سب رس

خاص نمبر ستمبر ۹۵۴



کابل
کا
ایک بازار

عمل۔
غوث الدین

★

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس خاص نمبر

حیدرآباد دکن

جلد (۱۷) فروری و مارچ سنہ ۱۹۵۴ء شمارہ (۲-۳)

نگران

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ

نجمہ صبیح
رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی

سالانہ چندہ چھ روپے سکۂ ہند
ششماہی " تین " "

(رجسٹری فیس بذمۂ خریدار)

خاص نمبر: دو روپے سکۂ ہند

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے تاج برقی پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

اِس شمارے میں

کملیہ

پہلی بات

جیسا کہ ہم نے جنوری کے شمارے میں اس کا اعلان کیا تھا کہ فروری یا مارچ میں "سب رس" کا خاص نمبر پیش کیا جائے گا سو وہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اسے فروری اور مارچ کا مشترکہ نمبر سمجھنا چاہیے۔ مگر یہ صحیح ہے کہ یہ نمبر کافی تاخیر سے نکل رہا ہے لیکن اس کا ایک سبب تو یہ ہوا کہ ہمارے کئی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات بھیجنے میں کافی تاخیر کر دی اور بہت سوں نے تو محض انتظار کروایا اور پھر بھی اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ دوسری وجہ انتظامی دشواریاں تھیں جن سے ہم بر وقت عہدہ برآ ہو سکے۔ بہر حال تھوڑی سی تاخیر کے بعد ہی سہی اب جو پرچہ آپ کے سامنے ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس لائق ضرور ہے کہ آپ ہمیں معاف فرما دیں گے۔ ویسے یہ خاص نمبر اور وزنی اور دبیز ہو جاتا اگر وہ تمام مضامین نظم و نثر شامل ہوتے جن کی ضخامت (کتابت کرانے کے بعد) ۳۰۰ صفحات تک پہنچ رہی تھی اور جنہیں مجبوراً اس لئے نکالنا پڑا کہ ایک تو وہ تھوڑے سے طویل تھے اور دوسرے ہمیں خاص نمبر کی ضخامت کو (مالی دقتوں کی وجہ سے) ۳۰۰ صفحات سے گھٹا کر ۲۰۰ صفحات کرنا پڑا۔ وہ مضامین جو اس نمبر میں شریک ہونے سے رہ گئے اپریل کے پرچے میں شامل رہیں گے۔ گویا اپریل کا پرچہ سالنامے کا دوسرا حصہ ہوگا جس کی اہمیت کا اندازہ نیچے دی ہوئی چند ناموں کی فہرست سے کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں ہم ان تمام کرم فرماؤں کے ممنون و شکر گزار ہیں جن کے مضامین، کہانیاں اور نظمیں اور غزلیں خاص نمبر کی زینت بن سکے۔

یہ نمبر کیسا ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ آپ خود بے لاگ رائے قائم کیجئے اور ہمیں لکھئے اور پسند آنے کی صورت میں "سب رس" کی توسیع اشاعت میں دلچسپی لیجئے۔

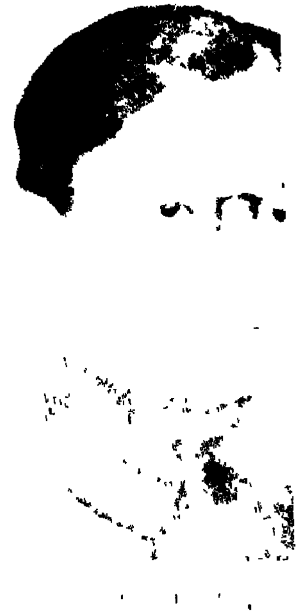
سالنامے کے دوسرے حصے کی ایک جھلک

(۱) مکتوبات اختر شیرانی مرسلہ دیوانہ سلطان آبادی (۲) مرزا غالب، آتش اور احسان کی شاعری، پروفیسر ہارون خان شیروانی (۳) "بھکاری" مصنف حبیب الرحمٰن (۴) "سورداس" پروفیسر زینت ساجدہ (۵) "غالب کا فیضان" پروفیسر شجاع احمد زیبا (۶) کتب خانہ آصفیہ کی قلمی کتابیں اور ان کی اہمیت ڈاکٹر راحت اللہ خان (۷) "کرن" (ڈرامہ) محمد مہدی (۸) "تفوق" (افسانہ) ل، احمد (۹) "جدید آرٹ کیا ہے؟" پروفیسر انعام الانصاری (۱۰) "نظموں میں نئے رجحانات" بلراج ساہنی (۱۱) "سالانہ رپورٹ" ڈاکٹر ابو یوسف ناظم (۱۲) "کتھاکلی" امجد علی (۱۳) "اورنگ آباد کے شعراء و ادیب" خالدہ بیگم ——— ان کے علاوہ بہت سی کہانیاں اور منظومات۔

سب رس کی مجلس انتظامی













[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



ڈاکٹر سلامت اللہ



عزیز قیسی



وحید اختر



ایرم ابوالحسن



شاذ تمکنت



دھی طرف سے

ڈاکٹر بھٹناگر ادارے کی محفل سخن میں

حضرت امجد - ڈاکٹر رضی الدین صدیقی - ڈاکٹر بھٹناگر - ڈاکٹر سید حسین
ڈاکٹر زور - ظہیر الدین احمد - عزیز قیسی - سلیمان اریب

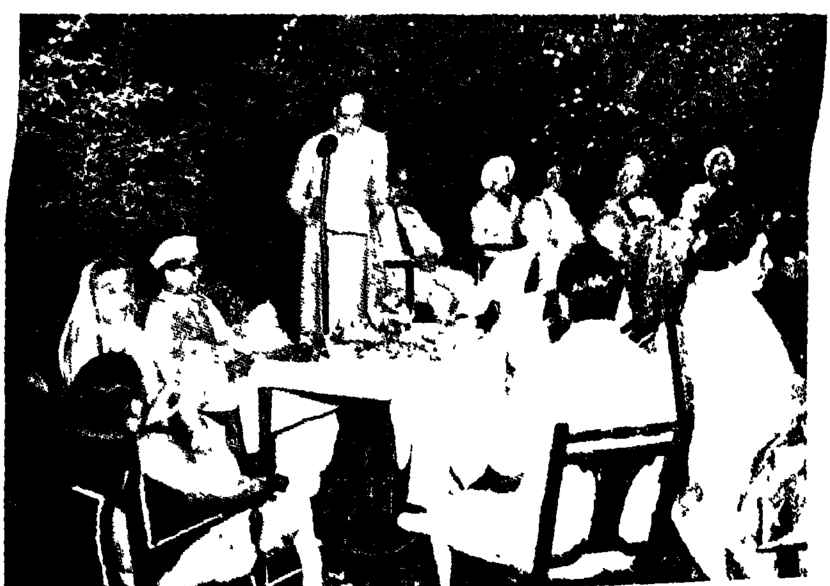


دھی طرف سے

پہلی صف :- ظہیر الدین احمد - ڈاکٹر سید حسین - حمید الدین شاہد - ڈاکٹر زور
ڈاکٹر بھٹناگر - سیدل دالا - کنول پرشاد - سرور ڈنڈا - سلیمان اریب - س۔ا۔ عشرت
دوسری صف :- حبیب عالم پوری - تقی الدین - سعادت نذیر - پروفیسر لطیف احمد فاروقی
مظہر حسین قیصر - قمر ساحری - ڈاکٹر حفیظ قتیل - عزیز قیسی - ضامن علی قادری - مراد علی طالع
تیسری صف :- راشد آذر - احمد علی - پروفیسر فضل حق - اکبر الدین صدیقی
پروفیسر صدیقی - پروفیسر سروری - پروفیسر سید محمد



سیدھی طرف سے پہلی صف ۔ وزیر تعلیم ادارے میں
حمید الدین شاہد ۔ پروفیسر سروری ۔ ڈاکٹر زور ۔ شاہ جہاں بیگم ۔ گوپال راؤ ایکبوٹے ،
وزیر تعلیم ۔ ای ۔ ہمایت راؤ ۔ ۔ وزیر مال ۔ سر نظامت جنگ ۔ راؤ ۔ صغرا بیگم ہمایوں مرزا ۔
دوسری صف ۔ مراد علی طالع ۔ حامدی کاشمیری ۔ نواب امام جنگ ۔ علی الدین احمد
حماد ۔ پروفیسر محمود حسینی ۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل ۔ پروفیسر سید محمد ۔



ڈاکٹر زور ، خیر مقدم کر رہے ہیں

ڈاکٹر محی الدین زور

موجودہ اردو ادب کے چند رجحانات اور مسائل

عہد حاضر میں اردو ایک نازک دور سے گذر رہی ہے۔ یہ ایک عبوری دور ہے۔ اور قوموں اور افراد کی زندگی میں ایسے دور کبھی نہ کبھی ضرور آتے ہیں۔ ہندستان کی آزادی نے جہاں کئی پیچیدگیوں اور رکاوٹوں کو دور کر دیا۔ بہت سے نئے نئے مسائل اور گتھیاں بھی پیدا کر دیں۔ جو سیاست دانوں اور ارباب حکومت کے لئے اب تک سرگردانی کا باعث بنی ہوئی ہیں اور اکثر اہل ملک ان میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔

اہل اردو بھی گذشتہ چند سالوں میں دوگونہ اضطراب اور انتشار کا شکار رہے۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ اس زبان کے شیدائی اور خدمت گزار اور خاص طور پر ادیب و شاعر بھی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ جو گروہ سرحد کے اس پار ہے وہ بھی ایک موافق ماحول اور سرکاری سازگاری کے باوجود مطمئن نہیں ہے۔ اس ملک کی مذہبی نوعیت نے وہاں کے ادیبوں اور شاعروں میں اسلامی ادب اور لادینی ادب کے علمبرداروں کی دو جداگانہ پارٹیاں کھڑی کر دی ہیں، اور آثار ایسے ہیں کہ نقطۂ نظر میں اختلاف کی یہ خلیج روز بروز وسیع ہوتی جائے گی اور ایک نہ ایک دن اس کا اثر ہندستان کی اردو اور اہل اردو پر بھی پڑے گا۔

ہندستان کی آزادی نے جہاں اس ملک کی اکثر و بیشتر زبانوں اور ان کے بولنے والوں میں زندگی اور زندہ دلی کی نت نئی لہریں دوڑا دیں۔ اردو اور اس کے حامیوں کو ایک خطرناک صورت حال سے دوچار کر دیا۔ یہاں بعض ایسے افسوسناک رجحانات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے اردو کو ایک بدیسی اور غیر ملکی زبان سمجھا جانے لگا اور اس کی شاندار ملکی روایات کا سرے سے انکار ہونے لگا۔ اور اس کی وہ خدمات فراموش کر دی گئیں جو ہندستان کی جدوجہد آزادی میں وہ گذشتہ سو سال سے انجام دیتی آئی ہے۔

ان نامساعد حالات میں بھی اردو کے ادیب اور شاعر خاموش نہیں رہے اور اردو ادب و شاعری کا چشمہ سوکھنے نہ پایا اور بڑی طمانیت کی بات تو یہ ہے کہ اس افراتفری اور داروگیر کے دور میں جب کہ اس زبان پر صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا الزام لگایا جا رہا تھا اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے آگے بڑھ کر اس زبان کو اس کے حریفوں کے حملوں سے بچایا اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ سے یہ ثابت کر دکھایا کہ نہ تو اردو کوئی غیر ملکی زبان ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے جیسا کہ اس کے بعض مخالف اس کے متعلق غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ گذشتہ چھ سالوں میں غیر مسلم ارباب قلم کی جتنی کتابیں اور رسالے اردو میں شائع ہوئے ہیں اتنے کسی ایک دور میں کبھی نہیں ہوئے تھے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ کشن پرشاد کول۔ فراق گورکھپوری۔ آنند نرائن ملا۔ گوپی ناتھ امن۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ۔ سرور لکھنوی۔ تلوک چند محروم اور جوش ملسیانی تو اس کے قدیمی پریمی اور خدمت گزار ہیں۔ لیکن نوجوانوں میں کرشن چندر، کنہیا لال کپور، جگن ناتھ آزاد، اوپندر ناتھ اشک، عرش ملسیانی، ہنس راج رہبر، راجندر سنگھ بیدی، شیام اختر، راجندر سنگھ بیدی، نریندر ناتھ، کشمیری لال ذاکر، گور بچن سنگھ، بلونت گارگی، مخمور جالندھری، پرکاش پنڈت، اوم پرکاش، گوپال متل، ہنس راج کول، دیوندر ناتھ، کشمیری لال ذاکر، گور بچن سنگھ، بلونت گارگی، بلونت سنگھ اور تریش کمار شاد جیسے بیسیوں شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں اور صحافیوں نے پوری توانائی کے ساتھ اردو کی طرف توجہ کی اور ان کے مضمونوں، مقالوں، افسانوں، نظموں اور غزلوں اور ان کی نظم و نثر کے مجموعوں اور ان کے زیر ادارت شائع ہونے والے

رسالوں سے اردو ادب میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں صحت مند رجحانات نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور وہ روایات پھر سے تازہ ہو رہی ہیں جو دکن میں بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں میں صدیوں تک شگفتہ رہیں اور اس کے بعد کے ادب میں، نظیر اکبرآبادی، محسن کاکوروی، چکبست اور پریم چند جیسے فنکاروں کے یہاں جلوہ دکھاتی رہی ہیں۔

یہ صورت حال اردو کے ایک جدید اور امید افزا رجحان کی ترجمانی کرتی ہے اور ہندستان کے مخالفین اردو کے علاوہ پاکستان کے ان نام نہاد محبان اردو کو بھی دعوت فکر دیتی ہے جو اردو میں صالح یا اسلامی ادب کا ایک نیا دبستان قائم کرنے کا پرچار کر رہے ہیں اور اس طرح وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے لئے ایک اہم مسئلہ بنا کر کھڑا کر دیا ہے حالانکہ جس قسم کے دبستان کو وہ اب قائم کرنا چاہتے ہیں وہ پہلے ہی سے اردو میں موجود ہے اور اس کے لکھنے والے اور پڑھنے والے ہر زبان کے مذہبی ادب کے دبستانوں کی طرح اردو میں بھی صدیوں سے موجود ہیں۔

اردو کے آج کل کے ادیبوں کے لئے خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا ہندستان میں صرف یہی ایک مسئلہ یا مرحلہ درپیش نہیں ہے اور یہ مسئلہ بھی آسانی سے طے ہو جائے گا اگر وہ اپنی زبان اور ادب کے ان تین بنیادی مسئلوں کو حل کر لیں جو پہلے سے زیادہ شدت اور گہرائی کے ساتھ اب ان کے آگے ہیں۔

(۱) کیا لکھیں اور کس کے لئے لکھیں؟

(۲) کس طرح لکھیں یعنی زبان اور ٹیکنیک کیا ہو؟

(۳) متحدہ محاذ کس طرح بنائیں؟

یہ ظاہر ہے کہ سائنٹفک تجزیہ اور صحت مند طریقہ پر حقیقت کی بے لاگ ترجمانی کسی ادیب کی سب سے بڑی کامرانی ہے۔ اس کے لئے ادیب کو سماج کی حقیقت سمجھنی پڑے گی۔ مختلف طبقات کے رشتوں اور ان سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے خیالات اور جذبات کو جاننا ہوگا اور اپنی تہذیب، کی تاریخی و ادبی روایتوں سے واقفیت حاصل کرنا اور اپنے ملک کی اخلاقی، تاریخی اور سیاسی فضا کا بہ امعان مطالعہ کرنا پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو عوام یا سماج کے جس طبقے کے لئے لکھنا مقصود ہے۔ اس کی حقیقی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک زبان اور فارم کے مسئلہ کا تعلق ہے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو یہ مسلمہ حقیقت ہر وقت پیش نظر رکھنی ہوگی کہ وہی ادب بڑا اور عظیم الشان ہوا ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے ہو اور ایسے ادب کی زبان، فارم اور طریقۂ اظہار یا ایکسپریشن کو بھی عام فہم اور نوک پلک کے ساتھ آسان بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایک طرف انفرادیت پسندی، فحاشی، و عریانی، اسلوب پرستی، اور ٹکنیک کی شکست سے اور دوسری جانب سیاسی انتہا پسندی کی ذہنیت۔ کسی خاص نظریہ کی تشہیر اور آخر میں فارم کو نظر انداز کرنے کے تصور سے بچنا ہوگا۔

اس تمام تفصیل کا خلاصہ اس ایک جملہ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اردو ادب کی ہیئت قومی اور اس کے موضوع مقبول خواص و عوام ہوں کیونکہ کسی ادب میں اس کے یہ دونوں اجزا یعنی موضوع اور شکل (Form and theme) برابر کی اہمیت رکھتے ہیں۔

اردو ادب کا تیسرا اور اہم مسئلہ خود ملک اور اہل ملک کے ان حالات اور رجحانات کا پیدا کردہ ہے جو اس عبوری دور میں سامنے آگئے ہیں اور جن سے اردو ہی کے ادیب سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ ہمارا ملک جن حالات سے گزر رہا ہے اور ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں جو انتشار سا نظر آتا ہے اس کے دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا صوبہ داریت، گروہ بندی اور علم و فضل کا تعصب دور نہ ہوگا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ مختلف نقاط نظر اور مختلف جماعتوں یا مجموعوں

تعلق رکھنے والے ادیب و شاعر باہمی میل جول کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ آپس میں بحث و مباحثہ اور سیکھنے سکھانے کے طریق کار سے صحیح تنقید اور خود تنقیدی کا ان میں شعور پیدا ہوگا اور اس طرح رفتہ رفتہ ایک متحدہ محاذ بن سکے گا۔ یہ متحدہ محاذ سیاسی جماعتوں کا جو د سیاسی عقائد کی بنا پر۔ اس لئے اس میں ہر وہ ادیب اور شاعر شامل ہوگا جو محب وطن ہو اور جمہوریت پسند بھی۔

آج کل ادب کے سلسلے میں ایک اور موضوع بحث "جمود" بھی ہے۔ عام طور پر اس جمود کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تقسیم ہند اور آزادی سے پہلے انگریز سب کا دشمن سمجھا جاتا تھا اور ادیبوں کے لئے اس کی مخالفت ایک عام موضوع تھا۔ جب منظر سے انگریز ہی ہٹ گیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ سے ان کا موضوع نکل گیا۔ وسعت نظر اور سیاسی شعور کی کمی نے ان میں واماندگی کے آثار پیدا کر دیئے۔ بعض نے روحانیت میں پناہ لی اور بعض نے گٹ بندی کا سہارا ڈھونڈھا اور بعض صوبہ واریت کی گود میں گر پڑے۔ اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ ادیبوں کا ایک متحدہ محاذ ان سے چھوٹ کر پیچھے رہ جانے والوں کو اپنے ساتھ لے لے اور انھیں صحیح راہ پر لگا دے۔ اس سلسلہ میں ایک اطمینان کی بات یہ ہے کہ ایسے ادیب اور شاعر بھی جنھوں نے عریانیت اور فحاشی کی کم یا زیادہ کسی زمانے میں سرپرستی کی تھی اب اس سے کنارہ کشی اختیار کر چکے یا کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو قدیم عربی قصیدہ نگاروں کے مشہور موضوع تشبیب ہی کو ان اصحاب نے ایک نفسیاتی حربے کے طور پر استعمال کیا تھا تاکہ ان کے موضوع سے دلچسپی نہ رکھنے والے بھی اس ذہنی عیاشی کے مسحور کن نغمے سے متاثر ہو کر وہ سب کچھ سن پڑھ لیں اور سیکھ لیں جو یہ بتلانا چاہتے تھے۔ اور اب جبکہ یہ مقصد بڑی حد تک پورا ہو چکا ہے اس حربے کے استعمال کرنے والے خود بھی اس کے گرتے ہوئے معیار کے قائل اور اس کو چھوڑ دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔ جب متحدہ محاذ کی کوششوں سے ایک صحتمند اور ترقی پسند فضا پیدا ہو جائے گی تو مٹی کی گلی چیزیں خود گر پڑیں گی یا پھینک دی جائیں گی۔ مجھے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہر رات ایک نیا خواب لاتی ہے اور ہر صبح اس خواب کی نئی تعبیر

(انجمن حیدرآباد ہندی پرچار سبھا میں پڑھا گیا)

ظ۔ انصاری کی تین کتابیں

جارج برنارڈ شا۔ (۲۰۵ صفحے کی کتاب جس میں برنارڈ شا کی زندگی، اس کے فن کی تنقید عہد حاضر کے انگلینڈ کی سماجی حالت کے پس منظر میں پیش کی گئی ہے اور چار ڈرامے بھی شامل ہیں۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

ورق ورق — ایک عجیب کتاب، جو بمبئی میں ۵۳ء کی سب سے مقبول اور سب سے مطعون کتاب قرار دی گئی ہے نثر ایسی جس میں فلسفہ ہے، شاعری ہے، ادب ہے، خطابت ہے، طنز ہے، تاثر ہے اور مزاح۔۔ ہے۔ صفحات تقریباً (۱۲۰۰)۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

کمیونزم اور مذہب — ایک مختصر کتاب جو دونوں موضوعات کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اسی قدر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے جس کا غیر جذباتی استدلال ہی بڑا وصف ہے۔

مکتبہ شاہراہ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

سے منگوائیے

محمد مہدی

ہندستانی صحافت

ہندستانی صحافت کا ذکر کرتے وقت میرے سامنے لازمی طور پر چند مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ مشکلات ہیں زبان کی۔ ہندستان کی ترقی یافتہ زبانوں میں ایک زبان بھی ایسی نہ ملے گی جس میں صحافت کی ایک تاریخ اور اس کی اچھی بری روایات موجود نہ ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندستان کی آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی انگریزی صحافت کو ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے اور ہندستان سے باہر اور خود ہندستان میں رائے عامہ سے واقف ہونے کے لئے عام طور پر انگریزی صحافت ہی پر بھروسہ کیا گیا لیکن اس کے باوجود بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کی اپنی زبانوں کی صحافت نے ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک نمایاں پارٹ ادا کیا ہے اور اب بھی اس کی آواز میں ایک اثر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ملک کے موجودہ سیاسی اور معاشی ڈھانچے کو دعا دیجیے کہ اس نے اب تک ایسے حالات پیدا نہیں کئے کہ ہندستان کی اپنی زبانوں کی صحافت ترقی کر سکے اور رائے عامہ کی نہ صرف عکاسی کر سکے بلکہ اس کی رہنمائی کے فرائض بھی پورے کر سکے جو اس کا ایک اہم مقصد ہے۔

بہر حال موجودہ حالات میں جب ہم ہندستانی صحافت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اگر ایک طرف ہندستان کی مختلف زبانوں کی جدید صحافت ہے تو دوسری طرف ہندستان کی انگریزی صحافت بھی ہے جو اب بھی رائے عامہ کو استوار (یا گمراہ ؟) کرنے میں سب سے آگے آگے ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ زبان کی مشکل ہمارے اس مطالعے کو محدود کر دیتی ہے لیکن پھر بھی چند ایسی مجموعی خصوصیات ہمارے سامنے ہیں جن کی بنیاد پر سارے ملک کی صحافت کے متعلق ایک رائے قائم کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جدید ہندستانی صحافت، جس پر رائے عامہ کی عکاسی کرنے اور اسے استوار کرنے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کونسا رخ اختیار کر رہی ہے اور اس سے کیا نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

یوں تو ہندستانی صحافت کی ابتداء ملک کی مختلف اصلاحی تحریکوں کے ساتھ ہوئی اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار راجہ رام موہن رائے نے شائع کیا۔ لیکن ہندستان کی صحافت کی آواز میں اعتماد اور انفرادیت کی تاریخ ہندستان کی قومی آزادی کی تحریک کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ ہندستان کی قومی تحریک کے ساتھ ساتھ ہندستانی صحافت نے بھی ترقی کی اور اگر آپ کو ہندستانی صحافت کی تاریخ میں کسی منصوبہ بندی کا فقدان نظر آئے تو اسے اپنی قومی آزادی کی تحریک کی برکت سمجھیئے جو ابتداء میں ایک خود رو پودے کی طرح بڑھتی رہی۔

شروع میں رسائل نکلے تو کمپنی بہادر کی قصیدہ خوانی انھوں نے اپنا فریضہ سمجھا لیکن جیسے جیسے ہندستان کا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ اپنی پوزیشن سے واقف ہونے لگا اور درمیانی طبقے میں سیاسی شعور بیدار ہوا ویسے ویسے ہمارے رسائل اور اخبار ایک حد تک لوگوں کے عام رجحانات کی نمائندگی کرنے لگے یا کم سے کم ان کے دکھ درد کو حکومت تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگے۔ کیلکٹا ریویو (Calcutta Review) اور فرینڈز آف انڈیا (Friends of India) جیسے اخبار کسانوں پر زمینداروں اور حکام کے مظالم کے لرزہ خیز قصے شائع کرنے لگے لیکن عام لوگوں کے ساتھ ان اخباروں کی ہمدردی صرف اسی حد تک تھی جب تک وہ حکومت کے آگے ناک رگڑنے سے انکار نہ کریں۔ جب ستاون کی بغاوت نے مشرقی ہندستان کو ہلا دیا تو فرینڈز آف انڈیا نے یہی لکھا کہ ان خونخواروں کے

دلوں میں جو نہ عمر دیکھتے ہیں نہ جنس کا لحاظ کرتے ہیں خوف و دہشت بٹھائے بغیر اس بغاوت کو ختم کرنا ممکن نہیں.....“

قومی تحریک کے قدموں میں استقامت آئی تو ہندستانی صحافت نے بھی ایک نیا رخ اختیار کیا۔ ادھر ایک پریس ایکٹ کے بعد دوسرا پریس ایکٹ بنایا گیا اور ادھر قومی جذبے کے تحت ایک اخبار کے بعد دوسرا اخبار جاری کیا گیا۔ ابتدا میں قومی صحافت منافع کے لئے نہیں بلکہ قومی آزادی کو زبان دینے کی غرض سے شروع ہوئی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اس نے یہ فرض ایک حد تک اچھی طرح سے پورا کیا۔

لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہی۔ ہماری بدقسمتی سے ہندستان کی قومی آزادی کی تحریک کی رہنمائی یہاں کے ایسے سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں تھی جس نے ہندستان کی مکمل آزادی سے زیادہ ضروری اپنے منافعوں کو رکھا۔ چند انگریزی اخبار اگر ایک طرف ملک میں انگریزوں کے مفاد کی نگرانی میں مصروف تھے تو دوسری طرف باشعور سرمایہ دار طبقہ بھی اپنے طبقاتی مفاد کے تحفظ کے لئے اخباروں کو استعمال کرنے کی فکر کرنے لگا اور آہستہ آہستہ صحافت ایک ایسے پیشے میں تبدیل ہوگئی جس کا اولین مقصد لوگوں تک صحیح اور غیر جانبدارانہ انداز میں خبریں پہنچانا نہیں رہا بلکہ اس کا سب سے اہم مقصد سرمایہ دار طبقے کے مفاد کی حفاظت کرنا اور ایک صنعت کی حیثیت سے منافع کمانا ٹھہرا۔

کڑی در کڑی

آج ہندستان کی ساری صحافت اسی ڈگر پر چل رہی ہے۔ ملک میں چند گنے چنے ہی اخبار ایسے رہ گئے ہیں جن کا تعلق کسی ایسے بڑے سرمایہ دار خاندان سے نہ ہو جو ہندستان کی معاشی زندگی میں اجارہ دارانہ حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت تین بڑے سرمایہ دار خاندان پورے ہندستان کی صحافت کو اپنے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں یا اور زیادہ جکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک برلا گروپ ہے جس نے ہندستان ٹائمز، سرچ لائٹ (پٹنہ)، لیڈر (الہ آباد) وغیرہ اور اسی قسم کے ہندی اخباروں کی ایک زنجیر قائم کر رکھی ہے۔ دوسرا گروپ گوئنکا کا ہے جسے اکسپریس گروپ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس کے قبضے میں شمال اور جنوب دونوں علاقوں کے اخبار ہیں اور تیسرا گروپ ڈالمیا کا ہے جس نے ٹائمز آف انڈیا کو انگریزوں سے خرید کر تین جگہ سے نکالا۔ (کلکتہ ایڈیشن بند ہو چکا ہے) اور جس کے قبضے میں کئی ہندی اور فلمی پرچے ہیں۔ یہ تینوں خاندان ہندستان کے ”کاغذی بادشاہ“ ہیں جو صحافت کے ہر پہلو پر چھائے ہوئے ہیں۔

اردو اور دوسری زبانوں میں یقیناً ایسے اخبار بہت ملیں گے جو کسی ایک خاندان یا فرد کے جاری کئے ہوئے ہیں یا جو صرف ایک ہی جگہ سے شائع ہوتے ہیں۔ انگریزی میں ہندو اور میل جیسے اخبار بھی ہیں جو اپنی جگہ بہت بڑے اخبار ہیں لیکن وہ خاندانوں کی نجی ملکیت ہیں۔ لیکن جب سے اخباروں کو خبریں پہنچانے کے ذرائع سے زیادہ منافع کمانے کا ذریعہ سمجھا جانے لگا اس وقت سے یہ رجحان زیادہ تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اخبار ایک ہی فرد یا سرمایہ دار خاندان کے ہاتھ میں مرکوز ہو جائیں اور ایک ہی اخبار کئی کئی اہم شہروں سے نکلے۔ سرمایہ دار خاندانوں کی ”نظر عنایت“ سب سے پہلے انگریزی اخباروں پر پڑی کہ اس وقت انگریزی صحافت کی آواز میں اثر ہے۔ اس کے بعد ہندی اخباروں کا نمبر آیا ہے جس نے آزادی کے بعد سے کافی اہم مقام حاصل کر لیا ہے اور اب تو یہ رجحان اردو صحافت میں بھی پیدا ہو گیا ہے، مثال کے طور پر اردو ملاپ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جو بیک وقت دہلی، جالندھر اور حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا سیٹھ ڈالمیا کے لئے نہ صرف ایک نفع بخش صنعت ہے بلکہ اس اخبار کے ذریعہ وہ ایک طرف اپنے طبقاتی مفاد کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تمام مسائل پر اپنے اور اپنے طبقے کے مفاد کے نقطۂ نظر سے رائے زنی اور تنقید کرتے ہیں اور دوسری طرف سیاسی میدان میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے یا برقرار رکھنے کے لئے اسے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

یہی حال ہندستان ٹائمز، سرچ لائٹ اور لیڈر جیسے اخباروں کا ہے جو سیٹھ برلا کی تجوریاں بھرنے کے علاوہ ان کے

معاشی اور سیاسی مفاد کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اور بالکل یہی بات اکسپرس گروپ پر صادق آتی ہے جو گوئنکا کے مفاد کا محافظ ہے۔ انگریزی روزناموں کے علاوہ ان گروہوں نے ان ہی اخباروں کے ساتھ ساتھ ہندی اور دوسری زبانوں میں اخبار یا رسالے بھی جاری کر رکھے ہیں۔ یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان تین گروہوں میں سے دو گروہوں نے شادی کے ذریعہ ایک دوسرے سے رشتے داری بھی قائم کر لی ہے۔

جب اخبار بڑے سرمایہ دار خاندانوں کے ہاتھ میں ہوں تو یہ اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان اخباروں کا مقصد کیا ہوگا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ان اخباروں کو یہ لوگ اپنے نجی اور طبقاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن اب تو یہ بات بھی منظر عام پر آرہی ہے کہ بیک وقت ایک ہی اخبار کے مختلف مقامات سے ایڈیشن نکالنے کے پیچھے ایک جذبہ اور بھی کار فرما ہے کہ کس طرح اپنے سرمائے کو مختلف سمتوں میں تقسیم کیا جائے اور اس طرح اگر ایک طرف ٹیکس سے بچنے کی کوشش ہوتی ہے تو دوسری طرف ایک اخبار کا منافع دوسرے اخبار میں لگا کر منافع کو کم کر کے دکھایا جاسکتا ہے اور اخبار میں کام کرنے والوں کی تنخواہوں میں اضافہ کو بھی روکا جاسکتا ہے کئی مقامات سے ایڈیشن نکالنے سے اسٹاف بھی کم کیا جاسکتا ہے اور اسی طرح منافع کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

اس "زنجیری" صحافت نے ملک کو مختلف مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔ ایک طرف تو ہر باشعور انسان محسوس کرنے لگا ہے کہ بڑے اخباروں کا اصل مقصد خبریں پہنچانا نہیں بلکہ اپنے گروہ یا طبقے کے حامی مفاد کو آگے بڑھانا اور اس لئے ہر جھوٹ کو سچ کر دکھانا ہے اور دوسری طرف چھوٹے صوبائی اخبار بڑے سرمایہ سرمایہ داروں کے لئے بے انتہا سرمایہ اور ان کی نہ ختم ہونے والی مسابقتی قوت کے سامنے ہتھیار ڈال دے رہے ہیں۔ ان اخباروں کی اشاعت کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے، کچھ اخبار بند ہو رہے ہیں اور جو زندہ رہنے کی کوشش میں مصروف ہیں انھیں ایسی ترکیبوں اور چالوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جو صحافت کو بدنام کر دیتی ہیں۔ اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے یہ اخبار سنسنی خیز خبروں اور سرخیوں، شہوانی خبروں یا تصویروں، من گھڑت قصوں اور جذبات بھڑکانے والے مضامین کا سہارا لیتے ہیں۔ حیدرآباد اس کی بہترین مثال ہے۔ یہاں ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب اردو روزناموں کی تعداد بیس سے زیادہ پہنچ گئی تھی۔ غالباً اب بھی بہت سے اخبار ڈیکلریشن باقی رکھنے اور موقع پڑنے پر "خاص ایڈیشن" نکالنے کے لئے کبھی کبھی جلوہ گر ہو جاتے ہیں جو چند اخبار سرکاری اور غیر سرکاری اشتہاروں اور سرمایہ کے سہارے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے اور ان کے پروپرائٹر اچھا خاصا منافع کمانے لگے۔ اب وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ پی ٹی آئی کی خبریں بھی حاصل کر سکتے ہیں اور چھ صفحات روزانہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا سکتے ہیں۔ پھر انگریزی اخباروں نے بھی اپنا مارکٹ پیدا کر لیا تھا اس لئے لازمی طور پر کم سرمایہ والے اخبار مشکلات محسوس کرنے لگے۔ کئی اخبار اس مقابلے کی تاب نہ لا کر بند ہو گئے اور چند نے دوسرا طریقہ اختیار کیا یعنی سنسنی خیز خبریں شائع کرنا۔ حیدرآباد کی مخصوص فضا میں فرقہ پرستی کو ہوا دینا ان اخباروں کے ہاتھ میں ایک اچھا خاصہ ہتھیار ثابت ہوا اور اب ان کا وجود صرف اسی سنسنی خیزی کی بنیاد پر قائم ہے۔

اس "زنجیری" اور سرمایہ دارانہ صحافت کا نتیجہ ہے کہ پنڈت نہرو کے قائم کئے ہوئے اخبار "نیشنل ہیرالڈ" کو معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اب وہ صرف یو۔پی کے ایک مخصوص حلقے کا اخبار ہو کر رہ گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے اخبار بھی اس "زنجیری صحافت" کی زد سے نہ بچ سکے جنھوں نے میدان صحافت میں ایک مخصوص سنجیدہ مقام حاصل کر لیا تھا۔ چنتامنی کے اخبار "لیڈر" پر سیٹھ برلا کی نظر پڑی اور اپنی ساری روایات کو ختم کر کے وہ برلا جی کا ترجمان بن گیا۔

صنعتی میدان میں اجارہ داری چھوٹی صنعتوں کو تباہ کر دیتی ہے لیکن صحافتی میدان میں اجارہ داری نہ صرف چھوٹے اخبارات کو ختم کرتی ہے بلکہ سیاسی میدان میں بھی اجارہ داری کے جال بچھا دیتی ہے۔ اخباری جھوٹ کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش

لتی ہے اور صاحب اقتدار عناصر کو اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کرتی ہے۔

خبریں اور خبر رساں ایجنسیاں

ہمارے اخبار اپنے معاشی اور سیاسی مفاد کے پیش نظر صرف ایسی ہی خبریں شائع کرتے ہیں جو ان کے لئے مناسب ہوتی ہیں اور اگر وہ مجبور ہو کر دوسری قسم کی خبریں شائع بھی کرتے ہیں تو اتنی رنگ آمیزی کے ساتھ کہ اس خبر کی صورت ہی مسخ ہو جاتی ہے اور صحافت کی اصطلاح میں اس کا نام "کلرنگ" رکھا گیا ہے۔ غیر جانبدارانہ خبر رسانی کا شاید ہم لوگوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو کہ چار بڑے وزراء خارجہ کی برلن کانفرنس میں یورپی اجتماعی تحفظ کے متعلق سوویت روس کے وزیر خارجہ مولوٹوف کی تجویز کو مغرب کے کئی اخباروں نے شائع ہی نہیں کیا اور اگر شائع بھی کیا تو اپنے الفاظ میں گہری رنگ آمیزی کے ساتھ اور یہ صرف مغرب ہی میں نہیں ہوا بلکہ ہندستان کے زیادہ تر اخباروں نے مولوٹوف کی تقریروں کو اتنا مختصر کر کے شائع کیا کہ اکثر و بیشتر بے معنی ہو گئیں یا ان تقریروں کے ساتھ اپنے نامہ نگاروں کی رنگ آمیزی بھی شائع کر دی کہ لوگ اس چیز کو دیکھ ہی نہ سکیں۔ آج کل غالباً آپ کو ہر صبح اخبارات میں "آئرن کرٹن" (آہنی پردہ) کا ذکر پڑھنا پڑتا ہوگا جسے ہمارے اخبار اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا اب اس لفظ اور اس کے مفہوم کی صداقت کو ہر شخص تسلیم کر چکا ہے۔ حالانکہ سوویت روس کے متعلق افترا پردازی کرنے والوں کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سوویت روس آہنی پردے کے پیچھے چھپا ہوا نہیں بلکہ مغربی ممالک نے اپنی اندرونی کڑوی حقیقتوں کو چھپانے کے لئے جھوٹ کی ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ آپ غالباً اخباروں میں اکثر و بیشتر Russia's Sattelite (روس کے حاشیہ برداروں) کا ذکر پڑھتے ہوں گے اور وہ بھی ایسے اخباروں میں جو برطانوی اور امریکی سامراجیت کے قیام کو دل و جان سے سراہتے ہیں۔ ان اخباروں کے ایک یا دو صفحے سٹے بازی، نیمارک کاٹن کے بھاؤ، اسٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ اور گھوڑ دوڑ کی ٹپ سے بھرے ہوتے ہیں لیکن ٹیگور جیسے شاعر کی برسی کے موقع پر شاعروں اور ادیبوں کی تقریریں ان میں صرف چار سطروں تک جگہ پاتی ہیں اور امن کے جلسوں اور جلوسوں کی خبریں چھپنے کے انتظار ہی میں دم توڑ دیتی ہیں۔

صرف ہمارے اخبار ہی اس جرم کے مرتکب نہیں ہیں۔ ہندستان کی خبر رساں ایجنسیاں بھی اس ڈھرے پر چل رہی ہیں۔ ہندستان میں قومی اعتبار سے دو خبر رساں ایجنسیاں ہیں۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی ٹی آئی) اور یونائیٹڈ پریس آف انڈیا (یو پی آئی)۔ پی ٹی آئی نے پرانے اے پی آئی کی جگہ لی ہے اور اس کا سارا کاروبار ملک کے چند بڑے اخباروں کے مالکوں کے ہاتھوں میں ہے جس کے صدر سیٹھ گوئنکا ہیں جو بذات خود جنوبی ہندستان کے بہت بڑے سرمایہ دار ہیں اور اخباروں کے ایک گروپ کے مالک ہیں۔ پی ٹی آئی نے برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر سے یہ معاہدہ کیا ہے کہ وہ ہندستان سے باہر کی تمام خبریں اسے حوالے کرے اور وہ ہندستان سے باہر کے لئے ساری ہندستانی خبریں اس کے حوالے کیا کرے گی۔ اس طرح ہم ساری بیرونی خبریں برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر کے ذریعہ سے پڑھتے ہیں اور قومی خبریں پی ٹی آئی کے ذریعہ اور اسی طرح باہر کے کئی ممالک میں لوگ ہندستان کی خبریں صرف پی ٹی آئی کی بھیجی ہوئی خبروں سے حاصل کرتے ہیں۔

یو پی آئی نسبتاً چھوٹی ایجنسی ہے جس پر ایسے لوگوں کا قبضہ ہے جن کے متعلق عام قصے یہ مشہور ہیں کہ اس پر عزیز و اقارب کا اجارہ ہے۔ اس نے بھی بیرونی خبریں حاصل کرنے کے لئے ایک فرانسیسی ایجنسی سے معاہدہ کر رکھا ہے جسے وہ اس کے بدلے میں ہندستانی خبریں دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ہندستان کے اخباروں کو چند ایسے خبر رساں اداروں سے بھی خبریں بہم پہنچاتے ہیں جن کا تعلق بیرونی ملکوں سے ہے۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر یونائیٹڈ پریس آف امریکہ (یو پی اے) نیزانیڈ فار ایسٹ نیوز ایجنسی (نافن) اور ایسوسی ایٹڈ آف امریکہ (اے پی اے) ہیں ——— موخر الذکر ادارہ ہندستانی خبروں کو صرف بیرونی اخباروں کے لئے بھیجتا ہے۔ ان کے علاوہ سوویت روس کا خبر رساں ادارہ تاس اور چین کا نیو چائنا نیوز ایجنسی بھی ہیں جن کا مقصد زیادہ تر ہندستانی خبروں کو اپنے ملکوں کو بھیجنا ہے۔

قومی اعتبار سے ہندستان کا سب سے اہم خبر رساں ادارہ پی ٹی آئی ہے جو ملکی خبریں دیتا ہے اور رائٹر کے ذریعہ بین الاقوامی خبریں

بھی۔ پی ٹی آئی اور رائٹر کے درمیان اس معاہدے کے پیچھے بھی ایک دلچسپ حکایت ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حکومت ہند نے یہ شرائط عائد کردیں کہ چونکہ ٹیلی پرنٹرس کی سہولتیں محدود ہیں اس لئے ٹیلی پرنٹر دیتے وقت پہلے ہندستانی اداروں کا خیال کیا جائے گا اور اس کے بعد بیرونی اداروں کی باری آئے گی۔ رائٹر کے لئے یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ ٹیلی پرنٹر کی سہولتیں براہ راست حاصل کرے اس لئے اس نے فوراً پی ٹی آئی کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا جس کی شرائط بڑی حد تک صیغۂ راز میں ہیں۔ گویا صحافتی میدان میں وہی کچھ کیا گیا جو سیاسی میدان میں ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا۔ حالانکہ رائٹر کو مجبور ہوکر پی ٹی آئی کے ساتھ یہ معاہدہ کرنا پڑا لیکن اب بھی سنجیدہ حلقوں میں اس خیال کا اظہار کیا جارہا ہے کہ پی ٹی آئی نے اس بہتر پوزیشن کے باوجود ایسی شرائط بھی قبول کرلیں جنہیں وہ آسانی سے رد کرسکتا تھا۔

رائٹر وہ رسوائے زمانہ خبر رساں ادارہ ہے جس نے برطانوی سامراج کی خدمت گزاری کو اپنا مقصد اولین قرار دیا ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جس نے انگریزی راج کے زمانے میں ہندستانی قومی تحریک کو "غنڈہ گردی" اور "غیر ذمہ دارانہ لوگوں کی بے ہودگی" کا نام دے کر دنیا میں بدنام کیا۔ یہی وہ ادارہ ہے جس نے بیرونی ممالک کے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ انگریزوں کا راج ہندستان کے لئے امن وامان اور خوشحالی و ترقی کا ضامن ہے اور یہ کہ قومی تحریک کو ہندستانیوں کی تائید حاصل نہیں ہے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہم تک بیرونی خبریں پہنچانے میں اسی ادارے کو تقریباً اجارہ دارانہ حیثیت حاصل ہے۔

رائٹر ہی کا کرشمہ تھا جس نے ہمارے اخباروں کے ذریعہ ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کوریائی جنگ کی اصل وجہ جنوبی کوریا پر شمالی کوریا کا جارحانہ حملہ تھا حالانکہ واقعات اس کے بالکل برعکس تھے۔ رائٹر ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کررہا ہے کہ ملایا، انڈونیشیا، کینیا، یوگنڈا، برٹش گیانا، فلی پائن اور دوسرے غلام ملکوں میں آئے دن انگریزوں، فرانسیسیوں اور امریکیوں کو جو قتل عام کرنا پڑ رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے چند لوگ قاتل، لٹیرے، ڈاکو اور وحشی ہیں۔ اسی نے کینیا کے آزادی پسندوں کو "ماؤ ماؤ دہشت پسند" کا نام دیا، ملایا کے جانبازوں کو "کمیونسٹ دہشت پسند" کا لقب دیا اور جب ویت منہ کی سپاہ آزادی کو کوئی اور نام نہ مل سکا تو یہی کہہ کر دل کی بھڑاس نکالنے لگا کہ ہوچی منہ ماسکو کا غلام ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جو چین میں روزانہ "قحط اور بلوے" کی اور سوویٹ روس میں روزانہ "غلاموں کے کیمپ" کے من گھڑت قصے سناتا ہے اور سامراجی ممالک کے جارحانہ عزائم اور مکروہ چہروں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہ رائٹر نے دروغ گوئی کو فن کی سطح تک پہنچانے کی کوشش کی ہے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ جھوٹ ایک دن کھل کر ہی رہتا ہے۔

رہ گیا پی ٹی آئی کا معاملہ سو ہم سب جانتے ہیں کہ اس ادارے پر بڑے سرمایہ داروں اور بڑے اخباروں کا قبضہ ہے اور انہی کی خواہشوں کے مطابق وہ صرف خبریں چنتا اور مسترد کرتا بلکہ گڑھتا بھی ہے۔ اب تو پی ٹی آئی نے اپنا دائرہ اور بھی بڑھانا شروع کردیا ہے۔ اس ادارے کی خبریں صرف اخباروں، آل انڈیا ریڈیو اور حکومت کے اداروں ہی تک محدود نہیں بلکہ اس نے اپنی خدمات سٹے بازوں اور تجارتی کاروبار کرنے والوں کو بھی پیش کردی ہیں، اس لحاظ سے ایجنسی کے کردار میں بھی تبدیلی ہوتی جارہی ہے اور اب اس کا ایک معتدبہ حصہ بازار کے بھاؤ، سٹے کی خبروں اور گھوڑ دوڑ کی ٹپس میں صرف ہوجاتا ہے۔

زیادہ دلچسپ حقیقت تو یہ ہے کہ مرکزی سرکار اور ریاستی حکومتیں بھی اس کی سرپرستی کرتی ہیں۔ اس کی خبریں حاصل کرنے کے لئے مختلف سرکاری محکموں سے ہزاروں روپیہ ادا کئے جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ رقم ادارے کی عام فیس سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک طرف تو ٹیلی پرنٹرس کی سہولتوں کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے لیکن دوسری طرف امریکہ کے ایک خبر رساں ادارے یو پی اے کو ٹیلی پرنٹر کی سہولت دی جاتی ہے۔ یعنی امریکہ کے ایک ادارے کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ نہ صرف ہندستانی خبر رساں ایجنسیوں کا مقابلہ کرے کہ اپنے خاص نقطۂ نظر کی اشاعت بھی کرے۔ اس حقیقت کو آنے والے پاک امریکی فوجی

معاہدے کی روشنی میں دیکھئے تو اس کا خطرناک پہلو سامنے آجائے گا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یو پی اے کی خبریں پاک امریکی معاہدے کے خطرناک پہلو کو چھپا کر اس کی غیر موجود برکتوں کی قصیدہ خوانی کر رہی ہیں؟ اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اسے قومی مفاد کے پیش نظر برداشت کیا جا سکتا ہے؟

بیرونی اثرات

اس مسئلے میں ایک اور اہم سوال بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ کیا کوئی ملک رائے عامہ کو ہموار کرنے کے شعبے میں کسی بیرونی ملک اداروں کو مداخلت کرنے کی اجازت دے سکتا ہے؟ اور کیا یہ اجازت اس ملک کے قومی مفاد کے منافی نہ ہوگی؟ صحافت جیسے اہم میدان میں کسی بیرونی عنصر کو کھلی آزادی دے دینا نہ صرف غلط بلکہ خطرناک بھی ہے کیونکہ اس طرح ہم ان عناصر کو آزادی دے دیتے ہیں کہ وہ اپنے ملک یا اپنے نجی مفاد کے لئے ہمارے ملک کی رائے عامہ کو ہموار کریں اور اس بات کا کافی امکان ہے کہ ان عناصر کا مفاد ہمارے ملک کے مفاد کے عین خلاف ہو لیکن آج ہندستان میں نہ صرف ایسے عناصر کو برداشت کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی ہمت افزائی بھی کی جا رہی ہے۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد انگریز سرمایہ داروں کے مفاد کی نمائندگی کرنے والا اخبار اسٹیٹسمن اب تک شائع ہو رہا ہے اور نہ صرف کلکتہ سے بلکہ دہلی سے بھی شائع ہوتا ہے۔

برطانوی عناصر کے ساتھ ساتھ امریکی عناصر بھی اب ہندستانی صحافت میں قدم رکھ رہے ہیں نہ صرف یہ کہ ہندستان میں امریکی حکومت کا اطلاعاتی بیورو خود اخبار اور بلیٹن نکالتا، مفت کتابیں اور پرچے تقسیم کرتا ہے بلکہ اب امریکی ڈالر نے خود ہندستانی صحافت کو بھی خرید لینے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ چند ہندستانی اخبار تو ایسے ہیں جنھیں غالباً براہ راست امریکی امداد تو نہیں ملتی لیکن وہ امریکہ کا پروپگنڈا ضرور کرتے ہیں کیونکہ ان کے پروپرائٹر کا مفاد امریکہ سے وابستہ ہو چکا ہے۔ اگر سیٹھ برلا نے امریکی کمپنی اسٹوڈی بیکر سے تجارتی معاہدہ کیا تو ان کے اخبار ہندستان ٹائمز نے وکالت شروع کی کہ ہندستان کو اپنی غیر جانبدارانہ خارجی پالیسی ترک کر کے امریکہ سے رشتہ مضبوط کرنا چاہیئے، ان کے دوسرے اخبار ایسٹرن اکانمسٹ نے بھی بالکل یہی راگ الاپنا شروع کیا اور اس نے بھی مشورہ دیا کہ حکومت ہند کو "امریکہ کی طرف جھکنا چاہیئے"۔

ممکن ہے سیٹھ برلا کے اخباروں نے امریکہ سے دوستی کا نعرہ صرف برلا جی کے معاشی مفاد کی وجہ سے لگایا ہو اور انھیں امریکی امداد نہ ملی ہو لیکن اب ہندستان میں ایسے اخبار بھی مل جائیں گے جنھیں امریکی ڈالر نے خرید لیا ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ امریکہ ایک خاص پالیسی کے تحت کروڑوں ڈالر اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ دوسرے ملکوں کے دانشوروں، ادیبوں، اخبار نویسوں اور سیاست دانوں کو خرید لیا جائے۔ صرف ۱۹۵۱ء میں امریکہ نے اس غرض کے لئے ہندوستان میں ۳۶۹,۴۹۸ ڈالر خرچ کئے۔ ۱۹۵۲ء میں (۱۳۲) ہندستانی امریکہ کا دورہ کرنے گئے، کے اخراجات امریکی حکومت نے برداشت کئے۔ جرنلسٹوں پر بھی خاص نظر عنایت کی جا رہی ہے اور اب تک کئی اخبار نویس امریکہ کا دورہ کر چکے ہیں۔

چند مہینے قبل دہلی کے ہفتہ وار اخبار "ریاست" نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ہندستان کے کئی اخباروں کو امریکی امداد مل رہی ہے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون نے بتایا تھا کہ اردو اخباروں ملاپ اور پرتاپ کو کئی ہزار ڈالر مل چکے ہیں۔ ان کے ایڈیٹروں کو امریکہ کے دورے کے زمانے میں روزانہ ... روپے ادا کئے جاتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کو ایک لاکھ روپے امریکی سفارت خانے سے اس شرط پر ملے کہ وہ اپنے اخبار میں امریکہ کی تائید میں مضامین لکھیں لیکن ایڈیٹر صاحب امریکی سفارت خانے سے بھی زیادہ چالاک نکلے۔ انھوں نے روپے لینے کے بعد امریکہ کی تائید میں مضامین لکھنے اور شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکی عہدے دار عجیب شش و پنج میں پڑ گئے کہ اگر مقدمہ چلائیں تو خود اپنے کرتوتوں کا بھانڈا پھوٹتا ہے اور اگر مقدمہ نہ چلائیں تو ایک لاکھ روپیہ ہاتھ سے جاتا ہے آخر میں یہ طے کیا گیا کہ مقدمہ نہ چلایا جائے کیونکہ مقدمے کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا امریکی ادارے کسی ہندستانی ادارے کو اس طرح روپے دے سکتے ہیں۔ دیوان سنگھ مفتون نے امریکی عہدے داروں کو چیلنج کیا تھا کہ اگر ان کے اس بیان میں کچھ

غلط بیانی ہے تو وہ ان پر ہتک عزت کا مقدمہ چلائیں لیکن اب تک مفتوں پر کسی قسم کا مقدمہ نہیں چلایا گیا۔

صرف اردو ہی نہیں انگریزی اور دوسری زبانوں کے اور کئی اخبار ہیں جنھیں کسی نہ کسی شکل میں امریکی امداد ملتی ہے تاکہ وہ ہندستان کی رائے عامہ کو امریکہ کی تائید اور سوویت روس اور چین کے خلاف ہموار کرسکیں۔ انگریزی ہفتہ وار کرنٹ کے امریکہ نواز ایڈیٹر ڈی۔ ایف کراکا نے نیویارک ٹائمز کو ایک دلچسپ خط لکھا تھا جس سے اس سوال پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے ۲۴ جولائی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا۔

> "چند ہفتے قبل میرے اخبار کرنٹ کے دفتر میں یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس (امریکی اطلاعاتی بیورو) کا ایک رکن آیا۔ وہ مجھے میرے اخبار کے پہلے صفحہ پر شائع شدہ ایک مضمون کے متعلق مبارکباد دینے آیا تھا جس کا عنوان تھا "جنگ ناگزیر ہے" اور جس میں وزیر اعظم نہرو کی غیر جانبدارانہ خارجی پالیسی پر تنقید کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ امریکہ جس طرح جنگ کے ناگزیر ہونے کے تصور کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ پنڈت نہرو کی پالیسی اس سے میل نہیں کھاتی۔ ہم سے کہا گیا کہ ہندستان میں اس مضمون کی اشاعت اور زیادہ ہونی چاہیے جس سے ہم یہ سمجھے کہ وہ ہم سے یہ درخواست کرنے آیا ہے کہ ہم امریکی اطلاعاتی بیورو کو اس کی بار دیگر اشاعت کی اجازت دیدیں ہم نے کہا کہ ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس نوجوان نمائندے کی ذہن میں یہ بات نہ تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمارا ہی اخبار اس پیغام کو اور زیادہ وسیع پیمانے پر لوگوں تک پہنچائے۔ اس نے کہا کہ اس سلسلے میں جو اخراجات ہوں گے ان کے لئے روپے کا انتظام کر دیا جائے گا۔"

مسٹر کراکا جیسے امریکہ کے دوست صحافی کے اس بیان کے بعد شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ امریکی ڈالر بہت تیزی سے ہندستانی اخباروں کو خریدنے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں اور یہ تلخ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ اس خفیہ سازش کو روکنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ پاک امریکی معاہدہ کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم ان واقعات کو نظر انداز کرکے اپنے ملک میں پانچویں کالم کو پناہ دے رہے ہیں۔

چند اہم مسائل یہاں چند ایسے مسائل کی طرف توجہ دلانا بھی نامناسب نہ ہوگا جن سے آج ہندستانی اخبار دوچار ہیں اور جن کا اثر بالآخر قارئین پر بھی پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ ہے اشتہاروں کا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ زیادہ تر اخباروں کی زندگی کا دارومدار اشتہاروں کی آمدنی پر ہوتا ہے بلکہ بڑے اخباروں کے لئے تو یہی منافع کا ذریعہ ہے۔

ظاہر ہے اخباروں میں اشتہاروں کی اشاعت پر اصولاً کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا لیکن جن لوگوں کو صحافت سے تھوڑا بہت بھی لگاؤ ہے وہ بخوبی محسوس کرسکتے ہیں کہ آجکل کے حالات میں اشتہارات اخباروں کے کردار، خبروں کے چناؤ، ایڈیٹوریل پالیسی اور عام مضامین کے تنوع پر کس طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اگر آپ اپنا اخبار غور سے پڑھتے ہیں تو غالباً آپ نے اکثر و بیشتر یہ بھی دیکھا ہوگا کہ آپ کے ہی اخبار میں شائع ہونے والے اشتہار کے متعلق کچھ باتیں ایسی بھی شائع ہوتی رہتی ہیں جنھیں عام طور پر خبر کہا جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہوتی ہے کہ مشتہرین اپنے اشتہار کے ساتھ ساتھ اپنے مال کے متعلق ایک خبر یا مضمون یا انگریزی میں جسے "رائٹ اپ" کہتے ہیں بھجوا دیتے ہیں تاکہ اگر اشتہار پر آپ کی نظر نہیں پڑی تو کم سے کم خبروں کے بہانے اس مال کی خوبیوں سے آپ واقف ہو جائیں گے۔ جس اخبار میں سینما کے اشتہارات زیادہ آتے ہوں اس میں آپ نے کسی فلم پر مخالفانہ تبصرہ ذرا کم ہی پڑھا ہوگا۔ اس کے برخلاف ایسے ریویو زیادہ چھپے ہوں گے جن سے آپ کو سخت اختلاف ہوگا۔ یہ سب اشتہاروں کا معجزہ ہے۔

بڑے کارخانے اور تجارتی فرم تو اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کارخانہ اپنے مال کا اشتہار دیتا ہے تو ساتھ ہی یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ اس اخبار میں نہ تو اس کارخانے کے تیار شدہ مال کے خلاف کوئی بات شائع ہوگی اور نہ

ان صنعتی جھگڑوں، مزدوروں کی حالت اور ان کے مطالبوں کے متعلق کوئی بات شائع ہوگی جن سے اس کارخانے کو تقریباً روزانہ سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اگر کسی سب ایڈیٹر نے غلطی سے کوئی ایسی خبر شائع کر دی تو دوسرے دن اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ بڑے اخبار تو صرف اتنی احتیاط کرتے ہیں کہ اپنے مشتہرین کے خلاف کوئی بات شائع نہیں کرتے لیکن چھوٹے اخبار تو اپنی ایڈیٹوریل پالیسی بھی مشتہرین کی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے کہ ایک سینما کے مالک نے صرف اس لئے اشتہار دینا بند کر دیا تھا کہ ہمارے اخبار میں سینما کے ملازمین کی شکایتیں شائع ہوئی تھیں اور مجھے ذاتی طور پر ایسے اخباروں کا بھی علم ہے جو کوئی ایسی خبر شائع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جس سے اس کے مشتہرین خفا ہو سکتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر سرکاری اشتہاروں پر عائد ہوتی ہے۔ سرکاری اشتہار صرف اچھی آمدنی ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ صحافتی دنیا میں عزت کا بھی ذریعہ ہیں۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں تو سرکاری اشتہارات صرف ان اخباروں کو ملتے تھے جو انگریزوں کی شان میں قصیدے پڑھتے تھے۔ توقع تھی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اس رویہ میں تبدیلی آئے گی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ آج کل بھی اخباروں کی ایک سیاہ فہرست تیار کی جاتی ہے جنھیں اشتہارات نہیں دیئے جاتے۔ سرکاری نمائندے عام طور پر تو یہی کہتے ہیں کہ سرکاری اشتہار دیتے وقت عہدے داروں کے پیش نظر صرف ایک ہی سوال رہتا ہے کہ اخباروں کی اشاعت کتنی ہے۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کا مشہور و معروف قصہ ہمارے ذہنوں میں اب بھی تازہ ہے جبکہ بمبئی کی حکومت نے اشتہارات دینا صرف اس لئے بند کر دیا کہ ٹائمز آف انڈیا کئی باتوں میں حکومت پر سخت تنقید کرتا ہے۔ یعنی اشتہارات دینے نہ دینے کا انحصار صرف سیاسی بنیاد پر ہے۔ حکومت صرف ان ہی اخباروں کو اشتہارات دیتی ہے جو اس کی تائید کرتے ہیں اور اگر تائید کرنے والے اخبار بھی کسی وقت تنقید کرنے کی جرأت کرتے ہیں تو ان کے اشتہارات بند کر دیئے جاتے ہیں یا بند کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ مخالف جماعت کے اخباروں کو سرکاری اشتہارات تقریباً بالکل نہیں ملتے۔ مغربی بنگال کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی سی رائے نے بہت صاف طریقے سے اسمبلی میں اعتراف بھی کر لیا کہ اشتہارات دیتے وقت حکومت کے پیش نظر صرف اشاعت ہی نہیں بلکہ کئی اور سوال بھی ہوتے ہیں یعنی سیاسی سوالات۔

صحافت اور حکومت کے درمیان تعلق کا سوال بھی کافی اہم مسئلہ ہے جو دنیائے صحافت کو ایک عرصے سے پریشان کر رہا ہے۔ انگریزوں نے اپنی مخالفت کو روکنے اور کچلنے کے لئے ایک کے بعد ایک قوانین بنائے، اخباروں کے لئے نئی نئی زنجیریں ڈھالی گئیں اور آزاد اخباروں کی زبان بندی کر دی گئی۔ کئی اخبار بند کر دیئے گئے۔ کئی اخباروں سے ہزاروں روپے کی ضمانت طلب کی گئی، سنسرشپ کے قواعد اتنے سخت کئے گئے کہ چند اخباروں کو شائع کرنے سے پہلے ہر چیز سنسر کو دکھانی پڑتی تھی۔ اڈیٹروں اور صحافیوں کو جیل میں ڈالا گیا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود صحافت کی آزادی کی جدوجہد برابر جاری رہی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ پریس کی آزادی کی یہ جدوجہد اب بھی ختم نہیں ہوئی کیونکہ اب بھی صحافت کے پیروں میں پریس ایکٹ کی زنجیریں ہیں۔

حال ہی میں صدر جمہوریہ نے اپنی خصوصی اختیارات کے تحت "قانون قابل اعتراض مواد" کی مدت میں توسیع کرنے کے لئے ایک آرڈیننس جاری کیا۔ یہ وہ قانون ہے جس کی مخالفت نہ صرف بائیں بازو کے اخباروں اور صحافیوں نے کی بلکہ آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس جیسی جماعت نے بھی کی جس میں بڑے بڑے اخباروں کے مالکوں کے نمائندوں کا اثر ہے۔ اس کانفرنس نے مذکورہ بالا قانون کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اخباروں سے اپیل کی تھی کہ وہ نمایاں مقام پر یہ نعرہ لکھا کریں کہ "اظہار خیال کی آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم اسے حاصل کر کے دم لیں گے۔"

اگر ایک طرف اس قانون کے ذریعہ حکومت کو اخباروں سے ہزاروں روپے کی ضمانت طلب کرنے کا حق حاصل ہے حکومت کے پاس سلامتی نظر بندی کا قانون بھی موجود ہے جس کے تحت وہ صحافیوں کو نظر بند کر سکتی ہے بلکہ کرتی ہے۔ غرض آج صحافت کو قدم قدم پر پابندیوں کا مقابلہ ہے اور اسی لحاظ سے آزادی صحافت کی جدوجہد تیز تر ہوتا ہے۔

آزاد صحافت کی جد و جہد

آزاد صحافت کی جد وجہد کے دو پہلو ہیں۔ مجموعی طور پر ہندستانی صحافت کو برسر اقتدار طبقوں کی عائد کردہ پابندی کے خلاف جد وجہد کرتے ہوئے اظہار خیال کی آزادی کا تحفظ کرنا اور اپنے حقوق کو منوانا ہے۔ لیکن جب ہم آزاد صحافت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا تصور اس سے بھی پرے جاتا ہے۔ اس مفہوم میں اب تک جو کچھ [illegible] کی گئیں اگر وہ صحیح ہیں تو پھر لازمی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مجموعی حیثیت سے ہندستانی صحافت آزاد صحافت کہلائی جانے کی مستحق ہے؟ جو اخبار مختلف رشتوں ناتوں سے ایک مختصر گروہ کے مفاد کے تابع ہوں اور اس مفاد کے پیش نظر خبروں، اداریوں، مضامین اور کارٹونوں میں رنگ آمیزی کریں اور حقیقت کو صحیح اور صحت مند زاویہ سے دیکھنے اور پیش کرنے کے بجائے واقعات کو مسخ کریں انھیں آزاد صحافت کی برادری میں کس طرح شامل کیا جا سکتا ہے! ان اخباروں کے لئے تو خبر اب بھی یہ نہیں ہے کہ کتے نے آدمی کو کاٹا بلکہ خبر تو اسی وقت بنتی ہے جب آدمی کتے کو کاٹ لے۔ جنس، قتل، زنا، اغوا، ڈکیتی اور مارپیٹ ان کے محبوب عنوانات ہیں جن کے لئے وہ خبریں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ خوشحالی اور امن کیلئے عام انسانوں کی روزانہ کی جد وجہد ان کے لئے خبر یا تبصرے کی مستحق نہیں ہے۔ عام انسان کی صورت اگر ان اخباروں میں نظر بھی آتی ہے تو مسخ شدہ حرباتو کسی کے بھڑکانے سے جرائم اور "تشدد" کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنی "وحشیانہ خصوصیات" کا مظاہرہ کر کے برسر اقتدار طبقوں کو پریشان کرتے ہیں یا پھر ہر وقت "ناجائز" اور "غیر مناسب" مطالبات سے اپنے آقاؤں کو تنگ کیا کرتے ہیں۔

لیکن ان ہی عام انسانوں کی زندگی اور ان کی جد وجہد اپنی ترجمانی کے لئے آزاد صحافت کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہی عام انسان اپنی تحریکوں کو مربوط کرنے کے لئے اپنے اخبار مانگتے ہیں۔ ایسے اخبار نکالنا یا انھیں زندہ رکھنا آسان کام نہیں کیونکہ انھیں اگر ایک طرف برسر اقتدار طبقوں کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو دوسری طرف سرمایہ پرست اخباروں اور ان کی چالبازیوں کا سامنا کرنا [illegible] تیسری طرف اشتہاروں اور آمدنی کے دوسرے ذرائع کو خیرباد کہہ کر لوگوں کی عملی امداد پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے۔

آزاد صحافت کی تاریخ پرانی ہے اور شاندار ہے۔ اس میں ان دیش بھگتوں اور محبان وطن کا خون جگر شامل ہے جنھوں نے انگریزوں کے حلقہ بگوش پریس کے مقابلے میں آزادئ صحافت کے لئے جد وجہد کی۔ اردو میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار جیسے لوگوں نے صحافت کی شاندار روایات قائم کی ہیں، انگریزی میں نیشنل ہیرالڈ جیسا اخبار بھی ہے جس نے پنڈت نہرو کی سرپرستی میں ابتدا کی اور انگریزوں کے تمام حملوں کا مقابلہ کرتا ہوا آج بھی سنجیدہ صحافت کا معیار رکھے ہوئے ہے۔ بالکل اسی طرح بنگالی، مراٹھی اور دوسری زبانوں کے اخباروں نے آزاد پریس کے لئے شاندار جد وجہد کی ہے اور اس راستے میں بڑی یادیں چھوڑی ہیں۔

لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات میں یہ بوجھ کچھ اور ہی عناصر کو اٹھانا پڑ رہا ہے، گو اس کی ابتدا آج سے بہت پہلے انگریزی کا [illegible] ہو گئی تھی جب کہ محنت کش طبقات نے بھی اپنے رسالوں کے ذریعے دنیائے صحافت میں قدم رکھا تھا لیکن اب یہ جد وجہد اور بھی زیادہ تیز ہو گئی ہے کہ حالات کا یہی تقاضا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ انگریزی میں نیشنل ہیرالڈ جیسے ایک ہی آدھ اخبار ہیں جو سنجیدہ اور آزاد صحافت کے پرچم کو بلند کئے ہوئے ہیں۔ دوسری زبانوں میں بھی حالات اسی قسم کے ہیں۔ ہزارہا مشکلات اور مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے چند نامہ اخبار اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ اس جد وجہد کی سختیوں کو کچھ وہی خوب محسوس کر سکتا ہے جو عملی طور پر ان سے وابستہ رہا ہو۔

یقیناً مبارکباد کے قابل ہیں وہ اخبار جو ان مشکل حالات میں زندہ ہیں اور زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کتنی شاندار تھی "نیا زمانہ" کی جد وجہد جس نے ہر حملہ کے بعد نیا روپ دھارا، کبھی "مزدور" ہوا کبھی "نئی زندگی" اور کبھی "سات دن"

...جس نے ورکروں سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ جب کبھی ہندستانی صحافت کی تاریخ لکھی جائے گی یہ باب سونے کے حروف سے
...جائے گا۔ محسوس کیجئے ان مساعد حالات کو جن کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے جنوب کا واحد آزاد اردو اخبار "پیام" تنہا
...اور اپنا پیغام ورکروں تک پہنچاتا رہا۔ قاضی عبد الغفار اور سبط حسن جیسے صحافیوں نے اسے پروان چڑھایا، اختر حسن جیسے صحافی
...مذہبی جنون کے جھگڑوں کے درمیان اس چراغ کو بجھنے نہ دیا لیکن آخر سرمایہ کی کمی نے اسے بھی خاموش کر دیا۔ شاید اس سے
...زیادہ شاندار ہے دوسری زبانوں کے اخباروں کی وہ کہانی جو ان نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے، مالی مشکلات کا
...نکالتے ہوئے عوام کی خدمت برابر کر رہے ہیں۔ یہ کہانی یقیناً ایک دن لکھی جائے گی اور ان ہی تجربوں کی بنیاد پر نئی صحافت
...جنم لے گی۔

ہندستانی صحافت کا ماضی شاندار ہے۔ آج سرمایہ کی گرمی نے ان روایات کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے اور
صحافت کو استحصالی طبقوں کی لونڈی بنا دیا ہے۔ لیکن آزاد صحافت کی جدوجہد برابر جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی
جب تک صحافت واقعی تمام زنجیروں کو کاٹ کر آزاد فضا میں سانس لینا نہیں شروع کرتی۔

حیات اجمل

اس کتاب کے مرتب قاضی محمد عبد الغفار صاحب ہیں۔ اس سوانح حیات کا بہت دنوں سے انتظار
تھا۔ اس میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی صرف سوانح عمری ہی نہیں بلکہ اس کی پوری سیاسی تحریکات کا
خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں حکیم صاحب مرحوم کی عظمت و کردار کا پتہ چلتا ہے۔
اس کتاب کی بڑی خوبی مصنف کے انداز بیان کی دلکشی بھی ہے جس کے متعلق بمبئی کے انگریزی
اخبار "بھارت جیوتی" نے لکھا ہے کہ:-

"قاضی محمد عبد الغفار نے جو اردو کے بہت بڑے عالم اور انشا پرداز ہیں ایک
عظیم الشان شخصیت کی سوانح حیات لکھ کر بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ کتاب اس زمانے
کے سیاسی انقلابات کی ایک مستند تاریخ ہے اور پر لطف اردو میں لکھی گئی ہے۔"

قیمت مجلد آٹھ روپے

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ

اکبر الہ آبادی

ظ۔ انصاری

(اپنی شکست کی آواز)

سماج اور ادب کی تاریخ اس مرحلے سے آگے بڑھ گئی ہے جہاں وہ اکبر الہ آبادی کو جنم دے سکتی تھی۔ اب اردو شاعری دوسرے اکبر کو پیدا نہ کر سکے گی۔ کیونکہ ٹیلی ویژن اور ہائیڈروجن بم کے اس زمانے میں تاریخ کے ساتھ جغرافیے کا تصور بھی بدل گیا ہے اور مشرق و مغرب کا درمیانی فاصلہ روز بہ روز کم ہوتا جا رہا ہے۔

اکبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ کم سنی سے شاعری شروع کر دی تھی لیکن شاعری کی وہ سمت جس نے انھیں اردو ادب میں خاص مقام دیا ۱۸۶۶ء کے قریب شروع ہوئی جب ان کی عمر ۲۵، ۲۶ برس کے لگ بھگ تھی۔ یہ زمانہ اکبر کی شاعری کا پس منظر ہی نہیں ہے بلکہ اس کی روح بھی ہے۔ جس کے گہرے مطالعے کے بغیر اکبر پر کوئی مستقل لیبل لگانا بے جا ہوگا کیونکہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ صرف رجحانات ہی نہیں بدلتے بلکہ وہ اسباب و حالات بھی بدل جاتے ہیں جو آرٹ کی مختلف سمتوں اور شکلوں کی راہ تیار کرتے ہیں۔

سودا نے جب اپنا وہ مشہور قصیدہ لکھا تھا جس میں گھوڑے کی تیز رفتاری کو یوں بیان کیا گیا تھا کہ

حاضری کھائے جو کلکتے تو لندن میں ٹفن

اس وقت یہ مصرعہ انسانی خیال کے انتہائی مبالغہ کا ایک نمونہ تھا اور مبالغہ کا حسن ہی اس کی جان تھا۔ لیکن آج صرف ڈیڑھ سو برس کے فاصلے نے اس میں مبالغے کا حسن ختم کر دیا ہے اور اس کے بجائے حقیقت یا واقعیت کی سادگی پیدا کر دی ہے۔ آج نہیں تو پانچ سات سال کے بعد یہ بالکل ممکن ہوگا کہ آدمی کی سواری صبح ۵ بجے کلکتے میں ہو اور دن کو ڈیڑھ بجے لندن پہنچ جائے ہم سودا کے اس شعر کی داد نہیں دے سکتے اگر ہم اسے اٹھارویں صدی کے حالات میں رکھ کر نہ دیکھیں۔

اکبر ۱۹ ویں صدی کے آخری برسوں کے ہندستانی ذہن کی پیداوار ہیں اور بیسویں صدی کی ابتدا تک ہندستانی درمیانی طبقے کی ایک بڑی تعداد کا ذہن ان کی شاعری کی زبان سے بولتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد شمالی ہندستان پر انگریزوں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ اب برطانوی شہنشاہیت نے ہندستان کے نظام کو اپنے مفاد اور اپنے منشا کے مطابق اور زیادہ قوت کے ساتھ ڈھالنا شروع کر دیا اور عہد وسطیٰ کے ہندستان کی رہی سہی مدافعت بھی اس کے آگے بالکل بے بسی محسوس کرنے لگی۔ فوجی ہتھیار بند بغاوت کی ناکامی نے ذہنی، سیاسی اور تہذیبی ناکامی کی فضا طاری کر دی جو کم از کم ۲۰، ۲۵ برس یوں ہی برقرار رہی

یہ پیپر ۱۹۷۵ء دسمبر کا لکھا ہوا ہے۔ ظ۔ا

پس منظر

لارڈ ڈلہوزی کے بعد لارڈ کیننگ کو برطانوی شہنشاہیت کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا تو ڈلہوزی کی سیاسی اور فوجی سخت گیری ضرور کم ہوئی لیکن اس کی جگہ تہذیبی اور معاشرتی سخت گیری اندر ہی اندر بڑھنے لگی ـــ سر جان لارنس کے زمانے اور اس کے بعد سے مغربی سرمایہ داروں نے اگر ہندستان میں ریلیں، ڈاک، تار اور روئی یا جوٹ کے صنعتوں کے جال بچھانے شروع کئے تو ان کے ساتھ نئے ترقی یافتہ، زیادہ خوش حال، زیادہ منظم سماج کی آمد نہیں ہوئی بلکہ یہ بھی نو آبادیاتی نظام کو مضبوط اور پائدار بنانے کی تدبیر تھی تاکہ ہندستان کو ایک زراعتی ملک کی حیثیت سے برطانوی صنعتوں کی نفع اندوزی کے لئے سدھایا جائے۔ نئے نظام کی حیرت انگیز قوت، پائداری اور امن کے حالات کی تنظیم سے جو اطمینان کی فضاء پیدا ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی کیونکہ اس سطح کے نیچے نہ صرف یہ کہ عام ہندستانی کی معاشی حالت روز بہ روز گرتی جا رہی تھی بلکہ اسے اپنی مکمل سیاسی شکست کے سامان کے ساتھ وہ حالات بھی نظر آ رہے تھے جن میں حاکم کے دل میں محکوم کی طرف سے بے اعتمادی اور تحقیر بھری ہوئی تھی۔ اوپر کے طبقوں میں ان لوگوں کی سرگرمیاں نظر آ رہی تھیں جو خود یا تو منافع خور تاجر تھے یا بچے کھچے جاگیردار تھے یا اعلیٰ عہدوں کے لالچی اور ان سب کا دار و مدار صاحب اقتدار انگریزوں کے دامن دولت سے وابستہ ہونے میں تھا۔ پھر ادھر بمبئی، کلکتہ اور مدراس یونیورسٹیوں کے سایۂ عاطفت میں ہندستانیوں کی ایک نئی نسل پروان چڑھ رہی تھی۔ ان میں دولت مند تاجروں، بڑے بڑے جاگیرداروں اور خوش حال درمیانی طبقے کے بیٹے تھے جن کا مستقبل نامت برطانیہ کی انتظامی اور تعلیمی پالیسی کا ایک پرزہ بن جانے میں پوشیدہ تھا۔

لارڈ میکالے کی تعلیمی اور تہذیبی پالیسی اپنا کام کر رہی تھی کہ

> "ہمیں ہندستانیوں میں ایک ایسا طبقہ بنانا چاہیئے جو ہمارے اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان بن جائے۔ خون اور رنگ کے اعتبار سے تو وہ ہندستانی ہو مگر اپنے مذاق، اپنی رائے، الفاظ اور عقل و شعور کے لحاظ سے بالکل انگریز ہو"
> (۱۸۳۵ء۔ میکالے رپورٹ)

اس طرح حکمران اجنبی اور پرغرور قوت کے لئے (Social Base) ہندوستانی زمین پر ایک سماجی بنیاد تیار کرنا انگریز کی انتظامی، تعلیمی اور تہذیبی پالیسی کا اصل مقصد تھا چنانچہ وہ سوشیل بیس پیدا ہو رہی تھی جو فکر اور فن میں تو انگریزوں کی طرح گہری پرجوش اور اخلاق نہ تھی لیکن انگریز نما اور انگریز ساز ضرور تھی اور برطانیہ کے ادھ کچرے افسروں کی کھوکھلی نقالی ہی کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کافی سمجھتی تھی۔

اکبر نے سرکاری ملازمت کی، روٹی کا کوئی اور سہارا نہ رہ گیا تھا اس لئے اور اپنی ذہانت اور محنت سے ترقی کرتے کرتے چند سال کے اندر اس مقام تک پہنچ گئے جہاں وہ انگریز کو، انگریزی کو اور کھوکھلی انگریزیت کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے اور اس کے ظاہر و باطن کے فرق کو سمجھ سکتے تھے۔ اس کے پہلے ہی جلووں نے اکبر کو بیزار کر دیا۔ اگر شاعر کی عالی شان سرپرستی کرنے والے ملک میں پہلے کی طرح زندہ ہوتے تو شاید اکبر سرکاری دفتر میں مسل خوانی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے یا اگر عام ہندستانی کی طرح متاثر اور مستقل ہو جانے والا دل و دماغ رکھنے کے ساتھ اگر ان میں مصائب کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہوتا تب بھی وہ سرکاری نوکری سے استعفا دے دیتے۔ لیکن یہاں تو ساری قوم کا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ اکبر کس شمار و قطار میں تھے۔

انھوں نے دبی زبان سے احتجاج شروع کیا۔ یہ احتجاج طنز وہ تھا۔ بیزاری سے بھرا تھا اور اس میں انگریز اور انگریزیت کو غصہ اور نفرت سے دیکھنے والوں کا جذبہ اور ایک بے بس سرکاری ملازم کی زبان پائی جاتی تھی۔

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند

سب رس

ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش　　یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

اس "مطیع و خیر خواہ" کے اعلان میں منہ پھیر کر تھوک دینے کا جذبہ موجزن ہے۔

اسی جذبے اور حالات کی مجبوری میں کش مکش ہوئی اور بہت دن تک ہوتی رہی تب جا کر وہ انداز بیان ابھرا جس میں طنز کی تلخی اور مزاح کی چاشنی پائی جاتی تھی۔ یہ بھی ایک نمایاں مثال ہے ادبی تنقید کے اہم نکتے کی کہ معنوی کیفیت اپنے مطابق صوری انداز یا اظہار کے سانچے خود بنا لیتی ہے۔ ہئیت کی ساخت میں موضوع کو گہرا دخل ہے۔
اکبر کی ابتدائی غزلوں میں عاشقی کی رنگا رنگی، شباب کی جولانی اور روایتی عقاید کی پچ کاری پائی جاتی تھی، طنز اور مزاح کا نام و نشان نہ تھا لیکن جیسے جیسے ان کی نگاہ گہری ہوتی گئی۔ قومی درد کی کسک بڑھتی گئی اور قومی بے بسی کے ساتھ اپنی مجبوریوں کا احساس ہوتا گیا اتنا ہی ان کے شعر میں طنزیہ کیفیت اور ان کے طنز میں دھار پیدا ہوتی گئی۔

اب اور چاہئے گورنمنٹ کے واسطے کیا بات　　یہی بہت ہے مشرف ہوئے اسلام سے ہم

جن لوگوں نے کلام اکبر کو ترتیب وار اور تاریخی سلسلے کے ساتھ پڑھا ہے انھیں یہ بات ضرور محسوس ہوئی ہوگی کہ اکبر کے ہاں شروع شروع میں طنز کا وار زیادہ تر ان افراد پر پڑتا ہے جو ان کے نزدیک محض عہدوں کے لالچ میں، سرکاری رعایتوں کی تمنا میں اور قوم کی نگاہ میں صاحب رسوخ اور با اثر کہلانے کے لئے مشرقی آداب، روایتی طور طریقوں، پرانے درمیانی طبقے کی معاشرت اور پرانی مذہبی تعلیم سے دور بھاگنے لگے تھے۔ بعد میں ایسے لوگوں کو وہ اداروں کی شکل میں دیکھنے لگے ہیں اور ان کو واضح کرنے کے لئے بالکل دیسی فضا سے کچھ نام تراش لیتے ہیں۔ مثلاً کلو، بدھو، وفاتی، لیڈر، شیخ، سید، جمن، مس اور بیگم، لاٹ صاحب، گھسیٹا، پنڈت وغیرہ۔
اور جس طرح افراد کے خلاف جو غصہ تھا وہ مظاہر کے خلاف بیزاری میں تبدیل ہوا ایسے ہی مظاہر کے خلاف نفرت مستقل اداروں اور ان کے مقاصد اور ان کی سرگرمیوں کی شدید انتھک مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔
یہ بات یوں ہی گزر جانے کی نہیں ہے بلکہ کافی غور طلب ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اکبر کے مشرقی احتجاج نے انتہائی فطری راستہ اختیار کیا۔ ان کی شاعری بھی ان کی نگاہ اور ان کے جذبے کی طرح ناپختگی سے پختگی کی طرف، مجاز سے حقیقت کی طرف، حس سے ادراک کی طرف اور نفی سے اثبات کی طرف بڑھتی گئی ہے۔ یہ ہوا تب جا کے ان کے پرچار میں فن کی گہرائی اور دلکشی پیدا ہوئی۔ پروپگنڈا دھیرے دھیرے فن کے سانچے میں سمایا اور جب سما گیا تو اس طرح کہ دونوں یک جان و یک قلب بن گئے۔ اب ہم اکبر کے فن کو ان کے پروپگنڈے سے جدا نہیں کر سکتے اور یہ نہیں بتا سکتے کہ یہاں پروپگنڈے کی خاطر فنی حسن کو یا فن کی خاطر پروپگنڈا دلیو کو ختم کر دیا گیا۔ فکر اور جذبے کی ہم آہنگی کی یہ منزل بھی اکبر کے ہاں بڑی لمبی ریاضت کے بعد آئی ہے۔

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں　　دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اکبر کے دل پر کم و بیش ۴۰ برس تک (۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۱ء تک) کیا گزرتی رہی اور کیوں گزرتی رہی؟ یہ اصل سوال

۱؎ چند جستہ جستہ اشعار اس کلیے سے مستثنا ہیں جہاں اکبر محض بھکڑپن پر اتر آئے ہیں۔ ط۔ ل

ہے اور اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ اول ان حالات کی صورت میں جو ۱۸۵۷ء کے دوران اور اس کے بعد ہندستان میں پائے جاتے تھے اور پھر ان تحریکوں کی صورت میں جو اسی دوران اور اس کے بعد یک وقت اور یکے بعد دیگرے ردعمل کے طور پر ہندستان کی خاک سے اٹھیں ۱؎

"ہندستان میں برطانوی راج کے تاریخی صفحات پر اگرچہ تباہ کاری کے سوا کوئی اور داستان نظر نہیں آتی لیکن انگریز کی قوت تاریخ کے بے رحم ہاتھوں میں اوزار کی طرح کام کر رہی تھی" (مارکس کیپٹل میں)

تاریخ کے بے رحم ہاتھوں نے انگریز کے خون آلود ہاتھوں کو اوزار کی طرح استعمال کر کے جو کام لیا اس کا حاصل تو بہت دیر بعد نظر آنا شروع ہوا پہلے تو تباہ کاری کے زہریلے پھل ہی ملے۔

مقامی جاگیرداروں کے زوال نے کسانوں کو خوش حالی نہیں بخشی بلکہ انھیں اور نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کاشتکاری پرانے خود کفایتی نظام کے دائرے سے نکل کر تجارتی لائنوں پر چل پڑی تھی کہ اسے بار بار خوف ناک دھچکے کھانے پڑے۔ قحطوں کا سلسلہ، آبپاری کا انتظام درہم برہم ہونا۔ مالکوں کا بدلتے رہنا۔ فوجی افراتفری۔ لگانوں کی بھرمار زرعی پیداوار کا کم قیمت رہ جانا اور اس کے علاوہ سب سے بڑی مصیبت یہ کہ ہندستانی دستکاری کی تباہی، خاص طور سے کپڑے اور نیل کی صنعت کی بربادی نے دستکاروں کو بھی زمین کی پیداوار پر بوجھ بنا دیا جس سے پرانے کاشت کار اور نئے کاشت کار طبقے کی کمر اور بھی ٹوٹ گئی۔

جب دیہات اور قصبات میں تباہی اور افراتفری کا یہ دور دورہ ہو اس وقت زمیندار طبقے اور معمولی بیوپاری طبقے کی کیا حالت ہوگی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پرانی دنیا لٹ رہی تھی اور اس کے ملبے سے نئی دنیا جنم نہیں لے رہی تھی۔ ماضی بعید کی یادیں خوشگوار تھیں، حال دردناک تھا، مستقبل نامعلوم اور گھپ اندھیرا

مغربی کل نے مجھ کو پیسا ہے میرا چرنا ہے اور کلیسا ہے

۱؎ جو حضرات اس موضوع کا اور خاص طور سے اس زمانے کے ہندستانی ردعمل اور تاثرات کا تفصیلی جائزہ حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے میں ذیل کی چند کتابیں تجویز کروں گا جو اکبر اور ان کے دور کو سمجھنے میں میرے لئے شمع راہ ثابت ہوئی ہیں۔

(۱) کارل مارکس کے خطوط ہندستان پر (K. Marx)

(۲) India Today (R. P. Dutt)

(۳) India struggles for freedom (ہیرن مکرجی)

(۴) تاریخ ہند .... آر، سی، مجمدار

(۵) " .... ڈاکٹر تاراچند

(۶) حیاتِ جاوید .... مولانا حالی

(۷) مسلمانانِ ہند کا روشن مستقبل ..... مولانا طفیل احمد منگلوری

(۸) حیاتِ شبلی .... سید سلیمان ندوی

(۹) ہندستانی قومیت (جلد دوم و سوم) ..... ڈاکٹر سید عابد حسین

(۱۰) اسبابِ بغاوتِ ہند .... سر سید احمد خاں

(۱۱) ابن الوقت .... ڈاکٹر نذیر احمد

اس زمانے میں حاکم انگریزوں کا رویہ تعلیم یافتہ ان پڑھ، عوام اور خواص ہندستانیوں کے ساتھ کس قسم کا تھا۔ اس کے لئے وارن ہسٹنگز یا لارڈ ڈلہوزی کے "کارنامے" پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ جب لارڈ رپن نے البرٹ بل کے ذریعہ ایک سماجی اصلاح کی کوشش کی اور انگریزوں اور ہندستانیوں کو قانون کی نظر میں یکساں سمجھنے کا ابتدائی قدم اٹھایا تو بااقتدار اور سرمایہ دار انگریزوں کی طرف سے طوفان برپا ہوگیا اور رپن کا اصل مشن ناکام کر دیا گیا

یہ پہلا موقع تھا جب بمبئی، کلکتہ اور مدراس یونیورسٹیوں سے اور ان کے آس پاس سے ابھرنے والی نئی نسل میں کچھ ایسے لوگ بھی آگے آئے جن کے حوصلے بلند تھے اور جو کارلائل، مل، بنتھم اور آدم سمتھ کی کتابوں کو امتحان کی تیاری کے لئے نہیں بلکہ فرد کی آزادی اور قوم کی عزت کا مفہوم سمجھنے تک پڑھ چکے تھے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ ہندوؤں میں ایسے لوگ زیادہ تھے کیوں کہ ہندو درمیانی طبقے نے ہی نئے تعلیمی انتظام سے زیادہ فیض اٹھایا تھا اور انگریزوں نے ابتدا میں سرپرستی بھی ان کی ہی کی تھی۔ ان کے احساسات قریب قریب وہی تھے جو اکبر کے اس شعر سے ظاہر ہیں۔

نیشنل وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم   آ نیشنل عزت کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں

ٹھیک یہی دن تھے جب انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی اور ان ابھرتے ہوئے لوگوں کی جلد بندی ہو گئی جو انگریزی قانون کے دائرے میں رہ کر "نیشنل" وقعت حاصل کرنا چاہتے تھے اور زیادہ سے زیادہ اونچے عہدے اپنا حق سمجھ کر مانگتے تھے۔

مگر یہ مسئلہ صرف سیاسی نہ تھا۔ اس سے آگے کا اور اس سے زیادہ گہرا تھا۔ اور اس کا حل صرف اونچے عہدوں اور سیاسی طور پر "نیشنل وقعت" حاصل کرنے کی جدوجہد سے نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تہذیبی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں اصلاح، تجدید اور احیاء (Revivalism) کی تحریکیں شروع ہوگئیں جو ایک طرف انگریزوں کے جابرانہ نظام حکومت کی مدافعت اور مقابلے کی راہیں بناتی تھیں تو دوسری طرف مغربی تہذیب کی نئی قوتوں سے محدود تعاون کی صورتیں نکالتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں کچھ تو تعلیم یافتہ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی، کچھ انگریزوں کی جدید پالیسی کی بدولت، اور کچھ اس لئے کہ قوم نے انگریز کا زبردست اقتدار تسلیم کر لیا تھا اور اسی کے سائے میں رہ کر باعزت زندگی کی سبیل کرنی تھی، مسلمانوں میں بھی تقریباً اسی طرح کی نئی تحریکوں کا آغاز ہوا جن کی سطح کے نیچے یہی دو مقصد کارفرما تھے۔ بے لگام حکومت اور بے تحاشا دساوری تہذیب کے لئے مدافعت اور بچاؤ کی ایک دیوار قائم کرنا اور زندہ رہنے اور قدم جمائے رکھنے کے لئے محدود تعاون کی صورتیں بھی پیدا کرنا۔

لیکن جیسا کہ ہر نئی تحریک میں ہوتا ہے، یہاں بھی ہوا۔ جدید حالات میں جدید تر تحریکوں کو افراط اور تفریط کا سامنا کرنا پڑا۔ بنگال پر انی روشنی کے ترقی یافتہ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے لئے جو کام کیا تھا وہ کچھ دن بعد ہی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ برہمو سماج، برہمو سماج آف انڈیا، پرارتھنا سماج (بمبئی)، راناڈے کی سارو جنک سبھا اور ان سے الگ لوکمانیہ تلک کی دکن ایجوکیشنل سوسائٹی وغیرہ اصلاح، تجدید اور احیاء کے الگ الگ درجوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ باشعور اور قوم کے درد مند تعلیم یافتہ ہندوؤں میں خیالات کے جھکاؤ کے لحاظ سے تین صفیں قائم ہو گئیں۔ ایک میں وہ اعتدال پسند تھے جو مغرب کی نئی تہذیب کو اپنے یہاں کی سوسائٹی کے لئے قوت اور روشنی کا ایک سرچشمہ بنانا چاہتے تھے اور انگریزوں کی انتظامی مشنری میں ایک کارآمد اور اہم پرزہ بن کر کام کرنا چاہتے تھے۔ دوسری صف ایسے لوگوں کی تھی جو انگریز کی معاشرتی، تہذیبی اور انتظامی پالیسی سے تو ہم آہنگ ہونے کو تیار نہ تھے مگر قوت کے نئے خزانوں سے فیض اٹھاتے ہوئے اپنی قدیم تہذیب اور قدیم تاریخ اور قدیم تعلیم میں ضرور اصلاح و ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ تیسری صف مذہب، تہذیب اور سیاست میں انتہا پسندوں کی صف تھی جو جدیدیت کی گاڑی میں اس کے شاندار ماضی کا گھوڑا باندھنا چاہتے تھے اور اس طرح انگریز کی دہری بخشش کی پالیسی کو نفرت سے دیکھتے تھے۔ اسے میٹھا زہر سمجھتے تھے اور سیاسی محاذ پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو رضامند نہ تھے۔

تیسری صف کے انتہا پسند لوکمانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے، اور سوامی دیانند سرسوتی کے گرد جمع ہو گئے جو ماضی کے جرأت مندانہ ستقبل کی جنگ کرنے کا فی سمجھتے تھے اور قدیم سے قدیم تر تہذیب، تاریخ اور تعلیم کو قوم کے زندہ اور گرم رکھنے کا سبیل سمجھتے تھے اور ہر جدید ادارے اور جدید وضع کو نقالی اور زمانہ سازی سمجھ کر نفرت و تمسخر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

تقریباً اسی طرح کی تقسیم ۱۸۵۷ء کے بعد درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ پہلی صف میں سرسید، امیر علی اور حالی کا نام لیا جا سکتا ہے، دوسری میں شبلی کا اور تیسری صف میں مولانا محمود اسیر مالٹا سے لے کر اکبر تک مختلف حالات کے لوگ آتے ہیں جو سرسید کی مصلحانہ کوششوں کو بھی صرف اس وجہ سے نہ سراہ سکتے تھے کہ ان کے خیال میں یہ بات بھی برطانوی شہنشاہیت کے تہذیبی مقصد کی ایک کڑی تھی۔

کہا کسی نے یہ سید سے آپ اے حضرت — نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں
جواب انھوں نے دیا ہم ہیں پیرو قرآں — ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں
جواب حضرت سید کا خوب ہے اکبر — ہم ان کے قول درست و بجا کو مانتے ہیں
و لیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر — خدا کو اور نہ فرق دعا کو مانتے ہیں
زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں
وہ صرف قوت فرماں روا کو مانتے ہیں

"قوت فرماں روا" کے خلاف جوان بزرگوں کا صالح اور ایماندار غصہ تھا وہ افراط میں داخل ہو گیا اور اس نے ان کے دل و دماغ کو ایسا متاثر کیا کہ وہ ہر نئی چیز کو اسی کی نگاہ سے دیکھتے اور اسی کی طرح مشتبہ سمجھنے لگے اور "کتاب دل" کو رہنما ماننے پر قناعت کر گئے۔

کتاب دل مجھے کافی ہے اکبر درس حکمت کو — میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا

اکبر اگر حالی اور شبلی پڑھنے کے ساتھ ساتھ (Spencer) اور (John mill) اور (James Smart mill) کا مطالعہ بھی کرتے جاتے تھے تو شبلی کی طرح ان پر یہ حقیقت کھلتی کہ جدید تعلیم کی خامیاں کہاں پوشیدہ ہیں۔ برطانوی سیاست کی جڑیں کونسے مفاد کا کام کر رہے ہیں اور جدید فلسفہ کن گہرائیوں کا حامل ہے لیکن جو دیو بند کی ٹریجڈی تھی وہی اکبر کی بھی تھی۔ ان کی نگاہ مظاہر تک پہنچ کر رک گئی۔ اندرونی حقائق کی کھوج نہ کر سکی۔

اس کا سبب کچھ یہ بھی ہے کہ مظاہر بجائے خود بڑا دردناک منظر پیش کر رہے تھے اور ان کی تاریکی میں آگے کا راستہ ٹٹولنا بہت مشکل تھا اور یہ پتہ چلانا اور بھی مشکل کہ ماضی کو مستقبل سے کس طرح جوڑا جائے۔ بقول آل احمد سرور

"اکبر نیک نیت بھی تھے اور تھوڑے سے تنگ نظر بھی۔ طوفان آتے دیکھا تو سمجھے کہ سب کچھ فنا ہو جائیگا یہ بھول گئے کہ اس کے اثر سے زمین بھی زرخیز ہو جائے گی۔"

جدید تعلیم آئی تو زیادہ تر ایسے لوگوں کے ہاتھوں آئی جنھوں نے روشن خیالی اور آزادہ روی کے بجائے قوم سے بے رخی ماضی سے بے تعلقی اور بااقتدار اجنبیوں کی نقالی پر زیادہ زور دیا۔ اسے اکبر انگریزی کی دوسری ساخت کی توپ نہ سمجھتے تو کیا سمجھتے۔

توپ سرکی پروفیسر پہنچے — جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

....

جو بات بتائی جاتی ہے وہ گویا فقط بازاری ہے   جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اور تعلیم نسواں کے حامیوں میں بھی کثرت ایسے لوگوں کی تھی جو تعلیم یافتہ لڑکیاں تیار کر رہے تھے قوم کا معیار علم اونچا کرنے کے لئے نہیں بلکہ تعلیم یافتہ عہدے دار نوجوانوں کے جدید ڈرائنگ روم سجانے کے لئے۔ سو اکبر کا ان سے چڑنا ضروری تھا۔

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی   یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

چنانچہ تعلیم یافتہ خواتین مشرق کو آرائش کے سوا اگر کچھ اور معروفیت تھی تو کلب اور سوسائٹی کی۔ اکبر کے نزدیک پرانے قسم کی گھریلو عورت مجسمہ تھی ان تمام خوبیوں کا جو ایک اچھی بیوی، اچھی ماں اور اچھی بیٹی میں پائے جاتے ہیں۔ اخلاق، محبت، پاکیزگی اور خدمت۔ اس لئے وہ چراغ خانہ نظر آتی تھی اور جب اس چراغ میں مغربی تہذیب اور جدید تعلیم کی گیس پہنچ جاتی تھی تو گھر میں اس کا سمانا مشکل تھا۔

حامدہ چمکی نہ تھی مغرب سے جب بیگانہ تھی   اب ہے شمع انجمن، پہلے چراغ خانہ تھی

لیکن اکبر اس سے آگے نہ دیکھ سکے، وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ قدیم تعلیم اور قدیم رسوم سے بھی تو قوم کا مداوا ہونے والا نہیں ہے۔ عورت کا جو آئیڈیل ان کے سامنے تھا اسے انھوں نے مشرقیت کا نام دے دیا۔ مگر عورت کی یہ "مشرقیت" نئے حالات میں مفلوج ہوئی جا رہی تھی۔ عورت کو محض گھر کی خدمات بجا لانے والی مشین کا نئے سماجی حالات میں پست ہو جانا یقینی تھا۔ چلمن کے پیچھے جس ناموس کو وہ محفوظ سمجھ رہے تھے جب وہ بھی غیر محفوظ نظر آیا تو وہ درد اور احساس شکست سے چیخ پڑے۔

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی   سپر بنیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

"ہندوستانی عورت دور تنزل میں جہالت، بیماری اور علاج کے بے جا قیود کی وجہ سے ایک اعصابی مزاج کی دبی دبائی مخلوق بن کر رہ گئی تھی۔ انگریزی تہذیب نے اسے بغیر ان تحفظ کی قوتوں کے، جو انگریز عورتیں رکھتی ہیں۔ گوشۂ عافیت سے باہر کھینچ کر زندگی کی مشکلوں اور تحریصوں میں ڈال دیا۔ صرف اس کا پردہ ہی نہیں توڑا بلکہ وہ فصل جو ایشیائی مردوں اور عورتوں میں ہمیشہ رہا ہے دور کر دیا۔ صرف اسے گھر سے نکالنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ کلب میں لے جا کر ناچنے کے لئے کھڑا کر دیا۔ اس "آزادی" کے ناگوار نتائج کا رد عمل اور زیادہ افسوس ناک تھا۔ مغرب زدہ عورتوں کی مثال نے عام طور پر ہندوستانیوں کو عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی مصلحانہ اور ذمہ دارانہ تحریکوں سے بدظن کر دیا اور ان کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی۔"

ڈاکٹر عابد حسین نے ہندوستانی سماج کے طبقاتی فرق کو مد نظر رکھے بغیر اگرچہ "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس طبقے کا ذکر ہے گنتی میں کم ہونے کے باوجود ہندوستان میں انگریزی دساوری تہذیب کا نمائندہ اور حامی طبقہ تھا اور اکبر اسی کا نام لے کر لڑکیوں کی تعلیم پر برستے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی   ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین   پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

جس سین کو اکبر نے دیکھا اور جسے وہ مغربی تہذیب اور جدید تعلیم یا تعلیم نسواں کا نمائندہ سمجھے وہ نمائندہ و معتادی نہیں۔ اگر اکبر بات کو اکبر پہلے ہی سمجھ جاتے تھے تو بعد میں اپنے رویہ کی یہ کہہ کر اصلاح نہ کرتے۔

انجن آیا نکل گیا زن سے   سن لیا نام آگ پانی کا!
بات اتنی اور اس پہ یہ طومار   غل ہے یورپ کی جانفشانی کا

علم پر اگر سکھائیں ہمیں   تب کریں شکر مہربانی کا

جدید تعلیم کے علاوہ جس چیز کو وہ زیادہ بڑا خطرہ سمجھ رہے تھے وہ تھی جدید انگریزی تہذیب جو جھنڈے لک سے سات ہزار میل پار کر چکنے کے بعد ادھر کچھ انگریز افسروں اور ان کے حواریوں کے دامن میں پل کر اپنی تاثیر بدل چکی تھی۔ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہو کر رہ گئی تھی اور با اقتدار انگریزوں سے ظاہری قرب اور ممتاز عہدے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی۔

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی   اونٹ پر بیٹھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

وہ اس "امی ٹیشن" اور دکھلاوے پر خار کھاتے تھے جو خود اندر سے خالی تھا اور ماضی سے صرف اس لئے بیزار کہ ماضی سے بے خبر بھی تھا اور اسے بے اقتدار بھی سمجھتا تھا۔

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے   بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی   یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

انھیں ایسے مجبور مغربی نقادوں کے مقابلے میں وہ مشرقی یعنی درمیانی طبقے کے ہندستانی مسلمان اور ہندو اچھے لگتے تھے جو اپنے مستقبل کو صرف اس لئے قربان کئے دے رہے تھے کہ اپنے ماضی سے شرمندہ نہ تھے، اس سے بے خبر نہ تھے، لالچ نے انھیں اندھا نہ کیا تھا اور جو اپنی تمناؤں کے گرد اونچی چہار دیواری کھڑی کر کے انھیں محفوظ سمجھ رہے تھے۔

یہیں موقع ہے کہ اکبر کی طنزیہ شاعری کے ایک اور تیکھے پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔ یہ ہے ان کا اپنے طبقے اور اپنے آئیڈیل کو بے نقاب پیش کرنا۔

بالزک کی طنز نگاری کی تعریف کرتے ہوئے ایک موقع پر اینگلس نے لکھا ہے کہ اس کی دلی ہمدردی تو قدیم شرفا اور نوابین کے زوال آمادہ طبقے کے ساتھ ہے اور وہ خود کو انھی سے وابستہ سمجھتا ہے لیکن جب طنز کرنے پر آتا ہے تو ان لوگوں کو اصلی روپ میں پیش کرتا ہے اور انھیں بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے اور نئے زمانے کے بے تہہ لوگ جن سے اسے دلی نفرت ہے اور جن کا وہ طبقاتی مخالف ہے ان کے کردار کو جوں کا توں پیش کرتا ہے اور محض اپنے جذبات کی رو میں نہیں بہتا۔ اکبر کے طنز میں، خاص طور سے سیاسی اور تہذیبی زندگی کے جن عناصر کو وہ اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں، ان پر طنز کرنے میں اکبر نے اکثر اسی حقیقت نگاری کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ ان کے ہاں حقیقت اتنی گہرائی کے ساتھ نہیں پائی جاتی تاہم اس کا شائبہ ضرور ہے۔

پاس کالج کے جو ہیں، ووٹ طلب کرتے ہیں   پاس مسجد کے جو ہیں طاعت رب کرتے ہیں
غمزہ ہائے عجمی کے وہ ہوئے ہیں کشتہ   یہ رخ سادگیٔ طرز عرب کرتے ہیں
ان کو ہے لینڈ و وسکی کی ضرورت اور یہ   رفع پانی سے فقط خشکیٔ لب کرتے ہیں
چھیلتے وہ ہیں کہ اغیار سے جوڑیں رشتہ   یہ ہیں سمٹے ہوئے اور حفظ نسب کرتے ہیں
وقت کو دیکھ کے اب آپ ہی انصاف کریں   وہ ستم کرتے ہیں یا آپ غضب کرتے ہیں

....

مولوی ہرگز نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے   گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

....

پردے میں ضروری ہے طوالت بے حد   انصاف پسند کو نہیں چاہیے ہٹ

تشبیہ بری نہیں اگر میں یہ کہوں　　بیگم تو ہے پیچوان، لیڈی سگرٹ

....

گرجائیں لاٹ صاحب، منبر پہ شیخ صاحب　　بدمعو فلاقی کے کرے بھی سٹر رہے ہیں

....

سید اٹھے جو گزٹ لے کے لاکھوں لائے　　شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

....

اکبر کو تہذیب جدید میں ایک اور خطرے کا پہلو یہ نظر آرہا تھا کہ جن سماجی قدروں کے وہ عادی تھے وہی قدریں بدل رہی تھیں۔ عیب، ہنر اور ہنر عیب ہوا جا رہا تھا۔ جاگیرداری عہد کے اخلاق، مروت، براہ راست باہمی لین دین، آدمی کا آدمی سے سیدھا سماجی رشتہ ٹوٹ رہا تھا اور اس کی جگہ سکے اور بازار کا رشتہ قائم ہونے لگا تھا۔ یہ اچنبھے کی بات تو تھی ہی لیکن ان لوگوں کے لئے جو خود قدیم وضعداری کے پاسبان تھے دردناک حقیقت بھی تھی اور وہ قدروں کی اس تبدیلی کا خیر مقدم کسی حال میں نہیں کر سکتے تھے شیکسپیئر سے لے کر آج تک کسی ادیب نے جو جاگیرداری کی مخمور اور سرپرستانہ آنکھیں دیکھ چکا ہو۔ آدمی آدمی کے درمیان رشتے کی اس تبدیلی کو تحسین اور استقبال کی نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔ جو کل فنکار تھا وہ آج ددکاندار بنا جا رہا تھا۔ اسے سماج میں اپنا یہ حیثیت پہلی نظر میں پسند نہ آئی اور اس نے مغربی تہذیب کو اس وجہ سے کوسا کہ وہ بے دردی کا ایک ایسا نظام زندگی ہے جو استاد اور طالب علم کے مقدس رشتے کو بھی بازار کی جنس بنا ڈالتا ہے جو شاعری اور موسیقی کو فنی لطافت کے لئے نہیں بلکہ کھلے بازار میں بیچنے کے لئے خریدتا ہے۔

اکبر نے اس پہلو سے بھی انگریز کو اور اس سے متعلق انگریزی تہذیب کو زہریلے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض　　جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
یا اب ہے یہ زمانہ کہ لڑکا پس از سبق　　کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

....

اکبر نے کہا شن لو یاد رہے اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں　　یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

....

عشاق کو بھی مال تجارت سمجھ لیا　　اس قہر کو ملاحظہ للہ کیجئے
بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں　　کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

....

اور سماجی و اخلاقی قدروں کے بدل جانے سے فن اور ادب کی روایات بھی بدلی جا رہی ہیں۔

مغرب نے خورد بین لگا کے کمر ان کی دیکھ لی　　مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا

....

آخر یہی ہوتا ہے جیسے وہ مشرق کی شاعری، مشرق کا کردار، مشرق کی خصوصیت اور دراصل مشرقی سمجھتے تھے وہ تھا مذہب اور مذہب بھی وہ جو مذہب قدیم زمانے سے پایا جاتا تھا جو "کتاب دل" میں پڑھا جاتا تھا۔ فلسفی کو جس کا شعور کا سرا نہیں ملتا اور مغرب کی مادی [illegible] ذاتی ایک مغرب کی مادی قوت نے جس کی ساری روحانیت پہ پانی پھیر دیا۔ اکبر بذات خود کوئی مذہبی آدمی نہ تھے۔ [illegible] بھی ایسے پابند تھے۔ ارباب نشاط کے کوٹھوں پر گھومنے پھرنے سے بھی مانع تھے۔ ستار کے بھی

۔ روز مرہ کی زندگی میں بھی آزادہ روی کی تھی لیکن مذہب کے معاملے میں ان کی شاعری میں جو شدت پائی جاتی ہے اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ان کا خیال تھا کہ مذہب کے پرانے تصور سے وابستہ رہنے میں "مغربیت" کے تہذیبی، تعلیمی، سیاسی اور فکری طوفان کے بچاؤ کے لئے ایک بند وہ تیار ہو جاتا ہے اور اس بے حد شدید طوفان کا اقتدار، اس کا دبدبہ نظر میں کم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ان تصورات کی پسپائی جنھیں وہ "مشرقیت" سمجھتے تھے، بے ضرورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مذہب اور مغربیت کو انھوں نے بار بار ایک دوسرے کی ضد کے طور پر پیش کیا اس کی وجہ یہاں تلاش کی جا سکتی ہے۔

خدا کے باب میں کیوں آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں   خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

....

رات بنگلہ میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں   جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

....

مذہب کی یہ محبت صرف اذعانی اور روحی عقیدوں کا ہی مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ عبارت ہے پرانی پرسکون زندگی، انسانی ہمدردی، حیا، محبت، اخوت اور قومی آزادی سے۔ اکبر کے نزدیک مشرق، مشرقیت اور مذہب سب کا یہی ایک گڈمڈ تصور ہے اور جتنا جتنا وہ انگریز کے ظاہری اور باطنی عمل سے برافروختہ ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی مشرقیت یا مذہب یا قدیم نظام زندگی سے والہانہ محبت بڑھتی جاتی ہے اور جس قدر یہ محبت بڑھتی ہے اتنا ہی وہ انگریز کی سیاست سے بیزار ہوتے جاتے ہیں۔ یہ عمل ردعمل کا سلسلہ ہے جس نے اکبر کی شاعری کو ۲۰، ۲۵ برس اپنی گرفت میں رکھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر نے سوراج پارٹی پر طنز کیا۔ کونسلوں اور سرکاری کمیشنوں کو قبول کرنے والے ان کے تمسخر کا نشانہ بنے اور ان تمام لوگوں کو جو کچھ لے دے کر انگریز سے معاملے کرنے پر رضامند تھے اکبر نے قابلِ طنز سمجھا۔

کونسلوں میں سوال کرنے لگے   قومی طاقت نے جب جواب دیا

جس لیڈر کا وہ مذاق اڑاتے ہیں وہ یہی لیڈر ہے جو قومی ایجی ٹیشن کو استعمال کر کے صاحب بہادروں پر سکہ جماتا ہے اور اپنے لئے رعایتیں اور آسائشیں حاصل کرتا ہے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ   رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

....

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی   شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

....

انھیں تلک اور گاندھی جی اس وقت عزیز تھے جب ان کی پالیسی قومی تحریک میں گرم پالیسی سمجھی جاتی تھی۔

مدخولۂ گورمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا   اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

....

جب اعتدال پسندوں اور لبرلوں کی جماعت سلف گورنمنٹ مانگ رہی تھی اس وقت اکبر کی ذہنی انتہا پسندی یوں [illegible] رہی تھی۔

کام اس ملک میں ہو سلف گورمنٹ سے کیا   زہر کو ہضم کرے کوئی پیپرمنٹ سے کیا

سرکاری عہدے پر قائم رہنے اور اس سے پنشن پانے کے زمانے میں اکبر اس سے زیادہ کھل کر اپنی انتہا پسندی [illegible] سکتے تھے۔ ان کی انتہا پسندی کی تلوار کو غلاف جہاں ظرافت کا ملا وہاں اس نے دھار مذہب کی پائی۔ انھوں نے

مذہب کے نقطۂ نظر سے کافی کام لیا اور کلام کی تاثیر بھی بڑھائی۔

ان کے نزدیک جدید تعلیم اس لئے بھی معطون ٹھیری کہ اس سے مذہبی پختہ کرداری میں خلل پڑتا ہے۔

طفلِ دل محوِ طلسم رنگِ کالج ہوگیا — ذہن کو تپ آگئی، مذہب کو فالج ہوگیا

اور مذہبی اخلاق کے ماننے والے قدیم مشترکہ خاندانوں کے گھریلو تعلقات پر اثر پڑتا ہے۔

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مذہب اس لئے بھی انھیں عزیز ہے کہ وہ بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک رشتے میں پروکر دشمن کے مقابلے کے لئے تیار کرتا ہے اور قربانی کا جذبہ عطا کرتا ہے اور چونکہ نئی تہذیب اسے مٹائے یا اندر سے کھوکھلا کئے دیئے رہی ہے اس لئے وہ اور بھی قابلِ نفرت ہے۔

کر گئی کام نگاہ بت پرفن کیسا — تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا

....

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی — مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

حالانکہ مذہب میں ایمان یعنی بے بحث اعتقاد ہی ایسی چیز ہے جو اس شمشیر میں فولاد کا کام کرتا ہے۔

نہ ہو مذہب میں جب زور حکومت — تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

اور فلسفے کو مشین اس طرح دبا لیتی ہے کہ وہ بے جان رسوم کا ایک مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے — اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے

دین اور مشین کے تاریخی تعلق کو سمجھے بغیر اکبر نے دونوں کو ایک دوسرے کا حریف جانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر تو مشین کی ہما ہمی بڑھتی گئی، بمبئی میں پہلی جنگ کے زمانے اور اس کے بعد روئی کے کارخانے، مغربی یوپی میں شکر کے کارخانے اور بنگال میں پٹ سن کی صنعت پھیلنے لگی، علی گڑھ کالج قوم کی نگاہوں کا مرکز بنتا گیا، کونسلیں آباد ہونے اور سیدوں اور برہمنوں کی تقریروں سے گونجنے لگیں اور نئی زندگی کے دھندلکے سے مردانِ خردمند بھی برآمد ہونے لگے، اکبر کو اپنے جذبوں اور اپنی تمناؤں کی مستقل شکست کا سامان روز بہ روز زیادہ نظر آنے لگا۔ اکبر کی آوازیں جس طرح احتجاج سے غصہ پیدا ہوا تھا اور غصے سے نفرت اور بیزاری کے نعرے بلند ہوئے تھے، اب اسی آوازیں کراہ پیدا ہونے لگی۔ یہ کراہ تنہا اکبر کی نہیں تھی بلکہ ان تمام لوگوں کی کراہ تھی جو دیوبند کے ذریعے علی گڑھ کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، دین کے ذریعہ مشین کو پسپا کرنا چاہتے تھے اور قدیم جاگیرداری کے زنگ خوردہ حربوں کی مدد سے جدید پُرپیچ سرمایہ داری تہذیب کو شکست دینا چاہتے تھے۔ اکبر کی آخری عمر انہی کراہوں کے لئے وقف ہوکر رہ گئی۔

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا — نقاب الٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کر ہی لے گا مرا ہوا کیا

....

تائیدِ وضعِ ملت و دیں کی کروں گا میں — چاہے زمانہ لاکھ ہنسے مجھ غریب پر

....

وعظ کالج میں جو دیے آتے ہیں اکبر جاکر — کیا یہ گرتی ہوئی دیوار کو تھام آتے ہیں

گرتی ہوئی دیوار کو اپنا پشتہ بنا کر اکبر کو بالآخر یہی دن دیکھنا تھا۔ اگر جدید سرمایہ داری ہتھیاروں کے مقابلے کے لئے انھیں جدید تر صنعتی ہتھیار مل جاتے، اگر وہ ماضی کو لاش سمجھ کر سینے سے نہ لگائے رہتے بلکہ اس کی صالح روایتوں کو ایک زندہ امانت سمجھ کر حفاظت کے لئے نئے سروسامان کی تلاش کرتے اور کچھ دن اور جیتے رہتے تو انھیں اپنے طبقے کے وضعدار مگر زخم خوردہ "شرفا" کی لے میں لید

...شکست کی آواز بلند نہ کرنی پڑتی۔

شعراکبر کو مجبور کیا نگار انقلاب یہ اسے معلوم ہے غلطی نہیں آئی ہوئی

...بالآخر یہاں تک خوف زدہ تھے۔

آثار کہہ رہے ہیں کوش دل حزیں میں جیتا رہا تو تو بھی مل جائے گا انھیں میں

...وں نے اس پر مجبوتہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ عہد جدید کے فرزند جو چاہیں کریں مگر

ہاں ایک حق بندۂ عاجز کا رہے یاد اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

...ن اس شرط پر بھی مجھوتہ انھیں مشکل نظر آیا اور بالآخر انھوں نے سینے پر پتھر رکھ کر اپنی شکست کا اعتراف اور آنے والے زمانے
...ی نئی چمن بندی کا دکھی دل سے اعلان بھی کر دیا۔

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

....

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کی نہ حس ہوگی نہ غم ہوگا ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے۔

اردو شاعری میں ماضی قریب اور ماضی بعید کا نہ ایسا عاشق پیدا ہوا اور نہ ایسا ہنسا ہنسا کر رونے والا اور نہ ایسا کوئی مرثیہ لکھا گیا۔

لیکن اکبر نے طنز نگار اور قدامت کے مرثیہ گو کا ہی فرض ادا نہیں کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے مختلف رجحانات کی بھی عکاسی کی۔ قدیم کی حمایت میں اور جدید کی مخالفت میں اس درجہ شدت سے کام لیا کہ لوگوں کو افراط و تفریط، حد سے زیادہ اور حد سے کم، نقل اور اصل کے درمیان تمیز کرنے کی طرف توجہ ہوئی اور ماضی سے بیزاری کا وہ رجحان کم ہوا جو ...مجبور سے ہیں اور جدید کی اندھی تقلید سے پیدا ہوا تھا اور ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر لپکنے والوں کے لئے ہچکچاہٹ کا ایک سامان تیار ہو گیا۔ یہی ان کا سماجی رول ہے۔ اکبر اگر نہ ہوتے تو اکبر کی نقل کرتے کرتے اقبال کو اتنی آسانی سے نیا راستہ کیسے ملتا۔

سردار الہام کی تازہ تصنیف

آنچلوں کے سائے

(ناولٹ)

● متوسط طبقہ کی ذہنی کش مکش ● حسن و عشق کا روح پرور امتزاج ● زندگی کی ہمہ رنگی کی جیتی جاگتی تصویریں

ٹائٹل دیدہ زیب رنگین
قیمت ڈیڑھ روپے

ملنے کا پتہ :۔ قادری بک ڈپو۔ ۳۰ نور منزل محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

ڈاکٹر سلامت اللہ

ناول نگار پریم چند

ناول نگاری کی دنیا میں پریم چند کا درجہ بہت اونچا ہے۔ وہ اردو اور ہندی کے ترجمانی کے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ دنیا کی بڑی زبانوں کے ناول لکھنے والوں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ یورپ کی بعض زبانوں مثلاً انگریزی، روسی، چیک وغیرہ میں ان کے فن کی جانچ پرکھ کی گئی ہے اور اسے بہت سراہا گیا ہے۔

پریم چند نے کل تیرہ ناول لکھے ہیں۔ ان میں سے آخری ناول "منگل سوتر" ادھورا ہے۔ وہ اس کے صرف چار باب ہی لکھ سکے تھے کہ ان کی زندگی کا چراغ جو توانائی کی کمی سے بہت عرصے سے ٹمٹما رہا تھا گل ہو گیا۔

پریم چند نے جو غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کا راز کیا ہے؟ پریم چند اپنے زمانے اور ملک کے سچے ترجمان ہیں۔ وہ جس فضا میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے' اس میں ہندستان کا دل دھڑکتا ہے اور ضمیر بولتا ہے۔ دیہات جس میں ہمارے ملک کے بیشتر لوگ زندگی بسر کرتے ہیں' پریم چند کی شخصیت کے لئے تانا بانا فراہم کرتا ہے اور کسان ان کے شعور اور احساس کو جگاتا اور سنوارتا ہے۔ پریم چند نے گاؤں کی زندگی کو ایک فلسفی کی عینک سے بے تعلق ہو کر نہیں دیکھا اور اس کی ترجمانی کرنے میں خیالی پلاؤ نہیں پکایا بلکہ وہ خود اس زندگی میں سے ہو کر گزرے اور انھوں نے اس کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی۔ انھوں نے خود محسوس کیا تھا کہ غریب کسان کس طرح ہر آن زہر کے گھونٹ پیتا ہے۔ وہ قدم قدم پر کن مجبوریوں اور محرومیوں سے دو چار ہوتا ہے۔ اس کی کیا آرزوئیں اور تمنائیں ہیں' اس کے دل میں کیا حوصلے اور ولولے دبے ہوئے ہیں اور وہ اپنی بے کیف اور پژمردہ زندگی کو کس طرح بدلنا چاہتا ہے۔ غرض پریم چند ایک ناول نگار کے ناتے ہندستان کے ادب میں پہلی بار اس کسان کے نقیب بن کر آگے بڑھے جو مظلوم تو ہے لیکن پست ہمت نہیں' جو توہمات کا شکار اور گھناؤنی رسموں کا قیدی تو ہے لیکن انسانیت سے یکسر بے بہرہ نہیں جو بڑی سے بڑی ذلت جھیل جاتا ہے لیکن بپھر بھی سکتا ہے اور اور اپنی قسمت کو خود بدلنے کا اہل بھی ہے۔ یہ پریم چند کا کمال ہے اور یہ ہندستانی ادب کو ان کی بڑی دین ہے کہ انھوں نے اس کسان کو جسے ہمارے ادیبوں نے اب تک قابل اعتنا نہ سمجھا تھا' ادب میں اس کا جائز مقام بخشا۔ پریم چند کی آواز دراصل کسان کی آواز ہے اور وہ آواز آج اردو اور ہندی ادب ہی میں نہیں بلکہ ہندستان کی تمام زبانوں کے ادب میں گونج رہی ہے۔

پریم چند کے ناولوں میں ہمیں ان حالات کی جھلک نظر آتی ہے جو بیسویں صدی کے ہندستان میں بدیسی حکومت اور سامراجی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ جنتا ان حالات سے نڈھال اور بے چین ہو رہی تھی۔ ہندستانی سماج کے مختلف طبقوں میں کش مکش تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ وہ طبقے جو سامراج کے بل بوتے پر اقتدار کے مالک بن بیٹھے تھے' اپنے ذاتی مفاد کی حفاظت کیلئے عوام کو کچل رہے تھے۔ چنانچہ آزادی کی جنگ جو بدیسی حکومت کے خلاف لڑی جا رہی تھی' کہیں کہیں طبقاتی جدوجہد کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ زمینداروں اور کسانوں میں' ساہوکاروں اور قرض داروں میں' سرکاری افسروں' پولیس والوں اور عام لوگوں میں' مل مالکوں اور مزدوروں میں' غرض سماج کے مختلف گروہوں میں جگہ جگہ تناؤ بڑھ رہا تھا اور کہیں کہیں اور کبھی کبھی ان میں کھلم کھلا ٹکر بھی ہو جاتی تھی۔ پریم چند نے ان پیچیدہ سماجی مسائل سے آنکھیں نہیں چرائیں۔ دکھی انسانیت کی کراہ اور چیخ پکار سے کان بند نہیں کئے' جابر و ظالم قوتوں سے ڈر کر اپنی زبان پر تالا نہیں لگایا۔ بلکہ انھوں ...... نے ایک حساس دل اور روشن دماغ کے ساتھ

صورت حال کو سمجھنے اور فنی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

ہر ناول افراد کے عمل اور ردعمل سے عبارت ہوتا ہے۔ یہ افراد ایک ایسے سماج کے پس منظر میں کچھ کرتے کراتے اور چلتے پھرتے ہیں جس میں ایک کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہے، جس میں ایک کے لئے جو چیز آب حیات کا درجہ رکھتی ہے وہی دوسرے کے لئے زہر ہلاہل ہے۔ موجودہ دور میں سماج اور افراد کا باہمی توازن ختم ہو گیا ہے۔ اس صورت حال میں ناول نگار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے ناول کو ترتیب دے۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ سماج میں تبدیلی کا رخ کیا ہے۔ ناول نگار اپنے کرداروں کے ذریعے یہ کام انجام دیتا ہے۔ ان کرداروں کے راستے میں جگہ جگہ پگڈنڈیاں اور بھول بھلیاں ملتی ہیں اور کرداروں کے سامنے صحیح راستے کے انتخاب کا سوال آتا ہے۔ یہ انتخاب ناول نگار کی نظر اور فکر کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ نظر اور فکر سماج کی ابھرنے والی طاقتوں کی بھی ترجمانی کر سکتی ہے اور ڈوبتی ہوئی قوتوں کی بھی ہمنوا ہو سکتی ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر بھلے اور برے، کھوٹے اور کھرے فنکار کی تمیز کی جا سکتی ہے۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو پریم چند کے ناولوں میں ان کی ترقی پسند فکر اور وسیع نظر کا کافی ثبوت مل سکتا ہے۔ ان کے کردار سماجی اور سیاسی بے راہ روی اور ناانصافی کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھاتے ہیں۔ سامراجی حکومت، نوکر شاہی اور اس کے پٹھوؤں کے ظلم و تشدد کا مقابلہ کرتے ہیں اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ پریم چند اپنے کرداروں کے ذریعے سماجی حقیقت کی ہو بہو تصویر کھینچ کر ہی مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ وہ اس کے ارتقائی عمل کو بھی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حقیقت انسانی جد و جہد کی بدولت کس طرح تبدیل ہو رہی ہے۔ لیکن وہ حال کے آئینہ میں مستقبل کی صرف ایک دھندلی سی اور ادھوری تصویر دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھا کہ ان کی فکر و نظر دیہاتی زندگی کی حدود میں گرفتار ہو کر رہ گئی۔ وہ اس قوت کا صحیح احساس نہ کر سکے جو ہندستان میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی شکل میں رونما ہو رہی تھی۔ پریم چند کی اس کوتاہی کی وجہ سے ان کے ناولوں میں سماجی حقیقت پوری طرح ہمارے سامنے نہیں ابھرتی۔ سماج کے بدلنے میں جو محنت کش مزدور طبقے کا رول ہے وہ نظر انداز ہو جاتا ہے۔ لیکن غالباً پریم چند کی یہ کوتاہی بھی ان کے حق میں اس لحاظ سے مفید ثابت ہوئی کہ انھوں نے انجانے میدان میں چھلانگ لگانے کی [illegible] خطرہ تھا کہ وہ محض تخیل کے بل بوتے پر سماجی ارتقاء کی ایک بے بنیاد عمارت کھڑی کر دیتے جیسا کہ [illegible] زمانے میں کیا ہے اور اس طرح ان کی تصنیفات یقین آفریں ہونے کے بجائے بے اثر ہو کر رہ جاتیں۔

آیئے، اب ذرا پریم چند کے چند ناولوں کا اس خیال سے جائزہ لیں کہ ان میں جو حقیقت ابھرتی ہے [illegible] کی ہے۔

"بازار حسن" پریم چند کے ان ناولوں میں سے ہے جن میں ان کے اصلاح پسندانہ رجحان کی [illegible] انھوں نے اس تہذیب کے گھناؤنے روپ کو بے نقاب کر کے دکھایا ہے، جو عورت کی عصمت کو بھی دوسری تجارتی چیزوں کی طرح خرید و فروخت کی جنس سمجھتی ہے۔ اس کا بھی بازار میں اسی طرح مول بھاؤ ہوتا ہے جس طرح کھانے پینے اور استعمال کی دوسری چیزوں کا۔ اس ناول میں ہمارے سماج میں اس عورت کے دکھ درد اور بے عزتی کی دل ہلا دینے والی داستان ہے۔ جو ماں کی شکل میں انسانی زندگی کو جنم دیتی ہے۔ بہن کے روپ میں ایثار اور قربانی اور انسانی صفات کی دیوی ہے اور بیوی کی حیثیت سے محبت کا مجسمہ، زندگی کی رفیق اور غمخوار ہے۔ یہاں سماج کی ان کھوکھلی قدروں پر [illegible] جو انسان کو حیوان بنا دیتی ہیں۔ لیکن اس وقت پریم چند کے سامنے اس صورت حال سے [illegible] اس لئے ناول کی ہیروئن آخر کار ایک آشرم میں جا کر پناہ لیتی ہے۔

"گوشۂ عافیت" پریم چند نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان لکھا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے کے

ر یہ تمام دنیا ایک بڑے اقتصادی سنکٹ میں مبتلا ہو گئی تھی اور ہندستان میں سامراجی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے یہ سنکٹ اور ی زیادہ گہرا تھا۔ ترک موالات کی سیاسی تحریک عام تباہی کے احساس کا ایک عملی روپ تھی۔ اس پس منظر میں پریم چند نے ندستان کی ادبی تاریخ میں پہلی بار دیہاتی کسان کی بغاوت کو اس ناول میں پیش کیا ہے۔ اس میں ہندستانی سماج کے ان تمام عناصر بے نقاب کیا گیا ہے جو کسانوں کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیتے ہیں اور جب کسان متحد ہو کر اس کی مخالفت کرتے ہیں تو انھیں ظلم تشدد کے ذریعے کچل دیا جاتا ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے بہت صفائی کے ساتھ دہشت انگیزی اور تشدد کے خلاف عوامی اتحاد ور جد و جہد کی ضرورت کو پیش کیا ہے۔ ناول کا ہیرو بلراج روسی انقلاب سے انسپریشن حاصل کرتا ہے اور وہ کسانوں کے اندولن کا لیڈر بن جاتا ہے۔ اگرچہ اس ناول میں دیہات کی زندگی کی ایک سچی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن آخر میں مسائل کا جو حل پیش کیا گیا ہے وہ حقیقت کے بجائے آدرش پرستی پر مبنی ہے۔ ناول کے تمام برے کرداروں کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور وہ ایک دم بھلے مانس بن جاتے ہیں۔

ترک موالات کی تحریک کی ناکامی نے تحریک کی کمزوریوں کو اجاگر کیا۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں ان کی تصویر کھینچی ہے۔ "رنگ بھومی" میں جو کہ سنہ ۱۹۲۷ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے بیچ میں لکھا گیا ہے۔ ہم ایک ایسے لیڈر سے دوچار ہوتے ہیں جو عوام کو دھوکا دے کر اپنا الو سیدھا کرتا ہے اور عوام کے ساتھ غداری کرتا ہے۔ اس قسم کے کردار پریم چند کے بعض دوسرے ناولوں مثلاً "کایا کلپ" "غبن" اور "کرم بھومی" میں بھی ملتے ہیں۔ یہاں ان کی کردار نگاری، فنی حسن اور اثر سے بھرپور ہے۔ سماج کے اس کوڑھ کے خلاف پریم چند حقارت اور نفرت کا جذبہ بڑی کامیابی کے ساتھ ابھارتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود کس قدر حب وطن کے جذبے سے سرشار تھے۔

"گئودان" پریم چند کا آخری اور سب سے بڑا شاہکار ہے۔ یہاں ہمیں ان کی شعور کی پختگی اور فن کے رچاؤ کا گہرا احساس ہوتا ہے۔ ناول میں جو کردار پیش کئے گئے ہیں وہ ایسے ٹائپ ہیں جن کی شکل و صورت کو ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ وہ ہمیں سارے ہندستان میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں یہ حقیقت بہت موثر انداز میں نمایاں ہوتی ہے کہ جاگیرداری نظام کی عمارت جو سامراج کے سہارے کھڑی ہے اپنی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے کس طرح گر رہی ہے اور کسانوں کا طبقہ اپنی زمینوں سے بے دخل ہو کر کیسے کھیت مزدور اور مل مزدور بن رہا ہے۔ اور اس عمل میں بلا کی کشمکش، الجھن اور مصیبت ہے۔ دوسری طرف اس ناول میں سرمایہ داری کا بھرم بھی کھلتا ہے کہ یہ نظام کس کس ڈھب سے مزدوروں کو لوٹتا کھسوٹتا ہے اور دوسرے محنت کش لوگوں کی بربادی کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یہاں بھی پریم چند نے کسان کی تباہ حالی پر اپنے قلم کا زور صرف کیا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اس دنیا کو مٹتا ہوا دیکھ رہے تھے جس سے انھیں جذباتی لگاؤ تھا، جس کا کہ وہ خود ایک حصہ تھے۔ مگر ان کے سامنے نئی دنیا کی کوئی واضح شکل نہیں تھی۔ اس سے ان کے دل پر جو کچھ گذرتی تھی، وہ جس کڑھن، جلن اور غم و غصہ کو محسوس کرتے تھے اسے انھوں نے اپنے کرداروں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔

"گئودان" کا ہیرو ایک عام کسان ہے جس میں وہ تمام خوبیاں اور کمزوریاں موجود ہیں جو کسی کسان میں ہوتی ہیں۔ ہوری ان پرانی اخلاقی اور سماجی قدروں کا پابند ہے جو اس کے طبقے کی میراث ہیں۔ وہ زمیندار، کارندے، ساہوکار اور پروہت سبھی کی ہوس ناکیوں کا شکار بنتا ہے۔ یہاں تک کہ خود اپنے بھائی کے حسد کا نشانہ بنتا ہے۔ لیکن وہ انسانیت کا دامن اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یکے بعد دیگرے اس پر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں ان کا وہ جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن اپنی عزت آبرو کا پاس رکھتا ہے۔ ہوری کی دھنیا اس کے مقابلے میں زیادہ لڑاکا اور زوردار کردار ہے۔ وہ اونچے طبقے کی زوال پذیر عورت کے بین اور بے بسی کی تصویر نہیں بلکہ ایک ایسا کردار ہے جسے اپنے زور بازو پر بھروسہ ہے اور جو ہر نا انصافی کے خلاف لڑتی ہے۔ ہوری کے لڑکے گوبر میں ہمیں ایک باغی نوجوان کی روح کا احساس ہوتا ہے جو فرسودہ سماجی بندھنوں کو بے باکی کے ساتھ توڑتا ہے۔

ر دارشی پود کا نمائندہ ہے۔ رائے صاحب کے کردار میں جاگیرداری کا بھدا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ رائے صاحب ایک بڑے زمیندار ہیں سے
یہ فریب اور سازش کے پتلے ہیں۔ پریم چند نے نہایت فنکارانہ انداز میں ان کی شرافت اور دیش بھگتی کا پول کھولا ہے۔ اس طرح کھنّہ کا
دار جو ایک شکر کے مل کا مالک ہے۔ سرمایہ داری کے بھیانک روپ کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

غرض "گئودان" میں ہماری موجودہ سماجی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر موجود ہے۔ اس میں مختلف کرداروں کے باہمی سماجی
رشتے واضح خطوط میں دکھائے گئے ہیں۔ اس ناول میں پریم چند کے فنکارانہ کردار نگاری کا ایک اچھا نمونہ ملتا ہے۔ ان کے کردار گراموفون
ریکارڈ کی طرح اپنے ماسٹر کی آواز نہیں معلوم ہوتے بلکہ وہ خود اپنی بولی بولتے ہیں۔ وہ کٹھ پتلیوں کی طرح مصنف کے اشارے پر نہیں ناچتے
بلکہ اپنی فطرت کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔ وہ اسی جانی پہچانی دھرتی کے باشی ہیں۔ آسمانی فرشتے نہیں ہیں۔ یہ ہے پریم چند کی حقیقت
نگاری کا کمال اور اس کے لئے لکھنے والے کو بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

"گئودان" کے ہوری، دھنیا اور گوبر انفرادی جدوجہد کے ذریعہ شعوری لحاظ سے بہت ترقی کرتے ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہو پاتے
کہ اپنی الجھنوں کے سلجھانے کی کوئی موثر تدبیر کر سکیں ——— یہ معذوری دراصل اس وقت کی تحریک آزادی کے کردار کو ظاہر کرتی ہے جب کہ
پریم چند نے یہ ناول لکھا تھا۔ یہ اس صدی کی چوتھی دہائی میں قومی آزادی کی جدوجہد کی کمزوری اور تنگی کی دلیل ہے۔

پریم چند ہمارے دور کے عظیم فن کار ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو دولت مندوں کے بے جا اثر سے پاک اور آزاد رکھا۔ انھوں نے
آزادی کے اس غلط اور گھٹیا تصور سے خود کو محفوظ رکھا جس کی آڑ لے کر بہت سے ادیب بری بھلی چیزیں لکھ کر دولت کماتے ہیں۔ یہی وجہ تھی
کہ وہ فلمی دنیا سے بہت جلد بیزار ہو کر واپس آگئے اور انھوں نے فراوانی اور فراغت کی زندگی پر غریبی اور تنگی کی زندگی کو ترجیح دی تاکہ وہ اپنے
فن کو بے روک ٹوک عوام کی جدوجہد کا آلہ بنا سکیں کہ فن کار کی حقیقی آزادی کا یہی راز ہے۔

پریم چند اپنے ناولوں، افسانوں اور لیکھوں کی بدولت ترقی پسند ادیبوں کے ہراول دستے میں ہیں۔ غیر مذہبی جمہوریت، ہندو مسلم
اتحاد، متحدہ قومیت کے وہ علمبردار ہیں اور چھوا چھوت، مذہبی ڈھکوسلوں اور فرسودہ رسم و رواج کے سخت مخالف ہیں۔ ان کی ہمدردی ہمیشہ
مظلوم طبقے کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ ہر جگہ سماجی ناانصافی اور عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ غرض ان کی تمام تحریروں میں
ایک گہری اور ہمہ گیر انسان دوستی کی روح کارفرما ہے۔

پریم چند کا اسلوب سیدھا سادھا ہے۔ یہ ان کے افکار کی صفائی کی دلیل ہے۔ وہ جنتا کی بولی کو زیادہ سے زیادہ اپناتے ہیں۔
انھیں اس کے حسن اور معنویت کا احساس ہے اور وہ عوام کی بولی کو بڑی فنکارانہ چابک دستی اور بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یہی
وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں وہ مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہوا جسے بہت عرصے سے ہندی اردو مسئلے کے نام سے بہت اچھالا اور بہت الجھایا جا رہا
ہے۔ انھوں نے اپنے تمام ناول اور افسانے ایسی زبان میں لکھے ہیں جس پر ہندی کے پجاری ہندی سمجھ کر سر دھنتے ہیں اور جسے اردو
کے طرفدار اردو کہہ کر سراہتے ہیں۔ اس لحاظ سے پریم چند کی حیثیت وہی ہے جو مذہبی اعتبار سے کبیر کی تھی جن کی لاش کو ہندو اپنا سمجھ کر
جلانا چاہتے تھے اور مسلمان اپنا سمجھ کر دفن کرنا چاہتے تھے۔ اس میں ہندی اور اردو کے تمام شیداؤں کے لئے ایک چیتاونی ہے۔

ادب اور کردار نگاری

حنس راج رہبر

ایک بار الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو ایک ادیب دوست نے جو ہندی کے مشہور افسانہ نگار ہیں ایک تازہ رسالہ میرے سامنے رکھ کر پوچھا: میری یہ کہانی پڑھی؟" میرا جواب نفی میں پا کر انھوں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا" آپ میری کہانیاں کیوں پڑھنے لگے۔ مگر یہ کہانی بہت شاندار ہے اسے ضرور پڑھئے۔ میں نے اس میں فلاں لیڈر کا فلاں پمفلٹ سارے کا سارا کھپا دیا ہے"۔

میں مسکرایا اور رسالہ ایک طرف رکھتے ہوئے بولا" معاف کیجئے گا میں نے وہ پمفلٹ پڑھ لیا ہے"۔

یہ پمفلٹ یا اخبار پڑھ کر کہانی لکھنے کی رو چار پانچ سال پہلے بہت زور سے چلی تھی اور ابھی تک چل رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے کہانی اور ناول میں کردار نگاری کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم سیاسی یا سماجی نظریئے بیان کر کے ایک قسم کا تاثر پیدا کر دینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن افسانہ اور ناول کی بہت سی جزئیات میں سے کردار نگاری ایک اہم جزو ہے۔ تکنیک اور اسلوب خواہ کچھ بھی استعمال کیا جائے اور اس میں فی زمانہ خواہ کچھ بھی تبدیلی واقع ہو جائے مگر ایک ادیب جب تک افسانہ نگاری پر پوری توجہ صرف نہیں کرتا وہ اپنے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ گذشتہ دنوں چینی ادیبوں کا جو ایک وفد ہندستان آیا تھا اس کے ڈپٹی لیڈر (نام یاد نہیں رہا) نے میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ" کردار نگاری ادب کا اگر لازمی نہیں تو کم از کم ایک اہم جزو ضرور ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چین میں کچھ کہانیاں ایسی بھی لکھی جاتی ہیں جن میں کردار نگاری کا فقدان ہوتا ہے مگر ایسی کہانیوں کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ انھیں جلد بھلا دیا جاتا ہے"۔

کامریڈ کالینن مرحوم سابق صدر سوویت روس ادب کے بلند پایہ نقاد تھے۔ چند سال پہلے سوویت لٹریچر کے ایک شمارہ میں شیلوخوف نے ان سے اپنی ایک ملاقات شائع کی تھی جس میں کالینن نے ادب میں کردار نگاری پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ چیخوف کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کے کردار اس قدر زندہ اور حقیقی ہوتے ہیں کہ ایک بار پڑھنے کے بعد ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ کبھی نہیں بھولتے۔ یہی وجہ ہے کہ چیخوف کی کہانیاں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور وہ ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ اس کے برعکس جس کہانی اور ناول میں کردار نگاری کمزور ہو انھیں ایک بار پڑھ لینا بھی ممکن نہیں ہوتا"۔

اردو میں ۱۹۳۶ء کے بعد نیا ادب کی جو تحریک چلی تھی اس میں ہیئت اور تکنیک کے بہت سے تجربے ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ پچھلے دنوں "شاعر" بمبئی کے سالنامہ میں اور" افکار" کراچی میں خواجہ احمد عباس کی ایک کہانی "مونتاژ" کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کی پیشانی پر خود خواجہ احمد عباس کے یہ الفاظ درج ہیں۔" بظاہر غیر متعلق" ان مل بے جوڑ اور بے معنی مناظر میں ایک خاص ڈھنگ سے ربط پیدا کرنے کو فلمی تکنیک میں (Montage) کہتے ہیں ——— یہ افسانہ (جو حقیقت بھی ہے) اصلی واقعات کو اسی طرح ترتیب دے کر بنایا گیا ہے۔ اس افسانہ کو میں نے تخلیق نہیں کیا۔ یہ آپ سے آپ لکھا گیا ہے۔ میں صرف ترتیب دینے کا ذمہ دار ہوں۔ اس افسانہ کا ہیرو کون ہے اور ہیروئن کون ہے اس کا شاید فیصلہ نہ کیا جا سکے۔ مگر ویلن کے بارے میں کوئی شبہ نہیں"۔

رپورٹ اور ہیرو ٹی اس لئے نہیں کہ کہانی اخباروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی خبریں جمع کر کے مرتب کی گئی ہے جس سے قاری کے ذہن پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کانگریس راج میں بھی عوام کی حالت ذرا نہیں سدھری۔ لوگ کسمپرسی کی زندگی بسر کرتے ہیں، فاقوں سے مرتے ہیں اور بے گناہ ہوتے ہوئے قانون کی نظر میں مجرم ہیں۔ دوسری طرف عوام دشمن طبقے لوٹ کھسوٹ کے نئے طریقے اور نئے حربے استعمال کرتے ہیں اور اپنی مجرمانہ حرکتوں کے باوجود قانون کی گرفت سے آزاد ہیں۔

افسانے کے اس تاثر اور اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں بلا شبہ یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ افسانہ میں کردار نگاری کا یکسر فقدان ہے۔ اخبار کی خبریں بھی ایک تاثر ہوتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے بہت سی خبروں کو یکجا کر کے جس ڈھنگ سے انھیں پیش کیا ہے اس سے تاثر یقیناً شدید ہو گیا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ افسانہ کو فنی اعتبار سے کامیاب بنانے کے لئے جو محنت درکار ہے خواجہ صاحب نے اس سے جی چرایا ہے۔ کردار نگاری تو ایک طرف کہانی میں ادیب کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی شامل نہیں ہے۔ خواجہ احمد عباس کی کہانی تو صرف مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے ورنہ تجربے اور مشاہدے کی کمی اور محنت سے جی چرانے کا رواج عام ہے اور بدقسمتی سے یہ رواج ادب کی ترقی پسند تحریک سے منسوب ہے حالانکہ ترقی پسند ادیبوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں ٹھوس متحرک اور مثبت کردار پیش کریں کیونکہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اور وہ ادب میں عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب تک وہ عوام کی زندگی کا مطالعہ نہیں کریں گے ان کے مسائل، ان کی نفسیات اور فلسفۂ حیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں لیں گے وہ عوام کو متاثر کرنے والا ادب پیدا کرنے میں قاصر رہیں گے پھر جب قاری کو ادب میں ایسے کردار ملیں گے جو اس کی اپنی زندگی سے مشابہت رکھتے ہیں جو اس کے اپنے جیسے ہیں۔ جن کے درمیان وہ زندگی بسر کرتا ہے جن سے اسے ہر روز واسطہ پڑتا ہے تو وہ ایسی کتابوں کو زیادہ دلچسپی سے پڑھے گا اور ان کرداروں کے ذریعے اس کی اپنی تربیت ہوگی اور جو افسانہ یا ناول میں بلند اخلاق کے مثبت کردار ہیں وہ زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں اس کی رہنمائی کریں گے اور ان کرداروں کی مثال سے اس کے اپنے کردار میں استحکام اور عزم پیدا ہوگا۔ یوں ادب کی افادیت اور ادب برائے زندگی کے نظریہ کو ادیب عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوگا۔

لیکن اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ ہم عوام کی نمائندگی کا دم بھرتے ہیں۔ ادب کی افادیت کے قائل ہیں اور ادب برائے زندگی کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن جب کوئی ہماری تخلیق میں "عوام نکالتا" ہے۔ کردار نگاری کے فقدان کا عیب نکالتا ہے اور ہماری تخلیق کے پروپگنڈا محض ہونے کی شکایت کرتا ہے تو ہم خود تنقیدی کے اصول کو ترک کر کے بڑے فخر سے کہتے ہیں۔ "جی ہاں، ہم پروپگنڈا کرتے ہیں۔ سارا ہی ادب پروپگنڈا ہے"۔ اور اگر ہمارا بس چلے تو ہم معترض کو رجعت پرست کہہ کر منہ چڑانے سے بھی گریز نہیں کرتے ایک دور تھا جب ہم معترضوں کو رجعت پرست کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتے تھے اور دوسروں کی چیزوں کو کلاسیکل کہہ کر اچھالتے تھے لیکن اب ادب کی ترقی پسند تحریک سترہ اٹھارہ سال کی نوجوانی میں قدم رکھ چکی ہے۔ اوائل عمر یا بچپن کا ابتدائی زمانہ بہت پہلے ختم ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ملک کے حالات ہی ایسے تھے کہ ہم نے جذباتی باتیں کرنا ہی بہتر سمجھا لیکن اب وہ دور شروع ہوتا ہے کہ ہم پر ایک نئے عہد کی رہنمائی کا فرض عائد ہوتا ہے ہمیں اب اپنے قول اور فعل کے بارے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے ہمیں سیاست کی طرح ادب میں بھی جمہوری عناصر کا مشترکہ محاذ قائم کرنا ہے جنھیں ہم نے اپنے تعصب کی وجہ سے الگ کر دیا ہے انھیں ساتھ لانا ہے اور نوجوانوں کی صحیح رہنمائی کرنا ہے۔ موضوع اور کردار نگاری میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جب تک موضوع کردار سے ہم آہنگ نہ ہو خواہ ہم اسے کتنی بھی خوبصورت اور دلچسپ زبان میں پیش کریں ہماری تخلیق کو افسانوی ادب میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اگر ہم ماضی پر نظر ڈالیں اور ایسے افسانوں کا نام یاد کریں جنھیں ہم نے کبھی نہ کبھی خود کلاسیکل کہا تھا تو انھیں کوئی آج تیسرے درجے کا افسانہ ماننے کو بھی تیار نہ ہوگا اور جن لوگوں

افسانے کے "جتنا دری" سمجھا جاتا تھا ان کا فن اور کمال آج ہمیں انحطاط پذیر کیوں دکھائی دے رہا ہے حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ افسانہ نگار کا جوں جوں تجربہ اور مطالعہ وسیع ہوتا ہے اس کے فن میں پختگی آتی ہے اس کے کردار نکھرتے اور واضح ہوتے جاتے ہیں۔ کسی ادبی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے ایسے ادیب جنھوں نے زندگی کی صحت مند قدروں کو لے کر لکھنا شروع کیا جوں جوں ان کا تجربہ بڑھا ان کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور جتنا وہ اندرونی تضاد کو حل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں آخری عمر میں اتنے ہی اچھے شاہکار انھوں نے پیش کئے ہیں۔ ڈکنس، بالزک، اناطول فرانس، وکٹر ہیوگو، ترگنیف، چیخوف، گورکی، رومان رولاں، ٹولسٹائی، ٹیگور اور پریم چند اس کی واضح مثالیں ہیں اور ان کے شاہکار اس لئے شاہکار بن سکے ہیں کہ انھوں نے جتنا عظیم موضوع منتخب کیا ہے ان کے پاس کردار نگاری کا فن بھی اتنا ہی عظیم ہے۔

مثال کے طور پر گورکی کا ناول "ماں" لیجئے وہ موضوع کے اعتبار سے عظیم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن اگر اس کا ہیرو پاویل ایک زندہ کردار نہ ہوتا اور اس میں اس روسی مزدور کی تمام خوبیاں موجود نہ ہوتیں جس نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی رہنمائی کی تھی تو گورکی کی اس تصنیف کو جو درجہ آج حاصل ہے وہ کبھی حاصل نہ ہوتا اور گورکی کے روسی نقادوں کا کہنا ہے کہ گورکی نے پاویل اور اس کی ماں کو فی الواقعی دیکھا تھا اور ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ گورکی کے اس ناول میں اس عہد کی روسی زندگی اپنی تمام حقیقتوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ موجود ہے۔ حالانکہ گورکی پہلا ادیب ہے جس نے مزدور کو اپنی ناول کا ہیرو بنایا اور پرولتاری اخلاق اور کلچر کو بورژوا اخلاق اور کلچر کے مقابلے میں پیش کیا اور کسی کو یہ جرات نہ ہوسکی کہ وہ "ماں" ناول کو پروپگنڈا کہے۔ دنیا کے بہترین ناولوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ موضوع خواہ کچھ بھی ہو اسے فنکارانہ ڈھنگ میں پیش کرنا ضروری شرط ہے اور فن میں اسلوب اور شوکت الفاظ سے کہیں زیادہ کرداری کو اہمیت حاصل ہے۔ زبان اور اسلوب کی خامیاں کسی حد تک برداشت کی جاسکتی ہیں لیکن کردار نگاری ایک ایسا اہم جز ہے کہ اسے نظر انداز کرنے والا ادیب ایک روز خود نظر انداز ہوجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسلوب اور بیان کی خوبیاں کے باعث وہ کچھ دن مقبول رہے (اردو افسانہ نگاری میں سدرشن اور راشد الخیری کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں) لیکن آخر میں اسے اور اس کی تخلیقات کو خواب کی باتوں کی طرح بھلا دیا جاتا ہے اور کردار نگاری کتابیں پڑھ کر سیکھنے سے نہیں آتی اس کے لئے زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ ضروری ہے۔ پھر ہم ترقی پسند یہ مانتے ہیں کہ خیالات مادے سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے اس لئے انسان کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کے ماحول اور مادی حالات کا مطالعہ بھی ضروری ہے تبھی ہم اس کے جذبات اور احساسات کی صحیح عکاسی کرسکتے ہیں۔ اگر ہم تفصیل سے لکھیں گے اور اپنے خیالات کو قاری تک پہنچانے کے لئے کردار کو محض کٹھ پتلی بنائیں گے تو ہماری تخلیق ناقص ہوگی۔ ادب میں حقیقت نگاری کی ابتداء سے پہلے قصہ گو یہ کرسکتا تھا کہ وہ کرداری نگاری کو نظر انداز کر کے قصہ کی دلچسپی برقرار رکھے اور اس کے ذریعہ اپنی بات کہتا جائے۔ ارسطو نے اپنی کتاب "بوطیقا" میں ٹریجڈی پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ڈرامہ میں کردار پر قصہ کو ترجیح دیجائے۔ قرون وسطیٰ تک یہی اصول قائم رہا لیکن الزبتھ کے عہد کے اور خصوصاً شیکسپیر کے ڈراموں کا جب تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں مقصد سے کہیں زیادہ کردار اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ڈرامہ، کیا کہانی اور کیا ناول سب میں ہمیشہ قصہ پر کردار نگاری کو ترجیح دی گئی ہے اور یہی حقیقت پسندی کے نام پر تخلیق ہونے والے ادب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں مختصر افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ موپاساں اور چیخوف اس جدید افسانہ نگاری کے امام ہیں۔ لیکن موپاساں اور چیخوف میں نمایاں فرق یہ ہے کہ موپاساں قصہ اور خارجیت پر زیادہ توجہ صرف کرتا ہے۔ لیکن چیخوف میں قصہ اور بھی مختصر ہوگیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں خارجیت اور داخلیت کا کچھ ایسا حسین امتزاج پیش کرتا ہے کہ اس کا کردار اپنے ماحول اور طبقہ کا صحیح نمائندہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس لئے ہمیں

انسانی فطرت کے مختلف رجحانات اور پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ چیخوف کی کہانیوں میں کہیں ایک سطر بھی ایسی نہیں ملتی جو کردار کی فطرت اور اس کے خارجی ماحول سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ چونکہ چیخوف نے کردار نگاری کے فن کو اپنے عروج پر پہنچایا ہے اس لئے افسانوی ادب میں چیخوف کو جو بلند مقام حاصل ہے کوئی دوسرا ادیب اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچا۔ ٹالسٹائی کے "وار اینڈ پیس" اور "اینا کرینینا" ناولوں میں سینکڑوں کردار ہیں وہ اپنے ماحول اور طبقہ کی خصوصیتوں کو بدرجہ اتم نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہر کردار کی ایک انفرادی حیثیت ہے اور وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ میکسیم گورکی ادب میں کردار نگاری کی اسی شاندار روایت کا علمبردار ہے اور وہ اس سلسلے میں رقم طراز ہے:۔

"ایک ادیب کا کام بہت ہی دقت طلب ہے۔ لوگوں کے بارے میں کہانیاں لکھنے کا مطلب محض "تانا بانا" بن دینا ہرگز نہیں۔ اس کا مطلب ہے الفاظ کے ذریعے لوگوں کی تصویرکشی کرنا جیسے کوئی پنسل یا برش کی مدد سے تصویریں بناتا ہے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ادیب کو اپنے موضوع پر پوری قدرت حاصل ہو اور وہ اپنے کردار کے ہر عمل کو بخوبی سمجھتا ہو اور پھر وہ ان سب باتوں کو سادہ اور واضح الفاظ میں یوں تحریر میں لائے کہ قاری کو چھپے ہوئے الفاظ کے پیچھے سے زندہ انسان کا چہرہ ابھرتا ہوا دکھائی دے اور اس کی حرکات و احساسات میں ایک قدرتی امتزاج نظر آئے۔" (آرٹ اینڈ لائف)

ہم ایک قدیم ملک کے باشندے ہیں اور ایک قدیم تہذیب کے وارث۔ ہمارے افسانوی ادب کی ابتداء دیومالا سے ہوتی ہے اور ہماری دیومالا نے سینکڑوں ایسے عظیم اور لافانی کردار پیش کئے ہیں جو صدیوں سے زندہ ہیں اور عوام کے ذہن پر نقش ہیں۔ پھر رامائن اور مہابھارت ایسی لازوال مثنویاں ہیں جن میں سینکڑوں، ہزاروں کردار ایسے پیش کئے گئے ہیں جو نیکی، بدی، حق و باطل اور شرافت و کمینگی کے مجسمے ہیں۔ جن میں سے کسی کی ہم پرستش کرتے ہیں اور کسی سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کرداروں کے اب تک عوام کے ذہنوں پر چھائے رہنے کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مصنف نے انتہائی خلوص کے ساتھ پیش کیا ہے اور وہ ہمارے کلچر کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے علمبردار ہیں۔ رامائن اور مہابھارت کی مقبولیت اور شہرت کی بناء پر شکوہ عبارت یا عجیب و غریب ہئیت اور تکنیک نہیں بلکہ بلندپایہ کردار نگاری ہے۔

ہم رامائن، مہابھارت اور اپنی دیومالا سے کردار نگاری کے سلسلے میں بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ پنج تنتر کو لیجئے گو وہ جدید افسانوی تکنیک پر پوری نہیں اترتی لیکن وہ دنیا بھر میں کہانیوں کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اسے وشنو شرما نے اسّی سال کی عمر میں بہت سے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کے بعد لکھا تھا اور اس کی تمہید میں مصنف نے لکھا ہے کہ "جب تک آدمی بہت سے بھیس اور بھاشا کو دیکھ سمجھ نہیں لیتا اس کا علم مکمل نہیں ہوتا۔" گو کہانیاں بیشتر جانوروں سے متعلق ہیں لیکن اس میں مصنف کا تجربہ اور مشاہدہ پوری طرح موجود ہے۔ اس نے ہزاروں جانوروں کے جو نام اور کردار تخلیق کئے ہیں ہمارے سماج کے مختلف انسانوں پر ان کا جوں کا توں اطلاق ہوتا ہے۔

گو یہ ٹھیک ہے کہ جدید افسانہ نگاری کی ابتداء سائنس کی ترقی کے ساتھ یورپ میں ہوئی۔ فرانس اور روس نے اسے عروج پر پہنچایا۔ انگریزی زبان کے ذریعہ اس کی ابتداء ہمارے دیس میں پہلے بنگال میں پھر سارے ہندستان میں ہوئی۔ لیکن حقیقت پسند افسانوی ادب کو ملک کے حالات اور روایات سے الگ رکھ کر ترقی دینا ممکن نہیں۔ اگر ہم اپنے دیس کے دو عظیم فنکاروں ٹیگور اور پریم چند کو لیں تو یہ صحیح ہے کہ انھوں نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر جدید صنف کے افسانے اور ناول تخلیق کئے لیکن ان کے سوچنے کا تصور بالکل ہندستانی تھا۔ بیسویں صدی میں سرمایہ داری کے زوال کے ساتھ افسانوی ادب کا بھی زوال

ہوا ہے۔ حقیقت نگاری اور کردار نگاری کی جگہ لفظی شعبدہ بازی اور ہئیت کی جدت پسندی نے لے لی ہے لیکن پریم چند اور ٹیگور بیسویں صدی کے ان زوال پسند بورژوا ادیبوں کے بجائے انیسویں صدی کی پیداوار ٹالسٹائے، رومان رولاں، ڈکنس، بالزک اور چیخوف سے متاثر تھے اور انھوں نے مغربی ادب کی بہترین روایت کو اپنایا تھا اور اس کے ساتھ انھوں نے اپنے دیس کی روایات اور زندگی کا بھرپور مطالعہ کیا تھا چنانچہ اپنی نظریاتی خامیوں کے باوجود ان کی تخلیقات میں انسان دوستی کی روح جاری و ساری ہے اور ان کے کردار زندہ کردار ہیں۔ ٹیگور کا کابلی والا' گورا' چندرمنی اور پریش بابو کسے متاثر نہیں کرتے۔ پریم چند نے دھنیا' چھنیا' منوہر' بلراج' گوبر، ہوری' امرکانت اور مایا ہندستانی عوام کے نمائندہ ایسے سیکڑوں کردار دیئے ہیں کہ اپنی اصلاح پسندی کے باوجود پریم چند آج ہمارے کلاسک میں شامل ہیں اور جیسے جیسے عوام میں تعلیم پھیلے گی انھیں ان کے جمہوری حقوق ملیں گے اور وہ اپنے کلچر کے آپ وارث ہوں گے۔ پریم چند کا مرتبہ بڑھتا جائے گا اور ہمارا موجودہ ادب پریم چند کی روایات اپنا کر ہی آگے بڑھ سکے گا اور اس روایت میں کردار نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں خود پریم چند رقمطراز ہیں:-

> "واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک روبہ ترقی ہے کہ آج کا افسانہ ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے تسکین نہیں پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی کردار انسانوں سے ملتے جلتے ہیں بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں اور مصنف نے حتی الامکان ان کی سوانح عمری لکھی ہے۔"
> (خطبۂ صدارت ۱۹۳۶ء)

آج اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے ٹیگور اور پریم چند کی روایت کو کہاں تک آگے بڑھایا ہے۔ ان کے بعد ہمارے افسانوی ادب نے کہاں تک ترقی کی ہے؟ تو اس کی ایک۔ اور صرف ایک کسوٹی یہ ہے کہ ہم نے کتنے زندہ اور عظیم کردار تخلیق کئے ہیں۔ ہئیت اور تکنیک کے تجربے کرنا یا ہنگامی اور بین الاقوامی موضوعات پر لکھنا ترقی کا کوئی معیار نہیں۔ اخباروں کے ایڈیٹوریل ہمیشہ انھیں باتوں پر لکھے جاتے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے بہتر زبان استعمال کی ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے ہئیت اور تکنیک کے تجربہ کی دھن میں حقیقت کو مسخ کر دیا ہو۔ ترقی پسندی کرداری نگاری کی منافی نہیں۔ چونکہ ترقی پسندی کا مطلب ادب کا زندگی اور عوام سے براہ راست تعلق قائم کرنا ہے اس لئے کردار نگاری کے معاملے میں ترقی پسند ادیب کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایک ادبی تخلیق صحافت اور فلسفے سے اس ضمن میں مختلف ہوتی ہے کہ اس میں ایک خیال کو مجسم کر کے انسانی روپ میں پیش کیا جاتا ہے ایک ادبی تخلیق میں ایک سماجی اور سیاسی نظریہ اور ایک تضاد ایک انسان کی ــــ ایک کردار کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور وہ کردار اپنے دور کے ایک قطعی خیال کا بہترین نمائندہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادیب ایسا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا زندگی اور سماج کا مطالعہ ناقص ہے۔ کردار نگاری کے معاملے میں مارکس کا کہنا ہے۔

> "انسان کا کردار اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ تمھیں ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا ہوگا اگر تم کردار تخلیق کرو گے۔"

ایک انسانی کردار کی وضاحت حرکات و سکنات اور اس کے اعمال کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اینگلز نے لکھا ہے "ایک شخص کا کردار صرف اسی بات پر منحصر نہیں کہ وہ کیا کام کرتا ہے بلکہ اس پر منحصر ہے کہ وہ اسے کیسے کرتا ہے۔"

اگر ہم کوئی کردار اپنے تخیل سے گھڑ لیتے ہیں تو یہ تو ممکن ہے کہ ہم اپنے تخیل سے اس کے ساتھ کوئی کام بھی وابستہ کردیں لیکن محض تخیل سے یہ جان لینا ممکن نہیں کہ وہ اس کام کو کیسے کرتا ہے اس لئے جس ماحول اور جن انسانوں کو ہم نے دیکھا نہیں ہم ان کے بارے میں کہانیاں یا ناول بھی نہیں لکھ سکتے۔ اگر لکھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری کوششیں ناکام رہتی ہیں اور لوگ بجا طور انھیں *

---

* نعرے بازی کا نام دیتے ہیں۔ اب اس خامی کو دور کر کے ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔

برائے بحث

اقبالؔ اور اُن کی شاعری

وندمیری

پچھلے دنوں انجمن عوامی مصنفین (حیدرآباد) کی جانب سے "اقبال اور ان کی شاعری" کے عنوان پر ایک سمپوزیم رکھا گیا تھا جس کی ابتدا اس مضمون کی شکل میں عالم خوندمیری نے کی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ پوری بحث کسی رسالے میں شائع کروائی جائے لیکن ان ساتھیوں نے جنھوں نے بحث میں حصہ لیا تھا اور خود اپنے خیالات قلمبند کر کے دینے والے تھے ابھی تک اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اس لئے مجبوراً عالم صاحب کا مضمون ہی اشاعت کے لئے روانہ کیا جا رہا ہے۔

سلیمان اریب
سکریٹری انجمن عوامی مصنفین

اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس کے باوجود اقبال کی شاعری اور ان کے پیام کے بہت سے رخ ایسے ہیں جن پر ابھی
ہ لکھا جا سکتا ہے۔ اگر اقبالؔ اردو کے سب سے بڑے شاعر نہیں بھی ہیں تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اردو کے ایک بہت
، شاعر ہیں اور اگر غالبؔ نہ ہوتے تو شاید اقبالؔ ہی اردو کے سب سے بڑے شاعر ہوتے ان کی عظمت اور ان کے کمال
، کسی نقاد کو بھی یہ جرأت عطا نہیں کی کہ وہ ان کے پیام اور ان کی شاعری پر تنقید کر سکتا، اقبالیات کا اکثر حصہ اقبال کی
ے زیادہ نہیں، اور اقبالؔ کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں صوبائی تعصب اور گروہ بندی کے خطرناک اور زہریلے
ت کی کارفرمائی کے سوا کچھ اور نہیں۔ میری نظر سے صرف سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" ایسی گذری جس میں انھوں
بالؔ کے مقام کو متعین کرنے کی صحیح کوشش کی ہے۔ اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ یا تو اقبالؔ کو کلیتہً قبول کر لیا جاتا تھا یا پھر
رائے پوری کی طرح انھیں فاشسٹ اور رجعت پسند کہہ کر پوری طرح نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن پہلی بار
رجعفری نے اقبالؔ کے ترقی پسند ورثہ کو پیش کیا ہے۔ بدقسمتی سے پچھلے چند دنوں سے یہ صدا بلند کی جا رہی ہے کہ اقبالؔ کا
تمام کا تمام رجعت پسند تھا۔ وہ جمہوریت کے دشمن تھے اور فاشزم کے علمبردار تھے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسے نقاد
ل کے منفرد اشعار کے نمونے پیش کر دیتے ہیں اور اپنی دانست میں مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے اقبالؔ کی فاشسٹ
یت کو ثابت کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کے تصورات میں ہمیں جا بجا تضادات نظر آتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک
جی اور معاشی مسائل کا تعلق ہے ان کے سامنے کوئی واضح اور صاف نصب العین نہیں تھا۔ وہ پرانے نظام سے بیزار تھے
یں اس نظام کی تباہ کاریاں صاف نظر آتی تھیں، جاگیرداری اور سرمایہ داری نظم معیشت کی انسان دشمنی اور ان نظاموں میں
ان کی رسوائی کو انھوں نے پوری طرح محسوس کیا اور یہ بھی دیکھا کہ اس نظام نے انسان کی ساری تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کر دیا
ہ اور سارے تخلیقی سوتوں کو خشک کر دیا ہے۔ اس لئے انھوں نے اس نظام کے خلاف نعرہ بلند کیا اور اس جنگ میں ایک

یہ مصالحت آمیز رویہ پہ آخر وقت تک قائم رہے لیکن ساتھ ہی کسی ایسے قابلِ عمل نظام کی نشاندہی نہ کر سکے جو اس پرانے اور فرسو نظام کی جگہ لے سکتا اور انسانیت کے موجودہ مصائب اور پریشانیوں کا خاطر خواہ علاج کر سکتا۔ انھیں پوری طرح احساس تھا یہ سارا نظامِ معاشرت فرسودہ ہو چکا ہے اور اس میں زیست کی صلاحیت بالکل باقی نہیں۔ وہ نہ صرف ایک نئے سماج کے خواہا تھے بلکہ اپنے لئے ایک نئی کائنات کی تخلیق کرنا چاہتے تھے جس میں ہر چیز نئی ہو، فلک بھی نیا اور ستارے بھی نئے ـــــ قدیم سے اتنی شدید نفرت اور جدید سے اتنا والہانہ عشق، اقبال کے سوا کسی دوسرے شاعر میں نہیں ملتا۔ اردو تو کیا کسی دوسری زبان کے کم شاعر نے بھی اس شدت کے ساتھ اپنے فرسودہ ماضی کے خلاف اس قدر شدید بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ اقبال کے سوا کسی دوسرے شاعر نے اس قدر یقین کے ساتھ ایک نئی دنیا کی تعمیر کی نشانیوں کو نہیں دیکھا۔ مثلاً ؎

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است زندگی در پئے تعمیر جہانے دگر است

پرانی سیاست، پرانی معیشت اور پرانے نظامِ حیات کی زوال پذیری کا اتنا صاف نقشہ کسی نے پیش نہیں کیا جو اقبال کی مش نظم ساقی نامہ میں ہمیں ملتا ہے ؎

پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشہ دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ماضی سے بیزاری اور قدیم سے نفرت کے باوجود اور ماضی کے تمام اصنام ڈھا دینے کے بعد اقب نے اسلام کے پرانے نظام کی طرف دعوت دی اور اسی میں انسانیت کو اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی جانب ابھارا۔ سچ تو یہ کہ اقبال کی یہ آواز کہ ؎

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا

ان کی ماضی سے بیزاری سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ لیکن محض اس بنا پر انھیں (Revivalist) احیاء پسند نہیں کہ جا سکتا کیونکہ ان کے نزدیک اسلام خود ایک جامع نظریۂ حیات کا نام نہیں تھا بلکہ ان کے تخلیقی تصور اور خلاق ذہانت نے اسلام کو ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ یہاں ایک ایماندار نقاد کو ان کے فکر کے اس تضاد کو عیاں کرنا چاہیئے بجائے اس کے کہ ان پر ماضی پرستی کا غلط الزام عاید کیا جائے۔ ہمیں اقبالؔ پر یا کسی دوسرے پرانے شاعر، ادیب یا مفکر پر تنقید کرتے ہوئے یہ نہ بھول جانا چاہیئے کہ شا ادیب اور مفکر زمانہ ساز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی پیداوار بھی ہوتا ہے اور وہ پوری طرح ان حدبندیوں کو توڑ نہیں سکتا جن میں اس کا شعور ترقی پاتا ہے۔ انسانی شعور کسی خلاء میں پرورش نہیں پاتا بلکہ ایک خاص سماجی سرزمین پر شعور کی نشو و نما ہوتی ہے خاص مادی، سماجی اور سیاسی حالات سے الگ کر کے کسی کے شعور کو پرکھنے کی کوشش، شعور کی ماہئیت سے لاعلمی کا ثبوت.

ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ کہاں تک اس شاعر یا مفکر نے اپنے زمانے کے ترقی پذیر تمدن کی تائید کی اور کہاں تک اس انحطاط پذیر سماج کو بے نقاب کیا، اس نے اپنے دور کی سب سے بڑی عوام دشمن اور جمہور کش قوت کی مخالفت کی یا اس کا دیا، عوام کو نسل، رنگ، فرقہ اور مذہب کی بنیادوں پر تقسیم کیا یا انھیں متحد کرنے کی کوشش کی، انھیں فن برائے فن کے طلسم میں رکھا یا اپنے فن اور اپنے شعور کو زندگی کا خدمت گزار بنایا، عوام کو عمل اور جدوجہد پر ابھارا یا انھیں سلانے کی کوشش کی، شاعر حیثیت سے اپنے پیام کو خوبصورت انداز میں پیش کیا یا محض تک بندی کی شاعری اور فن کی صحت مند روایات کی پابندی کرتے ہو انھیں ایک نئی زندگی دی اور نئی روایتوں کی تخلیق کی یا محض پرانی روایات کی پرستش کرتا رہا۔ اپنے فن کے ساتھ ایماندار ثبوت دیا یا فن کو ناروا مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان معیارات پر اقبالؔ کے کلام اور ان کے پیام کو

ی کوشش کی جائے تو اس کے بیشتر حصے میں ہمیں خوبصورت اور صحت مند عناصر ملیں گے۔

یہ ایک اتفاق نہیں بلکہ ہندستان کے خاص تاریخی، تہذیبی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھا کہ ہندستان کے اس صدی کے دو بڑے شاعر اور مفکر ٹیگور اور اقبال دونوں اپنی انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے باوجود تصوریت اور عینیت کے فلسفہ کے علمبردار تھے۔ ان کی عظمت اس سے کم نہیں ہو جاتی لیکن ان کے فکری تضادات کے سمجھنے میں اور ان کے حدود کا ادراک کرنے میں ہمیں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی عینیت پسندی نے انھیں عوام سے روگردانی کرنے کی جانب مائل نہیں کیا بلکہ وہ اپنی فلسفیانہ کوتاہ نظری کے باوجود عوام اور جمہور کا ساتھ دیتے رہے اور ان کے دشمنوں کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ مستقل جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ ان کی تصوریت نے انھیں سامراج دشمنی اور آزادی پسندی کے راستہ سے ہٹایا تو نہیں لیکن ان کے بنیادی انسان دوستی کے جذبہ کو اس کی آخری اور منطقی حد تک پہنچنے نہ دیا۔ ٹیگور اگر ویدانت کے فلسفہ وحدت الوجود سے اکتساب فیض کرتے ہیں اور "ہمہ اوست" سے انسان دوستی اور انسانی مساوات کا سبق اخذ کرتے ہیں تو اقبال اسلامی تعلیمات اور قرآن سے عمل، جہد، تسخیر کائنات، انسان کی عظمت، آزادی کی اہمیت اور انسانی مساوات کے پیام کو تلاش کرتے ہیں۔ انسان کے بنیادی مسائل اور اس کی مصیبتیں دونوں کے پیش نظر رہتی ہیں۔ ٹیگور مندر اور معابد میں خدا کی تلاش کرنے کے بجائے مزدور کی محنت میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں اور سامراج کے خلاف اہل وطن کی لڑائی میں اور ایک نئی زندگی کی تعمیر کی جدوجہد میں انھیں انسان کی عظمت اور برتری کا راز نظر آتا ہے۔ سوویت یونین کے اشتراکی نظام میں انھیں نئی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اقبال کو سوویت یونین میں "آفتاب تازہ" نظر آتا ہے اور وہ انقلاب روس کا خیر مقدم کرتے ہیں ؎

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا   آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

سوویت یونین سے ان کی وابستگی اور دلچسپی آخر وقت تک قائم رہی۔ چنانچہ ضرب کلیم کی ایک نظم میں ان کا یہی بنیادی خیال کارفرما نظر آتا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم   بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اقبال پہلے اردو شاعر ہیں اور ایشیا کے ان چند شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کا خیر مقدم کیا اور بندۂ مزدور کو ایک نئی دنیا کی بشارت دی جس میں سرمایہ دار حیلہ گر اس کی محنت کا استحصال نہیں کر سکتا اور جہاں "لیس الانسان الا ماسعیٰ" کا تصور پہلی بار صورت پذیر ہو سکا تھا۔ انھوں نے سوویت انقلاب اور سوویت اشتراکیت میں ان اسرار کو بتدریج کھلتے ہوئے اور ظاہر ہوتے ہوئے دیکھا جنھیں اب تک انسان کی ہوس نے چھپا رکھا تھا اور جن پہ بڑے بڑے تالے پڑے ہوئے تھے۔ اقبال کا بے رحم ترین نقاد بھی اقبال کی شاعری کے اس دور کو نظر انداز نہیں کر سکتا جب کہ انھوں نے پہلی بار انقلاب کا لفظ صحیح اور حکیمانہ طریقہ سے استعمال کیا ؎

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب   از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام   آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اقبال کا پیام یکساں نہیں۔ اس میں ہمیں بے شمار ناہمواریاں نظر آتی ہیں اور اس کا سبب ان کا بنیادی تصوری فلسفہ ہے۔ وہ کائنات کو ایک روحانی نظام تصور کرتے ہیں اور اسی لئے وہ ہر جگہ سبب کو نتیجہ اور نتیجہ کو سبب تصور کرنے لگتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی عریانی، بیکاری اور افلاس کو وہ ایک خاص نظام معیشت سمجھنے کے بجائے ان مظاہر کو دور حاضر کے انسان کی بے بصری اور کوتاہیٔ ذہن سے تعبیر کرتے ہیں۔ موجودہ تمدنی بحران کو معاشی اور سیاسی بحران کا نتیجہ قرار دینے کے بجائے وہ اسے معاشی اور سیاسی بحران کا سبب قرار دیتے ہیں اور اسی لئے انسانی ذہنوں میں انقلاب کو وہ ایک صحیح علاج تصور کرنے لگتے ہیں۔ ان کی بنیادی روحانیت

اور عینیت ان کے پیام کو صحیح راستوں پر بڑھنے اور نشو و نما کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور کچھ دور چل کر ان کا خیال مقید ہو جاتا ہے۔ ماخولا نے ایک مشہور اسلامی مفکر عراقی کے بارے میں لکھا تھا کہ "وہ اپنے خیال کے پورے لوازمات (Implications) کا ادراک نہ کر سکے۔ کچھ تو اس لئے کہ وہ ریاضی داں نہ تھے اور کچھ تو اس لئے کہ وہ ارسطو کے اس خیال کے حامی تھے کہ کائنات ایک جامد وجود ہے۔" ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اقبال کی یہ تنقید خود ان پر بھی صادق آتی ہے۔ اقبال بھی اپنے فکر کے لوازمات کا پوری طرح ادراک نہ کر سکے کچھ تو اس لئے کہ ان کو "اقتصادیات" کے پہلے مصنف ہونے کے باوجود معاشی اور سیاسی مظاہر کے بارے میں نقطۂ نظر پوری طرح سائنٹفک نہیں تھا اور کچھ تو اس لئے کہ وہ بنیادی طور پر کائنات کو ایک روحانی نظام تصور کرتے تھے۔

اقبال کے نزدیک یہ کائنات بنیادی طور پر روحانی ہے اور مادہ محض قوتِ عمل کو ابھارنے اور "روح" کو پوری طرح اجاگر کرنے کے لئے ایک ضروری رکاوٹ ہے جسے خود روح نے پیدا کیا ہے۔

این جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندار من است — جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے او را — حلقہ ہست کہ از گردش پرکار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من — چہ زمان و چہ مکاں شوخیٔ افکار من است

اقبال کے اس بنیادی فلسفہ پر جرمن فلسفی فشتے (Fichte) کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس نے کائنات کو خود (Self) اور غیر خود (Non-Self) میں تقسیم کیا تھا جس میں (Non-Self) یا "مادہ خود" کو ابھارنے میں مدد دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی موجودات کی ماہیت ایک وجود بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادہ کی قوتیں پوشیدہ ہیں اور جس کی ماہیت خیال یا تصویر سے زیادہ انسان کے ارادہ اور جذبہ سے قریب تر ہے۔ کسی شئے کی ہستی یا زندگی کا پیمانہ اس کی "خودی" یا ارادہ کا استحکام ہے۔ اقبال کی تصوریت میں تصور اور خیال سے زیادہ عمل اور ارادہ کی کارفرمائی ہے اور یہی بنیادی تصور ہے جو اقبال کو دوسرے تصوری فلسفیوں اور مفکرین کی طرح زندگی سے فرار اور بیزاری کی جانب راغب نہیں کرتا بلکہ مخالف قوتوں سے ٹکرانے، متصادم ہونے اور رکاوٹوں پر غالب آنے کی تعلیم کا باعث بنتا ہے۔ اقبال صحیح معنی میں نہ تو تصوریت پسند ہیں اور نہ مادیت پسند بلکہ "عملیت پرست" (Activist) ہیں۔ لفظ (Word) یا تصور (Idea) نہیں بلکہ عمل (Deed) ان کے نزدیک کائنات کی ماہیت ہے۔ وہ بھی گوئٹے کی طرح یہ کہتے ہیں کہ "پہلے عمل تھا"۔ اقبال نے پہلی بار اردو اور فارسی شاعری میں اس نئی اور مختلف قسم کی رومانیت کو ابھارا اور اس لئے ان کا پیام اپنی رومانیت کے باوجود زندگی اور عمل کا نقیب ہے۔ فشتے کے اسی فلسفہ نے جرمنی میں گوئٹے کو ابھارا تھا اور گوئٹے کا مشہور رزمیہ "فاوسٹ" اسی فلسفہ سے اکتساب فیض کرتا ہے۔ اقبال کے نقاد یہ بھول جاتے ہیں کہ گوئٹے اپنی تصوریت کے باوجود رجعت پسند نہیں تھا بلکہ زندگی کے بڑھتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے رجحانات کا نمائندہ تھا۔ اقبال کی شاعری میں ہمیں ایسی عظیم الشان روایات نظر آتی ہیں جو تصوریت کی تاریخ میں اتنی شدت اور وضاحت کے ساتھ پہلی بار ابھری ہیں اور جن کی بنیادی ترقی پسندی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال کے نزدیک یہ کائنات ایک جامد وجود نہیں بلکہ یہ ابھرتی ہوئی اور ترقی پذیر کائنات ہے۔ ارتقا کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ ارتقا جاری ہے اور ابھی نئی نئی دنیائیں اور نئی نئی منزلیں ابھرنے والی ہیں۔ ہماری آگے کی منزل آخری منزل نہیں بلکہ صرف قریب ترین منزل ہے ورنہ تبدیلی اور جدت کائنات کا سب سے بڑا اور پہلا قانون ہے ؎

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ — قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں — میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

کائنات کے نامکمل ہونے اور ارتقا کے تسلسل کو مکمل وضاحت کے ساتھ انھوں نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ان کے نزدیک یہ جہاں اسیر انقلاب ہے اور موت و حیات کی پیکار ہمیشہ ایک نئی حیات کی تخلیق کے سامان فراہم کرتی ہے ؎

جہاں ما کہ جز انگارۂ نیست   اسیر انقلاب صبح و شام است
ز سوہانِ قضا ہموار گردد   ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

اس بدلتی ہوئی کائنات میں انسان ایک تماشائی نہیں بلکہ وہ اپنے عمل سے اپنی جد و جہد سے کائنات کی تبدیلی میں مدد دیتا ہے

اور اس لئے اقبال انسان کو ابھارتے ہیں کہ ؎

بہر نفس کہ برآری جہاں دگرگوں کن   دریں رباط کہن صورتِ زمانہ گذر

کائنات کا یہ ارتقا، ہموار نہیں بلکہ تضادات کی باہمی کشمکش سے رونما ہوتا ہے جسے انھوں نے " ز سوہانِ قضا ہموار گردد" کے خوبصورت مصرعہ میں پیش کیا ہے ۔ تضادات کی باہمی کارفرمائی اور اس سے ارتقا کے عمل کو اقبال نے اپنی اردو شاعری میں بھی بارہا پیش کیا ہے ۔ چنانچہ بانگ درا کی ایک نظم " ستارہ " میں تضادات کے ذریعہ ارتقا کے اس خیال کو اس خوبصورت طریقے سے پیش کیا ہے ؎

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی ایک ولادت مہر   فنا کی نیند مۓ زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل   عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

کائنات کا یہ تغیر تغیر محض نہیں بلکہ اس تبدیلی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کہیں تکرار نہیں زندگی کے بارے میں ساقی نامہ میں کیا ہے ؎

یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی   عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر   مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

بے نظیری ارتقا کی ایک خصوصیت ہے " پسند اس کو تکرار کی خو نہیں " ارتقاء کی ایک خاص خوبی ہے لیکن تضادات کی یہ ٹکر اور اضداد کا یہ تصادم محض اس کا دعوکا نہیں اور نہ صرف خیال اور فکر کی کارفرمائی ہے بلکہ یہ اصل حقیقت ہے یہاں اقبال ہیگل کی تائید نہیں کرتے جس کے نزدیک یہ تضادات صرف فکری ہیں ۔ اقبال کا یہ نظریہ کہ " پسند اس کو تکرار کی خو نہیں " نطشے سے بھی انھیں نمایاں طور پر الگ کر دیتا ہے جس کے نزدیک زندگی نئی صورتیں نہیں پیش کرتی بلکہ بار بار وہی پرانی صورتیں رونما ہوتی رہتی ہیں ۔ اقبال نے نطشے کے اس ازلی تکرار (Eternal Recurrence) کے نظریہ کی بار بار مخالفت کی ہے اور زندگی کے نئے پن اور ابھار کو ہمیشہ اجاگر کیا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی!   اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال نے ایک دوسرے گمراہ کن اور انتہائی خطرناک تصوری رجحان کی بار بار مخالفت کی ہے جس کی رو سے یہ کائنات اور یہ محسوسات بے حقیقت ہے اور صرف ہمارے ادراک کا کھیل ہے اور ہمارے ذہن کا محض ایک کرشمہ ۔ وہ کائنات کو حقیقی سمجھتے ہیں ! افلاطون کے " عالم اعیان یا عالم مثال " کے سخت نقاد ہیں جو ان کے قیاس میں انسان کی قوت عمل کو مفلوج کر دیتا ہے اور اسے زندگی سے بیزار کر دیتا ہے ؎

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت   حکمتِ او بود را نابود گفت
بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود   جانِ او وارفتۂ معدوم بود

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است
قوم ہا از فکرِ او مسموم گشت خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

افلاطون کے فلسفۂ اعیان پر اس سے کڑی تنقید شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ اقبالؔ کسی فلسفہ کی خوبی اس کی صداقت اور
ں کو ایک ہی معیار سے جانچتے ہیں اور وہ یہ کہ آیا یہ فلسفہ اور فکر انسان کے ذوقِ عمل کو ابھارتا ہے یا اسے خوابیدہ کرتا ہے۔ انھوں
ایا کہ اسی فلسفہ کی جس نے ہندوستان کے فکری نظام کو اب تک جکڑ رکھا ہے بڑی شدت سے مخالفت کی۔ یہ فلسفہ عجیب طریقے
ہماری شاعری اور ہمارے فکری نظام پر مسلط ہو گیا تھا چنانچہ غالبؔ جیسا زندگی سے محبت رکھنے والا شاعر بھی اس کائناتی تصور
متاثر ہے اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے" کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف
ل نے کہا ہے

تو چشم بستہ گرفتی کہ ایں جہاں خواب است کشائے چشم کہ ایں خواب خوابِ بیداریست

آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ "ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں" والا فلسفہ ٹھیک ہے یا اقبالؔ کا اقرارِ کائنات۔
اقبالؔ صرف فلسفہ کی خاطر فلسفہ کے قائل نہیں وہ اس فلسفہ کے بالکل عملی اسباب کی بناء پر مخالفت کرتے ہیں۔ فلسفۂ اعیان
ن کو خاموشی صبر پسندی اور قناعت کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ناانصافی اور بے رحمی کے سماجی نظام کو من و عن قبول کر لینے
معیت میں ہنسنے اور خوش رہنے اور تلخیٔ حیات کو خیال کی رنگینی سے خوشگوار بنانے کی جانب راغب کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے
بسیار ادہ کہ بنیادِ عمر بر باد است"۔ اقبالؔ نے حافظؔ کے اس تصور کی سخت مخالفت کی اور اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں
ظ کے بارے میں لکھا تھا ہے

مار گلزادے کہ دارد زہرِ ناب صید را اول ہمی آرد بخواب

اقبالؔ اس خواب آور فلسفہ سے کسی قیمت پر مصالحت کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ ان کے نزدیک زندگی شکستِ طلسمِ ایام
م ہے اور آزادی عمل سے اور کائنات کی تسخیر سے حاصل ہوتی ہے۔ آزادی کا عملی تصور ہماری شاعری اور ادب میں
ل نے ہی پہلی بار پیش کیا اور "اپنے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہوا" کے بجائے ایسے کعبہ کو ڈھانے کی تعلیم دی۔ آزادی ان کے
یک ایں جہانِ آب و گل سے فرار کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی اور نہ زندان میں آزادی کا راز مضمر ہے بلکہ عمل اور فطرت کی
ں کو تسخیر کرنے کے ذریعہ سے ہی آزادی کا حصول ممکن ہے۔ وہ اسپنوزا اور ہیگل کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہیں
ئنات کے جبر اور قوانین کے شعور ہی سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ شعور "مراقبہ" سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ عمل اور مخالف
ں کے ٹکراؤ کے ذریعہ بیدار ہوتا ہے۔ شعور کا منبع اور سرچشمہ عمل ہے نہ کہ تصور اور مراقبہ۔ خواہشوں کے مٹانے اور
زوؤں کو دفن کرنے سے انسانیت کی شخصیت آزاد نہیں ہوتی بلکہ آرزوؤں کی تخلیق ہی آزادی کی ضامن ہے۔ آرزوؤں کا قتل
ف غلط ہے بلکہ اقبالؔ اس نفسیاتی حقیقت سے واقف ہیں کہ ناممکن ہے۔ جاوید نامہ میں اسی خیال کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے
کیا ہے۔ فلکِ قمر پر ان کی گوتم بدھ سے ملاقات ہوتی ہے جہاں وہ اقبالؔ کو اپنا فلسفہ بتاتے ہیں کہ ؎

ہر چہ از محکم و پایندہ شناسی گذرد کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست
از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

گوتم بدھ نے نہ صرف کائنات کی نفی کی بلکہ (Self) اور "انا" کی بھی نفی کی تھی کیونکہ یہی "انا" آرزوؤں اور خواہش
ات ہے اور اس لئے انھوں نے تعلیم دی کہ آزادی اور نجاتِ انا اور نتیجتہً آرزوؤں اور خواہشوں کو ختم کرنے میں مضمر ہے

اس لئے بدھا کا مردِ آزاد جد و جہد کی دنیا کا باعمل انسان نہیں بلکہ بھکشو ہے جو اپنے نفس کو ہر طرح ہلاک کرتا ہے۔ اقبال کی ملاقات ایک رقاصہ سے بھی ہوتی ہے جس نے بدھا کے ہاتھ پر توبہ کی تھی اور دنیا کو ترک کیا تھا لیکن زندگی کی آرزو اور ہنگامۂ حیات کی جستجو ختم نہ ہو سکی اور پھر وہ زندگی کے کارزار میں واپس جانا چاہتی ہے اور اسے اپنی پرانی زندگی اور اس کے رنگین لمحات بری طرح یاد آتے ہیں۔ یہاں اقبال کی انسان دوستی بھی پوری طرح ابھر آتی ہے۔ رقاصہ کے کلمات سنئے۔

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را / یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تاب دار را
از تو درونِ سینہ ام برقِ تجلی کہ من / با مہ و مہر دادہ ام تلخیٔ انتظار را
ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد / عشق فریب می دہد جانِ امیدوار را
تا بفراغ خاطرے نغمۂ تازۂ زنم / باز بہ مرغزار دہ طائرِ مرغزار را
تیشہ اگر بہ سنگ زد، ایں چہ مقامِ گفتگو ست / عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

اقبال کی یہ آواز کہ زندگی کی اصل آرزو ہے اور انسان آرزوؤں کے خاتمہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ان کی تخلیق اور ان کی پرورش ہی کے ذریعہ عظمت حاصل کرتا ہے، پوری اردو اور فارسی شاعری میں ایک نئی آواز ہے اور ایک نیا پیغام ہے ؎

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا / سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم / از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

ان کے نزدیک زندگی لامحدود امکانات کی حامل ہے۔ انسان کی سعی کی کوئی منزل نہیں، اگرچہ یہ منزل راہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ انسان کی اصلی کشمکش ایک خام کائنات کے خلاف ہے اور جب تک یہ کائنات پوری طرح رام نہیں ہو جاتی انسان کو سکون میسر نہیں آسکتا لیکن یہ کائنات ایک لامحدود کائنات ہے اور اس لئے اس سفر کا انجام نہیں۔ زندگی کوہساروں میں اپنا راستہ بناتی ہے اور دنیا کے منتشر شیرازہ کو ایک منظم کائنات کا روپ عطا کرتی ہے ؎

جانم در آویخت با روزگاراں / جوئے است نالاں در کہساراں

یہاں اقبال نے تمام تصوری فلسفیوں سے ہٹ کر اپنا راستہ بنایا ہے اور انسان کا ایک ایسا خوبصورت تصور عطا کیا ہے جو مشکل ہی سے کسی دوسرے تصوری فلسفی کے پاس مل سکتا ہے۔ اقبال کا انسان زندگی کے کارزار سے ہٹ کر کسی نامعلوم خدا کی جستجو میں سرگرداں نہیں بلکہ وہ اسی کائنات کو حسین سے حسین تر اور زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف ہے۔ خدا نے ایک بے ڈھنگی کائنات دی تھی جس کی تہذیب کو خدا نے ادھورا چھوڑا تھا انسان اسی کی تکمیل میں مصروف ہے۔ اس تصور کو اقبال نے پیامِ مشرق کی ایک مشہور نظم "محاورہ ابین انسان و خدا" میں بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے جہاں خدا انسان سے کہتا ہے ؎

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم

انسان جواب دیتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

آخر میں انسان کی تخلیق کی انتہا یہ ہے کہ

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم / من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس نظم میں اقبال نے تہذیب کے معنی پر بھی روشنی ڈالی ہے کیونکہ تہذیب بنیادی طور پر فطرت کی خام اشیاء کو اپنے استعمال کی چیزوں میں بدلنے کا نام ہے۔

اقبالؔ نے زوالِ آدم کے تصور کے برخلاف عروجِ آدم کا تصور پیش کیا ہے جس کے عروج سے ساری کائنات میں ہنگامہ ہے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

انسان کو اس نے خدا کے مقابل کھڑا دیا ہے جس کے عمل کی جس کی تخلیق کی کوئی حد نہیں۔ خوب سے خوب تر، حسین سے حسین تر، مکمل سے مکمل تر کی طرف وہ رواں ہے اور اپنے جذبۂ عمل سے اور جذبۂ تخلیق سے ہر دم ایک نئی زندگی بلکہ ایک نئی کائنات کی تخلیق میں مصروف ہے۔

زشرر ستارہ جویم، زستارہ آفتابے سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

تخلیق کا یہ جوش اقبالؔ سے ہٹ کر ہمیں صرف گوئٹے کے ہاں نظر آتا ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک بھی زندگی عبارت ہے نئی راہوں کی تخلیق اور نئی منزلوں کی جستجو سے تقلید اور پرانی راہوں سے وابستگی ایک گناہ ہے۔ نئی زندگی کی تخلیق میں اگر کوئی کارِ نادر وقوع پذیر ہو اور اگر یہ گناہ بھی ہو تو اقبالؔ کے نزدیک ثواب ہے ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دستِ تو کارِ نادر آید گناہے ہم اگر باشد ثواب است

ان کے پیشِ نظر موجودہ سائنس اور اس کی بے پناہ ترقی تھی اور اس میں انھوں نے سائنس کی تمام نہادبے راہ روی کی مدافعت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہمیں بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اقبالؔ اپنی انقلاب پسندی کو آخر وقت تک نباہ نہ سکے۔ تقلید کے خلاف نعرہ بلند کرنے والا اقبالؔ اور یہ کہنے والا اقبال کہ ؎

تقلید بودے گر شیوۂ خوب پیمبر ہم رہ اجداد رفتے

خود بھی تقلید کا شکار ہو گیا اور رسم و رہ اسلاف کی عظمت کے راگ گانے لگا۔ حفظ دین محمدی کے نام پر انھوں نے پرانی روایت پسندی کو بھی گوارا کرنے کی کوشش کی اور "تزکیہ خودی" کے لئے تقلید اسلاف کا انوکھا نسخہ دریافت کیا۔ وہ خود اپنے فکر کے بے پناہ امکانات سے گھبرا گئے اور ؎

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست پیش ما جز کافر و زندیق نیست

کہتے کہتے یکدم سنبھل گئے، سنبھل کیا گئے اپنے سارے فلسفے کو بھول گئے اور مومن و کافر کے روایتی فرق کو ابھارنے لگے جس کا افسوس [illegible] ان کا مضمون "ختم نبوت و قادیانیت" ہے۔ ان کا بنیادی روحانی نقطہ نظر بار بار ان کے لئے ایک رکاوٹ بن جاتا [illegible] انسان کے صحت مند جوش کو ان کی مذہبیت روک دیتی ہے۔ اقبالؔ مذہب کو اس بحران سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اصل میں [illegible] ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس بحران کا سبب "مذہبی انسان کا مذہب فراموشی" اور روایات سے بے نیازی نہیں [illegible] کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہ بحران صرف تصوراتی نہیں بلکہ موجودہ سائنسی اور علمی ترقی اور معاشرتی تبدیلی کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ موجودہ تہذیبی بحران انحطاط پذیر سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ ہے اور انسان اس بحران سے اسی وقت نکل سکتا ہے جب وہ معاشرہ کے موجودہ رشتوں کو تبدیل کرے۔ وہ اس انقلابی تبدیلی کی بجائے قدیم ادارات سے وابستگی کا درس دیتے ہیں اور یہاں اقبالؔ خود اپنے آپ سے دست و گریباں نظر آتے ہیں کیونکہ قدیم ادارے قدیم تقاضوں کی پیداوار تھے اور انسان کی خلاقی قدیم روایات اور اداروں کی حد بندیوں کو گوارا نہیں کر سکتی۔ ان کا یہ فکری تضاد ان کے بنیادی فلسفہ کا لازمی نتیجہ ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ اقبالؔ نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ انسان کی خودی (Ego) ...... اجتماعی تنظیم و ضبط کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، یہی خودی جو خلاق ہے اس خوبصورت کائنات کو اور تہذیب کے پورے ورثہ کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ لیکن تنظیم و ضبط کے ادارے بھی اجتماعی ہوتے ہیں جنھیں انسان اپنی اجتماعی کشمکش میں بناتے ہیں اور زندگی کی ایک منزل کے اصول

دوسری اور اعلیٰ تر منزل پر کارگر نہیں ہو سکتے۔ لیکن اقبال نے ایک بنے بنائے نظام کے تحت انسان کی خلاقیت کو جکڑنے کی کوشش کی اور ـــ

راہ آبا رو کہ ایں جمعیت است　　　معنی تقلید ضبط ملت است

کا انتہائی گمراہ کن اور رجعت پسندانہ نصب العین پیش کیا۔ انھیں خود اقرار ہے کہ ماضی کے اداروں کا غلط احترام اور ان کے معنوی احیا کی کوشش انسان کی آزادی کو کچل دیتی ہے لیکن یہ بھی ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کے ایک حصہ میں اسی غلط احترام کے جذبہ کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے زندگی کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے پرانی تاریخ اور روایات سے ربط ضروری ہے زندگی کی نئی منزل پرانی منزلوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کی اچھی اور صحت مند روایتوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے لیکن ہر قدم پر او نقد ... امتحان کرتا ہے اور رد و قبول کا عمل یکساں طور پر جاری رہتا ہے۔

اقبال اس راز سے نا واقف نہیں لیکن جہاں تک اسلامی روایات کا تعلق ہے وہ تنقیدی نظر سے ان کا امتحان نہیں کرتے
"حجازی روایات" کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوں کا توں قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود اپنا دیا ہوا یہ سبق ــ ع

آئین نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا　　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

بھول جاتے ہیں اور قدیم روایتوں کی حفاظت کے لئے کمربستہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اس اندیشے نے کہ مذہب کا بحران اتنا شدید ہے کہ اس کا علاج ممکن نہیں، اقبال کو سہما دیا تھا، اور اسی خوف اور اندیشہ کی بنا پر وہ سائنس اور حکمت پر بھی برس پڑتے ہیں حالانکہ بنیادی طور پر وہ سائنس اور حکمت کے شیدائی ہیں کیونکہ سائنس وہ ہتھیار ہے جسے انسان نے تسخیر فطرت کی مہم میں بنایا ہے۔ اقبال کی شاعری کے پہلے دور میں ہمیں سائنس اور حکمت سے ایک والہانہ دلچسپی نظر آتی ہے کیونکہ یہ دور امید اور تخلیق کا دور تھا لیکن جوں جوں سرمایہ دارانہ نظام کا بحران گہرا ہوتا گیا اور مایوسی اور افسردگی کی فضا بڑھتی گئی اقبال کا جوش و خروش بھی سرد پڑتا گیا اور "عقل و عشق" کی پرانی شاعرانہ اور حیات بخش کشمکش علی الاعلان عقل دشمنی اور علم کی مخالفت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ وہی اقبال جنھوں نے کہا تھا کہ

علم از سامانِ حفظ زندگی است　　　علم از اسبابِ تقویم خودی است

علم و فن از پیش خیزانِ حیات　　　علم و فن از خانہ زادانِ حیات

ضرب کلیم میں انتہائی (Synical) انداز میں کہنے لگتے ہیں۔ ع

بندۂ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن

حالانکہ زبور عجم اور پیام مشرق کے دور میں اقبال کے لہجہ میں یہ سختی اور قطعیت نہ تھی۔ وہ صرف "عقل" کے امکانات کی انتہا کے قائل تھے اقبال برگساں کی طرح "عقل" کو صرف عملی زندگی کا ایک ہتھیار تصور کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک عقل حقیقت (Reality) کا علم عطا نہیں کر سکتی۔ یہ فلسفیانہ خیال اس میں کوئی شک نہیں کہ انتہائی خطرناک رجحانات اور امکانات کا حامل ہے اور ... کی تصور اتی بنیادوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے لیکن اقبال پہلے پہلے عقل کی مخالفت میں اتنے پر جوش نہ تھے۔ وہ اس سے بھی نا واقف نہ تھے کہ خرد و جذبہ کی کشمکش ایک خوشگوار ترکیب (Synthesis) پر حل ہو سکتی ہے اور یہ ترکیب (...) انسانی تجربہ ہے ... چونکہ اقبال کی فکر کی بنیادیں جدلیاتی نہ تھیں اس لئے وہ خرد اور جذبہ کی کشمکش میں الجھ کر رہ گئے اور یہ الجھاؤ انھیں ... عقل دشمنی کی منزل تک پہنچا کر رہا۔ انسانی شعور نہ تو عقل محض ہے اور نہ جذبۂ محض بلکہ خرد اور جذبہ دونوں شعور کے لازمی عناصر ہیں۔ کسی کو کسی پر ... یا تفوق حاصل نہیں۔ انسانی ذہن ایک ایسی کلیت ہے جس میں یہ سارے اجزا گھلے ملے ہوتے ہیں ... ہوتا ہے اسی لئے کوئی تجربہ خالصتہً وقوفی (Cognitive) ہے اور نہ خالصتہً جذباتی یا وجدانی۔ ... انتہائی مجرد تجربہ صرف ایک وقوفی (Cognitive) عمل ہے بلکہ ایک جذباتی عمل بھی ہے کیونکہ وہ ... کائنات کے ایک راز کو بے نقاب نہیں کرتا بلکہ

ساتھ ہی اس راز کو بے نقاب کرنے کی تمنا اس کی قوتِ عمل کو ابھارتی ہے اور اسے بے چین کر دیتی ہے۔ اس جدلیاتی عمل کو اقبال نے ایک حد تک محسوس کیا جب انھوں نے کہا ؎

ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں
عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

لیکن یہ دوئی غلط ہے۔ عقل اور عشق الگ الگ کام نہیں کرتے بلکہ ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ یہ حریف نہیں بلکہ رفیق ہیں۔ ایک منزل پر عشق عقل میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عقل عشق میں۔ جب عقل محض (Cold Intellect) ٹھنڈی عقل نہیں رہتی اور عشق یا جذبہ محض (Blind Impulse) اندھا رجحان نہیں رہتا، مقصدی عمل (Purposive action) بن ان دونوں کا تصادم نہ صرف رفع ہوتا ہے بلکہ یہ دونوں مل کر امیرِ کارواں بن جاتے ہیں۔ انتہائی جذبۂ تخلیق میں بھی عقل ہمیں روابط (Relations) کی اس دنیا سے باخبر رکھتی ہے ورنہ پاسِ گریباں باقی نہ رہتا۔ خود اقبال کو اس کا احساس ہے چنانچہ ایک جگہ عقل کے اس عمل (Function) کو انھوں نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ؎

باچنیں ذوقِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

لیکن رفتہ رفتہ اقبال اس جدلیاتی عمل سے بے پروا ہوتے گئے اور بالآخر انھوں نے عقل کی مکمل تردید کے غلط نقطۂ نظر کو اپنا لیا۔ خوش قسمتی یہ کہ اقبال کی شاعری کا یہ دور مختصر رہا ورنہ ان کی بہترین شاعری اس دور کی پیداوار ہے جب وہ تخلیق کے جذبہ سے سرشار تھے اور تسخیرِ کائنات اور شخصیت کی مکمل ترقی اور بھرپور ارتقاء کا درس دیتے ہیں۔ اس لئے اقبال کو محض اس ایک افسوس ناک پہلو کی بنا پر فاشسٹ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال بنیادی طور پر ارتقاء کے اور تسخیرِ کائنات کے شاعر ہیں اور شخصیت کا بھرپور ارتقاء اور مکمل اظہار ان کی فکر اور شاعری کا ایک بنیادی تصور ہے۔ فاشزم ارتقاء کا اور تسخیرِ کائنات اور شخصیت کے اظہار کا دشمن ہے۔ جہاں انفرادی آزادی اور فردیت کے ارتقا کا جوش و ولولہ ہو وہاں فاشزم کا گمان کیسے کیا جا سکتا ہے کیونکہ فاشزم فرد کی ترقی سے زیادہ سماجی استحکام پر زور دیتا ہے۔ فرد فاشسٹ مملکت میں بقول مسولینی تمام غیر ضروری، مہمل اور بے بنیاد آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اس کے برخلاف اسے مملکت کے احکام کی پابندی پر مجبور ہونا پڑتا ہے لیکن اقبال انسانوں کی تعمیرِ خودی کے علمبردار ہیں اور ان کے نزدیک تہذیب اصل میں احترامِ آدمیت کا نام ہے۔ ان کے نزدیک خودی کی تعمیر کی بنیادی شرط یہی ہے کہ دوسرے افراد کی انفرادیت کا مساوی طور پر احترام کیا جائے لیکن وہ اپنے سماجی نقطۂ نظر کو پوری طرح ابھار نہ سکے وہ مذہب کا اس بری طرح شکار رہے کہ سماجی فلسفہ پر زیادہ وقت نہ دے سکے۔ یوں بھی اقبال جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے بڑے مفکر اور فلسفی نہیں۔ انھیں اپنے فکری نظام کے مختلف اجزا کو ترتیب دینے کا موقعہ نہ ملا اور نہ انھوں نے سنجیدگی سے اس کی کوشش کی۔ اس لئے جا بجا ہمیں تضادات نظر آتے ہیں۔ انھوں نے عمل اور عملیت کا فلسفہ تو پیش کیا لیکن کسی ایسی سماجی منزل کی نشاندہی نہ کر سکے جو ہمارے عمل کی مقصود ہو۔ انھوں نے انسان کو تو ابھارا اور انھیں "از خوابِ گراں خیز" کی تعلیم دی لیکن یہ نہ بتا سکے کہ بیدار ہونے کے بعد کریں کیا؟ اس کام کے لئے ایک بڑے مفکر کی ضرورت تھی جو نہ صرف روایتی فلسفہ کا اچھا عالم ہو بلکہ جس نے عصری، سماجی اور سیاسی علوم کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو۔ وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر بعض مرتبہ یہ تصفیہ نہ کر سکے کہ کون زمانہ کی واقعی آگے کی طرف رہنمائی کر رہا ہے اور کون ارتقاء کے قدم روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ انفرادیت اور خودی کی ترقی کے جوش میں یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف انفرادیت کی ترقی مقصود نہیں بلکہ ایک خاص باہمی توازن رہا سے قائم رہنا چاہیے اسی لئے وہ مسولینی سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں ؎

فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب!

عجمی فراتہا یہ ہے کہ یہ ندرتِ فکر و عمل ہمیں نادر چہرے مسولینی کو متعارف کر دینے میں بھی انھیں عار نہیں لیکن یہ بات چنانچہ ... مسولینی کی تعریف سے ایسا نہیں کہ وہ فاشسٹ تھے یا فاشزم کے دوست تھے بلکہ مسولینی اور فاش

کے نام نہاد اور گمراہ کن اطلاعات نے ان کی غلط رہبری کی ۔ اگر وہ فاشست دوست ہو گئے تھے تو ابی سینیا پر مسولینی کے حملے کے موقع پر خاموش بیٹھ جاتے لیکن ان کی بنیادی سامراج دشمنی نے انھیں خاموش نہ رکھا اور انھوں نے شدت کے ساتھ مسولینی کے خلاف آواز اٹھائی کیونکہ اس کی "خودی" ابی سینیا کے مظلوم انسانوں کی خودی کے ارتقا میں حارج ہو رہی تھی ۔ اقبالؔ کی سامراج دشمنی اور غلامی سے ان کی مخالفت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے لیکن ان کی سامراج دشمنی اور غلامی سے ان کی مخالفت کسی ٹھوس سیاسی فلسفہ کا مطالعہ پر مبنی نہیں تھی ۔ اس لئے وہ کبھی بھی جذباتی مخالفت سے آگے نہ بڑھ سکی ۔ ان کا نقطہ نظر ہمیشہ رومانوی رہا گو انداز بیاں ہمیشہ کلاسیکی رہا ۔ وہ صحیح طور پر تہذیب کو "احترام آدمیت" کا نام دیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ کس سیاسی اور سماجی نظام میں اس اصلی تہذیب کا حصول ممکن ہے کیونکہ تہذیب کے سارے تاریخی ادوار میں کہیں بھی ہمیں "احترام آدمیت" کا جامع تصور نہیں ملتا اور نہ جامع عمل کے آثار نظر آتے ہیں ۔ انھیں احساس تو تھا کہ تہذیبی اقدار معاشی اور سیاسی نظام سے وابستہ ضرور ہیں ۔ لیکن ان دونوں کی گہری اور لازمی وابستگی کا انھیں پوری طرح ادراک نہ ہو سکا اس لئے جب وہ نئے سماج کی تشکیل کے بارے میں سوچتے ہیں تو مادی اقدار کے روحانی اقدار پر زور دینے لگتے ہیں اور سماج کی جدید تشکیل کے بجائے فرد کی صحیح تربیت کو مقدم قرار دینے لگتے ہیں حالانکہ فرد کی صحیح تربیت خود ایک صحت مند سماج پر موقوف ہے ۔ اس لئے انسانوں کے معاشی روابط کو بدلنے کی بجائے ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

کی قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں ۔ وہ سرمایہ داری نظام سے نالاں ہیں لیکن انھیں معاشی اور سماجی مظاہر سمجھنے کے بجائے موجودہ انسان کی کم نظری اور روحانی اقدار سے اس کی دوری کو ان خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں ۔ انھیں افسوس ہے کہ باوجود سائنس اور حکمت کی ترقی کے انسان اپنی زندگی کی شبِ تاریک کو سحر نہ کر سکا لیکن اس کا سبب وہ اس کی کم نظری کو قرار دیتے ہیں ۔ حالانکہ یہ دونوں مظاہر یعنی اس کی بے بسی اور بے بصیرتی ایک ہی علت کے معلول ہیں ۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود اقبالؔ بنیادی طور پر جمہوریت پسند اور عوام دوست ہیں ۔ جو شاعر یہ کہہ سکتا ہو

اسے جمہوریت دشمن قرار دینا انتہائی ناانصافی ہے ۔ ان کی فکر کی بنیادی کمزوری انھیں ایک مکمل اشتراکی اور (Communism) جمہوریت پسند بننے سے روک دیتی ہے لیکن وہ انتہائی شدت کے ساتھ تنگ نظر قومیت پسندی، نسل پسندی اور فرقہ بندی کی مخالفت کرتے ہیں ۔ وہ نہ مشرق کے پجاری ہیں اور نہ مغرب کے دشمن بلکہ ساری دنیا کو ایک سمجھتے ہیں ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبالؔ نے اپنی شاعری اور اپنی تخلیقات میں آخر وقت تک اس معیار کی پابندی کی اور اس لئے انھوں نے ہر جمہوری تحریک کی تائید کی اور ہر سامراج دشمن تحریک کی مخالفت کرتے رہے ۔ غلامی کے خلاف ان کی آواز غیر مصلحانہ رہی کیونکہ غلامی انسان کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے اور فرد کے ابھار کی سب سے بڑی دشمن ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

....

تا کجا در تہ بال دگراں می باشی در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

لیکن اپنے سماجی علوم سے چونکہ ان کی واقفیت سائنٹفک نہ تھی اس لئے وہ "جمہوریت" اور "پارلیمانی جمہوریت" میں امتیاز نہ کر سکے اور بعض مرتبہ پارلیمانی جمہوریت کی مخالفت نے جمہوریت کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا ۔ انھیں موجودہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے نقائص کا بخوبی احساس ہے اور یہ جانتے ہیں کہ یہ صرف سرمایہ داری کا ایک ڈھونگ ہے جس میں صرف انسانوں کو گنا جاتا ہے ۔

پارلیمان اور پارلیمانی اداروں میں جنگ زرگری کا مظاہرہ کیا ہے۔

گمر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا　　کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

انہیں سرمایہ داروں کے نمائندوں کو انھوں نے " دہ صد خر " کے نام سے یاد کیا ہے۔ انحطاط پذیر سرمایہ داری سماج کے موجودہ بورژوا (Bourgeoisie) کے لئے " خر " سے زیادہ موزوں لفظ شاید اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا لیکن جمہوریت کی بنیادی اخلاقیات (Ethics) یعنی " فرد کا احترام " ان کی پوری شاعری اور فکر کی اساس ہے اور اس لئے انھیں سوویت تجربہ میں امید کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ اس تجربہ کا پوری طرح ساتھ نہ دے سکے اور اپنی ایک خیالی دنیا میں پناہ لی جسے وہ خالص " اسلامی دنیا " سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو ہے ان کی " حجازیت " ان کی بے بسی کی نظیر ہے اور یہ بے بسی ایک متوسط طبقہ کے حساس فنکار کی آخری منزل ہے اگر وہ اپنی جماعت اور طبقہ کی زنجیروں کو توڑ نہ سکے۔ اقبال کی حجازیت اصل میں موجودہ دور سے ان کی بیزاری کا نتیجہ ہے انھیں انسانوں کی اجتماعی جد و جہد کا اندازہ نہ ہو سکا جو بجائے پیچھے کی جانب مڑنے کے اپنے لئے ایک نئی منزل کی تلاش اور تخلیق کر لیتی ہے۔ فرار کا دشمن اقبال بالآخر اس دنیائے رنگ و بو سے فرار کی جانب مائل نظر آتا ہے اور یہاں ان کی فکر کا ایک ایسا خطرناک موڑ تھا جہاں سے وہ واپس نہ آسکے اور اپنی فکر کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے وہ آہستہ آہستہ تمام انسانوں سے دور ہونے لگے اور آخر میں " نسیمے از حجاز آید کہ نیاید " کی الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ لیکن ان کی حجازیت میں بھی ایک خلوص ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک تھکی ہوئی روح نے اپنی تخلیقی دنیا میں پناہ لے لی ہے لیکن ان کا فنکارانہ خلوص برابر انھیں اس تخیلی دنیا سے باہر کھینچ لاتا تھا اور وہ پھر ایک عجیب جوش کے ساتھ عام انسانوں سے مل جاتے تھے۔ چنانچہ ان کا آخری پیغام جو موت سے کچھ ہی دن پہلے انھوں نے دیا تھا ان کے خلوص کا آئینہ دار ہے۔

آخر میں اقبال کے ایک عظیم الشان ورثہ کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے جس نے اردو شاعری کے پرانے لہجہ کو بالکل بدل دیا۔ اور ایک نیا نقطۂ نظر اور ایک نئی آواز عطا کی۔ باوجود ان تمام تبدیلیوں کے جو اقبال کی شاعری میں ہمیں نظر آتی ہیں ایک چیز ایسی ہے جو ہمیشہ ان کی شاعری کا لازمی عنصر رہی اور وہ ان کا شاعرانہ نقطۂ نظر ہے۔ انھوں نے آخری وقت تک اپنی شاعری کو زندگی کی قوتوں کے ایک زبردست ہتھیار کی طرح استعمال کیا اور اپنی شاعرانہ عظمت کے باوجود کبھی بھی شاعری کو زندگی سے الگ نہیں کیا۔ انھیں مشرق کی قدیم شاعری اور ادب سے بجا طور پر شکایت ہے کہ ؎

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں　　زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

وہ اپنی تصوریت کے باوجود " شاعری اور ادب " کی خود مختاری (Autonomy) کے خطرناک نظریہ کا کبھی بھی شکار نہ ہوئے بلکہ فن کو ہمیشہ زندگی کا خادم سمجھتے رہے۔ ان کے نزدیک نغمہ سے زیادہ نغمہ کا مقصد اہم ہے اور فن سے زیادہ اہم فنکار کا نقطۂ نظر ہے۔

اگر سوز میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام　　حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

زبور عجم میں فن اور ادب پر غلامی اور محکومیت کے تباہ کن اثرات کا انھوں نے بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے اور صحت مند اور مریضانہ فن کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

غلامی کی موسیقی کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

از نے او آشکارا راز او　　مرگ یک شہر است اندر ساز او
ناتوان و زار می سازد ترا　　از جہاں بیزار می سازد ترا

یا پھر غلامی کی مصوری کے متعلق ؎

می چکد از خامہ ہا مضمون موت　　ہر کجا افسانہ و افسون موت

زندگی بخش موسیقی اور مصوری کی اس سے بہتر تعریف اور کیا ہو سکتی ہے

نغمہ می باید جنوں پروردۂ — آتشے در خونِ دل حل کردۂ
نغمہ گرمعنی ندارد مردہ است — سوزِ او از آتش افسردہ است
حور او از حورِ جنت خوشتر است — منکرِ لات و مناتش کافر است
آفریند کائناتِ دیگرے — قلب را بخشد حیاتِ دیگرے

اقبالؔ کے اس فنکارانہ نظریہ کی بنا پر بجا طور پر انھیں ہم اپنی جدید شاعری اور ادب کا امام کہہ سکتے ہیں اور اسی لئے ہم انھیں عہدِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں کیونکہ کسی دوسرے شاعر نے اس شدت کے ساتھ اور اتنے خلوص کے ساتھ اپنے فن اور ادب کو انسانوں کی خدمت اور ان کی ترقی کے لئے وقف نہیں کیا اور اسی لئے ان کی "غلط کاریوں" کو ان کا خلوص اور بے پناہ انسان دوستی کا جذبہ چھپا لیتا ہے۔ کیونکہ بالآخر کسی شاعر یا فنکار کی عظمت اور بزرگی کا پیمانہ اس کا مجموعی تاثر اور مجموعی پیام ہے اور اس معیار پر اقبالؔ کو جانچا جائے تو انھیں ہم بنیادی طور پر ان شاعروں کی صف میں پاتے ہیں جنھوں نے اپنے دور میں تہذیب و تمدن کی ترقی پذیر قوتوں کا ساتھ دیا اور زوال پذیر قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

تحتانیہ سے کالج کی جماعتوں تک

ہر قسم کی درسی اور امدادی کتابوں، اسٹیشنری
اور طلبا کی دیگر ضروریات کی تکمیل کا

واحد مرکز

سنٹرل پبلشرز

عابد روڈ ۔ حیدرآباد دکن

فضل الرحمٰن

جنگ بازوں سے ایک سوال

میں کیا کہوں تم سے جنگ بازو کہ حکمرانی کا راز کیا ہے
حیات کے راگ جس سے نکلیں وہ امن و راحت کا ساز کیا ہے

دلوں کی کلیوں کو جو کھلا دے ہوا ہے وہ خوشگوار کیسی
خزاں کی زد میں نہ آ سکے جو بہار ہے وہ بہار کیسی

اندھیری شب کو جو روز روشن بنائے وہ روشنی کہاں ہے
جو جان ڈالے ہزاروں بے جان تنوں میں وہ زندگی کہاں ہے

فقیر گوشہ نشیں ہوں میں تم کو بادشاہت کا تجربہ ہے
میں ننگ عالم ہوں اور تمہیں عالمی سیادت کا تجربہ ہے

میں جانتا ہوں تمہارے دستِ کرم کا محتاج ہے زمانہ
تمہاری دولت کے آگے کچھ بھی نہیں ہے قارون کا خزانہ

تمہارا وہ لین دین ہے تم حکومتوں کو خریدتے ہو
حسینوں کا ذکر کیا ہے قوموں کی عصمتوں کو خریدتے ہو

تمہارے ادنیٰ اشاروں پر انقلاب آئے ہیں بحر و بر میں
غضب کی ہیں بجلیاں نگہ میں، ہیں زلزلے قہر کے نظر میں

مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے نہیں سوال اور کوئی میرا
جواب دیتے ہوئے نہ سمجھو کہ ہے خیال اور کوئی میرا

جو اشک و خوں کے بہائیں دریا وہ کیسے خود شاد رہ سکیں گے
جہاں کو برباد کرنے والے کب آپ آباد رہ سکیں گے

علی منظور

مردہ فن و کہنہ مزار

(۱)

مرے دل کو دھڑکا کا تبوں سے نہیں
پریشان ہیں بت گردوں سے نہیں
جلائے نظر خوبیاں اُن کی ہیں
میں بدظن نہیں خوبیوں سے نہیں

(۲)

مچادی ان اشعار نے کھلبلی
یہ کہنے لگے مجھ سے سید ولی
دیا شعر کا اذن کس نے تجھے
ارے اس میں ایطا ہے — وہ بھی جلی

(۳)

کہا جب انھوں نے بگڑ کر "تجھے"
کہوں کیا میں، کتنا ہوا دکھ مجھے
نہیں شعر گوئی کا پروانہ پاس
جو ہے آگ سینے میں کیوں کر بجھے

(۴)

نہاں ان کے دل میں فنی نکات
زباں پر سخن گسترانہ ہے بات
نہیں ان کو رابطہ جذبات سے
وہی — فاعلن فاعلن فاعلات

(۵)

بہاریں فضا بھی ہویدا ہوئی
ہنسا گل تو بلبل بھی شیدا ہوئی
میں ابھرا ابھرتے ہی موجِ نشاط
امیدِ عیش کی دل میں پیدا ہوئی

(۶)

مری سمت رُخ بزم کا پھر گیا
میں "نرغے" میں احباب کے گھر گیا
پکار اٹھے سب ماہرانِ عروض
ارے! عین تقطیع سے گر گیا

(۷)

جو اگلے زمانے کے ہیں یادگار
جنوں اُن کے سر پر ہے اب تک سوار
جلی ان کے حق میں ہے جو مردہ فن
زمیں دوز اس کا ہے کہنہ مزار

نیاز حیدر

اقبال نے عوام سے کہا

یہ کرشمۂ خودی ہے یہ کرشمۂ جنوں ہے!
کہ غرورِ میر و سلطاں ترے آگے سرنگوں ہے
تری روح میں ہیں رقصاں مرے قلب کے شرارے

مری شاعری جواں ہے ترے ذوقِ زندگی سے
مرا لحنِ انقلابی ہے نفورِ خواجگی سے
مرا شکوہ سو خداؤں کو زمیں پر اتارے

تجھے کہہ دیا ہے شاہیں، تجھے بال و پر دیئے ہیں
ترے چاک چاک دامن میں ستارے بھر دیئے ہیں
کبھی آنسوؤں کے تاروں میں پرو دیئے ستارے

یہی آب و گل کی دنیا مرا خوابِ جاودانی
تہِ خاک مضطرب ہے مرا جوشِ نغمہ خوانی
تجھے پھر جگا رہے ہیں مرے جاگتے اشارے

وہ سیاستِ فرنگی تری زد پہ آ رہی ہے
وہ ترے دل و نظر پہ مرے امن چھا رہی ہے
وہ بدل گیا زمانہ وہ نکھر گئے نظارے

مرے میکدے میں آ جا مرا بادہ خوار بن کر
مری جستجو رہے گی ترا انتظار بن کر
"چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبرو ئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جوئم ز ستارہ آفتابے"

(اقبال)

سلیمان اریب

چاندنی رات اور جیل

دودھ کی سی ہے چاندنی چھٹکی
یاسمن زار بن گیا ہے جہاں
ہے سرِ چرخ مطربِ مہتاب
بر ربطِ خامشی پہ نغمہ کناں

اک دریچے میں ہوں اداس کھڑا
آنکھ سنگین کی ہے ٹوکے ہوئے
کس طرح چاندنی میں رقص کروں
سنگ و آہن ہیں مجھ کو روکے ہوئے

کھوئے کھوئے ہوئے سے دم سادھے
بام و در نور میں نہاتے ہیں
گود میں اپنی دھرتی ماتا کے!
خاک کے ذرّے مسکراتے ہیں

دوست! لیکن ہم انقلابی جواں
یوں ہی محبوس رہ نہیں سکتے
ہم نے لے لی ہے ہاتھ میں شمشیر
اور ہم ظلم سہہ نہیں سکتے

کتنا گمبھیر ہے یہ سناٹا!
سحر بستہ ہو جیسے ہر اک شئے
دل کو محسوس ایسا ہوتا ہے
جیسے ستار ہی ہو زیست کی لے

وہ زمانہ قریب ہے جب ہم
زیست کو انگبیں بنائیں گے!
حسن و الفت کے جوگ اور بہاگ
چاند کے ساتھ ہم بھی گائیں گے

لطیف ساجد

ہزیمت

جنگ کو فطرتِ انساں کا تقاضہ سمجھیں
ساغرِ خشک کو سرچشمۂ صہبا سمجھیں
درد کو کشمکشِ زیست کا تحفہ سمجھیں
کس قدر سادہ و رنگیں ہے ہمارا پیغام
جانے پھر کس کے اشارے پہ بھڑکتے ہیں عوام

صبح ہوتی ہے تو سنتے ہیں کہ پھر پھول کھلے
رات آئی کہ خراب دلِ مہجور ملے
وقت اک جنتِ بیدار ہے شکوے نہ گلے
زعمِ سرمایہ کو تدبیر کی منزل نہ ملی
کیجیے کیا کہ کوئی صورتِ حاصل نہ ملی

کون ہے پردہ درِ رازِ نہانی اے دل
کس کے سینہ میں مچلتی ہے جوانی اے دل
کس کے ہونٹوں پہ ہے طوفاں کی کہانی اے دل
زندگی امن کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
جنگ کی بات بہت دور نکلی جاتی ہے

بزمِ غربت بھی سنواری ہے وطن سے پہلے
دعوتِ زلف بھی دی دار و رسن سے پہلے
گیت گائے ہیں بیاباں کے چمن سے پہلے
ہم نے کیا کیا نہ کیا شوقِ جہانگیری میں
کوئی بھی منفق دل نہ ہوا پیری میں

کیا کریں وقت عجب آکے پڑا ہے اے دل
موت کو سامنا انساں کا ہوا ہے اے دل
امن کے ہاتھ میں گیتی کا دیا ہے اے دل
روشنی مرکزِ آئینِ جہاں ٹھیری ہے
زندگی مقصدِ ہر پیر و جواں ٹھیری ہے

●

کمال احمد صدیقی

چراغاں کریں گے ہم

تعمیر ایک عالم امکاں کریں گے ہم ہر شمعِ آرزو کو فروزاں کریں گے ہم
یوں بزم زندگی میں چراغاں کریں گے ہم

اپنے تصورات کی دنیا ہے آج اور سرمستیوں کا دور ہے اک سرخوشی کا دور
اس دور کو حیات کا عنواں کریں گے ہم

ہم جاوداں بنائیں گے فصلِ بہار کو سینچیں گے اپنے خون سے ہر لالہ زار کو
رنگِ رخِ بہار نمایاں کریں گے ہم

سوکھے نہ کوئی ہونٹ کوئی چشم تر نہ ہو آئینِ گلستاں میں خزاں کا گذر نہ ہو
یوں اہتمامِ جشنِ بہاراں کریں گے ہم

سرمستیوں کی بزم میں ہوں گی حکایتیں ہم توڑ دیں گے تشنہ لبی کی روایتیں
"چہرے فروغ مے سے گلستاں کریں گے ہم"

ہر ایک چشم شوق میں امید کی ضیا بھر دیں گے ہر جبین میں خورشید کی ضیا
ہر ایک لب کو لعل بدخشاں کریں گے ہم

حمایت علی شاعر

نذرِ دکن

معاف کر دو مرے وطن کے گلاب زادو
کہ میں نے تم سے عجب گھڑی بے وفائی کی ہے
تم آج اپنی صفوں کو ترتیب دے رہے ہو
اور آج میرے غرور نے جبہ سائی کی ہے

میں اپنی دھرتی سے دور اک دوسری زمیں پر
خود اپنی عظمت کی آپ تحقیر کر رہا ہوں
بہ فیضِ افلاس چند نان جویں کی خاطر
میں اپنے مرقد کی آپ تعمیر کر رہا ہوں

ہزاروں آہوں کے آنسوؤں کے خموش نالے
مرے عزائم پہ آج آوازہ کس رہے ہیں
میں لاکھ ہنس ہنس کے دے رہا ہوں فریب خود کو
یہ میرے احساس کو سنپولے سے ڈس رہے ہیں

کچوکے دیتا ہے ہر نفس کوئی اندر اندر
کوئی مسلسل لہو میں زہراب گھولتا ہے
تڑپ کے یکلخت چیخ اٹھتی ہے روحِ مضطر
کوئی کچھ اس طرح دل کو پیہم ٹٹولتا ہے

میں اپنے ہونٹوں کی قبر پہ مسکراہٹوں کے
حسین پھولوں کی چادریں کب تلک چڑھاؤں؟
میں خود کو اور اپنے پیش و پس کو فریب دینے
بجھی سی شمعِ نظر کی لَو کب تلک بڑھاؤں؟

نہیں نہیں میں فریب خود کو نہ دے سکوں گا
یہ زہر قطرہ بہ قطرہ اب میں نہ پی سکوں گا
میں اپنے جمہور کی طرف سے نگاہ پھیرے
حیات کا دامنِ دریدہ نہ سی سکوں گا

میں دور رہ کر بھی تم سے نزدیک ہوں رفیقو
تمہارے بیتاب دل کی دھڑکن کو سن رہا ہوں
تمہاری آنکھوں میں جاگتا ہے جو خواب فردا
میں اس کی تعبیر کے حسیں پھول چن رہا ہوں

میں جانتا ہوں ــــ جو ظلمتیں آج پھن اٹھائے
تمہارے خوابوں کے لالہ زاروں کو ڈس رہی ہیں
وہی بہ عنوانِ دیگر اس سرزمیں پہ بھی ــــ
ہماری صبحوں کی نو بہاروں کو ڈس رہی ہیں

یہاں بھی انسان کا وقار اک حقیر شئے ہے
جو چند سکوں کے مول کانٹوں پہ تل رہا ہے
یہاں بھی تاریخ اپنا چولا بدل رہی ہے
خداؤں کا ناخداؤں کا پول کھل رہا ہے

حسین لفظوں کی اوٹ سے جھانکتی حقیقت
ضمیر کی سر بہ مہر خبریں اڑا رہی ہے
حرم کے محراب کے چراغوں کی اونگھتی لو
آلِ افسانۂ مشیّت دکھا رہی ہے

عوام کے شب گزیدہ خوابوں کے سرداق کو
ابھرتا خورشید اپنی کرنوں سے دھو رہا ہے
عقیدتوں کے سیاہ محبس میں دھیرے دھیرے
شعور انگڑائی لے کے بیدار ہو رہا ہے

میں عہد کرتا ہوں میرے بچھڑے ہوئے رفیقو
تمہارے ہر مورچے پہ پرچم بکف رہوں گا
میں اپنے جمہور کے قدم سے قدم ملائے
تمہاری جہدِ حیات میں صف بہ صف رہوں گا

عبدالرؤف عروج

دوسری جنگ کے بعد

جواں ولولوں کی ضیا باریوں سے حسیں رو کلا کے کھنڈر جگمگائے
جنھیں جنگ کی آگ جھلسا گئی تھی وہ چہرے بہ طرزِ دگر جگمگائے
اٹھا ہمہمہ ــــ امن کا آشتی کا خیالوں کے ویران در جگمگائے

یہی رو کلا ارضِ پولینڈ کا دل یہیں امن کی پہلی للکار جاگی
مہکنے لگے آنچلوں کے کنارے ضیا بخش گیتوں کی، جھنکار جاگی
سکوں کی پرستار، مجبور دنیا یہ آہنگِ احساس و کردار جاگی

ہٹاؤ دماغوں سے کہنہ لبادے فسردہ خیالات میں گم کہاں ہو
اڑاؤ فضاؤں میں نیلے پھریرے پرانی روایات میں گم کہاں ہو
جواں فکر دانشورو اور رفیقو اس امنڈی ہوئی رات میں گم کہاں ہو

یہ مغرب کے آقاؤں کا فیصلہ ہے "زمانہ پہ اک اور احساں کریں ہم"
کہیں اپنی فطرت گوارا کرے گی کہ آگ اور بارود میں جل مریں ہم

بہت ہم نے سمجھا تھا ان نازیوں کو　　یہ ممکن نہیں اب ان سے ڈریں ہم

زمانہ کہاں سے کہاں آگیا ہے　　یہ مغرب کے آقا کہاں سوچتے ہیں
نہ دیکھی تھی دنیا نے ایسی تباہی　　بنے کتنے انساں دھواں سوچتے ہیں
اگر جنگ ہوگی تو پھر کیا نہ ہوگا　　کچھ اس طرح اہل جہاں سوچتے ہیں

شاعر

مرے منفرد گیت، مشہور نظمیں　　ہیں خاکستر آرزو کے سوا کیا
ہزاروں ترانے لہو بن چکے ہیں　　دلوں کی ابھرتی ہوئی سی نوا کیا
وہی سرد آنسو، وہی گرم نالے　　گزشتہ لڑائی میں مجھ کو ملا کیا

مصوّر

بہت میں نے سمجھا ہے ناقدریوں کو　　بہت میں نے دیکھے ہیں ایسے زمانے
یہ سادہ تصاویر، معصوم خاکے　　نظر کی حکایت، وفا کے فسانے
میں ان کے لئے دل کو خوں کر چکا ہوں　　سلامت رہیں میرے آئینہ خانے

موسیقار

ہواؤں میں آگ اور بارود ایسی　　فضاؤں میں انگاروں کا رقص درم کیوں
نئی سر اٹھاتی ہوئی کونپلوں پر　　خزاں بار جھونکوں کی مشقِ ستم کیوں
مہکتا رہا پیار جس بنسری سے　　وہی دے گی اب نفرتوں کو جنم کیوں

فلسفی

غرض کوش ارباب زر کے سہارے　　مری فکر مجھو لی پاتی رہی ہے
مرا فلسفہ جنگ لاتا رہا ہے　　نظریات کی بات چلتی رہی ہے
مگر آگ جو بھی لگائی تھی میں نے　　اسی میں مری روح جلتی رہی ہے

مزدور

بصد ہوشیاری سیاست گردوں نے — مجھے کارخانوں میں دفنا دیا تھا
میں مجبور تھا اسلحہ سازیوں پر — مرا رنگ عزت الم آشنا تھا
کسے تھی خبر میری محنت کا حاصل — ابھرتی ہوئی نسل کا خاتمہ تھا

سائنسداں

مری جستجو ارتقاء کا قدم ہے — مرے ولولے آشتی کے دیئے ہیں
زمانے کو خوفِ فنا دوں تو کیوں دوں — مرے تجربے زندگی کے لئے ہیں
کسے تھی خبر میری "ریسرچ گاہیں" — بکھرتی ہوئی موت کے زاویے ہیں

سپاہی

زمیں پر کچھ اس طرح سے بم گرائے — کئی زلزلوں کو جگایا ہے میں نے
ہر اک شہر و دیہات مسمار کرکے — جہاں میں تہلکہ مچایا ہے میں نے
وہی قحط، بیکاری، افلاس، فاقے — بتاؤ بھی کیا اور پایا ہے میں نے

مورّخ

سمندر میں جلتے ہوئے "تارپیڈو" — فضا پر جہازوں کی اونچی اڑانیں
ہر سمت گمنام لاشوں کے انبار — چیختی ہوئیں زندگی کی چٹانیں
نہیں مجھ میں ہمت کہ پھر لکھ سکوں میں — کسی تیسری جنگ کی داستانیں

عوام

ہم ان سامراجی نظر بازیوں کو — زمانے میں یوں عام ہونے نہ دیں گے
محبت ودیعت ہے فطرت میں اپنی — محبت کو بدنام ہونے نہ دیں گے
یہ تحریک ہے، امن کی زندگی کی — کسی طرح ناکام ہونے نہ دیں گے

عزیز قیسی

رجز

ہم ہیں مشرق کی شفق عارضِ مغرب کا نکھار
فصلِ رفتہ کے امیں گلشنِ فردا کی بہار
ہم ہیں فریاد، رجز، چیخ، نوا، گیت، پکار
ہم ہیں سینوں کی جلن، ہم ہیں نگاہوں کے شرار
پیار میں نیل ہیں سختی میں ہمالہ ہیں ہم
اس سیہ خانۂ ہستی کا اجالا ہیں ہم
ہم سے آباد، کلیسا، حرم و بت خانہ
ہم سے ہے سجدہ گہِ شوق درِ جانانہ
ہم سے معمور ہے تہذیب کا ہر کاشانہ
ہم ہیں تاریخ کی عظمت کا حسیں افسانہ
چھپ گئے خاک میں سو بار پہ ہم زندہ ہیں
ہم جدھر سے بھی گئے نقشِ قدم زندہ ہیں
پوچھ لو زینتِ تاریخ ضیا کس کی ہے
داستانوں میں، فسانوں میں وفا کس کی ہے
گیت میں، نقش میں، مورت میں ادا کس کی ہے
یہ جہاں کس کا ہے، یہ خاک دھرا کس کی ہے

نور و تنویر و تب و تاب و ضیا ہے ہم سے
لالہ و گل، چمن و سرو و صبا ہے ہم سے
ہم سے ہر خواب کو رنگینیٔ تعبیر ملی
عشق کو سوز ملا حسن کو تنویر ملی
سم و زہراب کو تریاق کی تاثیر ملی
خاک کے ذروں کو افلاک کی تقدیر ملی
ہم نے فولاد کو بھی شہپرِ پرواز دیا
سنگِ پابستہ کو فرمانِ تگ و تاز دیا
حسن کو ہم نے محبت کے خزینے بخشے
زیب و آرائش و زینت کے قرینے بخشے
لعل و الماس و زمرد کے نگینے بخشے
دل ربائی کے یہ انداز ہمیں نے بخشے
زلف کو دے کے گہر کاہکشاں کر ڈالا
شب تاریک کو خورشید نشاں کر ڈالا
گیت ہم سے ہے نگاروں کی دل آرائی کے
حسن کے ناز کے انداز کے رعنائی کے
لذتِ وصل کے دردِ شبِ تنہائی کے
کوچہ گردی کے خرابات کے رسوائی کے
گیت جو تیغ بھی ہیں، زخم بھی مرہم بھی ہیں
کبھی لوری کبھی نعرہ، کبھی ماتم بھی ہیں
گیت جاگی ہوئی ہمت کی صف آرائی کے
تازہ دم ہوتے ہوئے عزم کی پیمائی کے
جوش کھائے ہوئے سینوں کی شکیبائی کے
علم و حکمت کے حکایات کے دانائی کے
کام تاریخ کا گیتوں سے لیا ہے ہم نے
زلزلہ لمحات کو پابند کیا ہے ہم نے

یہ زباں جس کو زمانے نے فغاں بخشی ہے
اس کے اعجاز نے گونگوں کو زباں بخشی ہے
اس کے فرمان نے ذرات کو جاں بخشی ہے
خاک زادوں کو کہ اک کی عناں بخشی ہے
اس کو کاٹا جو کسی نے تو لہو بول اٹھا
اک زباں بند ہوئی ہر بنِ مو بول اٹھا
جان دی نبض جہاں تجھ میں لہو بھر بھر کے
کتنے مُردوں کو جلایا ہے ہمیں نے مر کے
سرمہ کر ڈالا چٹانوں پہ ہتھیلی دھر کے
رکھ دیا آہن و فولاد کو پانی کر کے
یہ جو صد رنگ مناظر کا تماشہ ہے جہاں
خونِ دل قوت بازو کا کرشمہ ہے جہاں
ہم سے تعمیرِ ارم کر لئے شدادوں نے
تاج بنوائے ہیں ہم سے ہی دغا زادوں نے
سختیاں پائی ہیں اہرام کی بنیادوں نے
بستیاں کتنی بسائیں ہمیں برباد ووں نے
جیتے جی عرصۂ انساں تری تقدیر بنیں
ہم وہ سیماب ہیں مرجائیں تو اکسیر بنیں
ہم وہ نعرہ ہیں، فضا کانپ رہی ہے جس سے
ہم وہ بازو ہیں، جفا کانپ رہی ہے جس سے
ہم وہ سینہ ہیں، بلا کانپ رہی ہے جس سے
ہم وہ نشانہ ہیں، ہوا کانپ رہی ہے جس سے
ہم وہ ہیں نام پہ الفت کے جو مرجاتے ہیں
جادواں رسم وفا دہر میں کر جاتے ہیں
ہم سبک گام کسی سے بھی رکائے نہ رکے
دھوپ جھلسا دے کہ آئے جو ساتے نہ رکے

راہزن کتنی دفعہ لوٹنے آئے نہ رکے
رہبروں نے بھی کئی دام بچھائے نہ رکے
وقت رفتار کو کھو دے جو قدم رک جائیں
دم الٹ جائے زمانے کا جو ہم رک جائیں
جب بھی بڑھتی گئی آرام کی ناوک فگنی
زندگانی کی تڑپ اور جواں سال بنی
جاں کنی، فاقہ کشی، تشنہ لبی، بے وطنی
سو دفعہ دیکھی ہے تاریخ نے یہ سینہ زنی
سو دفعہ لاکھ دفعہ ہم پہ ستم ہوتا ہے
ہم سے افسانۂ تاریخ رقم ہوتا ہے
خون بھی ذرّوں پہ ٹپکا ہے جواں ویروں کا
کھل گیا ان پہ بھرم مہر کی تنویروں کا
جس جگہ نغمہ ابھرنے لگا زنجیروں کا
گھٹ گیا سینے میں دم کتنے جہانگیروں کا
یہ بجا ہے کہ ہمیں خون میں نہلا ڈالا
پس گیا زیرِ قدم ہم سے الجھنے والا
رات نے بڑھ کے بجھا دی جو کسی شمع کی لو
ہنس پڑی رات کی ناکامی پہ خورشید کی ضو
ہم جو مٹ جائیں ابھر آئیں کئی عالم نو
ہم جو مرجائیں تو جی اٹھے ہمارا پرتو
موت کو کچھ نہ ملا اشکِ ندامت کے سوا
ظلم کچھ پا نہ سکا تازہ بغاوت کے سوا

وحید اختر

تنہائی

بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
ہر ایک گام نیا جادہ، مشکلات نئی
نئے تقاضے، نئے تجربے، نئے آلام
ہر اک مقام سفر پہ ہے کائنات نئی
وہی ستارے، وہی چاند اور وہی سورج
مگر نیا ہے ہر اک دن، ہر ایک رات نئی
عجیب بات ہے مرنے کی آرزو کر کے
کبھی کبھی تو ملی ہے مجھے حیات نئی
بزورِ جہد مسلسل، بہ فیضِ عزم و عمل
ہر ایک مشکلِ راہِ سفر ہوئی آساں
بہ تابِ شمعِ یقین و بہ گرمیٔ رفتار
ہر ایک منزلِ دشوار کے ملے ہیں نشاں
جنھوں نے مجھ کو سہارا دیا تھا آج تلک
وہ حوصلے وہ عزائم جواں ہیں اب بھی
جو تنگ تھے مری مشکل پسند ہمت پہ
وہی حدودِ زمان و مکاں ہیں اب بھی
مگر حیات میں آیا ہے کونسا یہ مقام
ہوا ہے آج مرے دل کو شکوۂ آلام
بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگی کے

●

مجھے عزیز ہے دل اور دل کی ہر دھڑکن
میں اپنے دل کے تقاضوں کو کیسے سمجھاؤں
دلِ جواں سے عبارت ہے زندگی اپنی
مگر اداس ہے یہ کیوں نہ اس کو بہلاؤں
یہ جامِ شیشہ ہے، ٹوٹا تو جڑ سکے گا نہ پھر
اسی سے نشہ ہے کس طرح اس کو ٹھکراؤں
یہ کشت زار مرے ہی لہو نے سینچی ہے
اسے لٹا کے میں کس دل سے آگے بڑھ جاؤں
یہی رفیقِ سفر ہے، یہی ہے راہ نما
اسے ہی چھوڑ کے میں ٹھوکریں کہاں کھاؤں
اسی کے فیض سے ہے سیلِ زندگی جاری
اسی کے دم سے ہے آساں ہر ایک دشواری
بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
بغیر ہمرہیٔ دل نہ چل سکوں گا میں

●

نہ جانے کونسی منزل پہ آج آ پہونچا
قدم اٹھانا بھی چاہوں تو چل نہیں سکتا
نہ جانے کس کا مجھے آج انتظار سا ہے
بغیر جس کے مرا دل بہل نہیں سکتا
میں خود کو جتنا بھی بہلا دے دینے کی خاطر
ہجوموں، انجمنوں، محفلوں میں لاتا ہوں
مجھے کسی کی کمی اور ہوتی ہے محسوس
میں خود کو جتنا سبھوں سے قریب پاتا ہوں
اسی قدر مجھے احساس بُعد ہوتا ہے
ہر ایک خوش ہے اس آباد و شاد دنیا میں
پکارتا ہے یہ دل، تُو تو اب بھی تنہا ہے

●

اداس رات! طویل و خموش و نوحہ کناں
تمام عرصہ گہہ زیست خواب گاہِ عظیم
ہوا بھی چلتی ہے تھم تھم کے سسکیاں بھرتی
مہِ تمام کا بے نور و زرد رو، چہرہ
دکھا رہا ہے غمِ دل کو جیسے آئینہ
چہار سمت اڑاتا ہے چاندنی کا غبار
کہ میرے دل پہ برستی ہے تیرگی کی پھوار
بہت گراں ہے شبِ ماہتاب و تنہائی
مرے خیال کی رعنائیو سہارا دو
یہ چاند تارے مرے درد دل کو کیا جانیں
تصورات کی برنائیو سہارا دو
فلک کی پست نگاہی سے ہے گلہ مجھ کو
ضمیرِ ارض کی اونچائیو سہارا دو
یہ تیرگی ہے کہ گھٹتا ہے دم اجالوں کا
دیارِ شعر کی پہنائیو سہارا دو
ہوائے یاس سے احساسِ غم بھڑک نہ اٹھے
مجھے امید کی پرچھائیو سہارا دو

●

خوشا کہ موجِ تصور ہوئی ہے بال کشا
مقامِ میکشی و بے خودی پہ آ پہونچا
خیالِ یار کا پیکِ سبک خرام آیا
دیارِ دوست سے دل کے لئے پیام آیا
ٹھہر بھی جا کہ ستاروں کو نیند آتی ہے
جگا کے چاند کو ان کی سواری آتی ہے
سکوتِ شب کو بھی اذنِ نواگری دے دو
نفس نفس کو زبانِ پیمبری دے دو
بہت حسین ہیں شب و روز آفتاب و قمر
کسی کے حسن کا پرتو ہے یا عروجِ نظر
خیالِ یار کی رنگینیاں معاذ اللہ
وصالِ دوست کی ساعت، گناہ پاکیزہ
کچھ اتنی مست ہوئی جا رہی ہے بزمِ خیال
تمام عشق کا پرتو، تمام عکسِ جمال
یہی صنم کدۂ ذہنِ شاعرِ تنہا
یہی ہے معبدِ فکر و نظر، یہی قبلہ
یہاں نہیں کبھی دل کو ملالِ تنہائی
ہجومِ ناز و ادا کی ہے محفل آرائی
غرورِ حسن ہے خود عشق کا تمنائی

بہت طویل ہے یوں تو حدیثِ بزمِ خیال
مگر زباں کی نہیں شرحِ حسنِ دل کی مجال

●

بہت عزیز سہی مجھ کو بزمِ فکر و خیال
بہت طویل سہی یہ حضوریِ جاناں
عزیز تر ہیں مگر زندگی کے ہنگامے
طویل تر ہے مگر ساعتِ غمِ دوراں
زمیں پہ کھینچ ہی لاتی ہے بے پناہ کشش
خمار ٹوٹ ہی جاتا ہے ایک منزل پر
جسے کیا تھا بہ مشکل اسیرِ دامِ خیال
نکل ہی جاتا ہے وہ دسترس سے پھر باہر
فقط خیال سے تنہائیاں نہیں کٹتیں
فقط بیان سے دشواریاں نہیں گھٹتیں

●

مرے صنم کدۂ ذہن کی حسین معبود
تخیلات کے پردہ سے باہر آجاؤ
زمیں کو ہی بنانا ہے جنتِ انساں
فرازِ جنتِ تخیل سے اتر آؤ
دماغ و دل کی نظر نے تو خوب دیکھ لیا
نصیبۂ نگہِ انتظار چمکاؤ
سمجھ نہ بیٹھے فریبِ گماں شعور تمہیں
نقاب چہرے سے اپنے ذرا تو سرکاؤ
تصورات کی محفل کو زندگی دے دی
اب حادثاتِ زمانہ پہ بھی ترس کھاؤ
نہ جانے کتنے فسانوں کا آج عنواں ہو
حقیقتوں کو بھی اپنا رنگ دکھلاؤ
ہزار روپ سے چھپ چھپ کے مسکراتی ہو
کسی بھی روپ میں اب سامنے تو آجاؤ
ڈرا رہی ہے غمِ روزگار کی ظلمت
نظر نظر میں غمِ دل کی روشنی لاؤ
سفر طویل ہے، منزل ہے دور، سخت ہے راہ
اب اور سختیٔ ہجراں میں یوں نہ تڑپاؤ
بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
رفاقتِ دلِ تنہا اب آ کے فرماؤ

●

تمہاری آنکھوں سے پیتا رہوں شراب اگر
ہر ایک زہر کو پی کر بھی جی سکوں گا میں
تمہاری زلف کے سایہ میں ہے پناہ اگر
بھڑکتی آگ کے شعلوں سے کیا ڈروں گا میں
متاعِ زیست گراں ہے اگر زمانہ میں
تمہارا حرفِ محبت حیات پرور ہے
بہت ہی تیرہ و مایوس کن ہے رات اگر
تمہاری اک نظرِ التفات رہبر ہے
نظامِ ظلم و تشدد، نظامِ زرداری
ہر اک نظامِ غلط کار کو بدلنا ہے
کچھ اور تیز ابھی ہوگی جہدِ آزادی
ابھی تو اور بھی دشوار راہ چلنا ہے
تمہارا ساتھ اگر ہو تو سہل ہے سب کچھ
بس اب تقاضۂ دل کو نہ اور ٹھکراؤ
پکارتا ہے تمہیں ہر نفس چلی آؤ

شاذ تمکنت

شکست

آج میں پیار کے مندر میں بچشمِ گریاں
آخری پھول محبت کے چڑھا آیا ہوں
مجھ کو تکتے تھے تمنا کے سلگتے تارے
ان کو نومیدی سے چپ چاپ سلا آیا ہوں
اپنے اشکوں سے پروئے ہیں شکستہ گجرے
تربتِ عشق کو بھی بھر کے سجا آیا ہوں
تیرا پیمانِ شکستہ ترا آزردہ کرم
میرے اس عشقِ دو روزہ کی امیدوں کا بھرم

آج بھی نام مرا تیری ہواؤں کو ہے یاد
جانتے ہیں مجھے تیرے شفق و ابر و باد
میری تنہائی کا سیلا ہوا آنگن ہے گواہ
دھیرے دھیرے چلی آتی تھی ترے قرب کی دھوپ
ڈھل گئی تھی مرے سینے میں ترے پیار کی اوس
کتنے رنگوں نے سنوارا تھا مری آس کا روپ

یاد ہے عقدۂ جاں کو ترے ناخن کی تراش
سرِ سودا زدہ بھولا نہیں تیرے در و بام
بن گیا پاؤں کی زنجیر مرا عہدِ وفا
بھول سکتا ہے کوئی تیری نگاہوں کا پیام
آنکھ کو یاد ہے اب بھی تری پلکوں کا جھکاؤ
دل نے دیکھا ہے ترے دھانی دوپٹوں کا چناؤ
آج بھی آتی ہے مجھ تک ترے دامن کی ہوا
مجھ سے شرماتی ہے اب بھی ترے ہاتھوں کی حنا
مجھ کو پہچانتی ہے تیرے شبستاں کی فضا
میں کہ تھا رمز شناسِ سخنِ راز نما
آج بھی ہے نگراں تیری کم آمیز نگاہ
کتنا ویراں ہے مرا سلسلۂ شام و پگاہ
کونپل احساس کی شبنم میں دھلی جاتی تھی
میری قسمت خمِ ابرو میں کھلی جاتی تھی

میری نظموں کی جبینوں پہ ترے رخ کی پھبن
میرے اشعار کے سینوں میں ترے غم کی چبھن
پُر فشاں ہے مری گفتار میں بھولی ہوئی چوٹ
میرے انفاس میں دکھتے ہوئے زخموں کی کرن
میری آنکھوں کی خلائیں ہیں کہ اجڑے بازار
میری نظریں ہیں کہ ہاری ہوئی آوارہ سپاہ

راگ چھیڑتے ہیں تو آہوں کو زباں ملتی ہے
دل کے دکھتے ہی رگِ سنگ تپاں ملتی ہے
صبح جب نام ترا لے کے چلی آئے گی
میرے غم خانے کی تاریکی میں کھو جائے گی
وقت جب تیرے تصور کو بھی گہنا دے گا
میرا ہر عہدِ جواں مجھ کو اُپہنا دے گا
ترے ایواں کے دریچوں کے مصفا شیشے
یاس کی دھند میں سنولائیں گے کجلائیں گے
جل نہ پائیں گی سرِ شام چراغوں کی لویں
کتنے معمورۂ شب تاب اجڑ جائیں گے
رات جب یاد دلائے گی دعائیں مجھ کو
کس قدر روئیں گی تاروں کی ردائیں مجھ کو
سرد ہو جائے گا جب نیم شبی کا پہلو
قطرہ قطرہ مری آنکھوں سے گریں گے آنسو

تیری ساحل پہ وہ ٹوٹے ہوئے معصوم سے خواب
تھام لیں گے مرا دامن تو میں کیا دوں گا جواب
نقشِ پا میرے، تری رہ پہ بگولے بن کر
چاک کر دیں نہ کہیں نرم ہواؤں کا جگر
سوچتا ہوں کہ تری آنکھ سے اوجھل ہو کر
مدتوں بعد ترا سامنا ہو جانے پر
ایک اک لمحے کو ہنس ہنس کے دعا دیتا ہے
دلِ مرحوم کو رو رو کے صدا دیتا ہے

کس کو سمجھاؤں کہ با وصفِ نشاطِ محزوں
رچ گیا منظرِ فطرت میں مرا سوزِ دروں

پیڑ سوجاتے ہیں ہنکارتی لو کے صدمے
خشک افشانیٔ دامانِ سحر کی خاطر
صحنِ برگِ گلِ شفاف سے شبنم جو اڑے
خوئے بالیدگیٔ شاخ و شجر کی خاطر
دلِ تیشہ زناں سیرابِ خطِ موجۂ خوں
ولولہ خیزیٔ مسجودِ نظر کی خاطر
صدفِ بحر مثالِ تہی پہلوئے حباب
عفتِ قطرۂ نیسان و گہر کی خاطر
تروح اک عمر سے ہے سہن ستم ہائے دگر
کن فلک ساز دعاؤں کے اثر کی خاطر

شورشِ دل ہدف طعنۂ اغیار ہنوز
اشک ہم مرتبۂ جنبشِ سیارہ ہنوز

نیم شب بڑھتی چلی جاتی ہے احساس کی لو
گلے گھلتی ہے شبک نجم طلا فام کی ضو
راہ گیروں کے تھکے قدموں کی بیزار آواز
نیند اڑا دینے کا بن جاتی ہے سنگین جواز

مونہہ موڑ سلگتی ہوئی بوجھل شامیں
آہ بھرتی ہوئی پیڑوں کی برہنہ شاخیں
میری جلتی ہوئی نبضوں کی نگہبان تھیں
میری ویرانیٔ خاطر سے پریشاں تھیں
اس شب و روز میں کس غم کا فسوں زائی ہے
یا فقط میرا ہی اعجاز خود آرائی ہے

[illegible] سے جھکی ہوئی دوپہروں کا سماں
گھر کی دہلیز پہ سناٹوں کو پھیلاتا ہے
یوں فضا ہوتی ہے جیسے کوئی مایوس دعا
اپنے فردا کے تصور سے لرز جاتا ہے

چاند کے عکس کی، پانی میں طلائی پھانکیں
جیسے آتش کدۂ موج میں ٹھنڈی آنچیں
تیلمیں پانی کے بہتے ہوئے پتلے فیتے
نیند کے ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے جیسے
گھنے جنگل کہ جہاں خواب نمو پاتے ہیں
وہ ہوائیں کہ فرشتوں کے قدم آتے ہیں
کون سمجھے گا کہ اس منظرِ فطرت کا سبھاؤ
اور دہکاتا ہے بھولی ہوئی یادوں کا الاؤ
فاختاؤں کی صدائیں جو چلی آتی ہیں
میری تنہائیاں سوچوں سے لپٹ جاتی ہیں
تتلیاں اڑتی ہیں جس طرح شفق کے ٹکڑے
بھونرے گاتے ہوئے کاجل کی قبائیں پہنے
رقص کرتی ہوئی چڑیوں کے سہانے دوہے
ان کو تکتے ہوئے گماں ہوتا ہے غم خواری کا
دیدنی ہے یہ سماں دل کی طرح داری کا

کتنے تلخاب اتارے ہیں تہہ کام و دہن
کتنے صحراؤں کی پہنائیاں کاٹیں میں نے
مدتوں بعد کھلا ہے یہ سلگتا ہوا راز
رونقیں بولی تھیں تنہائیاں کاٹیں میں نے

حسن نعیم

حسن و عشق

کچھ بھی کہہ لیں مرے ناصح، مرے احباب مجھے
عشق کو جرم میں تسلیم نہیں کر سکتا
اس کی باتوں پہ یقیں کیسے کرے گا کوئی
حسن کی دل سے جو تعظیم نہیں کر سکتا

عشق نے بدلا ہے ہر دور میں کردارِ جنوں
حسن نے بدلا ہے ہر دور میں اندازِ کرم
کنجِ خلوت سے نکل آئے ہیں بیدار حبیب
جنتِ غم، ہیں نہ وہاں آج کنیزانِ حرم

ان دنوں عام ہے ہر بزم میں توہینِ جمال
کوئے جاناں کے علاوہ بھی ہے رسوا غمِ دل
مجھ سے کہتے ہیں بصد جوش مرے بعض رفیق
"حسن کا نام نہ لو، چھوڑ دو ذکرِ محفل"

حسن معمار ہے، اب اپنے صنم خانہ
عشق آغاز ہے، اب جہد کا انجام نہ
ہجر اب ختم نہیں آہ سحر گاہ
وصل اب جسم کی قربت کا فقط نام نہ

زندگی جہد ہے، اک جنگ ہے لیکن اس میں
کون کہتا ہے نہیں عشق غمِ نو کا امیں؟
حسن جلاد و ستم گر ہی نہیں دوست بھی ہے
کعبۂ نو کے لئے اس نے جھکائی ہے جبیں

وحشتِ دل بھی ہے اک منزل اور اک حیات
تارِ دامن بھی ہے اک سلسلۂ ہوش و خرد
اس پہ افشا ہی نہیں گلشنِ ہستی کے رموز
"آں زِ گل واقفِ اسرارِ گلستاں نہ بود"

ماہر ہاشمہ

پس و پیش

تم بھی شاید اسی محفل میں چلی آئی ہو
لب ورخسار سے شعلوں کی لپک آتی ہے
میرا اک ایک نفس ڈھونڈتا رہتا ہے جسے
اسی ابرو، اسی گیسو کی مہک آتی ہے

اپنی آنکھوں کی شفق سے نہ گراؤ شبنم
تم میری یاد کی کلیوں کو مسل جانے دو
غیر کے ہاں تمہیں آسودگیٔ جسم تو ہے
دل فسردہ ہی سہی، روح کچل جانے دو

جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے شکایت ہوگی
اس لئے آنکھ ملاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
بے وفا مجھ کو سمجھتی ہو تو سمجھو لیکن
حال دل تم کو سناتے ہوئے جی ڈرتا ہے

میری ہمراز بس اک تم ہی نہیں ہو مجبور
سیکڑوں آج یہی جور و جفا سہتے ہیں
کتنی خاموش نگاہوں کو یہی شکوہ ہے
کتنے دل روز یونہی خون ہوا کرتے ہیں

یہ پس و پیش تھا کس طرح تمہیں اپناؤں
جب کہ خود فکر معیشت میں ہوں حیراں حیراں
سوچتا تھا کہ محبت کے یہ معنی تو نہیں
اپنے ہمراہ میں تم کو بھی کردوں سرگرداں

آج ہر گھر میں دہکتی ہوئی دوشیزائیں
مانگ سیندور سے محروم لئے بیٹھی ہیں
دل میں طوفاں ہے امڈتے ہوئے ارمانوں کا
شرم سے ہونٹ مگر اپنے سیئے بیٹھی ہیں

میری روداد سے افسردہ و غمگیں نہ ہو
ہر نفس جرعۂ زہراب کا میں عادی ہوں
میرے سینے کی جلن کا نہ مداوا سوچو
اس قدر تلخ مئے ناب کا میں عادی ہوں

ان گنت اور تمہاری طرح دوشیزائیں
رسم اور ریت پہ قربان ہوا کرتی ہیں
اپنے محبوب کی تصویر لئے سینے میں
ایک انجانے کو سینے سے لگا لیتی ہیں

خانگی ملک اور میراث کے اس مقتل میں
پیار مرجاتا ہے، ارمان کا خوں ہوتا ہے
منفعت بازی و بحران کے اس چکر میں
عصمتیں بکتی ہیں، انسانوں کا خوں ہوتا ہے

امام الدین یقین

آثارِ سحر

سینۂ خشک میں سہمی ہوئی آہوں کی قسم خوں اگلتی ہوئی بے چین کراہوں کی قسم
سرد بجھتی ہوئی بے نور نگاہوں کی قسم رہبر قوم کے معصوم گناہوں کی قسم
قسمت اہل وطن نوحہ کناں آج بھی ہے
فصلِ گل صورتِ بیدادِ خزاں آج بھی ہے

آج جمہور کے سیلاب کا رکنا ہے محال وہ تموج وہ تلاطم وہ حرارت وہ جلال
عزمِ امروز میں لہراتا ہے فردا کا جمال دستِ محنت نے بصد عزم اٹھائی ہے کدال
جاں بہ لب، خاک بہ سر، شوکتِ دارائی ہے
کج کلاہوں سے کہو، وقتِ جبیں سائی ہے

سنسناتے ہوئے جذبات کے دھارے کا بہاؤ وقت و تاریخ کے بپھرے ہوئے دریا کا چڑھاؤ
کون سہہ سکتا ہے اب ظلم کی پتوار کے گھاؤ اب تو ممکن نہیں سرمائے کی کشتی کا بچاؤ
فکر و احساس کے طوفان میں گہرائی ہے
ڈوب جاؤ کہ زمانہ بھی تمنائی ہے

کھل گئے وادئ مشرق میں تمناؤں کے پھول کارگر ہو گئے لینن کی قیادت کے اصول
شب کے پروردہ ستارے ہیں حزیں اور ملول کوئی دم میں شفقِ سرخ کا ہوتا ہے نزول
صبح کے ہاتھ میں گیتی کی زمام آئی ہے
مژدہ اے تشنہ لبو منزلِ جام آئی ہے

کچھ نہیں دار و رسن ظلم کی تدبیروں میں میرے جمہور ہیں گیتی کے عناں گیروں میں
مسکراتے ہوئے بڑھتے ہیں جو شمشیروں میں برق جکڑی نہیں جاتی کبھی زنجیروں میں
رہزنی، نوحہ گری، رات کے ڈھلنے تک ہے
"صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے" (مخدوم)

فانی مرادآبادی

غم نے کہا

دیکھ ظلمات میں پھیلے ہوئے سناٹے کو
سینۂ شب سے ہی انوارِ سحر پھوٹتے ہیں
شب کی آغوش ملی تجھ کو تو مایوس نہ ہو
اسی خاکسترِ ظلمت سے شرر پھوٹتے ہیں

ہاں بکھر جانے دے کچھ اور بکھر جانے دے
یہ غمِ زیست کے بھڑکے ہوئے شعلوں کا ہجوم
اپنے نغمات کے چہرے پہ بکھر جانے دے
لذتِ درد کی مدہوش امنگوں کا فسوں

عیش اک وہمِ تخیل کے سوا کچھ بھی نہیں
عیش کی سمت ترا ذہن لپکتا کیوں ہے
آ مری سمت ترا مونس و غم خوار ہوں میں
اجنبی راہوں پہ بے سود بھٹکتا کیوں ہے

فن کے دامن پہ جگہ پائیں گے اَن مٹ بن کر
آنسوؤں کو تو نہ اس طرح سے بہ جانے دے
اس کی جھنکار کی قسمت ہے حیاتِ ابدی
شیشۂ دل کو ذرا چوٹ تو سہہ جانے دے

کتنے عنوان کہانی کے نئے ہیں محفوظ
آ مرے پاس ابھی اور ہیں موضوعِ سخن
کتنے شہ پارے ترے واسطے ہیں چشم براہ
کتنے مضمونوں سے بھرپور ہے میرا دامن

میرا ذمہ ہے کہ میں بڑھ کے نکھاروں گا تجھے
دوست! تاریخ کے سینے پہ ابھاروں گا تجھے

بشر نواز

رات ڈھلتے ہی

خنک رات یہ موسم یہ ضیاپوش گھٹا
کہکشاں راہگزر جیسے ہو بل کھائی ہوئی
ر خاموشی کو ناہید نے چھیڑا نغمہ
چاند جیسے کوئی دوشیزہ ہو شرمائی ہوئی

لقۂ ابر میں یوں چاندنی گھر جاتی ہے
دختِ رز شیشے کی دیواروں میں جیسے محبوس
رے جس طرح اجالے کے ابلتے چشمے
جوں دمِ فکر تخیل کے سنہرے فانوس

ے جاتے ہیں مرے ذہن میں رنگین دیئے
یادیں ماضی کے جھروکوں سے مجھے جھانکتی ہیں
ری خوشیاں مرے آلام ترا قرب و فراق
چشمِ تخئیل میں سب چیزیں کھڑی کانپتی ہیں

رسے آئے ہوئے سرد ہوا کے جھونکے
دل کی ہر چوٹ کو سہلاتے ہیں دھیرے دھیرے
ازِ احساس کا ہر تار لرز اٹھتا ہے
نبضِ افکار میں رقصاں ہیں بھڑکتے شعلے

یہ خموشی یہ سکوں وقت کا بے پایاں سکوت
جنبشِ چشم سے بھی شب کی رگیں دکھتی ہیں
اور ایسے میں بڑے دھیمے بلوریں بانکیں
میرے ماحول کے سناٹے میں بج اٹھتی ہیں

ناچ ناچ اٹھتی ہیں خاموش فضائیں جب بھی
بجنے لگتی ہے کہیں پاس ہی کوئی چھاگل
ٹوٹتا ہے کبھی ایسے بھی خموشی کا طلسم
سرسرا جاتا ہے آہستہ سے رنگیں آنچل

بند کرتا ہوں جو آنکھیں تو ترا عکسِ رخسار
روح کے خاکوں کو رنگین بنا جاتا ہے
سوچتا ہوں جو کبھی، سایۂ گیسو تیرا
بڑھ کے تخیل کی ہر راہ پہ چھا جاتا ہے

بزمِ انجم کی خموشی میں سکوتِ مہ میں
تیری آواز کی جھنکار میں سن لیتا ہوں
مزرعۂ شب سے بفیضانِ جنونِ رسوا
کلیاں معصوم تبسم کی بھی چن لیتا ہوں

تیری قربت نہ سہی یاد بھی کافی ہے مگر
یہ بھی تیری ہی طرح مجھ سے بچھڑ جائے گی
دستِ تخئیل کی فنکاری و محنت کی قسم
رات ڈھلتے ہی یہ محفل بھی اجڑ جائے گی

حمید الماس

محلکے

خنک فضا ہے ستاروں کی آنکھ بھاری ہے
یہ سرسراتی ہواؤں کے ریشمی جھونکے
الٹتے جاتے ہیں اوراقِ زندگانی کو
یہ گیت ابھرتے ہوئے چاندنی کے ہونٹوں پر
یہ ماہتاب کی دزدیدہ چمپی نظریں
مری اداس طبیعت کو لوریاں دے کر
مری حیات کو زنجیر سی پنہاتی ہیں

یہ میرا جرم کہ میں نے کسی کو چاہا تھا
مری خطا کہ چُنی تھیں شرار کی کلیاں
مرا گناہ کہ ریگِ رواں تھی قبلۂ جاں
کسے کہوں کہ مجھے تیرا آسرا نہ ملا
دیارِ دیدہ و دل کو کوئی خدا نہ ملا

●

راشد افسر

حسینؑ انقلابی

ہر ادا تیری رباب شوق کی مضراب ہے
تیرا جوش گفتگو اک آتشیں سیلاب ہے
روح تیری رقص کرنے کے لئے بیتاب ہے
تیری فطرت برق ہے طوفان ہے سیماب ہے

"روح آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون
ناچتے سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون" (سردار جعفری)

جی رہی ہے غم کے ماروں کو جلانے کے لئے
زندگی کے جام بھر بھر کر پلانے کے لئے
ایک چنگاری تڑپ کر رنگ لانے کے لئے
بے قرار اک موج خار و خس بہانے کے لئے

اٹھتی آندھی کو تشدد سے دبا سکتا ہے کون
زیست کے شعلوں کو پھونکوں سے بجھا سکتا ہے کون

خاک میں جتنا شرارے کو ملایا جائے گا
جس قدر بجلی کو بادل میں چھپایا جائے گا
فطرت آزاد کو جتنا دبایا جائے گا
اتنی ہی شدت سے زندانوں کو ڈھایا جائے گا

بچ کے تنظیم بغاوت سے گزر سکتا ہے کون
انقلاب وقت کو اب زیر کر سکتا ہے کون

ابوالفضل صدیقی

بچہ

(ایک ناولچہ)

(ا) نوخیز　　(ب) ریس　　(ج) جیت

نوخیز

بچو میاں شہسوار نہ سہی تو خودرو قسم کے دھنگیا سوار تو تھے ہی۔ اور گھوڑسواری کی تعلیم نہ تو بیچارے نے "زینت الخیل" پڑھ کر مکتب میں حاصل کی تھی اور نہ انھیں اس کے عملی سبق ان کے بڑے بھائیوں کی طرح میدان میں استاد شجاعت خاں نے دیئے تھے بلکہ مکتب کے زمانۂ بچپن میں قصبہ کے چماروں، کسانوں، نائی کہاروں کے بچوں کے ساتھ دھوبیوں کمہاروں کے آوارہ چھوٹے گدھوں خچروں کو پکڑ کر کھیل میں ان پر سواریاں لیتے، کبھی دم کی جانب منہ کر کے، کبھی سر کی جانب منہ کر کے بھگاتے اور ہر سواری میں پٹخیاں کھاتے گھنٹہ دو گھنٹہ کھیل کود کر گرد جھاڑ کے اور ہاتھ پاؤں دھو کر چلے جاتے۔ خیر مکتب کی زندگی تک کبھی کبھی یاران طریقت کے ساتھ یہ پروگرام چلتے رہے مگر اسکول میں داخل ہوتے ہی اس قسم کے کھیل میں شرم آنے لگی اور ساتھی اپنے کام کے راستوں پر پڑ گئے لیکن بچو میاں کا اندرونی اسپورٹس مین جوں کا توں رہا اور سواری کے لئے تڑپ بڑھ گئی۔ بچو میاں کے باپ چودھری کے دو اپنی ذاتی بڑی گھوڑیاں تھیں اور وہ سرکاری سانڈوں کا دارندہ تھا۔ دن رات اصطبل اور مویشی خانہ گھوڑے گھوڑیوں کی ہنہناہٹوں ہی سے جھنکارتا رہتا۔ مگر بچو میاں بیچارے اتنے چھوٹے تھے کہ دونوں سواری کی گھوڑیاں ان کے لئے بہت بڑی تھیں اور وہ اپنے باپ اور بھائیوں کو گھوڑیاں کداتے دیکھ کر من مار کر رہ جاتے اور ساں کی ہمت تو پڑتی کہ چھتنگی سوار بن کر وہ بھی چڑھیں مگر انھیں چڑھنے کون دیتا۔ ایک روز اسکول سے واپس آ رہے تھے اور آج جیب گرم تھی، ایک روپیہ تو فیس میں سے کورا بچا تھا، آٹھ آنے کتاب کے داموں میں سے کترے تھے اور ایک روپیہ جیب خرچ کا ملا تھا۔ راستہ میں قصبہ کے کانجی ہوس پر بھیڑ تھی اور منشی نیلام کی بولی بول رہا تھا "سوا دو روپے! سوا دو روپے! سوا دو روپیہ! سوا دو ایک سوا دو، دو ــــ نسلی کاٹھیاواڑی، اصلی دیسی گھوڑی کے سوا دو روپیہ، سوا دو ایک سوا دو، دو ــــ پندرہ روپے کے دھن کے سوا دو" اور بچو میاں بھیڑ چیر کر گھسے تو منشیوں کے پیچھے پندرہ روز کی بھوکی پیاسی دبلی تاتی قیدی کاٹھیاواڑی گھوڑی دیکھی اور اونچائی کے لحاظ سے اپنے لئے بالکل فٹ دیکھ کر "ڈھائی روپیہ" کہا، منشی نے زمین دار کے بچہ کی بولی پر ڈھائی روپیہ میں تین کر دی، اور وہیں سے بچو میاں اپنی خودرو ٹریننگ کے مطابق بغیر لگام کے سوار ہو کر ایال پکڑے گھر تک آئے اور مویشی خانہ میں بندھوا دیا۔

اور کاٹھیاواڑی ٹٹیا مویشی خانہ میں دونوں گھوڑیوں کا پس خوردہ کھاتی۔ اصطبل سے بڑھ کر بھاری بھدی سانڈوں کی جو ٹھن پڑتا تھا صاف کرتی اور بیلوں اور گایوں کے حصہ میں دو چار منہ حصہ بانٹتی چودھری کے چالیس پچاس مویشیوں سے بھرے مویشی خانے میں پلنے لگی۔ اور بچو میاں ڈھائی روپیہ کے شہسوار بن گئے، پچھلے سب ساتھی یہ زندہ کھلونا دیکھ کر جمع ہوئے، اور اب تو لگام اور چار جامہ کسا جاتا اور باری باری سے ہر کا

ہوتے ہیں۔ صبح شام معصومیت کے ساتھ سواری ہوتی اور بجو میاں کو کاٹھیاواڑی سے ایسا شغف بڑھا کہ چودھری کو اپنی پان پان سو کی بادہ ستارہ سے نہ تھا۔ گودام میں گھس جاتے۔ چنے کا لوندا اور گڑ کا ڈھیلا چراتے اور کاٹھیاواڑی کے منہ میں چپکے سے دے دیتے، نوکروں کیلئے بیسن کی روٹیاں پکتیں باورچی خانہ میں ماما کی آنکھ بچاکر دو چار روٹیاں پاجامہ کے نیفے میں گھرس کر گودام میں تیل کے مٹکے میں ڈبو دیتے شام کو اسکول سے پلٹ کر چپکے سے نکالتے اور مویشی خانے میں لے جاکر کاٹھیاواڑی کو کھلا دیتے، تمام دن جو گھٹن پہ کاٹھیاواڑی کا منہ چلتا، صبح شام بجو میاں کے مال مسروقہ پہ ہاتھ مارتی اور تین ہی چار مہینے میں ڈھائی سو والی کی کاٹھیا رنگ پہ آگئی۔ رونگٹے سو نکلے پر بھی تیلی چمک اٹھا، مٹھی بھر اونچی ہی ہوکر پھیل گئی۔

چودھری کے وسیع مویشی خانے کی تقسیم تھی، اور یہ تقسیم چودھری کو جب سے وہ "وارندہ" ہوا تھا خاص توجہ کے ساتھ کرانی پڑی تھی۔ بیچوں بیچ سرکاری سانڈوں کا اصطبل تھا جس میں تین شمال رویہ بڑے بڑے ہال تھے۔ ان میں تین سرکاری سانڈ رکھے جاتے تھے۔ ان تینوں سانڈوں کے اصطبلوں کے سامنے وسیع صحن تھا پھر تین سانڈ گدھوں کی کوٹھریاں تھیں جن میں تین سرکاری گدھے رکھے جاتے۔ اس سرکاری اصطبل کے کمپاؤنڈ سے پورب کو لگا چودھری کے ذاتی جانور کا مویشی خانہ تھا اور پچھم کو نسل کشی کا احاطہ اور دونوں جانب کو دو دروازے تھے۔ پورب والا دروازہ مویشی خانہ میں کھلتا تھا اور پچھم والا نسل کشی کے احاطہ میں۔ مویشی خانے میں دو بڑے اصطبل چودھری کی ذاتی گھوڑیوں کے تھے اور بقیہ چودھی سائیس، چارہ کے گودام اور نوکروں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں اور وسیع صحن میں جگہ جگہ تھان بنے ہوئے تھے۔

سرکاری سانڈ گورنمنٹ (Husbendry Department) کی جانب سے چودھری کی سپردگی میں تھے اور عام نسل کشی کے لئے تھے۔ ہر سانڈ کا مقررہ خرچ چودھری اپنے انتظام سے کرتا حتیٰ کہ سانڈوں کے سائیسوں کی تنخواہ بھی، اور ماہ بہ ماہ اخراجات کا بل بنا کر گورنمنٹ سے وصول کرتا رہتا، سائیسوں پر ایک ہیڈ البتہ براہ راست گورنمنٹ سے تنخواہ پاتا اور چودھری نے اس جگہ پر اپنے پشتنی چابک سوار استاد شہامت خاں کا نام لکھا دیا تھا۔ آٹھ روپے ماہوار فی سائیس چودھری بل میں تنخواہ دکھاتا اور استاد شہامت خاں کے بیس روپے ماہوار بھی خود رکھ لیتا، دو روپے ماہوار فی سائیس ادا کرتا اور آٹھ روپے ماہوار استاد کو دیتا اور سائیس اور استاد چودھری کے یہاں دونوں وقت ڈلیا پہ روٹی کھاتے۔ ویسے تو ہر "وارندہ" کو شدید سرکاری احکام ہوتے ہیں کہ نسل کشی بالکل مفت کیا جائے مگر یہ رواج بھی عام ہوتا ہے کہ ہر گھوڑی کے مالک کو جس پر بڑا سانڈ گھوڑا چھوڑا جاتا ہے دو روپے اور چھوٹی کے جس پر گدھا چھوڑا جاتا ہے آٹھ آنے دینے پڑتے ہیں اور اس طرح پانچ پانچ گھوڑے گدھے سانڈوں کے سائیسوں اور ہیڈ کو معقول یومیہ یافت رہتی ہے، اور چارہ دانہ راتب کا خرچ وارندہ اپنے کھیتوں سے پورا کرتا ہے جس کے ساتھ سال بھر میں اسے نسید کی اتنی کھاد مل رہتی ہے کہ کھیتوں کی پیداوار دوگنی تگنی ہو جاتی ہے اور ماہانہ بل کی رقم کوری وارندہ کے جیب میں چلی آتی ہے اور چودھری خوش حال قسم کا سیر وار زمیندار تھا وہ اس سرکاری خزانہ سے آئی ہوئی رقم کا بڑا حصہ سرکاری حکام کی تواضع میں خرچ کرتا رہتا اور سال کے سال ایک آدھ گھوڑی خرید کر الٹ پلٹ کرتا رہتا اور نفع پاتا رہتا اور ہر طرح سے اپنی چودھراہٹ کو اس اصطبل کے ذریعہ مضبوط کرتا رہتا۔

تین سرکاری سانڈ لارڈ سیکسن (Lord Saxon)، سرکیمپل (Sir Campble) اور عرب نائٹ النعاف (Arab Knight Mannaf) تھے۔ لارڈ سیکسن تھاروا انگلش بریڈ (انگریزی النسل) تھا اور خاص انگلستان سے امپورٹ کیا گیا تھا۔ دیوار کا دیو کر اونچا، بڑا لمبا اور چوڑا، سفید رنگ جسے سبزا کہتے ہیں، جاکتی ہوئی بنڈیا دم، چڑھے ہوئے لگاڑا سے پٹھے اور جسم کے لحاظ سے ذرا متناسب ہاتھ پاؤں، سڈول متکبرانہ انداز، نہایت شائستہ، سرکاری کاغذات میں بیس ہزار قیمت لکھی ہوئی تھی؛ سرکیمپل آسٹریلین ویلر تھا اور وہیں سے امپورٹ کیا گیا تھا، گھوڑا کا ہے کو کسی دیوتا و ملک کے گھوڑوں کا بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔ سرنگ رنگ (زردی مائل سرخ) قد لمبے سوتا، روکھا لمبائی چوڑائی اونچائی میں پہاڑ کا پہاڑ لگاڑا سے پٹھے اور اتنے تن و توش پر بھی موٹے بھدے ہاتھ پاؤں، تیور" پریشان گوش" قسم کے اور بیٹھا اتنی چوڑی کہ لمبے سے لمبے سوار کی ٹانگیں اوپر ہی پھیل کر رہ جائیں، بقول شخصے چارپائی بچھا لو، سرکاری قیمت پچیس ہزار لکھے

کمی بیشی تھی۔ تیسرا سانڈ عرب نائٹ انصاف (Arab Knight Insaf) مشکی (سیاہ) عرب تھا۔ میانہ قامت، چھریرا جسم، نازک نازک سے ہاتھ پاؤں، گول گول خوبصورت بھرے ہوئے پٹھے، پتلی کمر، لمبی متناسب گردن۔ گھٹنوں پہ پھیلتے ہوئے ایال اور زمین پر لوٹتی ہوئی دم، آنکھوں میں ہرنی کا سا بھولاپن اور تیوروں میں بجلی کی سی چمک، آواز میں سریلی جھنکار، سرکاری قیمت بیس ہزار درج تھی اور عراق سے امپورٹ کیا گیا تھا اور باقی تین گدھے تھے، فلسطینی، مصری اور آسٹریلین جن کی مجموعی قیمت پچیس ہزار درج تھی اور یہ ایک لاکھ کی سرکاری امانت چودھری کی نگرانی اور پرورش میں عام نسل کشی کے لئے تھی۔ تینوں گھوڑے اپنے اپنے وسیع مربع اصطبل کے کمروں میں موٹے موٹے بانس کے اڑگڑوں کے پیچھے کھڑے رہتے اور مقررہ چارہ دانہ کھا کر بڑے بڑے لاہوری نمک کے ڈھیلوں کو چاٹتے رہتے جو اصطبل میں لگے ہوئے تھے اور جب کوئی گھوڑی والا اپنی گھوڑی کو گابھن کرانے لاتا تو استاد گھوڑی کو دیکھ کر سانڈ تجویز کرتے۔ سائیس سانڈ کو مونہہ لگام چڑھا کر نکالتا اور احاطہ میں گھوڑی پر چھوڑ دیتا، اور چھوٹی گھوڑیوں اور خچریوں پر سرکاری احکامات کے مطابق گدھا چھوڑا جاتا۔ گورنمنٹ کے سخت احکامات تھے کہ چھوٹی دیسی گھوڑیوں پر گھوڑا نہ چھوڑا جائے اور ان کے قد کے مطابق تینوں گدھوں میں سے کوئی چھوٹا بڑا گدھا چھوڑا جائے۔

(۲)

ساون کی ایک اندھیری رات میں سانڈوں کے اصطبل کا وہ پھاٹک کھلا رہ گیا جو چودھری کے مویشی خانے کی جانب تھا۔ ادھر بچو میاں کی کاٹھیا واڑی کی رسی ٹوٹ گئی، گھوڑی اگر حاملہ نہ ہو تو ہر وقت "آلنگ" (بہار) پر رہتی ہے اور بچہ دینے کے بعد چھٹے روز پھر آلنگ پر آجاتی ہے اور گابھن ہو جاتی ہے، اور کاٹھیاواڑی تو مدتوں سے آلنگ پر تھی، گھوڑوں کی بو لیتی مویشی خانے سے سیدھی اصطبل کے کمپاونڈ میں پہنچ گئی۔ گھستے ہی پہلا اصطبل لارڈ ڈکسن کا تھا۔ دروازے پر پہنچتے ہی آوازوں کے تبادلے کے بعد لارڈ نے بڑی بے چینی کا مظاہرہ کیا زور زور سے ٹاپیں ماریں۔ بار بار ہنہنا کر اڑگڑے تک لپکا۔ باہر سے کاٹھیاواڑی نے بھی ہرا ہرا کے مستانہ اداؤں کے ساتھ بلایا۔ آہستہ آہستہ ٹاپیں ماریں، اٹھلا اٹھلا کر سریلی آواز نکالی، ہاتھ بھر کے فاصلے سے بو لے کر لارڈ بیتاب ہو کر اندر زمین کاٹے پھینکتا تھا اور باہر کاٹھیاواڑی بل کھاتا جاتی تھی مگر اڑگڑا بہت مضبوط تھا اور لارڈ کے باہر نکلنے کی یا کاٹھیاواڑی کی اندر پہنچنے کی کوئی شکل نہ تھی اور لارڈ تو خیر اڑگڑے کے اندر تھا مگر کاٹھیاواڑی تو آزاد تھی۔ دوسری بو لے کر جا بہ دائے اصطبل کے دروازہ پر پہنچی یہ سرکیمل کی آرام گاہ تھی، دس پندرہ من کی لاش بیچارے سرکیمل بجز بھاری بھاری ٹاپوں کے جھرمٹ سے زمین کوٹنے کے اور کیا کر سکتے تھے، اڑگڑے پر بھاری سر پٹخ پٹخ کر رہ گئے اور بھدی آواز میں اندر سے اظہار محبت ہی کرتے رہے اور اتنے میں برابر سے انصاف نے سن گن پا کر اور ناک لگا کر اپنی سریلی جھنکار میں صدائے لبیک بلند کی اور کاٹھیاواڑی چند گز بڑھ کر اور سرکیمل کو جوار بھاٹے میں چھوڑ کر .... انصاف کے دروازے پر صدا لگائی، موزوں جثہ اور کھرا صفت انصاف نے بڑی میٹھی محبت بھری ہنہناہٹ کے ساتھ کاٹھیاواڑی کا استقبال کیا اور اپنا نازک پتلا منہ اڑگڑے سے باہر نکال دیا اور کاٹھیاواڑی کے نرم گرم تر نازک ہونٹوں پر اپنے دہکتے ہوئے نم ہونٹ چپکا دیئے اور پچ پچا، چس چس، پچا پچ گرما گرم بوسوں کا دو طرفہ بازار گرم ہو گیا اور یہاں تک کہ اپنے ہلکے جسم سے بیتاب ہو کر انصاف نے ایک پھرکی سی لی اور پلٹ کر ایک بلند جست لگائی جس میں سر دروازہ کی ڈاٹ سے ٹکرایا اور سینہ اڑگڑے کے اوپر والے دو بانسوں سے جا بھڑا اور پورے ایک گھوڑے کی طاقت کے ٹکراؤ کے ردعمل میں اڑگڑے کے دونوں بانس ٹوٹے اور انصاف باہر، اور جب تک سوتے ہوئے سائیس اٹھ کر پہنچیں پہنچیں عرب کا کاٹھیاواڑی اتصال مکمل ہو گیا۔ سائیسوں نے بڑی چابک دستی سے بمشکل کاٹھیاواڑی کو ہنکا کر باہر کیا اور نہایت پھرتی سے پھاٹک بند کر دیا اور بے لگام انصاف کو پچکار کر اصطبل میں بند کرنے کی کوشش کی، اور سارا اصطبل ہنہناہٹوں سے گونج اٹھا، اپنی اپنی کوٹھریوں میں سے گدھے تک ہنس پڑے، مویشی خانے میں پہنچ کر کاٹھیاواڑی نے پھر دعوت وصل دی۔ ساتھ ہی پارہ اور ستارہ نے تائید کی اور مجنون عرب کو پھر ابال آیا اور قابو پانا ناممکن ہو گیا، اب کی جست میں کمپاونڈ کی دس فیٹ اونچی دیوار پھاند کر مویشی خانے کے وسیع صحن میں جا گرا اور عرب کاٹھیاواڑی اتصال کی پھر تکرار ہوئی۔ اصطبل سے جمع ہو کر سائیس دوڑے، مویشی خانے میں

ادھر اُدھر سے گوالے اور بِہائے بھاگ پڑے، اگر انصاف تو آج کسی کو پہچان ہی نہ رہا تھا اور بغیر لگام اور منہ بھر کے بچے ہوئے بے موہرے اپنے سانڈ کے قریب جانے کی کسی کی ہمت نہ تھی اور پچکاریاں بھی اس کے کان میں نہیں پڑ رہی تھیں۔ وہ تو آج اپنی سائیس کی آواز ہی بھول گیا تھا۔ بڑی ہشیاری سے سب نے مل کر کاٹھیا واڑی کو اب کی مرتبہ ہنکا کر ایک کوٹھڑی میں بند کیا اور کاٹھیا واڑی نکلوں ـ سے ادھر جل ہوئی اور ادھر انصاف کا جوش بھی کچھ ٹھنڈا ہوا۔ کوٹھڑی کے کواڑوں پر سر پٹخ رہا تھا کہ سائیس نے بڑی چالاکی سے مونہرا چڑھا لیا اور پھر لگام چڑھا دی اور جب قابو میں کر کے دیکھا تو سب کے ہوش اڑ گئے۔ انصاف کے دونوں نتھنوں سے خون کی دھاریں جاری تھیں، سر والی چوٹ رنگ لا رہی تھی اور سینے کی تو خیر نہ کھلی تھی کالے رنگ میں، دوڑ کر استاد شہامت خاں کے کواڑ پر پہنچے اور استاد گھبرائے ہوئے آئے۔ بیس ہزار کی ٹکر کی امانت۔ اور اس وقت انصاف گرم دودھ پی گیا تھا، خون ابل ابل کر مسام میں بٹا بٹا پھرتا تھا، فوراً طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اگر سرکاری ڈاکٹر مویشی کو رجوع کرتے ہیں تو بات حکام تک پہنچتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک جواب طلبیاں ہوتی ہیں پھر سر کی اندرونی چوٹ نہ معلوم کس کل اونٹ بیٹھے اور اور کیا نتیجہ ہو۔ دور کی سوچنے والے استاد نے جلدی سے اپنی پرانی عطائی بیطاری دواؤں کی خورجی منگائی اور بہت سا ٹھنڈا پانی۔ بار بار دوائیں سنگھاتے رہے اور سر پر پانی بہاتے رہے، کہیں صبح ہوتے ہوتے خون بند ہوا اور چودھری بالاخانے پر سو رہا تھا نیند میں یہ تو نہ سمجھا کہ اصل حادثہ کیا گذرا ہے البتہ اتنا اندازہ تھا کہ بہت شور و شغب رہا ہے، فجر کی نماز پڑھ کر سیدھا مویشی خانے میں آیا، استاد نے رات کی سب روئداد بیان کی مگر اب انصاف ٹھیک تھا۔ سائیسوں کو ڈانٹا ڈپٹا اور پھر ذرا اشتیاق کے ساتھ کہا " دنا ہوں، اور ہاں استاد ذرا انھیں تو دکھائیے وہ آپ کے بچو میاں کی کاٹھیاواڑی جن مسماۃ نے یہ قیامت برپا کر دی رات ہیں" اور ایک نوکر بند کوٹھڑی میں سے نکال کر کاٹھیا واڑی کو لایا اور چودھری دور ہی سے دیکھ کر بول پڑا " ایں استاد! اوں یہ تو ستارہ پیشانی!"

اور استاد نے چونک کر گھوڑی کے منہ پر نظر کی اور جب گھوڑی قریب آ کر کھڑی ہو گئی تو اس کے چہرے پر سے انصاف کا بھکرایا ہوا جما خون انگلی سے کھرچتے ہوئے بولے "ہاں سرکار ستارہ پیشانی بھی اور اس کے ساتھ "بڑا بھوڑا" بھی اور پیشانی اور ناک کا بانسا اچھی طرح کھرچ کر صاف کرتے ہوئے بولے" اور میاں "مینڈھا سنگین" بھی اور "عقرب" بھی، اور استاد ابھی پیشانی کی بھونریاں ہی دیکھ رہے تھے جب تک آنکھوں کے نیچے دو ترچھی ترچھی بھونریوں پر غور کرتے ہوئے چودھری بول پڑا" اور استاد "آنسو ڈھال" بھی دھری ہوئی ہیں" اور استاد نے چونک کر غور کیا تو بولے "ہاں" اور پھر چودھری نے گردن کی بھونریوں پر نظر کی اور بولا" استاد غضب رے غضب "ٹیک باگی" بھی ہے اور "ناگن" "سانپن" دونوں لہرا رہے ہیں" اور اب استاد خفیف سے ہونے لگے کیونکہ اصطبل ان کی نگرانی میں تھا۔ بات ٹالنے کی غرض سے بولے" اور سرکار بغیر مونہرے لگام کا سانڈ چھوٹ گیا، پھر ہیوٹی سی گھوڑی، بھرپور دیا، اور یہ دیکھئے دانتوں سے تمام سر جھنجھوڑ لیا اور یہ جو خون تمام سر اور چہرہ پر بہا ہے یہ سب انصاف ہی کا نہیں ہے اس میں اس کے سر سے بھی نکل کر مل گیا ہے، بلکہ سرکار یہیں سے مل کر بہا ہو گا" مگر چودھری گہری سوچ میں تھا بولا "اور استاد ذرا اس کا منہ تو کھولنا، یہ سالی" سیاہ تالو" بھی ہو گی" اور استاد نے منہ کھولا اور تالو پر نظر کی اور جھکے ہی جھکے بولے" جی سرکار خیال صحیح ہے۔ "سیاہ تالو" بھی ہے کمبخت: اور پھر چودھری نے اوپر سے نیچے تک نظر سے پرتالا اور اندازہ کر کے کہا" اور استاد ناپنا تو ذرا مجھے تو تیرہ تین معلوم ہوتی ہے۔

استاد نے ناپ سے لے کر "منڈھو" (پشت کا اگلا حصہ) تک بالشتوں اور انگلیوں سے ناپ کر حساب کیا تو ناپ میں تیرہ تین ہوئی، اور ناپنے ہی میں چودھری نے کہا" ذرا استاد پیٹ دیکھنا" یہ بھونری کیسی آئی ہے" استاد ذرا اٹھارتے ہوئے بولے" ہاں سرکار میں نے بھی دیکھ لی "تنگ توڑ" بھی دھری ہوئی ہے اور "گندہ بغل" بھی ہے۔ اور کھسیا کر پچھلے پاؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نفرت کے ساتھ بولے" او سرکار کیا بتاؤں میں نے کبھی ایسی دیکھی نہیں، ہوں" کھونٹا اکھاڑ" بھی ہے" جبھی تو کابکی ہوس میں آکر نیلام ہوئی۔ جہاں جائے گی کھونٹا توڑ بھاگے گی" کہنے کو تو استاد کہہ گئے مگر اور بھونریوں کے اثبات پہ مزید بحث آ جانے کے ڈر سے دل میں نادم سے ہو گئے۔ ستارہ پیشانی، [illegible] سنگین، ناگ سانپن، تو کھلی ہوئی خصم مار تھیں اور سیاہ تالو آنسو ڈھال ٹیک باگی ساری عمر مالک کو پریشان کر کے رلاتی رہیں۔ تنگ توڑ، گندہ بغل مالک کو

گھبرا کر بھاگے ..... اور چودھری اور استاد دونوں ہی ایک ایک بھونری کے مجرب خواص کے محرم تھے۔ دونوں دل ہی دل میں تجزیہ کر رہے تھے اور چودھری کا تلخ اور شکایتی تیوروں سے بولا "واہ استاد واہ! — یہی تو عیب شرعی! ہوں' اور پھر مجھے تو آپ پر حیرت ہے' ایسی آنکھیں موند لیں! اور میں تو آپ کے اصطبل مویشی خانے میں ذرا کم آتا جاتا ہوں، اور دیکھئے آج میں نے پہلی نظر ڈالتے ہی بھانپ لیا' آپ نے میرے یاں گھسنے کیسے دی؟! اور پھر چھ مہینے سے میرے تھان پر باندھے پڑے ہیں۔ اگر لڑکا لے بھی آیا تھا تو ڈھائی روپے کی اوقات' میں تو گھسنے بھی نہ دیتا" اور پھر ذرا جواب طلب سے انداز میں استاد کی طرف دیکھا' استاد محجوب سے ہو گئے اور بولے "سرکار واقعی میری غفلت لڑکے کا کھیل سمجھ کر میں نے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں" اور چودھری کا سینہ ایسی منحوس گھوڑی کے ساتھ لڑکے کا نام سن کر دھک سے ہو گیا اور جب تک ایک مرغ بے ہنگام سا سائیس بول پڑا "اور میاں یہ کیسی ہوئی رات کوڑھ میں کھاج! بھرا بھر ساون گھوڑی کا بھی ہوئی اب لوٹ ساون جائے بیائے گی"
اور چودھری کے سینے پر دوسرا گھونسہ پڑا جب تک ایک دوسرا بد تمیز سائیس بانگ بلند کر بیٹھا "ساون گھوڑی' بھادوں گائے' ماگھ بھینس بیائے آپ جائے نہیں تو مالک کو کھائے!" اور سب کی جیسے گھگھی کے ٹکے پہ چودھری الٹ کر جا پڑا' اور کاٹھیاواڑی کا مالک تو اس کا پیارا بیٹا بچو میاں تھا — "ساون بیانت" گھوڑی کا مالک ..... اور بال بھونری کی نحوستوں میں کاٹھیاواڑی کڑوا کریلا تھا تو ساون بیانت میں کا بھی ہو کر نیم چڑھا ہو گئی تھی، چھ مہینے سے نحوست کی پوٹ پل رہی تھی اور رات تو پاپ کی گھڑی بن گئی! — اور چودھری کے دماغ میں ضرب المثل کا اخیر حصہ گونجا "مالک کو کھائے" اور وہ اندر ہی اندر تھرا کر رہ گیا۔ استاد بیچارے اپنی غیر ذمہ داری اور غفلت پر گنہگار سے بنے سر جھکائے دم بخود تھے اگر چودھری کو ضرب المثل کی شرط والے حصے میں امید کی کرن نظر آئی "آپ جائے" مگر یکایک یہ بھی اس کے قابو میں نہ تھا' بچو میاں اس کا لاڈلا چھوٹا بیٹا کاٹھیاواڑی کو چھ مہینے سے محبوب کی طرح رکھے ہوئے تھا' اور وہ جانتے تھے کہ ابھی کاٹھیاواڑی کو نکالنے میں کچھ وقت لگے گا۔ لہٰذا اپنا انتشار دبا کر ذرا ہمت کر کے نوکروں کو دکھانے کے لئے کہا "کچھ نہیں سب فضول توہمات! ہم نہیں مانتے ایک بھی! — ہم تو یہ پوچھتے ہیں کہ بال بھونری کی منحوس گھوڑے گھوڑیاں کہیں گلیوں گھوروں ماری ماری پھرتی ہیں' وہ تو کسی نہ کسی اصطبل تھان پر بندھتی ہی ہیں اور ساون بیانت گھوڑی کسی گھر میں ہی بیاتی ہے' جنگل میں تو بچہ دیتی نہیں' اور بھادوں ماگھ بیانت گائے بھینس بھی کسی نہ کسی کھونٹے پر دودھ دیتی ہیں' کتیوں کی طرح گھر گھر ماری تو نہیں پھرتیں یہ سب برہمنوں نے ٹھگنے کی باتیں گڑھی ہیں"

اور ایک سائیس نے کہا "اور سرکار! قد پاؤں اور رنگ ڈھنگ کی کیسی اچھی ہے بٹیر سی" — اور اس کی منہ سے بات لے کر دوسرا بول پڑا "اور میاں بڑی کڑوی اور نکیلی، ایسا دوگاما کاٹی چلتی ہے کہ لوگ تماشا دیکھتے ہیں' بھرا کٹورا رکھ دو پیٹھ پہ مجال کیا جو بوند چھلک جائے" اور سب سائیس گھوڑی کی تعریف کرتے رہے مگر استاد چپ رہے۔ وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ چودھری لاڈلے بیٹے کی آزردگی کے سبب برائے گفتنی بات ہلکی کر رہا ہے ورنہ دل کا حال وہ خوب جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ہرگز کبھی اسے تھان پر نہ رکھے گا — اور اب کاٹھیاواڑی پر سب کی نظریں ایسی پڑنے لگیں جیسے ناگن! چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور یہاں تک کہ مویشی خانے سے حویلی تک جا پہنچیں۔ چودھری سے چودھری کی ماں نے استفسار کیا' اور چودھری تو اس خصوص میں خود ہی ان سے رجوع کر کے مدد طلب کرنے کی سوچ رہا تھا۔ لاڈلے پوتے پر دادی نے زور ڈالا کہ کاٹھیاواڑی نکال دے مگر بچو میاں تو مچل گئے۔ اور چودھری بیچارہ تو کیا چیز تھا اس کی ماں کے بھی قابو میں نہ آئے جن کے لاڈ کے زور پر بچو میاں کی نگاہ میں بھائیوں بہنوں ماں اور باپ تک کی کوئی حقیقت نہ تھی — اور اتفاقات کی ستم ظریفی! اسکول سے پلٹتے ہوئے بچو میاں بارش میں بھیگ گئے اور بڑا تیز بخار آیا اور ہفتہ بھر بے ہوش رہے اور بخار کی شدت میں ہذیانی کیفیت ہوئی اور ہذیان میں بار بار "میری کاٹھیاواڑی' میری کاٹھیاواڑی!" بکے۔ دادی کا وسوسہ بڑھا' بچو میاں کے ہوش میں آنے سے پیشتر ہی یکدم کاٹھیاواڑی قصبہ کے کاٹھیا کو دان کرا دی اور سات بکرے قربانی کرائے اور ہفتہ عشرہ بعد جب بچو میاں چنگے ہو کر مویشی خانے میں پہنچے' روئے پیٹے سر میں خاک ڈالی' حویلی کے صحن میں ڈھاڑیں مار مار کر لوٹیں لگائیں مگر کیا کرتے اگر کسی ہاتھ کاٹھیاواڑی باپ نے بیچ ڈالی ہوتی تو قیمت واپس کر کے پھر بھی لاتے وہ تو کاٹھیا کو دان کر دی تھی۔ باپ نے وعدہ کیا اور دلوی

خاص ہوئیں کہ اب کی کاتکی اشنان کے میلے سے اس سے اچھا کاٹھیاواڑی ٹٹو خریدیں گے۔ بیچارے صبر کر کے بیٹھ رہے اور استاد نے سب مخصوص مبارک بھونریوں پر بچو میاں کو لکچر دیا، ایک ایک کا خواص بالتفصیل سمجھایا اور اب کی مرتبہ کاتکی اشنان کے میلے سے ایسا گھوڑا خرید کر لانے کا وعدہ کیا جس کے ماتھے پر تلک ہو۔ گلے میں "کنٹھ منی" ہو، سینہ پر "دیومن" ہو، ہونٹوں پر "ان مہو" ہو، پیٹ پر گنگا پاٹ ہو اور پاؤں میں پدم ہو اور پھر ان سب سعد بھونریوں کے مبارک اثرات بتائے کہ ماتھے پر تلک ہو تو مالک ہمیشہ سربلند رہے، کنٹھ منی اور دیومن ہوں تو مالک کا گھر بھرا رہے، ہونٹوں پر "ان مہو" ہو تو جتنی مرتبہ مالک چڑھے بارہ برس عمر بڑھے، پیٹ پر گنگا پاٹ ہو تو اگر مالک ہار بھی جائے تو ہار میں جیت کرائے اور پاؤں میں پدم ہو تو خود کبھی نہ ہارے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر وعدہ بچوں کی فرقت کا اندمال نہ کر سکا اور وہ آرزو کرتے کہ کاش یہ سب مبارک بھونریاں ان کی کاٹھیاواڑی میں ہوتیں تو وہ کیوں گھر سے نکالی جاتی اور وہ کاٹھیاواڑی کو بھلا نہ سکے اور استاد کی بتائی ہوئی مبارک بھونریاں اپنے طفلانہ تخیل میں کاٹھیاواڑی پر چسپاں کر کر کے اپنی تمناؤں کے باطل جال بنتے رہے۔

اور بچو میاں اپنی تقدیر سے تو بچ گئے مگر کاٹھیاواڑی کی تقدیر بگڑ گئی۔ کنھیا صبح تڑکے چڑھ کر بھیک مانگنے گانوں گانوں نکل جاتا اور دس بارہ گانوں "منجھاکر" مٹھی مٹھی "ست سنجے"[1] کی پوٹیں، "چٹکی پھینک"[2] آٹے کے تھیلے، پرشاد کے پیڑے، "دان" کے چیتھڑے، "آتارے"[3] کی مٹھائی لادے اوپر سے خود بیٹھا شام کو گھر پلٹتا۔ اور سب مال لے کر گھر میں گھس جاتا اور باہر کاٹھیاواڑی کو موکھو کا موٹا، "دھگنا" چرا کر گھور دن گلیں پیٹ بھرنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ تمام دن کاٹھیاواڑی کنھیا کے ساتھ ماری ماری در در پھرتی، بھیک مانگنے کی گھگیاتی ہوئی صدا اور دینے والوں کی جھڑکیاں کان ڈالے سنتی اور کنھیا کے تھیلوں اور پوٹوں میں چٹکی چٹکی، مٹھی مٹھی پڑتے دیکھتی، اس دروازے سے اس دروازے اور اس سے اس پر گردش میں کہیں پر گھڑی بھر اتنا بھی موقع نہ ملتا کہ مونہہ دو مونہہ چلتے ہوئے کسی جگہ گلی گلیارے، ہری سوکھی گھاس پر مارے۔ پندرہ ہی دن میں چودھری کے یہاں کی سب کھائی پی نکل گئی اور مہینہ بھر میں تمام رنگ روپ اتر کر بھادوں ختم ہوتے ہوتے جیون کی تینوں انگلی پر ڈالنے کی ہو گئی۔

اور دن زیادہ گذرے، فاقہ اور محنت، پیٹھ پر موٹے کنھیا، من اور چٹکی پھینک کے تھیلوں اور ست سنجے کی پوٹوں کا بوجھ، پیٹ میں نجیب الطرفین عرب کی گراں قدر امانت کا حمل، کاٹھیاواڑی کو سر سے پاؤں تک زندگی بارہا بار ہو کر رہ گئی، خیر جاڑے تو لسٹم پسٹم گھسیٹے، چیت بیساکھ ربیع کی نئی پیداوار کے ساتھ کنھیا کی توند اور کولھے بھی بھاری پڑے۔ تھیلے اور پوٹیں بھی دونی ہوئیں، ادھر عرب کی امانت بھی بوجھل ہوئی اور کنھیا کی پھیری کا حلقہ بھی وسیع ہوا اور کاٹھیاواڑی کے پاؤں بھاری اٹھنے لگے اور جب ٹخ ٹخ کے زبانی جمع خرچ سے کام نہ چلتا دکھائی دیا تو کنھیا نے دوسرا کوڑا موٹی طرح کا باندھ کر بٹ لیا اور جیٹھ اساڑھ بھر کاٹھیاواڑی کے گھٹنے سے ٹوٹنے لگے اور اساڑھ گھسیٹ کر ساون آ ہی لگا، عرب کی امانت پیٹ سے پاؤں نکالتے دیکھی تو کنھیا نے دو ایک دن پیدل پھیری کی اور گھوڑی تھان پر باندھ دی اور جب ایک صبح سو کر اٹھا تو تھان پر کاٹھیاواڑی کے ساتھ عرب کی امانت اچھلتی کودتی دیکھی اور کنھیا کے کھونٹے پر گھوڑی نے بھرا بھر ساون بیانت بچہ دیا جس کی پیدائش کی خوشی نہ مرجانے کا غم البتہ اتنا اطمینان ضرور کنھیا کو ہو گیا کہ چلو ٹنٹا ہلکی ہوئی دو تین روز سے پیدل گھسٹنا تھا۔ چکی بھر سونٹھ زیرہ ڈال کر دو ایک روز گڑ تیل کی کلونجی پلائی اور ہفتہ بھر کے اندر چیتا کر کے کاٹھیاواڑی کنھیا کی باربرداری کے لئے پھر تیار ہو گئی اور بدستور کام پر لگ گئی۔

اور اب دو سے تین ہو گئے۔ پیچھے پیچھے بچہ، آگے آگے کاٹھیاواڑی، اوپر کنھیا، گانوں گانوں گھر گھر کیچڑ پانی میں لت پت "ست نجے" کی پڑیں اور "چٹکی پھینک" کے تھیلے بدستور، کنھیا کی تاندی توند اور لنگاڑا سے کولھے جہاں کے تہاں، اور ستم بالائے ستم، اوپر سے یہ دباؤ اور نیچے سے کھنچا

---

[2] "چٹکی پھینک" یو۔پی دیہات کے اندر، ہر چولھے کے قریب ایک مٹی کی ہانڈی رکھی ہوتی ہے۔ روٹی پکانے کے لئے آٹا گوندھنے سے پیشتر ایک چٹکی اس میں ڈال کر بقیہ آٹا گوندھا جاتا ہے اور ہفتہ کے ہفتہ یہ "چٹکی پھینک" آٹا کنھیا کو دان کر دیا جاتا ہے۔ [1] "ست نجا" چکی میں اناج ڈالنے سے پیشتر ایک کول دستی بھر اخیرات کا ایک مقررہ ڈلیا یا مٹی کی مٹکی میں علیحدہ رکھے جاتے ہیں اور چونکہ یہ مختلف النوع اناج ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسے ست نجا کہتے ہیں۔ روہیلکھنڈ میں دونوں دیہاتی اصطلاحیں خیرات کی ہیں۔

ہر دروازہ پر جہاں کا ٹھیاواڑی ٹھہرے بچہ سر کے تھنوں پر جھپکی لگائے، جس سے کنھیا کا کوڑا اور شیخ شیخ ہی نجات دلا ــــــ ئے، اور اب کا ٹھیاواڑی کو فاقے دو چند کھلنے لگے اور بھوک کے حصے پسپا کرنے لگے مگر کنھیا کے کوڑے کے سہارے بڑھتی رہی۔ پیٹھ کا ایک ایک تھیلا اور بوٹ بوٹ، کنھیا کی چربی کا ایک ایک بوٹلا، حتیٰ کہ ناج کا ایک ایک دانہ اور آنے کی سہرچکی، کنھیا کا رونگٹا رونگٹا کا ٹھیاواڑی پر الگ الگ بار سا معلوم ہونے لگا اور ایک ایک پاؤں ایک ایک من کا ہو گیا۔ سر سے پاؤں تک مکھیاں اور ڈانس، پسوؤں اور جوتوں کی کھیندیں تو چوستی ہی تھیں اور عرب کی سرد مہری امانت ابھر آ کر اور خون چوسنے لگی۔

اور کنھیا برہمن کو تو دنیا بھر کے زیادہ سے زیادہ نقصان اور زیادہ سے زیادہ نفع رساں تھے، برسات کا ہیضہ پنڈت جی کا سب سے بڑا روزی رساں تھا اور چیت کا طاعون ان کا سب سے بھاری سمت! سارے جہاں کی نحوستیں ان کے گھر میں دنیا بھر کی برکتیں نازل کیا کرتی تھیں اور نیستی ہی کے نتیجوں سے روزی پیدا کر کے کھانا بانٹتے تھے۔ اور بھگوان کی کرپا سے ان کے پرتی جمالی کے حلقہ میں ان پیدا واروں کی کمی نہ تھی۔ اور ان کے حق میں موت کے لق و دق میدان اور نحوستوں کی کھیتیاں بدستور شاداب و زرخیز تھیں۔ کا ٹھیاواڑی مرے یا بچے انھیں کیا غم!؟ کہیں سے موت کا زریں پنجہ دستگیری کرے گا اور تیرھویں میں ان کی سواری کے لئے بیلوں کی جٹ اور رہلو (بیل تانگا) بھیج دے گا۔ اور نحوست اب کی کا ٹھیاواڑی نہ سہی دکنی گڑھوالی کہیں سے نکال کر ان کے گھر چھوڑ جائے گی! اور پھر پنڈت جی کا ٹھیاواڑی کو لادتے بھی تھے تو کیا ڈر تھا، اور تین کی جگہ تیرہ گونوں سجاتے تو کیا بات تھی، چودھری کے اوپر پڑنے والی ساری نحوستوں کے ٹھیکہ پر اسے اپنے سر لیا بھی تو تھا اور اس بھاؤ چودھری کو بہت سستا پڑا! ابھی تو تھا اور ان داموں ہاتھ آ جانے میں وہ اسے اپنے تھان پر باندھے، جب تک چلے چلائے جاؤ، دال چھلکیا کھائے جاؤ، پر عامل تھے اور جب تک کا ٹھیاواڑی چل رہی تھی وہ چلا رہے تھے اور "ست بجے" کی دال اور "چٹکی چینک" کی چھلکیاں کھا رہے تھے اور اب تک تو گھوروں اور اور گلیوں میں آگے آگے کا ٹھیاواڑی پیچھے پیچھے بچہ گھاس کوڑے سے پیٹ بھر بھر کر چلائے جا رہے تھے۔

(۳)

اور ایک روز چودھری، استاد شہامت خاں اور بچو میاں شام کی چہل قدمی سے واپس آ رہے تھے۔ بستی کے قریب گھورے کے ڈھیروں پر چرتی ہوئی ایک گھوڑی ان کے جانب مونہہ اٹھا کر بڑے زور سے ہنہنائی اور دھنگنے سے بندھے ہوئے اگلے پاؤں سے کودتی وہ جست ان کی جانب کو بڑھی اور چودھری اور استاد نے تو نہ پہچانا مگر کا ٹھیاواڑی تو چھ مہینے کے گھی گڑ کے ملیدے اور چکنی چپڑی روٹیاں نہ بھولی تھی اور نہ بچو میاں ہی کا آسن اس کے دوگامے اور پو قدمے کے مزے بھولا تھا، پہچان کر بے ساختہ مونہہ سے نکلا "اوہو! میری کا ٹھیاواڑی! چہ چہ چہ! کتنی دوبلی، ابا جان میری کا ٹھیاواڑی!!" اور چودھری "میری کا ٹھیاواڑی" سنتے ہی اچھل سا پڑا ــــ اور گھوڑی کی جانب دیکھ کر ان کے مونہہ سے بے ساختہ نکلا "نہیں بیٹا! کنھیا کی کا ٹھیاواڑی" ــــ اور پھر کا ٹھیاواڑی کو ڈری ڈری، چڑی چڑی نگاہوں سے دیکھا اور بیٹے کے "میری کا ٹھیاواڑی" کہنے پر اس کے دل میں وسوسہ گذرا اور کا ٹھیاواڑی کی جانب سے نفرت کے ساتھ مونہہ پھیر لیا۔ اور ذرا تیز سی نگاہ سے بیٹے کی جانب دیکھا، مگر بچو میاں محو تھے اور پھر بے اختیار ہو کر بول پڑے "ابا جان! ابا جان! اور میری کا ٹھیاواڑی بیا گئی ــــ ہوں اس کا بچہ! کیسا اچھا!" ــــ اور چودھری خوف و خشونت کے ملے جلے انداز میں گھبرا پڑا "چپ ہو، کنھیا کی!" اور پھر ڈری ڈری کنکھیوں ــــ سے "ساون بیانت" منحوس بچھیڑے کو دیکھا جس کو گاؤں کے لوگ بول چال میں بھی بچھیرے کا درجہ نہیں دیتے اور ساری عمر بچھیا ہی پکارنے کا رواج ہے اور وہ راستہ راستہ بڑھتے کا ٹھیاواڑی کے محاذ پر پہنچ گئے۔ چودھری کے قدم سست جیسے ملک الموت کی جانب بڑھ رہا ہے اور بچو میاں تیز تیز لپکتے سے گویا کھٹے ہوئے کھلونے کی جانب ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ "ٹھہر لڑکے!" باپ نے خائف آواز میں کہا اور بچو میاں عین کا ٹھیاواڑی کے محاذ میں ٹھہر گئے۔ اور اگلے پاؤں دھنگی ہوئی کا ٹھیاواڑی نے ڈیڑھ سال پرانے عیش کی یادوں میں مری مری ہنہناہٹ کا ایک اور تحفہ پیش کیا اور قریب آنے کی ایک لنگڑی سی جست لگانے کی کوشش کی اور چودھری کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کے بیٹے پر آدم خور شیرنی جھپٹی، اور باپ کی محبت اندھا دھند لپکی اور چودھری ڈھال سا بن کر درمیان میں آ گیا اور بیٹے کو کھینچ کر پیچھے کر لیا۔ ادھر بچہ استاد کی

جانب رجھ رہا تھا۔ ادھر یہ بچہ بڑھا‘ ادھر باپ کی آڑ سے بچہ میاں لپکے اور استاد کے قریب پہنچ کر چکنے چکنے سفید چینی کے کھلونے کو چھوا۔ اور گھبرائے ہوئے سے باپ نے لپک کر پھر خود سر بیٹے کو ایک جانب گھسیٹ لیا اور چودھری کے کان استاد شامت کی بات پر لگ گئے۔ اور آنکھیں بچے پر اور استاد بولے "ابی میاں! ارے اس کے چھاتی پر گلے میں تو دیومنی اور کنٹھ من رکھی ہوئی ہیں ساتھ ساتھ! اور دیومن پچھ انگل بڑھ کر سیپوں سے مل گئی ہے" اور پھر ہونٹوں پر "ان مہو" رکھی ہوئی ہیں واہ واہ! ۔ میاں کیا بچہ ہے! ۔ اور آہاہا! اللہ میاں نے ہاتھ سے گڑھ کر بھیجا ہے‘ دائیں پاؤں میں پدم اور بائیں میں" چنتا من" ۔ اور واہ کو کھ اور ماتھے پر "فصلی"! ۔ پیٹ پر گنگا پاٹ! ۔ واہ! کیا کہنے! کیا کہنے!! ۔ بچہ ہے کہ سعادت ہی سعادت‘ سبحان اللہ" استاد جھوم سے گئے۔ کیا مبارک بچہ ڈالا ہے ڈائن کا قہیا وارثی نے کنھیا کے کھونٹے پہ! ۔ جس تھان پر باندھو وہ گھر بھر دے‘ ایک مرتبہ اس کی "ان مہو" چومو بارہ برس عمر بڑھے‘ اس کی "فصلی" جس ران اور ہاتھ تلے رہی عمر بھر سوار کا سر نہ دکھے۔ اور اس کا یہ پدم اور چنتا من ایکنے نہ کبھی اسے ہارنے دیں اور اگر مالک ہارے تو ہار ہی جیت کرائیں‘ سبحان اللہ! کیسا مبارک‘ کیسا شاندار بچہ!"

اور استاد کے اشاروں پر دور سے ایک ایک بھونری پہچان کر چودھری کے تیوروں کی نفرت بیگانگی اور ایک گونہ حیرت میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ ایک قدم آگے بڑھا اور بولا" اور استاد وہ تو سب ہیں اور یہ تو دیکھو یہ ہاتھ پاؤں کا کس قدر صاف اور رنگ ڈھنگ کا کتنا بے عیب ہے اور تیور کس قدر بانکے ہیں جس وقت جوانی میں بھٹ کر جوانی میں بھریگا تو تصویر بن جائے گا۔ مگر استاد ڈھنگ تو سب انصاف کے سے لایا ہے لیکن رنگ سے یہ لارڈ سیکسن کا بچہ معلوم ہوتا ہے‘ ابی استاد یہ سبز رنگ کہاں سے لایا‘ آپ کہتے ہیں عرب نانٹ کا بچہ ہے اور رنگ لیتا ہے لارڈ سیکسن کا۔ باپ مشکی‘ ماں تیلیا کمیت اور بچہ پڑے سبزا! کیا تک ہے؟! ابی!؟"

"میاں انصاف کا! سولہ آنے انصاف کا! اور اس میں تو کوئی شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے‘ عالم وجود میں آنے سے عین پیشتر باپ کا سر پھوڑا‘ ماں کا کھوپڑا جھنجھوڑا‘ اوہ سرکار! اور وہ اندھیری رات مجھے کبھی نہ بھولے گی‘ تین ہفتہ کا بچا ہوا دیوانہ سانڈ! اڑ گڑا تو ڑا تا ڑ مر پھوڑ کر باہر آ پڑا۔ مشکی گھوڑا اور ساون کی اماوس کی رات! سائیں سائیں کالا سایہ سا لہرایا ادھر سے ادھر نکل جانے ہے‘ لگام مونہہ سے‘ سائیسوں کی ہمت نہ پڑے پاس جانے کی! بھوکے شیر کی طرح بپھرا ہوا‘ جوش میں آ کر گھوڑی کا سر تک چبا گیا اور دوسری مرتبہ گھوڑی کی آدانہ پہ لنگور کی سی جست لگا کر مویشی خانہ کے میدان میں آ گرا‘ سرکار قیامت ہی برپا کر دی تھی اس بچہ کے قیام حمل کے وقت دونوں ماں باپ نے! اصطبل سے مویشی خانہ تک خون کی بارش ہوئی تھی میں تو گھبرا گیا تھا کہ بچہ کا سارا خون نتھنوں کے پرنالے کی راہ بہہ جائے گا۔ اور یہ بیس ہزار کی سرکار کا امانت ہڈی بن کر حلق میں اٹک جائے گی۔ مگر اللہ نے بڑا فضل کیا‘ ایک چٹکلا کام کر گیا اور خون بند......"

اور چودھری نے بات کاٹتے ہوئے کہا" وہ تو سب معلوم مگر استاد یہ سبز رنگ کہاں سے لایا سالا ابی"

" کہیں سے لایا ہو مگر انصاف کا بچہ ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا‘ تیور دیکھ لیجئے‘ ہاتھ پاؤں ٹھاٹھ سب عرب والے‘ اور پھر سرکار آنکھوں دیکھی بات ہے‘ کاہے کو ایسا کوئی گھوڑی آج تک اس ہنگامہ کے ساتھ گابھن ہوئی ہو گی روئے زمین پر! اس کے تو انصاف کا نطفہ ہونے میں کوئی شبہہ ہی نہیں ہو سکتا جناب"

" ہوں شبہ کوئی نہیں‘ میں نے تو رنگ کی مناسبت سے یوں ہی مذاق میں لارڈ سیکسن کا نام لے دیا‘ کیا میں نہیں جانتا‘ ہاتھ پاؤں گالے‘ تیور سب ڈھنگ میں انصاف کی تصویر جھلک رہی ہے‘ اور بال بھونری میں ماں کی ضد ہے‘ مگر یہ بگلا سا سفید رنگ کہاں سے لایا نہ معلوم ۔ پل گیا اور زندہ رہا تو نکلے گا بڑا بانکا جانور!"

اور استاد نے کہا" بس سرکار اسی میں بندے کو کلام ہے کہ پل گیا اور زندہ رہا۔ حالت نہ دیکھ لیجئے" گھوڑی کی جانب اشارہ کیا" یہ بھادوں کنوار ماں بچہ جی جائیں تو جی جائیں جب تک یہ جہاں تہاں گھوروں گلیوں سڑی گلی گھاس کا برساتی تنکا چکتا ہے اور کاتک اگھن کی ٹھنڈ پڑتے ہی یہ مر جائے گی اور پھر یہ اپنے آپ بھوکوں مر کر رہ جائے گا‘ اور کاتک اگھن گھسٹ جائیں تو پوس ماگھ کا جلہ کھا جائے گا"

اور چودھری ڈرا کہ ساون بیانت گھوڑی آپ چلی جائے گی۔ اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کا بچہ میاں اس کی نحوست سے ان کی بڑھیا ماں نے بروقت خبر لے کر بال بال بچا لیا۔ اور کوئی اچھی گھڑی تھی کہ انھوں نے دان کر دیا تھا۔ اور بچو میاں بڑی محبت سے بچہ کو دیکھتے اپنے باپ اور استاد کے ساتھ چلے آئے۔ چند قدم بچہ پیچھے پیچھے چلا اور جب یہ ایک موڑ کی آڑ میں آ گئے تو پلٹ گیا اور بچو میاں مڑ مڑ کر دیکھتے رہے اور پھر گھر تک سوچتے آئے کاش یہ منحوس کاٹھیاواڑی کا بچہ نہ ہوتا۔ یا پہلے سے کاٹھیاواڑی کے بجائے سب مبارک بھونریاں ہوتیں جن پر اس کے باپ اور استاد جھوم جھوم گئے تو وہ کیوں بیمار پڑتے اور ان کی کاٹھیاواڑی کیوں نکالی جاتی یا پھر یہ کمبخت کاٹھیاواڑی مہینہ بھر پہلے کا جن ہوا ہوتی تو پھر یہ بچہ ان کا ہوتا، اور اس کے لئے اور بھی بڑے بڑے گھی گڑ کے لوندے چرایا کرتے، ڈلیوں روٹی اور تیل کھلا کھلا کر اس کو اس چینی کے گھوڑے کی شکل بنا دیتے جس سے ان کی منی بہن کھیلتی ہے جو اس کے لئے وہ کابلی اشنان کے میلے سے لائے تھے۔ ارے گھی گڑ کے لوندے کیا چیز ہیں وہ تو اسے وہ سب کھلایا کرتے جو وہ دسترخوان پر کھایا کرتے ہیں۔ دال بھات، روٹی سالن پراٹھا اور اگر وہ کھاتا تو کیا قورمہ پلاؤ تک چرا چرا کر ...۔ اور پھر ان کے تصور میں اس چینی کے گھوڑے کی تصویر گھوم گئی جو وہ اپنی منی بہن کے لئے لائے تھے اور ایک زندہ کودتے پھاندتے کھلونے سے کھیلنے کو ان کا بے اختیار جی چاہا۔

اور کاتک کے اخیر تک بچہ نے کاٹھیاواڑی کے جسم سے خون کی اخیر بوند بھی چوس لی، اور اگہن کی پہلی ٹھنڈی سیت چلتے ہی فاقوں، کوڑوں اور چپکیوں کی ماری کاٹھیاواڑی کٹھیا کی لگام دھنگنا توڑ کر اور عرب نائٹ کی شاندار امانت قصائی کے کھونٹے پر چھوڑ کر راہ گئی، اور اسی روز شام کو کسی سائیس نے بر سبیل تذکرہ چپکے چپکے استاد کو بتایا کہ ساون بیانت کی بھینٹ میں کاٹھیاواڑی "آپ گئی"۔ اور اماں کے بال بال بچنے اور بڑی بی بی کی بیدار مغزی اور بروقت کاٹھیاواڑی کو نکال باہر کر دینے پر بڑی اہمیت کے ساتھ تبصرہ کیا، اور بڑے بوڑھوں کی عقل اور تدبر اور حفظ ماتقدم کی تعریف کی۔ ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا کہ کٹھیا کاٹھیاواڑی کے مرنے سے پہلے ہی بچہ سے نالاں ہو گیا تھا۔ اور اب اس بچہ کا کیا کرے، قصائی کے بھی تو کام کا نہیں جو چپکے سے مری ہوئی گائے کے بچھڑے بچھیا کی طرح کاٹ دے جو کبھی کبھی کسی گائے کے بیانے کے چالیس دن اندر مر جانے کے بعد گانوں والے دان کر دیتے تھے اور وہ بہت جلد خاموشی کے ساتھ کسی بقر قصاب کے چھریوں کے سایہ میں پرورش کرنے کیلئے فروخت کر دیتا تھا۔ دن بھر بچہ بھوکا تھا۔ شام کو جو کا آٹا گھول کر اور دودھ بنا کر تار سے پلانے کی کوشش کر رہا تھا اور کاٹھیاواڑی کو گالیاں دیتا جاتا تھا جو اپنا سارا بار اس پر لاد گئی۔

صبح کو چودھری مویشی خانہ میں آیا تو استاد نے بڑے کھلتے ہوئے انداز میں کہا "لیجئے میاں مبارک ہو، آپ کا دان سپھل ہوا" گھوڑی آپ گئی تے۔۔۔ مالک بچا، اور کٹھیا سب نحوست ہضم کر گیا، اور میں تو سرکار ٹھٹھرا گیا تھا اس روز خاص وقت آپ نے بھونریاں دیکھ کر قاعدہ میں بھی ہے اور آج تک نادم تھا۔ کیا عرض کروں ساری عمر سات پشت سے رئیسوں کا ہی کھلا نا بنے گئی ہے۔ غلام نے اپنے پچپن سال کے تجربہ ایسا غچہ نہیں کھایا۔ بچوں میاں نے لا کر باندھ دی اور میں نے کوئی خیال نہ کیا۔" چودھری خوش ہوا اور کھل کر بولا "مگر استاد وہ بچہ بڑا اچھا ہے کیا کہنے اب اس کے۔ اور پھر وہ تو ماں کی ساری نحوستوں کا زندہ جواب اور مبارک بدل ہے، جس تھان پہ بندھ جائے بڑا ہی با برکت۔۔۔ بن جائے۔ کوئی مبارک بھونری بھی ہی نہیں ہے۔ جو نہ لاتا بالی بال موتی پروے سولہ سنگھار کئے آیا ہے۔ اللہ اللہ بچہ کو سعد اکبر، اگر کسی آپ جیسے جوہر شناس رئیس کے ہاتھ پڑ جائے تو چار دانگ عالم میں شہرہ کر دے، پر ہاتھ پاؤں رنگ ڈھنگ تیور میں یکتا چودھری نے للچا کر اشتیاق کے ساتھ کہا "پڑ کیسے جائے ہمارے ہاتھ، بڑی بی بی کو کون سمجھائے۔ عورتیں اتنی باریکیاں تو سمجھتی نہیں کہ اب اس کے برعکس ہے۔ وہ تو مرتے وہی ایک ٹانگ نحوست لئے جاتی ہیں۔

اور استاد چودھری کی مرضی پا کر خوش ہو گئے اور بولے ان سے نبٹنا میرا کام رہا، میں مویشی خانہ میں کبھی اس کا تھان ہی نہیں کروں گا، جہاں چاہے بیٹھے، کھائے، کھیلے کودے، بس چلتا پھرتا رہے گا۔ اور سرکار پرانی فارسی ضرب المثل ہے، اسپ گشتہ بکار، عمر بھر باندھ کر پالے ہیں، ایک ایسا ہی سہی، ذرا بہاریں دیکھنا اس کے جوہر کی۔"

"تو پھر آئیے جا کر کنھیا سے گر نقد قیمت دے کر، خوش خرید" چودھری نے کچھ ایسا خیال دل میں لاتے ہوئے کہا کہ قیمت دینے کے بعد جب ہر چیز حلال ہو جاتی ہے تو اگر ماں کے زمانہ کی تھوڑی بہت نحوست لگی لگائی رہ گئی ہو تو پاک ہو جائے گی

ہاں، سرکار قیمت دے کر اور نہیں تو کیا ہم اس "چھنکیا" سے اپنا دان پھیرنے جا رہے ہیں۔

(۴)

صبح تڑکے استاد چپ چاپ اکیلے کنھیا کے گھر پہنچے۔ کنھیا جھٹ پٹ لی چھیرا پر جانے کی تیاری کر رہا تھا اور چھٹی بھر ہوئے آٹے کا دودھ بنا کر بچہ کے منہ میں نار سے انڈیل رہا تھا اور جھنجھلا جھنجھلا کر بچہ کی ماں سے اپنا ناجائز رشتہ قائم کرنے کی بات کرتا جاتا تھا۔ استاد نے آواز دی، اور کنھیا استاد کی آواز پر چونک کر بچہ کو "نکل سالے، نکل سالے" کرتا باہر آ گیا اور استاد نے کہا "کہو پنڈت جی اس بچہ کو پالے پڑے ہو؟"

"پالے کیا پڑے ہیں استاد یہ ہمارے پالے پڑ گیا ہے، وہ تو چل گئی اور سالی منحوس مجھ پہ چھاپ مڑھ گئی" کنھیا نے گھگھیاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر بیچ لو نا"

"ارے استاد کہاں سے گاہک دوڑے گو" کنھیا نے کہا اور استاد نے استادانہ بزرگوں کے ساتھ احسان اور دان سا کرتے ہوئے انداز بڑے چپکے سے دو روپے جیب سے نکال کر کنھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ گر کنھیا کا مطلب برروئے کار آ گئی۔ اور موٹے موٹے ہونٹ کھول کر عاجزی سے پیلے پیلے میل چڑھے دانت آگے کو نکال کر جھک سی طلب کی اور استاد نے ایک اٹھنی اور ہتھیلی پر رکھ دی اور بولے "تو بس اب تو خوش؟ پورے ڈھائی" اور بچہ ہنکا کر لے آئے۔

اور چودھری کے مویشی خانے میں دودھ دوہا جا رہا تھا، بچہ اپنے آپ جمنا پروشنیا (جانسی تھار کی یک رنگ سیاہ گائے) کے پاس جا کھڑا ہوا اور شیا نے غریب الامنا کا پیار کے ساتھ استقبال کیا۔ استاد کے اشارہ پر گوالے نے بچھڑی دوہنی بچہ کے سامنے کر دی اور جنم کے بھوکے اور پیدائشی فاقوں کے مارے بچہ غٹاغٹ ایک ہی سانس میں سونت گئے اور ہفتہ بھر کا ہوا مارے بچہ کی آنکھیں کھلیں تو پتہ چلا کہ زندگی بھوک ہی بھوک نہیں ہے اور نہ سوکھی ماں اور کنھیا کے کوندوں کے پیچھے پیچھے دوڑنا ہی دوڑنا ہے۔ زندگی دودھ ہی دودھ ہے۔ اور دودھ ان کے پہلو سے لگے بیٹھے رہنا ہی رہنا ہے۔ اور تھنوں سے تو شیا بھر پانی کیا ہی کے بچے کو پلا لی مگر چند ہی روز میں اسے غریب بچہ کے لیے بھی اپنے خالص دودھ کا گند سنگھوانی دینے لگی، جو دودھ ہی میں ہو کر بچہ کے رونگٹے بن گئے۔ یہ رونقی سامان کر بچہ نکل پڑا تھا اور وہ جھلا ہے بچھڑے کو پیار سے چاٹی اتنا ہی بے ماں کے بچہ کو، ادھر بچو میاں کے دل کی کلی کھل گئی اور اب بچہ کو چھوٹی بہن والے جنیں کے تھوڑے کی شکل بنانے یا لکھی گٹڑ، روئی پل کر سب پرانی چوریاں دھرانے لگے اور کچھ بچہ کا پاؤں کھلا، گائیں، بیلوں، بھینسوں کے حصہ میں سے ہر نعمان پر پہنچ کر منہ مارنا شروع کیا اور ایک بچو میاں ہی کیا، چودھری اور استاد نے سے لے کر بچہ مویشی خانہ بھر کا کھلونا بن گیا اور بنائی جیت لگنے لگے۔ بچہ بیچ نہ چینی کا سا کھلانا بن گیا اور اب ہرے بوٹوں میں دانا کر لیا، بہار کی ہوا میں پکے اناج کی خوشبوئیں تیرنے لگیں، بچہ اسا اللہ بار دیکھا کی گئے تھے، مویشی خانہ کا سب سے کا لٹا اور انہیں چھوڑا، یا نوں زیادہ لگا۔ ہرے لہلہاتے کھیتوں میں اگلے دانتوں سے کتر کتر کر ہرے ہرے ہونٹ اور جو لی الیاں کھانے بیٹا اس پھی زیادہ دو میں کلیلیں کرتے اور پیٹ تمام ہے، جمنا پروشنیا اتا کا کھار ہی کو باشرہ دودھ ستیا تمام ہے، دو ہفتہ گئیں بچو میاں کے چاٹے ہوئے لمبی گڑ کے روڑے کھاتے، تیل بن ڈولی نہیں کی کھلیں، بٹیاں چبانے اور بیج کی نقل کی اور لعب خانہ ہوئے، نہ تھیلی کھلیاں پہنا گئے۔ دو سو نہ ایک، ڈھیر پہ اور جا۔ دو پہر دوسرے پر تمام دن ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر چودھری بھی کیا ہر انسان کے کریں صاحبوں پر مصروف طعام رہتے اور شہر اپنا محبت کے ساتھ دکھی اور مبارک نظر سے لوں کی مہرت پر اپنے ڈھیر پر بچہ کا منہ مارنا موجب برکت خیال کرتا۔ اور صبح کی دوہی سے ناشتہ کر کے گئے بچہ تمام دن کھا پی کر کہیں شام کو اپنا ا ما

کی دودھ پلائی کے وقت کا ٹھیک اندازہ کر کے مویشی خانے کو چلتے اور مقررہ ناشتہ کر کے اپنی جمنا پاروشیا ماں کے کبھی دائیں پہلو سے کبھی بائیں پہلو سے اور کبھی سامنے بیٹھ جاتے اور ان کا رضاعی بھائی بچھڑا تو چوری سے "چکھا" جانے کے اندیشہ میں ماں سے علیحدہ باندھ دیا جاتا مگر وہ تو دودھ پینے والے تھے، بے کھٹکے چرلے رہتے اور تمام رات شیاما پہلو سے لپٹائے بچہ پر زبان سے دست شفقت پھیرتی رہتی۔ اور جب فصل کھلیانوں سے بھی چلی گئی اور گھروں میں پہنچ گئی تو بچہ کو پھرتے پھراتے گلیوں اور دروازوں پر کسانوں نے محبت کے ساتھ روٹی کا ٹکڑا کھلانا شروع کیا اور کہیں کہیں برکت ہونے کے خیال سے پاؤ آدھ سیر دودھ کا بھی گھونٹ پلا دیتے اور لوٹ ساون آتے آتے تو بچہ گھر گھر کے لاڈلے ہو گئے اور در در پر منزل برکت کی نشانی بن گئے۔ اور پانوں کی جوتی گھر کے لاڈلے بچو میاں نے اتنی سر چڑھائی کہ بچہ حویلی کے اندر تک پہنچنے لگے اور یہاں تک کر دوپہر رات ہانڈیوں کی خوشبو پر دستر خوان والے دالان کے دوپہر سب لوگوں کے کھانا کھاتے وقت بچو میاں کے پیچھے اگلی ٹاپ مار مار کر ہنہناتے اور شروع میں تو بچو میاں نے اور پھر سب گھر والوں نے تواضع شروع کی، پھر سب کے کھانا کھانے کے بعد کی اچھی خاصی تفریح آ گئی اور کبھی کبھی جب ان کے قسمتے میں کوئی ایک آدھ ہڈی بوٹی پھینک دیتا تو جمنا پاروشیا کا بیٹا ایک چھینک سی لے کر ناز کے ساتھ کان جھکا کر ذرا اٹھاتا اور منہ پھیر لیتا۔ اور قہقہہ پڑ جاتا۔ کھانے کے بعد بڑی دیر تک دستر خوان کی جوٹھن سے لڑکے لڑکیاں، حتیٰ کہ چھوٹی بڑی چودھرائنیں تک تفریح کرتی رہتیں، اور جب سب ان کے مطلب کی جوٹھن ختم ہو جاتی اور سامنے ہڈیوں اور چھیچھڑوں کی بارش ہونے لگتی تو بچہ مکدر سے ہو کر چلے جاتے مگر بڑی بی کو ایک آنکھ نہ بھاتا اور وہ کبھی کبھی کہہ دیتیں کہ ایک نہ ایک دن اس کی نحوست رنگ لائے گی۔
مشہور مانی ہوئی بات ہے کہ بڑھاپے میں مسجد کی روٹیاں مرتے دم تک نوجوانی کے سوتے ابال دیتی ہے، بچپن میں در در کے ٹکڑے بڑی جلد دیہاتی جوانی چڑھا دیتے ہیں اور حویلی کے دستر کی جوٹھن سال بھر میں بچے سے جوان بنا دیتا ہے اور بچہ تو کسی کھر بندی نہ تھے۔ دو ہی سال میں "پانچ" ہو گئے۔ پہلے تو ماں اور نانی کی عمر کی بارہ ستارہ کی خوشبو مویشی خانے کے اندر لینے اور ہنہنانے لگے مگر یہاں معاملہ ان کے باپ ماں کے برعکس تھا۔ بارہ ستارہ اڑگڑوں کے اندر تھیں اور ان کے سلسلے سال کے سال سر کیمبل اور لارڈ سیکس سے ملتے رہتے تھے۔ ایسے لونڈے چھوکرے کی آواز پر ملتفت بھی نہ ہوتیں اور کبھی کبھی بوڑھی بارہ تو بچہ کو اظہار عشق پر بچے کی طرح محبت کے ساتھ چمکار دیتی اور جب یہاں بارہ اور ستارہ کو انصاف کی طرح اڑگڑے توڑ کر باہر آنے کی ضرورت نہ پائی تو ملک خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست، جس طرح بچو میاں نے کمہاروں اور دھوبیوں کے خچریوں اور گدھوں پر سواری کی ٹریننگ خود دلی تھی اسی طرح آپ بھی جا پہنچے۔ مگر گدھیاں اور خچریاں بہت بجتی تھیں اور بچہ ماشاء اللہ دو سال میں باپ کے لگ بھگ پہنچ گئے تھے، باوجود دو تین روز دوڑ دھوپ کرنے کے بھی فٹ نہ ہوئے اور شاید وہ ایک روز سلسلہ اور چلتا تو کہیں اونچی نیچی جگہ پر کامیاب بھی ہو جاتے کہ استاد کی نظر پڑ گئی، تھان پر باندھ تو سکتے ہی نہ تھے اور نہ استاد کو کچھ سجھتا تھا کہ انصاف۔ ایک روز خورجی سے نشتر، چھری نکال کر اور السی کا تیل منگا کر بچہ کو باندھ لیا اور چت گرا کر پہلے نشتر سے کھال میں شگاف دیا، پھر کوئلوں پر سے دہکتی ہوئی چھری اٹھا کر موٹی موٹی لٹکتی نسوں پر چھوا دی اور نار سے السی کا تیل حلق میں ڈال دیا اور ہمیشہ کے لئے مویشی خانہ کے اندر اور باہر بچہ کے رومان لڑانے کا سد باب کر دیا۔

اور آختہ ہو کر تو بچہ کے اوپر بڑی رنگ دار جوانی چڑھنا شروع ہوئی۔ رونگٹے رونگٹے پر وہ چمک دوڑی جیسے گھی تیل میں سے غوطہ مار کر نکلا چلا آ رہا ہے، آنکھوں کی چمک میں جیسے اپنی دادی والی دلکشی پیدا ہو گئی اور تیوروں میں ماں والی رعنائیاں کھیلنے لگیں۔ گردن تیکھی مور کی طرح تنی اور پٹھے اٹلے نگاڑے کی طرح گول گول الٹ کر اوپر جا پڑے اور بچہ سنگ مرمر کا تراشا ہوا مجسمہ سا بن گیا اور چودھری کو اس بیلڈگری معلوم کرنے کا شوق پیدا۔ ماں کی جانب سے تو قصبہ کے کانجی ہوس سے آگے سراغ ہی نہ چلتا تھا۔ ہسبنڈری ڈپارٹمنٹ کے کئی ایک بڑے انگریزوں نے اصطبل کے معائنہ کے لئے کیمپ کیا اور معائنہ کے بعد چودھری نے بچہ کو پیش کیا اور مشکی عرب سانڈ اور تیلیا کمیت کاٹھیاواڑی کے کراس میں سبز اور سفید بچہ کیسے پڑا، کا اہم سوال پیش کیا۔ انگریز تحقیق کا بڑا شایق ہوتا ہے اور صاحب موصوف نے عرب ناٹ انصاف کی پیڈگری کے ماڈرن سرٹیفکیٹوں کی تفصیل دیکھی مگر سات پشت تک ماں باپ میں کہیں سفید رنگ کا رونگٹا بھی نہ نکلا تو

کو گھوں میں پڑ کر عراق کے سینڈری ڈیپارٹمنٹ کو کیس ریفر کیا تو وہاں سے کئی ماہ بعد مزید تحقیقات ہو کر اور کاغذات دیکھ کر یہ پتہ چلا کہ عریبینٹ کا چودھواں والد اسپنر تھا اور اس چودھویں والد کی صحت شکل اور بال بھونری کی جو تفاصیل لکھیں من و عن بچے میں وہ تمام موجود تھیں۔

اور اب تو چودھری کی نگاہیں بچے پر بہت گہری ہو گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات تمام علاقہ میں بھی مشہور ہو گئی۔ سارا گاؤں جیسے بچے کے وجود پر محبت کے ساتھ فخر کرنے لگا۔ ادھر آخرت ہو کر بچے کو بالکل ہی لوٹ معاف ہو گئی، سرکاری اصطبل میں پہنچنے لگے، گھروں گھروں عورتوں مردوں میں بچے مانوس ہو گئے اور اب جتنا پہلے خیال اس سے فراتی محبت بڑھ گئی کہ بیان سے باہر اور بچوں میاں کا تو عاشق ہو گیا۔ جسم کے ساتھ ہی بڑھا اور چوتھے سال کی عمر میں غضب کی جوانی پھٹ پڑی کہ باپ کو مات کر دیا۔ استاد شجاعت خاں نے تیسرے سال کے اندر ہی اندر تینوں سال لے کر ٹریننگ مکمل کر دی اور بچے میں الھڑپن اور طراری شوخی کی جگہ شائستہ تیزی نے لی اور مزاج رنگ ڈھنگ میں جیسے بالکل اپنے چودھویں دادا کو پلٹ پڑا۔

(۵)

روہیلکھنڈ کا مشہور دیہاتی میلہ جو گنگا کنارے رحمت خاں اور دیلی دور کی یادگار تھا آج تک اسی آن بان سے لگتا تھا اور اب تک قدیم رواج کے مطابق اس میں خاص روہیلہ دور کی عام گھوڑ دوڑ بھی ہوتی چلی آ رہی تھی۔ روہیلکھنڈ اور ہمسایہ اضلاع کے بہترین گھوڑے گھوڑیاں خرید و فروخت اور دوڑ کے لئے آتے تھے، ویسے تو ہر قسم کی مویشی کی خرید و فروخت اور کاتکی بیساکھی کی پورن ماشیوں پر عقیدت کے ساتھ گنگا اشنان اس میلہ کی اہم ترین خصوصیتیں تھیں مگر سب سے اہم یہ دیہاتی گھوڑ دوڑ بھی تھی جس میں ایک سے ایک بڑھ کر اور چھ چھ مہینے ریاض کر کے دیہاتی زمیندار اپنے جانور لاتے اور کبھی زمیندار کے رکھے ہوئے جوت پر دوڑ کا مقابلہ ہوتا، سب اضلاع کے کلکٹر اور روہیلکھنڈ ڈویژن کا کمشنر اس کے منتظم ہوتے۔ اور کل میلے کی آمدنی سرکار کو جاتی تھی اور آفیشل طبقہ کی خاص توجہ اس تاریخی قسم کی گھوڑ دوڑ پر بڑے شوق کے ساتھ تھی۔ اور لطف یہ کہ اس کے قواعد و ضوابط آج تک وہی پرانے روہیلے دور کے چلے آ رہے تھے بازی لگانا منع تھی، سب سے تیز اور جیتنے والے گھوڑے کو رئیس کا خطاب، جیت کی سند اور چاندی کا کپ (جوت) دیا جاتا۔ اور تجربہ کار استاد نے بچے کے دم خم دیکھ کر چوتھے ہی سال میں میلہ کی گھوڑ دوڑ میں اتار دیا اور سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں میدان بچہ کے ہاتھ رہا اور بڑے لمبے عرصہ سے رہا لوما ایک چکر پڑھا! صدیوں سے اتنے لمبے عرصہ سے کسی جانور کے بڑھنے کی روایت نہ تھی، دوڑ کے رجسٹر میں بچے کے مالک کے نام کے خانہ میں بچہ میاں بجائے اپنے یا اپنے باپ کے اویس گڑھ لکھایا تھا، اویس گڑھ اس قصبہ کا نام تھا جو ان کا آبائی وطن تھا اور اس جدت پر چودھری بہت خوش ہوا کیونکہ اویس اس کے جد امجد تھے جنہوں نے اپنے نام پر یہ قصبہ آباد کیا تھا، اور میلے اور گھوڑ دوڑ کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی کہ کوئی گھوڑا بجائے کسی فرد کے کسی مقام کے نام شریک ہوتا تھا اور دوسری فصل بیساکھی کے میلے میں استاد نے پھر بچہ کو گھوڑ دوڑ میں شریک کیا اور اب کی مرتبہ میدان اور بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ ہاتھ رہا۔ استاد بچہ پر خود سوار ہو کر بھگاتے اور تیسرے راؤنڈ میں تو بچہ غضب ہی کر دیتا۔ دس پانچ گز نہیں پورا راؤنڈ آگے ہوتا، لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے گھوڑا ہے یا آسیب، ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ فرلانگ سے ہراتا ہے۔ اگلے سال کے دونوں میلوں کی دوڑ کا سہرا بھی اسی شان کے ساتھ بچہ کے سر رہا۔

اور اب بچہ اویس گڑھ کے کسانوں سے بڑھ کر ضلع کے کسانوں کے دلوں میں گھر کرنے لگا اور تیسری دوڑ جیت کر تو بچہ کی محبت اور جیسے ملکیت تمام روہیلکھنڈ میں عام ہو گئی۔ اس کی جیت کے ساتھ ہر دلعزیزی بڑھانے والی خاص چیز اس کی پرورش کا طریقہ جو پچھوں اضلاع کے کسانوں کے علم میں بالتفصیل تھا، اور پھر یہ کہ بچہ کسی کی تنہا ملکیت نہیں، اویس گڑھ کے اندر اس کا کوئی نقصان نہیں، اور اویس گڑھ کے کسانوں سے بڑے فخر کے ساتھ بچپن سے لے کر اب تک کی بچہ کی سوانح حیات بیان کرتے اور وہ بڑے شوق سے سنتے اور پھولے نہ سماتے کہ اویس گڑھ کے کسانوں نے ایک ایسا بیرا پالا جو بڑے بڑے پرانے راجپوت پٹھانوں کے جانوروں سے بڑھ گیا اور جتنا رشک و حسد کا جذبہ بچہ کی جانب روہیلکھنڈ بھر کے بھاگ میں حصہ لینے والے اور ہر سال منہ کی کھانے والے روساء کے دلوں میں ترقی کرتا گیا۔ کسانوں کے دلوں میں اس کا

محبت جڑ پکڑتی گئی۔ اور دوڑ میں تو بچو نے پہلے ہی سال سے ہیلکھنڈ نرلیش کی پوزیشن لے لی تھی اور اب تو ہر کسان کے دل میں ہیرو کا مقام پیدا ہو گیا۔ اور بچو میاں کو شروع شروع میں تو بچو کی مناسبت اور دلچسپی کے سبب اولیں گڑھ کے کسانوں کے ساتھ یک دلی کا احساس ہوا اور پھر یہ دلچسپی اور لگاؤ جو ایک گھوڑے کی محبت سے پیدا ہوا تھا ان کا اور ان کے کسانوں کا اپنا ہو کر رہ گیا' اور سن شعور کو پہنچتے پہنچتے کالج کی سوسائٹی اور مخصوص قسم کے مطالعہ نے انھیں کے طریقہ میں عام کسانوں سے اتنا ہی قریب پہنچا دیا جتنا بچو تھا اور آخر بحیثیت تک تو خیر کچھ دوئی کا پردہ رہا مگر بیٹے میں پہنچے ہی وہ بھی بچو کی طرح کسانوں کا کچھ ایسا منفرد قسم کی چیز بن گئے' شروع سے ہی ان کا طرز عمل اپنا کچھ علیحدہ تھا' ان کے دونوں بڑے بھائی شکار کے شوقین تھے حکام ضلع اور رؤسا اہم چشموں کی پارٹیاں مدعو کرتے۔ جیسے' مرغابی' قاز' تیتر بٹیر کے شکار کے پروگرام بنتے اور کبھی کبھی شیر کے شکار کی اسکیم بن جاتی۔ دعوتیں اڑتیں' سیکڑوں روپیہ خرچ ہوتا مگر بچو میاں ایک اچھے شکاری اور قادر انداز نشانہ باز ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ کبھی شریک نہ ہوتے۔ وہ ہمیشہ جنگل کے شکار کے پروگرام بناتے' اور سانبھر' ہرن' چیتل جھانک' بارہ سنگھے وغیرہ قوی الجثہ چرندے بڑے شوق سے مارتے اور اس سے زیادہ شوق کے ساتھ دیہات میں گوشت تقسیم کراتے۔ پارٹی میں نوجوان منچلے شوقین کسان ہوتے اور ان کے ساتھ بچو میاں کو اپنے دونوں بھائیوں کی نسبت کہیں زیادہ مزہ آتا۔ اور اس طرح سیکڑوں من گوشت بانٹ کر اور گھر گھر گوشت کی ہانڈیاں گرم کرا کر اور گوشت کی بہاریں دیکھ کر انھیں اس سے کہیں زیادہ لطف آتا جتنا ان کے بھائیوں کو شکار کیمپ کی ڈائننگ ٹیبل پر اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ تیتر اور بٹیر کے روسٹ اور قاز' مرغابی کے قورمہ میں آتا تھا اور بالعموم عین اسی وقت جس وقت ان کی یہ ٹیبل رنگا رنگ گلستوں اور شرابوں سے مہکتی ہوتی' بچو میاں کہیں جنگل میں کوٹلوں پر ہرن' چکارے سانبھر' بارہ سنگھے کے گوشت کی سیخیں بھنوا بھنوا کر مزے سے کسانوں کے ساتھ کھاتے ہوتے۔ اور بچو میاں کے کیمپ میں بالعموم سو سو آدمی ہوتے جن پر خرچ بھی کرتے اور جنگلی زندگی کا سچا لطف لیتے۔

اور اب کی مرتبہ میلے سے پیشتر روہیلکھنڈ بھر میں کانوں کان بڑے زور سے افواہ اڑی کہ اس گھوڑ دوڑ میں کمشنر صاحب کی میم صاحب کی گھوڑی بھی دوڑے گی۔ اس دوڑ میں یہ عجیب افواہ تھی' ورنہ ہر میلے سے پہلے ہمیشہ کسی ٹھاکر پٹھان زمیندار کی گھوڑی گھوڑے کے نام کی شہرت اڑا کرتی تھی اور جب سے بچو نے یہ کیم جیتنا شروع کیا تھا یہ شہرت بہت زور سے ساتھ طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں کر کے اڑائی جاتیں اور پہلے سے مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی یا بالعموم بچو ہی کی شخصی مد نظر رہتی۔ مگر کمشنر صاحب کی میم صاحبہ کا نام بالکل نیا تھا اور میلے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کوئی سرکاری عہدہ دار شریک ہو رہا تھا اور میم صاحب کی دوڑنے والی گھوڑی کی طرح طرح کی مافوق الفطرت قسم کی باتیں اور روایتیں استاد کے کانوں میں پڑیں اور ہر کانوں کی جھنک کی پٹھے اور تخاسے [illegible] نئی سنائی بڑھتی رہیں' استاد کو سرے سے ہی یقین نہ تھا کہ کوئی سرکاری عہدہ دار [illegible] ریس میں مقابلہ کے لئے آئے گا' مگر [illegible] اور [illegible] [illegible] جوں جوں میلہ قریب آتا گیا افواہ تیز ہوتی گئیں اور روہیلکھنڈ بھر کی نظریں تو اپنے بچو پر تھیں اور [illegible] [illegible] [illegible] کرتے اور دور دور [illegible] گڑھ کے کسانوں میں خبریں پہنچانے اور یہ [illegible] [illegible] پٹھان زمیندار کے [illegible] کے لئے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] فلاں پٹھان لوں [illegible] [illegible] [illegible] تھی اور جوں جوں میلہ قریب آتا یہ خبر [illegible] [illegible] پہلی خبر [illegible] کمشنر صاحب کی میم صاحبہ کو جو گھوڑے ایک [illegible] نواب نے ان کی شادی کے جہیز [illegible] [illegible] گھوڑی سے بچو کیا جیت پائے گا!"

اور بچو میاں نے میلہ سے قبل [illegible] گھر آ کر خوشی خوشی استاد کو اس دیہاتی افواہ کی حقیقت بتائی کہ چند ماہ قبل ہمارے کمشنر صاحب [illegible] کرنے ولایت تشریف لے گئے۔ تھے اور وہاں میم صاحبہ کو ہز ہائنس سر آغا خان نے جوان کے ایام دوشیزگی کے دوست ہیں [illegible] [illegible] [illegible] پر میدم کلو ڈیا نامی گھوڑی بطور تحفہ پیش کی ہے اور یہ تحفہ شاہی [illegible] صاحب نے فرانس اور انگلستان بھر کی اسٹڈ میں بہترین [illegible] [illegible] کا اعتراف ہے جو لوڑتے تجربہ کار متبحر دوست نے شہد گھوڑی بطور تحفہ پیش کر کے کیا ہے اور یہاں تک کہ

انگلستان سے رخصت ہوتے وقت ان کے ساتھ میڈم کا وڈیا کا بچہ Madam بھی خود اپنے اہتمام سے لایا ہے اور بچو میاں نے بڑی خوشی سے بیان کیا کہ ان کا بچہ میڈم کا وڈیا کے مقابلے پر دوڑے گا اور بیس لسوہ جیتے گا اور انٹرنیشنل شہرت کا مالک ہوگا۔ استاد کرسمس میں پڑ گئے تو بچو میاں نے کہا کیوں استاد کیا ڈر گئے؟ اور آپ تو کہتے تھے کہ بچہ کے ہاتھ پر فضلی اور پاؤں میں پدم ہے اور یہ کسی سے ہار ہی نہیں سکتا اور یہ تو یہ اس کا مالک اور اس کا سوار تک کبھی کسی سے نہیں ہار سکتا۔ مگر استاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور جیوں جیوں میلہ قریب آتا گیا افواہ گرم تر ہوتی گئی اور یہ گھوڑدوڑ ہمیشہ سے زیادہ رنگین تر ہوتی گئی اور کیوں نہ ہوتی کمشنر صاحب کی نئی موتی کے رنگین دور سے گذر رہی ہوئی دولہن کی گھوڑی اور اس پر طرہ یہ کہ گھوڑیوں بچھڑیوں کے کچھ بین الاقوامی پوزیشن کے جوہر شناس قدرداں اس میدان کے مرد میدان آغا خاں اور تحفہ محت چوپال چوپال' الاؤ الاؤ چرچے تھے اور دل خوف و امید میں زیر و زبر دھک دھک کر رہا تھا اور اگر ہو تو یہ کیسے کہ کوئی بات ہے اگر بچہ ہار گیا تو کیا بات ہے۔ اسے کا بھی تو کمشنر صاحب کی گھوڑی سے تو نوجوان گھڑ گھڑا پڑتے اور ادب کے سامنے الگی بات پچھنے بڑھنے کو روکتے اور انھیں صبر نہ آتا۔

رئیس

(۶)

کمشنر صاحب چھ مہینے کی رخصت کے بعد شادی کر کے پلٹے۔ سب اضلاع کے کلکٹر صاحبان مبارک باد اور تحفے لے کر حاضر ہوئے گھوڑی کے سلسلے میں کمشنر صاحب نے شادی کے بعد ہی ولایت میں میم صاحب سے اپنی کمشنری کی اس تاریخی گھوڑدوڑ کا تذکرہ کر دیا تھا اور وہ گھوڑی کے شوق میں وہیں میم صاحب نے اس کو گھوڑدوڑ میں شریک کرنے کا اظہار خیال کیا تھا اور صاحب کمشنر ہو اور ایک ہندستانی اعلیٰ عہدہ دار کی واقفیتوں کا اپنی نئی نویلی دلہن کے سامنے اظہار شیخت کرتے ہوئے بزعم خود میڈم کا وڈیا کو جتانے کا وعدہ بھی کر کے لائے تھے جبکہ کا وڈیا نے ہندستان کی سرزمین پر ٹاپ بھی نہ رکھی تھی۔ ویسے میم صاحب کو سر آغا خاں کی بچپن کی صحبتوں میں ہندستان کے اونچے طبقہ کی داخلی طاقتوں کا یورپ کے اندر خوب تجربہ ہو گیا تھا لیکن ذرا بھی ایک ہندستانی کمشنر کی بوالعجب قوتوں کا اس پہلو سے اچھی طرح اندازہ نہ تھا۔ انھوں نے اس یقین کے ساتھ وعدہ کرنے کی صورت پوچھی تو کمشنر صاحب نے مسکرا کر ٹالنا چاہا اور جب بار بار اصرار کے ساتھ پوچھا تو فرمایا کہ میں اپنے اضلاع کے کلکٹروں کو ایک اشارہ کافی ہے' اور اسپورٹس مین لانگ میم صاحب نے مزید مشغل دریافت کرنا چاہا تو وہ سب موقوف یہ جادو کی بات نہ سمجھا سکے کہ ان کے کلکٹر ایک اشارہ میں اپنے اپنے اضلاع کے اندر کس طرح گھوڑے کو گدھا اور گدھے کو گھوڑا بنا سکتے ہیں اور ذرا دیر میں آدمی کو ڈاروں کی تھیوری پر الٹا چڑھا کر بندر کی طرح اپنے جادو کے ڈنڈے پر کیسے نچاتے ہیں اور میم صاحب جاری ۔ تازہ ولایت اور ہندستان میں نوگرفتار قسم کی عالمی عہدہ دار کی بیوی تھیں اور عہدہ داریا عہدہ دارانہ اشاروں سے ناواقف تھیں۔ کلکٹر تحفے کر سلامی مجرائی کے لئے حاضر ہوا اس سے نہایت معصومیت کے ساتھ اس کے کمشنر کے ولایت کے وعدہ کا تذکرہ کر کے میڈم کا وڈیا کے جتانے کا قطعی وعدہ لے لیا۔ حالانکہ صرف اتنا معلوم ہو جانا ہر کلکٹر کو ربانی آواز تھا کہ کمشنر صاحب کی میم صاحبہ اپنی گھوڑی کو شریک مقابلہ کرنے کا خیال کر رہی ہیں۔

اور سنگ آمد سخت آمد' استاد کا تو سنتے ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ اب کی ان کے بچہ کی خیر نہیں' میلہ کے انتظام کے ساتھ ساتھ تمبرون اضلاع کے اندر اس مرتبہ اس جدید انتظام کے بھی احکامات چھوٹے بڑے اسد عامہ کے عہدہ داروں میں آنکھوں آنکھوں میں دیے گئے اور ایک اشارہ میں مکمل ہو گئے اور انھیں کی تعمیل کے سلسلے میں کوتوال صاحب بچو میاں سے چودھری کے ہاں پہنچے ۔ [illegible] کا سبب بچہ کی جانب سے سخت اندیشہ تھا اور کوتوال صاحب نے چودھری کو دوستانہ اور بچو میاں کو [illegible] ۔ [illegible] بچہ کو میدان میں نہ اتاریں۔ اور چودھری تو پرانی چال کا اور صلح کل طبیعت کا مرنج و مرنجان قسم کا آدمی تھا۔ کوتوال صاحب کی تجویز [illegible]

کچھ وعدہ وعدہ سا کر لیا مگر بچو میاں نے ایسی بات سے بھی زیادہ دم خم کے ساتھ ان سے بات کی اور نوجوان کے آثار کی شدت اور جذبات کی ابتدا لے کر تجربہ کار کرتوال سے ذرا پینترا بدلا۔ اور کہا "میاں، صاحبزادہ میں تو تمہاری بھلائی کے لئے کہتا ہوں، تمہارا گھوڑا آٹھ مرتبہ میدان مار چکا" اور میڈم کا وڈیا ولایت کی گھوڑی ہے خاص سر آغا خاں کے اصطبل کی ناک۔ جس کے ماں باپ "دادا دادی" نہ معلوم کتنی بار ڈربی ریس مار چکے ہیں جن میں بیس لاکھ کی ایک ایک بازی ہوئی ہے۔ مفت میں کیوں کرکری کرانے کو اس کے مقابلہ پر اپنا جاجا یا گھوڑا ڈالو ـــ اور پھر جیت جاؤ بفرض محال تو اس کا نتیجہ!؟"

اور بچو میاں نے ایک موہنہ زور وکیل کے انداز میں خشکی کے ساتھ جواب دیا "دیکھئے تو کرتوال صاحب ہار جانے والی قباحت تو آپ ہمارے سمجھنے کے لئے چھوڑ دیئے کیونکہ اسے صرف ہمارا دل محسوس کرے گا نہ کہ آپ کا وہ بفرض محال جیت گیا تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم جیت گئے؟ یا آپ کا خیال ہے کہ سوا اس کے اور کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ کہ خدا نخواستہ ہم ہار گئے"۔

اور گھاگھ کرتوال نے لونڈے کے کابج ڈیبیٹ والے تیور دیکھ کر کہا "نہیں میاں تمہارا کوئی دخل نہیں، بات میرے اور میرے دوست کے درمیان ہو رہی تھی۔ چودھری سے میرے دو سال کے مراسم ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ چودھری کا گھوڑا آٹھ مرتبہ کی جیت ہار کر آئے، میاں صاحبزادہ وہ گھوڑی بہت یکش ہے، ہم تو تین مہینہ سے کھلا پلا رہے ہیں اور ہماری ران تلے بھی عمر بھر گھوڑے گھوڑیاں رہ چکی ہیں، مفت میں کرکری ہوگی اور گھوڑا آپ کا بیچ کھیت پٹے گا"۔

"واہ جناب واہ! یہ اچھی منطق ہے، ارے صاحب ہماری عزت ذلت کو آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ ہم خود۔ اور فرض کیجئے ہمیں اسی میں عزت معلوم ہو کہ ہمارا گھوڑا بیچ کھیت پٹے تو پھر؟"

"اور یہی تو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں، اور میرا کام نیک و بد دکھانا ہے"۔

"آپ کا شکریہ کہ آپ ہماری جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہماری عزت کی حفاظت کا بھی راستہ بتا رہے ہیں"۔

اور کرتوال صاحب نے اک ذرا موڈ بدل کر کہا "جی ہاں میاں صاحبزادہ ابھی آپ بچہ ہیں، آپ کو آپ کی عزت کی ہی حفاظت کا راستہ بتا رہا ہوں"۔

اور بچو میاں نے انتہائی ضابطہ کے انداز میں خشکی کے ساتھ بولے "لیکن جناب یہ آپ مجھ سے میاں صاحبزادہ کہہ کر کیوں خطاب کر رہے ہیں۔ ابھی جو آپ کا یہ نیا ڈی ایس پی تقرر ہو کر آیا ہے یہ پچھلے سال میرا کلاس فیلو تھا، اور اسے تو شاید آپ حضور کہہ کر بات کرتے ہوں گے اور میں بچہ ہوں ابھی اور میرا نیک و بد سمجھانے کے لئے آں جناب کو تکلیف کرنی پڑی ہے، ہاں تو فرمائیے اگر میں ہار جانے ہی میں اپنی عزت خیال کرتا ہوں تو مجھ کو عزت بچانے کا کونسا راستہ دکھا رہے ہیں"۔

"دیکھئے چودھری بچو میاں صاحب! ماشاء اللہ آپ نوجوان ہیں، عقل مند ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، میں جانتا ہوں، تو میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا گھوڑا جیت گیا تو پھر یہ بات کمشنر صاحب کے لئے کتنی شاق ہوگی"۔

"لیکن جیتنا تو امر محال ہے جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا اور ہار نا یقینی اور ایسے گھوڑے کو ہرا کر جو آٹھ مرتبہ جیت چکا ہو کمشنر صاحب کی گھوڑی کی شہرت کتنی بڑھے گی لہٰذا جناب گھوڑے کا میدان میں نہ اترتے دینا کمشنر صاحب کی شہرت کا روکنا ہے۔" اور ہمارے گھوڑے کے جیت جانے پر شاق گذرنا تو خطری امر ہے اوپن کمپٹیشن (Open Competition) ہے اور ہار جیت کی اسپرٹ ہی میدان میں لاتی ہے۔ اور شاق گذرنے کا ہم پر کیا اثر کمشنر صاحب پر شاق گذرے گی ہم خوش ہوں گے"۔

"پھر عرض کرتا ہوں چودھری صاحب آپ نوجوان ہیں۔ پڑھ ضرور گئے ہیں، ان گلیوں کی ابھی سیر نہیں کی ہے، اثر کیوں نہیں مجھ پر بھی اور آپ پر بھی"۔

"دیکھئے تا اب یوں کہئے وہ وہ دستان رائے اور ہماری ذلت والی بات نہیں تھی بلکہ مطلب سعدی یہ تھا۔ ہم کوئی کوتوال تو نہیں جو

ہم پر کمشنر صاحب کی گھوڑی کو جیت لینے کا سہرا اللہ تعالیٰ دیجئے گا" اور نہ یہ سچ ہو تو اں کا گھوڑا ہے جسے گھر بٹھا کر اور میدان مار کر کمشنر صاحب کی اعلیٰ ذات اسپورٹسمین شپ والا اسپرٹ مطمئن ہو جائے کہ میڈم کلوڈیا پیچ پیچ روہیلکھنڈ کی ہیروئن کا درجہ پا گئی اور اب تو سیٹھ کو تیا پنج کھیت بیچ کر بھاگنا ہی یہ درجہ حاصل کر لے گی۔"

"اور کوتوالی نے بچو میاں کے دم خم دیکھ کر تیسرا پینترا بدلا۔" دیکھئے صاحب جانے دیجئے، خیر آپ میری پوزیشن پر بھی غور کیجئے۔ کسی کو کچھ نہیں بگڑے گا، آج کل ہندو گورودی کا زمانہ ہے۔ اور میں آپ کے والد کا دوست ہوں، اگر بچہ دوڑے گا تو مجھ کو نقصان پہنچ جائے گا اور پھر میں تو دوست بھلا خیر آپ ہی بتا دیجئے کہ آپ کتنے مسلمانوں کو روزی سے لگا سکتے ہیں، آپ کی ذرا دیر کی واہ واہ ہو گی اور پھر آپ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ کافر مفت میں آپ کے بھی پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"بھئی سبحان اللہ! یعنی سارا اسلام آپ کے نقصان نفع میں ہے، یعنی زیادہ سے زیادہ آپ کے کیریکٹر رول کی ایک بلیک انٹری بچانے کے لئے میں ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کو دھوکا دوں جن کی آنکھیں اس وقت اس گھوڑ دوڑ پر لگی ہوئی ہیں۔ اور یہ کونسا اسلام ہے جناب کہ کافروں کے پیچھے پڑ جانے کے ڈر سے میں لاکھوں آدمیوں سے جھوٹ بولوں، قبلہ آپ بھی جیت جانے کے نتائج کے لئے تیار رہئے، اور جب میں ہی بھگتنے کو تیار ہوں تو آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

اور کوتوال صاحب نے بوڑھے چودھری کی جانب پُر امید نگاہوں سے دیکھا اور پیشتر اس کے کہ بوڑھا باپ کچھ بول پائے نوجوان بیٹے نے تاڑ کر کہا "کوتوال صاحب یہ نہ چودھری صاحب کا ہے اور نہ میرا، یہ روہیلکھنڈ کے چار لاکھ کسانوں کا ہے اور اونس گڑھ کا پورا قصبہ اس کا امانت دار ہے اور ایسے معاملہ میں کسی بھی مصلحت کے پیش نظر کوئی سمجھوتہ کرنا خیانت ہے اور اگر خیانت نہ کرنے کے بڑے نتائج مجھ کو بھگتنے پڑیں گے تو میں بخوشی انھیں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔"

"اچھا اگر ہم براہ راست کاشتکاروں سے اس مسئلہ کو خوبصورتی کے ساتھ طے کرا دیں تو پھر آپ انھیں ورغلائیں گے تو نہیں"

"اس کے دو جواب ہیں روہیلکھنڈ کے تین لاکھ کسانوں کے ساتھ بچہ میں ایک حصہ دار میں بھی ہوں انھیں کیا حق ہے کہ براہ راست میرے حصہ کا بھی سمجھوتہ کریں۔"

"لیکن ہر معاملہ کثرت رائے پر طے ہوتا ہے۔"

"چلئے مان لی مگر میرے پاس اگر کوئی پوچھنے آئے گا تو میں حق بات بتاؤں گا۔ اور سچی بات اگر ورغلانا ہے تو آپ کے نزدیک ہر ورغلاؤں گا۔"

"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! کیا شوق لیڈری ہے" کوتوال صاحب نے کھسیانی بلی کی طرح کہا، اور برجستہ بچو میاں نے کہا "اے سبحان اللہ کیا شان کوتوالی ہے!" اور دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے اور بوڑھے باپ نے خود سر بیٹے کی جانب ذرا کڑے تیوروں سے دیکھ کر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا "ہیں بچو میاں! یہ مت بھولو کہ تم اپنے گھر پر ہو اور کوتوال صاحب سے بات کر رہے ہو۔"

"جی ہاں، جی ہاں" بچو میاں نے ذرا مجوب سا انداز بنا کر کہا "اگر کوئی دل شکنی ہوئی ہو تو کوتوال صاحب معاف فرمائیں اور خیال فرمائیں کہ اپنے ہیڈ کانسٹیبل سے باتیں نہیں کر رہے تھے۔"

"اچھا آپ تشریف لے جائیے!" عاقبت اندیش باپ نے نوجوان بیٹے سے کہا اور بچو میاں کو خود اٹھ جانا پڑا۔ اور اب کمرہ میں تنہا چودھری اور کوتوال صاحب دو منٹ بالکل خاموش اور ایک دوسرے کے آغاز کلام کے منتظر رہے اور چودھری کا نے کچھ الفاظ معذرت زبان پر لانا چاہے تو کوتوال صاحب نے اس دروازہ کی جانب بہ نظر احتیاط دیکھتے ہوئے بات کاٹ دی اور کہا یہ بات اب ایسے بن نہیں سکتی اور اگر آپ اب کوئی بات معاملہ کی کریں گے بھی تو اور بھی برا ہوگا، میں سمجھتا ہوں کہ اگر اب آپ کا گھوڑا روکنے کی کوشش کی جائے گی تو آپ کا یہ لیڈر بیٹا معاملہ کو تمام کسانوں میں پھیلا دے گا اور حکام بالا کے کان تک یہ آواز پہنچ گی کہ گھوڑا

رہ گیا جا رہا ہے تو اگر گھوڑا رک بھی گیا تو بھی بات بہت بگڑ جائے گی اور رکنا نہ رکنا برابر ہوگا بلکہ رکنا اور بھی برا۔

"اچھا صاحب میں آپ سے اور ... خلاف کہتا ہوں ..." چودھری نے کچھ کہنا چاہا مگر کوتوال صاحب نے بات کاٹ کر کہا "معاف فرمائیے میں آپ سے حلف لینے نہیں آیا ہوں اور نتیجہ کے لئے میں تیار ہوں اور مجھ سے پہلے آپ بھی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کے لئے تیار رہیے" اور مڑ کر کوتوال صاحب نے پھر اس دروازہ کی جانب دیکھا جس سے بچو میاں باہر گئے تھے اور پیشتر اس کے کہ چودھری کچھ کہہ پائے اٹھ کر بغیر علیک سلیک بے جا رہ جا۔

(۷)

کوتوال صاحب کوتوال سہی مگر چودھری بھی تو چودھری تھا، کوئی دھنا جولاہا تو تھا نہیں اور ٹھنڈا کر کے کھانے کے لئے وقت نہ تھا۔ 'Ready Justice' کا استعمال ممکن نہ تھا۔ معاملہ نہایت نازک تھا اور انھوں نے تو خود ہی بہت خیال کر کے چودھری کی اونچی پوزیشن کے مطابق ... تھی ... وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ بچو کو مقابلہ پر لا کر ہرانے کی فرمائش کرتے وہ کلکٹر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اطمینان دلا چکے تھے: میلہ لگ چکا اور پولیس میں دونوں ... سکے اور اب ہر طرح سے موقع دعائے پوائنٹ پر آگیا تھا۔ ایسے مواقع پر وہ ... کیا ضلع بھر کے اور دور دور کے تھانیدار اپنے استاد شیخ مشرف الدین ریٹائرڈ تھانہ دار سے رجوع کیا کرتے تھے۔ شیخ جی کے پاس ... ہی ... کوئی تھی مگر کبھی کبھی ان کی رائے تھانہ داروں کی ہمت کے ساتھ شامل ہو کر بڑے بڑے الجھے معاملوں کو ایک چٹکی میں سلجھا دیتی۔ شیخ جی کو ریٹائر ہوئے دس سال ہو چکے تھے اور سروس کی تیس سالہ مدت اور پانچ سال توسیع میں سپاہی سے شروع کر کے تھانیداری سے ریٹائر ہوئے تھے اور اپنے دور میں یو۔ پی پولیس کی رائے، بہادری اور بیدار مغزی کی زندہ تشکیل اور نمائندہ تخلیق تھے۔ پانچ سال کانسٹیبل، دس سال ہیڈ کانسٹیبل اور پورے بیس سال تھانہ دار رہے۔ ہیڈ کانسٹیبلی کے دور میں ایک اشارہ میں میرٹھ کی نوچندی لٹوائی، تھانیداری کے زمانے میں گاؤں کا میلہ لٹوایا ... جس گاؤں نے ذرا سرکشی کی دن دھاڑے پچھم سے نکلوا یا پورب میں اتار دیا اور اپنے تھانہ کے نہیں ضلع بھر کے بڑے بڑے جانگی گروہ بند بدمعاش زانوئے ادب تہہ کرتے۔ بد سلیقے تربیت پاتے اور گورنمنٹ نے تھانہ دار کی ان بیش بہا خداداد صلاحیتوں پر نظر کرتے ہوئے شیخ جی کی سروس کے اخیر دس سال ان کی یو۔ پی مشہور شہرہ پشت ڈاکو سلطانہ کی گرفتاری کے سلسلہ میں "کار خاص" میں لگا دی اور اس کار خاص میں پانچ سال انھوں نے گرفتاری کے سلسلہ میں اور بقیہ توسیع کے پانچ سال ترتیب مقدمہ "گینگ کیس" سلطانہ ڈاکو میں گذارے اور بس اسی زمانہ سے شیخ جی کا دل پلٹا اور ریٹائر ہوتے ہوتے ہوئے بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر کرنے کا عہد کر لیا۔ سلطانہ کو پھانسی پر لٹکا ... خدا کو اس کے ظلم سے نجات دلانا اور پھر اپنی جان ہتھیلی پر ... ان کی سروس کا اخیر کارنامہ تھا ... ریٹائر ہوتے ہی انھوں نے سب سے پہلا قدم تبلیغ اسلام اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نکاح بیوگان سے شروع کیا اور چھ مہینے ... سلطانہ مرحوم کی ... کو مشرف باسلام کر کے نکاح کیا اور پھر دوسرے ہی سال حج بیت اللہ ... سے مشرف ہوئے ... تھانہ داری کے زمانے کی مچھے کچھڑی داڑھی میں تار لٹکے اور دنیا سے سیر ہو کر ... بیسا ... جب تک ... تھے ناشتہ میں ... بالائی، انڈے کھاتے کھانے ... خاص خیال رکھتے۔ ساٹھ سے اوپر تھی ... سانگ ... آج ریٹائر ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ صبح بھر میں تعجب تعجب ... اور ڈکیتوں میں سلطانہ ڈاکو کی ڈرامہ کھیلا ... شیخ جی اس کے ہیرو تھے۔ اور اب اکل حلال اور صدق مقال کے بڑے قائل ... سے ہی تھے ورنہ ... روپیہ ... ریٹائر ہو۔ ... ایک لاکھ اکیاون ہزار کیسے بچا کر لائے۔

اب اس زمانہ ملازمت کی ایک لاکھ اکیاون ہزار ... میں سے کتنے شیخ کے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کے تھے اور کتنے دو شادی کے جہیز کے۔ یہ شیخ جی ارمان کی ... سونے کی چڑیا جاتی ہوگی جس کو مقدمے کی پیروی کے دوران ہی میں انھوں نے نیک را

لگایا تھا جس کا ظہور ریٹائر ہونے کے بعد مشرف بہ اسلام اور نکاح کی پاک صورت میں ہوتا اور اب تو رقم جہیز اور رقم تنخواہ سب کی سب ایک ہی کو باک تجارت میں لگ گئی تھی' شہر کی اناج منڈی اور سبزی منڈی اور میٹ مارکٹ کا ٹھیلہ، جنگی کوڑے کے پراؤ اور گھنڈا کا ٹھیکہ' بازار میں ہیڈ کانسٹیبل کے زمانہ کی خریدی ہوئی بڑے لڑکے۔ کے نام دکانوں کی قطار، سول لائن میں تھانہ دار کے زرین دور کی تعمیر کوٹھیاں جگہ جگہ زرعی جائداد کہ میں حصے' سب بڑے کے انتظام میں تھے اور شیخ جی اللہ اللہ کرتے' محلہ کی عورتوں کو تعویذ گنڈے دیتے' محلہ کی مسجد میں چراغ جلواتے اور جب کوئی مصیبت زدہ آتا تو اسے وظیفہ بھی بتاتے اور اگر کسی پولیس ہیڈ کانسٹیبل یا تھانہ دار پر رشوت' اعانت جرم وغیرہ کے سلسلہ میں دفعہ کی کارروائی ہوتی تو جس طرح عرب میں بدو قبائل کا شیخ اپنے قبیلہ کے پھنس جانے پر اسے تدبیر سے بچاؤ اور رہائی کی ترکیبیں بتاتا ہے شیخ جی ان تمام برکتوں کے علاوہ کوئی موثر جلالی وظیفہ بھی بتاتے اور مصیبت زدہ اگر ہندو ہوتا تو زوردار منتر۔ اور اس سلسلے میں اگر کوئی پرانا ساتھی تھانہ دار، ہیڈ کانسٹیبل کسی اہم مسئلہ میں ان کی رائے طلب کرتے تو نہ صرف قانونی مفید مطلب مشورہ ہی دیتے بلکہ پرانی وضعداری میں عملی مدد بھی کر دیتے اور اس اہم معاملہ میں مشورہ کے لئے کوتوال صاحب اپنے پرانے استاد شیخ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کی فیض تربیت سے وہ آج اس درجہ پہنچے تھے اور اس پرانے ماہر نفسیات جرائم اور جدید شناور راز قدرت خدا رسیدہ بزرگ نے سب روداد سن کر کوتوال صاحب سے سوال کیا "کمشنر صاحب بہادر کے سائیس سے تو آپ کا سلسلہ ہو گا ہی ہو گا۔"

"جی آپ ہی نہیں جانتے' سلسلہ کیا تنخواہ ہی دیتا ہوں اور گھوڑی کا سب ....."

"ہوں ہوں میں سمجھ گیا' تو پھر ذرا اسے میرے پاس لے آیئے' اور میں اس سے ایک بات کر لوں ذرا' ویسے میں آپ ہی کو بتا دیتا مگر آپ خلیہ سے سمجھا نہ سکیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے کوتوال صاحب نے کمشنر صاحب کے سائیس کو بلوا بھیجا۔

(۸)

اور دوسرے روز میم صاحب کا خواب و خور حرام رہا۔ پھیوں اضلاع کے ڈاکٹر مویشی جمع ہوئے اور کلکٹری نے اگلا سید ھا پاؤں زمین پر ٹیکا' نہ ورم نہ چوٹ۔ مالشیں اور انجکشن ہوئے مگر گھوڑی اصطبل کے اندر کھڑے ہی کھڑے تین ٹانگ کی رہ گئی۔ بیطاروں نے نظر کا اثر بتایا تھوڑی بہت جھاڑ پھونک کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی' اور تیسرے روز میلہ کی گھوڑ دوڑ بھی ہو گئی اور بچہ جیت بھی گیا اور جیت کو صبر کر کے میم صاحب گھوڑی کی خیر مانگنے لگیں۔ ہفتہ بھر کے بعد ایک بوڑھے ڈاکٹر مویشی نے جو مستقل طور پر گھوڑی کے لنگڑی ہونے کے بعد اصطبل پر ڈیوٹی پر تھا نعل بند کو بلوایا' نعل بند نے نعل اکھیڑا اور ایک ٹیڑھی نعل کی کیل سم میں سے برآمد کی جو غالباً کھڑے کھڑے ٹاپیں مارنے کے سبب ڈھیلی ہو کر یا ہر آئی تھی اور پھر ٹیڑھی ہو کر کچے سم میں گھس گئی تھی اور گھوڑی کے پاؤں کو بیکار کر دیا تھا۔ گھوڑی چنگی ہو گئی اور کوتوال صاحب نے خوش ہو کر نعل بند کو ایک سو روپیہ انعام بھی دیا اور کوتوالی کے کام کے علاوہ پولیس لائن کے سب جانوروں کے نعل ٹھوکنے کا ٹھیکہ بھی دلایا۔

اور اس وقت تو بلا ٹل گئی اور بس ٹل ہی گئی تھی شیخ جی کی ایک کرامت میں کوتوال صاحب کو سانس لینے اور سوچنے کا موقع مل گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ "انی بیچے سو برس کی عمر" مگر یہاں تو سو ہی دن بعد کوتوال صاحب کو پھر ہی دن تھا' بچہ زرسے ہاتھ نہ آ سکتا تھا' زر۔ سے ہاتھ نہ آ سکتا تھا زر ہی سے ہاتھ آنہ سکتا اور بچہ "پھندے" کے اور کوئی شکل ہاتھ آنے کی نہ تھی اور کوتوال صاحب کے ہاتھ میں ساری عمر پھندے ہی پھندے رہتے ہیں تعزیرات ہند کی صندوقچی میں پانسو بارہ پھندے لارڈ میکالے بنا کر کوتوال صاحب کے ہاتھ میں دے گئے ہیں' کوتوال نے ہر پھندا نکال نکال کر آزمایا' قتل ڈکیتی، بغاوت، بلوہ، فوجداری اور کیا کیا اور شیخ کے مشورہ کے لئے سامنے ڈالا' کیونکہ باوجود دو سالہ کوتوال ہونے کے بھی شہر اور متعلقہ علاقہ کو کوتوال صاحب اتنا نہ سمجھے ہوئے تھے جتنا شیخ جی کی نظر میں تھا مگر سنگین سے سنگین اور پیچیدہ سے پیچیدہ پھندا شیخ جی کے نزدیک اوچھا تھا اور شیخ جی ہمیشہ استادانہ تیوروں سے یہی کہتے رہتے "ٹھہرو" اور ایک روز جب ایک نہایت ہی سنگین کیس قتل و ڈکیتی کا تراش کر کوتوال صاحب شیخ جی کے سامنے لے گئے اور شیخ جی ایسے آہنی پھندے پر بھی وہی اپنی استادانہ "ٹھہرو" کہی تو کوتوال صاحب جھلا گئے ـــ استاد آپ کی ٹھہرو نے مارا اور یہ وقت کر دیا۔ اب وہ بار بار کا ٹھنڈی ہانڈی نہیں چڑھے گی اور تین مہینہ بعد گھوڑ دوڑ

سر پھرے

اور پھر سے چچا بکار بیٹا، ڈپٹی پولیس آفیسر نے کہا: عزیز القدر میں تمہاری عمر ہے اس سے زیادہ میری سروس ہے، اور پھر
تمہیں اس ضلع میں یہی تو آٹھ دن ہوئے ہیں اور یہاں بالکل ضلع سے نئے ہوئے ہیں اور پھر میں اس ضلع کا تو باشندہ ہوں اور چودھری
کو پشت در پشت سے اس لونڈے تک پہچانتا ہوں جسے کچھ میاں کہتے ہیں، اول تو چودھری تھوڑی کا کھڑیوں چھکنے کا نہیں، اور پھر لونڈا،
یہ کچھ میاں نہیں، کچھو میاں ہے۔ یہ باپ سے زیادہ قابو یافتہ ہے اور بڑا ہی خود سر، بس سمجھ لو کہ آج کا کچھو اور کل کا سانپ ہے، ابھی
کالج سے نکل کر سیدھا نہیں ہو پایا ہے کہ لیڈری کی باگ ڈور پکڑنا چاہتا ہے، اور ان حالات میں اولیس گڑھ تو بڑی چیز ہے اور قریب و
جوار کے مواضعات کا تو ذکر کیا میاں ضلع بھر کے اندر چودھری کے خلاف ایک سچا گواہ بھی پیدا ہونا ناممکن ہے اور اگر کسی بد مظنے،
ہسٹری شیٹر کو پکڑ کر الٹا سیدھا عدالت تک طیار کر کے لے بھی آؤ تو کون گارنٹی کر سکتا ہے کہ اندر جا کر الٹی نہ الاپے،

"تو پھر کیا مطلب ہے آپ کا قبلہ، یعنی پھر ـــــ اس خوف میں کوئی پھندا پھینکیں ہی نہیں:

"نہیں میاں، میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ادھا پھندا پھینکو گے تو الٹا اور سر ہو جائیگا۔ اور لونڈا یہ چیز کر اس طرح کمشنر صاحب
کی گھوڑی کو جتانا چاہتے ہیں عدالت میں تمہارے ہی پیش کردہ گواہوں سے کہلوالے گا اور پھر سمجھ لو کہ معاملہ کس قدر خراب ہو جائے گا
اور کیا عجب کہ اخباروں تک نوبت پہنچے تو میرا مطلب یہ ہے کہ کمشنر صاحب بہادر پر آپ کی اس تمام سرگرمی کا اتنی بدنامی کے بعد کیا اثر پڑیگا۔

"تو پھر کیا ہو؟" کوتوال صاحب نے کہا۔

"ٹھہرو!" شیخ جی بولے اور کوتوال صاحب نے ذرا طفلانہ انداز بنا کر ناز کے ساتھ بسورتے ہوئے کہا "استاد آپ کی ٹھہر
نے مارا" اور دیکھئے روز روز ایسے پھندے ہاتھ نہیں آتے بٹا گٹھا ہوا کیس (۳۰۲) اور (۳۹۲) کا آجکل میرے ہاتھ میں ہے۔"

"میاں تم بچہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم سنگین سے سنگین دار بھی دیہات میں چودھری پر کر دو گے تو منہ کی کھاؤ گے اور اس
کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکو گے اور وہ خیر تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے مگر گندگی تو اتنی اچھالے گا اور گھوڑدوڑ کی بات کو اتنی شہرت دے گا کہ کمشنر صاحب
اور ان کی میم صاحب کو وہ میڈم کلوڈیا کے ہار جانے سے زیادہ کھلے گی اور وہ چودھری سے تو کچھ بھی نہ کہیں گے اپنی بدنامی پر تمہاری
کھنچی لگاویں گے۔"

"ہاں تو یہ تو میرے دماغ میں شروع سے ہی ہے کہ یہ کام نہایت خوبصورتی سے بہت خفیہ طور پر ہونا چاہئے لیکن پھر آپ نے کیا سوچا ہے"

"ہم سوچ بیٹھے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے ہی ہاتھوں انجام ہوگا، اور تم دو سال سے کوتوال شہر ہو، پہلے تو تمہارے
پاس اتنا دماغ نہیں کہ اتنی دور کی کوڑی لا سکو اور اگر تمہیں سمجھا بھی دوں تو باوجود کوتوالی کے بھی ہم سمجھتے ہیں کہ تم اس کے لئے مواد فراہم
نہیں کر سکتے، اور وہ تو سب اس خاکسار کے ہی ہاتھوں۔"

"تو پھر بتائیے نا استاد" کوتوال صاحب نے شاگردانہ انداز میں کہا۔

"بتانا کیا تم دیکھو ہی جو لو گے، ایک مختصر بات یہ سمجھ لو کہ چودھری پر دیہات کے اندر تمہارا ہر جھوٹا سچا وار ناکام ہوگا اور حلق کی
ہڈی بن کر اٹک جائے گا اور یہ مرغا تو ہم جانتے ہیں شہر ہی میں پھنسے گا اور یاروں کے ایک ہی جھٹکے میں بچہ کے باپ تک کا یاروں کے گھر پہنچا جائیگا۔"

"کچھ تو بتاؤ استاد" کوتوال نے کہا اور پھر ذرا زانوئے ادب تہہ کرتے ہوئے پہلو بدل کر بولے "اور استاد ہم نہیں سمجھے۔"

"ابھی تم سمجھ جاؤ تو پھر استاد، استاد کا ہے کے مگر یہاں تمہارا یہ کام ہمارے سر، لیکن اس مرتبہ ہمارا کام بھی ہو جانا چاہئے۔"

"ہاں وہ آپ کے لڑکے کے سلیکشن کے متعلق، میں پچھلے سال ہی کپتان صاحب کے کان میں ڈلوا چکا ہوں۔"

"لیکن ہوا تو نہیں، کپتان صاحب نے ضلع سے نام بھیج دیا اور وہاں کمشنر صاحب نے سو گھما بھی نہیں، اب پہلے کپتان صاحب
کلکٹر صاحب اور کمشنر صاحب کے درمیان یہ چپقلش کرا دیجئے کہ ضلع سے تو نام جائے گا ہی جائے گا۔ تھانہ داری کے سلیکشن میں کمشنر صاحب

س کو اپنا نام ہے لی (Nominee) رکھیں۔"

"لیکن دیکھئے تو استاد آپ تو جاننے والے آدمی ہیں۔ میں ایک تھانہ دار ہی تو ہوں اور افسرانِ بالا سے ایک مخصوص دائرہ کے اندر ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔" کوتوال صاحب نے کہا اور شیخ جی نے ذرا ترکھائی کے ساتھ جواب دیا۔ "جی ہاں جناب یہ تو ٹھیک ہے اور یہ باتیں آپ کسی اور کو بتائیں تو ہوں۔ بقول شخصے عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں، یہ خود اِن جناب کا تشبیل سے چل کر تھانہ دار بن پہنچے اور کوتوالی کی ہم نے بھی سے اور نہ معلوم کتنی مرتبہ ان کانوں پر سے سلطانہ اور دھنیا اور علی محمد خاں کی گولیاں سنسنا کر نکلی ہیں اب ہمیں آپ یہ باتیں نہ سنائیے کام کیجئے اور کام لیجئے۔"

"تو دیکھئے استاد میں کہہ تو سکتا ہوں، وہ بھی کپتان صاحب بہادر سے۔"

"اب بھولن بنو اتنے تھوڑی یہ باتیں اس سے کرو جو جانتا نہ ہو۔ ٹھیکرو ٹھیکرو بدلائی نہیں ہوا کرتی کوتوال صاحب اور جو یہ روزانہ صبح تڑکے گھوڑے پر سوار ہو کر سو روپے جیب میں ڈال کر کپتان صاحب کے بنگلہ پر شہر کی خیریت سنانے جاتے ہیں بس ایک روز دینا ہاتھوں میں دیتے وقت میم صاحب سے کہئے کہ یہ چیز لے کر آئیں، خیر صاحب کے اور آپ کے درمیان ہم جانتے ہیں کہ دفتر میں پردہ رہتا ہے مگر میم صاحب صبح ہی صبح سو روپے کے نوٹ گنتے وقت تو روزانہ خوش ہوتی ہیں آپ کے سامنے۔" کوتوال صاحب کچھ چپ سے ہو گئے اور ایک گھونٹ لے کر شیخ جی نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا اور ہمارے زمانے میں ایک گئی جایا کرتی تھی روزانہ کوتوالی سے، سستانا تھا اور بس جوابات ہوئی میم صاحب کو ایک ذرا اشارہ دے دیا، صاحب کو دفتر میں سیلوٹ جھاڑا خیریت دی اور لوٹ آئے اور کام ہرا ہوا ملتا تھا۔

کوتوال صاحب نے گہری سانس لی اور بولے "بہتر ہے"

"تو پھر جانئے چودھری کو مع گھوڑے کے پھانس دینا ہمارا ذمہ ہے اور بغیر آپ کی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ ہوئے گھوڑا لنگا کھٹ سرپٹ آئے گا تمہارے تھانے پر اور پھر جو چاہا کرنا، ایسا معاملہ گانٹھوں کہ پہلے تو عدالت تک نوبت ہی نہ آئے اور تمہارے ہی ہاتھ سے فیصل ہو۔ اور بفرض محال نوبت آ بھی جائے تو پوری مقدمہ کی ترتیب میرے ذمہ رہی مگر دیکھئے سلیکشن پہلے سے اور ابھی اس کا انتظام ہو جانا چاہئے۔"

"بہت بہتر"

"تو پھر جانئے لگام لگ گئی سمجھ لیجئے۔ چودھری صاحب گھوڑا دیں اور ہاتھی کی فرصت ہو تو ہاتھی دیں گھر بلا کر۔" شیخ جی نے شدید استادانہ انداز میں کہا اور کوتوال نے خوش ہو کر اپنے استاد کی جانب دیکھ کر ذرا احسان مندی اور سعادت مندانہ احساس کمتری کا انداز بنایا اور لیک دم ان کے ایام جوانی کی مہمات اور روایات یاد کیں جو آج تک سب نئے پرانے تھانہ داروں میں زبان زد اور ضرب المثل تھیں اور شیخ نے اس کا اندازہ کر کے کہا، "میاں کوتوال صاحب بہادر ماشاءاللہ حاکم وقت ہو، مگر ابھی لڑکے ہو، اور ہم نے بیس برس اس گلی کی خاک چھانی ہے اور بڑے بڑے زیاں کئے ہیں۔ تم اگر کوتوال شہر ہو تو آج اناج منڈی سے لے کر کھنڈی کے پیڑ اور نکا کے ٹھیکے دار ہم بھی ہیں۔ مگر میٹے سے پہلے پولیس ٹریننگ اسکول کا سلیکشن ہے اور بات پکی ہو کر سلیکشن کا پروانہ ہمارے ہاتھ آ جانا چاہئے جب بات بنے گی۔"

"سمجھ لیجئے استاد آ گیا آپ کا لشکا۔" کوتوال نے کہا اور چل پڑے اور چلتے چلتے شیخ جی نے کہا، "تو پھر کوتوال صاحب سمجھ لیجئے کہ گھوڑا بھی آپ کے تھان پر بندھا ہے چاہیں دوڑا اور دوڑا کر گھٹا نا یا قصائی سے کٹانا۔" اور بار بار لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "بس آج تیرہ ہو گا اور اگلے مہینے کی تیرہ تک گھوڑے کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہو گی ان شاءاللہ!" شیخ جی نے استادانہ تیوروں سے زیادہ "ادیبانہ" انداز میں جیسے کشف کے نور سے کہا۔

(۹)

اویس گڑھ شہر سے سات میل کے فاصلہ پر تھا اور چودھری شہر ایسے ہی آیا جایا کرتا تھا جیسے چودھری لوگ آیا جایا کرتے ہیں اور رات گذارنے کا تو سال میں تین ہفتے کے سوا موقع ہی نہ ہوتا تھا جب نمائش لگا کرتی تھی اور ضلع کے اور سب رئیس زمیندار تو نمائش کیمپ لگاتے تھے مگر چونکہ چودھری چھوٹی چودھرائن کو ساتھ لایا کرتا تھا لہٰذا ایک دیہاتی ٹھاکر دوست کا خالی مکان جو اسی غرض کے لئے مخصوص تھا اور جہاں قوم دوست احباب عدالتوں اور مقدمہ بازیوں کے سلسلے میں آکر قیام کیا کریں نمائش کے پورے ہفتے چودھری کے لئے مدتوں سے مارہتا زیر رہ تھا اور نمائش کا قیام ہمیشہ سے اسی میں ہوتا چلا آیا تھا۔ شہر میں نمائش لگی ہوئی تھی۔ چودھری، چھوٹی چودھرائن، لڑکے، نوکر چاکر سب مقیم تھے۔ سیر و تفریح، خرید و فروخت ہو رہی تھی، چودھری تو خیر شام کے وقت گھنٹہ دو گھنٹہ کو گھومنے کو جایا کرتا اور اپنے شہری دیہاتی دوستوں کے ساتھ تھوڑی بہت تفریح خرید و فروخت کر کے چلا آتا، مگر لڑکے اور ان کے نوکر صبح کے نکلے کہیں رات کے بارہ کے ادھر گرد پلٹتے، تمام دن چودھری، چودھرائن، ایک بوڑھی ماما اور ایک بڈھا نوکر مکان پر رہتے اور اس لق و دق مکان کی تنہائی میں تمام دن چودھری، چودھرائن دن دہاڑے خلوت کے مزے لوٹتے اور نمائش کا پورا ہفتہ ہنی مون میں گذارتے۔

گیارہ بجے دن کا وقت تھا، لڑکے بڑا ناشتہ کر کے نوکروں کے ساتھ نکل گئے تھے اور چودھری چودھرائن دس بجے کے گھسے گھسے ابھی غسل خانہ سے ساتھ ساتھ غسل کر کے برآمد ہوئے تھے اور چودھرائن دھوپ میں بیٹھی بال سکھا رہی تھیں۔ چودھری کنگھی کر کے اور گلمچھے چڑھا کر فارغ ہو چکا تھا اور چودھرائن کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ نیچے کی منزل میں ماما کھانا پکا رہی تھی کہ چودھری کے کان باہر سڑک پر سے آتی ہوئی مختلف آوازوں پر چونکے اور چودھرائن سے پوچھا "بُلا (ملازم کا نام) باہر مردانہ میں ہے نا؟"

اور چودھرائن نے بال جھاڑتے ہوئے نیچے سر جھکائے ہی جھکائے کہا "ہوں، ذرا ابھی پان لانے بازار گیا ہے شاید۔" اور چودھری کے کان پھر آوازوں کی جانب چونکے اور وہ آہستہ سے اٹھ کر مردانہ زینے کی جانب سے چپ چاپ اتر گیا اور خاموشی کے ساتھ پھاٹک کے کواڑ کی آڑ میں کھڑا ہو کر سننے لگا۔

"اور پھر بوڑھا! جوان جہان پوت پوتوں والا۔"

"سے ڈاڑھی سے کرتوت۔"

اور چودھری نے محلہ کی مسجد کے پیش امام کی آواز پہچانی جس کے پیچھے وہ ظہر عصر کی نماز مسجد میں جا کر پڑھا کرتا تھا "کیا ہوا بھائی بنو خاں، کیسا شور تھا؟"

"ارے کیا بتاؤں ملاں جی چودھویں صدی ہے چودھویں، ارے یہ پہلوان بیٹھے ہیں اور ہم ایک ایک بیڑی جلا کر نہیں پی پائے ہیں کہ وہ بھنگی نکل کے گیا ہے جھاڑو بغل میں لئے پھاٹک میں سے اور جب تک اندر جھنگیا پٹک دی۔"

"ارے یہی تو آواز سن کر میں حجرہ سے نکلا۔ کس نے کس نے!؟"

"چودھری ــــ اوں، آں۔ ہاں ملاں جی بھیا وہ تو چودھری کا نام لینی گئی ــــ بے کھلم کھلا۔ ہم سب بیٹھے ہیں کیوں جی لالہ۔"

"ہوں" چاٹ کے خوانچے والے نے کہا۔ "برو جانو (زمانہ) ہے۔ آدمی کی نیت جرا (ذرا) دیر میں ڈگت ہے۔ چار پتہ ناہیں بتائے پائے ہیں کہ بھنگی نکلا ہے مد لو جب تک، ابھتیرو دے ٹکی بھر بھیا چودھری ٹھہرو، جو کرے سہاتا ہے۔ کل جگ ہے کل جگ۔"

"چہ چہ چہ!!! قرب قیامت ہے" پیش امام نے کہا۔

"اجی یہ اویس گڑھ تھوڑی ہے کہ آج بھنگن پکڑی کل چمریا، مزہ آجائے گا جی!" شاید امردوں کے ٹوکرے والا بولا۔ اور چودھری ٹھنڈا بیٹھا ہوا دیہاتی زمیندار تھا بگلے کی طرح دماغ ناچنے لگا اور کواڑ کی آڑ سے باہر قدم نکالنا چاہا مگر حرکت پیچھے کو ہوئی اور پلٹ کر مردانہ مکان کا صحن پار کر کے اندر آیا اور ہکلاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ابھی یہاں بھنگی گئی ہے کیا کر"

"ہاں میاں ذرا دیر بھی تو گئی تو ہے"

اور چودھری کی آواز سن کر اوپر سے چودھرائن بولیں "ہاں میاں، یہ تو میں آج چھمن میاں (بڑا لڑکا) سے کہنا بھول گئی کہ بنارسی دکان کی خبر لائے کہ آئی لڑکی کہ نہیں سنتے ہو شام کو ذری نگاہ ڈال لیجو، پھر میں اس کی دولہن کا ہو را جس دن نمایش زنانی ہوگی خود جاکر نیا کرا لاؤنگی۔ مرزا جی کی بہو کے ساتھ، اور ہاں ذری یہ تو بتاؤ اور ہوگی کس دن زنانی؟" اور پار سال کی تو میری دولہن آپ آکر پسند کرے گی اپنے اور میرے لئے۔"

اور چودھری پھر چپ چاپ باہر کو چلا اور پھاٹک کے سامنے سے اس کے چکراتے ہوئے سر اور اونگھتے ہوئے کانوں میں ٹیلیفون کی سی آوازیں آئیں "بچپن کی حد! ــ" توبہ توبہ!" اور وہ سیدھی گئی ہے کوتوالی!" اور اس نے خالی نشست گاہ میں نظر کی دل میں اور جھنجھلایا "خدا غارت کرے اس نمک حرام بلاکو! غائب ہے! کچھ خیر ہی لاتا، کیا طوفان ہے!؟" اور اتنے میں ملازم افتاں و خیزاں متوحش کپکپاتا ہوا آیا اور جیسے دم بخود مالک کا چہرہ دیکھنے لگا گویا منتظر ہے کہ سرکار کچھ پوچھیں اور چودھری نے اس کی جانب نگاہوں سے دیکھا کہ کچھ کہے اور ملازم لڑکھڑاتی زبان سے بولا "میاں۔ وہ۔ میں میں تو ابھی ذرا ڈھول لینے چلا گیا تھا سو باہر نہ معلوم کیا۔ ہوں۔ وہ۔ آں۔"

"بات بتاؤ کیا بلا ؟؟!"

"نہ معلوم کیا کیا، اول فول بک رہے ہیں سب لوگ کہ وہ وہ وہ تو کوتوالی گئی!"

"مہترا ـــ ایں ـــ کون کون! چودھری نے کہا۔

"جی ہاں میاں مہترانی ـــ" اور چودھری کی جانب مشتبہ نظروں سے دیکھا اور چودھری کی نگاہیں جھک سی گئیں اور ملازم نے نہایت سادگی سے کہا "پھر میاں اسے جانے ہی کیوں دیا، پھاٹک بند کیوں نہ ـــــ"

"او نمو! کیا بکتا ہے!"

اور نوکر نے کہا "ہاں میاں دیکھئے نا۔ میں تو اسے بھنگی کی جھاڑو لگانے چھوڑ گیا تھا اور بھنگیا مجھے پھاٹک پر گھستی ملی ڈبیا لئے" اور باہر محلے والے اور خوانچے والے نہ معلوم کیا کیا بک رہے ہیں ـــ وہ روتی پیٹتی نام لیتی گئی ہے؟"

اچھا تم پھاٹک بند کرو اور ملازم پھاٹک کے کواڑ تک پہنچا ہی تھا کہ رک گیا اور کوتوال صاحب درجن بھر کانسٹیبلوں کے ساتھ یکدم اندر گھس پڑے۔ اور چودھری کے گرد حلقہ کر لیا اور کوتوال صاحب بہادر نے کہا "آپ کے خلاف مسماۃ سندریا زوجہ بدھا خاکروب نے الزام دفعہ (۳۰۲) تعزیرات ہند، زنا بالجبر رپورٹ گذرانی ہے اور آپ زیر حراست ہیں" زمانے کے گرم و سرد دیکھے ہوئے بوڑھا چودھری جو پہلے سے ذہنی لڑائی سی جھو چکا تھا بدحواس سا ہوکر اور گھونٹ سا لینے لگا۔ کوتوال نے نرمی کے ساتھ کہا "اچھا پہلے آپ ایک گلاس پانی پی لیجئے۔ اور پہلے ذہن میں بیٹھ کر اظہار دیجئے۔ اور چودھری نشست گاہ میں چوکی پر بیٹھ گیا اور سپاہی ادھر ادھر کھڑے ہوگئے۔ کوتوال صاحب نے مونڈھا گھسیٹ لیا۔ ملازم نے جلدی سے ایک گلاس پانی دیا اور چودھری نے ایک گھونٹ لیا اور کوتوال صاحب نے ڈائری کھولی اور قلم ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے پھر اسی لہجے میں دہرایا "آپ کے خلاف مسماۃ سندریا زوجہ بدھا خاکروب نے الزام دفعہ (۳۰۲) تعزیرات ہند کی رپورٹ درج کرائی ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ نشست گاہ کی کوٹھری میں اکیلا پاکر حرم رنا بالجبر کیا آپ کیا جواب دیتے ہیں۔ اور چودھری لاجواب سا تھا۔ اندر سے اطلاع آئی تھی دوڑ کر چودھرائن کو خبر سنائی اور ۱۰ منٹ بعد چودھرائن کا علم نوکر کو ساتھ لے کر بہت جلد نمائش سے لڑکوں کو بلا کر لا سکے۔

اور جب چودھری نے مشکل نفی میں علق یہ پورا فقرہ ادا کر کے آواز نکالی تو کوتوال صاحب نے چند منٹ توقف کیا اور اتنی دیر میں مسماۃ سندریا زوجہ بدھا خاکروب مستغیثہ ہسپتال سے ڈاکٹری معائنہ سے فارغ ہوکر آگئی اور چودھری نے آج پندرہ دن کی مکان کی رہائش میں پہلی مرتبہ اپنی شوخ چشم، دیدہ دلیر قطامہ مدعیہ کو دیکھا جس نے اس پر آج مدعا علیہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ مسماۃ کے بیانات چودھری کے روبرو رکو رپورٹ کی لفظ بہ لفظ تائید میں ہوئے کہ وہ نشست گاہ میں جھاڑو لگا رہی تھی اور چودھری نے اس سے اس کوٹھڑی میں جھاڑو لگانے کو

کہا اور جب وہ اندر پہنچی تو پیچھے سے خود پہنچ گیا اور اسے پکڑ کر زمین پر گرا لیا .... وغیرہ وغیرہ، اور اس کے شور مچانے پر رمضان چاٹ
والا اور نجو امرود والا آ گئے جو پھاٹک ہی میں تھے اور جب ان دونوں نے شور مچایا تو اور بہت سے گلی میں سے اندر آ گئے ـــ اور کوتوال صاحب
نے ایک کانسٹبل کو اشارہ کیا اور پھاٹک کے سامنے سے نجو امرود والا، رمضان چاٹ والا، نبو خاں کبابی، جمّن خاں پہلوان، الٰہی بخش قصاب،
اور فتو حلال خور سب گواہوں کو بلا لایا، اور کوتوال صاحب نے دو تین معزز گواہوں کے سامنے اندر جا کر "موقع واردات" کا معائنہ کیا۔ اور جگہ
جگہ فرش پر سے "زندہ ثبوت واردات" میں بکھرے ہوئے در نایاب کھرچ کھرچ کر مع تھوڑی تھوڑی فرش کی پپڑی کے نہایت احتیاط کے ساتھ
ایک پڑیہ میں جمع کرتے اور باہر آئے۔ جہتیاں کی "رپورٹ معائنہ" دیکھی اور قیافہ شناس کوتوال گھستے ہی بھانپ گیا تھا اور پھر کھائے کے نکال اور
تہانے کے بال دھوپ میں نہیں پکتے ہیں اور یہ تو اس کے علم میں تھا کہ چھوٹی چودھرائن ساتھ ہیں اور گھر میں چودھری چودھرائن اکیلے ہیں چودھری
کی تانہ دھنی کئے دیکھ کر جیدار معزز تجربہ کار کوتوال نے مزید زندہ ثبوت فراہم کرنے کی امید موہوم میں اندھیرے کے اندر چھپ کے ایک تیر پھینکا اور
ضابطہ میں خانہ تلاشی کا حکم دیا اور قاعدے کے مطابق پہلے خود کو خانہ تلاشی کے لئے پیش کیا اور پھر کانسٹبلوں کو اور نیچے کی منزل کی تلاشی لیتے ہیں
غالباً پھرتی کی بالاخانہ پر پہنچا اور اپنے قیافہ کی جولیں۔ بھرا غسل خانے میں چودھری کا اور چودھرائن کے ذرا دیر پیشتر کے اتارے ہوئے کپڑے
لے چلے پڑے تھے اور ان میں سے چودھری کا پائجامہ علیحدہ کیا اور بیرون سیون بغور دیکھ کر چودھری کی ذات کے مزید دھبے مارک کر کے گویا
تحقیقات کی مسل کا پیٹ بھر کے پائجامہ ساتھ لے آیا اور دھبے ثبوت پر چسپاں کر دیئے اور پھر سب نشست گاہ میں جمع ہوئے۔ ایک کانسٹبل
کو اشارہ کیا اور اس نے اپنے جھولے میں سے عشکن کا لہنگا برآمد کیا "جو ارتکاب جرم کے وقت مساۃ کے جسم پر تھا" اور اس کا ایک پلندہ بنا کر
فولاد خاں کانسٹبل سے روبرو گواہان لاکھ بتی سے سیل مہر کر دیا اور پھر چودھری کا پائجامہ اور موتیوں کی ڈبیہ کا ایک پلندہ بنا کر روبرو گواہان
کرشے سنگھ کانسٹبل سے لاکھ بتی سے سیل مہر کرایا اور پھر دونوں بنڈل ایک پلندے میں جمع کر کے عدالت میں A. B. L. Exhibit بنا کر پیش
کرنے کے لئے کیمیکل اگزامنر کے پاس بھیجنے کو تیار کر دیئے اور فرد تلاشی پر گواہان تلاشی کے دستخط لے لئے ـــ اور یہ سب کام مکمل کرنے کے
بعد ذرا تحکمانہ انداز میں سپاہی سے کہا "ہتھکڑیاں چڑھاؤ" اور چودھری سے تشریف لے چلنے کو کہا ـــ بدحواس چودھری نے لڑکوں کا انتظار
کرنے کو کہا مگر وہ مجبور تھے کیونکہ عدیم الفرصت تھے لیکن چودھری کے بار بار کہنے پر بیچارے کو وقت نکالنا ہی پڑا اور اس فرصت کے
وقت میں کوتوال صاحب نے چودھری کی ہتھکڑیوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور کانسٹبل ہٹا دیئے اور تخلیہ میں معاملہ والی بات
ہوئی اور ہزار دو ہزار پہ لات مار کر کوتوال نے گھوڑا طلب کیا اور تھوڑی سی رد و کد کے بعد چودھری کو ہاں کرنی ہی پڑی مگر لڑکوں کے
مشورہ پر مشروط معاملہ لڑکوں کی آمد تک ٹھنگا رہا اور ہتھکڑیوں کا قفل کھلنے ہی والا تھا کہ لڑکے بھی آ گئے۔ ذکر سے معاملہ کا خلاصہ تو نمائش
ہی میں معلوم ہو گیا تھا۔ باپ کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر حسین میاں اور محسن میاں دونوں بڑے تو درکنار، مرتبہ زور اور بیباک بچو میاں بھی
ایک دفعہ گھبرا گئے۔ خیر بیٹوں کے آتے آتے باپ کی ہتھکڑیاں کھل گئیں اور مشورہ کے لئے اندر جانے کی اجازت بھی دی گئی، ہتھکڑیاں کھلوا کر
چودھری تینوں بیٹوں کے ساتھ زنانخانہ میں گیا، چودھرائن بھی بڑھاپے میں روز روشن کی خلوتوں کے سب ارمان بھول کر بالاخانہ سے نیچے
اتر آئی تھیں اور بیچاری استغفار پڑھ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی اور اپنے شوہر کی عزت مانگ رہی تھیں اور گھڑی گھڑی ماما سے
باہر کی خبریں منگا رہی تھیں۔ شوہر کو آزاد دیکھ کر لال بھبھوکا ہو گئیں۔ یہ بھی نہ خیال کیا کہ جوان بیٹے ساتھ ہیں برس پڑیں "ہے ہے مردود تمہارے
زور کی انگوٹھا شیطان ذرا دیر میں ڈگاتا ہے، اچھے بھلے! اور میں موذی کا کائی توال بھی نہ سکھایا، اور نہ معلوم کس وقت (دقت) ایک کے سے
پاؤں داں پہنچ گئے اور وہ داں خصم ہی گر کی پوٹ ـــ ہاں! خدا بچائے موئے شیطان سے! ـــ پھر ہے ہے مردود تمہاری نیت کو کیا کہوں
...... اور چودھرائن کچھ اور بھی کہتیں مگر حسین میاں نے جھلا کر کہا "امی جان کیا ہے! بس چپ بھی رہیئے، نہ سمجھیں نہ بوجھیں، بات کرنے
دیجئے ذرا" اور حسین میاں کی اماں بیچاری کیا سمجھتیں جب ابا ہی غریب کی سمجھ میں کوٹھڑی کے اندر بکھرے ہوئے گوہر نایاب کی تازہ تازہ
نزول سے کم نہ تھی جو گیچ پیچ چودھری کے خلاف ثبوت کے لئے بہا سرتی کوتوال صاحب کے ہاتھ لگے تھے اور جن کی وجہ نزول چند منٹ

کو چپتیاں دبائے پھاٹک سے نکلتے ہوئے بھگی کے علم میں تھی پھر حیرت سے بد حواس چلاتی گئی کہ اچھالی پھاٹک سے نکلتی بھگن کے علم میں تھی اور سب سے پہلے منجھی بی کے علم میں آئی تھی اور لڑکے تو خیر ابھی نمائش سے بھاگے ہوئے آرہے تھے اگر چہ دلہن بیچاری ناقص العقل نے شوہر کے چند منٹ کے لئے غائب ہو جانے پر اندر سے باہر جانے پر وہی سمجھ لیا جو بہت دنوں سے کوتوال صاحب سمجھے ہوئے تھے تو بیچاری کا کیا قصور؟ چودھری غریب چودھرائن کے اخلاقی و مذہبی لیکچر پر جیسے (Red Handed) مجرم کی طرح منظلوم سا ہوکر رہ گئے تھے نے عاجزی کے ساتھ دانت نکال کر مستفسرانہ انداز میں بیٹوں کی جانب دیکھا کہ کیا تم بھی یہی سمجھ رہے ہو مگر سعادت مند بیٹوں نے باپ کی لغزش پر اسے زیادہ محجوب نہ کرنے کے خیال سے ہی اپنی نظریں جھکالیں۔ اور چودھری نے تیز بیٹوں کی شکل سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے آج کی پاک دامنی بیٹی کی جس پر بیٹوں نے یک زبان ہو کر کہا" چھوڑئیے ابا جان، اور وہ بتائیے کہ آپ نے کیا طے کیا۔ اور جب چودھری نے اپنے جرم کا خون بہا سچ بتایا تو بڑے بیٹے نے یکدم اس پر منظوری دی اور منجھلے نے تائید کی، بچو میاں بہت جز بز تھے منطق اور نفسیات کے اسکالر تھے کچھ دیر بحث کی اور جب بڑے بھائی نے جرم کے سنگین ہونے کی جانب توجہ دلائی تو انھوں نے ثبوت کے کمزور ہونے کا عذر پیش کیا اور جب بڑے بھائی نے متعدد گواہوں کی جانب توجہ دلائی تو بچو میاں نے کہا کہ اول تو ان چھ چھ پیسے کے گواہوں کی عدالت میں وقعت کیا اور پھر ہم انھیں دو دو آنے میں توڑ کر الٹی اپنی کہلوا سکتے ہیں تو آخیر پر چھمی میاں کو کہنا ہی پڑا کہ" میاں جب تک دو دو آنے کے گواہوں سے الٹی کہلوا کر آپ کے بوڑھے باپ عدالت سے چھوٹ کر گھر آئیں گے اس وقت کتنی مرتبہ سفیدی میں کالک لگے گی، تم بچہ ہو اتنی بات نہیں سمجھتے!" اس پر منطقی نوجوان نے کہا" جب ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا ضمیر پاک ہے تو کوئی کچھ کہے ہماری سفیدی میں کالک کیسے لگ سکتی ہے"۔

مجھن میاں جو دونوں بھائیوں کے مکالمے خاموشی سے سن کر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے یکدم بول پڑے" چپ رہو بچو میاں تم گدھے ہو، موقع محل نہیں سمجھتے، امی کی طرح اپنے لگائے پڑے ہو، دیکھو میاں پہلی چیز تو یہ ہے کہ جنگ دو سر دارو! میں نے مان لی تمہاری کہ مقدمہ عدالت سے یقیناً چھوٹے گا۔ ضلع سے نہ سہی ہائیکورٹ سے اپیل میں لیکن مقدمہ تو مقدمہ ہی ہے مجوزہ تو آپ نہ ہوں گے اور اس وقت یہ معاملہ ہیں پر آپ کی مرضی کے مطابق طے ہوتا ہے اور ابھی چھوٹتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ آپ سمجھا کریں کہ آپ بے گناہ ہیں اور پاک ضمیر خیال کر کے جھوٹی تسکین دیا کریں دل کو دنیا تو یہ نہیں جانتی۔ میاں مرغی کو تکلے کا گھاؤ بہت ہوتا ہے۔ عدالت ابتدائی سے ہائیکورٹ تک پہنچنا تو بڑی چیز ہے یہاں سے کوتوالی جانے ہی میں ہم سب کو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ وہ ایک ٹکڑا ہے اگر آج ہم تینوں بھائیوں میں سے کسی کو خط غلامی لکھنا پڑے تو بھی بہت سستے چھوٹے، ورنہ ابھی تو بات اس کمپاؤنڈ تک ہے اور سہ پہر تک سارے شہر میں، ساری نمائش میں اور یاران ضلعوں میں آرے آرے ہو جائے گی اور میاں سب منطق اور فلسفہ بھول جاؤ گے۔ کسی کو مونہہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی"۔ اور بچو میاں کچھ سست سے پڑ گئے اور بولے" اچھا آغا بھائی یہ بتائیے کہ بچہ دے کر ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے مونہہ کالا نہ ہوگا، ان سے کیسے چھوٹیں گے"۔

ادھر چھمن میاں ذرا تیز آواز میں بول پڑے" ارے امی جان دیکھئے ہو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لونڈے کا دماغ واقعی خراب ہو گیا یعنی کہاں سے بول رہے ہیں آپ! اور اس وقت برابر کے پلے میں کیا چیز رکھی ہے آپ نے چھ چھ تمہاری عقل! افسوس!"

ادھر چودھرائن یکدم بول پڑیں" کیا ہم ان ہزاروں لاکھوں کے غلام ہیں نگوڑوں کے! کیا گھوڑا ان کے باپ کا ہے؟ ہماری گھوڑی کا بچہ ہمارا گھوڑا.................نگوڑے چھٹے سر چڑھے ہیں دو دو کوڑی کے! ہوں۔ میرے اللہ کے بڑے یار، دھنے جولاہے اور بھٹیارے مفت کی گھوڑدوڑ مچا دی ہے، پہنچ لوں گھر، دیکھوں گی تم کتنے لاڈلے ہو دادی اور اماں کے، بہت بھروسے رہے ہو ایک کر بھی جو پھٹکنے دوں دیوڑھی پہ سوئے مکھٹو۔ باپ کے ہتھکڑی پڑی ہے اور بیٹے تیس مار خاں لیڈر بنے مونچھیں اینٹھتے پھرتے ہیں"۔

اور بچو میاں نے ماں کی آواز تو ایسی ہی سنی۔ مگر ابھی چند منٹ پیشتر والی باپ کی جھریوں دار کلائیوں کی ہتھکڑیاں پہنے تصویر نگاہ میں گھوم گئی۔ ادھر مجھن میاں نے کہا" میاں ان سے نبٹئے اور اب کی ہم نبٹیں گے اور سب کو راضی رکھیں گے اس وقت اس بلا کو ٹالنا یہ سرِ دست ضروری

پٹھان کا بھی قرض نہیں ہے، مرہٹوں کی چوتھ ہے۔" اور جب تک باہر سے تقاضا آیا، بچھو میاں تو مونہہ لپیٹ کر پڑ رہے اور چودھری اور دونوں بیٹے باہر گئے کوتوال صاحب اسباب وغیرہ کیل کانٹے سے ہر طرح تیار ہو کر آئے تھے بچھو کی رسید فروخت "بالعوض مبلغ ایک ہزار روپے نقد سکہ چہرہ شاہی" بحق شیخ جی کوتوال صاحب کی ہدایت کے مطابق تحریر ہو گئی اور چودھری بیچ بچ چھوٹ گیا اور شام تک اودلیس گڑھ سے بچھو پکڑ کر قید فرنگ میں آ گئے اور شیخ جی کے تھان پر اور کوتوال صاحب کے اخراجات پر اپنے پانوں چل کر بندھ گئے اور چودھری نئی زندگی پا گیا اور خاندان ڈوبتے ڈوبتے مال بال بچ گیا۔

(ج)

جیت

(۱۰)

اور اب تو کوئی بات ہی نہ تھی آج سے میدان ہاتھ تھا اور بچھو کی راسیں تین مہینے پیشتر سے چھوٹیں آ گئی تھیں، کوتوال صاحب کلکٹر صاحب اور کپتان صاحب کے سامنے پکی زمین پر چھاتی ٹھونک رہے تھے۔ میڈم کلوڈیا جیتے گی اور درمیان بچھو کو ہرا کر جیتے گی اور روہیلکھنڈ کی چمپین بنے گی اور بجز چند مخصوص ہستیوں کے کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی، کوتوال صاحب سے لگا میم صاحب تک سب مطمئن تھے بجن میاں سے چودھری چودھراین تک سب کے سب سجدۂ شکر بجا بجا کر مطمئن تھے مگر بچھو میاں دل ہی دل میں بل کھا کھا کر رہ رہ جاتے اور اپنی مجبوری پر بعض اوقات کو سب کچھ الٹ کر مرنے مارنے پر تل جانے کو جی چاہا مگر حالات میں اس وقت یہ بھی گنجائش نہ تھی، اور انھیں بھی باپ بھائیوں کے ساتھ اپنے مونہہ سے تمام کسانوں میں یہی کہنا پڑا کہ چونکہ بہت نامی گھوڑی سے مقابلہ ہے اس لئے بچھو کو خاص ٹریننگ کے لئے ایک دوست کے یہاں شہر بھیج دیا ہے۔ استاد کو کسی نے کوئی بات تو بتائی نہ تھی مگر بوڑھا تجربہ کار چابک سوار سمجھ سب کچھ گیا تھا، ساری عمر کوتوالوں اور رئیسوں ہی میں جو کٹی تھی بس مالک نے جو کچھ کر دیا اس پر خاموشی کے ساتھ یقین کے ٹھنڈی سانسیں بھرتا۔ تمام کسان نت نئی افواہوں سے ڈر رہے تھے کہ دیکھو کس کل اونٹ بیٹھے۔ شہر سے لے کر دیہات تک خاص و عام کے اندر اس دوڑ کا انتظار و اشتیاق سال بھر سے تھا اور گھوڑ دوڑ کے لئے گھڑی گھڑی گن رہے تھے بسات سمندر پار کی آئی گھوڑی کا تو گھوڑ دوڑ میں جیتے ہوئے دیسی گھوڑے سے مقابلہ تھا، کسی کی پشت پر روایات کسی سے کم نہ تھیں اور یہاں تک کہ میلا لگا اور چودھری کے وعدے کے مطابق کوتوال صاحب نے استاد شجاعت خاں سے حسب معمول مطابق دستور بچھو دوڑانے کی تحریک کی اور گھوڑ دوڑ سے دو روز پیشتر بلا کر خاص ہدایات دیں، خیر ان کے سامنے تو استاد بیچارے ہوں ہاں کر کے اپنے مونہہ نہ سہی ان کے مونہہ سے وعدہ کر آئے مگر پرانی وضع کے آدمی، چابک لگام کے سچے جاکی اور پھر جس بچھو کو وہ موت کے مونہہ سے چھڑا کر گھوڑے پر سے پکڑ کر لائے جسے بچہ سمجھ کر پالا اور پھر جسے ران تلے لے کر چودہ ضلعوں کو جیتا، آج یکدم اسے ران تلے سے نکال کر ذبح کرنے کو کیسے آمادہ ہو جاتے۔ کوتوالی سے پلٹ کر چودھری سے عذر کیا مگر چودھری نے اپنے وعدہ کے پاس میں زور دے کر آمادہ کرنا چاہا تو سات پشت کی چودھری کی اور بارہ برس کی سرکاری ملازمت سے دست برداری پیش کی اور جب چودھری نے اپنی بات اور عزت کا حوالہ دیا تو چپ ہو گئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے بڑھاپے کی کمزوری کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کلائیوں کی طاقت کی کمزوری اور معذوری کا اس اہم تاؤ کے لئے اندیشہ بھی ظاہر کیا، مگر چودھری پھر بھی اپنی ہی کہتا رہا اور استاد کو مجبوراً وعدہ اور حسب مرضی نتیجہ کی گارنٹی دینی ہی پڑی مگر بھلا ہو درد کمر کا کہ بروقت دستگیری کی اور اب تک جو کچھ عذر لنگ تھا سچ مچ بن گیا اور شام تک چودھری نے کوتوال صاحب کو اطلاع دے دی کہ استاد یکدم درد کمر کے دورے میں مبتلا ہو گئے اور اب وہ جاکی کا انتظام خود کریں۔ اور کوتوال صاحب نے ایک نئے جاکی استاد مستان خاں کی خدمات گھوڑ دوڑ سے دو روز پیشتر نتیجہ سے آگاہ کر کے حاصل کریں جو کھینچ تاننے میں بہت سی شہرتیں پائے ہوئے تھا اور دو دن کے اندر ہی اس نے بچھو سے اپنا آسن مانوس کر لیا۔

یوں تو میلہ ہی بہت بھاری لگتا تھا اور اس مرتبہ تو ولایتی گھوڑی اور دیسی گھوڑے کی بھاگ کی شہرت تھی، دور دور کے کسان آئے تھے جو کبھی نہ آتے تھے وہ بھی موجود تھے۔ بیسیوں اضلاع کے کلکٹر اور سب ڈپٹی کلکٹر پولیس کے اعلیٰ عہدہ دار اور دوسرے محکموں کے چھوٹے بڑے آفیسر، اضلاع بھر کا ایک ایک دیہاتی رئیس زمیندار اور شہر کے رؤسا سب اپنے اپنے کیمپ لگائے پڑے تھے، اور رات دن ہر خاص و عام کی زبان پر یہی موضوع زیر بحث تھا۔ کسان کا بچہ بچہ کو ہمارا بچہ کہہ کر بات کرتا اور سولین میڈم کلوڈیا کو اچھی گھوڑی کہہ کر پکارتے اور زمیندار جاگیردار طبقہ جس وقت سولینوں میں "حاضر باش" خدمت ہوتا تو میڈم کلوڈیا کو ہماری گھوڑی ہی کے پرخلوص خطاب سے یاد کرتا مگر جب آپس میں بیٹھتے تو نہایت فنکارانہ انداز میں بحثیں ہوتیں اور میڈم کلوڈیا کمشنر صاحب کی گھوڑی ہوتی اور بچہ چودھری کا گھوڑا پکارا جاتا مگر پچھلے تو میدانوں کے روندے ہوئے زمیندار توڑ مروڑ کر بحث کی میزان بچہ کی بار ہی لگا دیتے اور چودھری اور ان کے دونوں بیٹے اگر موجود ہوتے تو وہ بھی تائید کرتے۔

اور آج بھاگ کا دن تھا۔ گنگا کنارے پھیلی ہوئی مٹی کے نم اور ذرا چھچھورے میدان پر لاکھوں آدمی جمع تھے ایک جانب کسان بڑا بھاری "اکٹھ" کئے ہوئے تھے دوسری جانب سولین گروپ تھا اور ان کے برابر ہی زمیندار رؤساء کا ہلکا پھلکا سبک سا مجمع تھا۔ حکام کرسیوں پر تھے اور ان کے سیدھے ہاتھ پر زمینداروں کی لمبی چوڑی دریاں قالینیں، مسندیں اور تکئے لگے ہوئے تھے۔ خوشبودار تمباکوؤں، پانوں اور عطروں سے فضا بسی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک بات بات پر نقرئی قہقہے اور طلائی مسکراہٹیں تھیں اور اس کے بیچوں بیچ چودھری، چھمن میاں، ممجو میاں بھی تھے۔ اور بچو میاں کھوئے کھوئے گنہگار سے اپنے غول میں تھے جہاں جگہ جگہ اپلوں کے الاؤ اور خانہ ساز تمباکو کے ڈھیر تھے۔ ٹولیوں میں چلموں کے دھوئیں کے اندر بحثیں ہو رہی تھیں اور بچہ کی جیت پر میزان لگتی تھی۔ سولین اور زمینداروں کی سوسائٹی میں میڈم کلوڈیا کی پیڈگری اور نجابت پر بحث تھی اور اس کی سائنٹفک ٹریننگ کے چرچے تھے۔ اور چونکہ میڈم کلوڈیا اور بچہ کی سیاہ و سفید کی ملکیت ہم معنی ہو گئی تھی لہٰذا مالکوں کے چہروں پر طمانیت کی گہری چمک تھی، ادھر بچو میاں کے چہرے پر کسی کسی وقت ایسی بدحواسی کے آثار دکھائی پڑتے جیسے اس کا باپ مر گیا ہو، گویا اپنے بیٹے کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ رہا ہو جیسے آج وہ سارے روہیلکھنڈ کا قاتل ہے اور سب کا خائن۔!

اور میم صاحب اور کمشنر صاحب بہادر لیڈیز اور معزز عہدہ داروں کے جلوس میں تشریف لائے۔ سب کی نظریں اٹھیں۔ بیسیوں متعلقہ اضلاع کے یورپین و "نیم یوروپین" آفیسروں کی گوری بیویوں کے علاوہ اور بہت سی گوری اور "نیم گوری" مہمان سہیلیاں بھی تھیں، جو اس نازک مہم کے تماشے کے لئے دور دور سے مدعو کی گئی تھیں اور انگلستان سے روہیلکھنڈ تک رنگین سلسلہ ملا رہی تھیں اور دور ہی سے دیکھ کر زمیندار طبقہ اپنی اپنی نشستوں پر کھڑا ہو گیا، آفیسروں نے کرسیاں چھوڑیں اور چند ڈپٹی کلکٹر اور تحصیلدار ادھر سے ادھر دوڑتے نظر آئے اور ان کے پیچھے پیچھے کچھ زیادہ مستعد زمیندار بھی، سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا، کرسیاں اور صوفے پیش کئے، دو ایک کلکٹروں اور کئی ڈپٹیوں کچھ "الٰہی" قسم کے کوٹ پتلون پہننے والے آنریری مجسٹریٹ نسل کے زمیندار نے لیڈیز کی آمد کو تیز کرنے کے لئے نمایاں پھرتی دکھائی اور اگلی نشستوں پر سب کو بہ آرام بٹھایا اور چونکہ زمینداروں کی نشست آفیسروں کے سیدھے ہاتھ پر قریب ہی تھی، کلکٹر صاحبان اور کمشنر صاحب بہادر ان کی آمد پر مسندوں اور قالینوں پر حقے خاموش ہو گئے، سگریٹیں بجھ گئیں پان منہ میں دبا دبا کر چبائے جانے لگے، باتیں سرگوشیوں میں ہونے لگیں اور قہقہے بند ہو گئے، اور کہیں کہیں جو دو ایک بات بچہ کی تعریف کا پہلو لئے نکل جاتی تھی اس کی جگہ بھی میڈم کلوڈیا نے لے لی۔

یوں تو میلہ ہی سرکاری ہوتا تھا، ویسے دوڑ کا خرچ اور جاکی کا تمغہ اور دیگر اخراجات بالعموم کسی آنریری مجسٹری یا خطابات نوروز کے بھوکے امیدوار زمیندار کے سر رہتا تھا جسے اکثر گھوڑ دوڑ میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی تھی مگر آج تو سب زمیندار طبقہ کی دلچسپیاں میڈم کلوڈیا پر مرکوز تھیں بچہ کے نو دھنوں کے ہرائے ہوئے زمینداروں کے بغض معاویہ اور حب علی دونوں میں اور بقیہ سب کو "خوشنودی مزاج کلکٹر صاحب" میں اور یہ کوئی باضابطہ سائنٹفک قسم کی (Horse Race) تو تھی نہیں ایک بڑے دیہاتی میلہ کی تاریخی گھوڑ دوڑ تھی جس کی ابتدا اور روہیلہ دور سے ہوئی تھی اور جب سے میلہ کے انتظام پر گورنمنٹ نے خاص توجہ دی تھی اس کے بعد ہر سال دو سال پیچھے گھوڑ دوڑ کو کچھ ترمیم و تنسیخ کے ساتھ سائنٹفک انداز میں ڈھالا جا رہا تھا۔ ویسے دفتریں ہر دوڑنے والے "جانور" کا نام، مالک کا نام اور پتہ تو بہ صحت سے درج ہو رہا تھا لیکن احاطۂ تحریر

نام و پتہ لکھا کر ایک ٹکٹ بھی دیا جاتا تھا جسے لے کر سوار میدان میں آتا تھا اور دوڑنے سے پیشتر چیکنگ ہونا قرار پایا تھا۔

اور گھوڑے گھوڑیاں میدان میں ایک ایک دو دو کر کے اترنا شروع ہوئے کسی ریس کی "بجلی" بے حیائی کے ساتھ کوندتی اور کسی کے پیچھے بیلے کا پٹا ہوتا "پرندہ" مونہہ زوری سے بل کھا کھا کر ہنہناتا، تھوڑا الف ہوتا، کسی کا اکڑ فوں "موروجھ" کان پیچھے کو چپکا چپکا کر آہستہ آہستہ ٹلتی سے مرمراتا اور رگ رگ سے نئی سج دھج دکھاتا چلتا کسی کی "پھلجھڑی" بل کھا کھا کر اداؤں کے ساتھ بکھرتی، "سمٹتی، تیلتی، اٹھلاتی" پاؤں کے اندر جیسے زمین کو لپیٹ سی! اور چاروں طرف تماشائیوں میں ہر ایک کو پہچان کر تبصرہ ہوتا رہا اور ہر ایک کی نگاہیں میڈم کلوڈیا کے لئے فرش راہ رہیں اور تبصرہ کی تان بچہ کے تذکرے پر ٹوٹتی رہی۔ نیا جانور تو نہ معلوم کیوں اس دوڑ میں میڈم کلوڈیا کے اور کوئی اتارا ہی نہ جا رہا تھا ورنہ ہر دوڑ میں دو چار نئے جانور ضرور اتارا کرتے تھے۔ پرانے سب آچکے تھے۔ قدیم دیہاتی رواج کے مطابق نئے جانور کو دوڑ میں سب سے آگے کھڑا کیا جاتا تھا اور پچھلے جیتے ہوئے جانور کو سب سے پیچھے بقیہ سب درمیان میں، جدید انگریزی قاعدہ کے مطابق قد اور لمبائی کے تناسب سے آگے پیچھے دوڑانے کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ سب جانور میدان میں اتر چکے تھے۔ میڈم کلوڈیا کا نئے شوق میں اور بچہ کا پرانی عقیدت میں تماشبینوں کو انتظار تھا کہ میڈم کلوڈیا دفتر سے ٹکٹ کٹا کر میدان میں اتری! سب سے پہلے لیڈیز کی سیٹیں چھپا پڑیں: (Here comes madam Claudia — madam Claudia) اور تالیوں کی سنہری روپہلی جھنکار کے ساز پر میڈم کلوڈیا نے بارڈر لائن کے اندر قدم رکھا، اور رقص سا کرتے ہوئے قدموں پر تالیوں کا سازنہ بجتا رہا اور میڈم کلوڈیا میدان میں نظر آئیں پیٹھ پر ہز ہائنس سے لے کر کمشنر صاحب بہادر تک عظیم روایات اٹھائے ہوئے، فرانس اور انگلستان کی پیڈگری سرٹیفکٹوں کا پلندا بنی ہوئیں، میڈم کلوڈیا میدان میں کیا اتریں عظمتوں سے سارا ماحول بھر گیا۔ کانوں سے لے کر دم تک ریشمی جالی ——— سے ڈھکی ہوئی۔ چال چلنے سے زیادہ رقص سا کرتی ہوئی آ۔۔گے آگے زرق برق سائیس اس کے آگے اکڑ فوں اینگلو انڈین جاکی امونیشن بوٹ پہنے (Riding Breeches) رائڈنگ بریچس پر اگ لیدر گیٹرس (Hog Leather gaiters) چڑھائے اسپورٹنگ کلر کی چست جیکٹ پہنے سر پر سرخ رومال باندھے اور جس وقت میدان کے بیچوں بیچ جالی علیحدہ کی گئی تو جیسے ریس کورس چمک اٹھا گھوڑی تھی یا تصویر؟! حد تیور، پری پیکر آنکھوں کا ٹھ کمیت، آنکھوں میں سحر و اعجاز ایک پردہ کے اندر، چار تھرکیاں کسی ہالی وڈ کی نازنین کی طرح بھرتے، تو دو قدم کسی مشرقی ملک کے انداز میں ڈالتی! ایک حرکت میں کان سے لے کر دم تک بجلی سی لہرا جائے تو دوسری میں سم سے لے کر پشت تک بانکپن کے ساتھ فولاد سا لپک جائے۔ رفتار گام میں بھی محشر خیزیاں سی اہلتیں اور شرارے چھلیں۔ گھوڑی تھی کہ آگ کی پوٹ یا بارود کا تودہ جو پھٹا سا پڑتا تھا۔ ہر حرکت اور رنگ روپ ڈھنگ تربیت اور پرورش کے سانچہ میں ڈھلا ہوا۔ سات اور سات چودہ پشت سے سائنٹفک اصولوں پر پلی ہوئی جیسے یورپ کی کسی "اسپ ساز" مشین نے ایک مجسمہ تراش کر بھیجا ہے۔ جس میں صانع قدرت نے تمام ترچلتے ہوئے نقشے دوڑا دیئے ہیں جس کی کئی نانیاں، خالائیں، بھائی بہنیں ڈربی ریس دوڑ چکی تھیں، اور میڈم کلوڈیا گورے ہاتھوں کی تالیوں کے سریلے نغمے میں اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئی اور تماشبینوں کی حیرت و محویت میں آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

اور سب سے پیچھے کہیں دور دفتر کے قریب بارڈر لائن پر بڑھتے ہوئے میاں بچہ نے اپنی شیری کی سی مخصوص ہنہناہٹ میں گرج کر اپنے مخالفین کو ہمیشہ کی طرح چیلنج کیا جسے سن کر ایک ایک پرانا مدمقابل غصہ میں بھپھر کر زور سے ہنہنا پڑا اور بچہ کے میدان کے اندر اترتے ہی فلک شگاف نعرہ سے آسمان گونج اٹھا، "رولیکھنڈ نزلیش جیتے رہو!" ——— "بچہ بیر بڑھے رہو!" ——— اور ہر جیکارے کا بچہ نے اپنی صدائے بازگشت جیسی محبت بھری ہنہناہٹ میں استقبال کیا۔ اور پھر تو پیہم محبت اور عقیدت بھری صدائیں ابلنے لگیں اور بچہ جے کاروں کی جانب منہ پھیرتا اٹھاتا انگار جواب محبت دیتا گونج کے اندر بڑھتا رہا۔ جوں جوں کسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے قریب تر ہوتا گیا، جیکاروں کا جوار بھاٹا بڑھتا گیا بچہ کی شان ہمہ گیری اور رفتار شاہ گام بڑھتا گیا اور متکبرانہ اور غازیانہ انداز میں اپنی نو دفعہ کی جانی پہچانی مقررہ جگہ پر کھڑا ہو گیا اور جس وقت لال تند کی گردنگی پرانی ملگجی گلنتی اتاری گئی تو تین مہینے کے "تھان! ہے" اگاڑی پچھاڑی لگے۔ پیدائشی اسپ گشتہ کے مرمریں تن و توش پر گھاؤ نظر آیا اور سفید سا ٹھن سا رنگ شامیلا میلا گبڑا گبڑا دکھائی دیا۔ جسم بھی دبلا تھا اور ٹانگیں لمبی لمبی سی معلوم ہوئیں، مگر آنکھوں میں وہی چمک دمک

اور تیوروں میں وہی دم خم تھے جو ہمیشہ میدان دیکھ کر ہوا کرتے تھے۔ اور کسان تو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہتے۔ مگر بچو میاں کے پریم بھرے نرگسی پیالے اپنے بچپن کے پیارے بچہ کو دیکھ کر چھلکے سے پڑتے تھے۔ ایک جانب استاد سدن خاں چابک سوار جیسی ولائٹ پاجامہ پر پٹیاں کسے دیسی جوتا پہنے کباڑی کے یہاں کا فوج کا نیلامی کوٹ ڈالے، سر پہ کنزی بندش کا صافہ باندھے کھڑے تھے اور ہاتھ میں فتح پوری کوڑا لہرا رہا تھا، دوسری جانب میلا سا سائیس ایک کپڑا لئے آہستہ آہستہ گردن پر پھرا رہا تھا۔

(۱۱)

ایک ایک جانور کی تمام شریانیں جیسے کہربائی جھٹکے سے جھنجھلا اٹھیں، یکدم ریس کورس کوندتی بجلیوں سے بھر گیا، پٹاخہ چلا، اور دوڑ شروع ہو گئی، دمیں لہرا کر پیچھے کو پھیل گئیں، گردنیں آگے کو تن گئیں، کان نیچے کو آ گئے اور جانوروں کے جسم بھرپور کھنچ گئے اور زمین پانوں میں پٹنے لگی، ہوائیں پیچھے سے پڑنے لگے، ہر جانور جان توڑ کر پوری تیزی سے دوڑنے لگا اور تماشائیوں کی نگاہوں کو تعاقب کرنا مشکل ہو گیا۔ میڈم کلوڈیا اپنی مخصوص سائنٹفک ریس دوڑی اور بچہ اپنی نرالی جبلت کے مطابق چلا، بچہ کو اس میدان میں مدتوں سے سب سے پیچھے سے اسٹارٹ لینا تھا۔ اور اختتام پر وہ کبھی آدھا اور کبھی تہائی راونڈ اپنے حریفوں کو پیچھے چھوڑتا دنگل پوائنٹ پر پہنچا تھا، پہلے راونڈ کا دو تہائی فاصلہ ذرا کم رفتار کے ساتھ سب سے پیچھے طے کرتا تھا پھر بقیہ ایک تہائی میں سب کے دوش بدوش جا پہنچتا تھا اور دوسرے راونڈ کے آخیر تک آگے والے جانوروں سے کنوتی ملا لیتا تھا، اور تیسرے کے شروع سے ہی غضب ڈھانا شروع کر دیتا تھا۔ اسٹارٹ کے دس دس بیس بیس گز بڑے ہوئے مدمقابلوں کو بے بھاؤ پیٹتا یہ جاوہ جا، تماشائیوں کی آنکھیں پھٹی رہ جاتیں، گھوڑا ہے یا چھلاوہ، دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ جاتے اور دونگ پوائنٹ پر کبھی آدھا چکر کبھی تہائی چاند آگے پہنچتا اور اس جیتے ہوئے فاصلہ میں استاد شہامت خاں چابک سوار ڈھٹائی کے ساتھ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے جاتے، قریب ترین حریف کتنی دور پیچھے ہے استاد سدن خاں کی ران تلے پہلے راونڈ کا تین چہارم حصہ تو بچہ ٹھیک چلتا معلوم ہوا مگر جب اس راونڈ کے اختتام تک اپنی مقررہ ترقی نہ کر سکا تو مجمع میں بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور دوسرے راونڈ میں کسانوں نے سوار کے ہاتھوں اور راسوں پر غور کیا اور جیکاروں کے ساتھ جگہ جگہ آوازیں بلند ہوئیں "چھوڑ دو استاد باگ چھوڑ دو! ڈھیل دو — راسیں چھوڑ دو استاد —" مگر استاد نے چھوڑنے کی بجائے اور الٹی قید کر رہے تھے۔ اور کسانوں کی ہمت افزا آوازوں کے زور پہ دوسرے چکر کے نصف تک بچہ بمشکل درمیان کے جانوروں تک پہنچ سکا — اور میڈم کلوڈیا گولی کی طرح سب سے آگے اڑی چلی جا رہی تھی۔ اتنا فاصلہ تیسرا راونڈ شروع ہوا۔ بچہ نے پوری طاقت سے دوڑنا اور استاد نے پوری قوت سے روکنا شروع کیا، اور یہ دیکھ کر کنارے کنارے پھیلے ہوئے کسانوں میں جو بھونچال سا آ گیا۔ سارا مجمع زیر و زبر ہونے لگا، منچلے اور بانکے لونڈے منہ پھاڑ کا پھڑ کا کر بارڈر لائن تک پہنچ گئے، اور سب نے سب کچھ اندازہ کر لیا، اور کسان سمجھ گئے کہ ان کا برسوں کا بنا بنایا کھیل اور ہمیشہ کا جیتا میدان آج سازش کا شکار ہو رہا ہے، بوڑھے کسانوں نے اپنی بیٹھی ہوئی بھدی آوازیں بچہ کی ہمت بندھائی اور شاباش بچہ بیرا بچہ بیرے گیا! بچہ! بچہ! بچہ! مار میدان اور جوان استاد سدن خاں کی بدمعاشی پر آپے سے باہر زخمی شیر کی طرح بھرے پڑے تھے "ڈھیل دے" "سدنا نمک حرام!" "حرامی بچے ہاتھ مار!" اور بار بار لاٹھیاں گھمانے لگے "چھڑوں ماس بھریں گے" اور اولیس گڑھ کے نوجوان تو آپے سے باہر تھے اور سدن خاں کی ماں کا رشتہ لارڈ سیکسن اور سر کیمپل سے ملا ملا کر ان کی ولدیت میں استاد سدن خاں کا نام لگا رہے تھے جو اب یک دم ذرا دیر میں استاد سدن خاں کے بجائے "سدنا حرامی" کے معزز لقب سے چیخ چیخ کر پکارے جا رہے تھے۔ میدان کے تین چہارم بارڈر پر کسان لگے ہوئے تھے اور جب دکھن کے محاذ والوں سے گذر کر جانور پچھم والوں کے محاذ میں پہنچے تو ادھر کے کسانوں نے بھی بڑے زور سے گرج گرج کر ... کی "ابے او سدنا سالے، آج ہڈیاں توڑ دیں گے! — نمک حرام۔ سور کے ...... لاٹ سیکسن کے ...... کھوپڑی بھان دیں گے، حرامی بچے" اور بوڑھوں کی نرم آوازیں بدستور رہیں "بہت اچھے بہت اچھے بچہ۔ واہ بیٹا، ہاں ایک زور بچہ، لے لپک کے بچہ، بچہ بچہ — ہاں ڈنگ بڑھ کے بچہ بیرا! — اور بچہ کی گردن دوسرے راونڈ کے نصف ہی سے راسوں کے تناؤ میں دوہری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کسانوں کا مجمع امید و بیم میں اوچھل اوچھل کر گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ تیسرے راونڈ کے نصف پر تو بچہ لقا کبوتر بن گئے۔ کان چابک سوار کے چہرے سے آ لگے

اور دم دوہرا ہوا پیچھے سے چہ مکی کی طرح سر پہ لہرانے لگی، نوجوان بھونکتے ہی رہے اور سدن خاں ڈھیلا ڈھالا سے کھنچتا ہی چلا گیا اور جوں جوں گھوڑے نے دم خم زیادہ دکھائے سدن خاں اتنا ہی زیادہ تنا گیا۔ نوجوانوں کی گالیاں اور دھمکیاں شدید تر ہوتی گئیں بوڑھوں کی پھٹکاریاں اور ہمت افزائیاں تیز تر ہوئیں مگر استاد سدن خاں کے ہاتھ تنتے ہی گئے اور فتحپوری کوڑا مفلوج عضو کی طرح جھولتا لٹکتا رہا۔ محافہ سے گذرتے ہوئے نوجوان کسانوں نے بڑے زور سے بچہ پکارا میاں کے پیک! کا فلک شگاف نعرہ مارا اور جیسے زمین نے سکڑ کر اپنی طنابیں کھینچ لیں اور بچہ میڈم کلوڈیا کی دم تک اپنا مونہہ پہنچا سکا، باڑھیں تیز تر ہوئیں اور جیسے زمین تھرا گئی اور بچہ کے پاؤں پر لچھا سا بن کر لپٹ گئی۔ استاد نے پوری طاقت سے کھینچا، بچہ کے انداز سے معلوم ہوا کہ جیسے اس کی روح جسم کے اندر سے پرواز کر کے آگے نکلنا چاہتی ہے اور اب جبلت اسی کے منافی بغاوت شدید تر ہوتی گئی اور چابک سوار نے جتنا زیادہ روکنا چاہا اتنا ہی زیادہ تیز ہوا۔ اور دم قریب قریب سوار کے سر پہ لہرانے لگی اور گردن محرک طرح دوہری ہو کر کان سوار کی ناک کو چھونے لگے اور راسیں کھنچتی رہیں، رفتار بڑھتی رہی اور تیسرے راونڈ کے نصف سے بچہ میڈم کلوڈیا کے ساتھ کنوتی ملائے جا رہا تھا اور اب محافہ کے نوجوان کسانوں نے استاد کی گالیاں اور دھمکیاں بند کر کے بچہ کو بارڈر لائن سے باہر دوڑ کر دوڑ کر باڑھیں دینی شروع کیں، اور گردن کے اور پ سے چمڑے کا پورا لگنا دیا ختم ہو گیا، مونہہ کے اندر لوہے کے ٹکڑے پورا دباؤ دیکر دھکیل چلے اور کمشنر صاحب کے بازو سے کوتوال صاحب کے پنجے تک کا سب ساز باز سدن خاں کی کلائی کا زور پورا کر چکا تو ونگ۔ پوائنٹ کے قریب ٹھہرے بچو میاں نے کڑاک کر بچہ کو للکار دی، اور جیسے زمین ابتدائے آفرینش کی گردش کے خلاف ایک پھیری الٹی لے گئی اور سورج کے بجائے بجلی کے محور پر گھوم گئی، نگاہ کی شعاع کی رفتار سے آسمان الٹ کر نیچے آیا اور زمین اچک کر سر پر پہنچ گئی۔ گھربائی تڑپ سے بچو میاں کی آواز پر بچہ نے سر سے پاؤں تک جھٹکے ہی جھٹکے ایک اڑان سی لی اور میڈم کلوڈیا سے آگے جا گرا اور یہ ونگ پوائنٹ تھا —
اور سدن خاں استاد تو ونگ پوائنٹ پر سائیس کو گھوڑا تھما کر پولیس کے ہنٹر اور کسانوں کے ڈنڈے کے خوف سے مجرم کی طرح ایسے فرار ہوئے جیسے زمین نگل گئی! کسانوں نے بڑے زور سے ونگ پوائنٹ کی جانب رش کیا' بچہ بیر کی جے' — روہیلکھنڈ نرسنگ کی جے، کٹھیر سورکی جے! — اور ان کا بس نہ تھا کہ چاروں ٹانگوں سے اٹھا کر بچہ کو کندھوں پر رکھ لیں اور پولیس کے انتظام کرنے والے کانسٹیبل روکتے ہی رہے مگر وہ بچہ تک پہنچ گئے اور اس مرتبہ ہر جیت کی طرح استاد شہامت خاں تو موجود ہی نہ تھے جنھیں وہ بچوں کی طرح اٹھا لیا کرتے تھے اور کندھوں ہی کندھوں بڑھاتے اور پیس گڑھ کیمپ تک لے جایا کرتے تھے بے اختیار ہو کر چند آزاد نوجوانوں نے بچو میاں کو اٹھا لیا، مگر بچو میاں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور دل دھک دھک کر رہا تھا کہ آج کسانوں کی ساری خوشی مٹی میں مل جائے گی اور ان کی عمر بھر کی عزت خاک میں — اور جب یہ حال کھلے گا کہ ان کا بچہ نہیں جیتا ہے تو یہ ساری خوشی چھوٹی ہو جائے گی اور پھر جب یہ معلوم ہوگا کہ بچہ چودھری نے بیچ لیا ہے تو ان کا خاندان ڈوب جائے گا اور شاید انھیں ڈوب مرنے کو جگہ نہیں رہے گی اور جو کالک تین مہینے بیشتر لگنے سے بچی تھی وہ آج لگے گی اور ستم بالائے ستم بچہ نے یہ کیا کہ اپنے سائیس کے روکے نہ رکا اور شرارت دکھانے لگا اور کندھوں پہ بیٹھے جاتے ہوئے بچو میاں کے پیچھے پیچھے بھیڑ کے ساتھ چلنے لگا۔ ادھر بچے کے آگے گرتے ہی لیڈیز کی قطار سے ایک (Dying yell) سی بلند ہوئی اور دوربینیں آنکھوں سے نیچے آ پڑیں۔ کمشنر صاحب کی میم صاحبہ Faint کر گئیں اور کئی مہمان مسیں Faint کرتے کرتے بچیں، میڈیکل ایڈ مہیا ہوئی۔ دو ایک سینئر لیڈیز نے سنبھالا میم صاحب کے حلق میں برانڈی کے قطرے ٹپکا کر بمشکل کیمپ تک پہنچایا گیا اور ریس کے میدان سے ہر کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر، تحصیلدار، سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور انسپکٹر تھانہ دار سب کے سب سیدھے کمشنر صاحب کے کیمپ پہنچے جیسے ان کے یہاں غمی ہو گئی ہے، اور میم صاحب نے پہنچتے ہی کیمپ اکھیڑنے کا حکم دیدیا اور چلتے وقت کمشنر صاحب نے تو کچھ نہ کہا پانچوں کلکٹروں کی موجودگی میں کلکٹر صاحب بہادر سے نہایت سنگین قسم کے شکایتی انداز میں کہا کہ بڑے شرم کی بات ہے۔ آپ کا یہ انڈین کیمپ ہے!؟ آپ نے ایک لیڈی سے جھوٹا وعدہ کیا اور دھوکا دیا! — آپ جیسے ذمہ دار آفیسر اور کلچرڈ جنٹلمن کو یہ چیز زیب نہیں دیتی۔"

(۱۴)

اور اب کلکٹر صاحب کے کیمپ پر کوتوال صاحب کی پیشی اور جواب طلبی تھی۔ کوتوال صاحب اندر طلب کر لئے گئے بچہ بلاکر باہر کھڑا کر لیا گیا تھا۔ دفتر کے کیمپ میں آمنے سامنے کرسیوں پر غصہ میں شعلہ سے دیکھتے کلکٹر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب بیٹھے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ آہستہ آہستہ اپنے گیٹرس پر ہاتھ مار رہا تھا اور کلکٹر سفید مونچھ چبا رہا تھا۔ کوتوال صاحب نے اندر پہنچ کھٹ سے سلوٹ دیا اور کلکٹر نے دانت کٹکٹا کر آہستہ آہستہ کہا "You rouge of a City Kotwal — You rouge of a City Kotwal — "Worthless brute! تم سب کو دھوکا دیا" ول اور میز پر گھونسہ مار کر کہا "You dullard of a City Kotwal — اور جب دوسرے گھونسے کے بعد ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دانت کٹکٹا کر اور نیچے کا ہونٹ نکال کر کلکٹر صاحب نے ذرا سکوت کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر نے ایک شیر کی سی غوں نکالی اور بولے "یو ڈیمڈ سب انسپکٹر! — ول بچہ کس کا گھوڑا!؟"

اور کوتوال صاحب کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ سپرنٹنڈنٹ کی آواز پر اور بھی زیادہ تھرتھرانے لگے" ہو ..... ہو ..... حضور .... شیخ جی کا!؟"

"ہوں ڈیمڈ تم ہم کو بولا شیک جی کا! — پھر گدھا مانک ٹباؤ بچہ کیوں آگے گیا!؟" — اور اس کا جواب بجز بچے کے کسی کے پاس نہ تھا اور کوتوال صاحب بہادر بیچارے بلی کی طرح موہنہ چلا کر دو مرتبہ میاؤں میاؤں سی کر کے رہ گئے۔ اور سپرنٹنڈنٹ نے میز پر بڑے زور سے گھونسا مارا اور شیر کی طرح بپھر کر گرجا "یو ڈیمڈ! کوتوال کا بچہ! ہم پوچھنا مانگتا ہے سور کا مانک — بولو ڈیمڈ! —"

"او' او' ای ای'۔ ایں آں" — اور یہ کوتوال صاحب کے نکلے ہوئے دانتوں میں ہی نکلی ہوئی آواز تھی جو سکڑے ہوئے ہونٹوں کو جمع کرنے کی ناکام کوشش میں کلام موزوں کا جامہ نہ پہن سکی۔ اور کلکٹر صاحب نے فوجی کپتان قسم کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا انداز بجائے زبان کے ہاتھ سے جواب طلب کرنے کا دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس کے موہنہ سے بات لے کر مائی بہ تہذیبی اور ضابطہ کے طرز میں کہا "بولو تم بولا کپتان صاحب کی میم صاحب سے کہ تم چودھری سے گھوڑا شیک کے نام مول لیا؟" — اور کوتوال صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ کے چہرے سے لگا ہی جیسے اگر یہ شکل کلکٹر صاحب کے جواب میں بار بار تھوک نگل کر حلق سے مری مری "جی حضور" نکال سکے اور اتنے میں سپرنٹنڈنٹ پھر آگ بگولا ہو کر پھٹ پڑا "یو ڈیمڈ — اور تمہارا گھر ہے ... صاحب کی میڈم کو دیا ہے wire کہا" — اور کہہ کر "اسکاٹ اللنس" فوجی پھر ہمکا اور آئی سی ایس کلکٹر نے پھر روکا اور بولا "ہوں! اچھا چپراسی شیک جی کو بلاؤ!"

"ہوں — ڈیمڈ شیک جی! — غوں — غاں — غاؤں" سپرنٹنڈنٹ پولیس غرایا!

اور چپراسی دوڑا ہوا شیخ جی کے پاس پہنچا جو کوتوال کے کیمپ میں مہمان تھے اور شیخ جی کچی گولیوں کے کھیلے کب تھے۔ ان کو بری سے بری اور اچھی سے اچھی سوجھ گئی تھی، پھر چھوٹے بیٹے والی سروس کی ایک لاکھ اکیاون ہزار کی دوسری قسط سامنے تھی جس کی داغ بیل ایک تھینک پیٹر اس کے تھانیداری کے سلیکشن میں آتے ہی پڑ گئی تھی اور اس برے وقت کو سوچتے ہوئے انھوں نے دفتر پہ بچہ ... کا نام نہایت دور اندیشی کے ساتھ منشی کے پاس بیٹھ کر درج کروا لیا تھا جس کی ساری تیز بازی اور سعادتیں اور ایک مبارک بھونری اس وقت کوتوال صاحب بہادر کے سر پہ بلا بن کر سوار ہو گئی تھی اور ایسے ہی وقت کے لئے وہ بچے کی رسید فروخت جیب میں ڈال کر بیٹھے تھے جو انھوں نے ڈنگ پوائنٹ پر بچہ کے جست کرتے ہی بنظر احتیاط جیب میں رکھی بھی خالی از خطرہ نہ سمجھی تھی اور فوراً نکال بھی ڈالی تھی۔ نہایت دلیری کے ساتھ بادھکے کلکٹر صاحب نے سوال کیا "ول شیک جی بچہ تمہارا گھوڑا!؟"

"نہیں حضور میرا نہیں۔"

اور سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا "اچھا ڈیمڈ بچہ کس کا؟ — کوتوال کا گھوڑا؟"

"اسے یہ حضور مجھے معلوم نہیں؟"

"نہیں ہم پوچھنا مانگتا ہے گدھا کا مالک۔ کو قوال چودھری سے تمہارے نام گھوڑا مول لیا؟"

"نہیں حضور" شیخ جی نے نہایت استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ اور کلکٹر نے کہا "یہ بات؟ بچہ نمائش سے اب تک تمہارے اصطبل میں رہا؟"

"نہیں حضور" شیخ جی نے تڑ سے کہا۔

"اچھا تو یہ بات کہنے والا جھوٹا ہے کہ بچہ شیک جی کا گھوڑا ہے؟"

"حضور بالکل جھوٹا!" شیخ جی نے کہا۔

"اور یہ (Statement) بھی دینے والا جھوٹا ہے کہ بچہ شیک جی کے نام کو قوال نے اپنی جیب سے دام دے کر چھٹی رسیدکیا"

"حضور بالکل جھوٹا" شیخ جی نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے گرج کر پوچھا۔

"پھر ڈیمڈ بچہ کس کا گھورا؟ ہم پوچھنا مانگتا ہے"۔

مگر شیخ جی ذرا نہ ڈرے اور آہستہ سے بولے "حضور یہ میں کیا جانوں۔ حضور دفتر سے ریس کا رجسٹر منگا کر دیکھ لیں، ہر مالک نے اپنے اپنے نام سے گھوڑا دوڑیا ہے اور کل حضور اپنے ہاتھ سے انعام دیں گے مالک کو"۔

اور کلکٹر نے آواز نکالی "چپراسی منشی گھوڑ دوڑ رجسٹر کے ساتھ لاؤ"۔

اور ذرا دیر میں منشی مع رجسٹر کے آگیا۔ کلکٹر نے کہا "آج کی ریس میں بچہ کس کے نام سے شریک ہوا"

"حضور چودھری ناظم علی خاں۔ ادیس گڈ ھ" اور یہ کہہ کر رجسٹر کھولا۔ کلکٹر صاحب اردو میں بچہ اور اس کے مالک کا نام تو نہ پڑھ سکے مگر خانہ کیفیت میں سول جج کے دستخط اور ریمارک پڑھ لیا جو ریفری تھے اور جنھوں نے فوراً فیتہ سے ناپنے کے بعد بچہ کی جیتا کی تفاصیل اور مالک کا نام لکھا تھا جس کو میڈل اور سرٹیفکٹ ملنا تھا اور سدن خاں کے نام پہ جاکی والا تمغہ لکھا تھا۔ اور کلکٹر نے پھر کہا چودھری کو بلاؤ"۔

اور چپراسی دوڑا ہوا چودھری کے کیمپ پر پہنچا۔ بوڑھے چودھری بیچارے کے طلبی سنتے ہی طوطے ہرن ہو گئے۔ سمجھا جب تو بچ گئی عزت اب تو نہیں بچتی۔ دونوں بڑے بیٹوں سے مشورہ کیا اور یہی رائے قائم کی کہ چپراسی کو ایک روپیہ دے کر یہ کہلوا دیا جائے کہ ادیس گڑھ چلے گئے یا یکدم سخت درد اٹھا اور فوراً استارہ پر چڑھ کر بھاگ جائے اور پھر بیماری کا عذر کرتا رہے کہ کچھ سن گن پاکر بچو میاں بھی آ گئے اور میلہ میں یوں تو خاص و عام ان پہ مبارک باد کی بوچھار کر رہے تھے مگر جب دفتر کے منشی نے مبارک باد دی تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور پھر کچھ دور آگے بڑھ کر ہندستانی سول جج نے اسپورٹس مین لائک انداز میں مسکرا کر مبارک باد دی تو بچو میاں کو نگو میں پڑ گئے اور یہ خیال کر گئے کہ ان کا نام ان کے باپ نے کو قوال صاحب کی فرمائش پر نتیجہ کی رنگینی کو ڈھٹائی کے ساتھ شوخ تر بنانے کیلئے سازش کے تحت لکھا یا ہو کہ بچہ میڈم کلو ٹپا ہے جوں کا تیوں انھیں کا گھوڑا ہو کر اور انھیں کے سر ہو کر رہ رہے بھی۔

اُدھر کساروں میں یہ ہوا اڑی کہ بچہ کو قوال صاحب چھینے لیتے ہیں۔ اور بچو میاں نے کیمپ پہنچ کر باپ بھائیوں کو سراسیمہ و پریشان دیکھا۔ اور استارہ کسی ہرنی طیار اور چودھری فرار ہونے کے لئے پابہ رکاب۔ اور بچو میاں نے باپ کو ڈھارس بندھائی اور چپراسی کی زبانی سنا ہوا سب حال مجملاً سنایا۔ تو پھر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔

"بچہ جیت گیا اور کسی دشمن نے ہمارا نام لکھا دیا واں دفتر پہ بیٹا" بوڑھے چودھری نے کہا۔

"ایں تو جھوٹ ہی کہنا تھا کیا ہم نے بچہ کسی سالے کے ہاتھ بیچا ہے؟"

"ارے بیٹا ایک آفت میں پڑ کر تمہارا خاندان ڈوبتے ڈوبتے یوں بچا ہے اور آج یہ نئی اور بڑی خدا کی لاٹھی بے آواز" اور چودھری نے دونوں ہاتھ اٹھا کر گناہوں کی معافی مانگی اور آہستہ سے بولا "وہ بھری نمائش تھی اور آج بھرا میلہ" اور اس کی نظر میں بچہ کی طرح گھومنے لگا اور اس کی منحوس ماں کی ایک ایک نحس جو زہری ناگن کی طرح لہرا گئی اور پھر بولا یا "میں نے اپنی ماں کی نصیحت نہ مانی اور ا ا

کے سپوتے کو کنھیا کے گھر سے منگا کر آستین کا سانپ پالا" اور بچو میاں نے بات کاٹ کر کہا "ابا جان آپ کیوں ڈرتے ہیں، اور گھوڑا تو میرے نام پہ رجسٹر میں درج ہے۔ میں ابھی معلوم کر کے آرہا ہوں۔ خانصاحب نے مجھ سے کہا جو ریفری ہیں۔

"اچھا بیٹے تمہارے نام پہ درج کرادیا کسی نے! غضب خدا کا!"

"غضب کیوں رحمت نہیں؟ بچہ جیت گیا! اور میں جاتا ہوں"

"نہیں بیٹا تم نہ جاؤ۔ چلو میرے ساتھ تم بھی، گھر بھاگ چلو"

"کیوں؟"

"دیکھو بیٹا۔ تمہیں ——— یہ بند کردیں گے۔ میں چپراسی سے پوچھ چکا ہوں۔ صاحب آج بہت برہم ہیں"

"ہاں! بند کردیں گے۔ یہ بھی کوئی شہر کا موقع سمجھ لیا ہے۔ سنجیے ادھیڑ کر رکھ دوں گا"

"اگر گرفتار کرلیا تو؟!"

"اسے ابا جان! ان مجسٹریٹ قسم کے لوگوں کی ذہنیتیں مجھے معلوم ہیں۔ یہ مارتے کے آگے آگے اور بھاگتے کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں، جو آج بات بھی کر جائیں مجھ سے، مجھے گرفتار کرنا اور بند کرنا تو درکنار!"

"اور انھوں نے گرفتار کرلیا تو تم کیا کرو گے؟"

"اگر گرفتاری کی دھمکی بھی دی تو میلہ الٹ دوں گا۔ روہیلکھنڈ درہم برہم کردوں گا، اور آج تو میں اپنوں میں ہوں، یہ شہر والا مکان نہیں جو چوہے کی طرح پھانس لیں۔ کاکی استھان کا میلہ ہے" اور یہ کہتے ہوئے پورے میلے پر ہاتھ گھما کر ہمہ گیری کے ساتھ اشارہ کیا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

اور بوڑھا باپ ناعاقبت اندیش اکھڑ نوجوان بیٹے کی بات پر بگڑ گیا "جی آپ تو سارا ہندستان الٹ دیں گے بڑے ہفت ہزاری خان خاناں ——— کچھ نہیں بیٹا ہمارے موہنہ پر بھرے میلے میں کالک لگانے جاتے ہو کہ چودھری کا لائق بیٹا ہتھکڑیاں پہن کر حوالات کو گیا"

اور بچو میاں آہستہ سے ہنس پڑا اور یہ کہتا ہوا کہ آپ بیٹھیں اطمینان سے ہم نبٹے آتے ہیں۔ چپراسی کے ساتھ چل پڑا۔ اور چودھری دہائے رہ بلا پڑا ہتارہ گیا اور بچو میاں مجا ہوا، چال چلتے کلکٹر صاحب کے کیمپ پر سیکڑوں کسانوں کے جلوس میں پہنچے سامنے میدان میں پہلے بچہ ہی سے آنکھیں چار ہوئیں اور بچے نے بڑے زور سے شکوہ میں ہنہنا کر طنز کا ایک تیر سا پھینکا اور جیسے حضرت سلیمان کی طرح بچو میاں لفظ لفظ سمجھ گئے کہ کہہ رہا ہے داہ میاں بچو میاں داہ! تم نے تو بچپن کی بڑی اچھی نبھائی۔ تھالی کے کھونٹے پہ باندھا اور بیچ میدان شکنجہ میں کسوا کر ساری عمر کی کری کرائی خاک میں ہی ملادی تمی" اور وہ نگاہیں جھکا کر اندر کو لپک گئے تو بچے نے دوسری آواز ہنہنائی "میاں جاتے کہاں ہو، ذرا مجھے تو جواب دیتے جاؤ بیٹے" مگر وہ بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بھٹے گھس گئے۔ اور اندر مجمع پہ پہلی نگاہ ڈالتے ہی سمجھ گئے، راستہ میں معاملہ کی جزوی تفاصیل اور کوتوال شیخ جی اور منشی کے بیانات کا خلاصہ چپراسی سے معلوم کر لیا تھا جو ان کے باپ سے ایک روپیہ انعام پاکر چلا تھا جو مفرور ہی کے سلسلے میں دیا گیا تھا۔

کلکٹر صاحب نے ذرا جھینپی جھلی نظروں سے شیریں لہجے کے ساتھ انگریزی میں سوال کیا "چودھری ناظم علی صاحب، آج ریس کا جیتا ہوا گھوڑا بچہ نامی آپ کا ہے۔"

"جی ہاں ——— بچو میاں نے کہا اور آواز پہچان کر باہر سے بچہ خوشی کی ہنہناہٹ سنایا "ہیں ہیں! پھر اپنے بچہ کو شہر میں نیا کیوں کرادیا تھا اور یہاں ہیں یہ"

اور سپرنٹنڈنٹ نے سوال کیا "اور یہ بات غلط ہے کہ آپ نے بچہ شیخ مشرف الدین کے ہاتھ فروخت کیا"

"جی بالکل غلط" بچو میاں نے جواب دیا اور باہر سے آواز سن کر بچہ پھر ہنہنا پڑا "ہوں ہوں ہیں نانا نانا، ہیں ہیں! پھر مفت میں وہاں اندھیرے شہر میں کیوں بند کرا کر بندھوا یا تھا اب یہاں ہیں"

اور اب کی مرتبہ فوجی کپتان سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکٹر صاحب کے اشارے کے باوجود نہ رکا اور اسوہتن بورڈ کی ٹھوکروں سے

کوتوال صاحب بہادر پرچپل پٹا اور قانونی دھمکیوں کے ساتھ ہندستانی اور انگریزی گالیوں کے امتزاج سے ایک نئی اینگلو انڈین گالیوں کی ترکیب مرتب کرنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ پیہم ٹھوکروں کی دھول چپکا سے خود ہی جھاڑتا جاتا تھا اور سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ پاؤں کی تیزی سے زیادہ سرعت اور مستعدی کے ساتھ کوتوال صاحب ہر ضرب اٹینشن ہو کر قاعدہ میں لیتے رہے اور سپرنٹنڈنٹ نے اس فٹ بال اور گالف کے ملے جلے کھیل کے دوران میں غرا غرا کر "ڈیمڈ ٹم کو یہیں حاضر۔ ڈیمڈ ٹم کو دفعہ دس کی کارروائی" حکم دیا اور اور اک ذرا سانس لی تو کلکٹر نے اسی شیریں انداز میں بچو میاں سے کہا "آپ جا سکتے ہیں اور گھوڑا تو شاید آپ کا یہیں باہر ہے لے جائیے۔" بچو میاں نے سلام کو ہاتھ اٹھایا اور پھر ذرا گھوم مغموم کر کوتوال کی جانب دیکھا اور نہایت ادب سے ذرا گردن جھکا کر آداب کیا اور فاتحانہ انداز میں باہر نکلے۔ سامنے بچہ تھنے پھلائے متکبرانہ انداز میں بل سا کھائے ہوئے کھڑا تھا۔ اپنی اس تاریخی ذقند کے پورے پورے احساس میں چور بانکپن کا مجسمہ بنا ہوا جو اس نے کمشنر صاحب، لاٹ صاحب، ہز ہائنس شاہ جارج کے سر پہ سے لگا کر بازی جیتی تھی۔ استاد شہامت خاں کو بچو میاں کے پیچھے پیچھے چودھری نے بھیج دیا تھا کہ نہ معلوم کیا پیش آئے اور استاد بچہ کی گردن پہ ہاتھ رکھے۔ اس کی باچھوں سے بہتا ہوا خون اپنی پگڑی کے طرہ سے پونچھ پونچھ کر جیسے اسے منا رہے تھے۔ چند سربرآوردہ کسان اس کے جسم پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور اپنی پگڑیوں سے پسینہ خشک کر رہے تھے اور بچو میاں کو دیکھتے ہی بچہ پُرشکوہ کی مخصوص آواز میں ہنہنایا۔ اور بچو میاں نے لپک کر اس کی گردن میں ہاتھ حمائل کر دیئے۔ "ہوں، ہوں، ناہوں، ہوں ہنانانانا" بچہ نے ناز کے انداز میں مونہہ سا پھیرنا چاہا مگر بچو میاں نے پکڑ کر اس کے نرم و نازک تر ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ پیار میں تھرتھراتی اشرف المخلوق اور اشرف الحیوان سانسیں مل گئیں، شکوے مٹ گئے، بچو میاں کی آنکھوں سے دو غم طلب موتی ڈھلکے اور بچہ کی آنکھوں سے شکوے کی دو دھاریں بہ کر ہونٹوں پہ جمع ہو گئیں اور پھر تو بچہ بھی من گئے "ہوں ہوں، ہاں ہاں! ہاں ہاں ہاں ہاں، ہکا ہکا، چپ چپ۔ بوسوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ دھم دھم، ٹاپ ٹاپ سیدھی ٹاپ مار مار کر اور قریب کو بلایا اور بچو میاں نے رخسار پہ رخسار ملا اور آگے بڑھ کر سینہ سے لگایا" اور پھر ہونٹوں پہ ہونٹ رکھ کر ناز برداری کرتی ہوئی آواز میں جیسے ماں اپنے شیر خوار بچے سے توتلی زبان میں بات کرتی ہے، بولے "ہوں بچہ خفا ہو گئے بیٹا! اوں، آں، واں اتنے دنوں شہر میں پھنس کر — لو اب چلو گھر بیٹو — گھی گڑ کا ملیدہ کھاؤ، چنے کی تیل چپڑی کھاؤ، اول، آں، ہکا ہکا! چوں آں چوں! — ہوں! — گھر گھر گھومو، بجھڑ کا ٹکڑا کھاؤ، کھیت کھیت مونٹھ کی ہری ہری پھلیاں کترتے پھرو — کوٹو کوٹو بیٹھا بیٹھا سن پڑے ہو لو اب گھر چلو، ہوں سب تمہیں یاد کرتے ہیں، خوب کودو، خوب بھاگو! اپنی شیا ماتا کا لاڈ ہاگا ڈھاودھو ہو — ہنک ہنک چنا غ پشاح! — لو اب من جاؤ۔ ہاں ہاں ہاں!" بچہ کا لہجہ بدلا، تیوروں میں دودھ فہمد کے سوتے سے ابل پڑے، اور بچہ من گئے۔ "تو اب تو من گئے ہمارے بچہ بیرا — ہوں اور دیکھو تو بے ایمان نمک حرام سدّا نے ہمارے بچہ کا کھینچ کھینچ مونہہ کاٹ ڈالا" بچو میاں نے شکایتی انداز میں افسوس سا کرتے ہوئے اپنا ردالی بچہ کی زخمی باچھوں پر نرمی کے ساتھ پھیرا۔ اور سدّا کا نام سن کر بچہ کے تیوروں میں خشونت کی جھلک آ گئی، اور "ہن ہن ہنانانانا" — اور دھم سے زمین پر ٹاپ مار کر گویا بے ایمان نمک حرام سدّا کا کھوپڑا توڑا۔

اور بچو میاں نے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ظالم قصائی سالا — میرے بچہ کی گردن توڑ دی، سالے نے۔" اور بچہ کے نتھنے پھول گئے۔ "غوں، خوں، خاں: غصہ میں گردن جھٹکی — لو اب غصہ تھوک ڈالو — چلو" بچو میاں نے کہا اور بچہ نے "پھُرررر" سے غصہ تھوک کر ذرا اکڑ جھکا کر ہیلو پیش کی، اور بچو میاں کھلنڈرے سے انداز میں جست لگا کر بغیر ہی رکاب پہ پاؤں چھوئے ایال پکڑ کر زین پر دکھائی دیئے، اور سب کسانوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ استاد نے پگڑی کے طرہ سے آنسو پونچھتے ہوئے کڑک کر نعرہ لگایا "بچو میاں زندہ باد!" "بچہ بیرا جیت ہو! سردھنا کھنڈ نریش کی جے ہو" "کیہر بیر ہمارا" اور جے کار نعروں کی زنجیر کی کڑیوں کا سلسلہ سارے میلے میں ملتا چلا گیا اور ڈیرہ ڈیرہ خیمہ خیمہ گونج اٹھا، اور بچہ نے بجلی کی طرح لہرا کر ناز کے انداز میں ایک ذقند بھری، اور بغیر ہی راس کے اشارہ کے اودیس گڑھ کا رخ کر دیا۔

اقبال متین

آخری رات

(زیرِ تکمیل ناول کا ایک باب)

جھیل کا گہرا نیلا پانی بالکل ساکت تھا۔ گولر اور نیم کے درخت جھیل پر اپنا سایہ پھیلائے اس انداز سے کھڑے تھے جیسے الف لیلیٰ کی سوئی ہوئی نیلم پری کی رکھوالی کر رہے ہوں۔ ان تناور درختوں کے پیچھے کچھ ہی فاصلہ پر ریل کی پٹری صاف چمک رہی تھی۔ بہت دور سے جھینگر کی آواز آ رہی تھی۔ چاند کبھی سفید بادل کے جزیروں میں چھلانگ لگا کر ڈوب جاتا، کبھی نہا دھو کر اور آب و تاب سے باہر نکلتا۔ کبھی سارا ماحول اداس اداس ہو جاتا، کبھی جگمگا اٹھتا ـــــــ ٹرین دندناتی ہوئی گزر گئی۔ جھیل کے پانی میں سنہری مچھلیاں تڑپ کر چھپ گئیں۔ چنگھاڑتی ہوئی ریل گاڑی سے ماحول کا سکوت ٹوٹ ٹوٹ گیا ـــــــ گولر کے درخت سے کوئی پرندہ گھبرا کر اڑا اور پر پھڑپھڑا کر پھر وہیں بیٹھ رہا ـــــــ چاند بلند ہونے لگا یہاں تک کر رکھوالی کرنے والے دیوؤں سے بچ کر اس کی شوخ زرتار نگاہیں سوئی ہوئی نیلم پری کو گدگدانے لگیں ـــــــ نیلم پری نے جیسے آنکھیں کھول دیں اور دیکھتے دیکھتے چاند پوری شان کے ساتھ جھیل کے سینے میں سما گیا۔ سائے سمٹ کر پس منظر میں چلے گئے ـــــــ وہ آہستہ سے پٹریوں کے پاس والے نشیبی حصے سے نمودار ہوئے۔ گار کے پتھر پھلانگ کر جھیل میں آ رہے۔ جھیل کی پرسکون سطح پر لہریں اٹھیں۔ چاند ہلکورے لے کر پانی میں حل ہونے لگا۔

ایک نے دوسرے سے کہا "کیسا عجیب منظر ہے۔" دوسرے نے جواب دیا "لیکن ہمیں اس منظر سے کیا لینا" ـــــــ پہلے نے مٹھی بھینچ کر کہا "کیوں نہیں دوست! یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ جھیل، کل یہ سب ہمارے تصرف میں رہیں گے۔ ... کون ہے جو ہمارے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے۔ کون ہے جو ہمارے سینوں میں کھولتی ہوئی جوالا کو سرد کر سکے ـــــــ تم ہراساں تو نہیں ہو گئے دوست؟ نہیں تو" دوسرے نے سینہ تان کر اٹل ارادے کا اظہار کیا اور اس کی آنکھوں میں اس کی مقتول ماں کی خون میں تھڑی ہوئی لاش پھر گئی ـــــــ تو سنو! پہلا کہنے لگا ـــــــ ہمیں اس مقدس خون کی لاج رکھنی ہے جسے ہم نے اپنے ماتھے پر لگایا تھا ـــــــ ہمیں اپنی ماں کو جواب دینا ہے ـــــــ اچھا تو میں جاتا ہوں۔ تمہیں بھی جلد سے جلد پہنچنا چاہیے، سمجھے۔

گار کے پتھر جنبش میں آئے۔ پاس کی نشیبی جھاڑیوں کے جھنڈ میں کوئی خرگوش لپک کر دبک گیا۔ جھیل کی پرسکون سطح پر پھر ہلچل پیدا ہوئی اب کے ان لہروں پر چاند کی سنہری کشتی ڈانواں ڈول ہو گئی کہ وہ آسمان پر تیرتی ہوئی بادل کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا ـــــــ وہ نظروں سے بچتے گولر اور نیم کے درختوں کے پیچھے بیچ میں راستہ تلاش کرنے لگا ـــــــ اس کو اپنے بالکل پاس ہی وہ کچی سیڑھیاں دکھائی دیں جو نیا پل تعمیر کرنے والے مزدوروں نے آہن و فولاد کے دیو سے بچنے کے لئے بنا رکھی تھیں۔ وہ تیز تیز قدم رکھتا جھیل سے باہر آ پہنچا ـــــــ چاند گویا اس کو راستہ دکھلانے کے لئے برفانی پہاڑی کی چوٹی پر نمودار ہو گیا ـــــــ اس نے جھیل کی شفاف سطح پر نظر ڈالی۔ یک لخت اسے ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان کا ایک ٹکڑا زمین پر گر گیا ہے۔ وہی نیلی سطح، وہی تیرتے ہوئے روئی کے تودوں پر دمکتا ہوا چاند ـــــــ لیکن اس چاند کے چاروں ایک زخمی لاش تیر رہی تھی ـــــــ وہ ٹھٹکا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

چاند پوری طرح نکھر آیا تھا جیسے زمین کی ڈھکی چھپی گندگیوں کو بہت بے دردی سے عریاں کرنا چاہتا ہو ــــ منظر کا روان ایک پل میں خوفناک و بھیانک حقیقتوں سے ٹکرا کر بے رونق اور بھیانک ہو گیا ۔ ــ سطح پر پڑی ہوئی زخمی لاش دیکھتے ہوئے چاند کو منہ چڑا رہا تھا جھیل کی سطح پر تیرنے والا چاند جیسے زمین کی گندگیوں پر اچھل رہا تھا ۔ دودھ کی طرح چھٹکی ہوئی چاندنی مدھم پڑ رہی تھی ۔ ایک کالا ابر کا ٹکڑا چاند کو دبوچ رہا تھا یا شاید چاند خود ہی منہ چھپا رہا تھا ــ اس نے چلتے چلتے لاش پر آخری نگاہ ڈالی ــــ میں عورت ہوں ــ عورت جس نے تمھیں جنم دیا ــ عورت جو [illegible] ہے ــــ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں ۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے ــ ہم وعدہ کرتے ہیں ماں !! ۔ اور وہ تیز تیز بڑھنے لگا

اس کے قدموں میں بچھی ہوئی پگڈنڈی [illegible] سرسبز کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی نہ جانے کہاں تک چلی گئی تھی ۔ چھوٹے چھوٹے پودے نئی فصل کی آنے والی خوشیوں کی بشارت دے رہے تھے ۔ وہ گردوپیش پر اچٹتی نگاہیں ڈالتا تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا ۔ قدموں کے نیچے تیزی سے سرکتی ہوئی پگڈنڈی پر نظریں جمائے وہ اپنے اطراف سے قریب قریب بے نیاز ہو گیا تھا ــ خود اس کے اپنے ذہن میں اس وقت ایک دنیا سمائی ہوئی تھی ۔ ایک ایسی دنیا جو اسی دنیا کے بطن سے جنم لے رہی تھی ۔ نئے رنگ روپ سے نکھری، پیاری، پیاری، [illegible] اور غلاظتوں سے پاک ۔

خیالات کا ایک اتھاہ سمندر اس کے ذہن میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا ۔ کبھی ایک موج ابھرتی کبھی دوسری اس کے پیچھے دوڑتی ۔ ماضی، حال، مستقبل، تینوں اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئے ۔ وہ سوچ رہا تھا چند ہی دنوں میں ہماری زندگیوں میں کتنا بین فرق پڑ گیا ہے ۔ آج سے چند ماہ پیشتر وہ گاؤں کے ٹھاکر اور بنیئے کے خلاف ایک لفظ سوچنا بھی اپنی موت کے مترادف سمجھتا تھا ۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اس کا احساس تک نہ تھا کہ ان کی کنگالی اور افلاس کے ذمہ دار یہی سیٹھ ساہوکار اور دیسمکھ ہیں ۔ ان کا روان [illegible] دن بدن دیسمکھ کے قرض میں بندھ رہا تھا لیکن اپنی آدھی جائداد دے دینے پر بھی انھیں کچھ سوجھتا نہ تھا کہ کس طرح ان دیا ہو جھگڑا اور احسان چکائے ــــ دیسمکھ کے گماشتہ نے اس کے بوڑھے باپ کو ہر پھر کر ریلیوں کی جوڑی تک ہتھیا لی تھی لیکن وہ تنومند گبرو نوجوان ہو کر بھی اپنے پٹتے ہوئے باپ کی کچھ مدد نہ کر پایا تھا ۔ ایسے کتنے غریب تھے جو ان ٹھیکہ داروں کے مظالم کو کولھو کے بیلوں کی طرح سر جھکائے سہے جاتے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ ایسے میں دیس کے ان سپوتوں نے انھیں اپنی اہمیت سے آگاہ کیا ۔ ۔ انھیں بتا کر بونے والے کاٹیں گے بھی، جو ہاتھ درختوں میں پھل پھول لا سکتے ہیں وہی ہاتھ ان پھلوں کو توڑ بھی سکتے ہیں ــــ کتنی پیاری تھی وہ آواز ــــ جانا پہچانا ــ آتمائیں مسکرائیں ــــ آشائیں کسمسانے لگیں ــــ آنسوؤں سے گدلائی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی ۔ وہ دست و بازو جو اپنی قوت سے واقف نہ تھے انھیں اپنے بل بوتے کا احساس ہوا ــــ تاریکی میں ایک شمع جلی اور مظلوم انسانیت اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر کے اٹھی ــــ کچلے ہوئے، دبے ہوئے آدم، آہن و فولاد کے دیو بن گئے ــــ نیا سورج چمکا ۔ ــ عوام مورچہ بن گئے اور ظالم اور سب خس و خاشاک بہہ گئے ۔ کوئی نہ ٹک سکا اس محاذ کے آگے ۔

سرسراتی پگڈنڈی پر جھکے ہوئے دھان کے پودے اس کے قدموں کو چومتے ہوئے پیچھے چلے گئے ۔ اس کی نظریں دور تک لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو چومنے لگیں ــــ جیسے کوئی فنکار اپنے آرٹ کا کمال دیکھ رہا ہو، جیسے کوئی خالق اپنی تخلیق پر پھولا نہ سمائے ۔ غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ کھیت کی طرف اٹھ گئے ــ کومل پودوں کو ہاتھ سے تھپکتے ہوئے اس نے عجیب لذت محسوس کی، ایسی لذت جو نہ کبھی سے ابدی بھی ــــ اس کی آنکھوں میں وہ مناظر گھومنے لگے جب پہلے پہل اس نے اور اس کے گاؤں والوں نے اپنے کھیت جوتے تھے ۔ نہ لٹیروں کا کھٹکا تھا نہ رہزنوں کا خوف ۔ نہ اس نام نہاد عوامی حکومت کے ہتھکنڈوں کا ڈر تھا جو جمہوریت کے پردے میں فاقہ زدہ کسانوں سے ہر سال لیوی وصول کرتی ہے ۔ جو کم داموں پر غلہ ہی نہیں خریدتی بلکہ ان کی زندگی خرید لیتی ہے ــــ نہ ان ظالم جاگیرداروں اور دیسمکھوں کی پروا تھی جو خدا اور بھگوان کے نام پر قرض دیتے اور بعد میں خون پسینہ ایک کرا کر [illegible]

تھے ـــ وہ پوری طرح آشنا تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ پودے جھوم جھام کر اٹھیں گے۔ پروائی سنکے گی، پون بہکے گی اور دھان ان پودے متوارے بڑھتے جائیں گے ـــ بڑھتے جائیں گے ـــ اور پھر کھلیان ہمارا ہوگا ـــ ٹرق، اس کا ایک پاؤں ذرا سا نشیب میں بہتے ہوئے نالے میں اتر گیا۔ پگڈنڈی ایک گھنے ببول کے پیڑ کے پاس ختم ہوگئی۔ اس کو کچھ ہی فاصلے پر ایک دو دیئے ٹمٹماتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پھر فوراً ہی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں لیکن ان آوازوں سے وہ سمجھ گیا کہ گاؤں اتنا قریب نہیں ہے جتنا کہ وہ ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ کر خیال کر رہا ہے ـــ وہ رکا، کہیں میں بھٹک تو نہیں گیا ہوں؟ ـــ پھر وہ سوچنے لگا۔ اس نے خود ہی اپنی تردید کی۔ یکایک اس کی آنکھیں کھل گئیں ـــ اوہ۔ اور اس نے راستہ متعین کر لیا۔ کھیتوں میں سانپ کی طرح لہراتی ہوئی پگڈنڈی اب ختم ہوگئی تھی۔ وہ ایک سخت لیکن واضح لکیر پر چل رہا تھا ـــ اطراف بنجر زمین تھی۔ دودھ کی طرح پھیلی ہوئی چاندنی میں اس کی نگاہیں دور دور تک دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی اس کے پاؤں کے نیچے رینگتی ہوئی واضح لکیر پیپل کے گھنے سایوں میں چھپ جاتی تو اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور بہت احتیاط سے راستہ دیکھنے لگتا۔ جب اس کے پاؤں رتیلے نالے میں جنبش آنے لگے تو اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ گاؤں بہت قریب تھا۔ روشنیاں زیادہ واضح ہوگئی تھیں۔ کتوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور وہ اطمینان سے گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا ہر قدم فاتحانہ انداز سے اٹھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس بیتے ہوئے واقعے کو دیکھ رہی تھیں جب کہ اسی گاؤں میں گاؤں والوں کی زندگی دوبھر ہوگئی تھی ـــ اسی گاؤں میں چاوڑی کے پیچھے وہ موت کے منہ سے بچ نکلا تھا ـــ اسی گاؤں میں اس کے ساس اور سسر رہتے تھے۔ وہ بیمار ساس کی عیادت کے لئے آیا تھا کہ اسی رات مسلح رضاکاروں نے گاؤں پر ہلہ بول دیا ـــ اسے گاؤں والوں سے یہ معلوم کر کے کتنا تعجب ہوا تھا کہ ان حملہ کرنے والوں میں خود اسی گاؤں کے لوگ بھی شریک تھے۔ جنھوں نے ایک ساتھ زندگیاں بتائیں۔ ایک ساتھ آفتیں سہیں آج وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دیکھتے کے دیکھتے سارے کا سارا گاؤں لوٹ لیا گیا تھا۔ عجیب حالت تھی، چیخ پکار، سراسیمگی۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ بندوقوں کی آوازوں میں بھاگ بھی سکیں ـــ اور پھر جب ہم نے یہ دیکھا تھا کہ گاؤں کا دیشمکھ خود نشہ میں دھت لٹیروں کی مانند گھر کر رہا ہے، تو کیا حالت ہوئی تھی ہماری ـــ کوڑیوں کے مول ہماری زمینوں کو گروی رکھنے والا، ہمارے مویشیوں کو چند ٹکوں میں خرید کر ہم پر احسان کرنے کی دھمکی دینے والا، ہمیں اپنا بچہ، اپنے بچے کہہ کر خون پینے والا، آج ہماری آبرو بھی لوٹ رہا تھا۔ گھر گھر پھر کر نشاندہی کر رہا تھا ـــ نہ جانے کب سے واسو کی عورت پر نظر تھی اس کی۔ اور واسو غریب جان دیدی اس نے اس کے لئے۔ بیاہ سے پہلے ہی ان دونوں کی پریم بھری کہانیاں مشہور تھیں۔ اور واقعی بڑا سندر جوڑا تھا دونوں کا۔ آس پاس کے گاؤں میں مشہور تھے دونوں۔ کتنا دل والا تھا واسو۔ آج ہوتا تو ہمارا لیڈر ہوتا۔ لاٹھی لے کر بپھرے ہوئے شیر کی طرح ٹوٹ پڑا تھا لٹیروں کے مجمع پر۔ اور جب وہ گرا، کتنی بھیانک تھیں اس کی چیخیں۔ سرجو اس کا نام لے کر چلا رہی تھی، وہ سرجو کو پکارتا دم توڑ رہا تھا۔

ـــ اور وہ بدکار دیشمکھ جیسے بھاڑ پھاڑ کر ہنس رہا تھا۔ کیسی دل ہلا دینے والی تھیں ایسے ہی وقت میں یہ سب چیخیں ـــ اور عین اسی وقت گاؤں کے چاروں کونوں سے گولیاں چلی تھیں ـــ چاروں سمتوں سے مزدوروں اور کسانوں کی جے جے کار سنائی دے رہی تھی۔ لٹیرے رضاکار ہکے بکے اپنے محسن دیشمکھ کا منہ تک رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مرگھٹ میں عفریت کانا پھوسی کر رہے ہوں۔ ایک سناٹا گاؤں پر چھا گیا تھا۔ چاروں طرف سے تھوڑی تھوڑی دیر کو فیر ہوتے تھے۔ اس سناٹے کو صرف سرجو کی بھیانک چیخیں توڑ رہی تھیں، کہیں کہیں کوئی کتا رو دیتا۔ یکایک سرجو چھلانگ مار کر واسو کی لاش سے لپٹ گئی تھی۔ رضاکاروں نے بڑھ کر دیشمکھ کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا تھا اور وہ بھاگ رہے تھے۔ وہ شاید سمجھتے تھے کہ اسی دیشمکھ نے یہ چال چلی تھی۔ لوٹا ہوا مال جہاں کا وہیں پڑا تھا۔ مار دھاڑ اور فائرنگ کی آوازوں میں سرجو کے قہقہوں کی آوازیں بھی مل گئی تھیں۔ وہ دیشمکھ کے خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو ٹھوکریں مار کر خوب قہقہے لگاتی۔ بے طرح ہنسی۔ اف کیسی چڑیل دکھائی

دے رہی تھی وہ، اس کی سندرتا نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی ـــــ سارے گاؤں میں صرف وہی دکھی دکھائی دیتی تھی۔ سب کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے تھے۔ گاؤں بھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ انصاف اور حق کے لئے لڑنے والے سپاہی مسرتوں کی ایک دنیا لئے ہوئے گاؤں میں داخل ہو گئے تھے۔ سبھوں نے خوشی خوشی ان کا سواگت کیا تھا۔ دوسری صبح جب پربتوں کی چوٹیوں سے سورج نے جھانکا تھا تو کھیت ہمارے تھے۔ دھرتی ماتا ہماری تھی۔ گاؤں میں ہل چلانے والے ڈھور ڈنگر ہمارے اپنے تھے ـــــ لہلہاتے کھیتوں پر اپنی جوت لٹانے والا سورج بھی اپنا دکھائی دیتا تھا۔ شام ہوئی تو آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے، ستاروں کے جھرمٹ میں دمکتا ہوا چندرما سب کے سب ہماری اپنی ملکیت تھے۔ دیکھنے کو یہی چاند تارے پہلے بھی تھے۔ یہی سورج پہلے بھی نکلتا تھا۔ یہی پون پہلے بھی چلتی تھی۔ کھیت پہلے بھی لہلہاتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ سب ہمارے ہو کر بھی ہمارے نہ تھے۔ پسینہ ٹپکا کر گیلی کی ہوئی مٹی سے جب ہم اناج اگاتے تو یہ اناج لگان اور بیوپار کے بہانے نظام کے سونے اور چاندی کی ڈھیریوں میں تبدیل ہو جاتا۔ جو بچ رہتا وہ نظام کے پالے ہوئے بھیڑیوں کے دوزخ کا ایندھن بن جاتا اور ہم بھوکے رہتے ـــ اور اب۔ اب وہی گاؤں، وہی دھرتی سب کچھ وہی ہوتے ہوئے بھی ہر شئے نئی ہوگئی تھی۔ ہمیں اپنی قوت کا اندازہ ہو چلا تھا۔ ہم نے اپنا محاذ بنا لیا تھا۔ متحدہ محاذ۔ غاصب قوتوں کا قبرستان لٹیروں کا مرگھٹ۔ اور اس نئے محاذ پر بچہ، جوان، بوڑھا، مرد، عورت سب کے سب ڈٹ گئے تھے ـــــ ایک گیدڑ جھاڑی سے نکل کر بھاگا ـــــ ہو ہو۔ اور وہ چونکا ـــ اس کی اندرونی دنیا بیرونی دنیا سے ٹکرا گئی۔ اثنائے راہ میں وہ نہ جانے ان باتوں کے علاوہ بھی اور کیا کیا سوچتا رہا۔ بہرحال وہ اتنا غرق تھا کہ گاؤں کے اس قدر قریب پہنچ جانے پر بھی اس کا خیال تھا کہ اس کو اور کچھ فاصلہ طے کرنا ہے۔ وہ گاؤں میں داخل ہو گیا تو فصیل کے باہر ایک کیچڑ کے گڑھے میں دو تین سور چپڑ چپڑ کر رہے تھے۔ فصیل کے دروازے پر ڈٹے ہوئے سورما نے للکارا اور اس نے اسے مطمئن کر دیا اور آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دوسرے ساتھی سے بالکل قریب ہو گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ اس نے ہدایت کی بموجب ساری تفصیلات کہہ دیں۔ پھر گھڑے سے پانی انڈیلا، غٹاغٹ پیا، اور اس سے پہلے کہ گاؤں کے سورما مسلح ہو کر روانہ ہو جائیں، وہ خود قریب کے دوسرے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

اسے ممکنہ حد تک جلد ولاس پور پہنچنا تھا۔ ولاس پور پنچایتی حدود سے کافی دور تھا۔ اس لئے اس کو اور اس کے چند متصلہ دیہاتوں کو نظام کے جرگوں سے محفوظ رکھنے میں ذرا مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا تھا۔ وہاں کی جنتا لال بانڈے والوں کی ہمدرد تھی۔ عوامی لیڈر بار بار وہاں کے لوگوں سے مل کر ان کو اپنا ہم خیال بنا چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ولاس پور میں ہندو اور مسلمان شیر و شکر کی طرح رہتے تھے، اور ان کے اسی ایکے کی بنا پر رضاکار اس گاؤں کی طرف رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ گو ولاس پور سے قریب ایک گاؤں میں ان بھیڑیوں نے قتل و غارت گری مچا رکھی تھی لیکن وہ ادھر نظریں نہ اٹھا سکتے تھے۔ ولاس پور ان دیہاتوں میں گنا جاتا تھا جو خوش نصیبی سے پکی سڑک کے کنارے آباد تھے۔ اور اب یہی خوش نصیبی ان گاؤں والوں کی سب سے بڑی بدقسمتی بن گئی تھی ـــ گو دوسرے دیہاتوں کی بہ نسبت ولاس پور کا فاصلہ D.T.R کی پکی سڑک سے کچھ زیادہ ہی تھا لیکن وہ پھر بھی انھیں دیہاتوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ضلع کے ہزاروں اندرونی دیہاتوں میں پنچایتی نظام قائم ہو گیا تھا۔ عوامی سیلاب تعلقوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر ضلعوں کے مستقر تک پہنچ گیا تھا اور جگہ جگہ جاگیرداری نظام کا جنازہ نکل رہا تھا۔

تو آج ولاس پور کے عوام کو ایک دوسرے ہی خطرے کا سامنا کرنا تھا۔ ہندوستان کی حیدرآباد پر پولیس کارروائی ختم ہو چکی تھی ـــــ بظاہر رات گذر چکی تھی لیکن دور دور تک سحر کے آثار مفقود تھے۔ ہر طرف ایک قیامت برپا تھی۔ لیکن قتل و غارت گری کے اس ہنگامے اور اس گھٹا ٹوپ اندھا دھند اندھیارے میں عوام کی ایک بڑی تعداد نے زندگی کی راہیں متعین کر لی تھیں اور اب کوئی قوت ایسی نہ تھی جو انھیں اس راستے سے ہٹا سکے ـــــ اس نے دل ہی دل میں بے پناہ خوشی محسوس کی کہ وہ بھی انھیں میں ـــ

لیک ہے۔ اس کی باچھیں خود بخود پھیل گئیں ـــــ غیر شعوری طور پر اس نے اپنے بازوؤں کو زور سے حرکت دی۔ اسے ایسا محسوس
ہوا گویا اس کے بازو گوشت پوست کے نہیں بلکہ فولاد سے بنے ہیں ـــــ اور اس نے ایک لمبا ڈگ بھرتے ہوئے چاند کی طرف
دیکھا جس کے دمکتے چہرے پر بادل کا ایک چھوٹا سا سیاہ ٹکڑا کالک پوت رہا تھا۔ کبھی فاصلے پر ذرا سے نشیب میں بہتے ہوئے پانی کی
رو پہلی لکیر اس کو یوں معلوم دے رہی تھی جیسے زمین پر کہکشاں اتر آئی ہو۔ جس نالے کو وہ پھلانگ رہا تھا وہی نالا چکر کاٹ کر پھر اس
کے سامنے آ پہنچا تھا۔ نالے کے کنارے کنارے کیچڑ میں دبے ہوئے مینڈک اپنی بے سری رٹ لگائے ہوئے تھے۔ قریب کے
پھولوں، پتوں اور پودوں میں دبے ہوئے حشرات الارض نئی نئی آوازوں سے ایک پورا آرکسٹرا بنانے میں مصروف تھے جیسے ان کی اس
چیخ پکار کے بغیر دنیا کا نظم ہی برقرار نہیں رہ سکتا تھا ـــــ اس کے ریت پر قدم رکھتے ہی کنارے پر دبے ہوئے مینڈک بڑق
بڑق کرتے پانی میں پھلانگ گئے ـــــ یکایک اس کے کانوں میں اس کی اپنی کیسری کے میٹھے قہقہے گونج گئے ـــــ واقعی کتنا رس ہے
اس کے قہقہوں میں۔ وہ سوچنے لگا، جب وہ ہنستی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی صراحی اوندھی ہو گئی ہو اور
بہتے ہوئے پانی کا سہانا پن اس کے ہونٹوں پر پھیل گیا ـــــ کیا جانے تکلیف بڑھ گئی ہو کیسری کی، لیکن اسے اطمینان تھا کہ گاؤں کی
سب بڑی بوڑھیاں جمع ہو گئی ہوں گی ـــــ فتح داد دائی جنانے کے فن میں ماہر ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا
سر فخر سے اونچا ہو گیا ہے ـــــ وہ ایک بہت اہم کام پر جا رہا ہے، دیس کی مائیں اور بہنیں اس کی منتظر ہیں، ایسے میں وہ کیسری کے
پریم میں اپنے فرائض کو کیسے بھلا سکتا تھا اور اس کو یوں محسوس ہوا جیسے کیسری کے پیٹ کا بچہ اپنے باپ کی اس حرکت پر گھمنڈ سے
تالیاں بجا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں کامریڈ شاموں کا دس سالہ ننھا پھرنے لگا ـــــ کتنا پیارا اور کیسا سمجھدار ہے وہ ـــــ رضاکاروں
کے خلاف جب بچوں میں مظاہرہ کیا گیا تھا تو کتنی دلچسپ اور معصوم حرکت کی تھی اس نے۔ دو جتھے بنائے گئے تھے۔ ایک جنتا راج بنا
رہا تھا دوسرا جاگیرداری کے پروردہ مسلم اقتدار کی رجعت پسند رٹ لگا رہا تھا ـــــ بچوں کو جب سمجھا دیا گیا کہ رضاکار نظام اور
اس کے سرمایہ پرست پٹھوؤں کے لئے عوام کا خون چوستے ہیں تو سارے کے سارے بچے ہم ہو گئے تھے ـــــ کوئی بھی رضاکاروں
کی صف میں لڑنے کے لئے تیار نہ تھا ـــــ سب چیخ رہے تھے۔ ہم جنتا راج چاہتے ہیں۔ ہم عوام کے سپاہی ہیں۔ ہم نظام اور
اس کے درندوں کا سر کچل دیں گے ـــــ رضاکار مردہ باد۔ جنتا راج امر رہے ـــــ بروقت تمام ان میں سے چند کو سمجھا کر رضاکاروں
کی ٹکڑی بنائی گئی تھی ـــــ وہ بچے کتنے دکھی اور مغموم دکھائی دے رہے تھے جنہیں رضاکاروں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ عوامی جتھے
کا ہر چہرہ خوشی و مسرت سے تمتما رہا تھا۔ سبھوں کو اس کا احساس تھا کہ وہ حق پر ہیں، وہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا ہیں ـــــ اور
دوسرے سوچ رہے تھے کہ وہ آدمیت کا گھن ہیں۔ عوام کے جائز مطالبات کے خلاف وہ حکومت کا، اس کھوکھلی مشنری کی بقا کے لئے
لڑ رہے ہیں جو زندگی کی نعمتوں سے انسانیت کو متمتع ہونے نہیں دیتا ـــــ جب لڑائی شروع ہوئی تو ان بچوں میں وہ جوش و خروش
نہ تھا جو مجاہدوں کے خلاف تھے ـــــ وہ سوچنے لگا صحیح تربیت اور سچا احساس آدمی میں کتنے جوہر پیدا کر دیتا ہے ـــــ اور
پھر اس کی آنکھوں کے آگے اس کا پسندیدہ منظر مجسم ہو گیا۔ کامریڈ شاموں کے ننھے نے لپک کر اپنے سے بڑے لڑکے کو پچھاڑ دیا
تھا۔ اس کے غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ بغیر کسی رحم و کرم کے نیچے پڑے ہوئے لڑکے کے نرخرے کو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر پوری
قوت سے دبا رہا تھا ـــــ سبھوں نے اسے کھینچ کر جدا کرتے ہوئے سمجھایا کہ یہ لڑکا بھی تو اپنا ہی ہے ـــــ شاموں نے اسے اپنے سینے
سے لگاتے ہوئے کہا "دیکھو وہ تو تمہارا دوست ہے، عوامی فوج کا جری سپاہی" ـــــ تب کہیں ننھا چونکا کہ وہ مظاہرہ تھا ورنہ
وہ سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ وہ ننھے کی اس دلچسپ حرکت کے محرکات پر غور کر رہا تھا۔ صحیح تربیت اور صحیح تعلیم کے کیسے اچھے اثرات
مرتب ہو سکتے ہیں ـــــ ننھے کا جوش و خروش اور اس کے مخالف لڑکے کی ہراسانی۔ ایک اپنے ضمیر کی آواز سے مطمئن تھا اور دوسرا
ـــــ اونگھتا ہوا ایک درخت پوری طرح سے روشنی میں نمایاں ہو کر فوری دھندلا گیا، اور ساتھ ہی اس سرعت سے اپنے خیالات

کے دھندلکوں سے باہر آکر وہ بھی پھر انھیں دھندلکوں میں جا بسا ـــــ کاش غلط قیادت دیس کے نوجوانوں کو تباہ نہ کر دیتی ـــــ کاش یہی قومیں کسی صحیح تحریک کا ساتھ دے سکتیں ـــــ آدم کے یہی بیٹے جو آدمیت کا مستقبل بن سکتے تھے اب مستقبل کی پیشانی کا داغ بن گئے ہیں۔ ایسا داغ جو مٹ نہیں سکتا ـــــ فراٹے بھرتی ہوئی ایک موٹر اس کے آگے سے نکل گئی ـــــ وہ جیسے کچی نیند سے چونک اٹھا ـــــ پچھلی منزل کے اتنا قریب آ گیا ہوں میں۔ نہ جانے اپنے خیالات میں کب تک مگن رہتا ـــــ ہو سکتا تھا کہ یہ موٹر اور کچھ دیر سے گزرتی تو ٹکرا ہی جاتا میں ـــــ اور وہ سوچنے لگا "ایسی فالتو موت ہوتی۔ اس کے پاس موت کے بھی افادی اور غیر افادی دو پہلو تھے ـــــ اس نے ذہن نے پھر ایک سلسلہ قائم کر لیا ـــــ موت سے میں نہیں ڈرتا لیکن ایسی فالتو موت کے لئے بھی تیار نہیں ہوں جو نہ صرف غیر افادی ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ـــــ ٹکرا کر مر جانا۔ کنویں میں گر کر مر جانا' اتفاقی حادثہ ہی سہی لیکن اس سے انسان کی عقل کے دیوالیہ پن کا ثبوت ملتا ہے ـــــ موت تو وہ ہے جو حقائق کے لئے باطل سے لڑتے ہوئے واقع ہو ـــــ جیسے اب میں خود چل کر موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ یہ موت میرے لئے طمیں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ـــــ شوکتی اور سنسناتی ہوئی گولیوں کا مجھے خوف نہیں۔ زمین کے پرخچے اڑا دینے والے بموں کا مجھے پروا نہیں ـــــ میں شوکتی ہوئی گولیوں میں مسکراؤں گا ـــــ پھٹتے ہوئے بموں میں ہنسوں گا۔ واقعی یک وقتہ موت کتنی بھیانک اور کتنی حسین ہے۔ جب آدمی کو اس کا یقین ہو جائے کہ وہ مرنے کے بعد بھی نہیں مرے گا تو موت کتنی معمولی چیز ہو جاتی ہے' کتنی ادنیٰ ـــــ اس کو یکایک خیال گزرا۔ موت پر مسکرانے کا سلیقہ اس نے اپنی ایک امریکن لڑکی سے سیکھا تھا ـــــ وہ کہتی تھی کہ کل مریں گے ہم مر اے تو کیا ایک اتفاقی' ایک رقص کرتی زندگی سے بہودہ ہوگا' اور آج اس زندگی کی پذیرائی میں ہم مر بھی جائیں تو کیا ہم امر ہو جائیں گے ـــــ سوچو کہ دن ہو گئے وہ جب انسان کو موت صرف ایک بار آئے گی۔ وہ اور حرف زندگی میں بہتر ہے یا نہیں مرے ـــــ بھوک کی ٹیس سے روٹی نہ ملنا بدن سکڑتا ہے کپڑا نصیب نہیں ـــــ اور جانتے ہو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ موت اتنی سو وہ بھی افتیار میں نہیں ـــــ کیا یہ موت سے بہتر ہے؟ کیا موت اس زندگی سے زیادہ بھیانک کوئی شئے ہے!! ـــــ تم جانتے ہو! جب میں یہ سوچتی ہوں تو مجھے اطراف سے نکلتی ہوئی گولیوں کی آواز یوں معلوم دیتی ہے جیسے میرا محبوب مجھے بلا رہا! قبرستان میں کھڑا ہوا ہے مجھے شوشو کر کے بلا رہا ہے۔ تم ہی بتاؤ اب میرے لئے اس قبرستان میں کون سا خوف رہ جاتا ہے جو میں جھجک جاؤں ـــــ وہ سوچنے لگا' واقعی مستقبل ہا ہر جو ہے اور ہم حال کے قبرستان سے نہیں ڈر سکتے ـــــ اور پھر جس تحریک کو ایسی بیٹیاں ملیں وہ ظلم واستبداد سے نہیں رک سکتی ـــــ ہر جھانسی کی رانی' ہر رضیہ سلطانہ' ہر شخص ٹیپو' ہر شخص ارجن ـــــ جب عالم یہ ہو تو موت بیچاری انھیں ملاتے شرمائے گی نہیں تو کیا! ـــــ ٹن ٹن' پاس ہی گھاس کی گری سے آواز آئی۔

وہ اپنی داخلی دنیا سے باہر نکل آیا۔ اس کو پہلی بار اپنے خیالات کے منقطع ہونے کا افسوس ہوا ـــــ وہ اپنے خیالات کی بہتی ندی میں بہت شانت ہو کر بہا جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سلسلے کی ساری جزئیات اور تاویلات پر غور کرتا رہے۔ آج اس کو موت خوفناک طاقت اپنے آگے حقیر اور بے بس معلوم دے رہی تھی۔ وہ کسی قیمت پر اس لذت کو کھونے کے لئے تیار نہیں تھا جو ارجن اور ٹیپو کی صف میں اس کو لا کھڑا کرنے کے بعد اسے حاصل ہو رہی تھی۔ اس نے بادل ناخواستہ گھاس کی گری کی طرف دیکھا۔ کوئی مشٹنڈا بیل گھاس کھینچ کھینچ کر کھا رہا تھا۔ بعض وقت جمی ہوئی گھاس تودے سے نکل نہ پاتی تو تھوتھنی گھسیڑ کر پھسکڑے بھرتا اور گھنٹیاں بج اٹھتیں مشٹنڈے بیل سے ہٹ کر اس کی نظر ایک بڑے چمڑے کے ڈول پر پڑی جو "موٹ" کی چرخی سے نیچے لٹک رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت بڑی چمگادڑ جھول رہی ہو ـــــ باولی ایک کانٹی لگے احاطے کے بیچوں بیچ واقع تھی۔ باولی کے اطراف پرانے سرکے کھنڈروں کی ڈھیریاں پھیلی ہوئی تھیں ـــــ وہ سمجھ گیا یہ جام خاں نقشبندی کا احاطہ ہے ـــــ جام خاں نقش بندی ایک بڑے ولی اللہ کے گھرانے سے ہے۔ اس کے جد اعلیٰ کے متعلق مشہور تھا کہ بڑے جلالی بزرگ گزرے ہیں۔ بعض لوگ تو یہ کہتے جام خاں کو کوئی نقصان پہنچاتا تو اس کے جد اعلیٰ اس کو تباہ کر کے ہی رہتے تھے۔ جام خاں خود اتنا ظالم تھا کہ اس کے ظلم کی

ں اس کے جدِ اعلیٰ کی بھی پگڑیاں اُکھاڑ پھینکنے میں دریغ نہ کرتے لیکن ان میں بہت سارے ایسے بھی تھے جو نہ صرف جام خاں سے خوف کھاتے بلکہ اس کی قدر کرتے اور بعض کھاتے پیتے گھرانے تو جام خاں کے نئے گھر کے لئے غلہ فراہم کر دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ جام خاں غلہ قبول نہ کرے تو نئے سال کی فصلیں خراب ہونا لازمی ہے۔ بہت کم ایسا موقع آتا تھا کہ جام خاں غلہ قبول نہ کرے اور فصلیں خراب ہوں۔ زمینداروں کا زور بڑھا تو جام خاں نقشبندی بھی ان کا سپہ سالار بن بیٹھا تھا اب کیا تھا گویا اس کے مظالم کو قانونی حیثیت سے قبول کر لیا گیا تھا چنانچہ سپہ سالار بنتے ہی اس نے پہلا کام اپنے جدِ اعلیٰ کی خوشنودی کے لئے یہ کیا کہ گاؤں والوں پر زیادتی کر کے عرس کے لئے چندہ جمع کرنے لگا۔ اس نے تلواروں اور بندوقوں کی دھونس پر کتنا چندہ جمع کیا تھا۔ یہ تو وہ خود جانتا تھا یا اس کے جدِ اعلیٰ جانتے تھے ـ نہ جانے جام خاں کہاں چلا گیا اب۔ سنتے ہیں پارٹی کا قبضہ ہو جانے پر وہ رات بھر اپنے ساتھیوں سمیت کسی سوکھے کنویں میں چھپا رہا ـــــ. جام خاں کے احاطے کو چھوڑ کر وہ اب سیدھی گاؤں میں داخل ہونے والی چوڑی سڑک پر چل رہا تھا ـــــ سڑک کی دونوں جانب گل مہوے اور لال بادام کے تناور درخت کھڑے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں پھیل کر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں جیسے بوڑھے کاہی سر جوڑے ہوئے کسی گہری سازش میں مصروف ہوں ـــــ انھیں درختوں کے گھنے سایوں سے سڑک کافی تاریک سی ہو گئی تھی لیکن پتوں سے چھن چھن کر جھل مل کرتی روشنی کے دھبے یوں معلوم ہو رہے تھے جیسے سیاہ چادر پر ٹیڑھی میڑھی اشرفیاں بکھر گئی ہوں اور وہ ان اشرفیوں کو روندتا گذر رہا تھا ـــــ درختوں کے اس سلسلے کے ختم ہوتے ہی وہ گاؤں میں پہنچنے والا تھا۔ وہ کئی بار اس راستے سے گذر چکا تھا اس لئے اسے معلوم تھا کہ سڑک پر سایہ کئے ہوئے ان بوڑھے جادوگروں کا ساتھ گاؤں کے صدر دروازے تک رہے گا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس کو اچھی طرح ... یاں کر لی تھیں ـــــ وہ اب بوڑھے کمہار کے مکان کے قریب پہنچ گیا تھا جہاں سے گاؤں شروع ہو جاتا تھا۔ چکوے کی جوڑی کسی درخت سے مسلسل چیخ پکار رہی تھی ـــ کبھی یہی چکوا چکوی اس کی زندگی میں بہت اہمیت حاصل کر گئے تھے۔ وہ کبھی کسی کام پر ہوتا اور چکوا چکوی کا چیخ اٹھتے تو اس کو یقین ہو جاتا کہ اب اس کا کام نہیں بنے گا ـــ کئی بار تو ایسا بھی ہوا تھا کہ چکوا چکوی کی آواز سے گھبرا کر اس نے اپنا کام ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ جب کبھی کسی ضروری کام پر جاتا تو درختوں کے نیچے سے اس طرح پاؤں دبا کر گذرتا گویا رکھوالے کی چوری سے درخت کے قیمتی پھل توڑنا چاہتا ہو لیکن اس کے دل کی تہوں میں وہی ایک خوف برقرار ہوتا ـــ اگر چکوا پکار اٹھے تو اگر چکوی بول اٹھے تو ـــ اور اگر بالفرض کوئی چکوے کی جوڑی چیخ پکار اٹھی تو جیسے اس پر بجلی گر پڑتی اور اس کی حالت اس ڈاکو کے مشابہ ہو جاتی جو اپنی دانشمندی سے لوہے کی تجوری میں محفوظ رکھی ہوئی نقدی، کو اپنی گرفت میں لانے لیکن اس کا ہاتھ تجوری میں پھنس جائے اور گھنٹی بج اٹھے ـــــ وہ ہنس پڑا واقعی کیسے کیسے بیہودہ واہموں کا شکار تھا وہ۔ کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ انسان کی زندگی میں جنگل کے حقیر پرندوں کا اتنا دخل ہو جائے۔ لیکن اس کو یوں معلوم ہوا جیسے وہ خود کو جھٹلا رہا ہے اور یہ خوف اب بھی اس کے دل و دماغ کے تاریک گوشوں میں کہیں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ جھلا اٹھا نئے محاذ کے ارجن اور بھیم اس پر تہزا کرنے لگے ـــ چیخ پکار کی آواز کی طرف نظریں پھیر کر، وہ پھر ایک بار مسکرایا۔ داہنے کندھے سے بندوق بائیں کندھے پر لٹکا لی اور بھول گیا کہ بندوق کی نالی اس کے زخم سے مس ہو رہی ہے جو ابھی پوری طرح مندمل نہ ہونے پایا تھا۔

گاؤں میں داخل ہو کر جب وہ لمباڑوں کے "ٹانڈے" میں پہنچا تو وہیں پر گاؤں کے بہت سارے لوگ جمع تھے۔ سب کے سب بڈھے بڈھے نئے مورچہ کی باتیں کر رہے تھے۔ ٹانڈے کے کتے ادھر ادھر بیٹھے کان کھڑے کر کے اس طرح یہ باتیں سننے میں مصروف تھے جیسے وہ بھی متحد ہو رہے ہوں ـــــ منگو بائی کا ساجا شاید سو سو کر اٹھ بیٹھا تھا۔ جب سے اس کی ماں لمباڑنوں کا بھدا، بدوضع لباس چھوڑ کر ساری پہننے لگی تھی۔ ساجا بہت خوش خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ماں جب کبھی اس کو اپنی آغوش میں کھینچتی تھی تو اس کے ننگے بدن پر ماں کی چولی اور لہنگے پر ٹکے ہوئے کانچ اور شیشے کے ٹکڑے بری طرح چبھتے تھے۔ جب سے ان کا گاؤں لال بولٹے والوں کے قبضے میں آیا تھا ساجا بہت خوش تھا ـــ اس کی خوشی ایک نہیں کئی اسباب پر مبنی تھی۔ وہ سب سے زیادہ خوش تو اس بات پر تھا کہ اگلے دنوں کی طرح

سونے لگنے پر اس کی ماں جھڑکتی اور پیٹتی نہ تھی ۔۔۔ اس کے ننگے بدن پر کمر کی ڈوری اور گلے تعویذ کے بجائے قمیص اور چڈی بہار دکھانے لگے تھے۔ اس کی ماں اس کو اپنے گود میں کھینچتی تو وہ خوشی سے اس کی آغوش میں دبک جاتا کیونکہ ایک تو خود اس کے بدن پر کپڑے تھے اور پھر اس کی ماں نے بھی وہ بھاری بھرکم "جھا" اپنے بدن سے اتار پھینکا تھا جس سے سر چھو دل ہی دل میں خوف کھاتا تھا ۔۔۔ اور پھر یہ خوشی اس کے لئے کچھ کم نہ تھی کہ اس کی ماں کے لہنگے اور چولی میں ٹنکے ہوئے سارے چمکدار سے کانچ اور پیتل کے گول گول ٹکڑے۔ کافور اور لاکھ کے دو دو تین تین انگل چوڑی اور موٹی موٹی چوڑیاں سب کی سب اس کو کھیلنے کے لئے مل گئے تھے ۔۔۔ اس کے ہاں ندے کے جتنے ساتھی تھے سب کے پاس کھیلنے کے لئے ایسی بہت ساری اشیا جمع ہو گئی تھیں۔ ایک چیز اور بھی تھی اس کا باپ اس کی ماں سے ان دنوں بات بات پر ٹھٹھول کرنے لگا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح آنکھیں نکال کر اس کو گالیاں نہیں دیا کرتا اور اسی وجہ سے اس کی ماں بھی اسے بہت پچکارنے لگی تھی ۔۔۔ ورنہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو ٹھیک کیا اور وہ دوڑی ساجا کی گدی پر ٹھوکا لگانے۔ بہرحال وہ سوچتا ہوگا کہ جب سے ان "گانٹھوں" سے میل ملاپ ہوا ہے کچھ اور ہی لیل و نہار ہیں ۔۔۔ اس روز جس وقت وہ پہنچا ہے ساجا بھی ماں کی گود میں بیٹھا اپنے باپ کے اس طرح بدل جانے، اختیار بند ہو کر نکل پڑنے سے متعلق سوالات کر رہا تھا اور وہ ساجا کی باتوں کا جواب دینے میں منہمک تھی ۔۔۔ ساجا کے ایک سوال کے جواب میں وہ کہہ رہی تھی کہ ۔۔۔ "ان بڈیا سرکار بھی جنتا کو نہیں چاہتی۔ یوں کہنے کو تو وہ جنتا کو جھوٹ موٹ یقین دلاتی ہے اور ہم بھی جنتا کی سیوا کرنے ہی کو آزادی سمجھتی ہے لیکن اس کی زبان پر کچھ ہے تو اس کے من میں کچھ اور ہی بسا ہے ۔۔۔ اگر یہ سرکار جنتا راج چاہتی تو ہمیں کھیلنے کے لئے اپنی سب ہاکی دل بچھ دیتی" ۔۔۔ "ٹھیک بولتی ہے اماں۔" وہ پکار اٹھا۔ "میں آج ہی تمام ساتھیوں کو جمع کر کے یہ سب باتیں بتلا دوں گا" ۔۔۔ سجو بائی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے جوش میں اچھلتے ہوئے ساجا کو اپنی گود سے الگ کرتے ہوئے پیٹھ کو آہستہ سے سہلایا۔ ۔۔۔ ساجا شریر نظروں سے دیکھتا ہوا چلایا "اماں تو جلدی کیوں نہیں دیتی جلدی سے، میں اس کو ساتھ لے کر جنتا راج کے لئے لڑوں گا ماں" ۔۔۔ اور سب کے سب ہنسنے لگے۔

۔۔۔ اس کو اکیلا ہی لوٹنا پڑا کیونکہ یہاں اس سے پہلے ہی مدد جا چکی تھی۔ پکی سڑک سے قریبی گاؤں کو لوٹ مار سے بچانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ضلع کے اندرونی گاؤں مضبوط مورچہ بندی کی وجہ سے محفوظ تھے۔ فوجی بھیڑیئے لال دھرتی میں داخل ہوتے ہوئے گھبراتے تھے۔ سڑک والے گاؤں کی حفاظت بہت ضروری تھی ۔۔۔ فوج کے ضلع میں داخل ہوتے ہی عوام دشمن عناصر نے لوٹ مار شروع کر دی تھی ۔۔۔ اس نے سیدھا دلاس پور کا رخ کیا۔ دلاس پور کے قریبی گاؤں لٹ چکے تھے ۔۔۔ وہ تیز تیز چلنے لگا۔ اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا۔ صرف ایک ہی خیال اس کے ذہن پر ہتوڑے چلا رہا تھا ۔۔۔ تیز چلنا چاہیے ۔۔۔ اور تیز ۔۔۔ اور تیز۔

اور اب سحر قریب تھی لیکن ابھی تک عوامی سپاہی گاؤں کو گھیرے ہوئے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ خطرہ دور ہو گیا تھا۔ لٹیرے بھاگ نکلے تھے۔ بچے ماؤں کے سینے سے لگے مزے سے گھروں میں سو رہے تھے۔ بوڑھیاں شاید نوجوانوں کو دعائیں دے رہی تھیں۔ ۔۔۔ اور بربریت انسانیت سے ٹکرا کر پسپا ہو چکی تھی۔ مسجد اور مندر ایک نئے انسان کو جنم دے رہے تھے جو نہ مسلمان تھا نہ ہندو بلکہ صرف انسان۔ خداؤں اور دیوتاؤں سے بزرگ و برتر انسان۔ فرشتوں سے بلند تر مخلوق، اعلیٰ، ارفع، افضل، اشرف۔

●

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

فیض احمد فیض

علی اختر

دل جمع نہ ہو تو شادمانی کیسی　　ساغر ہو تہی تو خوش بیانی کیسی
احساس کے ہمراہ ہے جینے کا مزا　　احساس نہ ہو تو زندگانی کیسی

ہر رند تہی جام نظر آتا ہے　　ہر بزم میں کہرام نظر آتا ہے
جب فکر نہ ہو محرمِ اسرارِ حیات　　آغاز میں انجام نظر آتا ہے

خود اپنے ہی سائے سے بھڑک جاتے ہیں　　جانی ہوئی راہوں سے بھٹک جاتے ہیں
دنیا میں کچھ ایسے بھی ہیں بیگانۂ ہوش　　پیتے نہیں ہر چند بہک جاتے ہیں

بھولی نہیں اب بھی تو انھیں دانشِ خام　　آقا نے سکھائے تھے جو اندازِ خرام
آزادی کی صدیاں تو گذر جانے دو　　آزاد کہیں ہوتے ہیں صدیوں کے غلام

جگن ناتھ آزاد *

اے فصلِ خزاں کی روح! اے جانِ بہار
اے جلوۂ آفتابِ نو! اے شب تار
اے یادِ حبیب! تو کہاں سے آئی
اے خلد بدوش! اے جہنم بہ کنار

کل تک یہ گھٹا سر در برساتی تھی
گردوں سے پیام سرمدی لاتی تھی
آج اس نے شراب بدمزہ کر دی ہے
یہ خود ہی کبھی شراب بن جاتی تھی

ل رگ میں نشہ بن کے مچلنے والے
فاس میں درد بن کے ڈھلنے والے
جا کہ قرار میری نظروں کو نہیں
ے روح میں کروٹیں بدلنے والے

مجھ سے بھی نہ دل کا حال کہنا تیرا
امواجِ غم و درد میں بہنا تیرا
اب تو ہی بتا نگاہ کب تک دیکھے
اس عمر میں یوں اداس رہنا تیرا

جلتی ہوئی آگ میں اترتا ہوں میں
تلوار کی دھار سے گزرتا ہوں میں
اے میری نظر سے دور جانے والے
اس طرح سے تجھ کو یاد کرتا ہوں میں

شعلہ سا ہواؤں میں بھڑکتا ہوگا
احساس شمیم کا پھڑکتا ہوگا
جس وقت تجھے خموش پاتی ہوگی
دل موجِ نسیم کا دھڑکتا ہوگا

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

پیتا ہوں جو مے تو مجھ کو پینے دو ابھی
سب زہر ہیں ایسے پیالے پینے دو ابھی
بیمار ہوں پھر بھی ابھی مرنے کی نہیں
جینا اور جیوں گا مجھ کو جینے دو ابھی

●

باہر سے چھپائے ہوئے اندر ہوں دل کے یہ داغ
لاؤں نہ زباں پر کہ ٹوٹا ہے ایاغ
جو مجھ پہ پڑی ہے اسے لوگ کیا سمجھیں
کیا پائے اندھیروں کے طاقوں پہ چراغ

●

یہ سوچ کے جب جنتِ انساں سے نکلے
چھوڑا ہی کہاں ہے یہ بھی تو ارماں نکلے
جو جام و سبو ساز تھے ان کی مستی پہ
واعظ سے بھی کچھ بڑھ کے وہ ناداں نکلے

●

جن کا نہ کوئی کام نہ کچھ دھندا ہے
شکوہ سبھی اس کا ہے سبھی اس کا ہے
جی چاہتا ہے ان سے یہ پوچھیں کہ حضور
خود آپ نے آئینہ بھی دیکھا ہے

●

باقر مہدی

...لت کا بھی عنوان بدل جاتا ہے
بیزاری کا اک دور نیا آتا ہے
...ب اہل خرد خوش ہیں کہ دیوانہ بھی
محفل میں نئی شمع جلا جاتا ہے

میخانے میں جانے کا یہ ہنگام نہیں
ہنگامہ اٹھانے کا یہ ہنگام نہیں
اس غم کو امیدوں کا جنازہ نہ کہو
اس غم کو مٹانے کا یہ ہنگام نہیں

اک خواب کی تعبیر حقیقت ہی نہ ہو
انداز تغافل میں محبت ہی نہ ہو
خوابوں سے حقیقت کو سمجھنے والو
ممکن ہے تخیل میں صداقت ہی نہ ہو

ہر رات امیدوں کی سحر لاتی ہے
ہر روز محبت کی خبر آتی ہے
انسان کی تقدیر کے مالک سے کہو
اس دور میں تقدیر بدل جاتی ہے

شہاب جعفری

تاریخ کہن کا مر رہا ہے انساں
انساں کی قدر کر رہا ہے انساں
سورج کی طرح پہلوئے گیتی سے شہاب
اک اور نیا ابھر رہا ہے انساں

ہر رند کو شاد کام کر دے ساقی
اک قطرہ بھی ہو تو عام کر دے ساقی
ہم نے تجھے نظم میکدہ سونپا ہے
اک جام کے لاکھ جام کر دے ساقی

لبریز تھا جام صبر، چھلکانا پڑا
ظلمت میں چراغ دل کو جل جانا پڑا
کب تک نہ شور و غم ابھرتا آخر
حالات کی رحمتوں کا گن گانا پڑا

اے حوصلۂ جہد و عمل اور مچل
اے مرحلۂ حیات آنکھیں نہ بدل
اے معرکۂ غم و نشاط اور بھی تیز
اے قافلۂ عمر رواں بڑھتا چل

اس رات کا نشہ چڑھ چلا ہے، چھلکیں
زلفیں تو بکھیر دو کہ دونوں نہ سکیں
دکھڑے تو بہت ہیں دکھ کے دن کاٹنے تک
آؤ بھی کہ دو گھڑی کو لہکیں بہکیں

راس آئی نہ ہمدردوں کی صحبت ہم کو
دنیا سے نہ ہو سکے گی نفرت ہم کو
اتنا کے غموں سے کیسے مر جائیں شہاب
جینے کی پڑی ہوئی ہے عادت ہم کو

بیٹے کی موت

سہیل عظیم آبادی

اعظم خاں جب ستارہ کو ساتھ لے کر خان پورہ پہنچا، تو ہر طرف سنسنی پھیل گئی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہ ہوئی تھی کہ کوئی پٹھان بازار میں بیٹھنے والی رنڈی سے نکاح کرے اور اسے اپنی بیوی بنا کر گھر میں رکھے۔ اگر کبھی کسی نے کسی کم ذات کی عورت سے بیاہ کر بھی لیا تو وہ بیاہتا نہیں بلکہ نکاحی بیوی کہلاتی تھی اور اس کے بال بچے کم ذات سمجھے جاتے تھے۔ خالص پٹھانوں سے الگ رہتے اور عام طور پر اپنے ہی خاندان والوں کی خدمت گاری کرتے تھے۔ لیکن پورے خان پورے میں، جب وہاں کے پٹھانوں کے پاس دولت تھی، تو بھی کسی نے بازار میں بیٹھنے والی رنڈی سے بیاہ نہیں کیا تھا ـــــ جب اعظم خاں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا، تو اس کی ماں دروازے پر ہی ملی۔ اور سلام کے جواب میں اس نے غصے میں کہا۔

"یہ رنڈی بچی میرے گھر میں بہو بن کر نہیں رہ سکتی جہاں سے اسے اٹھا لایا ہے وہیں پہنچا آ۔"

اعظم خاں پہلے ہی جانتا تھا کہ ستارہ سے بیاہ کرنے کا مطلب ایک بڑے طوفان سے مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن اس نے بیاہ کر ہی لیا تھا اور طوفان کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ اس نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی اور بولا

"ماں مجھ سے غلطی ہو ہی چکی ہے، میں تمہیں بعد میں ساری باتیں سمجھا دوں گا......"

لیکن اس کی ماں نے بات بیچ ہی میں کاٹ ڈالی ـــــ "بے شرم کہیں کا۔ ایک تو شہر میں خاندان کا نام اونچا کرتا رہا اور اب اسے گاؤں میں لے آیا۔ لے جا اسے۔ میں گھر میں داخل نہیں ہونے دوں گی۔" اور وہ ستارہ کے ساتھ دروازہ میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ اس کی ماں نے دروازہ بند کر دیا اور اندر سے کنڈی لگا دی اور بولی

"یہ رنڈی بچی اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اسے جہاں سے لایا ہے وہیں چھوڑ آ ـــــ اگر میری بات نہیں مانتا تو جہاں جی میں آئے چلا جا۔ سمجھوں گی کہ ایک لڑائی میں شوہر مارا گیا اور دوسری لڑائی میں بیٹا بھی مر گیا۔ جوانی میں بیوہ ہو کر صبر کیا تھا۔ بڑھاپے میں بے اولاد ہو کر صبر کروں گی......"

اعظم خاں بہت دیر تک ستارہ کو ساتھ لئے دروازہ پر کھڑا رہا اور اندر سے طرح طرح کی آوازیں سنتا رہا جس کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ ستارہ کو ساتھ لے کر اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ اور باہر اس سے ہمدردی کرنے والا تو ایک طرف کوئی بات سننے والا تک نہ تھا۔ سارے رشتہ دار کترائے ہوئے تھے۔ وہ ستارہ کو پہلے ہی ساری باتیں سمجھا چکا تھا۔ لیکن اب اعظم خاں کیا کر سکتا تھا۔ ستارہ اب بازار کی رنڈی نہ تھی۔ اب وہ اس کی بیاہتا بیوی تھی اور اس کی غیرت اسے کس طرح برداشت کرتی کہ جس عورت سے اس نے بیاہ کر لیا ہے اسے پھر ایک بار بازار میں اپنی جوانی بیچنے کے لئے چھوڑ آئے۔ اور اسی عزت کے جذبے سے مجبور ہو کر تو اس نے ستارہ سے بیاہ کیا تھا ـــــ وہ لڑائی کے میدان سے واپس آیا تھا۔ اور کیمپ میں آرام کر رہا تھا۔ ہر روز سیر کے لئے شہر جایا کرتا تھا۔ اور ستارہ کو ایک کوٹھے پر بیٹھا دیکھا کرتا تھا ـــــ جب اسے دیکھتا تو ایسا محسوس کرتا، جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ایک دن جوانی کے جوش میں بہک کر وہ ستارہ کے کوٹھے پر پہنچ گیا ـــــ ستارہ خوب صورت جوان اور ملنسار تھی ـــــ وہ وہاں ٹھہر گیا ـــــ پھر دوسرے اور تیسرے دن ـــــ اور دونوں کا دل مل گیا۔ پھر دونوں گھل مل گئے ـــــ ستارہ نے کوٹھے پر بیٹھنا ہی چھوڑ دیا، اور اعظم خاں کی ہو رہی۔ اعظم خاں نے دیکھا کہ رنڈیوں کے بارے

یں اس نے جتنی باتیں سن رکھی تھیں ان میں سے ایک بھی ستارہ میں نہ تھی ۔۔۔ لیکن پھر بھی اس کے دل میں ستارہ سے بیاہ کرنے کا خیال کبھی نہ آیا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا تھا کہ ایک دن وہ ستارہ کو چھوڑ کر اپنی راہ چلا جائے گا۔ اور پھر نہ جانے اس سے دوبارہ کبھی ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ لیکن ایک دن سارے حالات یکایک بدل گئے۔ وہ آیا تو ستارہ نے اسے بتایا کہ اس کے بچہ ہونے والا ہے۔ اعظم خاں یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ یہ بات اس کے دماغ میں کبھی نہ آئی تھی۔ دو تین دن تک وہ عجیب بے چینی کے عالم میں رہا۔ رہ رہ کر اسے صرف ایک ہی خیال پریشان کرتا تھا۔ اگر ستارہ کے بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا حشر بھی ستارہ کا ہوگا۔ وہ بھی جوان ہو کر رنڈی بنے گی اور پٹھان کی غیرت اسے برداشت کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس کی بیٹی رنڈی بن کر بازار میں بیٹھے اور اپنا روپ اور اپنی جوانی بیچے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے لئے مر جانے کی بات تھی۔ بہت سوچنے کے بعد اسے ایک ہی راہ نظر آئی اور وہ یہ کہ ستارہ سے بیاہ کر لے۔ چنانچہ اس نے ستارہ سے شادی کے لئے کہا' اور اس نے بات مان لی۔ اور نکاح ہو گیا۔

چند دنوں تک تو اس نے کسی طرح وقت کاٹا۔ پھر چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تھا۔ سپاہی کا کیا ٹھکانا' کس دن آگے بڑھ جانے کا حکم آ جائے۔ وہ جانتا تھا کہ ستارہ کو ساتھ لے کر جانے کا مطلب گھر سے باہر تک سے برائی مول لینا ہے۔ وہ ماں کے غصے اور ضدی طبیعت کو جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی ماں اس کی شادی کی بات اپنی بھتیجی سے طے کر چکی ہے۔ اور اسے اس کا بھی غصہ ہوگا۔ لیکن اب اس کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں رہ گئی تھی۔ اسے صرف ایک امید تھی کہ گناہوں کی معافی مانگنے کے بعد ماں کو سمجھائے گا۔ کہ اگر بیٹی ہوتی تو اس کا کیا حشر ہوتا۔ وہ بھی رنڈی بننے پر مجبور ہوتی اور اسے تھوڑی سی امید تھی کہ شاید ماں پر یہ وار چل جائے۔ پھر اگر ماں دو چار دن بھی اُسے گھر میں رہنے دے گی' تو ستارہ کی طبیعت اور عقلمندی سے اسے امید تھی کہ ماں کو خوش کر لے گی اور سارا معاملہ درست ہو جائے گا

لیکن اعظم کی ماں نے اُسے کوئی موقع نہیں دیا۔ ستارہ کا سلام لینا تو ایک طرف اس کی شکل تک نہ دیکھی اور گھر میں بند ہو رہی۔ اور اسے گالیاں اور کوسنے دیتی رہی۔۔۔ گھنٹوں وہ دروازے پر کھڑا رہا لیکن بے نتیجہ۔ اور اسی طرح کئی گھنٹے گزر گئے۔ اعظم خاں نے سمجھ لیا کہ اب گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرنا بیکار ہے تو ستارہ کو ساتھ لے کر گاؤں کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں آیا جسے اس کے باپ نے اس وقت بنایا تھا' جب وہ کھیتی کرتا تھا۔۔۔ اور اس گھر میں بیل باندھے جاتے تھے اور ان کے لئے چارہ رکھا جاتا تھا۔۔۔ لیکن اعظم خاں چھوٹا ہی تھا کہ اس کا باپ پہلی بڑی لڑائی میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا اور ایک لڑائی میں مارا گیا۔ ماں نے بڑی مصیبتوں کا مقابلہ کر کے اس کی پرورش کی۔ پھر اس نے جوان ہو کر کھیتی باڑی کی دیکھ بھال شروع کی اور مکان کی مرمت کرائی ہی تھی کہ دوسری بڑی لڑائی شروع ہو گئی اور وہ خود بھی کئی دوسرے رشتہ دار نوجوانوں کے ساتھ فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اب یہ مکان بس شبنم اور دھوپ سے بچنے کا بہانہ تھا۔

اعظم خاں اسی چھوٹے سے مکان میں ستارہ کو لے کر آیا اور کسی طرح رہنے لگا۔ لیکن ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ اسے زیادہ دنوں تک رہنا بھی نہیں تھا۔ اسے جلد ہی واپس جانا تھا۔ اور رشتہ داروں کا حال تھا کہ کوئی اس سے بات بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے فکر تھی کہ وہ ستارہ کو کس پر چھوڑ کر جائے۔ اس کے پیچھے اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔۔۔ اور اس مقصد کے لئے وہ اپنے ہر رشتہ دار کے پاس گیا' لیکن بے فائدہ۔ آخر رشتہ کے ایک بوڑھے چچا اس کی حالت پر ترس آ گیا اور اس نے ذمہ داری اپنے سر لی وہ بھی اس شرط پر کہ ستارہ رہے اسی گاؤں سے باہر والے مکان میں یعنی پٹھانوں کی آبادی میں نہیں۔۔۔ اعظم خاں کے لئے یہ بھی بہت بڑی مدد تھی۔

وہ پھر روز ماں کے پاس آتا' اور طرح طرح اسے سمجھاتا۔ اپنی غلطی تسلیم کرتا اور معافی مانگتا مگر اس کی ماں کسی طرح نرم نہ ہوئی۔

وہ بس ایک ہی جواب دیتی کہ رنڈی کی بچی پٹھانیوں میں کیسے بیٹھ سکتی ہے اور اسے ڈانٹتی۔ آخر چھٹی ختم ہو گئی اور وہ واپس چلا گیا۔

اعظم خاں کے جانے کے بعد ستارہ کے بچہ پیدا ہوا۔ اس دن اس کی ماں دن بھر گالیاں اور کوسنے دیتی رہی۔ اس نے بھی

سنا کہ ستارہ اور بچے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ لیکن ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کسی آدمی تک کو دیکھنے کے لئے نہیں بھیجا بلکہ بد دعائیں دیتی رہی اور ہر روز بد دعائیں دیتی۔ دو بار اس نے اپنے بھائیوں کو للکارا کہ ستارہ کو مار پیٹ کر گھر سے باہر نکال دیں۔ لیکن اس کے بھائیوں نے انکار کر دیا۔ ایک تو یہ کہ اب ستارہ بہرحال اعظم خاں کی بیوی تھی اور اس کو بے عزت کرنا اعظم خاں کو بے عزت کرنا تھا۔ دوسرے اعظم خاں ترقی کر کے صوبیدار ہو چکا تھا اور وہ جانتے تھے کہ کسی فوجی کی غیر حاضری میں اس کے کسی آدمی سے لڑنا مصیبت مول لینا ہے۔ اس کی ایک رپورٹ بہت کچھ ہنگامے پیدا کر سکتی ہے اور وہ اس کے لئے تیار نہ تھے۔

ایک دن ستارہ نے دل کڑا کر کے کہلا بھیجا کہ وہ صرف سلام کرنے کے لئے آنا چاہتی ہے اور بغیر کوئی جواب پائے برقع اوڑھ کر بیٹے کو گودی میں لئے پہنچ گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید معصوم بچے کو دیکھ کر اس کے دل میں رحم آ جائے لیکن اعظم خاں کی ماں نے اسے منہ تک کا نہ دیکھا۔ بیٹھے بغیر گھر سے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ اس دن ستارہ خوب روئی اور خود اپنی موت کی دعائیں کرتی رہی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب اس کی ساری زندگی روتے اور کڑھتے گزرے گی۔

کافی دنوں سے اعظم خاں کا کوئی خط نہیں آیا تھا اور اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ کہیں پھر لڑائی کے میدان میں چلا گیا ہے اور بس۔ ایک دن ایک خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ برما کے کسی مورچے پہ لڑ رہا ہے ــــ اس کے دو دن بعد ہی ایک سرکاری خط آیا کہ اعظم خاں برما کی ایک لڑائی میں مارا گیا۔ خط میں اس کی بہادری کی بڑی تعریف کی گئی تھی اور اس کی موت پر سرکار نے بہت زیادہ افسوس ظاہر کیا تھا۔

اعظم خاں کی موت کا حال سن کر ستارہ کا جو بھی حال ہوا لیکن اس کی ماں نہ روئی اور نہ چلائی بلکہ ایک لفظ بولی تک نہیں جو اس کے پاس آ کر ہمدردی کرتا، اس کا منہ تکتی رہتی۔ نہ اس کی آنکھوں میں کسی نے آنسو دیکھے اور نہ زبان سے کوئی بات نکلتے سنی۔ البتہ وہ دو تین راتیں بالکل نہ سوئی بلکہ آنگن میں ٹہلتی اور آسمان میں کچھ ڈھونڈتی رہی اور ایک دن دوپہر کے وقت وہ بغیر کسی پردے کے گھر سے نکل پڑی اور بیچ گاؤں سے ہوتی ہوئی اس چھوٹے سے مکان میں پہنچ گئی۔ جہاں ستارہ رہتی تھی۔ پوتے کو گودی میں اٹھا لیا۔ خوب پیار کیا۔ ستارہ کو لپٹا کر خوب روئی دھوئی اور پوتے کو لے کر گھر چلی آئی۔

اعظم خاں کی موت نے اب اس کی ماں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتی۔ کوئی کچھ پوچھتا ہے تو اس کا منہ تکتی رہتی ہے۔ جب ستارہ اسے کھانا لا کر دیتی ہے تو چپ چاپ کھا لیتی ہے اور جب پوتے کو دیکھتی ہے تو اسے پکڑ کر خوب ہنستی ہے ــــ لیکن جب اسے زور کا دورہ پڑتا ہے تو وہ گھر سے نکل جاتی ہے اور خان پورہ کی گلی گلی میں ماری پھرتی ہے اور جو ملتا ہے اس سے کہتی ہے۔

"اپنے بیٹوں کو لڑائی پہ نہ جانے دو ــــ بیٹے کے خون اور ہڈی کی قیمت نہ کھاؤ۔ جوانی میں بیٹے کو موت کے منہ میں نہ جانے دو......"

اور کبھی کبھی اس طرح بولنے لگتی ہے جیسے وہ ہزاروں ہزار کے مجمع کو مخاطب کر کے تقریر کر رہی ہو ــــ

"دیکھو لوگو! میں جوانی میں بیوہ ہوئی اور بڑھاپے میں جوان بیٹا کھو بیٹھی یہ لڑائی ہے۔ لڑائی میں اپنے لڑکوں کو مت جانے دو۔ یہ بڑی لعنت ہے۔ نہ جانے کتنے لاکھوں گھر بے چراغ کر چکی ہے......"

اعظم خاں کی ماں جس کی پچاس سال تک کسی نے پرچھائیں تک نہ دیکھی تھی اب گاؤں میں ماری پھرتی ہے۔ لوگ اس کی حالت دیکھتے اور افسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ چیخنے لگتی ہے ــــ

"میرا شوہر واپس کرو۔ میرا بیٹا مجھے واپس دو ــــ"

بیٹے کی موت نے بے چاری کا دماغ کر دیا ہے۔

مہندر ناتھ

سندھیا

سندھیا سیدھی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور اس نے کاغذ، قلم اور دوات کی فرمائش کی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالے بغیر اسے کاغذ دیا۔ دوات دی اور ساتھ ہی قلم بھی۔ وہ ان چیزوں کو لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے میلے سے بلاوز میں سے ایک کاغذ نکالا اور اس کاغذ کو سامنے رکھ کر وہ ایک نئے کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔

شاید وہ کسی کو خط لکھ رہی تھی۔ اور جانے کیا لکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو مشغول رکھنے کے لئے حجامت کا سامان نکالا۔ گلاس میں پانی ڈالا۔ اور حجامت کرنے لگا۔ حجامت کرتے کرتے مجھے خیال آیا کہ سندھیا سے پوچھ لوں کہ وہ کس کو خط لکھ رہی ہے۔ لیکن پوچھنے سے کیا فائدہ لکھنے دو خط اسے۔ لیکن دل نہ مانا۔ اور آخر کار میں نے پوچھ ہی لیا۔

"سندھیا کس کو خط لکھ رہی ہو؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ میں اس کی خاموشی سے بہت کچھ سمجھ گیا۔ کیونکہ اس خاموشی کے ساتھ ایک مسکراہٹ بھی تھی۔ ایک پھیکی۔ بے جان۔ اداس سی مسکراہٹ۔ جب لڑکی سب کچھ کھو بیٹھتی ہے۔ تو وہ اس قسم کی مسکراہٹ سے آپ کا خیر مقدم کرتی ہے۔

میں نے شیو کرتے ہوئے سوچا۔ میں نے سندھیا کو کب دیکھا تھا۔ ہاں یاد آیا۔ دو سال پہلے اور اس کے بعد لگاتار دیکھتا رہا سندھیا۔ اس وقت میرے سامنے بیٹھ کر خط لکھ رہی تھی اور میں نہایت بے فکری سے حجامت کر رہا تھا۔ اس کمرے میں کوئی نہ تھا۔ لیکن اس سے پہلے جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تھی تو میرے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی اور میں اس وقت چاہتا تھا کہ اس وقت کمرے میں کوئی نہ ہو۔ صرف میں اور سندھیا ہوں۔ اور کوئی نہ ہو۔ اور اس وقت اگر میرا نوکر کمرے میں ہوتا تو اسے باہر نکال دیتا۔ آج نوکر بھی کمرے میں نہ تھا۔ لیکن آج کسی کو باہر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس وقت میرے جسم کا ذرہ ذرہ یہی پکارتا تھا کہ کمرے میں میرے اور اس کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ سندھیا کو معلوم تھا کہ میں اسے کتنا چاہتا تھا۔ اور اسے کیوں چاہتا تھا۔ میری محبت کس قسم کی تھی۔ اس میں کتنی گیرائی تھی۔ اس میں کتنی تپش تھی۔ میرے بوسوں میں کتنی آگ تھی۔ اور میں اس کے جوان جسم کے ہر موڑ سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ صرف ایک جسم نہ تھی۔ ایک ناک۔ دو آنکھیں، ایک پیٹ۔ ابھری ہوئی چھاتیاں۔ ٹانگیں۔ بال۔ ہونٹ۔ ان سب کو ملا کر سندھیا کچھ اور بن جاتی تھی۔ وہ لمحہ۔ جب ہونٹ ہونٹ کو چھپا نہیں سکتے۔ جب نگاہ سے نگاہ مل جاتی ہے اور ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ سندھیا ان دنوں بے حد خوبصورت تھی۔

مجھے یاد ہے۔ جب سندھیا جوان ہوئی تو اس کا شباب اپنی تمام رعنائیوں کو لے کر میرے سامنے گھوم گیا۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس قسم کا پھول تھی جو وقت سے پہلے کھل اٹھا ہو۔ میں جو اپنے اندر ضبط کے مادے کو لئے ہوئے اکڑ رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی بے دست و پا ہو گیا اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سب کچھ کہہ دیا اور سندھیا جو دیکھنے میں کافی کالی تھی۔ لیکن جس کا دل کالا نہ تھا۔ گو اس کی ناک کچھ ٹیڑھی تھی۔ خد و خال اتنے دلکش نہ تھے کہ انسان صرف صورت دیکھ کر اس کی طرف کھنچ جاتا۔ لیکن جب وہ مجموعی حیثیت سے آپ کے سامنے آ جاتی تو آپ کے منہ سے "واہ" ضرور نکل جاتی۔ "آپ ضرور کہتے کتنی پیاری صورت

ہے۔ خدا اس کو سدا جوان رکھے۔" سندھیا کو خاموشی سے نفرت تھی۔ لیکن جب کبھی وہ خاموش ہو جاتی تو پھر اس کا جسم بولتا۔ اس وقت تو وہ قیامت برپا کرتی تھی۔ ان دنوں مجھے یوں ہی احساس ہو رہا تھا کہ سندھیا کا حسن دو روزہ حسن ہے۔ یہ حسن جلدی مٹ جائے گا۔ یہ اُبال عارضی ہے۔

میں نے یہ سوچتے سوچتے حجامت ختم کر لی۔ آنکھوں کے سامنے دو سال فلم کی ریل کی طرح گھوم گئے۔ میں نہانے چلا گیا نہا کر واپس آیا، تو سندھیا بدستور خط لکھ رہی تھی۔ اتنے انہماک سے اس نے آج تک کسی کو خط نہ لکھا تھا۔

میں اسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔ اس لئے آپ کو بتا رہا ہوں۔ وہ آج بہت پریشان ہوگی۔ ہائے اس کا کیا حال ہو گیا تھا۔

دو سال کے عرصے میں اس نے چھ عشق کئے۔ کچھ عشق جسم کے تقاضوں کی وجہ سے۔ کچھ اپنی پسند کے۔

"میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ آج کس کو خط لکھ رہی تھی۔"

لیکن میں نے سوال پر زور دینا مناسب نہ سمجھا۔ میری آنکھوں میں آج کچھ نہ تھا۔ کوئی فرمائش نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میرا جذبۂ شوق ایک عرصہ سے مدّھم پڑ گیا تھا۔ وہ باتیں جو میں اس سے کیا کرتا تھا۔ اب وہ سننے سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس کی طرف محض اس کی جسمانی کشش کی وجہ سے آیا تھا اور اب وہ اس کشش کو کھو چکی تھی۔ اسے اس بات کا احساس تھا اور مجھے اس سے زیادہ۔ میں تو اس پجاری کی طرح تھا۔ جو مندر کی خستہ حالت سے آگاہ ہو چکا ہو اور جس کے دل میں مندر کی مورتی کے احترام کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا ہو۔

اتنی جلدی وہ حسن کدھر گیا۔ وہ جوان جسم اتنی جوان راتوں میں کہاں پگھل گیا۔ وہ جوش۔ وہ ولولے۔ وہ نگاہ۔ وہ مسکراہٹ۔ وہ حرارت کہاں چلی گئی۔

سندھیا بیس سال سے ایک کھولی میں رہتی تھی۔ ایک کمرہ۔ تاریک سیاہ۔ وہیں اس نے جنم لیا۔ اسی اندھیرے میں وہ پلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ لیکن وہ کمرہ۔ وہ خوراک۔ وہ بستر۔ وہ بو۔ اس سے الگ نہ ہوئی۔ اس نے بہت کوشش کی۔ لیکن ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ یہ چھ عشق اس کوشش کا نتیجہ تھے کہ کہیں تو راستہ مل جائے گو کچھ عرصے کے لئے۔ ذہنی اور مالی فائدہ ہوا۔ لیکن آخیر میں وہی کھولی۔ وہی اندھیرا وہی تاریکی۔ لیکن اس تاریکی میں وہ ناچنا سیکھ گئی تھی اور یہ ناچ گوپال نے سکھایا تھا۔ جو خود اس فن کا ماہر تھا۔

میں نے اسے کتنی بار ناچتے دیکھا تھا۔ وہ واقعی اپنے فن کی ماہر تھی اور نہ جانے یہ ناچ اس نے کہاں سے سیکھ لیا۔ اسے ناچ سے کیوں اتنا لگاؤ تھا۔ کوئی بھاؤ بتاؤ فوراً اسے اپنے جسم کے اندر جذب کرے گی اور پھر اس خوبصورتی سے اس بھاؤ کو جسم سے نکالے گی کہ دیکھنے والا واقعی عش عش کرنے لگے گا۔ اس حرکت کو دیکھ کر ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے یہ حرکت اس جسم کا ایک حصہ تھی۔

اسے کسی وقت کہو "سندھیا ذرا ناچ کر دکھاؤ" تو وہ فوراً کولھے مٹکاتی ہوئی آپ کے سامنے کھڑی ہو جائے گی اور ترچھی نگاہوں سے آپ کو دیکھنے لگے گی اور آپ اسے دیکھ کر ضرور یہ کہیں گے "کتنی بے شرم عورت ہے۔"

لیکن وہ بے شرم نہ تھی اس کا مجھے پورا علم تھا۔ میں نے بہت سی شرمیلی عورتیں دیکھی ہیں جو کافی بے شرم دکھائی دیتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کے دل میں جو آتا وہ کہہ دیتی۔ اس کا جسم جس کو پکارتا اس سے ضرور ملتی۔ اگر اس حرکت کو بے شرمی کے مترادف سمجھا جائے تو کوئی بات نہیں۔ ایک دن کہنے لگی "مجھ پر ایک سیٹھ مرتا ہے۔ ایک بڑی مل کا مالک ہے اور کہتا ہے اگر تو میری ہو جائے تو سب کچھ تمہارا ہے۔"

"تو تم نے کیا جواب دیا؟"

لیکن اس سیٹھ کی توند بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے مسوڑے پھولے ہوئے تھے اور وہ اتنا موٹا تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے نفرت ہونے لگی۔ نہ جانے عورتیں ایسے مردوں کے ساتھ کیسے سوتی ہیں" اور یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں ایک نفرت کا اظہار تھا۔ وہ ہنستے ہنستے پھر خاموش ہو گئی۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگی۔ "میں نے اس سے کہا پہلے توند گھٹاؤ پھر تشریف لانا۔ نہ توند گھٹے گی۔ نہ وہ میرے پاس دوبارہ اپنی فرمائش لے کر آئے گا" لیکن اس وقت وہ خط لکھ رہی تھی۔ دو سال کے بعد مجھے معلوم تھا کہ ان دنوں اس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ آج کل ناچ کے لئے کوئی بلاوا نہ آتا تھا۔ پہلے بہت آتے تھے۔ پہلے جسم جوان تھا۔ پہلے جسم میں رعنائی تھی کشش تھی۔ پہلے جسم میں بلاوا تھا۔ آنکھوں میں تبسم تھا۔ ہونٹوں پر ہنسی تھی۔

لیکن اس وقت جسم سو رہا تھا اور اس کھیت کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کی ساری فصل کاٹ لی گئی ہو۔ اب کس کو خط لکھ رہی ہو۔ شاید میں سمجھ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔

کیا وہ گوپال کو خط لکھ رہی تھی۔ نہیں گوپال تو مر گیا۔ کیا سریندر کو۔ اس بیچارے نے شادی کر لی۔ کیا سہائے کو۔ اس کا تو جی بھر گیا۔

کیا پران کو۔ اس کی بیوی نے اپنے خاوند کو جوتے مار مار کر درست کر لیا۔

کیا لکھو کو ــــ وہ بیچارا ایرانی کی دوکان پر نوکر تھا۔ اور اسے صبح و شام، اپنی تنخواہ میں سے چائے اور بسکٹ کھلایا کرتا اور کبھی کبھار بریانی بھی۔ سندھیا اکثر لکھو کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔ کبھی کبھار جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں کو چومتی۔ اسے آنکھ مارتی۔ اپنی چائے میں سے ایک دو گھونٹ چائے اسے دیتی اور وہ پی لیتا۔ وہ چائے کے دو گھونٹ پی کر کتنا خوش ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اور ہم نہیں کر سکتے۔ وہ صرف لکھو ہی کر سکتا ہے ــــ لیکن یہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ لکھو نے اپنے دل میں سندھیا کے لئے کیا کچھ نہ سوچا ہوگا۔ شاید ایک جھونپڑا بنایا ہوگا۔ اس میں سندھیا رہے گی۔ وہ رہے گا۔ سندھیا اس کا کھانا پکائے گی۔ وہ کام پر جائے گا۔ سندھیا اس کا انتظار کرے گی۔ وہ کام کرنے کے بعد گھر آئے گا۔ سندھیا کو روپے دے گا۔ سندھیا روپے لے کر مسکرائے گی۔ لیکن وہ دن نہ آیا۔ سندھیا کی مسکراہٹ نے اس کی کتنی راتیں حرام کی ہوں گی۔ کون جانتا ہے۔ اور کون کسی کی پروا کرتا ہے اور سندھیا ایسے چھوکروں کی پروا کرنے لگتی تو گلی کا ہر نوجوان چھوکرا اپنے ہاتھوں پہ دل رکھے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتا۔ اور کہتا "جان من! یہ دل تمہارا ہے"۔ لکھو کو وہ کیا خط لکھے گی۔ لکھو تو خود ان پڑھ تھا۔ لیکن وہ ہے کہاں وہ آج کل یہاں نہ تھا۔ وہ بیچارا کب کا جیل چلا گیا۔ کیونکہ سندھیا کے بسکٹ، اس کی چائے، اس کی بریانی کے دام اتنے چڑھ گئے تھے کہ اگر لکھو ساری عمر ایرانی کی دوکان پہ کام کرتا رہتا۔ جب بھی وہ اس کا قرض نہ چکا سکتا اور جب مالک کا قرض نہ چکا سکا تو اس نے مالک کے ہاں چوری کی۔ سو روپے چرائے۔ پھر پکڑا گیا۔ اور سیدھا جیل بھیج دیا گیا۔

لیکن سندھیا روئی نہیں۔ اب اس کے یہاں ہرگوند آتا تھا۔ ایک کار۔ موٹا تازہ۔ عمر پچاس سال سے اوپر۔

وہ ہرگوند کو بچپن سے جانتی تھی۔ اور ہرگوبند بھی بچپن سے اسے جانتا تھا۔ شروع میں جب سندھیا جوان ہوئی تو سیٹھ نے آنا جانا شروع کیا لیکن سندھیا کے رویے نے اسے مایوس کر دیا۔ یہ سیٹھ بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ گلی، محلوں میں ایسی چھوکریوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اکثر ایک مسکین سی صورت بنائے ہوئے ان گھروں میں گھستے ہیں۔ لڑکی پر آنکھ رکھتے ہیں اور غریب والدین کی سیوا کرتے ہیں۔ پہلے ہمدردی کرتے ہیں پھر وار کرتے ہیں۔

لہٰذا ہری گووند یہی کچھ کرتا۔ جب سندھیا جوان ہوئی تو ہری گووند آیا۔ لیکن سندھیا نے اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ گوپال سے عشق کر رہی تھی۔ اسے گوپال پسند تھا۔

لیکن ہری گووند کے پاس کار تھی اور جب آدمی کے پاس کار ہو تو بیکار وقت زیادہ ہوتا ہے۔

اس لئے بیکار وقت کاٹنے کے لئے وہ سندھیا کے گھر والوں سے ملنے چلا آتا۔ یوں ہی گپیں ہانکتا۔ کبھی کچھ سندھیا کی ان کہی سے جا آ
باپ کو محض ایک دوست کی طرح اس لئے؟ انھیں ایک پڑوسی سمجھ کر اور کچھ نہیں۔ سندھیا سے کوئی عشق نہیں۔ اس کی جوانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بڑ
ایسی کوئی بات نہیں۔ ایسے آدمیوں کو عشق نہیں ہوتا۔ سندھیا جب گھر واپس آتی تو گھر والے ہری گووند کا ذکر کرتے۔ اس کی کار کا قصہ چھیڑتے۔ اس
کوٹھی۔ اس کی مل کا تذکرہ ہوتا۔ سندھیا یہ سن کر ناک بھویں چڑھاتی اور غصے میں آکر کہتی "میرے سامنے کچھ کہے تو اس کا منہ جھلس دوں گی۔ بیگی"
کا منہ جھلسنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ خود اپنا ہی منہ جھلس جاتا ہے۔

اگر گوپال نہ مرتا تو شاید۔ سندھیا کی یہ حالت نہ ہوتی ——

سریندر آیا۔ لیکن اسے ایک اور لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔ سریندر کے جانے کے بعد وہ بے حد روئی۔ اور اتنا روئی کہ اسے
ہری گووند کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ سیٹھ نے سندھیا کو بمبئی کی سیر کرائی۔ پھر اپنی کوٹھی دکھائی۔ اپنا جوہو کا بنگلہ اور سندھیا یہ سب کچھ دیکھ کر بے ہ
ہوئی۔ سیٹھ نے کہا۔ یہ بنگلہ تمہارا ہے اور ایک سو کا نوٹ اس کے بلاؤز میں رکھ دیا۔ اور ساتھ ہی یہ کہا۔ "جب کبھی روپیوں کی ضرورت ہو
سے مانگ لینا"

نہ جانے اس دن سندھیا کو اپنے آپ سے کیوں نفرت ہوگئی۔ "ذلیل کہیں کی۔ روپیوں کے لئے اپنی عزت بیچ دی۔ کوئی اور کا
کسی فیکٹری میں نوکر ہو جاؤ۔ کام نہیں ملتا۔ پھل پھول بیچو۔ اگر کھانا نہیں ملتا تو فاقے کرو۔ عزت کیوں بیچی۔ یہ کام بہت برا ہے۔ روپیوں
اپنا جسم بیچنا انتہائی شرمناک بات ہے۔ تو عورت نہیں۔ تو بازار کی رنڈی ہے"

اور اسے سندھیا کو نفرت تھی۔ اس نام سے۔ اس کام سے۔ پھر اسے بھائے سے محبت ہوگئی۔ بھائے خوبصورت تھا۔ جوا
کچھ کماتا تھا۔ اس لئے دونوں کی کچھ دنوں کے لئے نبھ گئی۔ لیکن چند مہینوں بعد بھائے بیکار ہوگیا۔ بھائے نے نوکری کی تلاش کی لیکن نوکری
بھائے چلا گیا۔ سندھیا دن بدن دبلی ہونے لگی۔

اور جب حسن اپنے پر سمیٹ لے اور شباب اپنے منہ پر بھوک اور بیکاری کی سیاہ چادر اوڑھ لے اور جب موت منہ کھولے
آپ کے سامنے کھڑی ہو جائے تو بڑے بڑے انسانوں کا کلیجہ دہل جاتا ہے اور سندھیا تو ایک عورت تھی۔ اس نے پھر ہری گووند کی ط
رخ کیا۔ ایک خط لکھا۔ کچھ روپے آئے۔

دوبارہ پھر روپے مانگے۔ اس بار روپئے آئے۔ لیکن دیر سے۔ ایک بار سیٹھ آیا اور سندھیا کو لے کر چلا گیا۔

بیچ میں پھر وقفہ۔ نہ سیٹھ ہری گووند آیا۔ نہ روپئے۔ پھر فاقے۔ بیکاری ——

سندھیا نے کام کی تلاش کی۔ کام نہ ملا۔ باپ مر چکا تھا۔ ماں کوئی کام کرنے کے قابل نہ تھی۔ عاشق اپنا اپنا راستہ اختیار ک
تھے اور حسن اور شباب میں اتنی کشش نہ تھی کہ کسی اور کو اپنی طرف راغب کر سکے اور آج سندھیا خط لکھ رہی تھی۔ وہ کیا لکھ رہی تھ
کو خط لکھ رہی تھی۔ وہی روپیوں کی مانگ۔ پاگل تھی سندھیا۔ کیا سیٹھ ہری گووند پھر آئے گا۔ سندھیا پہلے اپنا چہرہ کسی آئینہ میں دیکھ ل
سندھیا نے خط ختم کر لیا تھا۔ اس نے کاغذ کو دوہرا کیا اور پھر اپنے بلاؤز میں ایسے رکھ لیا جیسے وہ کسی تصویر کو لاکٹ میں رکھ رہی ہو
روپیوں کو اپنی تجوری میں رکھتا ہے۔ پھر اس نے جلدی سے چپل پہنی۔ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ جلدی میں وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا
میانے کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا۔ اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا

پیارے ہری گووند!

تم آج کل ادھر نہیں آتے۔ سنا ہے تم ہر روز ادھر سے گزرتے ہو۔ لیکن پھر بھی ادھر نہیں آتے۔ یکایک
یہ تمہیں کیا ہوگیا۔ میں ہر روز تمہارا راستہ دیکھتی ہوں۔ آج تک تمہارے وعدوں پر زندہ ہوں۔ اگر تم روپے نہیں
بھیج سکتے تو ایک بار نہ کر دو۔ میں جانتی ہوں۔ تم آج کل بہت مصروف ہو۔ گھر میں راشن نہیں ہے۔ چھ مہینوں سے

......

مکان کا کرایہ نہیں دیا۔ بجلی کا بل دینا ہے۔ تمہاری قسم میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں۔ تمہارے بھروسے پر زندہ ہوں۔ اب زیادہ پریشان نہ کرو۔ اس میں یہ کہنا چاہتی تھی۔ کہ اگر تم ....

ے خط ختم ہو گیا تھا۔ اسی کو سامنے رکھ کر وہ لکھ رہی تھی۔ میں نے کاغذ کو اچھی طرح دیکھا اور پھر پھاڑ دیا۔ سندھیا چلی گئی تھی۔ اگر وہ یہاں ری تو میں اسے بتا دیتا۔ اب سیٹھ ہرگز نہیں آئے گا۔ وہ کبھی نہیں آئے گا۔ اور اگر تم ـــــ کے بعد تم نے کیا لکھا یہ بتا دو۔ تو شاید تم برا مان ادگی۔ لیکن سندھیا مت جاؤ۔ میں کہتا ہوں مت جاؤ۔ تم تو چلی گئی ہو۔ یہ درست ہے۔ سیٹھ ہرگز نہیں آئے گا۔ کوئی نہیں آئے گا۔ اب ایک یٹھ نہیں آئے گا۔ بہت سے سیٹھ آئیں گے۔ سیٹھ نہیں آئیں گے تم سیٹھوں کے پاس جاؤ گی۔ کوئی کام کر لو۔ نوکری نہیں ملتی۔ ناچو۔ خوب ناچو۔ ل کھول کر ناچو۔ دنیا کے ہر شخص کو اپنی ابھری ہوئی چھاتیاں دکھاؤ۔ اگر چھاتیاں ڈھیلی پڑ گئی ہیں تو ان میں کپاس بھر لو۔ اگر کولھے متناسب نہیں ں تو پیڈ لگا لو۔ اگر گال زرد پڑ گئے ہیں تو سرخی لگا لو۔ اگر ہونٹ پھیکے اور زرد ہو گئے ہیں تو لپ اسٹک لگا لو۔ پھر شاید پیٹ بھر سکو اور کوئی طریقہ یں۔ لیکن مت جاؤ۔ سندھیا یہ راستہ بہت خراب ہے۔ بھوکی رہو۔ فاقے کرو۔ کم کھاؤ۔ مر جاؤ۔ لیکن مت جاؤ۔ تم نے مجھ سے روپے مانگے دتے۔ میں بھی تمہارے جسم کا خریدار تھا۔ تمہارے حسن کا پرستار تھا۔ ہر شخص تم سے الگ ہو گیا ایک ایک کر کے۔ میں جانتا ہوں تم کہاں جاؤ گی۔ ں جانتا ہوں تم چلی گئی ہو۔ میں جانتا ہوں تم چلی جا رہی ہو۔ ادھر اندھیرا ہے۔ آتشک ہے۔ سوزاک ہے! کوڑھ ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں مت جاؤ۔ روکو اپنے آپ کو۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ سندھیا۔ لیکن قدم اٹھ رہے ہیں۔ گھنگرو کی صدا آ رہی ہے۔ میٹھی اور سریلی آواز۔ واہ وا یا ناچتی ہے سندھیا! ـــــ جب پیٹ میں روٹی نہیں ہوتی تو عورت اپنی روح بیچ دیتی ہے۔ ٹھیک ہے سندھیا تم نے اپنی روح بیچ دی اکہ کچھ دن اور زندہ رہ سکو ـــــ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرہ میں کوئی نہ تھا۔ صرف تیز اور تند ہوا کھڑکیوں سے پنا سر پٹخ رہی تھی!

"سرخ سویرا" کا انتخاب
جو
مخدوم
کے نام سے
انجمن ترقی اردو (علیگڑھ)
نے آفسٹ پر نہایت خوبصورت انداز میں شائع
کیا ہے ـــــ قیمت ـــ ۱۲/
ملنے کا پتہ
انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ

دیش میلہ
اقبال متین کی کہانیوں کا زیر طبع مجموعہ
"دیش میلہ" کوئی کارنوال نہیں ہے جہاں زندگی
کی تلخیوں سے بھاگ کر پناہ لے سکیں۔ یہ آپ کے
دیش کے عوام کی رنگ رنگا اور پرہجوم زندگی کا میلہ ہے۔
جس میں
آپ کو سینکڑوں مانوس کردار اپنے اصلی روپ میں ملیں گے

سردار سلیم

دھندلے راستے

"اے رکشا ـــــ رکشا!" اسلم نے رکشا والے کو آواز دی "ملک پیٹ چلو گے میاں؟"

"ہاں صاب چلیں گے" رکشا والا اپنی نقلی ریشم کے رومال سے ہینڈل پہ لگے ہوئے آئینے کو صاف کرتے ہوئے بولا

"کیا لوگے؟"

"دس آنے ہوں گے صاب"

"ارے، دس آنے تو بہت ہیں میاں"

"بس کا کرایہ چھ آنے دیتے نا سرکار، اوپر چار آنے بھی نکو لیو بولے تو کیسا ہوں گا" رکشا والے نے اس طرح یہ دلیل پیش کی جیسے بس سے چار آنے زائد نہ دئیے جائیں تو قیامت ہی آ جائے گی۔

اسلم نے اپنے ذہن میں سوچا کہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے بیچارہ، انسانی محنت اور مشین میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے اور وہ تکرار کئے بغیر رکشا میں بیٹھ گیا۔ رکشا والے نے جلدی سے رومال گلے میں باندھا۔ تہبند کو ذرا ٹھیک کیا۔ آگے رُکے ہوئے ایک ٹھیلے کو ہٹانے کے لئے زور سے آواز لگائی "ہے بنڈی ۔ بڑھا بابا" اور رکشا آگے بڑھنے لگا ..... چھم ..... چھم ..... چھم ..... رکشا کے پہیوں میں بندھے ہوئے گھنگرو ایک چھناکے کے ساتھ بج اٹھے۔ پیڈلوں پر کھڑے ہو کر دو چار بار خوب زور سے انھیں گھمانے کے بعد رکشا والے نے پوچھا "ملک پیٹ میں کس جگہ چلوں مالک؟"

"بھئی، ریلوے برج کے پاس چھوڑ دو"

"جی اچھا سرکار" وہ تیزی سے پیڈل گھماتے ہوئے بولا۔

اسلم نے جیب سے ایک چارمینار سگریٹ نکال کر جلائی اور طویل کش لگایا۔ رکشا تیزی سے ملک پیٹ کے راستے پر دوڑ رہا تھا..... چھم ..... چھم ..... چھم، چھم ..... چھم۔ بازار میں خوب چہل پہل تھی، دفتروں اور مدرسوں کا وقت ختم ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اب شام کی تفریح کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس لئے سمنٹ کی کشادہ سڑکوں پہ آدمیوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ موٹروں کے ہارن، سیکلوں کی گھنٹیاں، رکشاؤں میں بندھے ہوئے گھنگروں کے چھناکے اور انسانوں کی ملی جلی آوازیں ایک اچھے خاصے شور میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اسلم نے سگریٹ کے دو چار کش لینے کے بعد اپنی جیب کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ نوٹوں کا بنڈل بالکل محفوظ تھا۔ گردن کو ذرا سا جھکا کر اس نے اپنے بائیں جانب کے سینے پر نظر ڈالی تو اسے اپنا سینہ بھی کسی نوخیز دوشیزہ کے سینے کی طرح ابھرا ہوا معلوم ہوا۔

"سالے کیشیر کے بچے نے سب دس دس کے نوٹ دے دئیے" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا "اگر دس، دس کے نوٹوں کے بجائے سو سو کے دے دیتا تو اس کا کیا جاتا؟" لیکن اس سے فرق کیا پڑ جاتا وہ رکشا کی پشت سے ٹیک لگائے سوچنے لگا۔ یہی نا کہ اس کا سینہ کسی نوخیز دوشیزہ کے سینے کی طرح ابھرا ہوا نظر نہ آتا، اور بس، رقم تو اتنی ہی رہتی۔ وہی سات سو چالیس روپے چھ آنے ہونے ـــــ اپنی شیروانی کے کھلے ہوئے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اس نے نوٹوں کے بنڈل کو چھو کر دیکھا۔ اس کی انگلیوں نے کسی پرانے اور میلے کاغذ کے بوڑھے نوٹ کے بجائے جوان اور نئے نوٹوں کے کرارے پن کو محسوس کیا لیکن اسے اس لمس سے کوئی خوشی نہ

ہوئی۔ اس سے پہلے اگر کبھی اس کی جیب میں کھڑکھڑاتے ہوئے نوٹ ہوتے اور اس کی انگلیاں ان سے کھیل جاتیں تو اسے بڑی مسرت ہوتی تھی۔ لیکن آج یہ چیز بھی اسے خوش نہ کر سکی — سات سو چالیس روپے چودہ آنے — اس سے پہلے اتنی بڑی رقم ایک ساتھ اس کے پاس کبھی نہ آئی تھی۔ اگر یہ رقم اسے معمولی حالات میں ملتی تو شاید اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا اور وہ طرح طرح کی اسکیمیں اور منصوبے بناتا۔ اسے خرچ کرنے کے نئے نئے ڈھنگ سوچتا۔ لیکن یہ رقم اسے معمولی حالات میں نہیں ملی تھی۔ آج اس کی نوکری ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تھی اور یہ اسی کا معاوضہ تھا جسے لے کر وہ اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔

جس دفتر میں وہ چار سال سے کام کرتا آیا تھا۔ اس سے ڈیڑھ سو آدمیوں کو کام کی کمی کی وجہ سے جواب دے دیا گیا۔ — اکثریت تو ایسے لوگوں کی تھی جنھیں ایک پیسہ بھی معاوضہ نہیں ملا لیکن بیس پچیس ایسے خوش نصیبوں کو جن کی سروس چار سال سے زائد تھی حکومت نے "انعام" دینے کا فیصلہ کیا۔ اسلم بھی انہی خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کا خیال آیا تو اسے ایک قسم کا سکون سا ہو گیا اور وہ سوچنے لگا چلو میں دوسرے لوگوں سے تو کروڑ درجے بہتر حالت میں ہوں، کم از کم کچھ سوچ تو سکتا ہوں، نوکری ملنے تک حلق بھگونے کا سہارا تو ہے۔ ان بیچاروں کو تو اتنا اطمینان بھی نہیں۔ ایک ذرا سے وقفے کے لئے وہ بالکل مطمئن ہو گیا اور اس نے جیب سے پیکٹ نکال کر دوسری سگریٹ سلگائی لیکن پھر خیالات کا ایک ہجوم اس کے دماغ میں گھس آیا۔

اب کیا کیا جائے؟ آئندہ آمدنی کا ذریعہ کیا ہوگا؟ صرف یہی سوال تھا جو اس کے ذہن میں بار بار ابھر رہا تھا۔

اگر وہ تنہا ہوتا تو شاید اسے اتنی فکر نہ ہوتی لیکن ایک اور زندگی بھی اس کی قسمت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی اس لئے کوئی ذریعۂ معاش جلد از جلد ڈھونڈنا بیحد ضروری تھا — گھر پہنچتے پہنچتے اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے کوئی ایسا کام کرنا چاہئے جس سے فوری آمدنی کی توقع ہو ورنہ جو رقم اس کی جیب میں تھی وہ تو اتنی زیادہ نہ تھی کہ وہ ایک طویل عرصے تک آمدنی کی فکر نہ کرتا۔

بیوی کو روپے دیتے ہوئے اس نے تخفیف کی بات سنائی تو اس کا نسوانی دماغ فوراً حرکت میں آیا اور ایک ریڈی میڈ تجویز اس کے سامنے پیش ہو گئی۔ "اخبار میں نوکری کر لو۔"

"واللہ رفو! کیا بات سوچی ہے" اسلم کی ساری پریشانیاں جیسے یکدم غائب ہو گئیں "کیا انعام دیا جائے تجھے، ادھر آ۔"

"ارے بھئی چھوڑو ..... یہ کیا ہے ...... باورچی خانے میں یوسف بیٹھا ہے۔"

"کہاں ہے" اسلم نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ صحن میں چلی گئی۔

"اچھا، یہ بات ہے۔"

"جی!" اس نے دور ہی سے جواب دیا

"خیر ہم باہر جاتے ہیں، پھر ملاقات ہوگی"۔ اسلم نے سینڈل کا تسمہ باندھتے ہوئے کہا اور پھر سیٹی بجاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

اگلی صبح وہ اپنے دوست غلام اکبر سے ملا۔

"یار تیرے اخبار میں نوکری چاہئے" اس نے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد کہا۔

"کیوں، کیا تیری نوکری چھوٹ گئی"

"ہاں بھئی، اسی لئے تو تیرے پاس آیا ہوں"

"دو چار روپے ہیں تیرے پاس؟" غلام اکبر نے انتہائی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ہاں، ہاں ہیں — کیوں، کچھ کام ہے؟"

"نہیں مجھے تو کوئی کام نہیں، لیکن اگر روپے ہیں تو اپنے لئے تھوڑی سی سنکھیا خرید لے"

"سنکھیا"

غلام اکبر کی اجڑی اجڑی ویران سی آنکھیں ایک لمحے کے لئے چمک اٹھیں۔

"مجھے پتہ نہیں پیارے، جرنلزم کیا چیز ہے، اب مجھی کو دیکھو، دس برس سے قلم گھس رہا ہوں، سات رات بھر جاگتا ہوں، اپنے اِنٹی سے زیادہ کام کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود سو سوا سو مہینہ سے زائد نہیں کما سکتا اور وہ بھی دس دس، پانچ پانچ کی شکل میں تے ہیں........"

اسلم نے اخبار کے دفتر تک آتے ہوئے جتنے خیالی محل تعمیر کئے تھے وہ سب کے سب لرزنے لگے ـــــ جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

"ان ہمارے ایڈیٹر صاحب سے تو تم واقف ہے نا" غلام اکبر رکے بغیر کہے جا رہا تھا "یہ حضرت جو بڑے اصول پرست اور محنتی خیالات رکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ ایڈیٹوریل اسٹاف تو ایک طرف رہا کاتبوں تک کی محنت کا معاوضہ مہینوں نہیں دیتے۔ خود بہترین کھانے، بہترین پہنتے ہیں، دو سو روپے کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں اور اگر اخبار کا کوئی ملازم دس پانچ لینے بھی کسی شدید ضرورت سے مانگے تو صاف ہاتھ اٹھا لیں گے ـــــ تجھے شاید معلوم ہوا ابھی دو مہینے قبل ہندوستان کے ایک بڑے مشہور شاعر یہاں آئے ہوئے تھے۔ ہمارے ایڈیٹر صاحب نے اپنے نومولود بچے کا بپتسمہ ان کے ہاتھوں کروایا۔ یعنی جس طرح عیسائیوں کا کوئی پادری بچے کے جسم پر مقدس پانی چھڑک کر اسے پاک کرتا اور اس کا نام رکھتا ہے اسی طرح ہمارے ایڈیٹر صاحب کے بچے کے حلق میں پہلی بار ایک مشہور شاعر نے جان ہیگ یا جانی واکر کے چند قطرے ٹپکائے اور تو جانتا ہے اس تقریب پر کتنے روپے صرف ہوئے۔ اخبار کے پورے اسٹاف کی دو مہینے کی تنخواہ! ـــــ دو مہینے سے اخبار کے کسی ملازم کو تنخواہ نہیں ملی اس واسطے کہ ایڈیٹر صاحب کو اپنے بچے کا بپتسمہ کروانا تھا ـــــ جرنلزم میں کیوں آتا ہے یار، کوئی اور کام کر۔"

"مگر کوئی تو اخبار ایسا ہوگا جہاں پابندی سے تنخواہ ملتی ہو؟" اس نے اپنے لرزتے ہوئے محلوں کو سنبھالنے کی ایک آخری کوشش کی۔

"ہاں ہاں ہے کیوں نہیں، لیکن وہاں نوکری کہاں!"

اسلم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سارے خیالی محل دھڑام سے زمین پر آگئے ـــــ تھکے تھکے، بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وہ گھر واپس آگیا۔

بیوی کے ایوریڈی دماغ نے فوراً دوسری تجویز پیش کر دی "تیل نمک وغیرہ کی دوکان کر لو۔"

"جی، کیا فرمایا آپ نے؟" غصے کی حالت میں وہ ہمیشہ ایک دوسرے کو آپ ہی سے مخاطب کرتے تھے۔

"یعنی، یہی کہہ رہی ہوں کہ تیل نمک وغیرہ کی دوکان کر لو ورنہ دو تین روپے کی آمدنی تو ہو جائے گی۔"

"بجا ارشاد، اب یہی باقی رہ گیا ہے کہ آپ کے لئے بنیوں کی طرح تیل اور نمک بیچیں۔"

"تو اس میں ہرج کیا ہے۔ اب یہ برابر کے مکان والی خالہ کے شوہر کو دیکھو۔ ایم۔ اے پاس ہیں لیکن دفتر کے بعد شام میں دوکان بھی کرتے ہیں مگر بالکل نہیں شرماتے اور شرمائیں بھی کیوں، کچھ چوری ڈاکیتی تو نہیں کرتے، محنت کرتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کو پالتے ہیں۔ ایک تمہیں میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو دوکانداری کو اتنی ذلیل چیز سمجھ رہے ہو۔"

اسلم کی طبیعت کچھ جھنجھلا سی گئی تھی۔ وہ صرف اسی قدر کہہ سکا "مجھ میں سرخاب کے پر لگے ہیں اور نہ میں دوکانداری کو ذلیل پیشہ سمجھتا ہوں لیکن تیل نمک بیچنا میرے بس کا روگ نہیں اس لئے آپ اس گفتگو کو چھوڑ دیجیے۔"

"تو پھر پان کی دوکان لگا لو" بیوی کے دماغ سے ایک اور تجویز ڈھل کر باہر آئی۔

"جی ـــــ!"

سب رس

"بھئی پان کی دو ...."

وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر گھر سے باہر چلا گیا

اسلم نے پان کی دوکان اور تیل نمک کے بیوپار سے پیچھا چھڑانے کے لئے نوکری کی تلاش شروع کر دی اور صبح سے شام تک سرکاری دفتروں اور خانگی کمپنیوں کے چکر کاٹنے لگا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اسے پتہ چل گیا کہ آزاد ہندستان میں بھی نوکریوں کو بڑی حفاظت اور چاؤ سے رکھا جاتا ہے ـــــ سنگین حصاروں اور فولادی دروازوں کے پیچھے، اور ان دروازوں پر ایسے بھاری بھاری تالے ڈالے جاتے ہیں جنھیں صرف رشوت یا سفارش کی طلسمی چابیاں ہی کھول سکتی ہیں۔

ایک مہینے تک نوکری کی تلاش جاری رہی اور "انعام" کی رقم گھٹتی رہی۔ اس عرصے میں رفعت کے دماغ نے بیسیوں اسکیمیں تخلیق کیں لیکن اسے ایک بھی تجویز پسند نہیں آئی اور وہ نوکری کی طرف سے مایوس ہو جانے کے باوجود کچہریوں اور کمپنیوں کے پھیرے کرتا رہا۔

اسلم جب چھوٹا سا تھا تو اسے مختلف قسم کے جانور پالنے کا بیحد شوق تھا اور اس نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں گلہریوں سے لے کر تیتر، بٹیر، کبوتر، خرگوش اور بکریوں تک ہر قسم کے چھوٹے بڑے جانور پالے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کے اس دور اور آج کے درمیان پورے پندرہ سال کی طویل مدت تھی اور ان پندرہ سالوں میں بہت سی ذہنی اور جسمانی تبدیلیاں بھی آ چکی تھیں لیکن یہ طویل مدت بھی غالباً اس کے اس شوق کو پوری طرح نہ مار سکی اور یہ پیار دل کے کسی نامعلوم گوشے میں دبا ہوا خاموشی سے سلگتا رہا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ جب زندگی میں پہلی بار اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا اور نوکری کی ساری امیدیں ٹوٹ گئیں تو اس کے دماغ نے اپنے اس شوق ہی کے ذریعے اپنی معاشی مشکلات کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ـــــ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو اسلم کے ذہن میں یہ خیال آیا ضرور اور اس نے ایک روز یکایک اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "رفو ایک شاندار اسکیم ذہن میں آئی ہے۔"

رفعت دالان میں بیٹھی ہوئی چاول صاف کر رہی تھی۔ وہ سوپ کو نیچے رکھ کر مسکرانے لگی "کہیں اس کپڑے والی اسکیم کی طرح تو نہیں؟" جب کبھی رفعت کپڑوں کی اسکیم والا واقعہ یاد دلاتی تو اسلم ہمیشہ بولتے بولتے رک جاتا اور پھر موڈ کے اعتبار سے یا تو ہنسنے لگتا یا عورتوں کی کم فہمی پر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتا۔

بات صرف اتنی تھی کہ ملازم ہونے سے پہلے اس نے بمبئی سے سستے داموں کپڑے لاکر اپنے عزیز و اقارب اور جان پہچان والوں میں فروخت کرنے کی ایک اسکیم بنائی تھی جو بری طرح ناکام ہوئی۔ کپڑے تو بک گئے لیکن بہت سے عزیزوں سے روپے وصول نہیں ہوئے۔ اس وقت کے بعد سے اسلم کوئی اسکیم بناتا تو رفعت اسے چھیڑنے کے لئے کپڑوں کی اسکیم کا حوالہ ضرور دیتی۔

"ارے نہیں جی۔ فرسٹ کلاس اسکیم ہے" اس نے زندگی میں پہلی بار رفعت کی بات پر دھیان دیئے بغیر جواب دیا۔ "اور پھر اتنے کم روپیوں میں ہونے والی کہ بس پوچھو مت۔"

"اچھا ذرا ہم بھی تو سنیں آپ کی اسکیم"

"مرغیاں پالیں" اسلم نے بہت ہی ڈرامائی انداز میں اپنی اسکیم پیش کی۔

"واہ .... واہ ...... وا" رفعت ہنستی ہنستی دوہری ہو گئی "بھئی کیا شاندار اسکیم ہے .... واہ .. اوہ ... اُف۔"

"ارے .... ارے .... اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے رفعت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی لیکن اسلم کی بات سن کر پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ارے بابا پوری بات تو سنو، خواہ مخواہ ہنسے جا رہی ہو"

"ہاں بھئی، سنائیے" رفعت نے مشکل سے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے آپ ذرا اپنی ہنسی کو روکئے اور دھیان دے کر سنیئے تو پھر عرض کرتا ہوں"۔

اس کے بعد کیا ہونے والا ہے اس کا رفعت کو اچھی طرح اندازہ تھا ـــــ اس کے بعد وہ ایٹھ گا، دو ایک بار کھنکار کر اپنا گلا صاف کرے گا، بالکل اس انداز میں جیسے کسی اہم ترین لکچر کی تیاری کر رہا ہو اور پھر لکچر شروع ہو جائے گا۔

چنانچہ لکچر شروع ہو گیا "آپ جانتی ہیں جناب پولٹری فارمنگ سے امریکہ کو سالانہ کتنی آمدنی ہوتی ہے؟"

"کس سے؟"

"پولٹری فارمنگ، مرغیاں پالنے سے بھئی، جانتی ہیں آپ؟"

"جی ہاں جانتی ہوں" رفعت نے بہت ہی معصوم صورت بنا کر کہا۔

"کیا!"

"دو روپے چار آنے چھ پائی"

"مذاق چھوڑو رفو، ذرا سنجیدگی سے بات سنو"

"اچھا بھئی اب نہیں کرتے مذاق ـــــ بولئے"

اسلم نے بڑے عالمانہ انداز میں بات شروع کی "سالانہ کئی کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے اور آسٹریلیا سے تو سارے یورپ کو انڈے اور مرغیاں جاتی ہیں"۔

"اچھا!"

"ہاں ہاں بھئی میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ مرغیاں پالنا کوئی معمولی کام نہیں ـــــ ماہانہ دو تین سو کی آمدنی تو بالکل معمولی بات ہے"۔

"ارے تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے مرغیاں سونے کا انڈا دیں گی"۔

"بالکل، لیکن یہ مرغیاں تھوڑا ہی ہوتی ہیں وہ ـــــ یہ دیسی مرغیاں پالیں تو تو دیوالیہ نکل جائے"

"پھر کونسی ہوتی ہیں؟"

اسلم نے سر کو ذرا پیچھے ڈھلکا کر آنکھیں بند کر لیں جیسے کوئی بھولا ہوا سبق یاد کر رہا ہو "چلو گنتی جاؤ" اس نے اپنی انگلیوں پر گنتی کرتے ہوئے کہا "برہما، کوچین، پلیمتھ راک، روڈ آئیلینڈ رڈ، ویونڈاٹ، سکس، لگ ہارن، بلیک ماٹارکا، آرپنگٹن۔۔۔"

"ارے بس بابا بس کیجئے میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا"۔

"کیا سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ جو میں نے ابھی کہا ـــــ یہ تو مرغیوں کی مختلف قسمیں ہیں"۔

"تو یہ مرغیاں پالیں گے۔ جناب"

"جی اب آیا۔ دماغ شریف میں"۔

"جی ہاں دماغ شریف میں تو آ گیا مگر اس سے دو تین سو ماہانہ کا فائدہ کیسے ہو گا؟" رفعت نے حیرت سے سوال کیا۔

"بھئی فرض کرو ہم نے پندرہ مرغیاں پالیں۔ پندرہ مرغیوں کا مطلب ہے روزانہ دس انڈے اور فی انڈا ایک روپیہ

کے حساب سے دس روپے روز اس طرح ماہانہ تین سو ہوئے یا نہیں" اسلم نے اسے لاجواب کر دینے کے انداز میں کہا۔

"لیکن ان کا خرچ"

"خرچ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ ہو جائے گا"

"بس!"

"ہاں بس، اور کیا ہوگا۔ چلو ایک سو رکھ لو، پھر بھی دو تین سو بچتے ہیں"

"لیکن روپے میں انڈا کون خریدتا ہے؟"

"روپے میں! ـــــ اجی جناب چھ، چھ روپے میں بھی انڈا بکتا ہے"

سوپ کو دوبارہ اٹھا کر رفعت اس طرح چاولوں سے کنکریاں چننے میں مصروف ہو گئی تھی جیسے بات بالکل ختم ہو گئی ہو مگر ...لم کا جواب سن کر اس کا ہاتھ کنکریاں چنتے چنتے یکایک رک گیا اور وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکی۔ اسلم اپنی کامیابی پر مسکرا ...ے بولا "خیر اب اس بحث کو چھوڑو، میں شام میں آتے ہوئے ایک کتاب لیتا آؤں گا اس وقت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا"

"مگر ......"

"نا بس اب چھوڑو، شام میں بات کریں گے"

شام میں وہ ایک چھوڑ تین تین کتابیں اپنے ساتھ لیتا آیا۔ ایک کتاب میں مختلف قسم کی مرغیوں کی اتنی پیاری پیاری تصویریں ...یں کہ انھیں دیکھ کر تو رفعت کا دل بھی مچل گیا "یعنی ہم تو یہ مرغیاں پالیں گے" اس نے صبح کی ساری مخالفت کا خیال کئے بغیر ایک ...طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہیں جناب بارڈ پلیمتھ راک، ان کا رنگ سرمئی ہوتا ہے اور ہر ایک پر کی نوک بالکل سیاہ ...ا کی وجہ سے سارے جسم پر یہ حسین سیاہ دائرے سے بن جاتے ہیں" اسلم نے اپنی معلومات کی دھونس جمائی۔

"کیا نام ہے ان کا؟"

"بارڈ پلیمتھ راک"

"تو بس پھر یہی پالیں" رفعت نے اس انداز میں کہا جیسے صرف نام ہی پر مرغیاں پالنے یا نہ پالنے کا انحصار ہو۔

"ہاں یہ بھی پال سکتے ہیں لیکن اور دیکھو، اور بہت سی تصویریں ہیں"

تصویریں ایک سے ایک حسین تھیں۔ کہیں کوئی شب رنگ مرغ تھا۔ رات کی تاریکی سے بھی زیادہ سیاہ پر، سرخ کلغی، سفید کا... ...ر آنکھیں، سچ مچ میں اتنا حسن اور بانکپن کہ نظریں تصویر سے ہٹانا مشکل ہو جائے اور کہیں ہلکے زرد رنگ کا کوئی جوڑا تھا۔ بال ... ...نے ملائم اور ریشمی جیسے دھنکی ہوئی روئی کو بڑی نفاست کے ساتھ سارے جسم پر لپیٹ دیا گیا ہو، کلغی انتہائی سرخ اور چھوٹی سی ...ندھی ہوئی، پاؤں زرد زرد پروں سے ڈھکے ہوئے، چھوٹی سی سرخ چونچ اور کھڑے ہونے کے انداز میں اتنی دلکشی اور طرحداری ...ھ کر بے اختیار پیار آنے لگے ـــــ رفعت سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مرغیاں بھی اس قدر حسین ہو سکتی ہیں۔ اسے اس وقت بھی یقین ...آ رہا تھا اس لئے اس نے پوچھا "ان کے رنگ اصلی ہیں نا، یا صرف تصویر میں ایسے نظر آتے ہیں؟"

"یکدم اصلی ہیں بابا، بہت ریلسٹک کلرز ہیں"

"اچھا!"

"ہاں، ہاں"

"تو پھر ضرور پالیں گے" رفعت نے قطعی فیصلہ صادر کر دیا۔

اسلم نے اپنے مٹی اور کھپریل کے بنے ہوئے مکان پر نظر ڈالی، اوسط قسم کا چھوٹا سا مکان تھا۔ ایسا ہی جیسے عام طور پر

شہر کے پرانے محلوں میں بستے ہیں لیکن ضرورت کی ساری چیزیں اس میں موجود تھیں۔ گلی میں جو دروازہ کھلتا تھا اس میں داخل ہو۔ ہی آٹھ دس گز کی ایک چھوٹی سی گلیاری تھی جس کی داہنی جانب بیت الخلاء تھا۔ گلیاری کے اختتام پر ایک اور دروازہ تھا جو مکان صحن میں کھلتا تھا اس سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا حوض، پانی کا ایک نل اور چنبیلی کا ایک گھنا منڈوا تھا۔ صحن میں سیدھی جانب دیوار کے ٹین کا ایک شیڈ ڈال دیا گیا تھا جس کے آگے بانس کی موٹی جالی لگی ہوئی تھی۔ شیڈ کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ جو صحن کے دروازہ سے تھا۔ بہت شکستہ اور خراب حالت میں تھا۔ دیواریں بھی اوپر سے کچھ ٹوٹ گئی تھیں اس لئے بیکار پڑا رہتا تھا البتہ روزانہ مکان صفائی کے بعد گھر کا سارا کوڑا کرکٹ اس کے ایک کونے میں ڈال دیا جاتا اور رفعت دو تین دن میں ایک بار یہ کوڑا باہر پھنکوا دیتی۔ دوسرا حصہ نسبتاً ٹھیک تھا۔ اس میں لال مٹی کے چولہے بنا دیئے گئے تھے اور اس سے باورچی خانے کا کام لیا جاتا تھا۔ صحن دوسری جانب تین کمرے تھے۔ پہلے ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس کی دیواروں سے ہمیشہ مٹی جھڑتی رہتی اور روشنی کے لئے کوئی در نہ ہونے کی وجہ سے بہت ہی تاریک اور ڈراونی معلوم ہوتی، اس میں جلانے کی لکڑیاں رکھی جاتی تھیں۔ اس سے ملا ہوا ایک بڑا تھا جس کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا اور اس کی دونوں جانب دو کھڑکیاں تھیں۔ اس لئے روشنی اچھی طرح اندر آتی تھی۔ دراصل گھر میں یہی سب سے اچھا کمرہ تھا اس کی دیواروں پر کی ہوئی پلستر بھی مضبوط تھی اور چھت کی کھپریل زیادہ نہیں ٹپکتی تھی اس لئے اور رفعت اسے اپنے سونے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ صحن کا تیسرا کمرہ بے حد مختصر تھا اس کی چوکھٹ کے نیچے پانی بہنے کے لئے ایک بھی بنی ہوئی تھی اس لئے رفعت نے اس میں لکڑی کی ایک بڑی چوکی ڈال دی تھی اور یہ حمام کے طور پر استعمال ہوتا تھا صحن کے بعد وسیع پیش دالان اور پھر ایک دالان تھا جس کی دونوں جانب ایک ایک کمرہ تھا۔ داہنی جانب والے کمرے میں اناج اور باورچی خانے کا سامان رکھا جاتا تھا اور بائیں طرف کے کمرے میں رفعت اور اسلم کی مختصر سی گرہستی کا سارا ساز و سامان رہتا تھا۔ دالان دن میں اٹھنے کے لئے تھا اور پیش دالان میں دو ایک ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی تھیں جنہیں کوئی استعمال نہیں کرتا تھا۔

تقریباً ایک سال پہلے وہ اس مکان میں آئے تھے۔ اس سے پہلے اسلم اپنے والدین ہی کے ساتھ رہتا تھا لیکن کنبہ بڑا ہو، خرچ میں زمین اور آسمان کا فرق رہے اور آمدنی کے ذرائع محدود ہوں تو نباہ ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے اسی لئے وہ اپنے عزیز و اقارب اور برادری کے سارے لوگوں سے دور اس چھوٹے سے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ رفعت نے گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے اپنے میکے کی ایک پرانی ملازمہ کے لڑکے، یوسف کو نوکر رکھ لیا تھا اور زندگی تنگی ترشی سے کسی نہ کسی طرح بیت ہی رہی تھی۔

جب یہ طے ہو گیا کہ مرغیاں پالی جائیں تو اس کی تیاریاں بھی زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ اسلم نے دوسرے ہی دن رفعت کو صحن والا کمرہ خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ "فوراً اپنا بستر وغیرہ دالان میں کر دالو اور صحن کا کمرہ خالی کر دو۔"

"کیوں؟" رفعت حیرت سے بولی۔

"مرغیوں کے لئے۔"

"ارے واہ واہ، مرغیوں کے لئے سونے کا کمرہ کون دے گا بابا! لکڑیوں کی کوٹھری میں رکھو۔"

"بس، اسی کا نام تو جہالت ہے۔" اسلم نے اپنی علمیت کی ڈینگ ماری۔ "مرغیوں کے لئے انسانوں سے آٹھ گنا زیادہ روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تاریک غار میں تو آدمی ہی کا زندہ رہنا مشکل ہے، مرغی کیا خاک جئے گی۔"

"افوہ، اب اتنے چونچلے کرنے ہوں گے؟"

"پھر کیا سمجھتی ہیں آپ، ولایتی مرغیاں ہیں کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے۔ ہم جیسے لوگ ان کی دیکھ بھال کا انتظام تو خیر تھوڑی سی لیپا پوتی ہی کریں تو سمجھو کر غنیمت ہے۔"

"بھئی پھر تو میں باز آئی ایسی مرغیوں سے" رفعت نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔

بات کچھ بگڑتی ہوئی معلوم ہوئی تو فوراً لیکچر بازی شروع کردی۔ "بابا! مرغیاں دیسی ہوں یا ولایتی۔ اگر ان کی پرورش کا اچھا انتظام، تازہ ہوا، صاف پانی، رہنے کے لئے ستھری جگہ اور اچھی غذا نہ ملے تو ظاہر ہے کہ وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اسی لئے تو ہمارے یہاں بے حساب مرغیاں مرتی ہیں۔ تقریباً دس فیصد سینے میں مرجاتی ہیں۔ بیس فیصد چیچک، ڈائریا اور دوسرے امراض کا شکار ہوجاتی ہیں، تیس چالیس فیصد رانی کھیت کے موذی مرض کی نذر ہوجاتی ہیں، پندرہ، بیس فیصد کتوں، بلیوں اور چیلوں وغیرہ کی غذا بنتی ہیں اور باقی دس فیصد بمشکل ہماری غذا کا کام دیتی ہیں۔ ذرا غور تو کرو کتنا بڑا نقصان ہے۔ ملک کی مرغیوں کا نوے فیصد بیماری، جہالت اور کم علمی کی وجہ سے تباہ ہوجاتا ہے حالانکہ اگر ذرا سے سائنٹفک طریقے اختیار کئے جائیں تو اس کے بہت سے حصہ کو بچایا جاسکتا ہے۔"

بیوی شوہر کی معلومات سے کافی مرعوب ہوگئی تھی اس لئے دبی دبی آواز میں بولی "اچھا بابا، اب لیکچر چھوڑو۔ خالی کردیتے ہم کمرہ۔"

کمرہ خالی ہوگیا تو اس میں ریت کی ایک موٹی تہہ بچھادی گئی۔ ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ ہوا اور احتیاطاً گندھک کی دھونی بھی دی گئی تاکہ مچھروں اور دوسرے بیماری لانے والے کیڑے پتنگوں کا نام و نشان نہ رہنے پائے۔ اسلم نے تین چار دن تک کتابوں کا مطالعہ کرنے اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کاروبار انڈوں سے شروع کیا جائے۔ دوسرے دن صبح ہی وہ پنڈی چرڈ سرکاری پولٹری فارم کے لئے روانہ ہوگیا۔ جاتے ہوئے اس نے رفعت کو بہت سی ہدایتیں دے دیں اور چوک سے دو کڑک مرغیاں منگوانے کے لئے کہہ دیا۔

شام میں سات آٹھ بجے تک وہ گھر لوٹا تو اس کے ساتھ انڈوں کی دو چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں بھی تھیں۔ اس وقت تک رفعت بھی کڑک مرغیاں منگوا چکی تھیں۔ "بڑے مشکل اور خوشامدوں سے ملے ہیں یہ انڈے۔" اس نے کپڑے اتارتے ہوئے رفعت سے کہا "صرف دو ہی قسم کی مرغیاں ہیں وہاں، لگ ہارن اور روڈ آئیلینڈ ریڈ۔ لگ ہارن کچھ زیادہ اچھے نہیں۔ دو سو اور دو سو انڈے دینے والی نسل ہے۔ وہ لوگ ابھی کچھ اچھی بلڈ اسٹرین نہیں بنا سکے ہیں، ورنہ یہ قسم تو ایسی ہے جن میں تین تین سو انڈے دینے والی مرغیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن روڈ آئیلینڈ اتنی پیاری تھیں کہ تو دیکھتی تو خوش ہو جاتی، بہت عمدہ ٹیبل فاول ہیں ——— میں ہر ایک کے نو، نو انڈے لیتا آیا ہوں۔"

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے بڑے غور سے کڑک مرغیوں کا معائنہ کیا۔ مرغیاں کافی بڑی بڑی تھیں اور کسی قسم کی بیماری کی بھی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی۔ اس طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد کمرے سے دو ٹوکریاں نکالی گئیں جو پہلے سے اس موقع کے لئے منگوائی گئی تھیں۔ دونوں ٹوکریوں میں نیچے کاغذ بچھاکر تین چوتھائی حصے تک ریت بھر دی گئی پھر اس پر کافی مقدار میں راکھ ڈالی گئی۔ ڈی ڈی ٹی پاؤڈر کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ ایک رکابی کے پیندے سے ایک گڑھا سا بنایا گیا جس میں پرانے بوریئے کا ایک ٹکڑا بچھادیا گیا تاکہ مرغی آسانی سے انڈوں کو الٹ پلٹ کرسکے ——— یہ ہوچکا تو ہر ایک ٹوکری میں نو، نو انڈے رکھ دیئے گئے اور ٹوکریوں کو کمرے کے الگ الگ کونے میں رکھ کر مرغیوں کو ان کے قریب چھوڑ دیا گیا۔

دونوں مرغیاں آسانی کے ساتھ انڈوں پر بیٹھ گئیں ——— قندیل کی مدھم روشنی میں پہلے انھوں نے گردنیں آگے بڑھا بڑھا کر انڈوں کو خوب غور سے دیکھا۔ ایک دو بار کڑک کڑک کڑک کڑک ——— کڑک کرتی ہوئی ٹوکریوں کے گرد گھومیں اور پھر اسلم اور رفعت کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر اچک کر ٹوکری پر چڑھ گئیں۔ انڈوں پر بیٹھنے اور انھیں چونچ سے اچھی طرح اپنے نیچے لینے کے بعد دونوں نے جسم کو ایک خاص قسم کی حرکت دی اور پھر پر پھیلا کر خاموش ہوگئیں جیسے اب پورا پورا اطمینان ہوگیا ہو۔

اسلم اور رفعت بھی مطمئن ہوگئے۔ ہر ٹوکری پر ایک ایک بڑا ٹوکرا ڈھانکنے کے بعد دونوں کمرے سے نکل آئے اور باہر سے

زنجیر چڑھا دی گئی۔

تین ہفتے بڑی مشکلوں سے گذرے۔ اس عرصے میں اسلم نے پچاس ساٹھ روپے صرف کر کے پیدا ہونے والے چوزوں کے لئے ایک خوبصورت پنجرہ بنوایا۔ مختلف بیماریوں کے لئے بازار سے دوائیں خریدیں۔ روزانہ غور سے کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا اور باقی وقت میں مرغیوں کی افادیت پر رفعت کو لکچر دیتا رہا۔

اتنے عرصے تک مسلسل اسلم کی باتیں سنتے سنتے رفعت کو بھی مرغیوں سے خاصی دلچسپی ہو گئی تھی۔ یوں بھی عورتوں میں پالنے اور پرورش کرنے کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اس لئے اکیسویں دن چوزے پیدا ہوئے تو اسلم کے ساتھ ساتھ اسے بھی بے انتہا خوشی ہوئی۔

"ارے کتنا ننھا سا ہے یہ" اس نے ایک چوزے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ چوں، چوں ——— چوں، چوں چوزے نے مدد کے لئے اپنی ماں کو آواز دی اور مرغی نے فوراً ایک زوردار ٹھونگ رسید کی "اف" رفعت کی منہ سے ایک دبی ہوئی آواز نکلی اور وہ اپنا ہاتھ چوسنے لگی۔

اسلم نے ہنستے ہوئے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر مرغی کے دونوں پنکھ پکڑ لئے اور اسے آہستہ سے ٹوکری سے اٹھا کر ٹوکرے میں بند کر دیا۔ اس ٹوکری میں روڈ آئیلنڈ ریڈ کے انڈے رکھے گئے تھے۔ جلد جلد چوزے نکلے تھے اور بقیہ تین انڈے جوں کے توں دھرے تھے

چوں، چوں ——— چوں، چوں چوزے زور زور سے چلا رہے تھے

کٹ کٹ کٹ ——— کوک، کٹ، کٹ ——— کوک مرغی ٹوکرے میں اچھلتے ہوئی چیخنے لگی۔

"اللہ، کتنے پیارے ہیں!" رفعت اس طرح چوزوں کو تکے جا رہی تھی جیسے وہ دنیا کی حسین ترین چیز ہوں۔

چوں، چوں ——— چوں، چوں ——— چوں چوں۔ چوزوں نے سارا کمرہ سر پہ اٹھا لیا۔ مرغی نے ٹوکرے کے اندر سے جوابی کارروائی شروع کی تو کمرے کے دوسرے کونے میں رکھے ہوئے ٹوکرے سے بھی زندگی کا ثبوت ملنے لگا اور چوں چوں اور کٹ، کٹ کی ملی جلی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اسلم نے ایک چوزے کو بڑی احتیاط سے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور ٹوکرے کو ذرا سا اٹھا کر اسے اندر چھوڑ دیا، پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا اس طرح جب ایک، ایک کر کے سارے چوزے ٹوکرے میں مرغی کے پاس چھوڑ دیئے گئے تو وہ دوسری ٹوکری کی طرف متوجہ ہوا۔ مرغی کو علیحدہ ٹوکرے میں بند کر دینے کے بعد پتہ چلا کہ اس ٹوکری میں چوزوں کی تعداد زیادہ ہے۔ آٹھ چوزے تھے اس میں، لیکن ایک انڈے میں پھنسا ہوا دم توڑ چکا تھا البتہ سات پیلے پیلے چوزے اپنی چھوٹی چھوٹی چونچیں کھولے زور زور سے چیخے جا رہے تھے۔ اسلم نے انھیں بھی اسی ٹوکرے میں چھوڑ دیا جس میں روڈ آئیلنڈ ریڈ کے چوزے تھے۔ جو انڈے بچے ہوئے تھے انھیں اسلم نے خوب الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کان کے قریب لے جا کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن آثار کہہ رہے تھے کہ ان میں زندگی کی کوئی علامت نہیں۔ اس لئے ٹوکریوں میں بھری ہوئی ریت اور انڈوں کے چھلکوں کے ساتھ انھیں بھی باہر پھنکوا دیا گیا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ٹوکرے میں جھانک کر دیکھا، مرغی نے روڈ آئیلنڈ کے چوزوں کے ساتھ اپنے نئے بچوں کو بھی اپنے پروں میں جگہ دے دی تھی اور پر پھیلائے مزے میں بیٹھی تھی۔ دوسرے ٹوکرے کی مرغی مسلسل چیخے جا رہی تھی کٹ، کٹ، کوک کٹ، کٹ، کوک ہو

"آج اس مرغی کو چوک بھجوا دے رفو!" اسلم نے ٹوکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " اتنے چوزوں کے لئے ایک مرغی کافی ہے"

اس کے بعد کے تین چار دن بڑی مصروفیت اور ہماہمی میں گزرے۔ اسلم کا خیال تھا کہ جب تک کسی شخص کا یقین پختہ نہیں ہوتا اس وقت تک وہ عمل بھی نہیں کر سکتا اور جہاں تک مرغیوں کی پرورش میں سائنٹفک طریقوں پر عمل کرنے کا تعلق تھا۔ ......

.... رفعت کو ان طریقوں پر پختہ یقین تو ایک طرف رہا وہ ان کی ضرورت تک کو محسوس نہیں کرتی تھی شلاً اگر اسلم کہتا "دیکھو رفو، پوٹاشیم پرمنگنیٹ ملائے بغیر پانی نہ رکھا کرو" تو وہ فوراً جواب دیتی "کیوں ہم تو ویسا ہی پانی پیتے ہیں، مرغیوں کے لئے اتنے اہتمام کی کیا ضرورت؟"

اسلم دن بھر تو گھر میں نہیں رہتا تھا کہ وہ سارا کام اپنے ہاتھ ہی سے کر لیتا، اس کا زیادہ تر وقت اب بھی ملازمت کی تلاش میں گزرتا تھا اس لئے رفعت کو ساری باتیں سمجھانا ضروری تھا تاکہ وہ اس کی غیر موجودگی میں ان کا خیال رکھ سکے اسی لئے وہ بڑی نرمی سے اسے سمجھاتا "دیکھو بھئی، اگر ہم نہیں پیتے ہیں صاف پانی تو کون سا اچھا کام کرتے ہیں، تم آج ہی سے اپنے پینے کے پانی میں بھی دوا ڈالنا شروع کر دو، بہت سی بیماریوں کی روک تھام تو صرف اسی ایک چیز سے ہو جا سکتی ہے لیکن زیادہ مت ڈالنا، خواہ مخواہ پانی بد مزہ ہو جائے گا، صرف پانی کا رنگ تبدیل ہو جائے تو کافی ہے۔"

کسی بات کی تبلیغ کرنے والا اگر خود اس بات پر ایمان رکھتا ہو اور خلوص و محبت کے ساتھ اس کی تبلیغ کرے تو بات سمجھ میں آ ہی جاتی ہے اور سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ــــ رفعت کے ساتھ بھی یہی ہوا، اسلم کی باتیں کچھ اتنی پر یقین ہوتیں اور وہ انھیں اتنے خلوص کے ساتھ سمجھاتا کہ وہ آہستہ آہستہ متاثر ہوتی گئی اور اب چھوٹی چھوٹی باتوں کا وہ خود ہی خیال رکھنے لگی۔ علی الصبح چوزوں کو کمرے سے نکال کر صحن میں رکھے ہوئے پنجرے میں بند کرتا، پنجرے میں کچھ کپڑے یا ٹاٹ کے تھیلے وغیرہ ڈال دیتا تاکہ اس کا ایک حصہ ہمیشہ چھاؤں میں رہے، پانی ایسے مقام پر رکھنا جہاں دھوپ آنے کا امکان نہ ہو، ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹوں سے انھیں تھوڑی تھوڑی غذا دیتے رہنا، یہ ساری باتیں رفعت کے لئے اب روز کا معمول ہو گئی تھیں اور وہ انھیں خوشی خوشی انجام دیتی، ننھے ننھے چھوٹے، بے بس اور کمزور چوزوں کو اپنے ہاتھوں پلتے پھولتے اور پروان چڑھتے دیکھ کر اسے ایک قسم کی ذہنی تسکین اور روحانی مسرت کا احساس ہوتا اور وہ بڑے لاڈ اور چاؤ کے ساتھ ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتی۔

زندگی ایک ڈھرے پر آ گئی۔ چوزوں کے پیدا ہونے کے بعد کے ابتدائی دنوں کا شور و غوغا، ہماہمی اور مصروفیت دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی اور اب دن بڑے ہموار انداز میں بیت رہے تھے۔ دو تین ہفتوں کے بعد ہی چوزوں کے نئے پر نکلنے لگے۔ پیدائش کے وقت جسم پر جو ایک رواں سا پھیلا رہتا ہے وہ جھڑنے لگا اور اس کی بجائے موٹی موٹی نکیلی، خون سے بھری ہوئی کلیاں جلد سے باہر آنے لگیں اور رفتہ رفتہ سر، گردن، پنکھ اور جسم کا سارا حصہ ان موٹی اور بد ہیئت کلیوں سے بھر گیا۔ پھر یہ کلیاں بڑھتیں، پکیں اور پک کر کھلنے لگیں ــــ لگتا ان چوزوں کا جسم ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ان پر موتیا اور چنبیلی کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ پھر یہ پھول آہستہ آہستہ بڑھتے گئے، پھیلتے گئے اور چوزوں کا سارا جسم روئی کے سفید گالوں میں تبدیل ہو گیا ــــ اور روڈ آئیلنڈ ریڈ تو [illegible] کے واقعی ایسے پر پرزے نکال رہے تھے کہ نمائش میں رکھنے کے قابل معلوم ہوتے، اسلم تو دن رات ان کی تعریف کرتے نہ تھکتا "تو دیکھنا رفو، میرے یہ بچے تو دنیا میں ضرور نام پیدا کریں گے" وہ اپنے چوزوں کی تعریف میں ڈینگیں مارنے لگتا "ہر ایک نمائش میں پہلا انعام نہ لیں تو کہنا" اور رفعت زبان سے کوئی جواب نہ دیتے ہوئے بھی اپنے شوہر کی بات پر صد فی صد ایمان لے آتی اور اس کے بعد اور زیادہ تندہی اور محنت سے ان کی دیکھ بھال کرنے لگتی۔

دن دھیرے دھیرے گزرتے رہے ــــ چوزے آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔

تین مہینے اس انداز میں بیت گئے۔ اچھی غذا اور پرورش کی وجہ سے چوزوں کی جسامت اور خوبصورتی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔ اب تو وہ اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ نر اور مادہ میں آسانی سے تمیز کی جا سکتی تھی لیکن اس کے باوجود گھر کی وہ فضا اب باقی نہیں رہی تھی جو تین مہینے پہلے تھی، اس وقت گھر میں "انعام" کی رقم تقریباً سب کی سب محفوظ تھی اسی لئے کسی فوری خطرے کا احساس

نہیں تھا، لیکن اب وہ صورت نہیں تھی۔ اب تک اس رقم کا ایک بڑا حصہ صرف ہو چکا تھا اس لئے گھر پر ہمیشہ مستقبل کے خوف اور وحشت کا تاریک سایہ منڈلاتا رہتا ـــــ چوزوں کو انڈوں کے قابل ہونے کیلئے چار مہینے اور چاہئیں، اس وقت تک کیا ہوگا؟ گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟ اسلم کو اکثر اس کا خیال آجاتا اور اس خیال کے آتے ہی اسے یکایک وحشت سی ہونے لگتی۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ رفعت سے اس سلسلے میں مشورہ کرے لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی اور ہمیشہ اس کام کو دوسرے دن پر ٹالتا رہا۔

رفعت بھی ان دنوں کچھ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی، کچھ دنوں قبل اس نے یوسف کو بھی جواب دے دیا تھا اور اب گھر کا سارا کام وہ خود ہی کرتی تھی۔ مرغیوں سے جو بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ جب ٹوٹ گئیں تو ان سے اس کی دلچسپی بھی ختم ہو گئی۔ اب چوزے کسی وقت دالان میں گھس آتے تو وہ غصے سے بڑبڑانے لگتی۔ اسلم اس جھنجھلاہٹ کے اصلی سبب کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس لئے وہ اور زیادہ شدت کے ساتھ نوکری کی تلاش کرنے لگا۔

"رفو! نوکری ملنے کے فی الحال تو کوئی آثار نظر نہیں آرہے ہیں ـــــ اچھا یہ تو بتا اب روپے کتنے رہ گئے ہیں؟" جو سوال مدت سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا وہ ایک دن زبان پر آ ہی گیا۔

"پچاس، ساٹھ روپے پڑے ہیں۔"

"بس!"

"پھر اور کیا ہوگا، پانچ مہینے سے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ سو ڈیڑھ سو آپ کے مرغیوں کے شوق کے نذر ہو گئے۔ اب پچاس ساٹھ نہیں تو کیا بچیں گے؟" رفعت نے بہت ہی تنک کر جواب دیا۔

"ارے! میں حساب نہیں پوچھ رہا ہوں ـــــ یونہی دریافت کر لیا اس میں برہم ہونے کی کیا بات ہے۔"

"ہاں یہ برہم ہونے کی بات کہاں ہے۔ آپ دن بھر گھومتے رہئے یا اپنی مرغیوں سے دل بہلائیے اور اگر کسی کی زبان سے ایک لفظ نکل جائے تو کہئے کہ یہ برہم ہونے کی کونسی بات ہے۔ ہم انسان کہاں ہیں، ہمارا کام تو ہمیشہ مسکراتے رہنا ہے۔"

"اچھا بھئی، میں اب تم سے بحث کہاں کروں۔" اس نے آنے والے طوفان کا اندازہ کرتے ہوئے چپ ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

زندگی ..... نوکری ..... نوکری ..... زندگی پھر اسی محور کے گرد گھومنے لگی۔ دن تیزی سے گذرتے گئے اور دنوں کے ساتھ ساتھ رفعت کے چڑچڑے پن اور اسلم کی فکروں میں بھی اضافہ ہوتا گیا ـــــ آخر وہ دن بھی آگیا جس کا اسے کئی روز سے دھڑکا لگا تھا۔ ایک رات اسلم گھر آیا تو اسے پتہ چلا کہ رات گھر میں چولہا ہی نہیں جلا کیونکہ ترکاری کے لئے پیسے نہیں تھے۔ رفعت نے مسکرانے کی ایک ناکام سی کوشش کرتے ہوئے اسے یہ بات بتا دی اور چپ ہو گئی جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اس کے بعد کیا کہے ـــــ دونوں بھوکے ہی بستر پر لیٹ گئے۔

رفعت تو کچھ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی لیکن اسلم بڑی دیر تک بستر پر لیٹا ہوا اپنی بیوی کے چہرے کو دیکھتا رہا اور اس کے دماغ میں سیکڑوں خیالات بھٹکے ہوئے کبوتروں کی طرح چکر کاٹتے رہے۔ پانچ برس پہلے جب رفعت اس کے گھر دولہن بن کر آئی تھی تو وہ کتنی حسین تھی، بہار کے کسی نوشگفتہ پھول کی طرح، رنگت ایسی جیسے کسی نے دودھ میں ہلکا سا گلابی رنگ گھول دیا ہے۔ آنکھیں ایسی کہ اگر جھکیں تو کنول کی بند کلیاں معلوم ہوں اور اٹھیں تو یوں محسوس ہو جیسے دو ستارے جگمگا رہے ہیں۔ ابرو ایسے خمیدہ اور نازک کہ دیکھنے والوں کو ان کی اصلیت میں شبہ پیدا ہو جائے ـــــ اس زمانے میں سچ مچ رفعت ایسی تھی کہ وہ کسی محفل میں چلی جاتی تو ہر ایک کی نظریں اسی پر پڑنے لگتیں اور واپس آنے کے بعد اس کی امی کو تین تین بار آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کرنا پڑتا تاکہ حسن کو نظر نہ لگ جائے ـــــ لیکن پچھلے پانچ سالوں میں یہ حسن بڑی حد تک ماند پڑ چکا تھا، رنگت کی سرخی ہلکی ہلکی زردی کے آگے تو شاید ہار گئی تھی، کنول کی بند کلیاں سیاہ حلقوں میں گھر گئی تھیں اور ستاروں کی چمک اب اتنی ماند پڑ گئی تھی کہ ان کی جگمگاہٹ کا کسی کو بھی

احساس ہوتا تھا۔

بستر پہ خاموش بیٹھا ہوا اسلم نہ جانے کب تک اس قسم کی باتیں سوچتا رہا — سوچتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا — صبح میں اس
بند سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہی اچٹ گئی اور وہ بستر سے اٹھ گیا۔

کچھ دیر کے بعد جب رفعت آنکھیں ملتی ہوئی صحن میں آئی تو وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک روڈ آئیلنڈ چوزے کے
پَر نوچ رہا تھا۔

"ارے، یہ کیا کر دیا تم نے؟" رفعت حیرت سے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی

"ویڈنگ"

"کیا!"

"ارے بھئی سائنٹفک طریقے سے مرغیاں پالنے والا جو بھی شخص ہوتا ہے نا۔۔۔"

"ہاں"

"اسے وقتاً فوقتاً ایسے پرندوں کو چھانٹ دینا پڑتا ہے جن میں کوئی خرابی ہو۔ ورنہ ساری نسل تباہ ہو جاتی ہے — آج صبح
جو میں نے دیکھا تو اس کمبخت کی بائیں آنکھ میں ذرا سا عیب تھا۔"

"کیا عیب تھا آنکھ میں، مجھے تو کبھی کوئی عیب نظر نہیں آیا۔"

"ارے تجھے کیا نظر آتا، آج صبح میں نے بھی غور سے دیکھا تو پتہ چلا، بدمعاش ایسا بیمار سا لئے پھر رہا تھا کہ اگر اور کچھ دنوں تک
پلتی تو خدا جانے دوسرے پرندوں کا کیا حشر ہوتا۔"

رفعت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "بھئی لیکن اسے ذبح کیوں کر دیا" وہ تقریباً روتے ہوئے بولی۔ پوچھا تھا ہی تھا تو چوک
بیتے:

"لیکن چوک کس کے ہاتھوں بھیجتے، یوسف کو تو تو نے نکال دیا۔"

"ارے بابا میں خالہ کے چھوکرے سے بھجوا دیتی یا کسی اور سے کہتی، ذبح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اب چوک کون بھجوائے رفو" اس نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پَروں کو جلدی جلدی نوچتے ہوئے جواب دیا، "میں نے سوچا چلو
مرغ ہی کھائیں گے — مرغ کھائے ہوئے دن بھی تو بہت ہو گئے تھے۔"

"مگر گھر میں چاول بھی تو نہیں ہیں، صرف آدھ سیر جو کا آٹا پڑا ہے۔"

"بس بس بہت کافی ہے، چاول میں کیا دھرا ہے صرف نشاستہ ہوتا ہے، خواہ مخواہ آدمی پھول کر کپا ہو جاتا ہے، جوار
کی قسم کے وٹامن ہیں۔"

رفعت نے کوئی جواب نہیں دیا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ کر پَر نوچنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے رکتے رکتے کہا "دیکھو
سنا ہوں:

"ہوں"

"ویڈنگ کیا کہا تم نے ابھی؟"

"

سارا مرغیوں کی ویڈنگ کیوں نہیں کر دیتے؟"

"کب؟" ہاتھ پر نوچتے نوچتے یکایک رک گئے

"آج جمعہ ہے"

"ہوگا ـــــ تو ؟"

رفعت کی آنکھوں کی رہی سہی چمک بھی اداسی میں تبدیل ہوگئی اور اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "گھر میں راشن نہیں اور آج راشن مہینے کا آخری دن ہے۔ کل دوکان بند رہے گی۔ پانچ سات مرغیاں رکھنے سے کیا حاصل۔ اگر تم کہو تو آج چوک بھجوا دوں۔ کم ازکم دو ایک ہفتوں کا راشن ہی آجائے گا۔"

"ارے نہیں رفو! راشن کا میں انتظام کرتا ہوں" اسلم نے جواب تو دیدیا لیکن اس کی آواز میں اعتماد نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا صحن تک گیا۔ پھر وہیں کھڑے ہوکر اس نے اپنی بیوی کو آواز دی "رفو!"

"کیا ہے؟" رفعت نے دسترخوان پر سے رکابیاں اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھو، وہ جوڑا، بجواتی ہے تو بھجوا دے۔"

رفعت شاید کسی اور خیال میں کھوئی ہوئی تھی اس لئے اس نے پوچھا "کیا بھجوا دوں؟"

"ارے آپ تو بالکل بدھو ہیں ـــــ بیوقوف!" اسلم یکایک بھڑک اٹھا "مرغیاں بھجوا دیجئے جناب ـــــ مرغیاں!"

رفعت اس طرح چونک کر پیچھے ہٹی جیسے اس کا جسم بجلی کے کسی تار سے چھو گیا ہو ـــــ اس کی آنکھوں میں اچانک آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے امنڈ آئے اور وہ دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی جو تیز تیز چلتا ہوا گھر سے باہر جا رہا تھا ـــــ جیسے کسی زنجیر سے آزاد ہو رہا ہو

ہماری ادبی تحریک کا ترجمان

رسالہ بھی ـــــــــــ کتاب بھی

فنکار (دہلی)

ایڈیٹر: پرکاش پنڈت

بہت جلد نمبر ۳، ۴ (مشترک) آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا جس کی حیثیت ایک ادبی دستاویز سے کم نہ ہوگی

سال میں چھ جلدیں۔ فی جلد دو روپے۔ رسالانہ دس روپے۔ رجسٹری سے بارہ روپے۔ ششماہی پانچ روپے۔ رجسٹری سے چھ روپے

فنکار ــــ اردو بازار ــــ دہلی

شکست

داس

وہ ایک فلم ایکٹر تھا اور جنگ کے اس زمانے میں جب ہندستان میں ہالی وڈ کی نقالی میں سستی اور گھٹیا فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ لوگ صرف اس کے رقص کی خاطر فلم دیکھتے تھے۔ دراصل وہ کوئی باقاعدہ تربیت یافتہ یا فن داں رقاص نہیں تھا۔ وہ تو فلم سازی کے دور سے قبل جب ناٹک کمپنیوں کا زور تھا ایک ناٹک کمپنی میں ملازم ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ ناٹک میں عورتوں کے لئے کام کرنا دشوار بھی تھا اور مصلحت کے خلاف بھی اس لئے ناٹک والے خوبرو لڑکوں سے عورتوں کے رول ادا کرواتے تھے اور اسے بھی اس طرح کا کام دے دیا گیا تھا۔ وہ ابتدا میں ہیروئن کی سہیلیوں یا خادماؤں کا پارٹ کرتا رہا پھر آہستہ آہستہ اسے گانے اور رقص کرنے والے گروپ میں شامل کیا گیا جہاں اس نے تال اور سر کے ساتھ پیر سے تھاپ دینا اور چند مخصوص زاویوں میں ہاتھ اور کمر کے ذریعہ ارت دکھانا سیکھ لیا تھا۔ رقص کے متعلق اس کی تربیت بس اتنی ہی تھی۔ اسے اس وجدانی کیفیت کا پایا تو کوئی پتہ ہی نہیں تھا یا وہ اس کے بس کی بات نہیں تھی جو ایک فن داں اور ماہر رقاص اپنے ابروؤں، ہر جنبش، اپنے آنکھوں کے ہر اشارے، اپنے پیر اور بازوؤں کی ہر حرکت، اپنے انگلیوں کی ہر پور اور اپنے گھنگھروؤں کی ہر جھنکار سے پیدا کر سکتا ہے لیکن جب جنگ کے زمانے میں پیسہ سستا ہوگیا اور فلم والوں نے تاجرانہ اور رکیک فلمیں بنانا شروع کیں تو اسے بھی کچھ چیختے ہوئے بے معنی اور لچر گانوں کے ساتھ نیم مزاحی قسم کے رقص کے رول بھی دیئے گئے اور وہ سارے ہندستان میں مشہور ہوگیا۔ اس نے کچھ دولت بھی جمع کر لی تھی لیکن اس طرح کے دور چونکہ زیادہ دن نہیں چلتے اور لوگ آخر بیزار آکر اچھی چیز کا مطالبہ کرتے ہی ہیں اس لئے فلم کے میدان میں اس کیلئے زیادہ موقع باقی نہیں رہا اور کسی وجدانی لمحہ میں اس پر یہ وحی نازل ہوئی کہ اسے ایک بیالٹ ٹروپ بنا کر ہندستان کا سفر کرنا چاہیئے اور اس طرح اپنے رقص کا اسٹیج پر مظاہرہ کر کے کچھ پیسے کمانے چاہئیں اور اسی سلسلے میں وہ یہاں بھی وارد ہوا تھا۔ یہاں آنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اسی ریاست کے ایک چھوٹے سے محلے میں پیدا ہوا تھا اور اسے خواہ مخواہ یہ امید تھی کہ یہاں اس کا بہت اچھا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس نے سنگھار میز کے آگے کھڑے ہو کر بالوں میں کنگھا کیا اور اپنی ٹی شرٹ کی سلوٹیں درست کیں پھر اپنی پتلون کی کریز کو ٹھیک کر کے اس نے وینشنگ کریم کی شیشی کھولی اور بہت احتیاط سے کریم کو اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر ملا۔ اس کی جلد میں اب جھریوں کے آثار پیدا ہونے لگے تھے اور کنپٹیوں پر بال بھی سفید ہو رہے تھے۔ اسے ابھی سیٹھ بنسی لال کا خیال ستا رہا تھا جن سے ملنے کے لئے وہ سہ پہر میں گیا تھا اور جنھوں نے یہاں اس کے اسٹیج شو کے لئے ساجھے کی بنیاد پر انتظامات کئے تھے اور معقول آمدنی کی امیدیں کافی روپیہ خرچ کیا تھا۔

"سالا سیٹھ کہیں کا۔ اس نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟" اس نے پوڈر کی ایک ہلکی تہہ چہرہ اور ہاتھوں پر جماتے ہوئے سوچا۔ اور پھر باتیں کیسی بڑی بڑی کرتا تھا۔ مجھ پر ہی الزام دھرتا ہے کہ میں نے اپنا بیالٹ ٹروپ انتہائی لاپرواہی سے ترتیب دیا ہے اور میرے آرٹسٹوں میں کوئی رقص اور موسیقی کے ابتدائی فن سے بھی واقف نہیں۔ جیسے اس کے باپ دادا سب بڑے استاد رہے ہوں۔ وہ تو صرف روپیہ کمانے کا فن جانتا ہے اور اس میں بھی نہ صرف یہ کہ ناکام ہوگیا بلکہ مجھے بھی تباہ کر ڈالا۔ اگر اس نے

پبلسٹی کی ہوتی تو کبھی مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس شہر میں تو بمبئی کے تھرڈ کلاس شو بھی ہزاروں روپیہ کمالے جاتے ہیں اور پھر یہ تو میرا اپنا وطن ہے اور میں اتنا مشہور فلم آرٹسٹ ہوں۔ کیا لوگ میرا نام سن کر بھی مجھے دیکھنے نہ آتے۔"

بیرے نے بیر کے شیشے لاکر تپائی پر رکھ دیئے اور تپائی کھسکا کر صوفہ کے قریب کر دی۔

اس نے سینٹ اپنے کپڑوں پر ملا اور بالوں پر آخری بار برش پھیر کر ایک سگریٹ جلایا اور چپ چاپ آکر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے شیشہ کھول کر بیر اس احتیاط سے گلاس میں انڈیلی کہ جھاگ بالکل جمع نہ ہو سکا۔ اس نے سر اٹھا کر خالی نگاہوں سے بیرے کی طرف دیکھا اور کھوکھلے لہجے میں اخلاقاً کہا "تم بہت مشاق ہو۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

"صاب کی طبیعت اب کیسی ہے" بیرے نے ادب سے پوچھا

"ہاں اب ٹھیک ہے۔"

"صاب کے کھانے کے لئے کوئی چیز لاؤں۔ صاب نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

"ایں۔ کل سے میں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ نہیں، میں نے رات باہر کھانا کھایا ہے۔ دراصل مجھے روز کہیں نہ کہیں دعوت رہتی ہے اس لئے میں تمہاری ہوٹل میں کھانا نہیں کھاتا۔ ضرورت ہوگی تو میں تمہیں بلالوں گا۔ البتہ کچھ بسکٹ یہاں تپائی پر رکھ جاؤ۔"

بیرے نے بسکٹ تپائی پر رکھ دیئے اور چلا گیا۔

"کیا میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ یہ میرا ہاتھ کیوں اس قدر کانپ رہا ہے۔ سب اسی وجہ سے ہے۔ سب اسی وجہ سے ہے۔ آج بیر کتنی ٹھنڈی، خوشگوار اور میٹھی معلوم ہو رہی ہے۔ رات بھر ادھر ادھر کی شرابیں پینے کا نتیجہ ہے اور آج تو ساتواں دن ہے کہ میں روز شام میں پانچ بجے سے پینا شروع کر دیتا ہوں اور صبح چار بجے اور پانچ بجے ہوٹل آکر سوتا ہوں اور دن بھر سوتا رہتا ہوں۔ دعوت؟ دعوت یہاں کون خاک دے گا۔ وہ پانچ روپے خرچ کر کے میرا ڈانس دیکھنے آنا تک پسند نہیں کرتے تو مجھے دعوت کیا دیں گے۔ میں ہی بڑا بے حیا ہوں جو رات رات بھر ایک ایک کے گھر دوڑتا پھرتا ہوں۔ اور انھیں جگا کر ان سے باتیں کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ لوگ بھی میرے پیچھے مجھے گالیاں دیتے ہوں گے کہ میں خواہ مخواہ ان کی نیند خراب کرنے ان کے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ اور بعض لوگ تو ملتے ہی نہیں۔ ان کے ملازم آکر کہہ دیتے ہیں کہ "صاحب کو اس وقت جگانے کا حکم نہیں۔" ہٹاؤ ان واہیات قصوں کو۔ آج میں کہیں نہیں جاؤں گا اور کسی سے نہیں ملوں گا۔ یہ بیر بہت اچھی ہے۔ کونسی ہے۔ کونیز نگل۔ جرمن ہے۔ کیا کہنا جرمنی کا۔ مگر وہ ہٹلر کے زمانے کی بات اب کہاں۔ کیا انسان تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو جنگ کبھی ختم نہ ہوتی۔ اسے دراصل اس کے ساتھیوں نے ہی زہر دے کر مار دیا تھا۔ ورنہ وہ تو آخر وقت کوئی ایسا حربہ ایجاد کرتا کہ سارا پانسہ پلٹ جاتا اور اس کی وجہ سے صرف جرمنی ہی کو کیا ساری دنیا کو کس قدر فائدہ پہنچا ہے۔ ہم لوگوں نے اس زمانے میں کیا روپیہ کمایا ہے، کیا روپیہ کمایا ہے کہ واہ وا۔ وہ اگر زندہ ہوتا تو آج یہ دن بھلا کیوں دیکھنا نصیب ہوتا۔ وہ کیا مرا کہ ہمارے گھر سے لکشمی چلی گئی۔ ہائے ہٹلر۔ لیکن میرے ہاتھ مسلسل کیوں کانپے جا رہے ہیں۔ حالانکہ میں نے دو گلاس بیر کے غٹا غٹ پی لئے ہیں اور اب بسکٹ تک مجھ سے نہیں ٹوٹتا۔ یہ سب بھوک اور کمزوری کی وجہ سے ہے۔ مگر بھوک تو مجھے بالکل نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سخت گولا پیٹ میں پھنس گیا ہو۔ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ بری شرابوں کی وجہ سے ہے۔ یا ہو سکتا ہے میں رات بھر جو چوڑا، چبینا اور پکوڑے شراب کے ساتھ پھانکتا رہتا ہوں اس کی وجہ سے ہو۔ مجھے کچھ بیر اور پی لینی چاہئے۔ اس سے طبیعت بالکل سنبھل جائے گی اور میں کچھ کھا سکوں گا۔ وہ اوپنر کہاں رکھ دیا کمبخت نے۔ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ وہ تپائی پر رکھے۔ پھر وہ کہاں گیا۔ تلاش کہیں کا۔ ہاں یہاں کرسی پر رکھا ہے۔ کرسی پر اوپنر رکھا ہے۔ یہاں ہر چیز الٹی ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ یہ سفر میرے لئے سخت منحوس ثابت ہوا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ اُف وہ اس میں سے کس قدر جھاگ نکل رہا ہے۔ میں اس بیرے کی اتنی صفائی سے تو خیر بیر بھر شاید

نہ انڈیل سکوں لیکن اس قدر جھاگ بھی میں نے کبھی نہیں اڑایا۔ لیکن اس جھاگ میں کس نے قوس قزح کو توڑ کر ملا دیا ہے۔ یہ بجلی کس نے جلائی تھی۔ ہاں ٹھیک تو ہے یہ گوپی رام نے جلائی تھی۔ جب وہ یہاں سے جا رہا تھا تو میں نے ہی اسے کہا تھا کہ بجلی جلا دینا۔ گوپی رام بالکل گدھا ہے۔ بلکہ گدھے کا بچہ ہے اور اس کی وجہ سے بھی میرا اس قدر نقصان ہوا۔ ورنہ مجھے کوئی اچھا منیجر ملتا تو میرا کبھی اتنا گھاٹا نہ ہوتا۔ یہ سامنے دیوار پر لگی ہوئی تصویر کتنی خوبصورت ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ کوٹھی پہلے نواب احسان الملک بہادر کی تھی۔ اس وقت میں چھوٹا تھا اور ماں مجھے لے کر یہاں آیا کرتی تھی۔ ہم تین تین چار چار دن اور بعض دفعہ ہفتہ بھر یہاں رہتے تھے۔ اس وقت نواب صاحب مرحوم زندہ تھے اور اوپر ہی رہتے تھے لیکن کبھی ہمیں اوپر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اوپر ان کے رشتہ داروں اور مخصوص ملازموں کے سوا کوئی جانے کی جرات ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں جب نواب صاحب حضور والاشان کی پیشی مبارک میں تشریف لے جاتے تو ان کے پوتے اور نواسے وغیرہ سب مل کر کوٹھی کے پیچھے آم اور سیتا پھل کا جو بڑا باغ تھا اس میں جمع ہو کر کھیلتے اور شرارتیں کرتے اور مجھے پکڑ کر بار بار دلھن بنایا جاتا اور میں کچھ نہ کہہ سکتا اس لئے کہ ماں کا حکم تھا کہ صاحبزادے جیسا کہیں ویسا کرنا۔ اب بھی جب کوئی نیا آدمی ملتا ہے اور حیدرآباد کی پرانی باتیں دریافت کرتا ہے تو میں اسے ضرور بتاتا ہوں کہ اس کوٹھی کے پیچھے ایک بڑا باغ تھا اور بمبئی سے جو لوگ میرے ساتھ آئے ہیں انھیں تو میں نے تفصیل سے اس کوٹھی کا ایک ایک چپہ بتایا ہے۔ یہ ہے بھی دیکھنے کے قابل چیز۔ اب لوگوں میں ایسی عالیشان حویلیاں اور ایسی ڈھنگ کی کوٹھیاں بنانے کی تمیز ہی کہاں رہی ہے۔ اب تو لوگ کیوبیکل ڈیزائن کا چھوٹا موٹا بنگلہ بنا کر اور بیڈ روم کے ساتھ باتھ اٹاچ کر کے بڑا فخر کرتے پھرتے ہیں۔ ان میں اپنے گھر کے لئے صحیح نام تجویز کرنے کی تک تمیز نہیں رہی۔ اب میں نے اپنے گھر کا نام "محل" جو رکھ دیا ہے تو لوگ ہنستے ہیں۔ کہتے ہیں یہ تو بڑا پرانا فیشن ہو گیا ہے۔ ارے کمبختو۔ یہ پرانا فیشن ہی تو معزز لوگوں کا فیشن ہوتا ہے ہر نیا فیشن تو نودولتئے اختیار کرتے ہیں۔ لیکن میں بھی تو بہرحال ایک نودولتیا ہی ہوں۔ آخر میرا باپ بھی تو نواب احسان الملک بہادر کے پاس محرر ہی تھا۔ اور وہ بھی چونکہ میری دادی نواب صاحب مرحوم و مغفور کی انا رہی تھیں اس لئے انھوں نے نواب صاحب مرحوم سے کہہ کر میرے والد کو نوکر رکھا دیا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو ہم نے رئیسوں کے آداب تو دیکھے ہیں اور ان کی صحبت میں زندگی کی شان و شوکت سے تو واقف ہو گئے ہیں۔ اب اگر بمبئی میں ہر شخص مجھے حیدرآباد کا ایک رئیس زادہ سمجھتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میرے عادات و اطوار ہی ایسے ہیں اور یہ سب نوابوں اور نواب زادوں کی صحبت کا صدقہ ہی تو ہے اور پھر ایک طرح میرا رشتہ نواب احسان الملک بہادر سے ملتا ہی ہے اس لئے کہ میری دادی نواب صاحب مرحوم کے والد نواب ایمان الملک کی "زوجگی" میں آ گئی تھیں حالانکہ وہ میرے دادا کی بھی آخر عمر تک بیوی رہیں (لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے) اور پھر میری دادی نے نواب احسان الملک مرحوم کو دودھ پلایا تھا اور اس گھر میں ان کا رتبہ حضرت بڑی بیگم سے کیا کم ہو گا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مجھے بھی اس گھر تک رسائی حاصل تھی اور میرے دل میں اس گھر سے اور اس گھر کے بچے بچے سے اتنی عقیدت تھی کہ میں ان کی غلامی تک کرنے تیار ہو جاتا تھا۔ آخر نمک کا کچھ اثر ہوتا ہی ہے ——

لیکن یہ نوابی بمبئی میں مجھے بہت مہنگی پڑی —— یہ آخر میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیوں مسلسل اس قدر کانپ رہا ہے اور یہ بائیں پسلی سے ریڑھ کی ہڈی تک اور ریڑھ کی ہڈی سے کاندھے تک درد کی ٹیس کیوں اٹھ رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں میں رات ایک ہی کروٹ سو گیا تھا۔ مجھے آخر رات کی باتیں کیوں بھول جانے لگی۔ کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ لوگ دن میں مجھ سے شکایت کرتے ہیں کہ میں اسٹیج پر ناچتے ناچتے بے تالا ہو جاتا ہوں اور استاد کے بار بار اشارے پر بھی تال اور ارت درست نہیں کرتا اور ایک دفعہ تو نگینی میرے ساتھ رقص کرتے کرتے چڑچڑا کر اسٹیج سے چلی گئی تھی۔ مگر مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ جب کوئی میرے آگے یہ باتیں دہراتا ہے تو خیالوں کی دھندلاہٹوں میں جیسے جگنو چمکتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ کچھ نظر آ رہا ہے لیکن کچھ نظر نہیں آتا۔ ہٹاؤ بھی۔ کچھ ہو گا۔ ممکن ہے کوئی بیماری ہی ہو۔ ذرا یہاں سے کچھ روپیہ کماؤں اور گھر کے خرچ کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو بمبئی پہنچ کر اپنی پوری اوور ہالنگ کرواؤں گا۔ لیکن اب تو پیسے کمانے کی امید بھی مٹتی جا رہی ہے۔ آج ہی تو کسی وقت نلینی، اس کا شوہر اور اس کے ٹروپ کی لڑکیاں مجھ سے کہہ رہی

تھیں کہ اگر ان کے پیسے آج نہیں دیے گئے تو وہ بمبئی واپس چلے جائیں گے۔ سالے کمینے کہیں کے۔ جیسے یہاں میں نے بہت روپیہ کمالیا ہے کہ انھیں روز سو روپیہ دیا کروں۔ سالی ذرا کلاسیکل انداز میں ناچتی ہے تو نخرے کرتی ہے۔ جانے کیا کیا ناچتی ہے۔ کتھک، کتھاکلی، منی پوری، منتھال۔ بھلا یہ بھی کوئی ناچ کے نام ہیں۔ جن ناچ کے نام ہی اتنے بے ڈھنگے ہوں وہ ناچ بھی کیا ناچ ہوں گے اس پر میرے ناچ سے بیزار ہو کر اسٹیج سے چلی جاتی ہے۔ ارے جا بھی۔ مجھے تیری کب پرواہ ہے۔ تیرا ناچ تو ایک دس بارہ استاد قسم کے لوگ دیکھتے ہوں گے یا کوئی شوقین مزاج رئیس دیکھ لیتا ہوگا۔ یہاں مجھے تو لاکھوں سینما دیکھنے والے جانتے ہیں اور میرے رقص پر خوش ہو کر تالیاں پیٹتے ہیں سیٹیاں بجاتے ہیں اور تو مجھے سبق سکھاتی ہے۔ ارت درست کرو۔ گھونگرو کا خیال رکھو۔ تھاپ گنو۔ ارے ہٹا ـــــ لیکن یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں کیوں اس قدر جھنجلا رہا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ بیئر ہے یا پانی۔ اس میں تو کوئی نشہ ہی نہیں۔ لوگ شربت پینے کے لئے تو بیئر نہیں پیتے۔ مجھے کچھ وہسکی پینی چاہیئے۔ گھنٹی کہاں ہے۔ ہاں یہ دروازہ کے پاس ہے۔ لیکن یہ بج بھی رہی ہے یا نہیں۔ کہیں آواز ہی نہیں سنائی دیتی۔ لیکن بھئی سچ تو یہ ہے کہ اتنی بڑی کوٹھی میں گھنٹی کی آواز بھلا کیا سنائی دے گی ـــــ واہ ری قسمت۔ یہ کوٹھی اور دوسری منزل کے یہ کمرے جہاں نواب صاحب مرحوم رہا کرتے تھے۔ کبھی ہم نے یہ خواب بھی نہیں دیکھا تھا کہ ہم اس کمرے میں جھانک بھی سکیں گے اور آج میں اس کمرے میں بیٹھا شراب پی رہا ہوں اور یہ کوٹھی ماروائی ساہوکار ۔ دل نے خرید لی ہے اور اس میں پارسی تاجر بچوں نے ہوٹل لگا رکھا ہے۔ کیا گردش ہے زمانے کی۔ ورنہ کبھی نواب صاحب مرحوم یہاں آرام فرماتے ہوں گے۔ یہ جھاڑ اور فانوس اور یہ تصویریں انھیں کے زمانے کی یادگار معلوم ہوتے ہیں۔ کتنی خوبصورت تصویریں ہیں۔ یہ سب ایرانی عورتیں ہوں گی یا یونانی ہوں گی۔ پانی کے کنارے بیٹھی ایک دوسرے سے چہل کر رہی ہیں۔ کس قدر گدرائے ہوئے ہیں ان کے جسم، اور یہ عورت جو ایک مخملی کوچ پر بیٹھی آئینہ دیکھ رہی ہے۔ یہ کوئی پرانی انگریز ملکہ ہوگی لیکن انگریز ملکہ کی تصویر ننگی نہیں ہوتی ـــــ وہ ایک مشہور ایکٹریس تھی نا۔ جو بہت عیاش تھی اور جس کی ہالی وڈ میں فلم بھی بنی تھی۔ یہ وہی ہوگی ـــــ ہاں تم آگئے۔ بھئی تمہارے پاس وہسکی کونسی ملے گی ـــــ جانی واکر مل جائے گی۔ ٹھیک ہے۔ لیکن کم از کم بیس برس پرانی ہونی چاہیئے۔ ہاں تو بس بہت مناسب ہے لے آؤ۔ دو پیگ اور ایک سوڈا۔ مگر جلدی کرو ـــــ خوب شراب مل رہی ہے یہاں۔ اور بھی جگہ ملتی ہے۔ مگر بلیک مارکٹ سے اور ایک ایک بوتل کے ستر اور اسی روپے دینے پڑتے ہیں اور یہاں ٹھاٹ سے چھتیس روپے میں شیشہ مل رہا ہے۔

اس نے سگریٹ جلایا اور چار دن کے شو کا پروگرام اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پورا پروگرام تفصیل سے دیکھ کر اسے پھر اطمینان ہوا کہ اس نے اس شہر میں جو شو کئے ہیں وہ بہت اچھے تھے۔

"ہر پروگرام میں ایک کلاسیکل ڈانس ہے۔ ایک گروپ ڈانس ہے۔ فلموں کے مشہور گانے ہیں، غزلیں ہیں۔ کتنے ڈوئیٹ اور سولو رقص ہیں اور سب مشہور فلموں سے لئے گئے ہیں۔ خود میں ہر پروگرام میں تین تین رقص پیش کرتا ہوں اور چھوکا ان کے سوا ہے۔ اور یہ سیٹھ کا بچہ مجھ سے کہتا ہے کہ میں بچر پروگرام پیش کرتا ہوں۔ کلاسیکل گانے اور کلاسیکل رقص مانگتا ہے۔ بیوقوف کہیں کا۔ جیسے عام لوگ کلاسیکل چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ارے لوگوں کا مذاق اتنا اچھا ہوتا تو دن بھر بیٹھے استاد کریم خاں کے ریکارڈ نہ سن لیتے۔ ہماری فلمیں دیکھنے کیوں آتے۔ اب یہی نلینی جب ناچتی ہے تو لوگ بیوقوفوں کی طرح بیٹھے اسے تکتے رہتے ہیں اور اس کے برخلاف جب میرے "گندے انڈے" کا رقص ہوتا ہے یا سرینڈر جب "آئی لو یو" بالکل انگریزی انداز میں گاتا یا عاشق و معشوق کا کامک پیش کیا جاتا ہے تو سیٹیاں بجتی ہیں اور لوگ وہ آوازے کستے ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے اور یہ سیٹھ کا بتاتا ہے کہ اس سے اچھا پروگرام تو یہاں اسکول کے بچے کر لیتے ہیں اور یہاں ایسے ایسے معیاری پروگرام دن رات مزدوروں کے جلسوں اور کسان سبھاؤں میں پیش کئے جاتے ہیں کہ لوگ میری چیزیں پسند نہیں کرتے۔ بدمعاش کہیں کا۔

"ہاں۔ گلاس یہاں رکھ دو اور یہ خالی شیشے لے جاؤ۔"

"صاحب کے لئے ٹیلیفون آیا ہے۔ کوئی صاحب سے ملنے آنا چاہتے ہیں۔"

"ارے بھئی اطہار سے منیجر سے کہہ دو۔ وہ بات کرے گا۔ —— ہاں اسے کہہ دینا اگر کسی نواب کا ٹیلیفون ہے تو انھیں آنے دے۔ اگر کسی اور کا ہو تو میں ہوٹل پر نہیں ہوں اور اسے یہاں میرے پاس بھیج دو۔"

کس نے ٹیلیفون کیا ہوگا؟ خدا کرے کوئی اور پروگرام کروانا چاہتا ہو۔ اگر کوئی ایسا آدمی مل جائے اور یہ پروگرام دوبارہ شروع ہو تو یقیناً اس دفعہ پوری کسر نکل جائے گی۔ کیا مزا ہو اگر روز دس ہزار روپے کا شو ہو جائے۔ پانچ ہی دن میں پچاس ہزار روپے بن جائیں گے۔ پھر تو میں اپنے پروگرام میں اور توسیع کر دوں گا اور دس ہی دن میں ایک لاکھ روپے بن جائیں گے۔ بس پھر فراغت ہی فراغت ہے۔ یہ ہندستان کے اس کونے سے اس کونے تک خالی ہاتھ مارے مارے پھرنے سے تو نجات مل جائے گی اور چین سے بیٹھ کر باقی دن گذاریں گے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں نے جنگ کے زمانے میں ہی مکان خرید لیا تھا اور لڑکیوں کی شادی کر دی تھی ورنہ اس تنگی اور افلاس میں سر چھپانے کی جگہ تک نہ ہوتی اور میری لڑکیوں کو کوئی پوچھ کر بھی نہ دیکھتا۔ دراصل میں نے اپنی زندگی بڑی بدتمیزی سے گذاری ہے۔ نواب بننے کی کوشش میں بہت غلط طریقے سے میں نے روپیہ خرچ کیا ہے۔ یہ نوابی بہت مہنگی چیز ہے۔ پتہ نہیں ان نوابوں کے پاس روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ اب تو کوئی نواب پانچ روپے خرچ کر کے میرا ڈانس دیکھنے تک نہیں آتا۔ حالانکہ نواب لوگ رقص اور موسیقی کے بڑے قدرداں ہوتے ہیں۔ ہوتے ہوں گے کلاسیکل چیزوں کے قدرداں۔ آج کل ہر شخص پر یہی جنون سوار ہے۔ کلاسیکل ڈانس فوک ڈانس۔ کلاسیکل میوزک۔ فوک میوزک۔ حد یہ ہے کہ میرا لونڈا تک یہی باتیں کرتا ہے۔ دو چار سستی فلموں میں کیا کام مل گیا کہ اپنے آپ کو بڑا آرٹسٹ سمجھنے لگا ہے۔ دو تین سو روپے مہینے پر کام کرتا ہے اور مجھے سکھاتا ہے کہ اب عوام ٹھوس چیزیں مانگتے ہیں۔ اپنے مسائل کے متعلق فلمیں چاہتے ہیں۔ بڑا چلا ہے عوامی مسائل کی فلمیں بنانے۔ ارے مسائل ہی حل کرنے ہیں تو لیڈری کیوں نہیں کرتا۔ آرٹسٹ کیوں بنا پھرتا ہے۔ اتنی بات نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کے پاس پیسہ ویسہ کچھ ہے نہیں اس لئے پندرہ بیس ہزار روپے لے کر عامیانہ سی فلم بنا لیتے ہیں۔ سب کیر کٹر چیتھڑے لگائے پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی کوسٹیوم ہے۔ نہ رقص ہیں۔ نہ گانے ہیں۔ ارے کہاں سے لائیں گے پلے بیک سنگر کو دینے اور جب تک کسی فلم میں آٹھ دس گانے اور پانچ چھ ناچ نہ ہوں پھر اسے کون دیکھے گا اور اب یہ نالائق آرٹسٹ مل کر بغیر پیسہ خرچ کئے فلم بنائیں گے۔ کوئی کچھ معاوضہ نہیں لے گا اور جب فلم بکے گی تو سب مل کر آپس میں آمدنی کو تقسیم کریں گے اور اس وقت تک کھائیں گے کیا۔ گھانس۔ اور وہ لونڈا مجھے اپنے ساتھ شریک کرنے چلا ہے۔ کہتا ہے آپ فوک ڈانس ناچیئے اب یہ رسبھاو بھاؤ نہیں چلے گا۔ اب اس عمر میں مجھے نئے سرے سے گویا ناچ سیکھنا پڑے گا۔ ان لوگوں کے کہنے پر۔ ارے ہٹا بھی۔ اب کون ان لفنگوں کا ساتھ دے گا۔ ساری دنیا کیا کہے گی اور لے دے کر سال میں ایک دو کنٹریکٹ مل جاتے ہیں۔ سیٹھ لوگ وہ بھی دینا بند کر دیں گے۔ خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ کام سے تو لگ گیا۔ اب میرے بعد وہی گھر سنبھالے گا۔ اس کی ماں کو بھی اس پر بڑا بھروسہ ہے۔ کچھ نہ ہوگا تو فاقے تو نہ کرنے پڑیں گے —— ہاں کہو بھئی گوپی رام تم آگئے کس کا ٹیلیفون تھا۔؟

"جی اسی سیٹھ منیی لال کا تھا۔ کہتا تھا آکر حساب دیکھ لو۔"

"بھئی کیا خاک حساب دیکھو گے۔ جیسے ابھی پانچ دس ہزار دے دے گا —— اچھا دیکھو گوپی رام کل رات ہم کو راجہ بہادر نے اپنے گھر کی کشید کی ہوئی جو شراب دی تھی نا۔ وہ کہاں رکھی ہے۔"

"جی یہیں الماری میں رکھی تھی۔" وہ صوفے کے گرد چکر کاٹ کر الماری تک گیا۔ لیکن وہاں پانچ کر چند سکنڈ کے لئے رک گیا۔ اس نے سوچا آج رات پھر اگر اسی طرح شراب چلتی رہے تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ کل جو ان پر دل کا سخت دورہ پڑا تھا اس کے بعد ڈاکٹر نے کہا تھا کہ انھیں شراب سے بہرحال پرہیز کرنا چاہیئے اور پھر پتہ نہیں یہ کس قسم کی شراب ہے اور اگر پی کر یہ پھر نکل گئے تو

خبر نہیں رات کہاں گزرے گی۔ حالانکہ انھیں بستر سے اٹھنا تک منع ہے۔ یہ میں نے کیا مصیبت مول لی ہے۔ پہلے
کی بیوی ساتھ آ جاتی۔ وہ شاید انھیں روک لیتی۔ ورنہ ان کو کچھ ہو جائے تو زندگی بھر میری جان کو روتی رہے گی۔ ا
میرا تار تو مل گیا ہوگا۔ اگر وہ فوراً ہی نکل گئی ہے تو اسے آج پہنچ جانا چاہیئے۔

"ارے بھئی یہ کیا کر رہے ہو اتنی دیر" وہ جھنجھلا کر چلایا۔

"جی ابھی لایا۔" اس نے جلدی سے بوتل الماری سے نکال لی اور اسے دستی سے صاف کر کے تپائی پر رکھ دیا

"کیا بات ہے کیا سوچ رہے تھے۔" اپنے سامنے بوتل دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی تراوٹ آگئی او
کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ لیکن اس کی آنکھیں شیشہ کی آنکھوں کی طرح مردہ رہیں۔ گوپی رام نے وہسکی کا خالی گلاس سوڈے سے ص
کر کے پھر تپائی پر رکھ دیا اور اس نے دو پیگ گلاس میں انڈیل لئے۔

"جی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نے رات کہا تھا کہ آپ کو شراب بالکل نہ دیجائے اور آپ کو مکمل آرام لینا چاہیئے۔ پھر آ
کئی دن سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے اور آپ کو بیر پہ وہسکی اور وہسکی پہ یہ شراب تو بالکل نہیں ملانی چاہیئے۔ اس سے آپ کا جگ
خراب ہو جائے گا۔"

"سب واہیات" اس نے ایک ہی سانس میں دو پیگ ختم کر دیئے اور تقریباً نصف گلاس بھر کر اپنے آگے رکھ لی
کچھ نہیں ہوا ہے۔ کچھ سردی لگ گئی ہوگی وہ ابھی صاف ہو جائے گی۔ دراصل یہ شراب بہت عمدہ ہے۔ آگ کی طرح حلق
تک پہنچ گئی ہے۔ مجھے اسی شراب سے ابتدا کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ اس قدر عمدہ چیز ہے۔"

"میرے خیال میں اب آپ زیادہ مت پیجئے۔ اس لئے کہ ابھی آپ کو بہت کام کرنے ہیں۔ آرٹسٹ نیچے آپ کے منتظ
وہ اپنا معاوضہ مانگتے ہیں۔ ورنہ وہ واپس جانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ آرکسٹرا والوں کو بھی آپ نے سویرے سے بلا
وہ ابھی بیٹھے ہیں اور دنگا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہوٹل والوں نے بھی دوپہر سے کھانا دینا بند کر دیا ہے۔ ان کا بل تقر
دو ہزار روپے کا ہو گیا ہے اور تین سو روپے کے قریب ٹیکسی والے کے دینے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے ان سب کو جھو
طرح سمجھا رہا ہوں۔ اب آپ ہی آ کر ان سے کہئے تو شاید وہ مان جائیں۔ اب یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں تو آج را
ٹرین سے واپس جا رہا ہوں۔"

"کیا کہا" وہ ایکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "تم جا رہے ہو — گدھے کہیں کے — سور کے بچے — نما
— اچھا تم جاؤ۔ ان لوگوں سے کہہ دو میں ابھی گھنٹہ بھر میں آ کر سب کی ایک ایک پائی چکا دوں گا۔ تم جاؤ یہاں سے۔"

"چلا گیا بے ایمان کہیں کا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ میری بیوی آ جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری بـ
سالے سب کمینے ہیں۔ جانے دو سب کو میرا کیا بگڑے گا۔ میں کہاں سے لا کر انھیں پیسے دوں جیسے میں نے بڑی دولت کما
ذلیل کہیں کے۔ سمجھتے ہیں اس طرح مجھے شکست دے لیں گے۔ سب حرامی ہیں۔ جانے دو۔ مجھے ار تھوڑی سی ڈالیں۔
ار بھی ڈالیں تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ روشنی اس قدر مدھم کیوں ہو گئی ہے۔ میرا گلاس کہاں ہے۔ ہاں یہ ہے۔ یہ ہے۔
ہے۔ آہا! کس قدر عمدہ شراب ہے۔ شراب کے سوا اب سب نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ سب کو جانے دو۔ جب تک شر
مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ کس قدر لذیذ اور خوش بو دار شراب ہے۔ ارے بوتل کہاں ہے۔ آخر یہ کیوں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ
ٹھنڈی ٹھنڈی چیز لگی ہے۔ یہی تو بوتل ہے۔ اف وہ یہ اس قدر وزنی کیوں معلوم ہو رہی ہے۔ کوئی پرواہ نہیں۔ کوئی پرو
اخاہ! آخر میں نے گلاس میں انڈیل لی نا — مجھے بہت نشہ ہو گیا ہے۔ یہ شراب بہت تیز ہوتی ہے۔ راجہ صاحب
تمھارا سے صرف گھونٹ گھونٹ کر کے پینا چاہیئے۔ ہاں اب میں اسی طرح پیوں گا چسکیاں لے لے کر۔ اخاہ۔ بس اس پیگ

میں اب نہیں پیوں گا۔ مجھے بہت اچھی طرح نیند آ رہی ہے۔ ایک مدت کے بعد اس قدر جلد سونے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ابھی تو اس گلاس میں شراب ہے۔ یہ تو ختم ہو جائے۔ اس وقت صوفے پر سر ٹیک دینا کس قدر آرام دہ معلوم ہو رہا ہے۔"

اور جب ایک گھنٹے بعد ہوٹل کا منیجر اپنا بل لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اسی طرح صوفے پر لیٹا تھا۔ گلاس الٹ کر اس کے زانوؤں میں پڑا تھا اور اس کی آنکھیں شیشے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس کا جسم برف کی طرح سرد اور پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی چند مطبوعات

منتخبات کلام

سراج سخن — عبدالقادر سروری (زیر طبع)
ایمان سخن — سید محمد — عہ
بادہ سخن — ڈاکٹر احمد حسین مائل — عہ
کیف سخن — ڈاکٹر زور (زیر طبع)
فیض سخن — عہ
متاع سخن — ڈاکٹر زور — عہ
رمز سخن — " — عہ

افسانے، ڈرامے اور ناول

رات کا بھولا اور دیگر افسانے — عبدالقادر سروری — ؏ہر
من کی دنیا — رشید قریشی — عہ
محبت کی چھاؤں — ظفر الحسن — ؏ہ
رم جھم — سری کرشن سنہا — ؏ر
ہرش کے ناخن — میر حسن، مخدوم محی الدین (زیر طبع)
کاغذ کی ناؤ — صاحبزادہ میکش — ؏ہر
سلک گوہریں — جلال الدین اشک — ۸ر
پیا کا جادو — عبدالمجیب الحضری — ۸ر
نیلی — عظیم النساء بیگم — ؏ہر
رادھا اور رنگ محل — وزیر حسن — ؏ہر

خطوط اور مضامین

روح غالب — ڈاکٹر زور — ے
شاد اقبال — " — ے
مکتوبات شاد عظیم آبادی — ے
رسائل طیبہ — طیبہ بیگم — ے
نذر دکن — سکینہ بیگم — ؏ہر
اردو نمبر — عاں
ترقی پسند ادب نمبر — حمید الدین شاہد — ۱۲ر
ریڈیو نمبر — ؏ہر

ادب لنسواں

من کی بتیا — لطیف النساء بیگم (زیر طبع)
سوتیلی ماں — رابعہ بیگم (")
علم خانہ داری — محمودہ صدیقی — ؏ہر

ادب اطفال

پانی کی کہانی — فیض محمد صدیقی — ۱۲ر
پودوں کی کہانی — محمد سعید الدین — ۱۲ر
کشمش نانی — شجاع احمد قاید — ۱۲ر
باتیں — عہ
چیونٹی — ہندراج سکسینہ — ؏ہ

عرب اور عربستان — جہاں بانو بیگم — ۱۲ر

سائنس

سائنس کے کرشمے — میر حسن — عہ
آب دوز اور سرنگ — فیض محمد صدیقی — ۱۲ر
زہریلے پودے — ڈاکٹر محمد عبدالسلام — ۱۲ر
طبیعاتی کائنات — محمد علی خاں — ۱۲ر
ہمارے پھول — محمد سعید الدین — عہ

عام معلومات اور تعلیم بالغان

تعلیم کا مسئلہ — ڈاکٹر رضی الدین — عہ
معلم بالغان — سید زاہد حسین — عہ
رفیق اردو داں — مرزا عصمت اللہ بیگ — عاں
اردو دانی کی پہلی کتاب — سجاد مرزا — ۲/؏ہر
" دوسری کتاب — " — ۴/؏ہر

فن تقریر

خطابیات — شیخ رحیم الدین — ؏ر
دفتری معلومات — ظہیر الدین احمد — ؏ہر
عروض — سید کلیم اللہ حسینی — ۶ر
بلاغت — " — ۱۰ر
مرقع مشاہیر — ؏ہر
اردو انسائیکلوپیڈیا — ؏ہ

ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

مجھے انتظار نہیں

یوسف منان

بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ اندھیرا کچھ اور گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ایرانی کی ہوٹل کی گھڑی میں دن کے گیارہ بج رہے لیکن ہوٹل کی بتیاں جلائی گئی ہیں۔ ہوٹل کچاکھچ بھری ہوئی ہے۔ میں سائبان تلے کھڑا ہوں کیونکہ میرے پاس نہ چھتری ہے نہ رین اور ڈبل بوٹ ہیں۔ میری اکلوتی پتلون قمیص کی حفاظت مجھے بعض مرتبہ جان سے زیادہ عزیز ہونے لگتی ہے کیونکہ لوگ کپڑے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اور کچھ میری اپنی طبیعت بھی صاف اور اجلا رہنے پر آمادہ رہتی ہے۔ اس وقت میں بھیگنے کا خوف لئے کھڑا ہوں

میرے سامنے شہر کا سب سے بڑا اور مشہور ہسپتال ہے۔ ہسپتال کے پھاٹک کے اندر قیدیوں سے بھری ہوئی دو لاریاں کھڑی ہیں۔ لاری کے پچھلے دروازوں پر دو دو سپاہی بھی بندوق سنبھالے بیٹھے ہیں جو دھندلائے سے لگتے ہیں۔ اس دھندلاہٹ میں ان کا بھدا سا یونیفارم بھی شامل ہے جو گہرا رنگ یوں جذب کئے ہوئے ہے جیسے جاذب نے روشنائی چوس لی ہو۔ قیدیوں لباس کو میں نے تصوراتی دائرہ میں رکھا۔ سفید کھادی کا کرتہ جس پر کالی دھاریاں ہیں، ایک دوسری کو کاٹتی ہوئیں۔ مربع بنات اسی کپڑے کی گول ٹوپی اور آف نیکر ——— ان ہی لباس، بعض اس میں داڑھی ہوں گے جن کی لمبی اور گول پیلے رنگ کی ہوں گی جن کو پہن کر شاید وہ خود بھی اپنے آپ پر ہنستے ہوں گے۔ لاری میں سب بیمار قیدی بھرے ہیں۔ سرکاری مہمان اور ان کی جان و مال کی حفاظت میزبان پر لازمی ہے۔ اسی لئے بیمار قیدی ہسپتال لائے گئے ہیں۔

میرے ارد گرد اچھا خاصہ مجمع ہے جو دیواروں سے لگا لمبی اور بے ڈھنگی قطار دکھائی دیتا ہے۔ میں بھی اس قطار کھڑا ہوں۔ مسکرا رہا ہوں۔ کیونکہ قطار کے تصور نے میرے ذہن میں اقبال کا ایک شعر اگل دیا ہے۔ ایک ہی......

میں مسکراتا ہوں۔ شعر لاجواب ہے۔ لیکن اقبال کے ذہن میں بارش سے بچنے والے وہ لوگ تھوڑے ہی ہوں گے ایرانی ہوٹل کے سائبان تلے یوں بے ڈھنگی قطار لگائے ہوئے ہیں۔ وہ شعر تو صف کا لفظ استعمال کرتا ہے جو یا تو فوج ہیں یا پھر نمازی......

میں اپنی ذہنی آوارگی کا بہت بری طرح سے شکار ہوں جو خواہ مخواہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ ڈھونڈنے پر مجبور کرتی میں سر ہلا کر صفوں کی ترتیب تتر بتر کر دیتا ہوں اور اپنے آس پاس کے لوگوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ میری حیرت کی انتہا نہیں ر میں ایک ہوٹل کے مالک کو بھی اس بھیڑ میں دیکھ لیتا ہوں۔ اس کی مخصوص لنگی اور سفید قمیص یوں تو آج بھی اس کے جسم پر لیکن بیچارہ، گردشوں نے اسے محتاج بنا دیا۔ ایک چھتری کا پاس ہونا بھی شاید اس کے لئے ایک مسئلہ بن چکا ہے جس کرنے کے لئے وہ چائے خانوں کے چکر لگایا کرتا ہے۔ جہاں چرس، گانجہ اور "یا علی توڑ دشمن کی نلی" کے نعروں کی گونج دھواں پھیلاتے ہیں۔

ایک گرم پتلون والا اپنی چھتری بند کر کے قطار میں شامل ہو گیا۔ میں نے اس کی پتلون کے بھیگے ہوئے پائنچے دیکھے کی ریشمی قمیص بھی بائیں کندھے پر بھیگ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر تاسف تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے اپنی پتلون اور کن نظر ڈالی۔ پھر اس نے آسمان پر چھائے بادلوں کو دیکھا۔

"صبح سے برس رہا ہے" کسی نے کہا
"آج کام پر بھی نہ جا سکا۔"
"کیا آیا ——؟"
"جوکے سے نوا ——"

میرے اردگرد آوازیں بھی تھیں۔ جن سے ایک گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوا کے خنک جھونکوں میں اتنی گرمی بڑا اطمینان بخش رہی ہیں۔ لیکن بیڑی کی دوکان کے نیچے بیٹھا ہوا ایک شخص شدت سے کانپ رہا ہے۔ اس کا لاغر جسم ننگا ہے جس پر اس نے ایک پرانا اور بھیگا ہوا سیاہ کمبل لپیٹ رکھا ہے جو کسی نے رحم کھا کر اس کو دیا ہوگا۔ یہ وہ کمبل تھا جس کو بارش پروف سمجھ کر گھاٹی لوگ چھتری نہ ہونے کی صورت میں سر پر دوہرا تہرا کر کے یوں ڈال لیتے ہیں کہ سر بھی بچا رہے چہرہ اور پیٹ بھی۔ اس بھکاری کے گرد بو تھی جو ناک میں خارش پیدا کر رہی تھی۔ اس نے پیشاب اور پاخانہ وہیں کر رکھا تھا۔ اس کے پاس کچھ پیاز کے بجھے، پاپڑیاں اور گھانٹیے بھی پڑے تھے۔ ایک آدھی ڈبل روٹی بھی تھی جو بھیگ کر پھول گئی تھی۔ لاغر فقیر تھرتھراتی نظروں سے اس روٹی کو دیکھ رہا تھا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ یہ سوچ رہا ہے کہ آخر پانی انسان کو کیوں پھلا نہیں دیتا وہ اس کے جسم میں تھرتھری اور کپکپی کیوں پیدا کر دیتا ہے۔

"پسلیاں گن لو سالے کی" کسی نے کہا۔

میں نے جب اس بے درد کی طرف دیکھا تو وہ شخص رومال سے ناک پونچھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک لمبے منحنی شخص نے فقیر کی طرف یوں بیدردی سے دیکھا جیسے اس ڈھانچے کی واقعی ہڈیاں گننے لگا ہے۔ پھر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا "سالے مر کیوں نہیں جاتے سمجھتے ہیں کیا مزہ ہے۔ بھوک، بیماری، بیکاری ——" اس نے اپنے بڑے بڑے بالوں پر دونوں ہاتھ ایک ساتھ پھیرے۔ اس کی میلی قمیص اور میلی ازار، کافی حد تک بھیگ چکے تھے۔ اس نے یوں تو شیو کر رکھا تھا لیکن کان کے نیچے جبڑوں کی ابتدا میں کچھ بال ایسے رہ گئے تھے جن سے یہ اندازہ لگانا کہ اس نے عجلت میں خود ہی ڈاڑھی بنائی ہے بہت آسان تھا۔ اس نے اپنی بے باک نظریں بادلوں پر ڈالیں اور بولا۔

"بادل چھٹ رہے ہیں" اس کی آواز میں مسرت تھی۔

بارش دھیمی ہو گئی تھی۔ رکی نہیں تھی۔ اس لئے لوگ سائبان تلے سے نکلتے ہوئے شاید گھبرا رہے تھے۔ گرم پتلون اور ریشم کی قمیص والا بڑی دیر سے منہ بنائے کھڑا تھا کیونکہ اس کے پاس کھڑے ہوئے دو قلی نما انسان سٹہ کی اوپننگ کلوزنگ پر باتیں کر رہے تھے۔ بارش کے دھیمے پن سے اس نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے چھتری کھولی اور رحمت باراں میں شامل ہو گیا۔ وہ جا رہا تھا۔ میں اس کی سیاہ چھتری کو دیکھ رہا تھا جس کی تیلیاں قطروں کی دھار چھوڑ رہی تھیں۔ اس نے پائنچے اٹھا رکھے تھے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے بچتا بچاتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو گول مول کئے وہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی گنہگار ہو۔

"کیوں بار بار اس بھڑوے کا نام لیتا ہے۔" ایک شخص نے کہا۔ اس نے منہ میں سگریٹ لگا لی تھی۔ دیا سلائی کی ڈبیہ اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک جملہ کہنے کے بعد رک گیا تھا۔

"دنیا کچھ بھی بولے، وہ تو مزے اڑا رہا ہے۔" ایک حریص آدمی نے کہا۔

"ایسے مزے کی ....." اس نے ماں کی گالی دی۔ وہ کش لگا چکا تھا اس لئے دھواں اس کے منہ سے جملے کے ساتھ نکلتا رہا۔

"محنت کرو، اپنی طاقت سے پیدا کرو، سالے مالدار عورت سے شادی کر لیتے ہیں۔" اس نے بڑی نفرت اور بیزاری

سے سگریٹ کے کش لگائے۔ دوسرا آدمی خاموشی سے اپنی ٹوپی ہاتھوں میں گھما رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دبی دبی ہنسی تھی۔ جس کو وہ چھپانا چاہتا تھا اور جس کا اظہار بھی ضروری تھا تاکہ اپنے دوست کو بتلا سکے کہ ہاں پیارے یہ بہت برا ہے۔ میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں ـــــ لیکن اس کی یہی ہنسی اس کا بھی اظہار کر رہی تھی کہ تم بکتے ہو۔ محنت عیش و آرام نہیں دے سکتی محنت کوڑیوں کے مول بکتی ہے۔ محنت کی کوئی قدر نہیں۔

میں اس شخص کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو ایسا تھکا ہارا مسافر تھا جس نے آرام کرنے کے لئے سرائے کا وہ کمرہ بھی قبول کر لیا ہے۔ جس میں دیہات سے لوٹی ہوئی ہجڑوں کی ٹولی بسیرا لے چکی تھی۔

بارش تھم گئی۔

لوگ ادھر ادھر کھسکنے لگے۔ مجھے اتنے سارے لوگوں کے تتر بتر ہونے پر افسوس بھی تھا۔ افسوس یوں کہ میں ان کی باتوں کی گرمی سے محروم ہو رہا تھا اور خوشی یوں کہ یہ سب اپنے اپنے کاموں کی تکمیل کے لئے جا رہے تھے اور مجھے بھی موقع مل رہا تھا کہ میں اکیلا رہ کر یہ سوچ سکوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

ہسپتال کے احاطے میں قیدی اتارے جا چکے تھے۔ وہ ٹپک ٹپک کر باہر کی دنیا دیکھ رہے تھے۔ عورتوں کو دیکھ رہے تھے بچوں کو دیکھ رہے تھے اور ایرانی ہوٹل کے شوکیس میں رکھے ہوئے طرح طرح کے کیک دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے ملنے جلنے والوں سے بیڑیاں اور سگریٹ پا لئے تھے۔ جبھی کافی قیدیوں کے پاس سگریٹ بیڑیاں سلگی ہوئی تھیں۔ سپاہی مطمئن تھے۔ کیونکہ ان کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ یہ قیدی آرام دہ بارکیں، کھانا اور کپڑا چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں بھاگ جائیں گے جہاں لاغر فقیر پرانا کمبل لپیٹے آخری سانس لے رہا ہے۔

فقیر واقعی چند گھنٹوں کا مہمان تھا۔ نہ جانے کیوں وہ ہسپتال کی زرد دیواریں نہیں دیکھ رہا تھا۔ جہاں مریضوں کے لئے آرام دہ بستر ہیں۔ طاقت کی دوائیں ہیں، انجکشن ہیں اور پیاری پیاری نرسیں ہیں جو کبھی ماں بہن یا محبوبہ بن کر جلا بخش دیتی ہیں۔ شاید فقیر کی آنکھوں کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ اس لئے اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ اگر وہ دیکھ سکتا تو ضرور اس کا دل ہسپتال کی آرام دہ زندگی کو دیکھ کر جگمگا اٹھتا اور اس کے چہرے پر امید کی کرنیں پھیل جاتیں لیکن وہ ایک ایسا اندھا نظر آ رہا تھا جس کی آنکھوں میں روشنی بھی ہے لیکن وہ دیکھ نہیں پاتا ہم سب کی طرح جو دیکھتے ہیں سمجھتے ہیں۔ ہم سب بھی اندھے ہیں۔

میں کتنی دیر سے کھڑا ہوں لیکن میں نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی کہ سفید سفید اجلے فراک والی نرسوں کی آمد و رفت بھی شروع ہو گئی ہے۔ میری نگاہوں کی بصارت جیسے لوٹ آئی۔ کیونکہ وہ نرسیں جو زندگی بخشتی ہیں میرے سامنے تھیں اور میں ان کے بالوں اور جسموں سے اٹھنے والی خوشبو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ حالانکہ ہوٹل کے دروازے پر کھڑا ہوا ایک شخص منہ پر رومال رکھے لاغر فقیر کو ترس بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

مجھے اس کا انتظار ہے جس نے میرے تھکے ہوئے جسم کو راحت دی تھی جس نے میری نغمگی سے ناآشنا کانوں میں امرت ٹپکایا تھا اور جس نے میرے ٹھہرے ہونٹوں کو قوت گویائی دی تھی جس نے میرے ذہن کے انتشار کو سکون بخشا تھا۔ میری سلگتی ہوئی روح کو اپنے پیار کی خنکی دی تھی لیکن اس کا انتظار کافی طوالت لے چکا تھا۔ جس نے ذہن کو اکتا دیا تھا۔ جس نے پیروں کو تھکا دیا تھا جیسے میں نے ہزاروں میل کا لمبا سفر پیدل طے کیا ہے۔

میں نے پیار سے اس فقیر کو دیکھا جو چند گھنٹوں بعد مر جائے گا۔ اس کا پوسٹ مارٹم ہو گا۔ میں نے پیار سے اس قیدی کو دیکھا جو بڑے بیہودہ ڈھنگ سے ٹرام کی منتظر ایک عورت کو انگلی دکھا رہا تھا۔ ہم سب کو صحت کی ضرورت ہے۔ ہم سب بیمار ہیں۔

پھاٹک میں آنے جانے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ کھانستے ہوئے۔ لنگڑاتے ہوئے رگ رگ آ رہے تھے جا رہے تھے۔ پٹیاں
پیٹے، دواؤں کی بوتلیں سنبھالتے ہوئے عورت، مرد، بچے۔

اتنے میں دو آدمی اسٹریچر اٹھائے ہوئے آئے اور انھوں نے اس لاغر فقیر کو اس پر لٹا دیا اور اٹھا کر یوں چلے جیسے
کرکٹ کرکٹ لئے جا رہے ہیں۔ لاغر فقیر کا کمبل رہ گیا جس کو ایک کونے میں دبکا فقیر بڑے پیار سے دیکھ رہا ہے۔ بدبو اب بھی باقی
ہے۔ گندگی اب بھی قائم ہے۔ لاغر فقیر نہ جانے غسل صحت پائے گا یا غسل میت۔ یہ سوائے ڈاکٹروں کے کون بتلا سکتا ہے وہ
مر جائے۔ اس کی طبعی عمر چالیس پینتالیس سال ہی ہے۔ جی کر بھی وہ کیا کرے گا۔ وہی بھیک فاقہ ..... جاؤ دوست یہ ہسپتال بھی
ایک دنیا ہے۔ جینے کی جدو جہد کرنے والے مریضوں کی دنیا۔ جاؤ اپنی زندگی کو تلاش کرو۔ اس احاطے میں گھری دنیا جس کے پھاٹک
پر قیدی بھی ہیں اور سپاہی بھی جو تمہیں نفرت سے دیکھ رہے ہیں۔

میری نفرت بھی ابھر آتی ہے۔ پاجی۔ دو کے کندھے پر جا رہا ہے۔ اسے چل کر جانا چاہئیے جیسے اور مریض جاتے ہیں۔ اسے
اس وقت جانا چاہئیے تھا جب اس نے لاغری کا پہلا حملہ محسوس کیا تھا۔ اسی وقت سوچ لینا تھا کہ اسے زندہ رہنا ہے۔ ہر قیمت پہ
ہر صورت میں۔ زندگی ایک خوبصورت نرس کی طرح اجلی اور بشاش ہوتی ہے۔ منحوس یہ جانے بغیر فٹ پاتھ پر پڑا رہا۔

میں بھی آہستہ آہستہ سڑک پہ آگیا۔ ٹرام مسافروں کو لئے ہوئے گذر گئی۔ برماشیل کی ایک رنگ برنگی لاری نے بھی بلی
کی طرح راستہ کاٹا اور ایک گھوڑا گاڑی بھی چھینٹیں اڑاتی گذر گئی۔ میں نے سڑک پار کی۔

میں پھاٹک میں داخل ہو گیا۔

قیدیوں نے مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں رشک تھا۔ سپاہیوں نے دیکھا۔ ان کی نظریں مجھے پرکھ رہی تھیں، مریضوں
نے بھی دیکھا۔ وہ میری بیماری کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن میں ان سب کے لئے ایک معمہ تھا۔

مجھے جستجو تھی۔ میں نے انتظار چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کو احاطے میں گھری دنیا میں تلاش کر رہا تھا۔ ایک اجلی اور بشاش
نرس کی جستجو۔ جو مجھے زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

سستی، خوب صورت اور زندگی آموز
کتابوں کا واحد مرکز
پیپلس بک ہاوس
نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن
ایک بار ضرور زحمت کیجئے

یہ بک اسٹال ہے
ہندستان، پاکستان اور حیدرآباد دکن کے ممتاز ترقی پسند ادیبوں کی زندگی نواز تخلیقات سستے داموں بکتی ہیں۔
سویرا، فنکار، شاہراہ، نقوش، ادب لطیف، ہمارا ادب، سب رس، روح ادب، نگار، آجکل، پریت لڑی ۔۔۔ اس کے علاوہ تمام علمی رسائل ہر زبان میں خریدئیے۔ یہ حیدرآباد کا پہلا بک اسٹال ہے جہاں ہر قسم کا لٹریچر و کتب مل سکتے ہیں۔
اسٹار کمپنی
بکسیلرس اینڈ پبلشرس
معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد دکن

آمنہ ابوالحسن

اوراقِ پریشاں

۱۸ر جنوری ۱۹۵۷ء

صبح ہوئی اور مصروفیات نے گھیرا، ناشتہ کی تیاری، نوکروں کی نگرانی، بچوں کی چیخ پکار، اسکول جانے کا ہنگامہ ـــ نو بجے بجتے سکون چھاگیا ـــ جانے والے چلے گئے، صرف وہی بچ رہے جنھیں کہیں نہ جانا تھا ـــ بچے کھیلنے کے لئے چلے گئے ـــ میں نے کتابیں سنبھالیں ـــ کتنا دلچسپ ہے یہ مشغلہ بھی کہ نہ وقت کٹنے کا پتہ چلتا ہے نہ تنہائی کا احساس ـــ لگتا ہے ہم نہیں دنیا ہی ہماری مٹھی میں بند ہے ـــ کامیڈی، ٹریجڈی، ہنسی مذاق سنجیدگی سبھی کچھ تو مل جاتی ہے ـــ "اے حمید" کے "منزہ و گلاب" نے زندگی کو پھر ایک پہیلی بنا دیا۔ ہونٹوں کے قہقہے غم اور فکر کے دھندلکے میں ڈوب کر رہ گئے۔ ذرہ ذرہ 'بولتا بولتا' پتہ پتہ جیسے ہنسا بھول کر سوچنے لگا ـــ وہ انجانی باتیں ـــ وہ انوکھے طریقے، جو فکر کو گہرائی بخشتے اور نامعلوم طریقے پر احساس کو اجاگر کر کے کبھی مجروح کرتے، کبھی جینا سکھاتے ہیں ـــ کتنی خاموش محبت، کیسی پیاری، کیسی اچھوتی، کتنی گہری ـــ دل خواہ مخواہ اس محبت کیلئے مچلنے لگا جو بار بار جتائی نہ جائے بلکہ جس کا اظہار انسان کے اپنے عمل سے ہو ـــ اس کے سلوک سے ہو، اس کی آنکھوں کی گہرائی سے ہو جیسے ـــ جیسے پروفیسر کی محبت اور رضیہ کا رول ـــ جی چاہا خود رضیہ بن جاؤں ـــ مگر ـــ پروفیسر کہاں؟ یہاں تو دن بدن خلوص و محبت ناپید ہوتے جا رہے ہیں پھر ایسی بلند، ایسی ارفع ہستی کہاں ملے جو پروفیسر کی جانشین بن سکے ـــــــــ!!

"ن" نے پھر پاگل پن شروع کر دیا ـــ اس کی محبت میں وہ اضطراب نہیں جو خود کو بے کل کر دے، بلکہ ایسا اطمینان ہے جو سب کچھ پا لینے کے احساس سے ہوتا ہے ـــ پگلا کہیں کا ـــ مجھے سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر یہی نہیں سمجھتا کہ میں کیا چاہتی ہوں ـــ کاش ـــ پروفیسر کی گہرائی اس میں پیدا ہو جائے تاکہ ایک لمحے کو رضیہ بننے کا احساس مجھے بھی ہو جائے ـــ یہ ایک لمحہ میرے لئے بڑا قیمتی ہوگا ـــ زندگی بھر سے زیادہ قیمتی ـــ دن ڈھل چکا ـــ رات آرہی ہے ـــ!!

رات کچھ اس طرح دبے پاؤں میرے دروازے پر آکھڑی ہوئی کہ خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا جیسے رات کائنات کے لئے نہیں صرف میرے ہی گھر آئی ہے ـــ تنہائی، اداسی لیے ہوئے ـــ چاند گہنا کے کمبخت اور نکھر گیا ـــ نور کا دریا سا بہہ رہا ہے، مگر مجھے کیا۔ میرا احساس تو بڑا مجروح ہے ـــ انتشار، الجھن، پریشانی ـــ سکون کا میلوں پتہ نہیں ـــ!

بچوں کو کھلا پلا کر سلا چکی تو وقت کچھ گذرتا محسوس ہوا ـــ "ن" نے وقت گزاری کے لئے رات کی دعوت بھی دے دی ـــ "کہیں باہر چلیں"ـــ باہر ـــ مگر باہر کیا رکھا ہے ـــ!! چاند تو میرے سر پہ ہے ـــ اب کس طرح "ن" کو سمجھاؤں کہ میرے پیچھے حیران نہ ہو ـــ کانچ کا اعتبار ہی کیا ـــ گرفت رہی تو سلامت، گرفت چھوٹی تو ریزہ ریزہ ـــ میں نے فیصلہ کر لیا آج کہیں نہ جاؤں گی۔ تو پھر وقت کیسے گذرے؟! لاؤ کچھ پڑھ ہی لوں ـــ میں نے ورق گردانی شروع کی ـــ مگر منزہ و گلاب کے بعد کچھ اچھا نہ لگا ـــ اچھے اچھے شہ پارے بھی متاثر نہ کر سکے ـــ میں نے گلاب کی کلی نکالی ـــ گلابی گلاب ـــ گلابی کلی ـــ ادھ کھلا پھول جو "ن" نے آج ہی بھیجا ہے ـــ کتنا نازک، اور پیارا تحفہ ہے ـــ مگر کھلنے سے پہلے ہی توڑ لیا جائے اس میں کھل ہونے کا احساس کہاں ـــ کلی پھول نہیں ـــ میں میں نہیں ـــ! "یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ـــ"

۱۹ر جنوری ۱۹۵۷ء

صبح سات بجے اٹھی ـــــ اناج آچکا تھا ـــــ تلواتے تلواتے ہی دس بج گئے ـــــ چائے کی ایک پیالی نے دس بجے تک سنبھال رکھا ـــــ جب اباجی دفتر اور بچے اسکول چلے گئے تو میں نے ناشتہ کیا ـــــ دنوں بعد "س" کا خط آیا ـــــ "س" بھی عجیب ہستی ہے جو کبھی دور کبھی نزدیک ـــــ اس سرگوشی کی طرح جو کبھی دبی ہو کبھی ابھری ـــــ اچھا دوست ہے ـــــ!

میں بھی عجیب ہوں ـــــ اس صدائے بازگشت کی طرح جس کا ڈوبنا ابھرنا صرف ایک ہی آدمی سن سکے ـــــ! کاش دو جہاں کے لئے ہوتی ـــــ سب جہاں کے کام آتی ـــــ زندگی پر سے ایقان کبھی کبھی نہ جانے کیوں اٹھ جاتا ہے ـــــ پھر لاکھ کوشش کے باوجود نہیں آتا۔ ایسے موقع پر چھوٹی بڑی چیز نئی بن جاتی ہے، ہر جانا پہچانا آدمی اجنبی لگتا ہے ـــــ جیسے دنیا میں تنہا آئی، تنہا چلی جاؤں گی ـــــ دنیا میری نہیں ـــــ کوئی میرا نہیں ـــــ میں کسی کی نہیں ـــــ ایک طویل راستہ، ایک ایسی راہگذار ہے جس پر سے بس یوں ہی گزر رہی ہوں ـــــ جب یہ راستہ ختم ہو جائیگا قدم خود بخود رک جائیں گے ـــــ قدم جہاں رکیں گے وہی منزل ہوگی یا نہیں ـــــ یہ نہیں جانتی ـــــ کون کہہ سکتا ہے کہ وہی منزل ہے ـــــ؟! ہو سکتا ہے وہاں سے ایک نیا راستہ آگے بڑھ جائے ـــــ کاش راستے بھی اتنے مٹ جانے والے ہوتے کہ جب چاہتے مٹ جاتے، جب چاہتے بن جاتے مگر یہ راستے ـــــ یہ پگڈنڈیاں ـــــ جن پر قدم رکھتے ہوئے زندگی گذرتی ہے، ہمارے ان مٹ ہوتے ہیں ـــــ صدیوں کے نقوش کہیں راہیں بناتے ہیں پھر انہیں مٹانے کے لئے بھی صدیاں ہی چاہیئے ـــــ اور میں چلی جا رہی ہوں منزل متعین کئے بغیر ـــــ کچھ پانے کی ہوس نہ کچھ کھونے کا خوف ـــــ جیسے اس دنیا سے مجھے مطلب ہی نہیں ـــــ یوں ہی آئی تھی یوں ہی چلی جاؤں گی ـــــ بہار کے پھول سمیٹے ـــــ خزاؤں کے خس و خاشاک کے لئے ـــــ ایک نشیمن بناتی ـــــ ایک نشیمن اجاڑتی ـــــ!!

"س" نے مدد کیا مانگی مجھے اپنی نااہلی کا اور بھی شدید احساس ہو گیا ـــــ کاش اپنی زندگی کی مالک ہوتی ـــــ خود مختار ہوتی ـــــ پھر اسے مدد دینا کتنا آسان ہوتا ـــــ اور اسے مسرور دیکھنا کتنا دل خوش کن ـــــ؟ چند یادوں کی طرح، چند ساتھی بھی بڑے محبوب ہوتے ہیں۔ یہ طے کرنا ہی مشکل ہوتا ہے کہ ان چند ہستیوں میں سب سے محبوب ہستی کون ہے ـــــ!!

پھول سب اپنی نوعیت کے اچھے ہوتے ہیں ـــــ کوئی خوش رنگ، کوئی خوشبودار اور کوئی بغیر خوشبو اور رنگ کے لطیف، کوئی سورج کی زرنگار کرنوں پر کھلنے والا، کوئی چاند کی نرم کرنوں پر پھولنے والا، کوئی صبح کا ستارہ، کوئی شب کا پجاری ـــــ عشق پیچاں، بید مجنوں، نرگس بیمار ـــــ اور وہ چھوئی موئی ـــــ نازک نازک، کومل کومل ـــــ اچھوتی سی ـــــ میرے احساس کی طرح ـــــ پل میں جاگتی، پل سوتی، پل میں بولتی، پل میں خاموش ہو جاتی ـــــ کتنا دل چاہتا ہے کسی ایک کو منتخب کر لوں ـــــ مگر پھر بھی دل پلٹ جاتا ہے ـــــ ایک سے دل نہیں بہلتا ـــــ جی چاہتا ہے جس طرف پلٹوں، ادھر رنگوں اور خوشبوؤں کا طوفان ہو ـــــ اپنے رنگ میں نہائے، اپنی خصوصیت میں ڈوبے، قدم سے قدم ملائے سب ساتھ رہیں ہنستے، بولتے مسرور ـــــ مگر ـــــ اف یہ دنیا ـــــ! یکی کیا ہے؟ ایک کو دیتا قرار دکھ سب کو ستر و کر دیتا ہے۔ اسی لئے تو نہیں بڑھاتی قدم ـــــ نہ اتنی مستقل مزاج ہوں نہ اتنی سنگ دل، نہ اتنی سخت جان ـــــ کسی کا سکتا نہ سن سکتی ہوں نہ دیکھ سکتی ہوں ـــــ بس تو پھر یہی اچھا ہے کہ سب کے ساتھ رہوں ـــــ سب سے ہنسوں بولوں اور جب مر جاؤں تو یہ غم نہ رہے کہ کسی کو میں نے دکھ دیا، کسی کے بڑھتے ہاتھ روک دیئے، کسی کی زندگی اجاڑ کر رکھ دی ـــــ وہ چمن بننا چاہتی ہوں جہاں بھانت بھانت کے پھول کھلیں، جہاں دور دور سے لوگ آئیں، جہاں سب کی نظریں سکون حاصل کریں، کوئی تشنہ نہ رہے، کوئی مرجھانے نہ پائے، کوئی لوٹ نہ جائے ـــــ سب سیراب ہوں اور میں سب کے لئے زندہ رہوں ـــــ!!!

جب سے "ب" دواخانہ گئی ہیں اور اکیلی ہو گئی ہوں ـــــ "ع" اور بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد تو یہ تنہائی اور شدید ہو جاتی ہے ـــــ رضائی سب الگ نماشپ ـــــ اباجی دفتر میں ـــــ میں یہاں گھر میں ہوتی ہوں ـــــ دل کتنا اکتاتا ہوگا ـــــ کاش کوئی

سوچ سکتا ——؟ مگر جب لوگ بہت جمع ہو جائیں تب بھی تو کچھ اچھا نہیں لگتا —— تب سکون کی خواہش اسقدر بڑھ کیوں جاتی ہے ——؟ طبیعت کی اسی دورنگی سے تو عاجز ہوں —— نہ یوں چین نہ ویسے قرار —— نہ جانے چین ہے کہاں —— جو کسی صورت ملتا ہی نہیں ——؟! وہ روز سے "ع" بھائی بھی نہیں آئے —— نہ آئیں —— مجبور بھی تو نہیں کر سکتی —— مصروف آدمی ہیں —— جب فرصت ہوگی ضرور آئیں گے —— کاش انھیں فرصت جلد مل جائے ——!!

"ن" کا خط کوئی دم میں آتا ہی ہوگا —— کتنا اصرار ہے اس کا اداس نہ رہا کروں —— ہنسوں، ہنساؤں، مسرور رہوں، روز تفریح کروں اور نمائش آیا کروں —— دیوانہ لڑکا —— وارفتگی کی حدوں کو پار کر کے جنون کی حدوں کو چھو رہا ہے —— کتنی بار کہا اس سے مجھے بھول جائے، میرے پیچھے حیران نہ ہو —— جسے اپنے آپ پر خود بھروسہ نہیں وہ دوسروں کے لئے قابل اعتماد کیسے ہو سکتی ہے ——؟ مگر اسے تو جیسے جنوں ہے میرا —— نہ جانے یہ جنون اسے کہاں لے جائے ؟! اس کا یقین بھی عجیب ہے! "تم اپنے آپ پر اعتماد کرو یا نہ کرو، مجھے تم پر اپنے آپ سے، دنیا بھر سے زیادہ اعتماد ہے" —— واہ رے اعتماد!! اگر واقعی کوئی چیز ہے تو منزل یقیناً بن جائے گی —— اب میں کہاں تک سر پھوڑوں —— اس کا تڑپنا، اس کا اداس ہونا دیکھ نہیں سکتی تو کہہ دیتی ہوں —— "جاؤ خوش رہو تمہاری خاطر جئے جا رہی ہوں —— مگر کون جانے کس خاطر جی رہی ہوں —— کس کو فریب دے رہی ہوں —— اپنے آپ کو یا اس غریب کو. ——؟!!!

دو بج رہے ہیں مگر اس وقت تک کچھ پڑھنے کی فرصت نہیں ملی —— کل تو جیسے سامانہ ختم کرنے پر تل گئی تھی اور آج —— آج وقت نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ رسالے کو چھو سکتی —— "ص" کا جواب بھی ادھورا ہے کوشش کر کے شام میں پورا کر دوں گی —— آج دوا خانہ تو جانا نہیں ہے۔ بجلی کا جو لفافہ "ف" کے ہاتھ "ب" کو بھجوا دوں گی اور اسی کے ساتھ اپنی مخلص آرزوئیں بھی —— شام کا انتظار ہے —— خدا کرے اچھی گزرے ——!!

"ن" کا خط آ گیا —— آج اس نے سکون نہیں دیا —— اس احساس کے باوجود کہ قلم میرے ہی لئے اٹھایا گیا یہ احساس بھی ہوتا رہا کہ قلم مجبور رہا ہے اپنے مالک کے ہاتھوں —— ورنہ حروف اس قدر عجلت میں نہ لکھے جاتے اور سیاہی یوں پھیلی نہ ہوتی کہ تحریر پڑھی نہ جا سکے —— وہی نمائش کا اصرار —— "تم آؤ" —— آتشبازی کا خاص مظاہرہ ہے۔ میں کلب کے پاس منتظر رہوں گا" —— ستم اس نے یہ کیا کہ خط کے ساتھ سینٹ بھی بھیج دیا —— اف کتنی محبوب خوشبو —— کتنی بھیگی، کتنی میٹھی، کتنی یادوں کے رس میں رچی ہوئی، نیند میری پلکوں پر تیرنے لگی، اس مدھم، میٹھی، جاں نواز بو کے ساتھ ہی ماضی کے دھندلکوں سے بچھڑی ہوئی محبوب ہستیوں نے سر اٹھانا شروع کیا جیسے یہ بو —— بو نہیں تھی —— بچھڑے ہوؤں کا ملاپ تھا، ان کی قربت تھی، ان کی سانس کی مدھم آنچ تھی جس نے "ن" —— کے منجدھار میں ایک بار پھر دلربا سنسنی پیدا کر دی —— اف کتنی محبوب تھی یہ خوشبو —— ہر محبوب سے زیادہ محبوب —— ہر یاد سے زیادہ دلکش —— ہر اقرار سے زیادہ پائیدار —— میں نے شیشی قریب رکھ لی —— نیند نے مجھے پہلو میں جگہ دے دی —— "ن" کا شکریہ تو ادا کرنا ہی تھا میں نے سوچا یہ بھی لکھ دوں گی کہ تم بہلے رہو —— بہلنے ہی میں آرام ملتا ہے اور یہ بھی کہ تمہارے قلم نے تم سے غداری کی اور میری ڈائری کے اوراق مکمل ہوتے جا رہے ہیں —— وہ بے وفا نہیں —— مورکھ ضرور ہے ——!!!

۲۰ر جنوری ۱۹۵۴ء

"ممی اٹھو نا" —— نسرین نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے میرے گال تھپتھپائے اور نیند پریشان ہو کر بھاگ گئی —— غصہ مجھے ایکدم سے آ گیا۔ اف یہ بچے!! سونے بھی نہیں دیتے چین سے —— مگر پھول ایسے چہرے پر اس کی کالی آنکھیں چمک رہی تھیں —— جیسے جاننا چاہتی ہوں کہ میں واقعی میں ہوں یا ...... ؟! "تم جاؤ باہر آ جاؤں گی" —— میں نے پھر دل اٹھا دیا —— "اوں —— ہوں۔

تمہارے ساتھ" ـــ اس نے اصرار کیا ـــ "اچھا بھئی اچھا چلتی ہوں ابھی ـــ تب تک آؤ تم بھی لیٹو" ـــ مجھے اشارہ کرکے وہ پھر لحاف میں دبک گئی ـــ نسرین میری ننھی بھانجی ـــ گڑیا ایسی ـــ پیاری پیاری ـــ طلوع ہوتی صبح کی طرح معصوم اور حسین ـــ صبح معمول کی طرح مصروف گذری ـــ تین ماہ بعد بھائی جان آئے تھے، ان سے خوب خوب باتیں ہوئیں ـــ بیتے دنوں کی باتیں ـــ مستقبل قریب کی باتیں ـــ بھابی کی، بچوں کی، سنہرے سپنوں کی باتیں ـــ زراعت کی، فصلوں کی، نفع نقصان کی باتیں ـــ ساڑھے گیارہ بجے جب وہ دوستوں سے ملنے چلے گئے ـــ میں نے پہلو بدلا ـــ شیلف سے کتابوں نے پکارا ـــ لال قلم نے زبان نکالی ـــ "مس" کا ادھورا خط پایا۔ میں جواب لکھنے بیٹھ گئی مگر عجیب تشنگی سی محسوس ہوتی رہی ـــ جیسے یا تو قلم رک رہا تھا یا الفاظ نہ مل رہے تھے یا اظہار مطلب غلط تھا۔ طبیعت جھنجھلا گئی ـــ میں تو ایسا جواب لکھنا چاہتی تھی جو نرم پھوار کی طرح اس کے احساسات پر برسے اور وہ بھول جائے کہ میں نے اسے مدد نہیں دی، اسے خراش کر دیا ـــ!!

لائٹر کے کھٹکے نے ـــ ہاتھ کی جنبش نے شعلہ بنا دیا ـــ انگلیوں کے درمیان زریں روشنی کانپتی رہی ـــ "کیپسٹن" میرے ہونٹوں میں جلتا رہا ـــ متعدد سگریٹیں پینے کے بعد کچھ موڈ آیا ـــ سماور کی ابلتی چائے نے خیالات میں روانی دوڑا دی ـــ قلم چل نکلا ـــ مگر خط ختم ہوا تو پھر یہ احساس شروع کہ خط لکھا ہی نہیں گیا۔ زچ ہوکر میں نے لکھ دیا۔

"میرے دکھ کی دوا کرے کوئی"......!

آج کی ڈاک بھرپور تھی۔ میں جتنی خالی الذہن تھی خطوط اتنے ہی بھرپور ـــ ایک ایک کرکے سب پڑھتی گئی ـــ زیادہ خطوط مختلف رسائل کے ایڈیٹروں کے تھے ـــ یہ ایڈیٹر بھی بس کمال کے آدمی ہوتے ہیں ـــ بھلا ان کا بس چلے تو قلم ہی مجھ سے چھین لیں۔ ـــ ہر ایک کی فرمائش "اپنی تازہ تخلیق سے جلد از جلد نوازئیے"۔ ایک بار تو چڑھ کر جی میں آئی سب کو ایک سا جواب لکھ بھیجوں "ناچیز کی تازہ "تخلیقات" یہاں نہیں"...... "کے پاس ملتی ہیں، خواہش مند حضرات بہ نفس نفیس لے جائیں" ـــ کیونکہ ان دنوں ساری تخلیقات باسی ہو چکی تھیں اور قلم کی ساری توانائیاں "......" کو خطوط لکھتے ختم ہو رہی تھیں ـــ

"مش" کا خط بڑا دردناک تھا، جیسے کسی نے زخم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور درد کی لہریں خون بن کر جسم میں پھیلتی گئیں ـــ احساس ٹوٹ کر رہ گیا جیسے کوئی پیچدار کمانی چوٹ سے کھل گئی ہو ـــ اب اس کی زندگی اجڑ گئی تو اس میں میرا کیا دوش ـــ ویسے ایک شاعر کی زندگی ـــ زندگی ہی کب ہوتی ہے وہ تو از سرتاپا ـــ ازل سے ابد تک ایک نامکمل مصرعہ ہی ہوتی ہے۔ جس کی تکمیل میں تمام عمر پھر سرگرداں رہتا ہے ـــ مگر پھر یہ سرگرانی کیوں؟ احساس کا بوجھل پن کیوں؟؟ جیسے گناہ کے بعد گناہ سے بھاگنے والا آدمی ضمیر کے ہاتھوں اور زیادہ گنہگار بن جائے ـــ مگر یہ گناہ ہے کیا چیز ـــ؟ مجھے "شاہراہ" کا ایک لطیفہ معاً یاد آیا اور دل بیقرار جاہا فراق کی فراست پہ قربان جاؤں ـــ دل ہلکا ہو گیا ـــ بڑی دلچسپی اور سلیقے سے میں نے اسے خط لکھا ـــ

"اپنا راستہ آپ بناؤ ـــ جنگل میں چلتے ہوئے تھک کر اونچی چٹانوں، گھنے درختوں کا سایہ ضرور لو
ـــ میٹھے چشموں کا پانی ضرور پیو ـــ مگر ان میں ڈوب کر نہ رہ جاؤ ـــ اپنی کشتی کا سوراخ تم خود بند کرو
ـــ دنیا غرض مند ہے دوسرا کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا ـــ نہ بہن، نہ بھائی، نہ محبوب!!! میرے
قدموں کے نقوش مٹا دو اگر وہ تمہیں بھٹکاتے ہیں ـــ نظر آگے اٹھاؤ ـــ آنے والا لمحہ ہے زیادہ
سبک خرام ہو ـــ!!"

خط لکھ کر بڑے سکون کا احساس ہوا جیسے کوئی بھاری بوجھ سر سے اتر گیا ہو ـــ تین بج رہے تھے ـــ بھائی جان اب تک نہ آئے تھے ـــ ہوں ـــ کسی دوست نے پکڑ لیا ہوگا ـــ بڑے وہ ہیں بھائی جان بھی ـــ ایک تو اتنے دن بعد آئے اور پھر آئے بھی تو مسلسل غیر حاضر ـــ اب آکر صاف کہہ دیں گے ـــ "میں کیا کروں امو! منصور نے پکڑ لیا، ذاکر چھوڑتا

ہی نہ تھا اور رشید تو ایک لمحہ کی جدائی کے خیال ہی سے بے ہوش ہو ہو جا رہا تھا ـــــ ہوں ـــــ اور یہ تک بھی نہیں جناب کو کہ چھوٹی بہن بغیر کھانے گھر میں اکیلی راہ دیکھ رہی ہو گی ـــــ کتنے چاؤ سے اس نے مختلف ڈشیں بنائی ہوں گی۔ نمک مرچ تو کم ہی، محبت زیادہ ڈال کر ـــــ اور یہ بھائی جان ـــــ عجیب ہیں ـــــ؟! میرے ہی بھائی ایسے ہیں یا سب کے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا ـــــ دل نے کہا، پگلی ـــــ بھائی تو سب کے ایسے ہی ہوتے نہیں ـــــ لاپرواہ، نٹ کھٹ!! ہٹاؤ بھی اب کون کرتا ہے ان کا انتظار ـــــ!! اب تو ہو کے بھی آئیں تو کھانا نہ کھاؤں ـــــ یہ سوچ میں نے یہ قصہ بھی ختم کیا ـــــ کھانے کے بعد سونے کی بہت کوشش کی ـــــ مگر نیند روٹھ گئی ـــــ نہیں آؤں گی ـــــ اس نے انکار کر دیا۔ کمبخت تو نے ساتھ دیا ہی کیا ہے ـــــ نہ آ ـــــ میں سوگوار تھوڑے ہی ہوں ـــــ میں نے پلنگ چھوڑ دیا اور "ن" کی یاد میں بہت سارے محل بنائے ـــــ محل!! ـــــ سونے چاندی کے نہیں ـــــ ہیرے جواہرات کے نہیں ـــــ امنگوں اور آرزوؤں کے محل، جن کے خاموش جھروکوں سے آشائیں جھانک رہی تھیں۔ ـــــ جن کے منقش دروازوں پہ امیدیں استقبال کو کھڑی تھیں ـــــ جن کے بالا خانوں پہ خوش آمدید کہتی آزادیاں رقص کناں تھیں اور جن کے اونچے سنہری میناروں پہ اڑتی فاختائیں چونچ میں زیتون کی ٹہنیاں لئے "امن" کا گیت سنا رہی تھیں ـــــ!!

سہ پہر ساری ان ہی سپنوں میں بیتی ـــــ یہ جاگتے سپنے، خوابیدہ سپنوں سے کس قدر مختلف تھے ـــــ؟!!!

پانچ بجے بھائی جان آ گئے ـــــ "امو"! ـــــ انھوں نے باہر ہی سے آواز دی۔ میں نے جھٹ آنکھیں موند رضائی سر پہ کھینچ لی۔ اور دل میں سوچ لیا وہ چاہے لاکھ منائیں ہرگز ہرگز نہ مانوں گی ـــــ!

"ارے! سو گئیں ـــــ؟ ابھی تو جاگ رہی تھیں میں نے خود کھڑکی میں سے تمہیں بیٹھے دیکھا تھا ـــــ!!"

یا اللہ ـــــ یہ تو تانک جھانک میں بھی ماہر ہو گئے ـــــ میں نے سوچا، مگر حرکت نہ کی ـــــ!

"بھئی اٹھو نا" ـــــ انھوں نے شاید عاجز آ کر کہا ـــــ!

آج تو پیر چھونا پڑے گا جناب ـــــ بڑے بن گئے تو کیا ہوا ـــــ میں نے دل میں کہا ـــــ!

"اچھا تو نہ اٹھو ـــــ اب کون اس بوجھ کو سنبھالتا پھرے ـــــ نسرین، پروین، ظفر، آؤ بھئی سب" انھوں نے آواز دی۔

لحاف دور پھینک کر میں اٹھ کھڑی ہوئی ـــــ!

"ارے آپ تو سو رہی تھیں ـــــ؟" انھوں نے ہنسی روک کر کہا۔

"لائیے ـــــ لائیے ـــــ!" میں نے سنجیدہ بنتے ہوئے کہا ـــــ

"مگر آپ تو صاحب سو ہی جائیے ـــــ آپ کہیں تو میں لحاف بھی اڑھا دوں ـــــ؟!"

"اللہ بھائی جان" ـــــ!! میں بیزار ہو گئی ـــــ کہاں تو جناب سے پیر پڑوانے کا خیال اور کہاں اب یہ نوبت خود پہ آ والی تھی ـــــ "چاکلیٹ کیک" ان کے ہاتھ میں تھا ـــــ شکر کے موتیوں اور کریم کے پھولوں سے سجا سجایا ـــــ میرا مرغوب کیک۔

وہ جانتے تھے اس ایک کیک کے بدلے وہ میری ہر خفگی کو خرید سکتے ہیں ـــــ!!

"نہ دیجئے، ہم کب مانگتے ہیں؟" دل کڑا کر کے میں بے نیاز ہو ہی گئی۔

"ارے کہاں چلیں ـــــ؟" انھوں نے پلٹ کر حسب عادت کندھوں سے مجھے پکڑا اور قہقہوں کے درمیان ہماری صلح ہو گئی

چائے پی کر جب وہ پھر چلے گئے میں اوپر چلی آئی ـــــ ڈوبتا ہوا نارنجی سورج تاڑ کے پتوں میں اوجھل ہو رہا تھا، شام کی س سیاہیاں آسمان کے دریچوں سے جھانک رہی تھیں اور زمین ـــــ کہیں گلنار، کہیں سرمئی، عجیب سی لگ رہی تھی ـــــ مشرقی رومان حسن کا ایک ثبوت میرے سامنے تھا ـــــ تاڑ کے پیچھے چھپتا سورج ـــــ سورج تو تھکتا ہی نہ تھا ـــــ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا اور

سب رس

واقعات پر حیران کوئی خوبصورت کنواری چہرے کو انگلیوں میں چھپائے، شرگیں نگاہوں سے انگلیوں کے جھروکوں سے جھانک رہی ہے اور اس کے چہرے کی گلنار رنگت انگلیوں سے چھن چھن کر دنیا پر برس رہی ہے ــــ !!!

گودام کا کام بند ہو چکا تھا ــــ دن بھر اناج کی وزنی بوریاں اٹھانے والے حمال اب کام ختم کر کے قطاروں میں چلے جا رہے تھے۔ ہندستان کے سپوت ــــ ہندستان کی خاص پیداوار ــــ آہنی پیکر، فولادی بدن ــــ رنگین رومالوں کو کمر کے گرد کسے، میلی ٹوپیوں اور کنٹوپوں کو سر پہ جمائے، بیڑی کا منہ میں دبائے ــــ ہنستے بولتے، قہقہے لگاتے، مذاق کرتے، بے فکر، مطمئن ــــ جیسے دن بھر انھوں نے بوجھ نہیں ڈھویا ــــ "ہنسی لا" اور لاابالیوں کے خزانے ڈھوئے ہیں ــــ ان کے سیاہ میلے سینوں میں ان کے شفاف جری دل کھکھلاتے رہے اور انسپکٹر گودام نے دروازہ بند کر کے بڑے تالے میں چابی گھما دی ــــ ایک داڑھی والے صاحب جو کام کے دوران میں دن بھر اکڑوں بیٹھے گپیں ہانکتے رہے تھے اس وقت دونوں ہاتھ ملائے کسی راہگیر کو "نمستے" کر رہے تھے ــــ "نمستے" ــــ جس پر ہل ہل کر داڑھی ان کا مذاق اڑا رہی تھی ــــ انسپکٹر نے بھاری بوٹوں کو حرکت دی ــــ چوکیدار خمیدہ ہو گیا ــــ شام کے ساتھ ہی فضا پر ایک بار پھر سکون چھا گیا ــــ البتہ دور سڑک پر جاتے ہوئے حمالوں کی سیاہ پیٹھیاں اب بھی چمکتی رہیں جن پر بوریوں کے وزن نے عجیب ملگجے نشان بنا دیئے تھے ــــ جیسے کھال چھل گئی ہو ــــ !!

سورج یکایک ڈوب گیا ــــ اندھیرا ہر طرف سے امنڈ آیا ــــ حمالوں کے محنت کشوں کے چہروں میں بشاش، چمکیلا اندھیرا نہیں بلکہ سوتا ہوا اندھیرا جو صرف رات کا اندھیرا ہو سکتا ہے ــــ !!!

سینے میں ہزاروں جذبات لئے میں نیچے اتر آئی ــــ ارے مگر یہ کیا ــــ ؟! کسی نے لائٹ کیوں نہیں جلائی ــــ ؟؟! سارا گھر اندھیرا کیوں پڑا ہے ؟!! میں نے بجلی جلائی مگر روشنی پھر بھی نہ آئی ــــ دور آسمان پر ایک ستارہ جھلملا کر میری اس ناکام کوشش پر ہنستا رہا ــــ !!

کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول
کیا ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

۱۲ر جنوری ۱۹۵۴ء

صبح بھی مصروف، دوپہر بھی ــــ کام! کام!! کام!!! ــــ میں تھی اور کام ــــ جیسے ہم دونوں ازل کے ساتھی ہوں ــــ؟ مدرسے کو کھانا بھجوا کر جب اوپر آئی گھڑی کی سوئیاں ایک بجا رہی تھیں ــــ صبح کا سبک خرام سورج "تیغ" "شعاعوں" کے انعکاس میں مصروف تھا ــــ بھائی جان جا چکے تھے ــــ صرف ایک دن کی یادیں دامن سے ابھی بار بار بہلا رہی تھیں ــــ شیلف پر رکھی ٹائم پیس ٹک ٹک ایک ایک چلا رہی تھی ــــ "کیوپڈ" کا ننھا اسٹیچو بدھا کے قدموں میں سرنگوں تھا جیسے بدھا کے سامنے اس کے سارے ترکش بے کار ہو چکے تھے ــــ جی چاہا کنند سے آخری تیر بھی نکال لوں تاکہ "عشق" پر کبھی مغرور ہو ہی نہ سکے۔ اندھا کیوپڈ آنکھیں کھول کر اپنی ہار دیکھے اور سسک کر پھر بدھا کے آگے خمیدہ ہو جائے ــــ !!!

صدیوں سے وراثت میں آئی خوبصورتی دن بدن اس قدر مسخ ہوئی جا رہی تھی کہ عشق مہمل سی چیز ہی کر رہ گیا تھا، جسے دیکھو عشق کا پتلا، جسے دیکھو حسن کا پجاری ــــ جیسے کائنات کا مقصد نہ رہی تھی حسن اور عشق کا ایک دلچسپ لطیفہ بن گئی تھی جس میں ہر روز ایک تازہ واردات عشق کے ہاتھوں سرزد ہوتی اور ہر رات ایک پردہ، نئی واردات کے لئے پرانے واقعات پر گر جاتا ــــ مگر دراصل نہ جہاں میں عشق سا تھا نہ حسن، دو بدصورتی رہ گئی تھی ــــ جنگ کے بعد جنگ کا خطرہ تھا ــــ موت کے بعد ایک اور موت تھی ــــ دنیا حیران تھی ــــ پریشانیاں سربلند تھیں اور میں ــــ میں سوچ رہی تھی بیدم کی اس غزل کو سراہوں یا سہگل کی اس آواز کو جو فضا میں بکھیر رہی تھی ــــ

بغیر مجھ سے ملے کم ہی نہ ہوتی تھیں ــــــــــ جس نے میرے لئے ایک دنیا کو بسا رکھا تھا ــــــــــ !!

تین بجے چلی گئی ــــ پانچ بجے واپس آئی ــــ تو دھوپ بہت ڈھل رہی تھی ــــ انار کے درخت پہ بے شمار انار کلیاں کھل کر مرجھا رہی تھیں ــــ جیسے دھوپ ایک جابر شہنشاہ کی طرح ان کے خاتمے کا حکم سنا کر دنیا کے ایوان سے اتر رہی تھی ــــ اور رات اندھیرے کی دیواریں لئے انھیں صبح تک قید کرنے آ رہی تھی ــــ بیچاری انار کلیاں ــــ معصوم اور حسین ــــ جن کی شگفتگی کو تقدیر نے جیسے کا حسن سمجھ جان لیا ــــ قاتلانہ ــــ دھوپ چلی گئی ــــ اندھیرے نے سب کچھ چھپا لیا ــــ چاند ابھی سو رہا تھا ــ تاروں کی شفیق چھاؤں میں صرف ایک تصویر چمکتا رہا ــــ جس میں مور ناچ ناچ کر تھک چکا تھا ــــ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور مورنی پاس کھڑی ان آنسوؤں کو پی رہی تھی ــــ !!

میں نے رسائل اٹھانے مگر دل تو آج بڑا مطمئن تھا ــــ وہ ضدی ــــ سرکش دل جو اپنے لئے سخت تھا' بے ناقوں کے لئے سرکش تھا' مگر دنیا کے لئے ــــ دوستوں کے لئے ــــ "ن" کے لئے ــــ نرم اور رحمدل ــــ !! پچھلے گھروں میں ڈھولک بجتی رہی ــــ مرد عورتیں آواز ملا ملا کر گاتے رہے جیسے رات نہیں گذار رہے کوئی تہوار منا رہے ہوں ــــ !!؟ ــــ اور میں سونے سے پہلے دیر تک سوچتی رہی ــــ "ن" کی مسکراہٹ نے اتنا سکون کیوں دیا ــــ جیسے وہ ہنسا تو اس کے ساتھ کائنات ہنس پڑی اور ــــ اب نہ کہیں دکھ ہے نہ غم ــــــــ !!!!

ادب میں جمود کی باتیں کرنے والے اب اردو ادب کی موت کا بھی اعلان کر چکے ہیں ــــــ

حمایت علی شاعر نے نہایت ہی خاموشی سے اس نعرے کا جواب دیا ہے

بنگال سے کوریا تک

- ایک طویل افسانوی نظم
- عوام کے شعوری ارتقا کی ایک تاریخ
- ہمارے ادب عالیہ سے ایک کامیاب استفادہ
- اردو کے جدید ادب میں ایک لازوال تخلیق

دیباچہ ــــ ممتاز حسین

(زیر طبع)

مرکز ادب کراچی

ادب اور آرٹ کا حسین امتزاج

ماہنامہ شاہین

جو ہندو پاک کے مشہور ترقی پسند ادیبوں و شاعروں کے افکار کو اپنے دامن میں سمیٹے' اقبال کے شاہین کی طرح ادب کے معیار کو لئے ارتقا کی طرف پر تول رہا ہے۔ ادب و آرٹ کے اونچی چٹانوں پر بسیرا کئے' قصر حرم کے پوسیدہ ادب کو چھوڑ کر عوام کی نفسیات' ان کی تہذیب اور ثقافت کو فخر کے ساتھ پیش کرتا ہے ــــــــ

قیمت :- ۸ / سکۂ ہند ــــ سالانہ چندہ چار روپے

ماہنامہ شاہین ۔ عثمان شاہی ۔ حیدر آباد (دکن)

بچوں کا محبوب ماہنامہ

چاند (ناگپور)

ایڈیٹر :- فیض آبادی

دلچسپ اور مفید کہانیاں ۔ سبق آموز نظمیں ۔ ننھے ادیبوں کا صفحہ ۔ منسوڑ کارٹون ۔ رنگ نما فوٹو ۔ سوال و جواب دلچسپ مشغلے ۔ کشیدہ کاری اور پانچ سو روپے سے زائد کے انعامات

قیمت فی پرچہ :- پانچ آنے ــــــ سالانہ :- ساڑھے تین روپے

(دکن کے ہر شہر و قصبہ میں ایجنٹ درکار ہیں)

لکھئے :- مینجر چاند ۔ ناگپور ۲

ریشمی کہانی

لاجپت رائے

بہت دنوں کی بات ہے جب کہ میں چھوٹا سا تھا تو میری دادی نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی۔ کہانی بہت خوبصورت تھی۔ کہانی ریشم کی طرح ملائم اور روئی کی طرح نرم تھی۔ اس کہانی میں ایک خوبصورت محل تھا اور اس محل میں ایک بہت بڑا باغ جس میں طرح طرح کے میوے تھے۔ انگور، ناشپاتی، انار، خوبانیاں وغیرہ۔ یہ میوے میں بازار میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ اس باغ میں ایک خوبصورت سی جھیل تھی اور اس جھیل کے ارد گرد رنگا رنگ کے پھول تھے۔ پیلے پھول۔ نیلے پھول۔ سرخ پھول۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ اس محل میں ایک خوبصورت شہزادہ رہتا تھا جس کے پاس اچھے اچھے کپڑے تھے۔ اس کے سر پر ہیروں کا تاج تھا اور اس تاج میں خوب پر لگے ہوئے تھے۔ یہ شہزادہ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لئے بڑے ناز و نعمت سے پالا گیا تھا۔ میں بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں لیکن مجھ کو وہ ناز و نعمت میسر نہیں جو اس کہانی کے شہزادے کو میسر تھے —— لیکن خیر میں آپ کو وہ خوبصورت اور ریشمی کہانی سنا رہا تھا جو میری دادی مجھے اکثر سنایا کرتی تھی ایک دن وہ شہزادہ باغ میں گھوم رہا تھا کہ اس نے پھولوں کی کیاری میں ایک سرخ پھول کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ وہ پھول بہت خوبصورت تھا۔ شہزادے نے اس سے پہلے اتنا خوبصورت پھول کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہزادے کو وہ پھول بہت پسند آیا اور وہ اسے اپنے محل میں لے آیا، اور بستر پر رکھ دیا اور سو گیا۔ نیند میں اس نے محسوس کیا کہ بستر میں کوئی چیز ہل رہی ہے اور اس کی ناک میں نہایت بھینی بھینی خوش بو آ رہی ہے اور جب اس نے آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ اس کے بستر پر ایک نہایت حسین عورت لیٹی ہوئی ہے۔ وہ عورت بہت ہی حسین تھی۔ بے حد حسین! اس کے بال ریشم کی طرح ملائم تھے اور چاند کی طرح چمکدار تھے۔ اس کے بالوں سے چنبیلی کے پھولوں کی خوش بو آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح پتلے اور نرم تھے۔ اس کے جسم میں سورج کی گرمی تھی، چاند کی ٹھنڈک تھی اور پھولوں کی کوملتا تھی اور اس کی آنکھیں شراب میں بھیگی ہوئی تھیں۔ شہزادے کو وہ عورت بہت پسند آئی اور اس نے اسے اپنی شہزادی بنا لیا۔

یہ کہانی مجھے بہت پسند ہے۔ یہ کہانی میں نے اپنی دادی سے بار بار سنی اور میری دادی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں بھی ایسی ہی خوبصورت شہزادی لاؤں گی۔ مگر میری دادی نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے سنتو جولاہے کی لڑکی درگی سے میرا بیاہ رچایا تھا۔ درگی اچھی لڑکی ہے۔ سارے گھر کا کام کاج وہی کرتی ہے۔ میری ماں بھی اسے بہت چاہتی ہے۔ درگی میری بھی بہت سیوا کرتی ہے۔ جب دن بھر محنت مزدوری کر کے میں گھر لوٹتا ہوں تو وہ بڑے پیار سے مجھے کھانا کھلاتی ہے اور جب میں کھانا کھاتا ہوں تب وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں سے چولہے کی راکھ کو کریدتی رہتی ہے اور جب میں سونے لگتا ہوں تب وہ میرے پاؤں دابتی رہتی ہے اور پھر میرے پیروں کی طرف سر رکھ کر سو جاتی ہے۔ درگی بہت اچھی لڑکی ہے مگر اس کے بالوں میں کہانی کی شہزادی کے بالوں کی طرح چنبیلی کے پھولوں کی مہک نہیں آتی بلکہ اس کے بالوں سے سرسوں کے کڑوے تیل کی بو آتی ہے۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ درگی تو سرسوں کے بجائے کھوپرے کا تیل لگایا کر مگر وہ میری بات مانتی ہی نہیں اور ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتی ہے کہ سرسوں کے تیل سے سر میں جوئیں نہیں پڑتیں .... اور میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ درگی کے جسم سے گلاب کے پھولوں کی مہک بھی نہیں آتی بلکہ اس کے جسم سے پیاز مسالے اور لہسن کی بو آتی ہے۔ لہسن سے مجھے سخت چڑ ہے پر کیا کیا جائے۔ بیچاری سارا دن تو

باورچی خانے میں سوتی ہے۔ اس میں اس کا کیا دوش۔ اس کا چہرہ پھیکا پھیکا اور بے جان سا ہے۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا کچھ تیرتا رہتا ہے ـــ سیاہ دسیاں اداس ـ اس کی آنکھیں ـــ اف ـــ لیکن دُرگی پھر بھی خوبصورت ہے میرا مطلب ہے راجو کی بیوی سے زیادہ۔ شامو کی بیوی کے تو دانت ہی باہر نکلے رہتے ہیں اور غفورو میاں کی بیوی کے گال پچکے ہوئے ہیں..... میری دُرگی ان سب سے اچھی ہے..... لیکن کہانی کی شہزادی ـــ اس کے بالوں میں چنبیلی کے پھولوں کی مہک ـــ چنبیلی کے پھول ـــ آہ چنبیلی کے پھول مجھے کتنے اچھے لگتے ہیں!

یہ کہانی جو میری دادی نے مجھے سنائی تھی جب کہ میں چھوٹا سا تھا مجھے اب بھی یاد ہے۔ اب جب کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اور یہیں شہر میں کپڑے کی مل میں کام کرتا ہوں۔ بھونپو بجنے سے پہلے ہی مل میں پہنچ جاتا ہوں اور تمام دن مشینوں کے ساتھ میرا دل، میرے ہاتھ اور میرا دماغ بھی چلتا رہتا ہے اور جب شام کو مشینیں بند ہو جاتی ہیں تو میرا دماغ بھی بند ہو جاتا ہے۔ دل سوچنا چھوڑ دیتا ہے اور برف کی طرح جم کر رہ جاتا ہے۔ اور دل ـــ دل حرکت کرتا ہے گھڑی کی سوئی کی طرح ـــ ٹک ٹک ـــ ٹک ـــ ٹک اور میں سڑکوں پر گھومتا ہوں۔ کبھی کہیں راستے میں چنے کھاتا ہوں اور راستے پر چلتی ہوئی ٹراموں کو، موٹروں کو، بسوں کو، مردوں کو، عورتوں کو اور بچوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ میری ہی طرح چلتے ہیں یہ لوگ۔ کبھی آہستہ کبھی تیز۔ کبھی گنگناتے ہیں، کبھی مسکراتے ہیں اور کبھی روتے ہیں۔ میں بھی کبھی کبھی مسکراتا ہوں اور کبھی کبھی روتا ہوں۔ لیکن مسکراتا کم اور روتا زیادہ ہوں۔ باقی لوگوں کا کیا حال ہے مجھے نہیں معلوم۔ کبھی میں راستے میں کسی بڑی دکان کے سامنے ٹھہر جاتا ہوں اور گرم اور ریشمی اور سوتی کپڑوں کو دیکھتا ہوں۔ ایسا سوتی اور رنگ برنگے پھولوں والا کپڑا اپنی مل میں بھی تیار ہوتا ہے اور ان لوگوں کو بھی دیکھتا ہوں جو یہ خوبصورت کپڑے پہنتے ہیں اور بالکل کہانی کے شہزادے کی طرح لگتے ہیں۔ ہمارے مل مالک کی رنڈیا جو سلیٹی رنگ کی کار میں ہماری مل میں کبھی کبھار آجاتی ہے۔ وہ بھی کہانی کی شہزادی کی طرح خوبصورت ہے۔ اس کے ہونٹ بھی کہانی کی شہزادی کے ہونٹوں کی طرح پتلے اور نرم ـــ گلاب کی پتیوں کی طرح ہیں اور اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ شہزادی صرف میری دادی کی ریشمی کہانی میں ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اس دھرتی پر بھی ہے میں نے ایسی کئی شہزادیوں کو دیکھا ہے۔ اپنے اس شہر میں ـــ فورٹ میں سمندر کے کنارے ـــ میں نے کئی ایسی شہزادیوں کو دیکھا ہے جو کہانی کی شہزادی سے ـــ بلکہ اس سے بھی زیادہ کومل ـــ سندر ـــ حسین ـــ بے حد حسین۔ اور تب میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی دُرگی کو بھی ایسی شہزادی بنا دوں۔ دُرگی ایسی شہزادی بن سکتی ہے۔ دُرگی خوبصورت ہے۔ جوان ہے۔ اس کی آنکھیں ـــ میرا مطلب ہے اس کی بناوٹ بہت اچھی ہے ـــ لیکن وہ خشک ہیں۔ اداس ہیں۔ بے جان ہیں۔ دُرگی بھی کہانی کی شہزادی کی طرح خوبصورت بن سکتی ہے۔ صرف اسے اچھے کھانے کی ضرورت ہے۔ اچھے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ بالوں میں چنبیلی کے تیل کی ضرورت ہے۔ آنکھوں میں کاجل کی ضرورت ہے۔ پاؤں میں اونچی ایڑی کے سینڈلوں کی ضرورت ہے۔ دُرگی شہزادی بن سکتی ہے۔ مگر ـــ مگر میں بہت کم کماتا ہوں۔ حالانکہ کام زیادہ کرتا ہوں اور بھونپو بجنے سے پہلے ہی مل میں پہنچ جاتا ہوں اور تمام دن کام کرتا ہوں اور پھر مجھے ڈھائی روپے ملتے ہیں۔ پہلے دن ڈھائی روپے، دوسرے دن ڈھائی روپے، تیسرے دن ڈھائی روپے..... اور میں کام کرتے کرتے سوچتا ہوں کہ اس مہینے ضرور دُرگی کے لئے ایک جاپانی سلک کی ساڑھی لے لوں گا اور پھر وہ کچھ کچھ شہزادی نظر آنے لگے گی اور پھر میں کام کرتا ہوں، تیس دن کام کرتا ہوں اور پھر میری جیب میں پچھتر (۷۵) روپے آجاتے ہیں۔ اور جب میں گھر آتا ہوں تو یہ روپے ماں کو دے دیتا ہوں اور اس سے ہر ماہ کہتا ہوں کہ دیکھو ماں اس مہینے ذرا سوچ سمجھ کر خرچ کرو۔ دیکھو میں دُرگی کے لئے ایک ساڑھی خریدنا چاہتا ہوں اور میری ماں روپے پاندان میں رکھ دیتی ہے اور پھر روزانہ روپے پاندان سے نکالنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ روپیہ راشن والے کے پاس جاتا ہے۔ مکان والے کے پاس جاتا ہے۔ کھولی کا بھاڑہ پندرہ روپے ـــ بھاڑہ بہت زیادہ ہے اور مکان بہت گندہ ہے ـــ مگر آجکل مکان ملتے کہاں ہیں ـــ خیر واشتی تیس روپے، کوئلہ

—— مرچی —— نمک —— تیل —— ماچس —— ہلدی —— اور روپے پاندان سے نکلتے رہتے ہیں اور پھر ختم —— روپے پیسے ختم ہوتے ہیں اور مہینہ پیچھے ختم ہوتا ہے۔ روپے پیسے کیوں ختم ہوتے ہیں اور مہینہ پیچھے کیوں؟ مجھے نہیں معلوم۔ اور اس کا علاج؟—— میرا خیال ہے کہ یا تو مزدوری بڑھ جانی چاہئیے یا مہینہ چھوٹا ہو جانا چاہئیے۔ لیکن میں پانچ سال سے اس مل میں کام کر رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ نہ تو میری مزدوری بڑھتی ہے اور نہ مہینہ چھوٹا ہوتا ہے۔ ہماری مل میں —— میرا مطلب ہے کہ ہمارے سیٹھ کی مل میں کبھی کبھی لال باوٹے والے بھی آتے ہیں اور چلاتے ہیں —— مزدوری بڑھاؤ، بھتہ دو اور کبھی کبھی تو سالے جوش میں آکر ہڑتال بھی کرا دیتے ہیں۔ مجھے بھی کہتے ہیں کہ منگلو تو بھی ہڑتال میں شامل ہو جا۔ پر میرا کوئی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دیکھو بھائی چلانے اور گلا پھاڑنے سے کچھ بھی نہیں بنتا۔ جب بھگوان کی مرضی ہو گی اپنی مزدوری بڑھ جائے گی اور اگر سیٹھ نے نکال دیا تو اپن گئے بارہ کے بھاؤ میں۔ چوا نے پونے ملتے ہیں۔ یہی غنیمت ہیں۔ بھگوان کی کرپا ہے۔ بھگوان دیالو ہیں۔ شکر ہے بھگوان کا کہ کھانے کو ملتا ہے۔ نہیں تو کئی بے چارے ایسے ہیں جنھیں کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ پچھلے دنوں اپنا رحیمو بیکار رہا —— وہی رحیمو جو سالا ہڑتال کراتا پھرتا تھا۔ بڑا حرامی لیڈر بنا پھرتا تھا۔ مر گیا نہ بھوکا۔ سالے کی بچی بیمار ہوئی اور مر گئی اور اب خود بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ شکر ہے بھگوان تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ تو کھانے کو دیتا ہے۔ میں ہر روز بھگوان کی پوجا کرتا ہوں اور کچھ دیر کے لئے من کو شانتی بھی ملتی ہے۔ مگر جب مجھے دادی کی ریشمی کہانی یاد آتی ہے اور میں اپنی درگی کے جسم پر ریشمی ساڑھی کو لہراتے ہوئے نہیں دیکھتا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل نہیں دیکھتا تو پہ لو بھی من پھر اداس ہو جاتا ہے۔ پھر مچل جاتا ہے اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یار منگلو یہ بھگوان وگوان سب سالا ڈھونگ ہے۔ بھگوان وگوان کچھ بھی نہیں۔ اوپر نیلا نیلا آسمان ہے۔ آسمان پر دن کو سورج چمکتا ہے اور رات کو تارے جگمگاتے ہیں اور چاند مسکراتا ہے —— مسکراتا ہے یا روتا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور اس کے سوا اوپر کچھ بھی نہیں مگر پھر جیسے مجھے کوئی تھپڑ مار دیتا ہے۔ اور میرے بال مٹھی میں بھینچ لیتا ہے اور کہتا ہے —— ابے سالے منگلو سوچنا بند کر دے تو ناستک ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب سوچنے کا دوش ہے۔ مایا کے لوبھ پھنس کر تو دھرم کی ڈگر سے ہٹ رہا ہے۔ نرک —— آگ —— نرک —— منگلو انسان اس دنیا میں خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ چلا جاتا ہے۔ درگی کو ریشمی ساڑھی مل جائے گی مگر کیا یہ ساڑھی وہ پرلوک ساتھ لے جائے گی اور پھر میرا سر بھگوان کے چرنوں میں گر جاتا ہے۔ لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ ٹھیک ہے درگی یہ ساڑھی پرلوک تو نہیں لے جائے گی لیکن جب تک اس لوک میں ہے تب تک تو اسے ملنی چاہئیے! اسے شہزادی بننا چاہئیے! مگر پھر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب سوچنا فضول ہے۔ سوچنے سے انسان ناستک ہو جاتا ہے۔ اس لئے آج کل میں بہت کم سوچتا ہوں لیکن میری ایک تمنا ہے کہ کوئی ایک ایسی کہانی لکھے جس میں شہزادہ بنوں اور درگی شہزادی۔ جس میں خوبصورت محل ہو اور باغ ہو اور پیتل ہوں —— اور —— اور —— مگر کون لکھے گا ایسی کہانی۔ کہانی لکھنے والے تو بڑے بڑے آدمی ہوتے ہوں گے اور ہماری ان تک پہنچ کہاں؟

ایک دن میں کام کرنے کے بعد مچھٹ پاتھ پر دوائیاں بیچنے والے کے مجمع میں کھڑا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا پہلے تو میں سمجھا سالا کوئی جیب کترا ہے مگر پلٹ کر جو دیکھتا ہوں تو میرا پرانا یار برکت ہے۔

میں نے کہا —— "ابے برکت تو سالا یہاں کہاں؟"

ہم دونوں مجمع سے باہر آئے اور دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ برکت اور میں بچپن میں ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے، کھیلا کرتے تھے اور سڑک سے چن چن کر سگریٹیں پیا کرتے تھے۔ پھر نہ جانے برکت کہاں چلا گیا اور پھر آج بہت دنوں کے بعد ملا تو بڑی خوشی ہوئی۔

میں نے کہا —— "کیا کام کرتا ہے رے آج کل؟"

کہنے لگا —— "کہانیاں لکھتا ہوں"

میں نے کہا —— "تو جھک مارتا ہے۔ ایسے کہانیاں لکھنے والے تو بڑے بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ اور تو —— تو —— رحمت جلاہے کا لڑکا —— تو کہانی لکھے گا —— دھت تیرے کی —— سالے بیڑی نکال"۔

برکت نے مجھے بیڑی دی اور کہا —— "چل تجھے کہانی سناؤں"۔

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں گئے۔ دو سنگل چائے منگائی اور پھر برکت نے اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ کاغذ نکالے اور پھر انھیں میز پر بکھیر دیا اور پھر برکت نے مجھے کہانی سنائی۔ میں کہانی سنتا رہا۔ کہانی بڑی اداس تھی۔ کہانی مجھ جیسے ایک مزدور کی تھی۔ اس کی ایک ماں تھی —— جس کا نام ماں تھا —— میری ماں کا نام بھی ماں ہے —— ہر عورت ماں ہوتی ہے —— اس کی ایک بیوی تھی —— جس کا نام چمپا تھا —— میری بھی ایک بیوی ہے جس کا نام درگی ہے اُس کے تین بچے تھے جو ننگے تھے —— میرے بھی دو بچے ہیں جو ادھ ننگے ہیں۔ اس کہانی میں ایک راشن والا تھا۔ ایک سود خور پٹھان تھا۔ ایک ڈاکٹر تھا جو فیس زیادہ مانگتا تھا۔ اس کہانی میں مزدور چاہتا تھا کہ اس کی بیوی اچھے کپڑے پہنے۔ اچھے مکان میں رہے۔ اچھا کھانا کھائے۔ اس کی بیوی شہزادی بنے میری دادی کی ریشمی کہانی کی طرح —— مگر آگے کہانی بڑی دردناک تھی۔ مزدور کے بچے بیماری میں مر جاتے ہیں۔ اس کی بیوی چتا میں جا بیٹھتی ہے۔ درگی چتا میں جا بیٹھتی ہے اور مزدور مر جاتا ہے —— منگلو مر جاتا ہے۔

میں نے کہا "برکت یہ کہانی میری ہے۔ وہ مزدور مر گیا ہے مگر منگلو زندہ ہے۔ یہ کہانی منگلو کی ہے برکت"

برکت نے کہا —— "منگلو یہ صرف تیری کہانی نہیں ہے۔ یہ سب کی کہانی ہے۔

میں نے کہا —— "ٹھیک ہے برکت یہ ہم سب کی کہانی ہے۔ یہ منگلو کی کہانی ہے۔ تو نے میری کہانی لکھی ہے۔ مگر یہ کہانی بڑی دردناک ہے۔ تو میرا دوست ہے۔ تجھے کہانی لکھنی آتی ہے۔ اب دیکھ تو ایک ایسی کہانی لکھ ..... ایسی۔ —— ایسی —— ایسی اور پھر میں نے اسے اپنی دادی کی ریشمی کہانی سنائی جس میں خوبصورت محل تھا۔ طرح طرح کے پھل تھے۔ رنگا رنگ کے پھول تھے —— پیلے پھول، نیلے پھول، سرخ پھول، ہر رنگ کے پھول اور شہزادی تھی۔ جہاں راشن کا جھگڑا نہیں تھا۔ جہاں اچھے اچھے کپڑے۔ تھے اور دیکھ تو ایسی ریشمی کہانی لکھ جیسی میری دادی نے سنائی تھی"۔

برکت نے کہا —— "منگلو میں ایسی کہانی نہیں لکھ سکتا۔ وہ کہانی بڑی سندر ہے۔ لیکن ایسی کہانی لکھنے کے لئے ہمیں لڑنا ہوگا۔ ہم سب کو لڑنا ہوگا"۔

میں نے کہا —— سالے تجھے لڑنے مرنے کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا کام نہیں۔ بچپن میں تو گلی کے لڑکوں سے لڑا کرتا تھا۔ ان کے پیسے چھین لیا کرتا تھا۔ وہ بچپن کے دن تھے۔ اب کیا بڑا ہو کر بھی تو نے لڑنا نہیں چھوڑا۔ چل جلدی سے چائے پی اور باہر چلیں —— پگلا کہیں کا!"

برکت نے جلدی سے چائے پی اور ہم دونوں باہر آئے۔ میں نے دیکھا کہ برکت بہت اداس تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ جب ہم دونوں ٹہلتا ٹہلتا سینما کے نکڑ پہ پہنچے تو مزدوروں کا ایک جلوس جا رہا تھا۔ آج گیس مزدوروں کی ہڑتال تھی۔ ان کے ہاتھ میں لال جھنڈے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ لال باوٹے والے ہیں۔ برکت انھیں دیکھتا رہا۔ پھر مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے پھسلتی ہوئی اس کے چہرے پر رینگنے لگی اور اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے میرے بازو کو زور سے بھینچا اور کہا: "چل منگلو چلیں جلوس میں۔

میں نے اس کا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا —— "چھی، چھی —— جلسے میں —— لال باوٹے والوں کے جلسے میں، ارے برکت وہاں پولیس لاٹھی چلائے گی اور گولی چلائے گی اور دنگا ہوگا۔ کیا رکھا ہے جلسے میں۔ چل فلم دیکھیں گے کہیں"۔

برکت نے میرے بازو کو اور زور سے بھینچا اور کہا —— "چل منگلو تجھے میری قسم۔ منگلو تجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ تیری دادی کی ریشمی کہانی کے لئے لڑنے جا رہے ہیں۔ چل نا" اور اس نے میرے بازو کو اتنی زور سے بھینچا کہ میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔

اثر لکھنوی

ختم جس دن امتیازِ این و آں ہو جائے گا
آدمیت کا جو منشا ہے عیاں ہو جائے گا

آرزو ہو گی خود اپنی اور اپنا انتظار
عشق بڑھ کر جانِ جاں آرامِ جاں ہو جائے گا

درد سے لبریز ہو جانے تو دو سازِ حیات
مطربِ غم گنگنا کر نغمہ خواں ہو جائے گا

ضبط میں کاوش نہ کرتے ہم اگر یہ جانتے
ہر نفس اک پردۂ سازِ فغاں ہو جائے گا

پھر کیا آزاد اے صیاد تو احساں کیا؟
جب اسیروں کو قفس ہی آشیاں ہو جائے گا

اثر ماضی کہاں تک حال میں جینا بھی سیکھو
قصۂ پارینہ جورِ آسماں ہو جائے گا

ہے نفس کی آمد و شد میں نہاں شورِ جرس
اٹھ کہ دم بھر میں روانہ کارواں ہو جائے گا

ہے یہی محویتِ نظارہ تو اے عندلیب
حسن رو دے گی چراغِ آشیاں ہو جائے گا

سوچ کر اے بے خبر انجامِ عشرت سوچ کر
نغمۂ رنگیں، نوائے خوں چکاں ہو جائے گا

فتنہ و پیکار کا ممکن جبھی ہے انسداد
جب اخوت مسلکِ ہندوستاں ہو جائے گا

دے دیا دل بے وفا کو، ہم نہ کہتے تھے اثر
جان پر بن جائے گی، جی کا زیاں ہو جائے گا

صفی اورنگ آبادی

وعدوں میں تمہاری یہ ذرا بھول ذرا یاد
واللہ مزہ آ گیا، کیا بھول ہے کیا یاد

اس یاد کے پردے کو دلائے کوئی کیا یاد
میرا ہی کہا یاد نہ اپنا ہی کہا یاد

وابستۂ دیرینہ کو کچھ خوف نہیں ہے
ہر جرم کی ہے آپ کے مجرم کو سزا یاد

حاصل نہ ہوا عیش تو تکلیف میں گزری
تم یاد نہیں آئے تو آیا ہے خدا یاد

حیرت میں ہیں سب آپ سے بیگانے یگانے
ہر بھول الگ بھول ہے ہر یاد جدا یاد

اس بھول کے قربان خطا اپنی فراموش
اس یاد کے صدقے ہوں فقط میری خطا یاد

بیگانوں کی صورت درِ دولت پہ کھڑا ہوں
کیوں یاد کیا تھا انھیں کچھ بھی نہ رہا یاد

یوں ہی نہیں معشوق کی دوری و حضوری
دوری کی بنا بھول حضوری کی بنا یاد

میں کون سا احساں تھا بھول گیا ہوں
اے دشمنِ اربابِ وفا! کچھ تو دلا یاد

تو سب کی خوشی کر نہ سکے گا مرے ساقی!
اک ایک بلا کش کو ہے اک ایک مزا یاد

مقطع میں صفی بھول گیا مقصدِ آخر
تھا ٹیپ کا جو بند وہ ہم کو نہ رہا یاد

*

نمکین سرمست

یہ سادگی اور یہ پرکاری ہر ایک کے بس کا کام نہیں
ہر جام ہے ساقی کا لیکن ساقی کا کوئی جام نہیں

بے وجہ تڑپ بے وجہ سکوں تکلیف نہیں آرام نہیں
اک درد ہے ایسا بھی دل میں جس درد کا کوئی نام نہیں

اے دوست جو حالت ہے دل کی کس طرح کہوں اور کس سے کہوں
کیوں کر یہ کوئی باور کرلے آرام ہے اور آرام نہیں

ساقی بھی ہے پاس اور پیاس بھی ہے اب کیا کہوں میں کیونکر پیاسا ہوں
یہ بھی نہیں میخانے میں مری تقدیر کا کوئی جام نہیں

میخانہ ہے رندوں کے دم سے اور رند ہی پیاسے رہ جائیں
ہے جرأت رندانہ کی کمی ساقی یہ کوئی الزام نہیں

قیدی بھی وہی زنداں بھی وہی عنوان اسیری بدلا ہے
اب کوئی اسیر دام نہیں اور کون اسیر دام نہیں

ہنستوں کو رُلانا آساں تھا روتوں کو ہنسانا مشکل ہے
بے فائدہ کیوں زحمت کیجئے یہ آپ کے بس کا کام نہیں

وہ رابطۂ خاص اور ہی شئے ہے جس کو گلستاں کہتے ہیں
پھولوں کو اکٹھا کر لینے کا ورنہ گلستاں نام نہیں

اب دور ستم اور دور کرم میں اس سے زیادہ فرق نہیں
بدنام بہت تھا دور ستم اور دور کرم بدنام نہیں

اپنے کو مٹا دینے والا قطرہ دریا کہلاتا ہے
جب تک ہے سکت ناکامی کی ناکام کوئی ناکام نہیں

اللہ رے سرور بے طلبی مسرور ہے دل ساغر خالی
یہ تشنہ لبی اور سرمستی نمکینؔ کچھ آساں کام نہیں

پرویز شاھدی

موقعِ یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا

کم سے کم میں غم دنیا کو بھلا سکتا تھا
پر تری یاد نے یہ کام بھی کرنے نہ دیا

اس رفاقت پہ فدا، میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا

تیری غم خوار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے
غم ہستی کی بلندی سے اترنے نہ دیا

حسن ہمدرد ترا ہم سفر شوق رہا
مجھ کو تنہا کسی منزل سے گذرنے نہ دیا

وہ تری شوخیٔ عارض کے قریب آنہ سکی
رنگ جس فکر کو بھی خون جگر نے نہ دیا

میں نے دیکھا ہے ترے حسن خود آگاہ کا رعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا

کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

ظہیر کاشمیری

شورشِ نالہ و فریاد ابھی باقی ہے
طمطراقِ دلِ برباد ابھی باقی ہے
غنچے غنچے میں ابھی تک ہیں قفس پوشیدہ
برگِ گل میں کفِ صیاد ابھی باقی ہے
زخمِ سر آج بھی ہے درد پرستوں کا علاج
عظمتِ تیشۂ فرہاد ابھی باقی ہے
دلِ پُرخوں سے کہو، حیلۂ مرہم نہ کرے
شہر میں اک ستم ایجاد ابھی باقی ہے
ابھی خونابۂ محشر سے گزرنا ہوگا
چشمِ تر اک نئی افتاد ابھی باقی ہے
بزم میں شعلۂ لب سوز جلانے والو!
شہرتِ نغمۂ آزاد ابھی باقی ہے
دلِ مرحوم کی خاموش فضاؤں میں ظہیر
اک سلگتی ہوئی فریاد ابھی باقی ہے

قتیل شفائی

آباد ہیں سینے میں احساس کے بت خانے
کافر ہوں کہ مومن ہوں، اب یہ تو خدا جانے
ایماں سے کہیں بڑھ کر وہ کفر مقدس ہے
انساں سے نہیں لیتا جو خون کے نذرانے
کیوں چاک کرے کوئی دامانِ حیات اپنا
اے کاش بہار دل سے روٹھے رہیں دیوانے
شب کیسی کٹی اپنی؟ کچھ یاد نہیں آتا
بکھرے ہیں سرِ محفل ٹوٹے ہوئے پیمانے
اے ابرِ کرم تجھ سے منکر تو نہیں کوئی
لیکن ترے سائے میں جلتے رہے کاشانے
آنسو بھی قتیل اپنی آنکھوں میں نہیں باقی
ایسے تو نہ دیکھے تھے ہم نے کبھی ویرانے

شاهد صدیقی

کیا ہوا جو گھبرا کے ہر طرف پکار آئے
اس سے حال دل کہیے جس کو اعتبار آئے

یہ عجب تماشا ہے دوست مجھ کو تڑپا ہیں
اور میری حالت پر دشمنوں کو پیار آئے

آپ کھیل کر خوش ہیں اور یہ نہیں معلوم
کس قمار خانے میں کیسی چیز ہار آئے

کاش پوچھ لے بڑھ کے کوئی ناخداؤں سے
کس کو غرق کر ڈالا، کس کو پار اتار آئے

غلام ربانی تاباں

گناہگار محبت ہوں میں قصور ہوا
مگر ادھر سے اشارہ کوئی ضرور ہوا

یہ راز میکدہ سمجھا نہ محتسب نہ فقیہہ
اِدھر غروب اُدھر مہر کا ظہور ہوا

جو پوچھ پاؤ تو پوچھو نگاہ ساقی سے
کسی کا ساغر دل کیسے چور چور ہوا

نگاہ و دل کی سیاست بھی کیا سیاست ہے
حضور یار جنوں اور نا صبور ہوا

نگاہ اٹھی شعاعیں بکھر گئیں تاباںؔ
تمام عالمِ دل غرقِ موجِ نور ہوا

نظر حیدرآبادی

مئے رنگیں کا کیا ہوتا یہ میخانے کہاں جاتے
نگاہِ یار مل جاتی تو پیمانے کہاں جاتے

بہار آئی تو یوں آئی کہ اب کہنا ہی پڑتا ہے
نہ اڑتی خاکِ گلشن میں تو دیوانے کہاں جاتے

غنیمت ہے یہی افسردہ گذرے روز و شب اپنے
طبیعت رنگ پہ آتی تو بہلانے کہاں جاتے

خدا رکھے کسے ملتا ہے لطفِ عیشِ تنہائی
اگر آباد ہو جاتے تو ویرانے کہاں جاتے

ہم ایسے لوگ، اگر ملتا نہ رستہ کوئے جاناں کا
نکل کر دیر و کعبہ سے خدا جانے کہاں جاتے

وطن سے دور رہے جانِ وطن ناشادماں اچھے
تری محفل میں ہم ہوتے تو پہچانے کہاں جاتے

اختر انصاری اکبرآبادی

زندگی بدلی محبت کے چلن بدلے گئے
محفلیں بدلیں، نظر بدلی، سخن بدلے گئے

آہ کی ہم نے تو دل کے زخم تازہ کر لئے
مسکرائے تم تو اندازِ چمن بدلے گئے

شام گذری، رات گذری، صبح آئی بھی تو کیا
ہر بہانے سے طریقِ انجمن بدلے گئے

رہنما بن کر ہزاروں رہنما آئے مگر
راہزن ہی رہ گئے، جب راہزن بدلے گئے

جس کو اہلِ ہوش بھی سمجھے نمودِ علم و فن
اس طریقے سے اصولِ فکر و فن بدلے گئے

مبتلا رہتے فریبِ رنگ و بو میں تا کجا
خود نہیں بدلے تو حالاتِ چمن بدلے گئے

سردار الہام

آؤ اس مہ جبیں کی بات کریں
مہ وش و نازنین کی بات کریں

واعظا چھوڑ ذکرِ حور و قصور
آ مئے دلنشیں کی بات کریں

چھیڑ دیں قصۂ تجلیٔ طور
تیرے روئے حسیں کی بات کریں

ذکرِ طاعت کہاں، کہاں یہ دل
صنمِ دل نشیں کی بات کریں

کیسا کعبہ کہاں کے دیر و حرم
آستان و جبیں کی بات کریں

زیبِ ہر داستاں ہے ذکرِ حبیب
اہلِ عرفاں کہیں کی بات کریں

حسن کی خسروی سلامت باد
آؤ تاج و نگیں کی بات کریں

قمر ساحری

شبِ سیاہ میں میری نظر جہاں ٹھہری
وہیں پہ ہو گیا روشن ستارہ سحری

مجھے کسی کی قیادت پہ شک نہیں لیکن
کہیں چراغوں کی ظلمت نے کی ہے راہبری

ابھی کچھ اور مٹے کا مشیتوں کا غرور
کھلیں گے اور ابھی رازِ عظمت بشری

تمام تہمت غارت گری بجا لیکن
ہمارے اپنے لہو سے ہے کائنات ہری

جہان خرد نے گرائے ہیں جہل کے پردے
مرے جنون نے کی ہے وہیں پہ پردہ دری

ابھی شباب پہ آیا نہیں چمن کا نکھار
کچھ اور خون کی محتاج ہے بہار گری

اچھال دی ہیں سردار زخم کی آنچیں
بتا دیئے ہیں ستاروں کو رازِ صبح گری

رفعت سروش

زندگی کی گلفشانی کی قسم
لالہ و گل کی جوانی کی قسم
پھول بن کر مسکرائی تھی حیا
روزِ اول کی کہانی کی قسم
ڈوبتی جاتی ہے نبضِ کائنات
چارہ گر کی مہربانی کی قسم
زہر سے لبریز ہے جامِ شرابؔ
غمزدہ سی شادمانی کی قسم
کیفِ محرومی کے تیور ہیں عجیب
جلتی بجھتی زندگانی کی قسم
علم کے دریا میں طغیانی نہیں
جاہلوں کی پاسبانی کی قسم
میرے لب پر ہے حدیثِ رنگ و بو
اہلِ فن کی نکتہ دانی کی قسم
دل کی اک دھڑکن میں نغمے ہیں ہزار
زندگی کی کامرانی کی قسم
ایک نفس ہستی حاصلِ کونین ہے
جوئے ہستی کی روانی کی قسم
آپ ہیں شوریدہ سر رفعتؔ سروش
نطقِ حق کی شعلہ بیانی کی قسم

نور محمد نور

بے بسی فکر کا حاصل تو نہیں ہو سکتی
سرنگونی میری منزل تو نہیں ہو سکتی
بند آنکھیں تو نہ ہوں ظلمتِ شب کے ڈر سے
حل کچھ اس طرح سے مشکل تو نہیں ہو سکتی
کارواں رک تو گیا پھر بھی قدم ہیں بیتاب
دل بھی کہتا ہے یہ منزل تو نہیں ہو سکتی
ناخدا تو نے غلط وقت پہ لنگر ڈالا
موج ابھری ہوئی ساحل تو نہیں ہو سکتی
آؤ لیلائے تمنا کا نظارہ بھی کریں
نظر آسودۂ محمل تو نہیں ہو سکتی
منزلِ دار و رسن کی مجھے عظمت تسلیم
وہ بھی قربان گہِ دل تو نہیں ہو سکتی
نغمۂ عیش بھی پیدا ہمیں کرنا ہوگا
زندگی شورِ سلاسل تو نہیں ہو سکتی
غنچہ و گل پہ جو پہرے ہیں انھیں اٹھنا ہے
رائگاں سعیِ عنادل تو نہیں ہو سکتی
سست رَو قافلۂ شوق نہ ہو نورؔ کہیں
استراحت سرِ منزل تو نہیں ہو سکتی

اکبر حیدرآبادی

مرا دل ہے وہ شرارہ جسے آندھیوں نے پالا!
جو مچل پڑے تو بجلی، جو بھڑک اٹھے تو جوالا

نہ دیے کی روشنی ہے نہ تو صبح کا اجالا!
تھی سیاہ رات کل تک، ہوا آج دن بھی کالا!!

ترا فیض عام ہے جب سر میکدہ تو ساقی
ترے میکشوں کو پھر کیوں نہ ملا کوئی پیالہ؟

نہ سنا کلیدِ جنت کی حدیثِ خشک زاہد!
کہ نہ کھل سکے گا ہم سے تری جنتوں کا تالا

ہوئیں مدتیں کہ بدلا وہ مذاقِ سجدہ ریزی!
ہیں جبیں کے سامنے اب نئے بت، نیا شوالہ

ہے نگاہ اپنی اپنی، ہے مذاق اپنا اپنا
کہیں شام کی سیاہی، کہیں صبح کا اجالا

ہے خبر ستم گروں کو کہ کہاں رکیں گی جا کر؟
یہ زمیں گداز آہیں، یہ فلک شگاف نالہ

جسے مدتوں دبایا تھا شرر سمجھ کے تم نے
کہیں ظلم کی ہوا سے نہ بھڑک اٹھے وہ جوالا

یوں سنا رہا ہے باتیں، تو ہمیں سزا جزا کی
ترے پاس جیسے واعظ ہے بہشت کا قبالہ

مرے باغباں نے کی ہے بڑی خدمتِ گلستاں!
کہیں آشیاں جلائے، کہیں خونِ گل اچھالا!!

بڑی پُر فضا ہیں اکبرؔ مرے دیش کی بہاریں
ہیں قدم قدم اجنتا، تو نظر نظر ہمالہ!

اثر مجیدی

کون کہتا ہے ہم تمہارے ہیں
ہم تو ان کے ہیں جو ہمارے ہیں
جو عبارت ہیں موج و طوفاں سے
میری نظروں میں وہ کنارے ہیں
آپ ہی سے مرا تخاطب ہے
برق و باراں تو استعارے ہیں
میرے ماحول کے اندھیرے میں
خون رستے ہوئے نظارے ہیں
آپ جب تک بھی سربلند رہے
ہم نے سولی پہ دن گذارے ہیں
آج گلچیں نظر نہیں آتے
پھول دہکے ہوئے شرارے ہیں
جن سے قائم ہے زندگی کا سہاگ
ان کے آنچل میں سرخ تارے ہیں
ہم اثرؔ ارتقا کے جویا ہیں
ہم سے نزدیک چاند تارے ہیں

س۔ا۔عشرت

فروغِ تشنگیٔ مہر دہن کی بات نہ کر
ابھی بہار نہیں ہے چمن کی بات نہ کر

اب اور کھا نہ سکیں گے فریب اہلِ سفر
قیادتوں میں چھپے راہزن کی بات نہ کر

ابھی تو ایک ہی ساغر دیا ہے ساقی نے
ابھی سے تلخیٔ کام و دہن کی بات نہ کر

ترے شعور نے سمجھا نہیں مقام مرا
تو میرے سامنے دار و رسن کی بات نہ کر

یہاں سکونِ دلِ مضطرب محال سہی
وطن فروش تو ارضِ وطن کی بات نہ کر

بہار آتے ہی نظمِ چمن بدل دیں گے
ابھی تسلطِ زاغ و زغن کی بات نہ کر

تجھے بلندیٔ فکر و نظر نصیب نہیں
سیاہ بختیٔ اربابِ فن کی بات نہ کر

غمِ حیات سے فرصت نہیں ملی عشرتؔ
ابھی تو زلفِ شکن در شکن کی بات نہ کر

شفیق فاطمہ شعریٰ

ہر ایک ذرہ میں سورج ہے دیدہ ور کے لئے
چلے چلو یہ توقف بھی کیوں سحر کے لئے

خیالِ قافلہ درخت و ساریاں ہے عبث
کہ ایک عزم ہی کافی ہے بس سفر کے لئے

ہم ایک لمحہ میں گذرے وہاں سے مثلِ نسیم
گذر محال ہے اب تک جہاں خضر کے لئے

گرفتِ حلقۂ امواج و ظلمتِ ماحول
بلائیں بحر میں کیا کیا نہیں گہر کے لئے

پہنچ کے رفعتِ افلاک تک تو لوٹ آئی
اب اور کون سا سامان ہے نظر کے لئے

نسیمِ صبح کی شادابیوں کو چھان لیا
دوا ملی نہ مجھے سوزشِ جگر کے لئے

خود اپنی حدتِ انفاس ہی سے راکھ بنا
چمک ہی دشمنِ جاں بن گئی شرر کے لئے

فرشتے رشک سے کیوں دیکھتے ہیں سوئے زمیں
حیات اٹھی ہے کس کے طواف در کے لئے

ہنر سے بڑھ کے صلہ اور کوئی کیا ہوگا
صلہ نہیں تو نہ ہو دہر میں ہنر کے لئے

بس اور کچھ نہیں اتنا ہی یاد ہے مجھ کو
چنے تھے پھول کبھی تیری رہ گذر کے لئے

محمد علوی

کھڑے رہے ہیں سرِ رہگذار صبح تلک
کیا ہے یوں بھی ترا انتظار صبح تلک

وہ تارے تھے کہ تھے لمحے شب جدائی کے
جو تارے گنتے رہے بے قرار صبح تلک

مری امید، مری آرزو، مری خواہش
تری وفا سے رہی ہم کنار صبح تلک

تمام رات لرزتی رہی صدائے جرس
اٹھا کیا رہِ دل سے غبار صبح تلک

اتر چکا تھا غمِ جاں گسل رگ و پے میں
بکھر چکا تھا طلسمِ خمار صبح تلک

کہاں کہاں نہ کھلے زخم ہائے دل علوی
کہاں کہاں نہ گئی یادِ یار صبح تلک

محمد حنیف خان ناشاد

رنگ غنچے کا اڑا، چاند سے وہ نور گیا
لے ترے حسن کا چرچا بھی بہت دور گیا

اور اس کوچہ میں خاک اس کی ٹھکانے لگتی
شکر ہے تیرا کہ در تک دلِ رنجور گیا

کس کا یہ ظرف کہ پیتا غمِ ہستی کی شراب
میں ہی بس اک ترے میخانے سے مخمور گیا

اہلِ عرفاں کو ہے پھر حوصلۂ دار و رسن
پھر اسی راہ سے ہو کر کوئی منصور گیا

ان اداؤں میں کہیں سایۂ افرنگ نہ ہو
ابھی ناشاد کہاں وہ بتِ مغرور گیا

مظہر امام

جلالِ دوش ہوں، فردا کا طنطنہ ہوں میں
امام وقت رواں، جان ارتقا ہوں میں
شب فراق کی حد سے گزر چکا ہوں میں
نگارِ صبح کے رخسار چومتا ہوں میں
ذرا سا چھیڑ تو دے زخمۂ بہار مجھے
رباب لالہ و نسریں کا زمزمہ ہوں میں
نظر ملائے بھلا کس طرح ضعیفیِ شب
عروسِ صبح مسرت کا آئینہ ہوں میں
جبینِ مہر بھی جھکتی ہے میرے قدموں پر
زمیں کی رفعت پستی کا دبدبہ ہوں میں
فراز دار بھی رنگیں ہے مرے دم سے
کفِ حیات کا سرمایہ ہوں، حنا ہوں میں
مری خطا نہیں، اگر گونجتا ہے ہر ذرہ
لبِ حیات سے نکلی ہوئی صدا ہوں میں
انھیں یہ زعم کہ کشتی کے ناخدا ہیں وہ
مجھے یہ ناز کہ ساحل کا مدعا ہوں میں
خرد نصیب! نہ کر طنز میری شورش پر
جنونِ عشق کے آداب جانتا ہوں میں
ہزار بار مرے پاؤں لڑکھڑائے ہیں
ہزار بار نئے عزم سے چلا ہوں میں
کسی کی راہبری کی عنایتیں ہیں امام!
کہ رہزنی کو بھی پہچاننے لگا ہوں میں

انجم پرویز

غمِ حیات سے بڑھ کر ہے کائنات کا غم
بہت زمانے میں سمجھے ہیں اتنی بات کو ہم
اب آؤ اوجِ ثریا سے جا کے ٹکرائیں
زمیں پہ رہ کے ستاروں کو توڑ لائیں ہم
جنوں شکار نظر نے یہ راز سمجھایا
کہ مہر و ماہ سے بڑھ کر ہے عظمتِ آدم
نہ سنگِ در کی طلب ہے نہ آستاں کی تلاش
مرے شعور نے ڈھالا ہے خود ہی ایک صنم
زمانہ تم کو سکھائے گا انقلاب ہے کیا!
یہ روز و شب کا تسلسل، یہ گردشِ پیہم
زمانے بھر کے دکھوں کو گلے لگانے سے
ہے درد دل کا بھی احساس آج کچھ کم کم
بتاؤں تم کو یہ کیوں کر کہاں ہوں میں انجم
زماں تو گرد سفر ہے مکاں ہے ایک قدم

سعید اختر نعمانی

سوزِ دروں میرا کامیاب نہیں ہے
رُخ پہ ابھی غم کی آب و تاب نہیں ہے

عشق میں وہ جذبہ کامیاب نہیں ہے
جس میں تب و تاب اضطراب نہیں ہے

اور بھی کچھ ہے یہاں طرب کے علاوہ
حاصلِ ہستی مے و رباب نہیں ہے

بزم بھی ہے مرے ہی خون سے ساقی
اور مرے ہی لئے شراب نہیں ہے

عیش و مسرت میں کیف ہے مگر اے دوست
کیف الم کا کوئی جواب نہیں ہے

عقدہ کُشا ہے کس کی زلف خمیدہ
میری نظر صرفِ پیچ و تاب نہیں ہے

اے غمِ جاناں میں کیف ڈھونڈنے والے
یہ غمِ دوراں کوئی عذاب نہیں ہے

شورشِ پیہم متاعِ شوق ہے اختر
اُف وہ دل جس میں اضطراب نہیں ہے

زبیدہ رضوی

یوں تو ہر راہ نکلتی تھی سوئے باغِ ارم
جانے کس راہ سے گذرے ہیں بہاروں کے قدم

میں کہاں اور کہاں لطف و عنایات کا غم
مجھ کو بدنام نہ کردے یہ ترا حُسنِ کرم

کتنی بے سود ہے یہ کشمکشِ دیر و حرم
یہاں تخیل کے بارے وہاں پتھر کے صنم

ان ہی صحراؤں میں مہکیں گے بہت لالہ و گل
یہ غمِ دوست یہ حالات کا بے پایاں الم

لیلیٰ صبح رہی محوِ خود آرائی ہے
اور کچھ روز ہے یہ تیرگئ شب کا بھرم

ان کی تعزیر کڑی ہے کہ مرا عزمِ جواں
لائیں وہ تیغ و سناں حوصلۂ جور و ستم

آج انسان ہر اک ظلم سے ٹکرائے گا
حُسنِ غمگیں کی قسم خونِ شہیداں کی قسم

جہدِ امروز میں وہ وقت بھی آئے گا قریب
بڑھ کے تلوار اٹھائیں گے ترے اہلِ قلم

افسر آذری

جو اتفاق سے صحرا میں پھول کھلتے ہیں
تو اپنے آپ گریباں کے چاک سلتے ہیں

مچل گیا تھا گھونگٹ تو یوں ہوا محسوس
ندی کے پار شفق رنگ پھول کھلتے ہیں

مری ندیم! مرے حال پر نظر رکھنا
یہ لوگ کیوں مجھے تنہائیوں میں ملتے ہیں!

کھلی شعور کی آنکھیں تو ہم نے یہ جانا
اب آسمان کی چھت کے ستون ہلتے ہیں

چھڑا ہے ذکر تمہارے شباب کا جب سے
کلی کی آنکھ میں آنسو خوشی کے ملتے ہیں

نزہت انور

ترے جمال دل آرا کی تاب لا نہ سکے
ہم اپنی خواہش دیدار بھی مٹا نہ سکے

جو بات حشر اٹھائے ہوئے ہے دل میں ندیم
وہ ایک بات ترے روبرو سنا نہ سکے

محافظانِ چمن کا سلوک کیا کہیے
بھری بہار میں ہم کھل کے مسکرا نہ سکے

نشاطِ جلوۂ جاناں کو ہم نے پا تو لیا
غمِ حیات کی تلخی مگر مٹا نہ سکے

نگاہِ یار تو اپنے فسوں کی بات نہ پوچھ
تری بلا سے اگر دل سکون پا نہ سکے

ہمارا میکدہ، ساقی ہمارا، مئے اپنی
عجیب بات ہے ہم تشنگی بجھا نہ سکے

تبصرے

ڈاکٹر محی الدین زور

نقوش لاہور کے ایک مشہور رسالہ نقوش نے اپنا جنوری کا شمارہ "افسانہ نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ ادارۂ فروغ اردو سے نکلتا ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر دو تین ماہ میں ایک ضخیم مشترکہ شمارہ شائع کرتا رہتا ہے۔
زیر نظر شمارہ میں تقریباً (۴۰) افسانے اور خاکے شریک کئے گئے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں اردو کے اکثر بہترین افسانہ نگار مثلاً عصمت چغتائی، غلام عباس، منٹو، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، کنہیا لال کپور، ہاجرہ مسرور، ابراہیم جلیس وغیرہ شامل ہیں۔
ابتدا میں بعض افسانہ نگاروں کی تصویریں اور سمپوزیم میں حصہ لینے والوں کی تصویریں بھی شریک ہیں۔ یہ سالنامہ پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے آخری حصے میں اس سمپوزیم کی تفصیلات درج ہیں جو اردو افسانہ میں روایات اور تجربے کے عنوان سے ادارہ نقوش نے منعقد کیا تھا۔ یہ پرچہ اس قابل ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے خاص نمبروں کے مقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی کامیابی پر اس کے مدیر محمد طفیل صاحب قابل مبارک باد ہیں۔

ساقی شاہد احمد دہلوی کی ادارت میں ماہنامہ ساقی کراچی سے بھی اسی اہتمام کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے جیسا کہ دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ البتہ اس کی مالی حالت اگلی سی باقی نہیں رہی لیکن علمی و ادبی معیار اسی طرح برقرار ہے۔
جنوری کے خاص نمبر میں مضامین، افسانے، نظمیں اور ڈرامے سب ہی شریک ہیں اور اس کے لکھنے والوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر ابو اللیث، ڈاکٹر عبادت بریلوی، عبدالرحمٰن چغتائی، ایم اسلم، امتیاز علی، جہاں بانو نقوی اور تسنیم سلیم جیسے پختہ مشق ادیب وغیرہ شامل ہیں۔ ہر حصۂ مضامین کا معیار قابل قدر ہے۔ البتہ منظومات کے معیار میں اور زیادہ بلندی کی ضرورت تھی۔ یہ خاص نمبر تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی توصیف کی جائے۔

مشرب کراچی سے صحت مند اور توانا ادب کے ترجمان کی حیثیت سے یہ ماہنامہ اختر انصاری الہ آبادی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۴ء کے ماہ جنوری کا شمارہ سالنامے کے طور پر تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل شائع ہوا ہے جس میں مضامین، نظمیں اور افسانے سب ہی شامل ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عندلیب شادانی، سری نواس لاہوتی، جوش ملیح آبادی، آمنہ ابوالحسن، جیلانی بانو، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس میں دوسری زبانوں کی چیزیں بھی شریک کی گئی ہیں اور یہ ایک اچھا ادبی اضافہ ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی کئی تصویریں بھی اس سالنامہ کی زینت ہیں۔

ھمایوں لاہور کا ایک قدیم ماہنامہ ہے جو میاں بشیر احمد کی ادارت میں سالہا سال سے اپنا معیار اور رنگ قائم رکھے نکل رہا ہے۔ پہلے اس کا سالگرہ نمبر خاص اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔ اس سال جنوری کا پرچہ بطور سالگرہ نمبر کے (۱۱۲) صفحات میں شائع کیا گیا ہے۔ تصویریں وغیرہ شریک نہیں ہیں اس لئے ضخامت کی کمی کی وجہ سے یہ دوسرے پرچوں کے سالناموں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تاہم اپنے بعض مضامین نظم و نثر کی وجہ سے قابل قدر ہے اور معتدل ذوق کے لئے تشفی بخش۔

تحریک گذشتہ سال دہلی سے گوپال متل کی ادارت میں یہ پرچہ شائع ہوا اور اب تک پابندیٔ وقت کے ساتھ ایک خاص رنگ میں شائع ہو رہا ہے۔ اس نے فروری مارچ کے شماروں کو بطور سالنامہ شائع کیا ہے۔ یہ بھی ہمایوں کی طرح

(۱۰۰) صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے مضامین بھی مقالوں، نظموں، افسانوں اور غزلوں پر مشتمل ہیں۔ اس پرچے کی خصوصیت یہ ہے کہ کمیونزم کے خلاف بطور تحریک کے پرچار کرتا ہے اس سالنامے میں ہمالیائی کنونشن کے عنوان سے مختلف شعرا کے نظمیں اور قطعات شائع کرکے ایک علیحدہ حصہ اس کے لئے وقف کیا گیا ہے لکھنے والوں میں جعفر علی خاں اثر۔ احسان دانش۔ امجد۔ محمود سعیدی۔ گوپال متل۔ اختر انصاری قابل ذکر ہیں۔

دھارا دہلی سے نکلتا ہے اور جنوری میں اپنا سالنامہ شائع کیا ہے جو (۲۴۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ بلدیو متر اور مہر چند آرجو اس کو ترتیب دیتے ہیں۔ مقالے، افسانے، غزلیں، نظمیں اور تصویریں سب ادب کے صحت مند قدروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں برجموہن دتاتریہ کیفی۔ احتشام حسین۔ آل احمد سرور۔ کرشن چندر۔ سجاد ظہیر۔ راجندر ناتھ شیدا۔ پرکاش پنڈت۔ خواجہ احمد عباس اور جوش ملیح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سالنامہ اپنے خاص معیار کی وجہ سے قابل قدر ہے لیکن کتابت وطباعت کا معیار ابھی قابل توجہ ہے۔

عاتق شاہ کی طنزیہ کہانیاں کا مجموعہ

اندھیری

جس میں آنسو بھی ہیں اور مسکراہٹ بھی

صفحات (۱۳۶) خوبصورت ٹائیٹل قیمت ۱؍

پبلشرز

تلنگانہ پبلکیشن۔ آغا پورہ۔ حیدرآباد دکن

من موہن لال چترویدی

کے

رومانی

اور

سماجی

افسانوں کا پہلا مجموعہ

دھندلے خاکے

عنقریب شائع ہو رہا ہے

ایک تحریک ــــ ایک راستہ ــــ ایک منزل

ہفت روزہ اجالا بمبئی

ایڈیٹر، گلزار دینوی

قیمت۔ دو آنے ــــــ سالانہ آٹھ

نمونے کا پرچہ مفت نہیں بھیجا جائے گا ــــ مینجر

ہفت روزہ "اجالا" ۲۶۴ بلاسس روڈ۔ بمبئی ۸

ادارۂ ادبیات اردو
کی سرگرمیاں

۳ر جنوری ۱۹۵۴ء

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کے استقبال میں ایک عصرانہ اور مشاعرہ ترتیب دیا گیا جس میں سائنس کانگریس کے اردو مندوبین اور حیدرآباد کے علم دوست اصحاب نے شرکت کی

۸ر جنوری

دکنی بورڈ کی ایک کمیٹی (جس میں ادارہ اور ہندی پرچار سبھا کے نمائندے شامل تھے) سبھا کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ دکنی کتابوں کو ناگری اور اردو رسم خط میں چھاپنے کا پروگرام اور تقسیم کار کے بارے میں تصفیہ کیا گیا۔

۱۰ر جنوری

ادارے کے جملہ معتمدین مجالس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں گزشتہ دو سالوں کے کام اور نظام العمل و طریقۂ کار کا تعین کیا گیا۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔ شاہجہاں بیگم صاحبہ ام اے۔ اکبرالدین صاحب صدیقی۔ رمن راج سکسینہ صاحب۔ خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد۔ مولوی محمد مصلح الدین صاحب۔ مولوی محمد محمود حسین صاحب اور فیض محمد صدیقی صاحب نے شرکت کی

۱۱ر جنوری

معتمد ادارہ کی دعوت پر ایک اردو کانفرنس کے انعقاد کیلئے ملک کے مختلف انجمنوں اور جماعتوں کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا جس میں ایک اڈہاک کمیٹی بنائی گئی۔

۱۳ر جنوری

مجلس ادب اطفال کا جلسہ ہوا جس میں سیدہ ماہ منور ادیب صاحبہ ناظم تعلیمات۔ رابعہ بیگم صاحبہ ام اے۔ سعید جہاں بیگم صاحبہ

راجیندر پرشاد صاحب بی اس اندومتی بندو۔ فیض محمد صدیقی صاحب۔ مراد علی صاحب طالع۔ منیر صفوی صاحب اور مصلح الدین صاحب صدیقی نے شرکت کی اور اس مجلس کا پروگرام اور موازنہ طے کیا۔

مجلس انتظامی شاخہائے ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں عاقل علی خاں صاحب۔ غلام حسین صدیقی صاحب۔ رمن راج سکسینہ صاحب۔ عبدالمنان صاحب۔ پرنسپل ذوالفقار علی صاحب۔ خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد اور عارف الدین حسن صاحب نے شرکت کی۔ شہر اور اضلاع میں شاخوں کو پھر سے سرگرم عمل کرنے اور نئی شاخوں کے قائم کرنے کے بارے میں تصفیہ کیا گیا اور سنہ ۵۴-۱۹۵۵ء کے لئے موازنہ مرتب ہوا۔

۱۴ر جنوری

مجلس انتظامی کتب خانہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ راجیندر پرشاد صاحب۔ حمید شطاری صاحب۔ غلام رسول صاحب۔ اکبرالدین صاحب صدیقی نے شرکت کی۔ طے پایا کہ کتب خانہ سٹی کالج کی فہرست کے نمونے پر ادارہ کی ایک فن واری فہرست تیار کی جائے اور کتابوں کی موجودہ تعداد کو ختم سال پر بڑھا کر ۵۰ ہزار تک کرنے کے لئے ایک مہم جاری کی جائے جس کے لئے ایک اپیل اخباروں میں شائع کی جائے اور مختلف اصحاب تک پہنچائی جائے۔

مجلس تعلیم بالغان اور اردو امتحانات کا اجلاس منعقد ہوا۔ مولوی سید علی اکبر صاحب۔ زینت ساجدہ صاحبہ۔ کنول پرشاد صاحب کنول۔ عابد علی خاں صاحب۔ سید محمد صاحب۔ سر عباس صاحب لاہوتی۔ مظہر حسین صاحب۔ حمیدالدین صاحب شاہد نے شرکت کی۔

طے پایا کہ ... اردو دانی۔ اردو عالم کے امتحانات

لئے جائیں اور ۱۹۵۵ء کے لئے موجودہ نصاب امتحانات پر نظر ثانی کی تجاویز تیار کرنے جائیں تاکہ آئندہ اجلاس میں پیش ہو سکیں۔ مجلس کا موازنہ بھی مرتب کیا گیا۔

● مجلس عمارت ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں شاہجہاں بیگم صاحب ایم اے۔ نوشیرجہانی صاحب۔ نواب سراج الدین احمد صاحب۔ مرزا عباس علی صاحب ناظر۔ ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب۔ ڈی، ڈی اناپیہ صاحب۔ مرزا ہمایوں علی بیگ صاحب۔ جانکی پرشاد صاحب۔ حمیدالدین صاحب شاہد نے شرکت کی اور طے پایا کہ ادارہ کی عمارت کے سلسلے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کر کے معتمد مجلس آئندہ اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کریں۔

۱۵ر جنوری

مجلس علمیہ و تحقیقات کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر اریندر شرما۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ۔ مولوی سید محمد صاحب۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ مس ولاد اگھورے۔ حسینی شاہد صاحب اور نصیرالدین ہاشمی صاحب نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں اس مجلس کے اغراض و مقاصد اور طریقہ کار اور موازنہ طے کیا گیا۔

● مجلس انسائیکلوپیڈیا کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر راحت اللہ خاں۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو۔ ڈاکٹر سید شاہ محمد۔ پروفیسر سید محمد صاحب۔ عالم خوندمیری صاحب۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ۔ پروفیسر سروری صاحب۔ رضیہ بیگم صاحبہ اور ڈاکٹر حفیظ قتیل نے شرکت کی۔ طے پایا کہ اصل انسائیکلوپیڈیا کا کام شروع کرنے سے قبل ایک چھوٹے انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت پر غور کیا جائے جس کا مسودہ تیار ہے اور جس کی جانچ کے لئے عالم خوندمیری صاحب ڈاکٹر سکسینہ اور رفیع محمد صاحب پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنا دی گئی۔

۱۶ر جنوری

ماہنامہ سب رس کی مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں مسز راج صاحب سکسینہ۔ سلیمان اریب صاحب۔ اکبرالدین صاحب صدیقی۔ طیبہ رفعت صاحبہ۔ سرنواس صاحب لاہوتی۔ حمیدالدین صاحب شاہد نے شرکت کی۔ "سب رس" کے متعلق مختلف ارکان نے اشتہارات فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور توسیع اشاعت وارکان مجلس کے اصول طے پائے۔

۱۷ر جنوری

مجلس نشر و اشاعت کا اجلاس منعقد ہوا جس میں محمود حسین صاحب۔ منیرہ بانو کادس جی صاحبہ۔ محمد بن عمر صاحب۔ رفیعہ سلطانہ صاحبہ۔ عالم خوندمیری صاحب۔ ابوالفضل صاحب اور حمید شطاری صاحب نے شرکت کی۔ بعض ارکان کا اضافہ کیا گیا اور طے پایا کہ اس مجلس کے ارکان میں سے ہر رکن ادارے کے لئے اراکین بنائے اور نشر و اشاعت کے لئے مختلف مقامات کا دورہ کیا جائے۔ اس مجلس کا موازنہ بھی طے کیا گیا۔

۱۹ر جنوری

مجلس انتظامی کتب خانہ کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر راحت اللہ خاں۔ خواجہ محمد احمد صاحب۔ مسعود یزدانی صاحب۔ رامچندر پرشاد صاحب۔ خالدہ بیگم صاحبہ۔ غلام رسول صاحب۔ اکبرالدین صاحب صدیقی صاحب اور حمید شطاری صاحب نے شرکت کی اور طے پایا کہ فن واری فہرست کی اسکیم کے لئے جانچ کی غرض سے ایک سب کمیٹی مقرر کی جائے جس میں ڈاکٹر راحت اللہ خاں، مسعود یزدانی اور خواجہ محمد احمد صاحب شامل ہوں۔ گزشتہ میٹنگ میں جو موازنہ اس مجلس کے لئے بنایا گیا تھا اس کو بعد نظر ثانی منظور کیا گیا۔

۲۴ر جنوری

مجلس انتظامی شاخہائے ادارہ کا دوسرا اجلاس معتمد مجلس کے مکان پر منعقد ہوا جس میں معتمد عمومی ادارہ کے علاوہ مولانا حامد صدیقی صاحب۔ حمیدالدین صاحب شاہد۔ پرنسپل ذوالفقار علی صاحب۔ پرنسپل مرزا سرفراز علی صاحب۔ غلام حسین صدیقی صاحب۔ سید محمد صاحب۔ مہدی حسن زبیری صاحب۔ محمد سلطان صاحب نے شرکت کی۔ مختلف مقامات پر شاخیں قائم کرنے کے سلسلے میں اراکین کمیٹی میں مراسلت اور دوروں کے بارے میں کام تقسیم کیا گیا اور پہلے اجلاس کے مرتبہ موازنہ میں ضروری ترمیم کی گئی

۲۵ر جنوری

۵ بجے شام۔ مولوی عبدالحمید خاں صاحب، صدر المہام صرف خاص نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

۲۷ر جنوری

مجلس نشر و اشاعت اور مجلس شاخہائے ادارہ کا متفقہ جلسہ چادر گھاٹ کالج میں منعقد ہوا۔ معتمد ادارہ کے علاوہ پرنسپل ذوالفقار علی صاحب۔ رفیعہ سلطانہ صاحبہ۔ محمد بن عمر صاحب۔ زینت ساجدہ صاحبہ

راج صاحب سکسینہ۔ عارف الدین حسن صاحب۔ منیرہ بانو کاوش
بہ۔ مولانا حامد صدیقی۔ محمود حسین صاحب۔ عالم خوندمیری صاحب
اللہ عزیز صاحبہ۔ قاضی عبدالرشید صاحب۔ خواجہ حمید الدین شاہد صاحب
اللہ حسینی صاحب۔ نذر مصطفیٰ صاحب۔ غلام حسین صدیقی صاحب
بجہ نداس سکسینہ صاحب۔ حمید شطاری صاحب۔ عبدالمنان صاحب
فضل صاحب اور سلیمان اریب صاحب وغیرہ نے شرکت کی اور
پایا کہ مجلس نشر و اشاعت کی طرف سے زینت ساجدہ صاحبہ اور
صدیقی صاحب کو مجلس شاخہائے ادارہ میں اور عارف الدین حسن
حب اور خلیل اللہ حسینی صاحب کو مجلس شاخہائے ادارہ کی طرف سے
س نشر و اشاعت میں نمائندہ مقرر کیا جائے۔ نشر و اشاعت کے کام
توسیع کے لئے مختلف ذرائع تجویز کئے گئے اور طے پایا کہ ادارے سے
لق اردو کتابچہ جلد شائع کیا جائے۔

رفروری ۱۹۵۴ء

مجلس تاریخ دکن کا اجلاس منعقد ہوا جس میں پروفیسر
ردان خاں صاحب شیروانی۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب۔ محمود علی صاحب
راج الدین احمد صاحب۔ مظہر حسین صاحب نے شرکت کی۔ طے پایا کہ
بجار چند کھنہ صاحب اور علی اصغر بلگرامی صاحب کو بھی اس مجلس کی رکنیت
کی دعوت دی جائے اور سال حال تاریخ گولکنڈہ۔ میر مومن اور
رسطو جاہ کا دوسرا ایڈیشن اور حیات بخشی بیگم کی حیات بھی چھپوائی جائے
آئینہ دکن مرتبہ ست گرو پرشاد صاحب۔ تاریخ مالکنڈہ۔ حدیقۃ السلاطین
حصہ دوم کی طباعت کے بارے میں بھی خاص طور پر سرمایہ جمع کرنے کا
کام شروع کرنے کا تصفیہ کیا گیا اور اس مجلس کے لئے موازنہ بھی مرتب ہوا۔

۷ رفروری

ادارے کی مجلس انتظامی منعقد ہوئی جس میں نواب لیاقت جنگ
مولوی سید علی اکبر صاحب۔ راجہ نرسنگ راج بہادر عالی۔ پروفیسر سروری
صاحب۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ مسٹر ایل۔ این گپتا۔ جانکی پرشاد صاحب
مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور ڈاکٹر زور نے شرکت کی

اردو کانفرنس، دکنی بورڈ اور پی ای این کانفرنس کے
سلسلے میں [illegible] اور ادارے کے مجلسوں کی رپورٹیں
[illegible] ادارے کی کونسل کا اجلاس طلب کر کے ان پر غور
کیا جائے۔

● مجلس انتظامی "سب رس" کا اجلاس منعقد ہوا۔ سلیمان اریب
صاحب۔ رمن راج سکسینہ صاحب۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔
طیبہ رفعت صاحبہ۔ لاہوتی صاحب۔ اکبر الدین صاحب صدیقی۔ حمید الدین
صاحب شاہد نے شرکت کی۔ سب رس کا موازنہ اور دیگر امور کے متعلق
ضروری تصفیے کئے گئے اور طے پایا کہ مسز لیسین علی خاں صاحب، سلطانہ عزیز
صاحبہ اور راشد افسر صاحب کو بھی اس مجلس کا رکن بننے کی دعوت دی جائے۔

۱۷ رفروری

شری گوپال راؤ اکبوٹے کے وزیر تعلیم مقرر ہونے پر ادارہ کی طرف سے
عصرانہ دیا گیا جس میں حیدرآباد کی اکثر انجمنوں اور جماعتوں کے نمائندوں
اور ادارے کے اراکین اور علم دوست حضرات کو مدعو کیا گیا۔ مجلس ادب
اطفال کے رکن پی۔ ہنمنت راؤ نے بھی جنہوں نے اسی روز ڈپٹی منسٹری کا
جائزہ حاصل کیا شرکت کی۔ اکبوٹے صاحب اور ہنمنت راؤ صاحب نے
خیر مقدمی تقریر کے جواب میں تقریریں کیں۔

۲۰ رفروری

دفتر ادارہ میں اردو کانفرنس کے علمی و ادبی پروگرام کی ترتیب
کے لئے ایک کمیٹی منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر [illegible]
پروفیسر سروری، مولوی حبیب الرحمٰن صاحب، رضیہ بیگم صاحبہ، حسینی شاہد
صاحب، محمد مہدی صاحب، خواجہ حمید الدین شاہد صاحب، سرینواس
لاہوتی صاحب۔ پروفیسر سید محمد صاحب، کلیم اللہ صاحب اور ڈاکٹر زور
صاحب نے شرکت کی اور کانفرنس کے مختلف اجلاسوں اور ان کے
عہدہ داروں کے بارے میں انتخاب اور تفصیلی پروگرام مرتب کیا گیا۔

۲۴ رفروری

ادارہ کی اڈوائزری کونسل کا اجلاس ہوا جس میں ادارے کی
مجلس انتظامی کے ارکان اور مجالس ادارہ کے معتمدین نے شرکت کی۔
ارمعتمد نے ۱۹۵۴ء و ۱۹۵۵ء کے لئے اپنا لائحہ عمل اور موازنہ پیش
کیا جس پر تبادلہ خیال کے بعد مجلس انتظامی میں پیش کرنے کے لئے
سفارشات اور تحریکات منظور کی گئیں۔

سری نیواس لاہوٹی

حیدرآباد کی ادبی و تہذیبی خبریں

ماہ جنوری اور فروری

۲ر جنوری سنہ ۱۹۵۴ء

تیرہ ارکان پر مشتمل روسی سائنس دانوں کا ایک وفد ۱۳ ویں سائنس کانگریس میں شرکت کے لئے حیدرآباد پہنچا۔ طیران گاہ پر انڈو سویت کلچرل سوسائٹی اور حیدرآبادی عوام کی جانب سے وفد کا استقبال کیا گیا اور گلپوشی کی گئی۔

۳ر جنوری

انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ وشوامتر عادل کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں برق یوسفی نے نظم اور اقبال اختر نے افسانہ سنایا جن پر مباحث ہوئے۔ آخر میں صدر جلسہ نے "ادب اور جمود" کے عنوان پر تقریر کی۔

● ادارۂ ادبیات اردو میں ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کے اعزاز میں ایک مشاعرہ اور عصرانہ ترتیب دیا گیا جس میں حیدرآباد کے کئی علم دوست اصحاب کے علاوہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی نے بھی شرکت کی۔ مشاعرے میں جن شعرا نے حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں: حضرت امجدؔ، مولوی علی منظورؔ، مولانا کامل شطاری، حکیم آشفتہ، نجم آفندی، نرسنگ راج عالی، جعفر عالمپوری، سلیمان اریب، کنول پرشاد، شبیل بالا، عزیز قیسی، قمر ساحری، سرور ڈنڈا، مظہر حسین قیصر، مس۔ ل۔ عشرت، اشد افسر، سعادت نظیر اور ڈاکٹر سکینہ۔

۴ر جنوری

ہندستان کی مشہور ماہر رقص مس شیریں وجفدار نے سائنس کانگریس کے مندوبین اور عوام کے سامنے اپنے رقص کا مظاہرہ کیا۔

۵ر جنوری

بلدیہ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے Lemal seagar gardens میں شہریان حیدرآباد کی جانب سے سائنس کانگریس کے مندوبین کا خیرمقدم کیا گیا۔ اس موقع پر ایک عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔

● ادبی سنگم کا پندرہ روزہ جلسہ "گلفشاں" ملک پیٹھ میں بصدارت صفی الدین صدیقی لکچرار ورنگل کالج منعقد ہوا جس میں خورشید ندیمہ صاحبہ نے ایک افسانہ اور غیاث صدیقی نے ایک غزل سنائی جن پر مباحث ہوئے۔

۶ر جنوری

روٹری کلب میں میجر جنرل سوکھے نائب صدر کل ہند امن کونسل نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مختلف ممالک کے عوام کا مطالبۂ امن اتنا طاقتور اور مضبوط ہے کہ کوئی سیاستداں اس مطالبے کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

۷ر جنوری

"ہندی بھون" میں ہندی پرچار سبھا، پریم چند سوسائٹی اور وینس ٹے گروپ کی جانب سے روسی سائنس دانوں کا استقبال کیا گیا۔ ڈاکٹر ترو درون نے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ روسی عوام ہندستانیوں سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ وفد کو منشی پریم چند کی تخلیقات بطور تحفہ پیش کی گئیں۔ اس موقع پر شری ایل ایں گپتا، پنڈت سری رام شرما، گوپال راؤ ایکبوٹے اور راج گوپال نے ہندوستانی مدد کی

کے عنوانات پر تقریر کرتے ممتاز روسی سائنس دانوں کا استقبال کیا۔

● انڈو سویت کلچرل سوسائٹی کی جانب سے بوٹ کلب میں روسی سائنس دانوں کے اعزاز میں ایک عصرانہ اور خیر مقدمی تقریب منعقد کی گئی جس میں حیدرآباد کے ممتاز اصحاب نے شرکت کی حیدرآباد کے بڑے وزیر نے اراکین وفد کی گلپوشی کی۔

۸ر جنوری

حیدرآباد راجیہ ہندی پرچار سبھا کی جانب سے اتر پردیش کے گورنر اور گجراتی، ہندی کے مشہور ادیب شری کے ایم منشی کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر منشی جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندی کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ دوسری زبانوں کے مروجہ الفاظ کو اپنائے۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تحقیقاتی کاموں میں بھی بین الاقوامی اصطلاحات کا استعمال کیا جانا چاہیئے۔ اس موقع پر مسٹر ایل این گپتا اور پنڈت سری رام شرما نے بھی تقریریں کیں۔

۹ر جنوری

شاد میموریل لائبریری میں تلگو شاعروں کا ایک اجتماع عمل میں آیا جس میں تلنگی کے ممتاز شعرا نے حصہ لیا اور تلگو ادب کے تعلق سے بات چیت کی۔ بعد میں شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

۱۰ر جنوری

عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار جلسہ امیر عارفی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں نصیر اختر اور غوث چغتائی نے افسانے سنائے اور سعادت نذیر نے غزل پڑھی۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ رضیہ بیگم لکچرار کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں عاتق شاہ اور پریم تیاگی نے افسانہ سنایا اور صادق نوید نے غزل پڑھی۔

۱۱ر جنوری

اردو کی مختلف ادبی انجمنوں کی دعوت پر اردو کے کارکنوں کا ایک جلسہ ادارۂ ادبیات اردو میں منعقد ہوا جس میں طے پایا کہ ماہ اپریل یا مئی میں ایک اردو کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ اس میں اردو زبان اور ادب کا جائزہ لیا جاسکے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بقا اور ترقی کے مسائل پر بھی غور کیا جاسکے اس سلسلہ میں ایک استقبالیہ اڈہاک کمیٹی تشکیل پائی جس کے حسب ذیل عہدہ دار

صدر:۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ (معتمد ادارہ ادبیات اردو)

معتمد:۔ حبیب الرحمٰن صاحب (معتمد انجمن ترقی اردو)، نائب معتمدین:۔ سلیمان اریب (معتمد انجمن عوامی مصنفین) اور رمن راج سکسینہ اور ارکان نواب سعید جنگ، جانکی پرشاد، عالم خوندمیری (معتمد پریم چند سوسائٹی) محمد کلیم اللہ (معتمد اس کمیٹی)، پروفیسر عبدالقادر سروری، زینت ساجدہ، عابد علی خاں (ایڈیٹر سیاست) اور سری نواس لاہوٹی منتخب ہوئے۔

۱۲ر جنوری

حیدرآباد کے صحیفہ نگاروں کی جانب سے مسٹر واسدیو راؤ اڈیٹر "مشیر دکن" کو اس کی ۵۰ ویں سالگرہ پر خراج تحسین ادا کیا گیا۔ اس موقع پر مسٹر بندر راؤ اور جانکی پرشاد ناظم و نائب ناظم اطلاعات مسٹر حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اردو، مسٹر عابد علی خاں معتمد حیدرآباد جرنلسٹس کانفرنس اور ہندی پرچار سبھا سے سری نواس لاہوٹی نے مسٹر واسدیو راؤ کی گلپوشی کی اور انھیں مبارکباد دی۔

۱۳ر جنوری

انوار العلوم کالج نامپلی میں ڈاکٹر حفیظ قتیل کی صدارت میں ایک ادبی محفل منعقد ہوئی جس میں زینت ساجدہ لکچرار جامعہ عثمانیہ نے فیض کی شاعری پر تقریر کی۔

۱۷ر جنوری

انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ س۔ ط۔ عشرت کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں برق یوسفی نے اپنی نظم اور جبار جعفر نے اپنا افسانہ سنایا۔ آخر میں صاحب صدر نے غزل سنائی۔

● عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار جلسہ صدیق منزل میں بصدارت مہیش پرشاد منعقد ہوا جس نصیر اختر نے اور امیر عارفی نے اپنے افسانے سنائے۔ اس کے بعد سعادت نذیر نے ایک غزل مسلسل پڑھی

اور مباحث کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

۲۰ر جنوری

ادبی سنگم کا پندرہ روزہ جلسہ صلاح الدین کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں امیر عارفی اور نصیر اختر نے افسانے پڑھے اور تاج ہاشمی نے غزل سنائی۔ اس کے بعد ایک محفل شعر و سخن منعقد ہوئی۔

● ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے پروفیسر بھگوت دیال ورما صدر شعبہ اردو، فارسی جامعہ پونا، اوسمانیہ یونیورسٹی ریسرچ اسکالر یونیورسٹی اور حسید رنگی خاں صاحب پروفیسر اردو جامعہ مدراس کے خیر مقدم میں ایک عصرانہ ترتیب دیا گیا جس میں حیدرآباد کے اکثر اساتذہ اور علم دوست حضرات نے شرکت کی۔

۲۴ر جنوری

عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار جلسہ "صدیق منزل" میں منعقد ہوا جس میں مہیش پرشاد نے ایک مقالہ پڑھا اور حبیب عابد نے افسانہ سنایا۔ آخر میں برق یوسفی اور کیلاش چند نے نظمیں پڑھیں۔ ان نظموں پر بحث کے دوران میں زبان کے مسئلہ پر بھی گفتگو ہوئی۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ سٹے پلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت نعیم زبیری نے لی۔ کیلاش چند اور نصیر اختر صدیقی نے افسانے سنائے۔ حبیب پرواز نے دیہاتی زبان میں ایک گیت پڑھا۔

۲۶ر جنوری

مال والا پیلس میں جشن جمہوریہ کی مسرت میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت راجہ محبوب کرن نے کی۔

۲۷ر جنوری

بدرو کا کالج آف کامرس میں مسٹر سیتو راجہ راؤ ناظم تعلیمات کی صدارت میں ایک غیر طرحی محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں مقامی قدیم و جدید شعراء نے حصہ لیا۔ مسٹر احمد حسین قدوائی نے مشاعروں کی اہمیت پر تقریر کی۔

۲۸ر جنوری

انجمن اتحاد طلبہ مدرسہ فوقانیہ چوک کی جانب سے ایک محفل شعر و سخن منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے کی اور جس میں حیدرآباد کے تمام ممتاز شعراء نے حصہ لیا۔ آخر میں صدر مدرس جناب سرفراز علی صاحب نے شاعروں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

۲۹ر جنوری

انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی جانب سے اردو اخبار "مشیر دکن" کی ۷۰ ویں سالگرہ پر اخبار کے اڈیٹر مسٹر واسدیو راؤ کو مبارکباد دینے کے لئے ایک خیر مقدمی تقریب اور عصرانہ ترتیب دیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر غلام یزدانی نے کی۔ اس میں مشیر حیدرآباد مادا پی ہنمنت راؤ۔ معتمد انجمن ترقی اردو، حبیب الرحمٰن صاحب اور مسٹر ایم نرسنگ راؤ ایم ایل اے نے تقریریں کیں۔ اس موقع پر مشیر دکن کے پرانے پرانے پرچوں کی نمائش بھی کی گئی۔

۳۱ر جنوری

انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ خیرات ندیم صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں برق یوسفی اور مجاہد انصاری نے نظمیں پڑھیں۔ آخر میں اقبال اختر نے افسانہ سنایا۔

● اردو مجلس کا ماہانہ جلسہ نواب ناظر یار جنگ کے مکان پر منعقد ہوا جس میں پروفیسر ہارون خاں شروانی نے "ز، خ، ش کی شاعری" پر ایک پر از معلومات مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد محفل شعر و سخن منعقد ہوئی۔

یکم فروری

انڈین ہسٹاریکل کمیشن کے تیسویں سالانہ اجلاس کا افتتاح حیدرآباد کے بڑے وزیر بی۔ رام کشن راؤ نے کیا۔ اس جلسہ کی صدارت حکومت ہند کے مشیر تعلیم پروفیسر ہمایوں کبیر نے کی۔ ان اجلاسوں میں ہندوستان کے تاریخی واقعات پر دلچسپ مقالے پڑھے گئے۔ سب سے

غدر سے پہلے کے اردو اور ہندی کے قصیدے پر روشنی ڈالی تھی۔

۳ر فروری

دھرم ونت ہندی ہائی اسکول کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ایک کلچرل پروگرام پیش کیا گیا۔ اس کلچرل پروگرام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ڈرامے میں جن لوگوں نے پارٹ کیا تھا وہ سب اسکول کے ننھے طالب علم تھے۔

● حیدری گشتی کتب خانے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "عراق میں اردو" کے عنوان پر تقریر کی۔

۴ر فروری

نمائش تھیٹر میں شام کو مسز رکمنی ارینڈل رکن پارلیمان کے زیر ہدایت ایک رقص و موسیقی کا پروگرام منعقد ہوا جس میں سب سے زیادہ مسز رکمنی ارینڈل کے بھارت ناٹیم کو پسند کیا گیا۔

۵ر فروری

ادبی سنگم کی پندرہ روزہ میٹنگ مسز مغنی تبسم کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں غیاث صدیقی، امیر عارفی اور جبار جعفر نے افسانے سنائے اور برق یوسفی نے نظم پیش کی۔

۶ر فروری

کرناٹک ساہتیہ منڈل کے زیر اہتمام تمام زبانوں کے شعرا کا ایک اجتماع کنڑی کے مشہور شاعر ڈی۔ آر۔ بیندرے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس ادبی اجتماع کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر پیداوار مسٹر کے۔ سی۔ ریڈی نے کیا۔

● کل ہند صنعتی نمائش کی جانب سے اردو ہندی کا ایک ملا جلا مشاعرہ سکندر علی وجد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پرانے اور نئے دونوں قسم کے شعرا نے اپنا کلام سنایا

۷ر فروری

عثمانیہ میڈیکل کالج کے یوم اتحاد طلبار کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک کلچرل پروگرام پیش کیا گیا۔ اس پروگرام میں ہند حکومت کے "آدھار" کو اسٹیج کیا گیا تھا۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ سری نیواس ا... صدارت میں منعقد ہوا جس میں برق یوسفی اور غیاث صدیقی کلام پیش کیا۔ جناب مرتضیٰ نے افسانہ سنایا اور آخر میں صـ... نے "دور وسطیٰ کے نمائندہ شاعر تمسی داس" پر اپنا مقالہ پڑ...

۱۱ر فروری

حیدرآباد ہندی پرچار سبھا کی جانب سے مسٹر گوپال ... وزیر تعلیم کا خیر مقدم کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا گیا۔ اس مو... عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ مسٹر ایل۔ این گپتا معتمد تعلیما... خیر مقدمی تقریر کی جس کے جواب میں مسٹر اکبو نے کہا ... کو مقبول بنانے کی کوشش کریں گے۔

۱۴ر فروری

عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار اجلاس صدیقی ... مغنی تبسم منعقد ہوا جس میں امیر عارفی اور امجد باغی نے افـ... جس پر کافی بحث ہوئی۔ بعد میں سعادت نذیر اور صاحب ... کلام سنایا۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ وحید اختر ... میں منعقد ہوا۔ کیلاش پرشاد جیسوال اور اختر عادل نے ا... اور شریف اشتر اور حبیب پروانہ نے اپنا کلام برغرض تنقید ... نصرت یوسف زئی نے ایک تاثر سنایا۔ آخر میں صدر جلسہ پر ایک مضمون پڑھا

۱۵ر فروری

بزم اتحاد طلبا نظام کالج کی جانب سے ایک غیر طر... سخن منعقد ہوئی جس کی صدارت حیدرآباد کے مشہور ... نویس مسٹر فضل الرحمن نے کی۔

۱۷ر فروری

ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے شری گر...

کے وزیر تعلیم مقرر ہونے پر ایک عصرانہ ترتیب دیا گیا، جس میں تقریباً دو سو اصحاب نے شرکت کی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور معتمد ادارہ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ خیر مقدمی تقریر کا جواب دیتے ہوئے مسٹر ایکبو نے نے کہا کہ اردو کے مستقبل کی جانب سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اردو زبان اور ادب کا خزانہ اس قدر وسیع اور مالا مال ہے کہ اسے کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا۔ آخر میں انھوں نے یقین دلایا کہ وہ حتی الامکان اردو کے تحفظ و بقا کے سلسلے میں مدد کرتے رہیں گے مسٹر بی۔ ہنمنت راؤ نائب وزیر مال نے بھی تقریر کی اور گاندھی جی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اردو ہندستان ہی کی زبان ہے اور ملک میں ایک ایسی ہندستانی کو رائج کرنا چاہیے جو اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی اور سمجھی جائے۔

۲۰ رفروری

ایک محفلِ شعر و سخن بیادگار ستگرو پرشاد راہبر آنجہانی منعقد ہوئی اس محفل کی صدارت راجہ نرسنگ راج عالی نے کی۔

● ادبی سنگم کی پندرہ روزہ میٹنگ پریم تیاگی کی صدارت میں منعقد ہوئی برق یوسفی نے اپنی نظم اور شاہ غیاث نے اپنا مقالہ "امراؤ جان ادا" پر تجزیہ تنقید پیش کیا۔ پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد، مغنی تبسم اور غیاث صدیقی نے بحث میں حصہ لیا۔ آخر میں محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی۔

۲۱ رفروری

انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ نصرت یوسف زئی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں کیلاش پرشاد، اسماعیل ادیب، مجاہد انصاری اور فاروق اعظم نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

● عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار اجلاس قمر ساحری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں سریندر ناتھ گوڑ نے افسانہ سنایا۔ امیر عارفی، اسعاد نظیر اور غیاث صدیقی نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں صاحب صدر نے اپنی تازہ غزل سنائی۔

● پروفیسر عبدالقادر سروری نے حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے یہاں عصرانے پر مدعو کیا جس میں شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

۲۳ رفروری

انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کی جانب سے کالج ڈے کے موقع پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں حیدرآباد کے ممتاز شعراء نے حصہ لیا

۲۵ رفروری

مشہور ترقی پسند شاعر اور کمیونسٹ لیڈر مسٹر مخدوم محی الدین ایم ایل سی ڈیڑھ ماہ تک یورپ کا دورہ کرنے کے بعد وارد حیدرآباد ہوئے۔ آپ نے ویانا امن کانفرنس میں حیدرآبادی مندوب کی حیثیت سے بھی شرکت کی تھی۔

۲۶ رفروری

روسی تہذیبی وفد کا ریلوے اسٹیشن پر حیدرآباد کے مختلف تہذیبی اداروں کی جانب سے شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ روس کا یہ تہذیبی وفد چھپن ارکان بشمول بارہ خواتین پر مشتمل تھا۔ وفد کے ہر رکن کو کثرت سے پھول کے ہار پہنائے گئے۔

● بلدیات حیدرآباد و سکندرآباد اور شہریوں کی جانب سے روسی تہذیبی وفد کا نمائش کے میدان میں خیر مقدم کرتے ہوئے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا وفد کے لیڈر مسٹر نکولائی ایچ بسپالوف نے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے کہا ہند اور روس کے درمیان تہذیبی وفود کے تبادلے دونوں ممالک کے رشتوں کو استوار کریں گے۔ شہریوں کی استقبالیہ کمیٹی نے وفد کے سامنے لمباڑہ ناچ، سدی ناچ اور طبلہ و سارنگی کا پروگرام پیش کیا جسے وفد کے ارکان نے کافی پسند کیا۔

● نمائش میدان کے کھلے تھیٹر میں سوویت فنکاروں نے ہزاروں حیدرآبادیوں کے سامنے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ حیدرآباد کے بڑے وزیر بی۔ رام کشن راؤ نے حیدرآبادیوں کی جانب سے بڑے پرجوش انداز میں وفد کا خیر مقدم کیا۔ پروگرام کا آغاز روس اور ہند کے قومی ترانوں سے کیا گیا۔ سیاسی اختلاف رائے کے قطع نظر سب ہی لوگوں نے پروگرام کو بیحد پسند کیا۔ اس پروگرام میں شریک ہونے کے لئے تلنگانہ اور ریاست آندھرا کے دو سو اراکینِ مقننہ خاص طور پر آئے تھے۔

۲۷ رفروری

انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کے سالانہ عشائیہ کے موقع پر ایک محفلِ شعر و سخن زیر صدارت مخدوم محی الدین منعقد ہوئی جس میں سلیمان اریب، عزیز قیسی، وحید اختر، شاذ تمکنت، س۔ ا۔ عشرت، عصمت اللہ بیگ

اور سرور ڈنڈا نے حصہ لیا۔

● بزم اتحاد ایوننگ کالج کے زیر اہتمام علامہ حیرت کی صدارت میں ایک محفل شعر و سخن منعقد ہوئی جس میں حیدر آباد کے قدیم اور جدید شاعروں نے حصہ لیا۔

۲۸ر فروری

عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار جلسہ جاندار افسر کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ امجد باغی کے افسانے "گاندھی کا خط نہرو کے نام" پر کافی بحث ہوئی۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ غیاث صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نعیم زبیری اور اسمٰعیل ادیب نے افسانے اور برق یوسفی نے غزل سنائی جس پر بحث و تنقید ہوئی

● اردو مجلس کا ماہانہ اجلاس بصدارت مولوی غلام یزدانی نامکر جنگ بہادر کے مکان پر منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر ہاشم امیر علی خاں نے امریکی جامعات پر ایک معلومات آفریں تقریر کی اور نصیر الدین ہاشمی نے "تاثرات سفر عراق" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ آخر میں شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

حیدر آباد میں اردو کانفرنس

جو حیدر آباد میں ۳۰ر اپریل ۱۹۵۴ء سے ۲ر مئی ۱۹۵۴ء تک منعقد ہوگی

جس میں

"دکن میں اردو زبان کا ارتقا" اور "موجودہ اردو ادب کا جائزہ"

کے عنوانوں پر سمپوزیم کے علاوہ

کلچرل پروگرام ہوگا، کل ہند مشاعرہ اور کوی سمیلن ہوگا اور علمی و ادبی نمائش ہوگی۔

کانفرنس میں جگر مراد آبادی، قاضی عبدالغفار، گوپی ناتھ امن، کشن پرشاد کول، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، آل احمد سرور، عبدالقادر سروری، احتشام حسین، کرشن چندر، مخدوم محی الدین، راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، جگن ناتھ آزاد اور حیدر آباد کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے شریک ہونے کی توقع ہے۔

آج ہی استقبالیہ کمیٹی کے ممبر بن جائیے

چندہ:۔ پانچ روپے سکۂ ہند   طالب علموں کیلئے:۔ دو روپے سکۂ ہند

حسب ذیل جگہوں سے ٹکٹ حاصل کئے جا سکتے ہیں

ادارۂ ادبیات اردو۔ خیریت آباد   دفتر انجمن ترقی اردو۔ حمایت نگر

دفتر روزنامہ "سیاست" نظام شاہی روڈ   دفتر انجمن عوامی مصنفین کمرہ نمبر ۳۵ معظم جاہی مارکٹ

آپ حیدرآباد ضرور تشریف لائیے

یہ نہ سوچئے کہ یہاں رہنے سہنے کے لئے آپ کا کوئی گھر نہیں یا کھانے پینے کا
کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ایسا نہ سوچئے اس لئے کہ شہر حیدرآباد میں

عزیزیہ ہوٹل (قیام و طعام)

ایک ایسا عام ہوٹل ہے جو خاص ہوٹلوں کی سی خصوصیات رکھتا ہے اور
جہاں آپ قیام فرما کر اپنے گھر جیسا سکون پا سکتے ہیں اور دیجیٹرین اور نان ویجیٹرین غذاؤں
سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہاں ہر وقت آپ پاکیزگی، نفاست اور صفائی پائیں گے۔

آپ کا محبوب مرکز

عزیزیہ ہوٹل و قیام گاہ

نامپلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن


at the
FIRST
SNEEZE
چھینک آتے ہی
چھینک کے آتے ہی سُعالین کی ایک ٹکیہ زبان پر
رکھکر آہستہ آہستہ چوسئے یہ نہ صرف زکام کو تسکین دے گی،
حلق کی خرابیوں کو دُور کریگی، طبیعت کو سکون بخشے گی
بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کر کے نظام میں توازن پیدا
کرے گی اور سانس کو خوشگوار بنائے گی۔
قیمت فی شیشی بارہ آنے (۱۲؍)
KEEP A BOTTLE HANDY
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی
Hamdard
DAWAKHANA (TREST) DELHI
ہزاروں روپے مفت انعام حاصل کرنے کے لئے رسالہ "ہمدرد صحت" کا مطالعہ کیجئے

حُسن

بغیر زیور کے نامکمل ہے

اور

آرائش کے لئے آپ زیور خریدتے
ہی ہیں اور پرانے اور فرسودہ زیور
نکال دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں

ہماری خدمات حاصل فرمائیے

شاخ سورج بھان اینڈ کمپنی

کمالی کمان روڈ متصل گلزار حوض۔ حیدرآباد دکن

بجرنگ پرشاد چودھری



یہ مسکراتے ہوئے چہرے۔ حال کی مسرتوں
اور سکون کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ لیکن ان کے
مستقبل کے سکون اور مسرتوں کی ذمہ داری
بھی تو آپ پر ہے۔ آپ صاحب عقل
فراست ہیں۔ دور اندیش ہیں۔ اسی لئے
زندگی کے کسی ناخوشگوار موڑ کے
آنے سے پہلے ان کے مستقبل
کی خوشیوں اور سکون کا ضامن

دی نیو ایشیاٹک انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

کو بنا دیجئے

ہماری ایجنسی کیلئے حسب ذیل پتہ پر لکھئے یا فون کیجئے

فون نمبر ۵۳۵۲

دی نیو ایشیاٹک انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

سلطان بازار۔ حیدرآباد دکن

خوشبو کے تصور کے ساتھ

گلبہار کمپنی

کا خیال آنا ضروری ہے

دکن کا یہ مشہور اور قدیم کارخانہ جو ایک عرصہ دراز سے اپنے معزز گاہکوں کی خدمت میں عطر گلبہار، عطر سلیمہ عطر شمامتہ العنبر، عطر بیٹ موگرا اور ہمہ اقسام کے ہیر آئیل۔ روحانی اگربتی وغیرہ پیش کر کے خراج تحسین حاصل کرتا رہا ہے

گلوں کی روح

کو

پیش کرنے والا

دکن کا مایۂ ناز کارخانہ



گلبہار کمپنی حیدرآباد دکن

افضل گنج۔ معظم جاہی مارکٹ۔ ہنمکنڈہ (ورنگل)

نوٹ (۱) نقالوں اور نقلی مال سے بچئے۔ (۲) گلبہار کمپنی کی تیار شدہ اشیا سیل بند دیکھکر خریدئیے۔ (۳) اضلاع کی سہولت کی خاطر وی۔ پی اور پارسل کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔

یادگیر نے ہمیشہ رہنمائی کی ہے

یادگیر ۔ جہاں سے ٹوپیوں کے پھندنے جنوبی آفریقہ، مصر، برما، ترکی اور سیلون کو برآمد کئے جاتے ہیں۔

یادگیر ۔ جو بیڑی سازی کا بہت بڑا مرکز ہے۔

یادگیر ۔ جو ریاست حیدر آباد کے تعلقوں میں سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے

لیکن اب یادگیر کی رہنمائی **میری اینڈ کمپنی** کرتی ہے

کیونکہ اس کے بنائے ہوئے پیپرمنٹ اور لانسجر عمدہ اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔

ایجنسی کے لئے

ہمیں لکھئے

MARRYSWEETMEAT COM-PANY.

YADGIR.C.R.

BRAS MONTHLY
DERABAD, MARCH 1954
Regd No. H. 153

ادارہ ادبیات اردو
کی چند مطبوعات

تاریخ ادب اردو یہ تاریخ زیادہ تر طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اہل صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے عام اصحاب کے لئے بھی معلومات کا ذخیرہ ثابت ہوئی۔ چھوٹی تقطیع (۱۷۶) صفحات قیمت دو روپے۔

مدراس میں اردو از مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ مدراس میں زبان شروع ہوا اور اس کے ارتقاء کی تاریخ ہے۔ نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دور کے شعراء و نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونہ کلام تفصیل سے درج ہے۔ صفحات (۲۰۰) قیمت مجلد دو روپے

اردو مثنوی کا ارتقاء از پروفیسر عبد القادر صاحب سروری۔ اردو شاعری کی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ یہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ بڑی سائز (۱۴۳) صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے۔

آریائی زبانیں از ڈاکٹر سدھیشور ورما صاحب ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ پروفیسر سنسکرت و اردو زبان میں اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سرگزشت حاتم از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ شاہ ظہور الدین حاتم ان چند شعراء میں سے ہیں جنھوں نے ولی دکنی کی تتبع میں مستقلاً اردو شاعری کی پروان چڑھایا اور اسکے بعد ساری دنیا کا ادب وسیع حلقہ چھوڑ گئے جنھوں نے اردو شاعری کو بڑھایا۔ اس کتاب میں ان کے حالات و سوانح خصوصیات کلام اور بعض منتخب مطالب قرار دی ہے۔ بڑی سائز۔ صفحات (۱۲۸) قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ

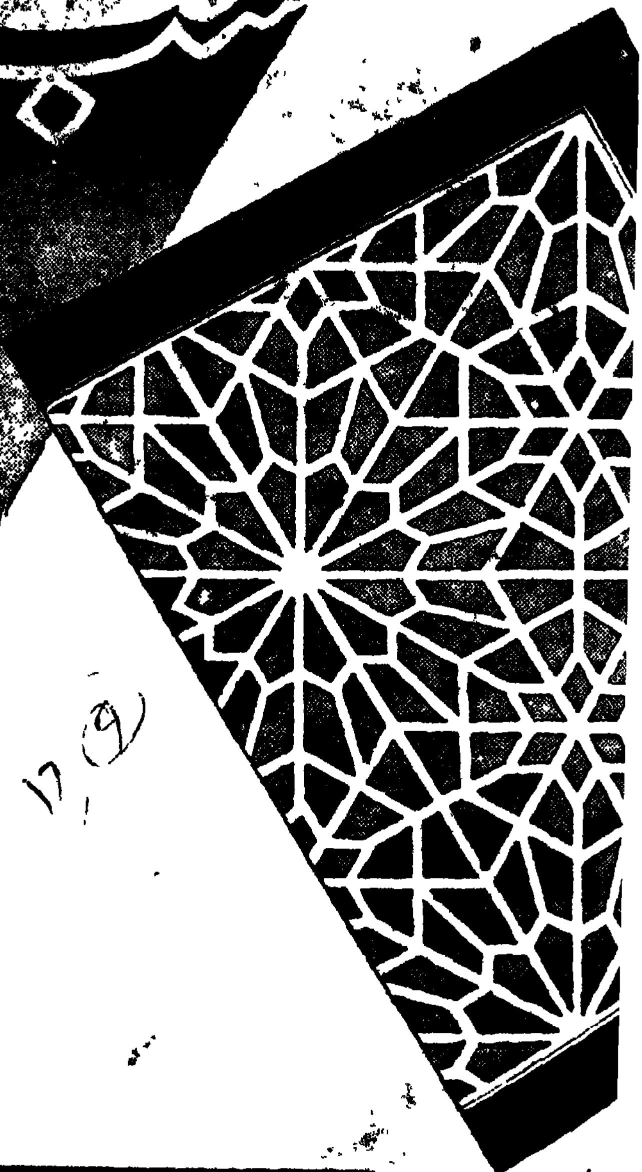
سب رس کتاب گھر خیریت آباد

حیدرآباد دکن

dern Printing House, Jambagh Road, Hyd-Dn.

سب رس

۹-۱۷



۱۶(۹)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

جلد (۱۷) شمارہ (۹)

ماہ ستمبر ۱۹۵۴ء

نگران
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارت
نجمہ سمیع
رشن راج سکینہ
نصیر الدین ہاشمی

سالانہ چندہ پانچ روپے سکۂ ہند
ششماہی " تین " "
(رجسٹری نمبر بذمہ خریدار)

فی پرچہ
آٹھ آنے

اس شمارے میں

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے "طارق برقی پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

اداریہ

پہلی بات

اس دفعہ پہلی بات کے تحت ہمیں کوئی خاص بات نہیں کرنی ہے۔ تاہم کچھ باتیں کی جاسکتی ہیں۔ "سب رس" کا پہلا نمبر اردو کانفرنس نمبر تھا جسے ہم نے بڑی محنت کے بعد ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے پیش کیا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ ہمارے لکھنے والے اور پڑھنے والے اس پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کریں گے لیکن ابھی تک بہت کم رائیں وصول ہوئی ہیں۔ ہم اپنے تمام دوستوں سے اس کی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اپنی قیمتی رایوں سے ہمیں ضرور مطلع کریں تاکہ آئندہ ایسے نمبروں کی ترتیب و تدوین میں ہمیں مدد مل سکے۔ بعض حلقوں میں کانفرنس نمبر کافی موضوعِ بحث رہا ہے لیکن اس کی "سند" نہیں اور اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ہم نے یہ نمبر بہت سے اخباروں اور رسالوں کو بھی ریویو کے لئے بھیجا تھا لیکن ابھی تک بہت کم معاصرین نے اس طرف توجہ کی ہے۔ البتہ ایک اخبار میں ایک "صاحبہ" نے اس پر خوب خوب لکھا جس کے لئے ہم اس اخبار اور ان "صاحبہ" کے بہت بہت شکرگزار ہیں لیکن افسوس کہ وہ تحریر تبصرہ اور تنقید سے بالاتر ہے اس لئے ہم اسے "سب رس" میں دینے سے معذور رہے۔

ہم نے اپنی مجلس انتظامی میں طے کیا تھا کہ ہر ماہ "سب رس" پہلے ہفتے میں شائع ہو جایا کرے لیکن اس دفعہ بھی اس وعدہ کی پابندی نہ ہو سکی۔ آئندہ ماہ سے اس کی انتہائی کوشش کی جائے گی کہ پرچہ تاخیر سے نہ نکلے۔

دفتر پر بعض خریداروں کے شکایتی خطوط آئے ہیں کہ انھیں پرچہ برابر نہیں مل رہا ہے۔ یہ کوئی نئی شکایت نہیں ہے اور اس سلسلے میں ہم محکمہ ڈاک کو بار بار لکھ چکے ہیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ لہٰذا آئندہ سے اگر کسی صاحب کو مہینے کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو وہ اس کے فوراً بعد ہمیں مطلع کردیں ہم دوبارہ پرچہ بھیج دیں گے۔

سب رس

اساسیب

جان پہچان

تمکین کاظمی

۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اور حیدرآباد کے ایک قدیم اور روشن خیال گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد مولوی سید منتجب الدین تجلی داغ کے شاگرد تھے اور ان کی والدہ کی تعلیم حلیمہ بیگم صاحبہ (بنت عماد الملک) کے ساتھ ہوئی تھی۔ چنانچہ بچپن ہی سے ان کو ایک ایسا علمی اور ادبی ماحول ملا جو ہر شخص کو نہیں ملتا۔

تمکین صاحب کی ادبی زندگی کی ابتداء نثر نگاری سے ہوئی اور ساتھ ساتھ کچھ دنوں تک انھوں نے شاعری بھی کی لیکن بعد میں مہدی افادی اور ناجور نجیب آبادی کے مشورے سے ایک "دیوان برابر" شعر کہنے کے بعد شاعری ترک کر دی اور نثر نگاری ہی کو اپنے لیے مختص کر لیا۔

تمکین صاحب پہلے تو طلسم ہوشربا کی طرز پر اور پھر مہدی افادی کی اتباع میں نثر اور افسانے لکھے۔ لیکن بعد میں ڈرامے اور اس کے بعد ادبی تنقید کی جانب رجوع کیا۔ بالآخر کسی ایک صنف کا پابند رہنے کی بجائے ایک "انشاء پرداز" بننا مناسب سمجھا اور اس وقت سے اب تک ہر صنف ادب پر لکھ رہے ہیں۔

بیچ میں تمکین صاحب کو جرنلزم کا بھی شوق ہوا چنانچہ وہ اس شوق کی تکمیل کے لیے کچھ دنوں تک دلی اور لاہور میں بھی رہے لیکن قدرت نے انھیں جرنلسٹ بنانے کے بجائے کلرک بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ پھر حیدرآباد واپس آگئے اور تقریباً (۲۵) سال سے دفتر میں قلم گھستے اور ادب اور اہل و عیال کی خدمت کرتے ہیں۔

تمکین صاحب نے ۱۹۲۷ء سے جب سے کہ وہ ایک باقاعدہ ادیب کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آئے ہیں بہت کچھ لکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ اب تک ان کی صرف چار کتابیں — آسکر وائلڈ کے ڈرامے "دی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" اور ایک فارسی ناول "معشوقہ نپولین" کا ترجمہ (عبد المنعم صاحب سعیدی کے ساتھ مل کر) "غنچۂ تبسم" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ، "تذکرۂ ریختی" ریختی گو شعراء کا تذکرہ — شائع ہو سکی ہیں اور کوئی درجن بھر کتابیں — "مدار سلطنت" نظام علی خاں کے زمانے کے مشہور مدار المہام کے سوانح حیات)، "مومن" اردو کے مشہور شاعر مومن خاں مومن پر تحقیقاتی تصنیف"، "طوطیان ہند" اردو میں شعر کہنے والی خواتین کا تذکرہ، "عملی زندگی" عملی نفسیات کے موضوع پر تالیف۔ "تزک آصفیہ"، "گلزار آصفیہ"، "آداب دربار آصفی"، "یادگار مکھن لال"، "آشوب نظامی" کے ترجمے اور ان کے علاوہ مضامین کے کئی مجموعے — اشاعت کے انتظار میں پڑی سڑ رہی ہیں۔

تمکین کاظمی صاحب بڑے وضعدار، باوضع، با اخلاق، صاف گو اور نام و نمود سے بے پرواہ قسم کے آدمی ہیں۔ حالات بدل گئے، لوگ بدل گئے لیکن ان کے متعلق لوگوں کی رائے نہیں بدلی۔

سید حسن

شاہد صدیقی

اردو شاعری کی نئی نسل کے شاعروں کے اس قبیل سے تعلق رکھتا ہے جس میں مجاز جیسے شاعر آتے ہیں۔ ایسے شاعر جو انتہائی ہردلعزیز بھی ہیں اور "بدنام" بھی۔

شاہد صدیقی اور مجاز میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں جیسے ذہانت، ظرافت، زندہ دلی، برجستہ گوئی، غیر ذمہ داری، لاابالی پن، انتہا پسندی اور آزادہ روی لیکن ساتھ ہی ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مجاز اپنا دماغی توازن کھو سکتا ہے شاہد نہیں کھو سکتا۔

شاہد صدیقی کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ ۱۹۳۶ء سے شعر کہتا اور اخبار نویسی کرتا ہے۔ اس طرح اس کی شاعری کی عمر آجکل کے بہت سے "صاحب دیوان" اور مشہور شعرا کی عمر سے زیادہ ہے لیکن اب تک نہ اس کا کوئی مجموعہ کلام شائع ہوا ہے اور نہ اسے وہ شہرت حاصل ہوئی جس کا وہ مستحق ہے۔ حالانکہ "کمیت" اور "کیفیت" کے لحاظ سے اس کے اب تک کئی مجموعے شائع ہو سکتے تھے اور اسے بہت مشہور بھی ہونا چاہئے تھا۔ اس ٹریجڈی کا ایک دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ جب اخبار نویسی بھی اس کے کمانے کے آخری ذریعہ کے طور پر باقی نہیں رہی ہے تو کچھ تو پیٹ کے لئے اور کچھ "تن آسانی" کی خاطر وہ اپنا فن ایک ایسے "محمود" کے ہاتھ بیچ رہا ہوگیا ہے جو عصمت اور شعر دونوں کو حرم میں داخل کر لیتا ہے۔

شاہد صدیقی یوں تو ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کر سکتا ہے لیکن دراصل وہ غزل کا شاعر ہے اور اردو غزل کے مزاج اور اس کی روایات سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہے بلکہ اس کو بخوبی برتنا بھی جانتا ہے۔

شاہد صدیقی ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے اس کے ساتھ ہے لیکن ۱۹۴۸ء میں ایک خوفناک گمراہی کا شکار ہو کر بچ نکلا ہے اور آج پھر اپنے صحیح راستے پر گامزن ہے۔

شاہد اگرچہ دیار تاج محل کا رہنے والا ہے لیکن ۱۹۴۸ء سے اس نے سرزمین تلنگانہ کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور اب کسی قیمت پر غریب الوطن بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

شاہد کی عمر اس وقت ۴۲، ۴۴ سال ہوگی لیکن کیا مجال جو آپ اس کے چہرے یا اس کی باتوں سے اس کی عمر کا اندازہ لگا سکیں۔ میرا خیال ہے کہ شاہد کبھی بوڑھا نہ ہوگا اس لئے کہ وہ شعر، ارتقا اور جوانی سے پیار کرتا ہے اور اسے آنے والی زندگی پر بھرپور یقین ہے۔

انور معظم

کبھی اورنگ آباد بڑا مردم خیز خطہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے کئی خارجی اسباب تھے لیکن آج اورنگ آباد نہ کبھی محمد تغلق کی راجدھانی ہے اور نہ کسی اورنگ زیب کا محبوب شہر۔ لہٰذا اب وہاں کی خاک سے کوئی ولی اور سراج نہیں اٹھتا تاہم "ریاست حیدرآباد" میں حیدرآباد کے بعد اورنگ آباد ہی ایک ایسا صوبہ ہے جو ایک ادبی مرکز رہا ہے اور جہاں سے آج بھی ادیب اور شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ شیخ چاند، اسکندر علی وجد، عاقل حسین، عبدالرؤف عروج، سعادت علی خاطر، وحید اختر اور انور معظم۔

انور معظم شاعر بھی ہے اور افسانہ نگار بھی اور اس میں ایک اچھے شاعر سے زیادہ ایک اچھا افسانہ نگار بننے کی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی عمر اب ۲۴، ۲۵ برس ہوگی اور ابتدا وہ ایم۔ اے کا طالب علم ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے کی عمر دو ایک برس سے زیادہ نہیں ہو سکتی لیکن اس کے باوجود ایک [illegible] بہت اچھے افسانے لکھ چکا ہے۔ جس میں ایک [illegible] خیال ہیں۔ پچھلے دنوں اس کا ایک خاصا بہت کامیاب [illegible] اورنگ آباد [illegible] اور حیدرآباد کے [illegible] [illegible]

مخدوم محی الدین کے نام ایک چیک لڑکی کا خط

جون ۱۹۵۲ء کی بات ہوگی مخدوم محی الدین صاحب کو آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے ہندستان سے باہر جانا پڑا۔ پہلے مخدوم ویانا گئے جہاں ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کا مرکزی دفتر ہے اور پھر وہاں سے انھوں نے بحیثیت ڈیلیگیٹ سوویٹ روس، عوامی جمہوریہ چین، چیکوسلواکیہ اور مشرقی یورپ کی دوسری عوامی جمہوریتوں کا دورہ کیا۔ چیکوسلواکیہ میں مخدوم کو اردو کے ایسے اسکالرس بھی مل گئے جنھیں اردو یا ہندی سے بڑی محبت ہے اور جو نہ صرف اردو لٹریچر سے دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ چیک زبان میں اردو کی کتابوں کو منتقل بھی کر رہے ہیں ایسی ہی ایک چیک لڑکی کا اصل خط جو اردو سے کافی اچھی طرح واقف ہے ہم یہاں چھاپ رہے ہیں یہ خط مارچ ۱۹۵۳ء میں پراگ سے لکھا گیا تھا جب کہ مخدوم ویانا ہی میں تھے۔

مخدوم اب ہندستان واپس آ چکے ہیں اور انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے سفر کے تاثرات یا زیادہ صحیح الفاظ میں تذکرہ وہاں کے ممالک میں ادبی سرگرمیوں اور بعض ادیبوں سے ملاقات کا حال بتلائیں گے۔ جو انٹرویو کی شکل میں ہم شاید اکتوبر کے "سب رس" میں پیش کر سکیں گے

۵ ادارہ

مسترم ساتھی!

آپ کے جانے کے بعد میری بات چیت Alexandr Novotny (ہمارا ادبی ہفتہ وار) اخبار کے ایک مدیر (ایڈیٹر) سے ہوئی۔ میں نے انھیں آپ کے قلم کہانی سنائی۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ وہ اس واقعہ کو اپنے اخبار میں چھپانا چاہتے ہیں۔ اس لئے وعدہ کیا ہے کہ آپ کو خط لکھوں گی اور اگر آپ مہربانی کر کے مجھے کہانی لکھ بھیجیں تو اس کا ترجمہ کر کے دوں گی۔

میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے یہ سوچ کر کہ ہمارے سارے لوگ جو اس کہانی کو پڑھیں گے ان پر ایسا ہی گہرا اثر پڑے گا جیسا ان مزدوروں پر جنھیں آپ نے یہ واقعہ سنایا تھا۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ آپ کا کلام زیادہ لوگ نہیں سن سکے۔ جب میں اتوار کے دن آپ سے مل کر گھر واپس آئی تو تمام دن آپ کے شعر میرے کانوں میں اور دل میں گونجتے رہے۔

جب مجھے "عقیدہ" کا خیال آیا اس کے الفاظ اور سے جیسے دل میں اتر گئے اور اس کے پس منظر اور جیل کی زندگی کا تصور آیا تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر میں نے "پیر جنگ ہے جنگ آزادی" کا ترجمہ کرنا کی کوشش کی اور اس سے میرے دل میں ہندستان سے اور زیادہ محبت پیدا ہوئی۔ مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہوئی کہ آپ کا کلام سب چیک لوگ نہیں سن سکتے۔ اس لئے ہم پوری کوشش کریں گے کہ آپ کے کلام کا بہتر سے بہتر ترجمہ کر سکیں اور اس طرح آپ کی آواز چیک عوام تک پہنچا سکیں۔

امید ہے کہ آپ کو اتنی فرصت ملے گی میرے قلم کی کہانی لکھنے کے لئے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کر رہی ہوں۔ معاف کیجئے لیکن میرے خیال میں یہ کہانی سب لوگوں کو جاننا چاہیئے۔ لال سلام

ملینہ ہولیشاتوو

تمکین کاظمی

صفی اورنگ آبادی

ولادت: ۱۴ر فروری ۱۸۹۳ء ۲۶ر رجب ۱۳۱۰ھ اورنگ آباد
وفات: ۲۱ر مارچ ۱۹۵۴ء ۱۵ر رجب ۱۳۷۳ھ حیدرآباد

عمر: بہ حساب سنہ ہجری (۶۳) سال بہ حساب سنہ عیسوی (۶۱) سال

صفی کے والد حکیم منیر الدین اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور مطب کرتے تھے۔ صفی اورنگ آباد ہی میں پیدا ہوئے اور آٹھ سال کی عمر تک وہیں رہے۔ نویں سال حیدرآباد بھیجے گئے اور مدرسۂ نظامیہ میں شریک کرائے گئے جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔
مدرسہ نظامیہ بہت قدیم اصول پر قائم کیا گیا تھا اور اس میں درس نظامیہ دیا جاتا تھا۔ مدرسین تقریباً ملا ٹائپ کے اور ساتھی سب کے سب پرانی وضع اور تاریک خیال۔ اس ماحول میں صفی بھی تاریک خیال اور پست ہمت بن گئے۔ چونکہ فطرت میں پستی اور تنگ خیالی نہ تھی، یہ نظامیہ کی زندگی پسند نہ آئی اور جلد ہی اسے خیرباد کہہ دیا۔ طب چونکہ آبائی پیشہ تھا اس لئے اس کا مطالعہ شروع کیا اور عرصے تک طب لینا کے پیچھے پڑے رہے مگر جلد بازی نے اسے بھی ادھورا ہی رکھا۔
صفی نے اگر کسی بات میں کمال حاصل کیا تھا تو وہ خوشنویسی تھی۔ بڑے اچھے خطاط اور خوشنویس تھے۔ عام طور پر صفی کی جلد بازی نے انھیں ہر کام میں ادھورا رکھا مگر مجھے حیرت ہے کہ وہ خوشنویس کس طرح بن گئے تھے۔ خوشنویسی کے لئے میر آنہ ما مشق اور مسلسل قلم کی ضرورت ہوتی ہے اور صفی کا حال یہ تھا کہ ہر بات جلد ختم کر دینا چاہتے تھے۔ جلدی ان کی فطرت میں تھی۔ چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، پینا، بولنا، شعر کہنا ہر کام جلد از جلد کرنا چاہتے تھے اور کرتے تھے۔ سوچنا تو وہ جانتے ہی نہ تھے ایک سکنڈ میں بڑے سے بڑا خیال قائم اور ایک ہی سکنڈ میں بدل بھی جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ طبیعت کی جلد بازی انسان کو ہر معاملہ میں ناکام رکھتی ہے۔ چنانچہ یہی حال صفی کا تھا مستقل مزاجی مطلق نہ تھی، سوچ بچار کے عادی نہ تھے۔
بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ جب ذرا سمجھ آئی تو باقاعدہ شعر کہنے کی کوشش شروع کی۔ شاہ سراج الدین ظفر آخری فرمانروائے دہلی کے ولی عہد مرزا فخرو کے بیٹے مرزا رحیم الدین حیا شاگرد مومن و ذوق کے فرزند مرزا منیر الدین ضیاء دہلوی حیدرآباد میں تھے جو نہ صرف بڑے اچھے شاعر ہی تھے بلکہ عروض کے ماہر بھی تھے۔ صفی نے مرزا ضیار کی خدمت میں حاضری دینی شروع کی۔ ضیار نے عروض پڑھانا شروع کیا اور صفی نے عروض انھیں سے پڑھی مگر ضیار اور صفی کی طبیعت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ضیار ایک ایک شعر کے لئے ایک ایک ہفتہ صرف کرتے تھے اور صفی دس منٹ میں پچیس شعر کہتے تھے۔ اس اختلاف طبع کی وجہ سے نباہ نہ ہوا اور صفی نے مرزا ضیار کو چھوڑ کر ظہور دہلوی کو غزل بتانا شروع کیا۔ مگر ضیار جیسے محقق کے بعد ظہور تو نظروں میں کیا جچتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی غزلیں بتانے کے بعد ان کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔
فروغ حیدرآبادی کے بڑے اچھے شاعر اور استاد داغ کے خاص شاگردوں میں سے تھے صفی کی نظر ان پر پڑی۔

انھیں غزلیں دکھانے لگے۔ فروغ نہایت ہی محتاط اور بہت ہی سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک تھے اور صفی کا یہ حال تھا کہ "کھاتا اور بے دوڑتا" انھیں یہ بے راہ روی پسند نہ آتی تھی اس لئے فروغ سے بھی صفی مطمئن نہ ہو سکے۔

حیدر آباد میں صفی کی طبیعت کے ایک اور صرف ایک شاعر کیفی تھے جو صفی کی طرح لاابالی، غیر محتاط اور تیز اور جلد باز تھے۔ اس مرتبہ صفی نے کیفی کا انتخاب نہایت ہی موزوں کر لیا اور اس انتخاب سے بہت خوش بھی تھے تقریباً دو سال کیفی کی صحبت میں گزرے اور خوب گزرے۔ کیفی کا دیوان صفی صاف کرتے، غزلوں پر اصلاحیں صفی لکھتے، خطوط کے جواب صفی صاف کرتے۔ تاریخوں کے ادے صفی ہی لکھتے اس طرح صفی کام سے لگ گئے اور خوب گزرنے لگی مگر بدنصیبی سے دو سال پورے نہ ہونے پائے تھے کہ کیفی اجمیر شریف چلے گئے اور وہیں اللہ کے پیارے ہو گئے۔

کیفی کے بعد صفی نے کسی کی شاگردی کا خیال بھی نہیں کیا اور اپنے طور پر شعر کہتے رہے۔ دیوان صفی نے کیفی کی زندگی ہی میں مکمل کر لیا تھا بقیہ ردیفوں کی تکمیل بھی کر لی اور اپنے لاابالی پن کے لحاظ سے اس کا نام بھی "پراگندہ" رکھ دیا مگر یہ پراگندہ واقعی پراگندہ ثابت ہوا۔ تین دفعہ اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے، آخری مرتبہ عمر یافعی صاحب نے صفی کو اپنے دیوان خانے میں بند کر کے دیوان مرتب کرایا تھا جو مدتوں تک یافعی صاحب کے پاس رکھا رہا اور پھر صفی کے پاس آگیا اور مرتے وقت انھیں کے پاس تھا۔ خدا کرے مجھ ایسے کی کوشش کامیاب ہو اور "پراگندہ" چھپ جائے۔

صفی کی طبیعت میں روانی، چستی، جدت، تیزی سبھی کچھ تھی فقط فکر کی کمی اور خیال کی بلندی نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے جب کہ صفی سوچنے کے عادی نہ تھے اور غور و فکر کی کوشش ہی نہیں کرتے تھے۔ آپ پوچھیں گے جب تفکر و تخیل ہی نہ ہو تو شاعری کیا رہی؟ اس کا جواب میں تشفی بخش نہیں دے سکتا، یہ ایک مستقل بحث ہے کہ شعر کے لئے تفکر و تخیل ضروری ہے یا نہیں؟ اگر آپ شاعری کے لئے تفکر و تخیل کو لازمی قرار دیں تو اردو کے سینکڑوں اساتذہ معرض تنقید میں آ جائیں گے اور میر سے لے کر جلیل، سودا سے لے کر گل تک سب ہی کو اس کسوٹی پر پرکھنا پڑے گا اور اردو شاعری میں درد، مومن، غالب، فانی، جوش ہی رہ جائیں گے اس لئے اس بحث کو فی الحال یوں ہی رہنے دیجئے۔ بہرحال صفی شاعر تھے اور اچھے شاعر تھے۔ شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ دوسرے شاعر دنوں میں جتنے شعر کہہ سکتے ہیں صفی منٹوں میں اتنے شعر کہتے تھے۔ 6

حبیب کنتوری کی یادگار میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ کیفی کے انتقال کے دوسرے ہی سال یہ مشاعرہ ہوا۔ طرح تھی ع

ہے رونق بزم کی ذکر حبیب نکتہ پرور سے

صفی نے طرح میں سہ غزلہ کہا اور میرے سامنے کہا۔ ایک غزل کا مقطع تھا۔

صفی جب باپ اور استاد کا درجہ برابر ہے   مرے کیا حضرت کیفی کہ سایہ اٹھ گیا سر سے

یہی حال صفی کا آخر تک رہا۔ وہ ہمیشہ سہ غزلہ کہا کرتے تھے، صفی کا دیوان تقریباً پندرہ سال پہلے میں نے دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے دیوان دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پندرہ سولہ سال ہوئے کہ میرے ایک عنایت فرما نے جامعہ ملیہ دہلی سے شعرائے اردو کے سو شعر شائع کرنا شروع کئے اور مجھے بھی مجبور کیا کہ شعرائے دکن کے سو سو شعر کا سلسلہ شروع کروں چنانچہ میں نے ولی دکنی کے سو شعر اسی سلسلہ میں شائع کئے اور ولی سے صفی تک ہر دکنی شاعر کے سو شعر شائع کرنے کا ارادہ کر لیا اور اسی کی خاطر صفی کے سو شعر بھی ان کے دیوان سے انتخاب کر لئے۔ افسوس ہے کہ یہ انتخاب میرے عزیز دوست تسکین عابدی مرحوم نے اپنے تذکرہ سخنوران دکن کے لئے مجھ سے حاصل کر لیا مگر پھر واپس نہیں کیا ورنہ آج میرے پیش نظر ہوتا۔

صفی کے پراگندہ میں میرا اندازہ تھا کہ ڈھائی تین سو غزلیں ہوں گی جن کے اشعار کی تعداد چار ہزار ہوگی۔ یہ وہ غزلیں تھیں جو صفی کے نام سے شہرت پائیں اور جنھیں صفی اپنے دیوان میں شامل کر سکے ورنہ اس سے دوگنا حصہ صفی نے تقسیم کر دیا ہے اور

۱ صفی کے ایک شاگرد

صفی کی جگہ کاوی کا نتیجہ دوسروں کی شہرت اور نام آوری کا موجب ہوا ہے یہ افلاس اور تنگدستی کا تھا [illegible] صفی نے جگا اور بہت سے شعراء بھگت چکے ہیں اور آجکل بھی بعض شاعر اور فنکار بھگت رہے ہیں اور جب تک دنیا میں [illegible] بھگتتے رہیں گے شاعری کو عام لوگ منحوس خیال کرتے ہیں اور یہ سچ بھی منحوس اس لئے نہیں کہ شعر کہنے سے کوئی نحوست آسمان سے ٹپک پڑتی ہے بلکہ اس لئے کہ شاعری شاعر کو بیکار بنا دیتی ہے۔ وہ اپنا ایک خیالی دنیا الگ بنا لیتا ہے اور اس میں ایسا کھو جاتا ہے کہ اسے دنیا اور مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ اس میں عملیت باقی نہیں رہتی اور عمل کی دنیا کو بیچ کر تخیل کی دنیا میں بس جاتا ہے اس کے قوائے عمل یکسر معطل ہو جاتے ہیں اور اس میں ہمت و استقلال کارکردگی اور کارفرمائی مفقود ہو جاتی ہے۔ میں نے اس نقطۂ نظر سے اردو شعراء کا مطالعہ کیا ہے۔ سوائے داغ کے کوئی شاعر بھی مجھے ایسا نظر نہیں آیا، چاہے وہ غالب ہوں یا حسرت، اقبال ہوں یا جوش!

اس خصوصیت سے صفی بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ ان میں قوت عمل یکسر مفقود تھی، صرف "اللہ توکلی آدمی" تھے اور ایا تو فی بھی بلا سوچے سمجھے بات کرنے والے، ایسا شخص کیا کامیاب ہو سکتا ہے۔ چوبیس پچیس سال پہلے تک صفی کے والد حکیم منیر الدین زندہ تھے وہ بڑے اچھے طبیب انتہائی نیک مزاج اور مرنجان مرنج بزرگ تھے۔ مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل رہا ہے۔ خاصے علم اور کاسئہ مد آدمی تھے۔ ان کی زندگی تک صفی نہایت ہی اطمینان سے بسر کرتے رہے البتہ ان کے انتقال کے بعد آٹے دال کے چکر میں پھنس گئے۔ حکیم صاحب نے آخر عمر میں ایک عقد بھی کیا تھا اور شاید مرتے وقت صفی سے خواہش کی تھی کہ اپنی سوتیلی ماں کو ماں کر رکھیں۔ چنانچہ صفی نے والد کے انتقال کے بعد سے ان محترمہ کو اپنی حقیقی ماں سے زیادہ عزیز رکھا اور ان کی خدمت میں کوئی کمی نہیں کی مرنے تک ان کا ساتھ دیا، یہ صفی کی شرافت اور سعادتمندی تھی۔

ذکری کا صفی سے کیا ہوتی دو ایک دفتروں میں امیدواری کی مگر پابندی نہ ہو سکی اس لئے نوکری کے بجاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا، چند سال بڑی تکلیف میں گزرے۔ پھر قسمت نے معین الدولہ کے دربار میں پہنچا دیا اور معین الدولہ نے بھی صفی کا خیال رکھا۔۔۔۔۔ ماہانہ تنخواہ تو معین الدولہ نے مقرر نہیں کی مگر ہر ملاقات پر کچھ دینا شروع کیا اور درمیان میں بھی ملنے لگا۔ چنانچہ معین الدولہ کے مرتے تک صفی ایک حد تک مطمئن رہے مگر ان کے بعد پھر تکلیف شروع ہو گئی اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ بعض ملنے والے اور دوست اور شاگرد کچھ خدمت کر دیتے تھے جس پر ان کی گزر ہو رہی تھی مگر گزشتہ دو ایک سال سے عام کساد بازاری کی وجہ سے ان سلوک کرنے والوں کا حال بھی پتلا ہونے لگا تھا اور یہ لوگ بھی کچھ بدلتے جا رہے۔ ٨

کردار کے لحاظ سے صفی بہت اچھے تھے ان میں صرف ایک کمزوری یہ تھی کہ پیتے تھے۔ آخر آخر میں سنا ہے کہ سال تک نہایت اچھی زندگی بسر کی۔ پینا بالکل چھوڑ دیا تھا اور نماز کے پابند ہو گئے تھے۔

صفی کی ایک بات مجھے سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہ کہ ان میں منافقت بالکل نہ تھی۔ نہایت ہی سیدھے اور بڑے بے لاگ آدمی تھے۔ جو دل میں ہوتا زبان پر آ جاتا اور جو زبان سے ادا کرتے وہی دل میں رکھتے تھے۔ یوں تو انھیں محبت تھی وہ کسی سے بھی نفرت نہیں رکھتے تھے مگر اپنے استاد بھائیوں میں سے چند خاص لوگوں کے ساتھ زیادہ محبت تھی اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر عزیز یار جنگ صاحب سے میری ملاقات ترک ہو گئی تھی صرف ملنا جلنا ہی رکاوٹ تھی اور کوئی بات نہ تھی نہ تو وہ میری برائی کرتے اور نہ میں ان کی۔ [illegible] جب صفی کو ہوا تو وہ بے [illegible] ایک روز شام کے وقت شمس الاسلام پریس پر میں بیٹھا ہوا تھا کہ صفی آ گئے [illegible] صاحب موجود تھے، ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں کسی نے عزیز یار جنگ صاحب کا نام لیا اور صفی یکایک [illegible] ہم تین چار بدنصیب جنھیں اپنی دوستی اور بھائی چارے پر ناز ہے پھر ہم [illegible] کوئی بات [illegible]

ہو گئی ہو تو بھول جاؤ اور میری خاطر تم دونوں مل لو" صفی نے جس خلوص اور محبت سے یہ الفاظ ادا کئے میں بھول نہیں سکتا' ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں کا پتی ہوئی آواز ' بھرّایا ہوا لہجہ۔ اب تک میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ میں نے اسی وقت صفی سے کہدیا کہ بھائی! کوئی اہم بات ہی نہیں بعض لوگوں کے غلط سلط باور کرانے سے ہم دونوں میں رکاوٹ تھی جو آج ختم ہو گئی۔ چنانچہ دوسرے ہی روز سے ہم دونوں ایک دوسرے سے صاف تھے اور صفی اس غلط فہمی اور رکاوٹ کو دور کرا کر مسرور۔

سکندر آباد میں اپنے چھوٹے بھائی کے لئے میں نے ایک بک ڈپو ادارۂ علمیہ کے نام سے قائم کر دیا تھا اور انھیں کاروبار سے واقف کرانے کے لئے ان کے ساتھ ادارے پر بیٹھا کرتا تھا۔ شام کے وقت بہت سے احباب جمع ہو جاتے اور خاصی دلچسپی رہتی تھی۔ کبھی کبھی صفی بھی آجاتے اور اگر وفاقاتی انھیں کسی نہ کسی بحث میں الجھا لیتے۔ ایک روز سرِ مغرب صفی آئے اور سب کے سامنے کہنے لگے "کچھ پلاؤ" میں نے کہا "فرمایئے کیا منگواؤں! چائے، شربت، آئسکریم!" تو کہا "نہیں یہ نہیں شراب پلاؤ!" صفی کو معلوم تھا کہ میں نہیں پیتا' اس لئے کبھی انھوں نے مجھ سے پلانے کی خواہش بھی نہیں کی تھی۔ اس روز نہ جانے کیا سوجھی کہ اس طرح سب کے سامنے خواہش کی۔ اور ادارے پر منگوا کر پلانا مجھے پسند نہ تھا میں نے کہا "فرمایئے کتنے روپے دوں۔ آپ جا کر شغل فرمایئے"۔ کہنے لگے "نہیں میں تنہا جا کر نہیں پیوں گا تم سب ساتھ چلو جس کا جی چاہے پئے جا ہے نہ پئے مگر میرے ساتھ سب رہیں" تقریباً دس حضرات اس وقت موجود تھے میں نے سبھوں سے خواہش کی کہ چلئے ہم لوگ بھی چلیں، صفی اپنے پسند کی چیز پئیں گے ہم اپنے پسند کی چیزیں پا لیں گے' دو تین حضرات نے وہیں معافی مانگ لی۔ میرے اور صفی کے علاوہ چار حضرات چلے راستے میں ایک صاحب کھسک گئے اور ہم پانچ آدمی دیکا جی پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ایک صاحب نے صفی کے ساتھ پینے پر آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ ان دونوں کے لئے شراب آئی اور ہم لوگ ان کے ساتھ گزک کھاتے اور کافی پیتے رہے۔ ابلے ہوئے انڈے صفی کو بہت پسند تھے۔ سنا ہے کہ وہ سینڈھی کے ساتھ بھی ابلے ہوئے انڈے بطور گزک کھایا کرتے تھے۔ خیر اس روز صفی نے صرف دو پگ پئے اور دوسرے پگ میں بہکنے لگے' ان کے ساتھی جنھیں ہم بہت پارسا سمجھا کرتے تھے چار پگ اڑا گئے مگر جیسے کے تیں رہے۔ میرے مجبور کرنے پر بھی صفی نے تیسرا پگ نہیں پیا۔ یہ تھی ان کی شراب نوشی۔ راجہ شیو راج ...... کا یہی تھوڑا نشہ انھیں بہت پسند تھی۔ ایک روز صفی سے باتیں کرتا ہوا میں چار مینار کے پاس کے ایک ... ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا کہ راجہ ہربنس چند اپنے مکان پر موٹر سے اترے اور میں نے سلام کیا تو مجھے بلا لیا اور باتیں کرتے ہوئے دیر تک دروازے پر کھڑے رہے۔ مجھے راجہ سے بے تکلف گفتگو کرتے دیکھا تو صفی کو شراب یاد آگئی۔ ایک پرچے پر "پھول" لکھ کر ہوٹل کے لڑکے کے ہاتھ سے میرے پاس بھجوا دیا۔ اس نے پیچھے سے پرچہ مجھے دیا اور میں نے دیکھ کر راجہ کو دکھا دیا' راجہ ہربنس چند بڑے نکتہ رس تھے سمجھ گئے اور کہنے لگے "جنگل سوتیا کی پہنچ رہا ہے۔ ایک دو شیشے ہوں گے منگوا دیتا ہوں چنانچہ وہیں کھڑے کھڑے ایک شیشہ منگوا دیا جسے میں نے دستی میں لپیٹ کر صفی کے حوالے کر دیا .... مشیرہ میں تالاب ..... کے سامنے میں نے گھر لیا تو شام کے وقت صفی میرے گھر پر سے جاتے نظر آتے تھے۔ ایک روز میں نے آواز دی اور انھیں بتایا کہ میں اس گھر میں آگیا ہوں تو دوسرے روز سے انھوں نے راستہ ہی بدل دیا۔ کبھی کبھی میرے گھر کے سامنے سے جاتے مگر واپس اس راستے سے نہ ہوتے تھے کیونکہ مجھے ان کے سینڈھی پینے سے اتفاق نہ تھا اور خصوصاً سینڈھی کا تو میں سخت مخالف تھا اسی لئے وہ میری آنکھ بچا کر جایا کرتے تھے۔ عمر میں مجھ سے دس سال بڑے تھے اور میں ان کا بہت احترام کرتا تھا مگر باوجود اس کے وہ میرا اتنا لحاظ کرتے تھے۔

اللہ غریقِ رحمت کرے ... کو انھوں نے مکہ مسجد کے قریب ..... ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کی دوکان لگائی تھی۔ میرے اور صفی کے بڑے پرانے دوست تھے۔ صفی اکثر ان کی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز میں سامنے سے گزر رہا تھا اور صفی دو چار آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ان کی دوکان میں ... باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سلام کیا تو مجھے روک لیا۔ کہنے لگے غالب کا ایک نیا شعر سنتے جاؤ۔ میں حیران کہ غالب کا نیا شعر ... سائیکل سے اتر پڑا اور دوکان پر پہنچا تو آپ نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ نے غالب کا ایک نیا شعر ... میں نے بڑی حیرانی سے شعر سننے کی خواہش کی تو ان صاحب نے سنایا۔

سید رشی

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے   سایہ شاخِ گلِ افعی نظر آتا ہے مجھے

سودا کے شعر کو "غلت ربود" کرنے والے سے یہ "شاخِ گلِ افعی" کہنے والے بڑھ گئے۔ ظالم نے غضب ہی کر دیا۔ صفی نے پوچھا جانتے ہو شاخ گلِ افعی کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا نہیں، میں کیا جانوں ایک نئی چیز انھوں نے پیدا کی ہے۔ ان صاحب کو مخاطب کر کے شاخِ گلِ افعی کے معنی صفی نے اس طرح سے سمجھائے کہ سب لوٹ گئے اور وہ صاحب ایسے بھاگے کہ پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔

ایک روز چند بے تکلف دوست راستے سے جا رہے تھے۔ صفی بھی مل گئے تو انھوں نے مجبور کر کے ساتھ بلا لیا اور ایک ہوٹل میں پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ایک صاحب نے ہر شخص سے پوچھا آپ کیا کھائیں گے؟ ایک نے کہا مرغ! دوسرے نے کہا دودھ! تیسرے نے چائے کی خواہش ظاہر کی۔ صفی نے مرغ مانگنے والے کی طرف دیکھ کر کہا آپ، ہمارے ہی خاندان سے ہیں اور دودھ مانگنے والے سے مخاطب ہو کر کہا آپ ناگ، سانپ کی اولاد ہیں۔

مولینا محمد علی کی طرح صفی میں بھی یہ عادت تھی کہ جو فقرہ ذہن میں آتا کہہ جاتے اور ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی فقرہ ان کے منہ سے نکل جاتا جو عموماً برمحل ہوتا، اسی طرح کوئی ان پر فقرہ چست کر دیتا تو خود بھی مزا لیتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ صفی نے دو دہلوی استادوں کی شاگردی کی یعنی ضیا اور ظہور کی۔ اور دو دہلی اسکول کے استادوں سے آخر میں اصلاح لی یعنی فروغ اور کیفی سے۔ اس طرح چار دلی کے اساتذہ کا شاگرد ہونے کے باوجود صفی پر لکھنؤ کا رنگ غالب رہا اور وہ رعایت لفظی اور معاملہ بندی ہی زیادہ کرتے رہے۔

خدا کی قسم کھا کے وہ ہنس پڑے   خدا کی قسم ہے مزا آگیا

آتے ہیں منہ پہ ڈوبتا تا ان کے   شربت دیدار دیں گے یہاں کے

مرے آنسوؤں نے جلایا عدو کو   تماشا ہے پانی میں چنگاریاں ہیں ۱۰

یہ تکیہ اور یہ بستر ٹھاٹھ ہیں سب اہل دنیا کے   جنھیں اس پہ ہے تکیہ ان کو تکیہ ہے نہ بستر ہے

صیاد بھی تو خوش نہیں مجھ بدنصیب سے   اتنے ہزار عیب ہیں جتنے ہزار پر

اس رعایت لفظی کی وجہ سے بعض شعر چیستاں بن جاتے تھے، مثلاً

جہاں اس کی اماں ہو لاکھ دشمن ہوں تو کیا پروا   وہاں جالے کو مکڑی اور انڈوں کو کبوتر ہے

مصرع ثانی واقعۂ ہجرت کی تصویر ہے مگر پہلے مصرع میں اس کا کوئی ذکر نہیں اس لئے شعر تشریح طلب ہو جاتا ہے۔

وہ دور اور دور کی اپنی نظر خراب   اے طالبان دید رہے عمر بھر خراب

اسی مضمون کا ایک شعر کیفی کا بھی ہے۔

تیرا چہرہ برابر دور سے دیکھا نہیں جاتا   جھجکتا کیوں ہے؟ آ نزدیک آ! یوں کھا نہیں جاتا

دل لگی عاشقی نہیں ہوتی   عاشقی دل لگی نہیں ہوتی

عاشق ہے تو چناں چنیں کیوں   مرتا ہے تو اگر مگر کیا

گریۂ اشک سے یاں رخصت بینائی ہے   اور وہ پوچھتے ہیں آنکھ تری آئی ہے

صفی عام طور پر محاورہ اور زبان کے پابند نہ تھے۔ انھیں نہ تو لکھنؤ کی زبان پسند تھی نہ دلی کی۔ اپنی زبان ہی الگ کر لی تھی اور جو جی چاہتا کہتے۔ ... دینا یا ظاہر کرنا محاورہ ہے مگر وہ ایسا لگا کہہ دیتے ہیں۔

تجھے یہ تماشہ ... صفی بدنام کرے گا   ... ہائیں ... ترے اشعار پر کیا کیا

"کانوں کان خبر نہ ہونا" کو "کانوں کانوں" باندھ دیتے ہیں۔

سید رس...

آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اس نے　　کانوں کانوں مجھے خبر نہ ہوئی

"یاد آنا" "یاد کرنا" محاورہ ہے مگر صفیؔ "یاد رہنا" باندھ دیتے ہیں۔

وہ کونسا صدمہ ہے جو ہم پہ نہیں ہوتا　　لیکن نہیں ہوتا انھیں یاد نہیں ہوتا

ایسی بے اعتدالیاں صفیؔ نے بہت کی ہیں اور یہ ان کے استاد کیفیؔ سے انھیں ورثے میں ملی تھیں کیونکہ اس میدان میں کیفیؔ سب پر سبقت لے گئے تھے۔

الفاظ کا الٹ پھیر ان سے کھیلنا یا الفاظ کا تکرار صفیؔ کو بہت پسند تھی، مثلاً

کاٹنے کاٹنے میں عمر کٹی جاتی ہے　　کبھی کچھ کاٹ کر لکھے کبھی لکھ کر کاٹے

نظر کیا وہ نظر حد جس نظر کی آسماں ٹھیرے　　نظر تو وہ نظر جو آسماں کے پار ہو جائے

مگر ان بے اعتدالیوں اور بے پروائیوں کے باوجود صفیؔ کے شعر جاندار ہوتے ہیں چند آپ بھی سن لیجئے۔

ادا پیدا نظر سے شان رخ سے آن تیور سے　　ترے قربان آخر دل ہے کس کس کے لئے ترسے

قیامت آئی یا اس فتنہ قامت کو شباب آیا　　جفا آئی، غرور آیا، ادا آئی، حجاب آیا

نہ اس کی دوستی کچھ ہے نہ اس کی دشمنی کچھ ہے　　کبھی تولہ کبھی ماشہ، کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

حسن والوں میں تو ہر اک نے خدائی کی ہے　　نہیں معلوم کس اللہ کا بندہ ہوں میں

جب وہ گرم عتاب ہوتا ہے　　چہرہ اور آفتاب ہوتا ہے

ہماتڑ کا الٰہی ذرہ ذرہ دہر کا جاگا　　مری سوئی ہوئی تقدیر بھی بیدار ہو جائے

یہ چند شعر میں نے سنائے ہیں۔ اپنے شعروں سے صفیؔ کا دیوان بھرا ہوا ہے اور ان پراگندہ اوراق میں ایسے شاہکار بھی ہیں۔ 11

معشوق کو بدنام بھی کرنا نہیں آتا　　لوگوں کو برا کام بھی کرنا نہیں آتا

کیسی کیسی خواہشیں جینے میں ہیں　　سینکڑوں بچھو مرے سینے میں ہیں

عاشقی میں ہم بڑھتے بڑھتے سودا ہو گیا　　قطرہ قطرہ جمع ہوتے ہوتے دریا ہو گیا

پروانہ نیا جلے گا محبت کی آگ میں　　اک جانور غریب لباس اس کی چار پر

ہم ان کے سامنے مجبور ہو کے رو دیئے　　اگر زبان سے اک حرف بھی ادا نہ ہوا

صفیؔ کی طرح حیدرآباد کا ایک بدنصیب شاعر سرمدؔ بھی تھا جو عین جوانی میں داغ مفارقت دے گیا۔ صفیؔ کے اس شعر کے ساتھ سرمدؔ کا یہ شعر بھی سنئے۔

ہمارا کام ہے سراپا التجا ہونا　　زباں سے حرف تمنا ادا ہوا نہ ہوا

اپنی بے اصولی زندگی اور بے عملی کا احساس صفیؔ کو تھا جس کا اظہار انھوں نے اکثر غزلوں میں کیا ہے۔

نہ پابندی سلیقہ کی نہ آزادی قرینے کی　　ضرورت کچھ نہیں معلوم ہوتی اپنے جینے کی

ہم اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں ساقی　　بھکاری بھیک میں ڈھونڈیں مزا کیا

ہوا ہوں جب سے مفلس اپنے آنسو آپ پیتا ہوں　　کروں کیا اے صفیؔ عادت بری ہوتی ہے پینے کی

چنانچہ اپنی اس زندگی پر دوستوں کے طعنے سن کر صفیؔ بگڑ بھی جاتے تھے۔

صفیؔ ان دوستوں سے کیا کہوں میں جو یہ کہتے ہیں　　کہ تیری زندگی کچھ اور تیری شاعری کچھ ہے

اس طعن و طنز کی وجہ سے احباب سے خفا بھی ہو جاتے ہیں اور انھیں باتوں باتوں میں کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

مجھے احباب سے کیا کام سننے کا یقیں ہوتا — یہ باتوں ہی ان کے ہاتھوں سے کچھ بھی نہیں ہوتا

اس پر بھی دوستوں کی چیخ پکار کم نہیں ہوتی تو بگڑ کر کہتے ہیں۔

ناروا ناحق یہ ٹنڈی دل مرا سر کھا گیا — دل گیا میرا تو اس میں دوستوں کا کیا گیا

صفی انیسویں صدی کی پیداوار ہونے کی وجہ سے پوری قدیم روایات کے پابند تھے۔ چنانچہ قناعت، وضع داری اور سیر چشمی ان میں بے انتہا تھی اس لئے امیروں کی دربار داری اور قصیدہ گوئی ان سے نہ ہو سکی۔ سوائے دو ایک امیروں کے جن سے انھیں خلوص تھا کسی کے پاس وہ نہیں گئے چنانچہ ان کا عمل خود اپنے اس شعر پر تھا۔

آبرو کھو کر کریں کیوں اہلِ دولت سے ملے — پاؤ ٹکڑا لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

یہ وضع داری ملنے جلنے دوستی محبت میں بھی قائم تھی۔

ہم سے تو اس کے واسطے بھی بد دعا نہ ہو — دشمن برا ہی کیوں نہ ہو مگر اس کا برا نہ ہو

خاکساروں سے خاکساری تھی — سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

ملنے کو کھنچ کے ملتے عدو سے بھی ہم مگر — اخلاق سے بعید مروت سے دور تھا

اسی مضمون کی ایک رباعی بھی سن لیجئے

اقرار محبت بھی اسی منہ سے کرے! — اظہار محبت بھی اسی منہ سے کرے

اس منہ سے صفی نے جس کی کی ہے تعریف — پھر اس کی شکایت بھی اسی منہ سے کرے

"خوش گزرانی" کے گر سے صفی اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لئے وہ مقبول عوام رہے اور پڑھنے والا ان سے خوش رہا۔ اس خصوص میں ان کا ایک مسلک تھا جس کو انھوں نے اس رباعی میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ۱۲

لوگوں سے ہر ایک ڈھب سے مل جل کے رہو — اب تک نہ رہے تو اب سے مل جل کے رہو

دنیا میں اگرچہ نیک و بد سب ہیں صفی — رہنا ہو یہاں تو سب سے مل جل کے رہو

صفی کو اس کا احساس تھا کہ "اشتہ ما دا ایم ما را اکثرش در کار نیست"

چنانچہ انھوں نے اپنی ضروریات زندگی کو بہت ہی محدود رکھا تھا۔

خاموشی میں زباں کی راحت ہے — عصیاں سے بچو تو جاں کی راحت ہے

قلت اسباب کی ہے راحت دل کی — دل کی راحت جہاں کی راحت ہے

صفی غزل اور صرف غزل کے شاعر تھے اور وہ غزل کو صحیح مفہوم میں استعمال کرتے تھے ان کی ساری غزل معشوق سے مخاطبت اور چھیڑ چھاڑ سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔ چند غزلوں کے شعر سن لیجئے۔

تم ہم جو مل کے بیٹھیں تو اٹھتی ہیں انگلیاں — کیا مل کے بیٹھتے نہیں دنیا میں چار لوگ

او غریبوں سے خفا ہو کے بگڑنے والے — کہہ دیا کس نے تجھے ہم چاہنے والوں میں

اب تمہاری دوستی کو دونوں ہاتھوں سے سلام — جو ہوا اچھا ہوا جو کچھ کیا اچھا کیا

تیرا خیال کیا ادھر آیا ادھر گیا — گویا ہوا کے گھوڑے پہ کوئی سوار تھا

خیال بھی دل بیمار کا ذرا نہ ہوا — خوش آمدید کہاں تھے بہت زمانہ ہوا

مضمون لمبا ہوتا جا رہا ہے اب آپ صفی کی چند غزلیں سن کر اسے ختم کر دیجئے۔

یہ ہے مری آہ کا اثر کیا؟ — سب دیکھتے ہیں ادھر ادھر کیا؟

بس

سمجھاؤ نہ مجھ کو ہم نشینو
اے بے خبرو تمہیں خبر کیا؟
جو کچھ گزری کہیں گے سب سے
جب منہ میں زبان ہے تو ڈر کیا؟
رہتا نہیں ایک سا زمانہ
اب بھی ملتے ہیں وہ مگر کیا؟
پھر دن نکلا کہ گھر سے نکلے
ہم سوچ رہے تھے رات بھر کیا؟

دل جو دیا دل کے لئے غم دیا
زخم دیا زخم کو مرہم دیا
جانتے ہیں وہ کہ میں آزاد ہوں
پھر مجھے جو کچھ بھی دیا کم دیا
آپ نے بخشا دل سوزاں مجھے
یا کسی کا ذکر کہ جہنم دیا
عشق میں بشاش بہت کم رہے
مے نے ہمیں کیف بہت کم دیا
شکر ہے دل اس نے دیا لے صفی
اور نہایت خوش و خرم دیا

محبت کا اگر قائم کوئی معیار ہو جائے
محبت کرنے والا زندگی دشوار ہو جائے
ستانا اور ایسی بے لحاظی کا ستانا کیا
کہ ہر مجبور تم سے روٹھ کر ناخوش ہو جائے
بہار باغ دنیا دیکھئے والو روش بدلو
نہ ہو ایسا کہ ہر کانٹا گلے کا ہار ہو جائے
ہوا حشر کا ابلی ذرہ ذرہ دہر کا جاگا
مری سوئی ہوئی تقدیر بھی بیدار ہو جائے

۱۳

یہ تھی صفی کی مختصر زندگی اور شاعری۔ صفی نے اپنی عمر کے (۵۵) سال حیدرآباد میں گزارے۔ (۴۰) سال سے زیادہ عرصہ تک مشق سخن ری رکھی اور ہزاروں غزلیں کہیں مگر فاقہ کشی میں مبتلا رہے۔ کھانے کو ملا تو کپڑوں کو، کپڑے ملے تو کھانے کو ترستے رہے۔ شراب ناب کے لے خون دل اور روٹی کے بدلے غم روزگار کھاتے رہے دمہ ہو گیا تھا۔ علاج کی سہولتیں نہ تھیں اسی میں مبتلا رہے اور اسی سے مرے جانتے تھے کہ ان کی زندگی میں ان کی قدر نہ ہوگی، چنانچہ (۴۰) سال پہلے انھوں نے کہہ دیا تھا۔

صفی بھی کس قدر ناداں ہے شاعر ہوا تو کیا
اسے لوگوں سے جیتے جی امید قدر دانی ہے

دیکھئے غریب صفی کا اندیشہ آج پورا ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد ہم اس کی قدر کر رہے ہیں۔ کاش اس کی زندگی میں ہم اس کی کوئی مدد کر سکتے۔ یہاں ہے دنیا مردہ پرست ہے۔

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا
بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے
صفی اورنگ آبادی

سید مس

تحسین سروری

اُردو کی قلمی کتابیں

کتب خانۂ آصفیہ میں

مدت سے اردو مخطوطات کی ایک مکمل فہرست کی کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اس لئے کہ ہمارا بیشتر علمی و ادبی سرمایہ ہنوز قلمی کتابوں ہی میں بند ہے۔ اب تک اردو کی غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد کا بھی کوئی تعین نہ ہو سکا۔ شکر ہے کہ حیدرآباد میں اس اہم کام کا آغاز مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے کر دیا ہے۔ موصوف نے سب سے پہلے کتب خانۂ آصفیہ کی تمام اردو کتابوں کی ایک مکمل اور وضاحتی فہرست تیار کی اور اب کتب خانۂ سالار جنگ کی فہرست تیار کر رہے ہیں۔ اس دوران میں اردو کی مختلف قلمی تصانیف پر ان کے جو مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب نہایت تحقیق اور کاوش سے کام لے کر ان فہرستوں کو کارآمد اور معلومات آفریں بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی موصوف ـــــ نے اپنے کسی مضمون میں یہ اطلاع دی تھی کہ اسی طرح وہ حیدرآباد کے تمام کتب خانوں کی فہرستیں تیار کریں گے۔ اگر یہ کام جاری رہے تو خاص کر اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب کا اسی قسم کا ایک مضمون "کتب خانۂ آصفیہ کی اردو کی قلمی کتابیں" کے عنوان سے ماہنامہ معاصر بابتہ اپریل ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے جو دلچسپ اور معلومات آفریں ہونے کے علاوہ کتب خانۂ آصفیہ کی اہمیت کو بھی واضح کرتا ہے۔ نیز ڈاکٹر صاحب نے اس کتب خانے کی مختصر سی تاریخ اور مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی صحیح تعداد اور ان کی قدر و قیمت بھی بتا دی ہے اور آگے چل کر موصوف نے کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی اہمیت پر مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانۂ آصفیہ کی (۱۱۱۰) اردو کی قلمی کتابوں میں کس فن پر کتنی کتابیں ہیں۔

راحت اللہ صاحب نے اپنے مضمون میں (۳۰) ایسی قلمی کتابوں کے نام درج کئے ہیں جو نایاب ہیں لیکن ان کے دوسرے نسخے دیگر کتب خانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مزید (۳۰) کتابوں کے نام درج کئے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ "ان نادر و نایاب قلمی نسخوں کا واحد نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ کسی اور جگہ ان نوادر کا دوسرا نسخہ موجود نہیں"۔ ان کتابوں میں ہو سکتا ہے کہ واقعی بعض کے دوسرے نسخے دوسری جگہ موجود نہ ہوں لیکن ان میں بیشتر موضوع یا مصنف کی شخصیت کے اعتبار سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ البتہ دیوان نوائی، حسن و اختلاط، تاریخ اقتداریہ، مثنوی شادی، مخزن اسرار سلطانی، ترجمہ تاریخ فیروز شاہی، جواہر اسرار اللہ بڑی اہم کتابیں ہیں اور ان کے دوسرے نسخے کسی اور جگہ ہونے کا اب تک کسی نے حوالہ نہیں دیا۔

ان نسخوں میں دیوان چندا، مثنوی گلزار اعظم، عروس مضمون اور دیوان قیس کو بھی ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب نے نایاب نسخوں میں شمار کیا ہے۔ میں اس مضمون میں انہیں نسخوں کے متعلق کچھ تحریر کروں گا۔

دیوان چندا اس میں شک نہیں اس لحاظ سے قابل قدر چیز ہے کہ یہ اردو کی اولین صاحب دیوان شاعرہ کا دیوان ہے لیکن اس کا واحد نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہونے کا جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ اس دیوان کے چند اور نسخے بھی بعض کتب خانوں میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں بھی موجود ہے جس پر سید نصیر الدین خاں قدرت

کا دیباچہ ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۱۳ھ میں مرتب ہوا تھا۔ (یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۵۵۴)

مثنوی گلزار الملوک کی بحیثیت قلمی کتاب ہونے کے حیثیت یوں گر جاتی ہے کہ خود میری نظر سے اس کا ایک مطبوعہ نسخہ گزر چکا ہے جو ۱۲۶۲ھ میں بمقام بنگلور سنگی طبع ہوا تھا۔

کوئی قلمی کتاب اسی وقت نایاب و نادر کہی جا سکتی ہے جبکہ اس کا کوئی نسخہ کسی اور کتب خانے میں نہ ہو اور وہ کبھی طبع نہ ہوئی ہو۔ یہ جانے بغیر کسی کتاب کے نایاب و نادر ہونے کا دعوی کرنا تلاش و تحقیق کو شرمندہ کرنا ہے۔ اس اعتبار سے "عروس مضمون" بھی نادر و نایاب نسخہ ہرگز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اردو کی مشہور شاعرہ شمس النساء بیگم مترنم کا دیوان ہے جس کا دوسرا نام "دیوان مترنم" ہے۔ "عروس مضمون" اس کا تاریخی نام ہے جس سے (۱۲۷۲) کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر (۸۰) صفحات پر مشتمل جو نسخہ ہے وہ نامی پریس لکھنؤ کا مطبوعہ ہے جو دوسری بار ماہ ستمبر ۱۹۰۸ء میں چھپا تھا۔ خاتمہ پہ قمر النساء بیگم حجاب کی تقریظ بھی شامل ہے مترنم کے حالات شاعرات اردو کے تمام تذکروں میں موجود ہیں۔

دیوان قیس حیدرآباد کے ایک بہترین اور پر گو شاعر کا دیوان ہونے کی وجہ سے خاص نسخہ ہے۔ لیکن یہ دعوی کرنا کہ اس کا کوئی اور نسخہ کسی اور جگہ موجود نہیں صحیح نہیں۔ ...... مجھے علم ہے کہ حیدرآباد میں مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانے میں اس کا ایک عمدہ نسخہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ خود میری نظر سے دو نہایت اچھے نسخے گزر چکے ہیں۔ ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) میں ہے اور ایک نسخہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے ذاتی کتب خانے میں میں نے دیکھا ہے۔ میں نے ان میں سے ایک نسخے سے چند شعر بھی نقل کر لئے تھے اور چاہتا تھا کہ قیس حیدرآبادی پر کوئی مضمون لکھوں لیکن اب تک اس کا موقع نہ آیا۔ اس وقت اگر چند شعر پیش کر دیئے جائیں تو میرے خیال میں نامناسب نہ ہوگا۔ قیس کے مختصر حالات یہ ہیں کہ :-

نام محمد صدیق تخلص قیس تھا۔ خاص حیدرآباد کے باشندے تھے۔ ان کے بزرگ دربار میں وقائع نگاری اور اخبار گری کی خدمت پر مامور تھے۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر استاذ الشعراء شیر محمد خاں ایمان قیس کے خالو تھے۔ قیس کو انھیں سے تلمذ تھا۔ خواجہ میر درد اور میر تقی میر کی پیروی کرتے تھے۔ فارسی و عربی کی کافی استعداد تھی۔ موروثی فن وقائع نگاری و تاریخ دانی میں کمال پیدا کیا تھا۔ اس خدمت کے علاوہ جناب بہادر چندو لال اور نواب شمس الامراء نے دو دو قدر روپے یومیہ مقرر کیا تھا۔ ان کا ۱۲۳۳ھ میں انتقال ہوا۔ (محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن ص ۹۴۲)

عبدالجبار خاں آصفی نے تذکرہ شعرائے دکن میں لکھا ہے کہ قیس نے اپنے دیوان کا نام "پیش کار" رکھا تھا۔ یہ بات کچھ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ میں نے انجمن ترقی اردو کا جو نسخہ دیکھا ہے اس میں پہلے صفحہ کی لوح پر یہ عبارت درج ہے۔

"پیشکار محمد صدیق ساکن حیدرآباد"

اس سے یہی مطلب لیا جا سکتا ہے کہ "پیشکار" قیس کے دیوان کا نہیں بلکہ ان کی کسی خدمت کا نام ہے۔ آصفی کی نظر سے دیوان قیس کا جو نسخہ گزرا تھا اس میں لفظ "پیش" ممکن ہے پہلی سطر میں ہو اور دوسری سطر میں قیس کا نام جس کی وجہ سے انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ دیوان کا نام "پیشکار" ہے ـــ بہرحال اس بحث کا یہ موقع نہیں۔ اب قیس کے چند شعر پیش کر کے یہ مضمون کو ختم کرتا ہوں ؎

آئینے پہ جبکہ وہ سایۂ گلن کا ثگن ہوا ۔۔۔ جوہر آئینہ سارا تختۂ سنبل ہوا

دل کو وحشت ہو گئی پھر بات سے ۔۔۔ بیٹھے بیٹھے یک بیک کیا ہو گیا
اور دیوانے بھی گزرے عشق کے ۔۔۔ قیس اپنے فن میں یکتا ہو گیا

آج کیا جی میں آگیا اس کے ۔۔۔ ہم سے مجلس میں ہم کلام ہوا
شکلیں بزم میں دیکھ رہا ہوں میں پیاسے کی ۔۔۔ یاد آ جاتی ہیں آنکھیں کسی دلبر والے کی

فلک نے ہاتھ جتا گلستاں نے آستیں پڑی ۔۔۔ نہ اٹھے اس کے در سے ہم نے بھی ایسی زمیں پکڑی

سب رس

رہے یہ داغ دل جب تک کہ جی ہے — اسی کے دم سے گھر کی روشنی ہے

محبت اے دل تجھے اس سے گلا ہو — کہ اس نے کی کسی سے کب دغا ہے

مجھے جو دیکھ کر ہنستے ہیں گل رو — شگوفہ کیا کوئی تازہ کھلا ہے

ہمارے دل پہ جو داغ الم ہے — چراغ دیر ہے شمع حرم ہے

بال کھولے ہوئے پھرتے تو ہو مستانے سے — راہ میں بھینٹ نہ ہووے کسی دیوانے سے

سر بزم شیخ کیوں خاموش ہو تم — زباں رکھتے ہو کچھ منہ سے کہو تم

نہ ملک و مال نہ جاہ و سپاہ رکھتے ہیں — دل ایک رکھتے ہیں سو بھی تباہ رکھتے ہیں

یوں داغ چاک سینہ کے بیچ درمیاں ہیں — گویا ہے روشنی کو کنول تابدان میں

داغ جو میرے ہاتھ پہ رکھے ہیں — انھیں ہاتھوں کے سب یہ چرکے ہیں

ہم تو اس بت کی آشنائی میں — مفت رسوا ہوئے خدائی میں

آنکھیں اس کی ہیں اس قرینے کی — پیالیاں ہیں شراب پینے کی

نہ ہم تھے آکے دن کو نہ تم رات کو — بھلا تم سے ملئے تو کس بات کو

دیکھا نہیں ہے اس نے دل داغدار کو — اس واسطے گھمنڈ بڑا ہے بہار کو

مطبوعات انجمن ترقی اردو

ادبی اور قومی تذکرے

پنڈت کشن پرشاد صاحب کول کے چودہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ پنڈت جی پختہ کار ادیب کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اس کتاب میں پنڈت جی نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کا خلوص شامل ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پنڈت جی کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں ملی جلی تہذیب کا سنگم تھا اور اتحاد و اتفاق کی بہاریں تھیں۔

اس کتاب پر ملک کے تمام اخبارات اور رسائل نے تبصرہ کیا ہے اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ریویو کیا ہے اور کہا ہے کہ پنڈت جی نے ادبی اور تہذیبی مسائل پر پورے غور و فکر کے بعد قلم اٹھایا ہے اور اسلوب کی دل کشی نے ان مسائل میں زندگی کی گرمی اور حرکت پیدا کر دی ہے۔

قیمت: چھ روپے آٹھ آنے

انجمن ترقی اردو۔ علیگڈھ

سب رس

تاریخ زندگی پر ایک نظر

مہدی علی

زندگی کی ابتدا آج سے شاید ایک یا ڈیڑھ ارب سال پہلے ہوئی تھی۔ کن حالات، کس ماحول اور کن اسباب کے تحت حیات وجود میں آئی ٹھیک ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ حیرت کا مقام ہے کہ اس عرصہ کے بعد آج بھی زندگی کے ایسے نمونے پائے جاتے ہیں جو سادہ ترین حیوان سے سادہ اور کمترین پودوں سے کمتر ہیں۔ ان سے اوپر کے حیوانوں کو (Protozoa) کہتے ہیں جس کا مطلب ابتدائی جاندار ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور امیبا (Amoeba) ہے۔ اس کی نہ تو معین شکل ہوتی ہے اور نہ جسامت۔ یہ ہر دم اپنی شکل بدلتا رہتا ہے۔ اسے طبعی موت کبھی نہیں آتی کیونکہ اس کا جسم دو حصوں میں بٹ جاتا ہے اور دونوں امیبا پھر زندگی جاری رکھتے ہیں۔ یہ سمندر اور میٹھے پانی کے حوضوں کی تہ میں پایا جاتا ہے۔ انسان کے دانتوں میں اس کی ایک قسم پائیریا اور آنتوں میں دوسری قسم ایک پیچش (Amoebic dysentery) پیدا کر دیتی ہے جس سے چھٹکارا بہت ہی مشکل ہے۔ یہ پروٹوزون مائیکروسکوپ کے ذریعہ ہی نظر آ سکتے ہیں۔ ان میں فورامینی فیرا نہایت ہی ننھے ننھے جانوروں کا گروہ ہے جو اپنے خول یا (Shell) بنا لیتے ہیں۔ اور ان ہی (Shells) سے (Chalk) اور (Dover) کے (Chalk) کی پہاڑیاں حاصل ہوئی ہیں۔ راڈیولیریا (Radiolaria) کے خول اس کے اراکین کی کاریگری کے حیرتناک نمونے ہوتے ہیں دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ ناکٹی لوکا (Noctiluca) ایک اور بہت ہی چھوٹا سا پروٹوزون ہے۔ مائیکروسکوپ کے نیچے بھی اس کو دیکھنے کیلئے مہارت کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ایک خاص موسم میں کروڑوں اور اربوں کی تعداد میں سمندر کی سطح کے اوپر آ جاتے ہیں تو سارا سمندر ان سے خارج ہونے والی فاسفورس کی روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ خیال ہے کہ اس منظر کو قدیم ملاح شیطانوں کا ناچ سمجھا کرتے تھے۔ اس لئے کہ روشنی تو دکھائی دیتی تھی لیکن روشنی کرنے والے نظر نہ آتے تھے۔ اس گروہ میں ملیریا اور سلیپنگ سکنس (Sleeping Sickness) پھیلانے والے ہلاک طفیلی بھی شامل ہیں۔ پروٹوزون سے اعلیٰ تر جانور اسپنج ہوتے ہیں۔ بازاروں میں بکنے والے اسپنج دراصل کروڑوں جانداروں کی بستیاں ہیں جن میں رہنے والے اب زندہ نہیں ہیں۔ اسپنج کے خاندان کی ایک نہایت حسین اور نازک بستی گلدان کی طرح کی ہوتی ہے۔ اس کو لوگوں نے اپنے حسن کی دیوی وینس کے گلدان کا نام دیا ہے۔ اسپنج سے اعلیٰ جاندار سیلن ٹیریٹا (Coelenterata) کہلاتے ہیں۔ اس گروہ کے اراکین مرجان یا کورل بناتے ہیں جو رنگین بھی ہوتے ہیں اور سادہ بھی۔ چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی۔ کورل اگر سمندر میں سے مینار کی طرح ایستادہ ہوں تو اٹال کہلاتے ہیں اور چٹانوں کی طرح پھیلے رہیں تو جزیرے۔ بحر ہند اور بحر پیسفک کے جزیرے اکثر کورل ایسلینڈز ہیں۔ لکادیپ مالدیپ کی مثال ہندوستان سے قریب ہی مل سکتی ہے۔ سیلن ٹیریٹا کے حسن کا مقابلہ حیوانی دنیا میں سوائے پرندوں کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ایک سیلن ٹیریٹا فیسیلیا (Physalia) کہلاتا ہے۔ سمندر پر تیرتے ہوئے بلبلے کی طرح اس سے لٹکی ہوئی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں ہوتی ہیں جن کے اندر سوئیاں لگی رہتی ہیں۔ اگر دشمن قریب آیا اور سوئیاں باہر نکل کر اس کے جسم میں دھنس گئیں۔ اس لئے پرتگال والوں نے اس کو پرتگالی جنگی جہاز کا نام دیا ہے۔

جیلی فش (Jelly fish) کا جسم اتنا نازک ہوتا ہے کہ سارے جسم کے وزن میں (۹۰) فیصدی سے زیادہ تو پانی

بچے کا وزن ہوتا ہے۔ ایک اور سیلینٹریٹ نہایت حسین، بہت خوش رنگ فیتہ کی طرح چپٹا ہوتا ہے جس کو یونانیوں نے بجا طور پر وینس کے کمربند کا نام دیا تھا جس کی اس دنیا سے آگے طفیلیوں کی بستی ملتی ہے۔ طفیلیوں کے لئے آزاد زندگی مشکل تھا۔ انھوں نے دوسرے کا سہارا ڈھونڈھا اور میزبان کا بوجھ بن کر رہ گئے۔ اس گروہ میں مختلف بیماریاں پیدا کرنے والے جانور پائے جاتے ہیں۔ بچوں کے پیٹ سے نکلنے والے کدو دانے، مرہٹواڑہ کی عام بیماری نارو کے کیڑے۔ فیل پا کے طفیلی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنی لیڈا ([illegible])
کا گروہ ان سے اعلیٰ تر ہے۔ اس میں کیچوے۔ جونک وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اس گروہ کا ایک جانور سمندری چوہا کہلاتا ہے۔ اس کے جسم پر لانبے لانبے رونگٹے ہوتے ہیں۔ ان پر روشنی پڑنے پر رنگ برنگی چمک دکھائی دیتی ہے۔ انیلیڈا سے اونچا گروہ ارتھروپوڈا کا ہے جو حیوانوں کا سب سے بڑا گروہ ہے۔ اس گروہ میں جھینگے، ٹڈیاں، تتلیاں، مکھی، مچھر، بچھو، مکڑیاں، ہزار پایہ، کنکھجورے شامل ہیں۔ جانوروں کی دنیا میں اب تک جس قدر انواع کی تعداد کا علم ہوا ہے وہ 9 لاکھ ہے اور ان میں صرف ارتھروپوڈا ہی کے تقریباً سات لاکھ انواع پائے جاتے ہیں۔ اس گروہ میں کیکڑے بھی شامل ہیں اور ان میں سے ایک ہرمٹ کراب ([illegible])
کہلاتا ہے۔ اس کی دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ مرے ہوئے گھونگوں کے خول اپنے گھر کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس خول کے اوپر ایک اور سیلینٹریٹ جانور جسے سمندری پھول یا سی انی مون کہتے ہیں آکر جم جاتا ہے۔ کیکڑا اور سمندری پھول اب ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جاتے ہیں اور جس طرح ایک لنگڑا اور ایک اندھا مل کر روزی کماتے ہیں ویسے ہی یہ ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں اس طرح وہ صرف وہی غذا استعمال کر سکتا ہے جو اسے آس پاس میں مل سکے۔ لیکن کیکڑا اسے ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جاتا ہے۔ نت نئی غذائیں انیموں کو ملتی ہیں۔ اس کے معاوضہ میں وہ کیکڑے کی حفاظت کرتا ہے۔ جب کوئی دشمن حملہ کرے تو کیکڑا اپنے خول کے اندر چلا جاتا ہے۔ سی انیموں کے جسم سے ڈنڈیاں سی نکلی ہوئی ہوتی ہیں جن پر سوئیاں ہوتی ہیں جو حملہ آور کے جسم میں
18 چبھ جاتی ہیں۔ اس طرح کی طرز زندگی کو (Commensalism) کہتے ہیں جبکہ دو یا دو سے زیادہ جانور ایک ساتھ زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائیں۔ تتلیوں کی دنیا حسن کی دنیا ہے۔ نازک، حسین اڑتی ہوئی رنگین تتلیاں چمن کی بہار ہوتی ہیں۔ لیکن بچے اور چڑیاں سے ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ ان دشمنوں سے بچنے کے لئے ان میں ایک دلچسپ صفت پائی جاتی ہے۔ ان کے پر اندرونی جانب رنگین ہوتے ہیں۔ شوخ و خوش رنگ لیکن بیرونی سطح یا تو پتوں کی ہم رنگ ہوتی ہے یا جھاڑیوں کی ٹہنیوں کی طرح خاکستری۔ جب اڑتی ہیں تو ہوا میں تیرتی ہوئی قوس قزح بن جاتی ہیں لیکن جب دشمن پیچھا کرے تو یہ پر بند کر کے طرح بیٹھ جاتی ہیں کہ پیچھا کرنے والے کی نظر دھوکا کھا جاتی ہے۔ ممکن نہیں ہوتا کہ انھیں بہ آسانی پہچان سکے۔ اس عمل کو لقا لی یا ([illegible]) کہتے ہیں۔ جس میں کہ جانور اپنے آپ کو ماحول سے ہم رنگ کر لے۔ کالیما ([illegible])
ایک تتلی اس خصوصیت میں بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ درخت پر بیٹھی ہوئی حالت میں اس کے پر دوں پر پتوں کی طرح سارے نس نظر آتے ہیں اور تتلی اور پتے میں مشکل ہی سے تمیز ہوتی ہے۔ ایسا عمل متعدد کیاٹر پلرز اور ([illegible]) میں بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ([illegible]) بھی دانٹوں پر بالکل سوکھی ہوئی ٹہنیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ارتھروپوڈا سے آگے تارہ مچھلیوں کا گروہ ہے۔ یہ جانور نہ تو تارے ہیں اور نہ مچھلیاں۔ تارہ مچھلیوں کے جسم سے عموماً (5) لانبے حصے نکلے رہتے ہیں۔ اس لئے تارہ کا لفظ ان سے منسوب کر دیا گیا۔ چونکہ یہ پانی میں رہتی ہیں اس لئے انھیں مچھلی کہنے اور سمجھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکی۔ تارہ مچھلیوں سے آگے ([illegible]) ملتے ہیں۔
(Mollusca) میں گھونگے، سیپیاں، صدف اور ([illegible]) شامل ہیں۔ صدف وہ سیپیاں ہیں جن کے اندر موتی پرورش پاتے ہیں۔ صدف کی اندرونی سطح نہایت چکنی ہوتی ہے۔ اس سے چھوٹے چھوٹے بٹن نما ابھار کی طرح موتی ابھرتے اور بالآخر علاحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ کا ایک جانور ([illegible]) کہلاتا ہے جو ریڑھ کی ہڈی نہیں

سب رس

رکھنے والے جانوروں میں سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کا جسم پچاس فیٹ کی لمبائی تک پہنچتا ہے۔ جسم سے دس لانبے ہاتھ سے نکلے رہتے ہیں۔ ان کے اندر بے شمار سکرز پائے جاتے ہیں۔ جانور اپنے شکار کو ان سے پکڑ لیتا ہے۔ سکرز ویکیوم پیدا کر دیتے ہیں اور شکار بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک اور دلچسپ خاصیت یہ ہے کہ دشمن کو آتا دیکھ کر یہ اپنے جسم میں پائے جانے والے ایک غدود سے سیاہی جیسا عرق خارج کرتا ہے۔ دشمن اور اس کے درمیان ایک سیاہ چادر حائل ہو جاتی ہے۔ اور اس اسموک اسکرین (Smoke Screen) کے پیچھے یہ غائب ہو جاتا ہے۔

(Mollusc) تک پہنچ کر حیات کی تاریخ کا پہلا نصف حصہ ختم ہوتا ہے۔ اس منزل تک پہنچتے پہنچتے کاروان حیات کو تقریباً (۹۰) کروڑ سال لگ گئے۔ اب تک یہ جیون دھارا بنیادی طور پر پانی ہی کے اندر چلتا چلا گیا گو اس قافلہ کے چند ساتھیوں نے پانی سے نکل کر دھرتی اور ہوا کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ پھر بھی زندگی کا گہوارہ پانی ہی تھا۔ اب تک جتنے جانوروں کا ارتقاء ہوا تھا وہ سب کے سب ریڑھ کی ہڈی نہیں رکھتے تھے۔ حیات نے ایک کروٹ لی اور ایسے جانور نمودار ہوئے جن سے کہ موجودہ مچھلیاں حاصل ہوئی ہیں۔ یہ واقعہ آج سے تقریباً (۳۵) کروڑ برس پہلے پیش آیا۔ مچھلیوں کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ ننھی ننھی تیرتی ہوئی چاندی کی بالیوں اور ناچتی ہوئی سورج کی کرنوں سے لے کر دہشت ناک (۵۰) فیٹ لمبی (Whale Shark) تک اس گروہ میں شامل ہیں۔ مچھلیوں کا انسان کی غذا اور دوا دونوں حیثیت سے تعلق ہے۔ تقریباً ۲۵ ارب پونڈ وزن کی مچھلیاں سالانہ پکڑی جاتی ہیں۔ جو غذا، جگر کی تیل اور دوسرے اغراض کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ . . . . — . . . . .

. . . .

. . . . عام طور پر مچھلیاں ہزاروں انڈے دیتی ہیں لیکن یہ مچھلی جسے ( ) کہتے ہیں بہت کم انڈے دیتی ہے۔ انڈوں سے بچوں کے نکلنے پر ماں بچوں کی پرورش اور نگرانی نہیں کرتی بلکہ اس کام کو اس کا باپ انجام دیتا ہے۔ اس طرح کہ یہ بچوں کے ساتھ ساتھ تیرتا ہے۔ جب بھی کوئی دشمن قریب آئے بچے باپ کے منہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور دشمن کے چلے جانے پر باپ منہ کھول دیتا ہے۔ بچے پھر تیرنے لگتے ہیں۔ پائپ فش (Pipe fish) سی ہارس (Sea horse) گلوب فش (Globe fish) پیراڈائز فش (Paradise fish) اور ہندستان کے ساحل پر ملنے والی چپٹی مچھلیاں بھی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ چپٹی مچھلیاں تیرتی نہیں ریت پر پھسلتی ہیں۔ اس وجہ سے ان کی ایک آنکھ ریت سے ملی ہوئی سطح سے ہٹ کر اوپری سطح پر آ جاتی ہے۔ اس طرح دونوں آنکھیں ایک ہی سطح پر رہتی ہیں۔ مچھلیوں نے جل تھلیوں کو جنم دیا ہے۔ جل تھلیے ایسے جانور ہیں جو جل اور تھل یعنی پانی اور زمین دونوں جگہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی مثال مینڈک ہے۔ مینڈک پہلے ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانور ہیں۔ جنھوں نے پانی کی زندگی کو چھوڑ کر زمین پر بسیرا کرنے کی جرأت کی۔ ان ہی مینڈکوں میں ایک مینڈک ہوتا ہے جو انڈے اپنی پیٹھ پر لادے پھرتا ہے یہ مینڈک مادہ نہیں نر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو مڈوائف ٹوڈ (Midwife Toad) کہتے ہیں۔ مینڈکوں کی نسل سے رینگنے والے جانور یعنی ریپٹائلز حاصل ہوئے۔ ریپٹائلز میں گرگٹ، سانپ، کچھوے، مگرمچھ اور پرانے زمانے میں زمین پر رہنے والے ڈائناسارز شامل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ریپٹائلز کی تاریخ ڈائناسارز سے شروع ہو کر ڈائناسارز ہی پر ختم ہو گئی آج سے تقریباً (۲۵) کروڑ سال پہلے یہ دھرتی پر آباد تھے۔ یہ اس وقت سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے بڑے جسم رکھنے والے جانور تھے آج بھی ان کی جسامت کو سوائے نیلی وھیل (Blue Whale) کے کوئی اور جانور نہیں پہنچا۔ ان میں سب سے بڑی جسامت رکھنے والا (Brontosaurus) تھا جو ۶۵ فیٹ لانبا اور تقریباً ۳۰ ٹن کا وزن رکھتا تھا۔ ایک اور ریپٹائل (Tyrannosaurus) تھا جس سے زیادہ خونخوار جانور آج تک زمین پر پیدا نہیں ہوا۔ ریپٹائلز اور ڈائناسارز کا یہ سنہرا

دور زمین پر تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ سال تھا۔ پھر سارے کے سارے ڈائنا سارز یکایک فنا ہوگئے۔ ایپٹائلز سے پرندے حاصل ہوئے۔ سب سے پہلا پرندہ آرکی آپیٹرکس تھا۔ اس کی چونچ کے اندر دانت اور انگلیاں تو ایپٹائلز کی سی تھیں۔ لیکن اڑنے کے لئے پر پرندوں کے مانند تھے۔ ایپاٹائلز کے خاتمہ پر میمالز نے زمین کی سرداری سنبھالی اس لئے کہ پرندوں نے ان سے مقابلہ کے بجائے ہوا کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ پرندے اپنے حسن اپنی آواز اپنی رنگینی میں تمام جانداروں سے ممتاز ہیں۔ بعض پرندوں نے اڑنے کی عادت چھوڑ کر بھاگنے کی خاصیت پیدا کر لی۔ ان دوڑنے والوں میں شترمرغ سب سے ممتاز ہے جو تقریباً (۴۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے۔ شترمرغ کا ذکر آیا تو خیال اس کے انڈہ کی طرف جاتا ہے۔ اس لئے کہ موجودہ پرندوں میں سب سے بڑا، فیٹ اونچا اور (۳۰۰) پونڈ کے وزنی جانور کا انڈا ظاہر ہے کس قدر بڑا ہوگا۔ لیکن شترمرغ سے بھی زیادہ بڑا اور ایک پرندہ تھا جو ایپی آرنس ([illegible]) کہلاتا تھا اور آج سے چند سو سال پہلے تک زندہ تھا۔ اس کا انڈہ تقریباً ۱۲ انچ لمبا اور (۹½) انچ چوڑا ہوتا تھا۔ پرندوں کی طرح میمالز بھی ایپٹائلز سے حاصل ہوئے ہیں۔ پرندوں اور میمالز (Mammals) کی زمین پر آمد کے ساتھ ایک اور بہت بڑا واقعہ نباتی دنیا میں پیش آیا یہ واقعہ پھول دار درختوں کا ارتقاء تھا۔ یہ تینوں واقعات تقریباً (۶) کروڑ برس پہلے پیش آئے تھے۔ میمالز میں سب سے ادنیٰ وہ جانور ہے جو ایپٹائلز کی طرح انڈے دیتے ہیں اور میمالز کی طرح بچوں کو دودھ پلاتے ہیں یہ جانور صرف آسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں اور ایپٹائلز اور میمالز کے درمیان کڑی سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو (Eoidna) اور (Duck Billed Mole) کہتے ہیں۔ کنگرو اپنے بچوں کو پیٹ سے نکلی ہوئی تھیلی میں پرورش کرتے ہیں۔ میمالز میں سے چمگادڑ نے ہوائی زندگی اختیار کر لی۔ میمالز کا سب سے اعلیٰ گروہ پرائمٹ (Primates) کہلاتا ہے۔ اس میں لیمورز، بندر، بن مانس اور انسان شامل ہیں۔ لیمور کی صورت دیکھتے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ بندروں کی ادنیٰ قسم ہے۔ بن مانسوں میں گوریلا کی سخت اور غصیلی صورت زیادہ اچھی نہیں لگتی۔ البتہ چمپانزی تمام بن مانسوں کے مقابلے میں انسان سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ چمپانزی کا ارتقاء انسان ہے۔ وہی انسان جو زندگی کے قافلہ کا سالار ہے اور جیون ناٹک کا سب سے زیادہ اہم کیریکٹر۔ اس کی آمد دھرتی کے اسٹیج پر سب سے آخر میں ہوئی۔ آج سے دس لاکھ برس قبل مسیح کی بات ہے کہ ہماری ہی سرزمین ہندستان کے ہمالیہ کی سوالک پہاڑیوں میں پہلا "انسان نما" پیدا ہوا۔ اور پھر صرف پچاس ہزار برس قبل مسیح کا ذکر ہے کہ کیسپیین سمندر کے کنارہ وہ پہلا انسان ظاہر ہوا جس کی نسل سے ہم سب ہیں۔ یہ انسان زندگی کے سارے شاہکاروں کا شاہکار تھا۔ اس میں عقل کا نور تھا اور سمجھ کا ظہور۔ اس لئے یہ (Homo Sapien) یعنی عقل رکھنے والا کہلایا۔ اسی عقل نے انسان کو دھرتی کا سرتاج بنا دیا۔ اس نے پانی زمین اور ہوا پر فتح پائی۔ طوفانی سمندروں کے سینے چیر دئیے۔ ہمالیہ کی چوٹی پر جھنڈا گاڑ دیا۔ ہوا میں آواز سے تیز رفتار سے دوڑ نکلا۔ بجلی کو رام کیا۔ عناصر پر قابو پایا۔ ایٹم کو توڑ کر صحراؤں کو گلزاروں میں تبدیل کر دیا اور اتنا کچھ کرنے کے بعد تاریخ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ یکم جنوری کو زندگی کا جو قافلہ چلا تھا اس میں ۳۱ دسمبر کو رات کے گیارہ بج کر ستاون منٹ پر وہ شریک ہوا ہے یعنی اس دھرتی پر آنکھ کھولے پورے ایک سال کے مقابل صرف تین ہی منٹ تو ہوئے ہیں۔

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی انداز جہان گزراں ہے کہ جو تھا
فراق

سب رس

شاہد صدیقی

(۱)

بادلوں میں اک بجلی لے رہی تھی انگڑائی
باغباں نے گھبرا کر کہہ دیا بہار آئی

آدمی کے ہاتھوں سے آدمی کو موت آئے
اس سے بڑھ کے کیا ہوگی زندگی کی رسوائی

تم سحر کے گن گاؤ، میں تو یہ سمجھتا ہوں
مجھ کو نیند میں پا کر رات پھر پلٹ آئی

چارہ گر کے چہرے پر اک عجیب عالم ہے
جیسے ناپ ہی لے گا میرے غم کی گہرائی

وہ خلش جسے شاہدؔ ان کی یاد کہتے ہیں
خلوتوں کی محفل ہے محفلوں کی تنہائی

○

پرویز شاہدی

بے باک ہیں پاداشِ خطا سے نہیں ڈرتے
ہم عشق کے مجرم ہیں سزا سے نہیں ڈرتے

آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں صبحِ رخِ تابناک
ہم تیرگیٔ شامِ بلا سے نہیں ڈرتے

پندارِ وفا ضامنِ بےباکیٔ دل ہے
ہم حوصلۂ اہلِ جفا سے نہیں ڈرتے

عجزِ رسن و دار کا عالم ہے نظر میں ۲۱
ہم طوق و سلاسل کی فضا سے نہیں ڈرتے

ہیں شمعِ سرِ راہ تو جلتے ہی رہیں گے
ہم دامنِ رہزن کی ہوا سے نہیں ڈرتے

گستاخ ہے معصومیٔ اظہارِ تمنا
ہم آپ کی بے درد حیا سے نہیں ڈرتے

بارود بچھانے کو تو آئے ہیں چمن میں
کیا برہمیٔ موجِ صبا سے نہیں ڈرتے؟

کیوں گھیر رہے ہیں گل و گلزار کو شعلے
کیا ابرِ بہاراں کی سزا سے نہیں ڈرتے؟

یہ تاج کے سائے میں زر و سیم کے خرمن
کیوں آتشِ کشکولِ گدا سے نہیں ڈرتے؟

قاروں کی شریعت پہ ہے اب شیخ کا ایماں
مسجد میں تو جاتے ہیں خدا سے نہیں ڈرتے

اتنا بھی کوئی محوِ جفا میں نہیں ہوتا
تم ولولۂ اہلِ وفا سے نہیں ڈرتے؟

خورشید نذیر

دل پہ جب ان کی عنایت کی نظر ہوتی ہے
مری ہر آہ بھی ممنونِ اثر ہوتی ہے

ہے وہی موج حقیقت میں سزاوارِ حیات
جس کی طوفانوں کے سینے پہ بسر ہوتی ہے

خار کی چھاؤں میں بھی اس کو لطافت ہے نصیب
روحِ آزاد مثالِ گلِ تر ہوتی ہے

رند میخانے سے نکلا تو چلا مسجد میں
اس سے بڑھ کر کہیں توہینِ بشر ہوتی ہے

زد میں آ آ کے مصیبت کے ابھرتی ہے حیات
شب کی آغوش میں تعمیرِ سحر ہوتی ہے

اس قدر واقفِ آدابِ خزاں ہوں اے دوست
پھول ڈالی سے جو گرتا ہے خبر ہوتی ہے

اتنا ہی غم مجھے آنکھوں سے بہا لینے دے
جتنی لذت تجھے اے دردِ جگر ہوتی ہے

زبیدہ تحسین

سنتے تھے ہم کہ زیست غموں ہی کا نام ہے
رازِ حیات غم میں تڑپ کے ہم بھی پا گئے

۳ دل نے قدم قدم پہ کیا خونِ آرزو
راہِ وفائے دوست میں ہم کام آ گئے

یہ بھی تھا سادگیٔ تخیل کا اک فریب
یوں جو سمجھ رہے تھے کہ ہم ان کو پا گئے

اللہ رے کاروبارِ محبت کا اختصار
وہ ایک ہی نگاہ میں اپنا بنا گئے

تھی دم سے ان کی بزمِ حیات وجد آفریں
وہ کیا گئے کہ بزم کو ویراں بنا گئے

بد قسمتی تھی اپنی کہ دامن نہ بھر سکے
یوں وہ مسرتوں کا خزانہ لٹا گئے

تحسین چارہ گر کی مسیحائی کے نثار
بیمارِ غم کو ایک نظر میں جلا گئے

میکسم گورکی
مترجم: [illegible]

کشتگانِ محبت

کریمیا میں ایک خان اسراب رہا کرتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام تولیاک الگلا تھا۔

ان الفاظ کے ساتھ نابینا تاتار فقیر نے جو بھورے بڑے سدا بہار پودے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا جزیرہ نما کی ایک پرانی کہانی کہنی شروع کی جو ماضی کی حسین یادوں سے مرصع تھی۔ پھر کیلے رنگوں کی قمیصیں اور ٹوپیاں پہنے تاتار کہانی سنانے والے کے گرد حلقہ بنائے ان پتھروں پر بیٹھے تھے جو کبھی کسی خان کے محل کی زینت تھے۔ شام کا وقت تھا۔ آفتاب دھیرے دھیرے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ اس کی سرخ کرنیں کھنڈروں کو گھیرے ہوئے سبز پتوں کو چھلنی بناتی ہوئی روشنی کے دھبوں کی صورت میں کائی جمے پتھروں پر اور لٹکتی ہوئی بیلوں پر پڑ رہی تھیں۔ ہوا بوڑھے درختوں کی شاخوں میں سے گاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ پتے دھیمی دھیمی آواز کے ساتھ یوں تیر رہے تھے جیسے پانی کا ان دیکھا دھارا بہہ رہا ہو۔ نابینا فقیر کی آواز دھیمی اور کمزور تھی۔ اس کے سخت کھردرے چہرے کی جھریاں، چہرے پر پھیلی ہوئی خاموشی اور سکون کے علاوہ اور کسی شے کا اظہار نہ کر رہی تھیں۔ الفاظ جو اس کے حافظہ میں منقوش تھے اس کے ہونٹوں سے یکے بعد دیگرے نکلتے ہوئے بیتے دنوں کی ایک تصویر اجاگر کر رہے تھے جس میں احساسات کی شدت تھی۔

اسراب بوڑھا تھا (نابینا تاتار نے کہا) لیکن اس کے حرم میں کئی عورتیں تھیں۔ وہ سب کہنہ سال اسراب سے پیار کرتی تھیں کیونکہ اس کی رگوں میں ابھی گرم لہو دوڑ رہا تھا۔ اس کے بازوؤں میں قوت تھی اور اس کا پیار شدید و لطیف تھا اور عورتیں ہمیشہ اس سے پیار کرتی رہیں جس کے آغوش میں آگ بھری ہو چاہے اس کی رنگت سیاہ اور چہرے پر جھریاں ہی کیوں نہ ہوں۔ جسم نرم کھال اور گلگوں عارضوں میں انہیں کس لیا ہے۔

اس کے حرم میں مختلف ملکوں کی تین سو عورتیں تھیں اور ہر حسینہ بہار کے پھولوں کی طرح خوبصورت تھی۔ وہ تمام اسے پیار کرتی تھیں لیکن اس کی تمام تر عنایات کا مرکز دنایپر کی وادیوں سے لائی ہوئی کوسکی دوشیزہ تھی۔ وہ اسے بے انتہا پیار کرتا تھا، اتنا پیار اسے اور کسی سے بھی نہ تھا۔ حرم میں ان کی زندگی خوشگوار تھی۔ خان نے دوشیزاؤں کے واسطے لذیذ اور خوشبودار کھانوں کے لئے حکم دے رکھا تھا۔ وہ جب چاہیں ناچیں، کھیلیں، انھیں اس بات کی اجازت تھی۔

وہ کوسکی دوشیزہ کو اکثر اپنے پاس اس مینارے میں بلایا کرتا تھا جہاں سے آپ سمندر کو دیکھ سکتے ہیں اور جہاں اس نے وہ تمام اشیاء مہیا کر رکھی تھیں جن کی ضرورت کسی حسینہ کو اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ہو سکتی ہے۔ مٹھائیوں اور ہر قسم کے خوبصورت کپڑوں سے، سونے اور چمکیلے رنگا رنگ پتھروں سے، انگیٹھی اور دور دراز ملکوں کے نایاب پرندوں سے محبت میں پگھلتے ہوئے خان کے آغوش میں گرمائی اس مینارے میں وہ زندگی کے نشیب و فراز سے دور رہ کر سارا سارا دن کوسکی دوشیزہ سے دل بہلاتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا بیٹا الگلا خانیت کے وقار کو کبھی کم نہ ہونے دے گا۔ جب بھی وہ روسی وادیوں میں بھیڑیے کی طرح جھپٹتا ہوگا اپنے پیچھے خون، گرد، خوف اور لاشیں چھوڑتا ہوا قیمتی لوٹ کے مال، حسین عورتوں اور نئی شان کے ساتھ لوٹتا ہوگا۔

ایک مرتبہ جب الگلا روس سے یلغار کر کے واپس لوٹا تو اس کے اعزاز میں [illegible] گئے۔ جزیرہ نما کے تمام امراء جشن میں شریک تھے۔ کھیل ہوئے، ضیافتیں ہوئیں اور تیر بلند آسمان کی طرف [illegible] کا نشانہ بنایا گیا۔ پھر انھوں نے [illegible] شراب پی اور الگلا کی بہادری کی (جس کے نام سے دشمن کانپتے تھے) اور خانیت [illegible] باتیں کیں۔ کہنہ سال اسراب

[illegible]

اپنے بیٹے کی عزت دیکھ کر پھولا نہ سما رہا تھا۔ اسے اس خیال سے بہت خوشی ہوتی تھی کہ اس کی موت کے بعد خانیت مضبوط ہاتھوں میں رہے گا یہ جاننا واقعی اس کے لئے مسرت کا باعث تھا۔ اپنے بیٹے پر اپنے پیار کی شدت ظاہر کرنے کے لئے وہ ان امیر زادوں کے سامنے جو دعوت میں شریک تھے مخاطب ہوا۔ وہ شراب کے بڑے پیالے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا: اے میرے عزیز بیٹے! یہ سب شان ہے اللہ تعالیٰ کی اور بزرگی ہے رسول کی:

سب نے مل کر اس کے رسول کی عظمت کے گیت اونچے سروں میں گائے اور پھر خان نے کہا "اللہ اکبر و برتر ہے۔ میری زندگی ہی میں اس نے میرے بہادر بیٹے کی رگوں میں میری جوانی کا خون تازہ کر دیا ہے۔ میں اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ جب سورج ان سے اوجھل ہو گا اور جب کیڑے مکوڑے میرے دل کو اپنی خوراک بنا لیں گے میں اپنے بیٹے کے قالب میں زندہ رہوں گا۔ اللہ عظیم ہے اور محمد اس کا سچا پیغمبر ہے۔ میرا بیٹا ہونہار ہے۔ اس کے بازوؤں میں قوت اور دل میں حوصلہ ہے اور اس کا ذہن صاف ہے۔ انغلا، تم اپنے باپ کے ہاتھوں سے کیا چیز لینا پسند کرو گے۔ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔"

بوڑھے اسراب کی آواز مشکل فضا میں کھوئی ہو گی کہ انغلا چمکیلی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں رات کی سیاہی میں پھیلے ہوئے سمندر کی طرح سیاہ تھیں اور کسی پہاڑی عقاب کی آنکھوں کی طرح لو دے رہی تھیں۔

"اے میرے شہنشاہ، اے میرے ابا!" اس نے کہا "مجھے روسی حسینہ بخش دیں:"

خان خاموش تھا، خاموش مگر اتنے ہی عرصہ کے لئے جتنا کہ اسے اپنے دل میں خوف و ہم کے جذبات کو خاموش کرنے کے لئے درکار تھا۔ خاموشی توڑتے ہوئے اس نے بلند آواز سے کہا "تم اسے لے سکتے ہو، دعوت ختم ہونے پر تم اسے حاصل کر سکو گے۔"

انغلا کا چہرہ تنویر مسرت سے دمک اٹھا۔ اس کی عقابی آنکھیں خوشی کی شدت سے چمک اٹھی تھیں۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنے باپ سے مخاطب ہوا: میں جانتا ہوں آپ نے مجھے کیا بخشا ہے، میرے عظیم ابا میں جانتا ہوں، میں تمہارا بیٹا تمہارا غلام ہوں۔ آپ میرا خون لے سکتے ہیں۔ ایک قطرہ قطرہ خون میرے جسم سے نکال سکتے ہیں۔ میری جان آپ پر سینکڑوں مرتبہ نثار ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے": خان نے کہا اور اس کا بھورے بالوں والا سر جو سالہا سال سے عظمت و شوکت اور کارہائے نمایاں سے بلند رہا تھا اس کے سینے پر جھک گیا۔

جلد ہی ضیافت ختم ہو گئی اور وہ دونوں شانہ بہ شانہ، پہرہ داروں محل سے نکل کر حرم کی طرف چل دیئے۔

رات سیاہ تھی۔ آسمان پر چاند اور نہ ستارے ہی۔ بادل کسی دبیز چادر کی طرح آسمان کو ڈھانپے ہوئے تھے۔

وہ بڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ چلتے رہے۔ آخر اسراب بولا:

"میری زندگی دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں مدھم پڑ رہی ہیں۔ میرے سینے میں زندگی ماند ہوتی جا رہی ہے۔ میری زندگی میں روشنی اور گرمی اسی کو سکی دوشیزہ کی شدید محبت سے تھی۔ مجھے بتاؤ تو لیا بی، مجھے بتاؤ کیا تم اس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ تم میری ایک سو بیویاں لے لو۔ تم اس کے عوض سب کو لے لو۔"

انغلا نے آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

"میرے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ اب تو مجھے دنیا میں بہت تھوڑے دن جینا ہے۔ یہ روسی لڑکی میری زندگی کی آخری خوشی ہے۔ وہ مجھے جانتی ہے۔ وہ مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ جب وہ میرے پاس، مجھ بوڑھے کے پاس نہ ہو گی تو مجھ سے اور کون محبت کرے گا، کون مجھ پر اپنی جان نثار کریگا۔ کوئی نہیں، انغلا! اور کوئی نہیں۔"

انغلا خاموش تھا۔ اسراب کہتا رہا۔

یہ جانتے ہوئے کہ وہ تمہارے آغوش کی زینت ہے اور تمہارے ساتھ بوس و کنار میں مصروف ہے۔ میں کس طرح جی سکوں گا؟ ایک

عورت کے لیے ہم سب بیتاب ہیں، لیکن عورت کے لیے ہم سب مجبور ہیں میرے بیٹے۔ کتنا اچھا ہو اگر میرے پرانے مندمل زخم پھر سے ہرے ہو جائیں اور میرا خون رگوں سے بہہ جائے۔ کتنا اچھا ہو اگر آج کی رات کے بعد میں زندہ نہ رہوں۔ میرے بیٹے!"

خان کا بیٹا خاموش تھا۔ وہ حرم کے دروازے کے پاس آ کر رک گئے اور خاموشی کے ساتھ ان کے سر ان کے سینوں پر جھک گئے۔ وہ بڑی دیر تک حرم کے دروازے پر کھڑے رہے۔ ان کے گرد تاریکی محیط تھی۔ آسمان پر بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ہوا کے تھپیڑے درختوں کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا کوئی پرشور گیت انہیں سنا رہی ہو۔

"بابا! میں اسے ایک عرصے سے پیار کرتا رہا ہوں۔" الغلا نے خاموشی سے کہا۔

"میں یہ جانتا ہوں، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تمہیں پیار نہیں کرتی۔" خان نے کہا

"جب میں اس کے متعلق سوچتا ہوں تو میرا کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔"

"لیکن اس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔"

اور پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ الغلا نے سرد آہ بھری۔

"اب مجھے معلوم ہوا کہ جو سبق میرے دانشمند ملّا نے دیا تھا وہ صحیح تھا۔ عورت مرد کے لیے ہمیشہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ اگر وہ خوبصورت ہوتی ہے تو وہ لوگوں کے دلوں میں اپنے حصول کی خواہش پیدا کر دیتی ہے اور اپنے خاوند کو حسد کی آگ میں مبتلا کر دیتی ہے اور اگر وہ بدصورت ہو تو اس کا خاوند دوسروں کی بیویوں کو دیکھ کر رشک کرتا اور حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ وہ اگر نہ خوبصورت ہو اور نہ بدصورت تو مرد اسے خوبصورت خیال کرنے لگتا ہے اور جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس کے باعث تکلیف اٹھاتا ہے۔"

"دانائی سے درد دل کا علاج ناممکن ہے۔" خان نے کہا

"ابا! ہمیں ایک دوسرے پر ترس کھانا چاہیے۔"

خان نے سر اٹھایا اور یاس بھری نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"آئیے ہم اسے مار ڈالیں۔"

وہ ایک لمحہ کے لیے سوچتا رہا اور پھر دھیرے سے بڑبڑایا۔

"تم مجھے اور اس سے کہیں زیادہ اپنے آپ کو پیار کرتے ہو۔"

"ہاں، اور آپ بھی۔"

پھر دونوں خاموش ہو گئے

"ہاں، اور میں کہاں؟" خان نے افسردہ خاطر ہو کر کہا۔ غم نے اسے معصوم بنا دیا تھا۔

"کیا ہم اسے مار ڈالیں گے؟"

"میں اس کو تمہیں نہیں دے سکتا، میں نہیں دے سکتا۔" خان نے کہا

"اور میں اور صبر نہیں کر سکتا۔ آپ میرا کلیجہ چیر ڈالیے یا اسے مجھے دے دیجیے۔"

خان خاموش تھا۔

"بابا آئیے، ہم اس کو اٹھا کر چٹان سے نیچے سمندر میں پھینک دیں۔"

"آئیے ہم اسے چٹان سے نیچے سمندر میں پھینک دیں۔" خان نے اپنے بیٹے کے الفاظ آواز کی گونج کی طرح دہرائے۔

وہ حرم میں داخل ہوئے جہاں وہ بیش بہا نفیس قالین کے بستر پر سو رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کر رک گئے اور اسے دیکھنے لگے۔ وہ دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ بوڑھے خان کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کی سفید داڑھی پر ڈھلک آئے جہاں وہ موتیوں کی طرح چمک رہے تھے

اس کا بیٹا اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے دے رہی تھیں اور وہ ضبطِ جذبات کی کوشش میں دانت پیس رہا تھا۔ اس نے لڑکی [illegible] کو جگا دیا۔ وہ جاگ پڑی۔ اس کے [illegible] نرم خدنگ چہرے پر طلوعِ صبح کی کیفیت تھی۔ اس کی آنکھیں گندم کے خوشوں کی طرح کھل گئیں۔
اس نے التلا کو دیکھا اور اپنے [illegible] خان کی طرف بڑھا دیے۔

"میرا منہ چوم لو میرے محبوب شاہین۔"

"اٹھو ــ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" خان نے سختی سے کہا۔

اس نے پھر التلا کو دیکھا۔ اس کی عقابی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ جلد ہی معاملے کی تہہ تک اتر گئی اور اس نے سب کچھ جان لیا۔
"میں چلوں گی۔" اس نے کہا "میں چلوں گی، لیکن نہ ایک کے لئے اور نہ دوسرے ہی کے لئے ــ یہی آپ کا فیصلہ ہے نا؟ مضبوط دلوں کو ایسا فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں چلوں گی۔"

وہ خاموشی کے ساتھ سمندر کی طرف بڑھے۔ وہ تنگ راستوں میں سے گزرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ہوا میں ایک غراہٹ سی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ جلد تھک گئی لیکن اس قدر مغرور تھی کہ کسی کو کچھ بتانا نہ چاہتی تھی۔

خان کے بیٹے نے جب دیکھا کہ وہ پیچھے رہ رہ جاتی ہے تو اس نے کہا "کیا تم ڈر رہی ہو؟"

اس نے قہر بھری نظروں سے التلا کی طرف دیکھا۔ پھر اسے اپنا پاؤں دکھایا جس سے کہ خون بہہ رہا تھا۔

التلا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "آؤ میں تمہیں اٹھا لوں۔" لیکن اس نے اپنی باہیں اپنے بوڑھے شاہین کی گردن میں حمائل کر دیں۔
خان نے اسے ایک بچے کی طرح اٹھا لیا اور چلنے لگا۔ وہ اس کے پہلو سے لگی ہوئی اس کے چہرے سے شاخیں ہٹاتی رہی تاکہ شاخیں اس کا منہ زخمی نہ کر دیں۔ وہ دیر تک چلتے رہے اور آخرکار کچھ دور سے انہوں نے سمندر کی آواز سنی۔ تولیاک جو اپنے باپ کے پیچھے پیچھے پگڈنڈی پر چلا آ رہا تھا۔ اچانک بولا "آپ مجھے آگے جانے دیجئے ورنہ میں آپ کی گردن میں چھرا گھونپ دینے کی خواہش کرنے لگوں گا۔"

"آگے بڑھ جاؤ۔ اللہ تمہاری خواہش پوری کرے گا یا تمہیں بخش دے گا ــ وہی ہوگا جو اسے منظور ہے۔ میں تمہارا باپ تمہیں معاف کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں محبت کیا شے ہے۔"

آخرکار وہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ نیچے خلا تھا، لامحدود اور سیاہ۔ چٹان کی تہہ میں سمندر کی لہروں کا دھیما دھیما شور سنائی دے رہا تھا۔ فضا سرد اور مہیب تھی۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

"الوداع" خان نے لڑکی کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

"الوداع" التلا نے اس کی طرف جھک کر کہا۔

اس نے نیچے دیکھا۔ لہریں شور مچا رہی تھیں۔ وہ سکڑ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ بھینچ لیا۔

"مجھے نیچے پھینک دو" اس نے ان دونوں سے کہا۔

التلا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے دل سے ایک کراہ پیدا ہوئی لیکن خان نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اسے آہستگی سے بھینچا اور پھر اسے سر سے اونچا اٹھا کر چٹان سے نیچے پھینک دیا۔

نیچے لہریں شور مچا رہی تھیں۔ لہروں کے شور و غل میں اس کے پانی میں گرنے کی آواز تک نہ آئی۔ کوئی چیخ اور نہ کوئی آواز انہوں نے سنی۔
خان وہیں چٹان پر بیٹھ گیا اور نیچے تاریکی اور خلا میں دیکھنے لگا جہاں سمندر بادلوں سے گھل مل رہا تھا۔ سسکتی ہوئی لہروں کی دھیمی آواز ابھی آ رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے جب اس کے قریب سے گزرتے تو اس کی داڑھی کے سفید بال منتشر ہو جاتے۔ تولیاک دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپے پتھر کی طرح خاموش اس کے قریب کھڑا تھا۔ بادل یکے بعد دیگرے آسمان پر پھیل رہے تھے۔ ہوا ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ سمندر کے کنارے چٹان پر بیٹھے ہوئے خان کے خیالات کی طرح بوجھل اور سیاہ تھے۔

سب رس

"ابا! آئیے چلیں" تولیاک نے کہا

"ٹھہرو" خان نے دھیمی آواز سے کہا۔ جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ نیچے سمندر موجیں مار رہا تھا۔ ہوا چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی اور درختوں میں سے چیختی ہوئی گزر رہی تھی۔

"ابا! آئیے چلیں"

"ذرا اور ٹھہرو"

تولیاک نے اپنے باپ سے کئی بار واپس چلنے کو کہا مگر خان اس جگہ سے نہ ہلا جہاں اس کے باقی ماندہ دنوں کی خوشیاں دریا برد ہو گئی تھیں۔ ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے۔ آخر کار وہ اٹھا، تمکنت اور حوصلے کے ساتھ وہ اٹھا، جھکا اور پھر کھوکھلی آواز سے بولا "آؤ چلیں"۔ وہ چلنے لگے، مگر جلد ہی خان رک گیا۔

"تولیاک، میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں جا رہا ہوں" خان نے اپنے بیٹے سے پوچھا "میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ میری زندگی اسی کے ساتھ تھی۔ میں بوڑھا ہوں اور اب مجھ سے کوئی محبت نہیں کرے گا۔ اگر تمہیں کوئی پیار کرنے والا نہیں ہے تو دنیا میں جینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

"آپ کے پاس دولت ہے، عزت ہے ابا!"

"تم مجھے اس کا ایک بوسہ دلا دو اور یہ تمام چیزیں بطور انعام کے مجھ سے لے لو۔ جاودان صرف عورت کا پیار ہے۔ باقی فانی۔ اگر آدمی عورت کے پیار سے محروم ہو تو وہ بیجان ہے۔ ایک بھک منگا فقیر ہے اور اس کی حالت قابل رحم ہے۔ الوداع بیٹے، اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں اور تمہاری زندگی کے ہر شب و روز میں تمہارے ساتھ رہیں۔" اور خان نے سمندر کی طرف رخ کیا۔

"ابا!" تولیاک چلایا "ابا!" اس کے ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ آپ اس شخص سے کچھ نہیں کہہ سکتے جس پر موت مسکرا رہی ہو۔

"مجھے جانے دو"

"اللہ"

"وہ جانتا ہے"

خان تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا چٹان کے آخری سرے تک گیا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس کا بیٹا اسے ایسا کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔ وہ ایسا نہ کر سکا۔ اسے پکڑ بھی نہ سکا۔ سمندر سے کوئی آواز نہ آئی نہ کوئی چیخ اور نہ خان کے گرنے کا شور ہی سنائی دیا۔ نیچے سمندر میں موجیں تلاطم پیدا کر رہی تھیں۔ ہوا وحشیانہ گیت گا رہی تھی۔

اخلا بعدی ریشکن چٹان سے نیچے دیکھتا رہا اور پھر چلایا۔ "مجھے بھی اتنا ہی مضبوط دل دے میرے اللہ!"

پھر وہ رات کی تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

اس طرح اپنی جان دے کر خان اسرآب اور خان تولیاک اخلا نے اہل کریمیا کے دلوں پر اپنی حکومت مسلط کر دی۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال

سب رس

مصنف، پرل بک
مترجم، (جسٹس) احمد محی الدین انصاری

ماں

اس اشاعت سے ہم پرل بک کا مشہور ناول "The Mother" کا.... بالاقساط "سب رس" میں دیں گے جس کا ترجمہ ہمارے بزرگ جسٹس انصاری صاحب نے کیا ہے۔
اسریب

باب اول

(۱)

وہ اپنے دیہاتی خس پوش چھوٹے سے گھر میں ایک بانس کی چوکی پر بیٹھی ہوئی ایک موٹی سی آہنی دیگچی کے تلے چولھا پھونک رہی تھی۔ ابھی آنچ پوری طرح نہ ہوئی تھی۔ خشک پتوں اور سوکھی تیلیوں کے ایندھن میں جان کیا ہوتی ہے۔ وہ کبھی کبھی چوپے میں پھونکتی جاتی تھی کہ آگ اچھی طرح روشن ہو۔ پاس ہی باورچی خانے کے ایک کونے میں اس کی بوڑھی ساس ایک موٹا سا روئی کا کوٹ ایک پتلے نیلگوں ریشمی کوٹ کے نیچے پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جتنا ہو سکے چولھے کے قریب بیٹھا کرتا ہے۔ بیچاری بڑھیا! نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ضعیفی نے یوں ہی ادھ موا کر رکھا تھا اس پر پرانے آشوب چشم کا عارضہ۔ آنکھیں سوجی ہوئی سرخی ہوئی اور بصارت برائے نام۔ تاہم بڑھیا دن کا روزن نما آنکھوں سے چولھے کی آگ کو بھڑکتے دیکھ کر خوش اور مطمئن معلوم ہوتی تھی لیکن وہ بار بار چوپے میں گھاس جھونکتے دیکھ کر بولی:۔۔۔ 9

"بیٹی! ذرا ایندھن احتیاط سے خرچ کرو۔ گھاس کے اب شاید ایک یا دو گٹھے ہی باقی رہ گئے ہوں گے۔ ابھی ابھی موسم بہار شروع ہوا ہے۔ گھاس کے اوگنے، بڑھنے اور کاٹنے کے قابل ہونے کو ابھی تو کئی دن لگیں گے۔ پھر گھاس جمع کرنے والا بھی کون ہے۔ میں تو لنگڑی لاچار۔ ہاتھ پاؤں چلانے اور تمہارا کام ہلکا کرنے سے معذور۔ ارے میرے اللہ اس کی زندگی سے تو موت ہی بھلی۔ خدا مجھے اٹھا بھی تو نہیں لیتا۔"

یہ تمنا اور دعا دن میں کئی بار دہرائی جاتی اور بہو کے منہ سے یہ جواب سننے میں بڑھیا کو بڑا اطمینان ہوتا۔۔۔

"اری اماں! ایسے منحوس کلمے کیوں زبان سے نکالتی ہو۔ تم جیو۔ تم نہ ہو گی تو ہم گھر بار کس پر چھوڑیں۔ گھر بلکہ کیسے آئیں گے؟ بچوں کی دیکھ بھال کون کریگا؟ پھر بچے دیکھو تو ایسے چلبلے کہ ادھر نظر چوکی ادھر انھوں نے کچھ نہ کچھ کر ڈالا۔ بول آنکھ پھری اور اور یہ چلے تلیا کی طرف۔ اماں مجھے تو اس نگوڑے تالاب کا ہمیشہ کھٹکا ہی لگا رہتا ہے۔"

یہ سن کر بڑھیا خوش ہو گئی۔ دیگچی کی سائیں سائیں اور بچوں کی گڑبڑ میں پرانی کھانسی سے دم لے کر اور گلا صاف کر کے بڑھیا بڑے اطمینان کے ساتھ بولی:۔۔۔

"ہاں یہ تو سچ ہے میں کچھ نہ کچھ کر ہی لیتی ہوں۔ وہ بڑے خراب ہیں۔ گھر کی دیکھ بھال بھی آخر ضروری ہے۔ بڑے چور اچکے تاک ہی میں تو رہتے ہیں لیکن منڈی کا لوگوں کو ابھی طرف جھانکنے تو دو۔ وہ سنو۔ بچا گیا بیٹی کے سارا اگا دن دوڑ پڑے ہائے کیا دن تھے ہمارے! ابھی کچھیلا ہے جب میں تمہاری عمر میں تھی ہم لوگ کھیت سے دھان لا کر دروازہ کے باہر ہی ڈال دیا کرتے تھے اور وہ صبح

تک جیوں کا توں وہیں پڑا رہتا تھا۔ دھوپوں میں جا کر باہر کا باندھ دیتے تھے کوئی چھیڑتا نہ تھا۔ صبح تھالی ہی پہ جگالی کرتے ہوئے صحیح سالم موجود۔ کیا مجال جو کسی کی نیت میں فرق آتا!"

بہو اس پر خوش مزاجی سے مسکراتی اور کہتی۔۔۔ "کیا سچ مچ ایسا اچھا زمانہ تھا۔ اماں؟"

یہ کہہ کر وہ بدستور اپنے کام میں مصروف ہو جاتی اور بڑھیا کے پرانے قصوں اور دن بھر کے دکھڑوں پر کان نہ دھرتی۔ بڑھیا اپنے زمانہ کی خوبیاں بڑی شان اور مبالغہ سے بیان کرتی۔ آج بھی وہ حسب عادت مسلسل اسی رنگ میں کہتی رہی۔ یہ تو ہر دور کا محبوب مشغلہ ہے۔ نوجوان ماں دل میں سوچنے لگی۔ سچ ہے ایندھن کے بارے میں ذرا احتیاط اور کفایت سے کام لینا چاہیے۔ باقی ماندہ ذخیرہ چند دنوں میں ختم ہو جائے گا جبکہ بونے کا زمانہ سر پہ آ رہا ہے۔ اس سے فرصت پا کر ہی میں درانتی لے کر جنگل جا سکوں گی۔ واقعی اماں کا کہنا ٹھیک ہے۔ ایندھن کم خرچنا چاہیے۔ اس کے اکٹھا کرنے میں کیا کچھ محنت نہیں لگتی۔

گو باورچی خانے کے دروازے سے لگ کر ہی کھلیان کے پاس صحن میں پیال کی دو گنجیاں کھڑی ہوئی تھیں اچھی طرح رچائی ہوئی اور مشعلہ بارش اور برف سے بچانے کے لئے چکنی مٹی کا ٹوپ چڑھا ہوا۔ میں نے سوچا پیال سے بھی کبھی کبھی مدد لی جا سکتی ہے۔ اس سے بہتر ایندھن ہوتا ہی کہاں ہے۔ کمی اس طرح پوری کر لوں گی۔ لیکن...... خود گھر کے ڈنگروں کے لئے پیال کا ایندھن بنانا ٹھیک نہیں۔ یہ تو شہر والوں ہی کو زیب دیتا ہے...... ہاں۔ اس سے تو ہمیں اڑے وقت کچھ پیسے ہاتھ آ جاتے ہیں۔ بچوں کے باپ نے اور میں نے پچھلے ہفتے ہی تو دو گٹھے شہر لے جا کر بیچے۔ کیسے کھنکھناتے ہوئے چار چاندی کے روپے ملے تھے! نا بابا پیال اپنے جلانے کی چیز نہیں۔"

یہی سوچتی ہوئی وہ خشک پتے اور تیلیاں چولہے میں ٹھونس ٹھونس کر آگ تیز کرتی رہی۔ آگ کی روشنی میں اس کا گول سڈول چکلا چہرہ دمک رہا ہے۔ رنگ کبھی سرخ گندم گوں تھا جس پر سورج کی تمازت اور گرم ہواؤں نے اپنے اثرات نہیں چھوڑے تھے۔ ہونٹ اور بھری ہوئی سیاہ آنکھیں آنچ کے سامنے خوب چمک رہی تھیں۔ چوڑی بڑی اور ابروؤں کے نیچے بالکل متوازی تھیں۔ ماں کو حسین تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اس کا چہرہ جہاں تیز جذبات اور گہرے عزم و استقلال کا پتہ دیتا تھا جاذب نظر ضرور تھا اور رعنائی سے خالی نہ تھا۔ وہ بظاہر بڑی غصیلی اور ہٹیلی تند خو نظر آتی تھی مگر تھی وہ ایک محبت کرنے والی بیوی، شفیق ماں اور اپاہج بڑھیا کی سچی رفیق

"ہم ایسے تھے" "ہم ویسے تھے" "اب یہ زمانہ آ گیا ہے"۔ اسی طرح بڑھیا برابر کہے جا رہی تھی گویا اس کی بہو بیٹی دلچسپی سے اس کی بکواس سن رہی ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ بڑھیا ہمیشہ گھر میں اکیلی رہتی تھی اسے کوئی بات کرنے والا ہی نہ ملتا۔ بچے البتہ گھر پر رہتے تھے مگر بچوں کا ساتھ بھی کوئی ساتھ ہے۔ بیٹا اور بہو دونوں کام کرنے کے لئے کھیت پر چلے جاتے۔ اب جو بہو اس کے ہتے چڑھی اس نے موقع کو غنیمت جانا اور زمانے کی اور اپنے تجربوں کی ساری باتیں ہو کر بتانے لگی نہ جانے کل کلاں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ دیگچی کی بھاپ کی سرسراہٹ کے ساتھ اس کا پوپلا منہ ہلتا رہا۔ کھانس کھانس کر گلا صاف کر کر کے اسی طرح باتیں کرتے کرتے کہنے لگی۔۔۔۔

"بیٹی میں تو ہمیشہ کہتی آئی ہوں مرد جب دن بھر کا تھکا ماندہ کام کاج کے بعد گھر لوٹے اسے اچھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے بیٹے ہی کو دیکھو نا! صبح سے شام تک کتنی محنت کرتا ہے۔ پسینہ کیا ہے بیٹی! لہو ہی تو ہے۔ میں کہتی ہوں چاول کی پیچ میں اسے ایک انڈا پھینٹ کر دیا کرو تو اچھا ہے۔ بیٹی! اس سے مرد کی کھوئی ہوئی قوت پھر آ جاتی ہے۔"

اب بچے شور مچا رہے تھے۔ چولہے کے پاس ماں سے لپٹ کر "کھانا" مانگ رہے تھے۔ ان کی چیخ پکار اور گڑبڑ میں بڑھیا کی آواز غائب ہو گئی اور چپکے ہو رہتی وہ اونگھنے لگی۔ ماں جلد جلد کھانا پکاتی رہی۔ بچہ کبھی بہن کا منہ چڑاتا۔ لڑکی اس کے جلد

کے لیتا۔ کبھی بیٹا کبھی وہ لیٹ جاتی۔ پھر دونوں ماں کے ساتھ کھینچا تانی کرتے اگر بچوں کی یہ گڑبڑ اور بڑھ جاتی تو ماں کی توجہ کو اپنے کام سے نہ ہٹا سکی۔ وہ خاموشی اور سکون سے اپنا کام کرتی رہی۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ آج بچوں کو ذرا دیر ہو گئی ہے تو جرتے بولنے لگے ہیں۔ کھیت پر خلاف معمول زیادہ رک جانا پڑا۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا لیکن سیم کے تھوڑے سے بیج بونے کو باقی رہ گئے۔ میں نے کہا انھیں ختم ہی نہ کر ڈالوں۔ ورنہ۔ گرم ہوا، بیج خراب ہو جائیں اور خشک راتیں چند روز میں نکل جائیں گی۔ بونے سے جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔ بیج جلد اگ جائیں گے اور عجب نہیں کہ بیلانے لگیں۔ گھر سے تو اطمینان ہے کہ آج جو رات کو ان خشک بیجوں میں زندگی پیدا ہو...... واقعی بیج بوئے گئے ہیں...... مگر چلو ایک کام تو ختم ہوا۔ کل تک سبز کونپلیں پھوٹیں گی۔ بچوں کا باپ بھی تو اب تک کھیت کے کام میں لگا ہوا ہے۔ ننگے پیروں سے گیلی زمین میں لگے ہوئے بیجوں کے آس پاس ہل چلا کر برابر کر رہا ہے۔ میں بھی بڑھ کر اس کا ہاتھ بٹاتی۔ لیکن بچوں نے مارے بھوک کے سر پر گھر اٹھا لیا تھا۔ مجبوراً ادھورا کام چھوڑ کر جلدی آنا پڑا۔ ... اب کھانا تیار ہوا ہی چاہتا ہے۔"

بچے بھوک سے تلملا رہے تھے۔ ادھر لڑکا آہستہ آہستہ بسور رہا تھا مگر آنکھوں میں تری نام کو نہ تھی۔ ادھر بچی ہاتھ چبا چبا کر چلا رہی تھی۔ بیچاری کا منہ جلانے اور مکھنے سے چونک کر تھوڑی دیر بچوں کو چپ کرنے کی کوشش کی مگر بالآخر ہار مان کر انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور بے پرواہی سے ان کا تقاضہ اور شکایتیں سنتی رہی۔ کبھی کبھی انھیں متوجہ کر کے دم دلاسا بھی دیتی مگر وہ کہاں ٹلنے والے! آخر ان کی جان ہی کتنی تھی۔ لڑکا پانچ سال کا تھا اور لڑکی تین سال کی۔ بچوں کو تو وقت پر ہی کھانا چاہیے۔ دیر ہو جائے تو تڑپنے لگیں بھوک سے بلبلا اٹھیں گی۔

تھوڑی دیر میں کھانا پک گیا۔ دیگچی کے سرپوش کے نیچے سے گرم گرم مزیدار خوشبو کی بھاپ نکل رہی تھی۔ جیسے ہی لڑکے کی ناک میں یہ خوشبو پہنچی اس کے سوکھے جبڑے ہلنے لگے اور منہ میں رال بھر گئی۔ اب اس نے اپنی بڑبڑ بند کر دی اور اطمینان کا سانس لیا۔ دیگچی کے نیچے آگ خوب تیز تھی اور اس کی تہ سے نکل کر روشنی ادھر ادھر پھیل کر دھوئیں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ماں بچے کو سرکی اور بچی کو بھی چولہے کے قریب سے ہٹا لیا مگر تیزی سے پھیلتا ہوا تلخ دھواں آخر بچی کی آنکھوں میں چلا ہی گیا۔ وہ میلے کچیلے ہاتھوں سے آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر رونے لگی۔ ماں نے جھٹ بچی کو گود میں اٹھا لیا اور دروازہ کے باہر لے جا کر کھلی ہوا میں چھوڑ آئی۔

"یہاں بیٹھ جا بیٹی!" وہ جاتے ہوئے بولی "میں ہمیشہ کہتی ہوں چولہے میں نہ گھسا کر۔ دھوئیں سے تیری آنکھیں دکھتی ہیں مگر تو مانتی ہی نہیں، چولہے میں گھسی چلی آتی ہے۔ ذرا یہاں تازہ ہوا میں بیٹھ اور آنکھیں کھولتی بند کرتی رہ۔"

بہو جب کبھی ایسی کوئی نصیحت کی بات کہتی بڑھیا بڑی توجہ سے سنتی۔ ایسے میں اسے بھی کچھ بولنے کا موقع مل جاتا۔ چنانچہ بول اٹھتی۔ "ہاں بہو میں نے بھی ہمیشہ کہا ہے بیٹی! میں بھی برسہا برس چولہا پھونکتی تو میری آنکھیں کیوں ضائع ہوتیں۔ اب تو ان کمبخت آنکھوں سے کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ دھواں بڑی بری چیز ہے۔ اسی سے تو میری بھلی چنگی آنکھیں جاتی رہیں۔ اور ہاں . . ."

مگر تو جری ماں نے گویا سنا ہی نہیں۔ بچی دروازے کے باہر زمین پر بیٹھی آنکھیں رگڑتی جاتی اور ساتھ ہی ساتھ روتی بھی جاتی تھی۔ آنکھیں اس بلا کی شوخ تھیں سرخ اور سوجی ہوئی ہوتی تھیں۔ جب کبھی آنے جانے والے ماں سے کہتے "تیری بچی کی آنکھوں میں کوئی روگ ہے" تو وہ کہہ دیتی "نہیں ایسی بات نہیں۔ میں جب کھانا پکاتی ہوں چولہے کے پاس یہ مجھ سے چمٹی رہتی ہے۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں دکھنے لگی ہیں۔"

بچوں کا چیخنا، پکارنا، رونا دھونا، واویلا کرنا اب اسے زیادہ پریشان اور متاثر نہ کرتا۔ اب اس کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ بچوں کو سنبھالنے میں لگی رہتی۔ بچے بھی تو جلد جلد یکے بعد دیگرے ہوتے گئے۔ پہلوٹا جب پیدا ہوا تھا اس کی ذرا سی چیخ ماں کا دل ہلا دیتی تھی۔ وہ بھاگی ہوئی جھپٹ کر آتی۔ گود میں اٹھا لیتی، چمکارتی، پیار کرتی۔ رفتہ رفتہ تجربے نے اس کو سکھا دیا کہ بچہ جب رونا شروع کرے تو جلد ہی کسی نہ کسی طرح اس کی تکلیف رفع کر کے اور آرام پہنچا کر اس کو منا ہی لینا چاہیے۔ ورنہ جہاں یہ سلسلہ ذرا طویل ہوا تو پھر ختم نہیں ہو پاتا۔ لیکن بچوں کا باپ

اس پر ناراض ہوتا کیونکہ کام میں بچوں کی خلل اندازی اسے ایک آنکھ نہ بھاتی۔ کام کرتے کرتے ماں کا بچہ کو لے بیٹھنا اسے سخت ناپسند ہوتا۔ اور وہ ڈانٹنے لگتا۔

"اری نامراد کبھی تو دل لگا کر کام میں میرا ہاتھ بٹایا کر۔ کام چھوڑنے کے لئے تجھے اچھا بہانہ مل گیا ہے۔ جہاں بچہ رویا تو چلی سمجھانے کے لئے۔ ابھی تو صاحبزادے ایک ہی ہیں۔ ابھی اور بیس سال میں نہ جانے کتنے بچے جنے گی۔ یوں ہی بچے بہلاتی رہی تو بس ہو چکی کھیتی باڑی سارا بوجھ مجھ پر ہی ڈال دیتی ہے۔ اری مردار تو کسی امیر کی تو جورو نہیں جسے ہاتھ ہلانے کی ہی ضرورت نہ ہو اور نوکر چاکر سارا کام کرلیں"۔

اس پر ماں جھلا اٹھتی اور خوب جلی کٹی سنا دیتی۔ شوہر کی طرح وہ بھی مزاج کی تیز تھی۔ تڑ سے جواب دیتی۔

"اتنی دیر سے تو زمین کھود رہی ہوں۔ سخت محنت کے بعد مجھے بھی دم بھر ستانے کا موقع کیوں نہ ملے؟ کیا تو کام کے بیچ ٹھیر کر حقہ نہیں پیتا؟ پھر میری محنت پر بھی کبھی غور کیا ہے تو نے؟ کیا تو بھی میری طرح نو مہینے پیٹ میں بچہ لے کر محنت کرتا ہے؟ کیا بچہ جننے کی تکلیف تجھے بھی اٹھانی پڑتی ہے؟ کیا میں بھی تیری طرح کھیت کے کام سے لوٹنے کے بعد ٹانگ پھیلا کر سو رہتی ہوں؟ مجھ تھکی ماندی کو کھیت سے واپس آتے ہی چولھے میں سر کھپانا پڑتا ہے۔ پھر بچوں کو کھلانا پلانا اور سلانا، بڑھیا کی خبر گیری کرنا۔ یہ سارے گھر کے کام کاج تو کرتا ہے یا میں؟ واہ رے واہ۔ آیا بڑا کام کرنے والا!"

اس طرح اکثر تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے ان میں چخ ہو جاتی۔ مگر نہ کسی کی جیت ہوتی اور نہ کسی کی ہار۔ برابر کی جوڑ تھی لیکن ایسے جھگڑے نہ دیرپا ہوتے اور نہ دور رس۔ کوئی نہ کوئی طرح دے دیتا اور معاملہ جہاں کا وہیں رفع دفع ہو جاتا۔ بچوں کے معاملے میں قدرت ذرا ماں کے ساتھ فیاضی واقع ہوئی تھی۔ یوں ایک بچے نے دودھ چھوڑا نہیں کہ دوسرا پیٹ میں آموجود۔ چند ہی ماہ ہوئے اس کی زچگی ذرا وقت سے پہلے ہو گئی تھی اور بچہ بھی چند سانسیں لے کر ٹھنڈا ہو گیا تھا مگر چند ہی دنوں میں دودھ خشک ہو گیا اور کوئی عجب نہیں کہ دوسرے کی بھی آمد آمد ہو۔

۲ بچوں کے بارے میں وہ سوچتی کہ ان کے پیچھے کوئی کہاں تک اپنی جان کھپائے۔ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دینا بہتر ہے..... روتے ہیں تو تھک کر چپ ہو جائیں گے۔ اب تو بچیا نہیں وہ دودھ بھی نہیں کہ بچی کے منہ سے لگا دوں اور اسے چپکا کر دوں..... بھوک پیاس کا معاملہ تو جب کھانا تیار ہو گا کھائیں گے۔ کہنے کو تو وہ دل میں یوں کہہ بیٹھتی لیکن تھی ماں کا بہت نرم۔ جہاں کوئی بچہ چیخا چلایا کوئی سا کام کیوں نہ ہو چھوڑ کر چیل کی طرح دوڑی آتی اور دیکھتی بچہ کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔

اب کھانا تیار ہو چکا تھا اور اس کی خوشبو اور بھاپ دھوئیں کے ساتھ شریک ہو کر سارے گھر میں پھیلنے لگی تھی وہ اٹھی اور ایک بڑا سا پیالہ صاف کر کے سب سے پہلے اس نے بوڑھی اماں کے لئے دلیہ نکالا اور برابر کے کمرے میں لے جا کر میز پر رکھ دیا۔ اور بڑھیا کو سہارا دے کر میز تک پہنچا آئی۔ کوئی سنے نہ سنے بڑھیا تو برابر کہے جا رہی تھی۔ "خیال سے ہو گا نا بیٹی تجھے؟ چاول میں مرچ شریک کر کے کچھ بھی پکایا ایسی مزے دار ہوتی ہے کہ بس کیا بولوں"؟

مگر ماں کچھ اور سننے کے لئے نہ ٹھیری۔ بڑھیا کو میز کے کنارے چوکی پر بٹھا کر چلی آئی۔ اس نے سوکھے ہاتھوں سے پیالہ تھام کر منہ لگایا اور سڑپ سڑپ دلیہ چاٹنے لگی۔ دلیہ پوپلے منہ سے گر گر ادھر ادھر بہنے لگا تو بڑھیا نے آواز دی۔

"ارے میری چمچ کہاں ہے؟ مجھے تو چمچ کہیں دکھائی ہی نہیں پڑتی۔ ارے ذرا کوئی میری چمچ تو دے جائے"۔ ماں نے اٹھ کر اس کے ٹٹولتے ہاتھوں میں اس کا چینی کا چمچہ جو سامنے ہی رکھا تھا اٹھا کر تھما دیا اور روٹھی کے پیالے اٹھا لائی۔ ایک میں دلیہ ڈال کر بانس کی چمچی کے ساتھ بچی کو دیا جو اب تک آنکھیں مل مل کر سسکیاں بھر رہی تھی اور جس نے اپنے مٹی سے اٹے ہوئے ہاتھوں سے اپنا ننھا چہرہ مٹیالا بنا رکھا تھا۔ ماں نے اس کو زمین سے اٹھا کر کھڑا کیا۔ ہاتھ تو خود اس کے بھی کچھ ایسے صاف نہ تھے۔ غرض جوں توں اس کا منہ پونچھا اور نرمی سے آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں صاف کرنے لگی۔ بچی کی آنکھیں ہاتھوں کی رگڑ سے سوج گئی تھیں اور پپوٹے الٹ گئے تھے۔ اس نے جھنجھلا کر منہ موڑ لیا۔ ماں نے اب اس کو زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور اس کے میلے کچیلے دامن سے آنکھوں کو صاف کر کے چھوڑ دیا اور اس کا پیالہ باہر

لے جاکر دروازہ کے پاس والی میز پہ دھر دیا۔ یہ ایک کھردری میز تھی جس پہ نہ رنگ تھا اور نہ روغن۔ یہ ہمیشہ دروازے کے پاس ہی باہر پڑی رہتی تھی۔ ماں بچی کو اٹھا کر بولی:—

"چل آ بیٹی۔ کھانا کھا لے۔ اب زیادہ رو دھو کر اپنی ننھی جان ہلکان نہ کر۔"

بچی گرتی پڑتی میز تک پہنچی اور اس سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں یوں بھی آنسوؤں سے بھری تھیں اس پر افق مغرب میں ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں جو اب بھی خاصی روشن اور تیز تھیں آنکھوں میں چبھنے لگیں۔ بچی نے آنکھیں بھینچ لیں اور ٹٹول کر پیالہ لینا چاہا۔ ہاتھ بڑھایا تھا کہ ماں بولی:—

"بیٹی ذرا صبر کر۔ دلیہ گرم ہے۔ منہ نہ جل جائے۔"

بچی رک گئی اور دلیہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ننھی ننھی پھونکیں مارنے لگی۔ ماں پاس کھڑی ہوئی شفقت سے اسے دیکھتی اور سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ وہ اپنے جی میں بول رہی تھی "اب کی جو اس کا باپ شہر میں پیال کا گٹھا فروخت کرنے جائے گا اس سے کہوں گی کہ وہ اسپتال کے پاس سے اس کی آنکھوں کے لئے کوئی ٹھنڈا انجن لیتا آئے۔"

بچی سے وہ فارغ نہ ہوئی تھی کہ لڑکا بھڑک اٹھا اور چیخنے لگا کہ ماں اس کو پوچھتی ہی نہیں۔ اس کا پیالہ اب تک بھر کر نہیں دیا گیا۔ ماں نے جا کر اس کا پیالہ بھی بھر دیا اور وہ کھانے لگا۔ اب کہیں جا کر گھر کے اندر کچھ سکون اور خاموشی ہوئی۔ وہ خود اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ کچھ کھانے کو جی نہ چاہا۔ ایک آہ سرد بھر کر وہ اٹھی اور دروازہ کے باہر ایک بانس کی چوکی ڈال کر کچھ دیر اس پر سستانے بیٹھ گئی۔ کچھ فراغت کا احساس ہوا تو اس نے اپنے لمبے بالوں کا جوڑا کھول لیا۔ کھیت کے کام سے بال خاک آلود اور پسینہ سے چپک گئے تھے۔ اپنی لمبی لمبی انگلیاں ڈال کر اس نے بال سلجھائے۔ گاؤں کا منظر دلآویز تھا۔ آس پاس کی پہاڑیاں جو اس وادی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھیں زرد و تاریکی افق کے پار سیاہ ہوتی جا رہی تھیں۔ اسی وادی کے بیچوں بیچ ان کا ہی کھیت تھا اور وادی کے اس کنارے اس چھوٹے سے قریہ کی جھونپڑیوں میں شام کے کھانے کی تیاری کے لئے چولہے روشن ہوتے جا رہے تھے۔ سیاہ دھواں دھیمی دھیمی ہوا میں آہستہ آہستہ بل کھاتا ہوا بلند ہوتا جا رہا تھا۔ یہ نظارہ کتنا سکون پرور تھا۔ ماں مطمئن تھی کہ دس بیس جھونپڑیوں کی اس چھوٹی سی بستی میں شاید ہی کوئی ماں اتنی مشقت کرتی اور بچوں پر اتنی جان چھڑکتی ہوگی۔ بعض چند سی خوشحال بھی تھے مثلاً ہوٹل کا مالک کافی مالدار تھا۔ اس کی بیٹی کانوں میں چاندی کی بالیاں پہنتی تھی اور ہاتھ میں انگوٹھیاں۔ ماں کو خیال آیا کہ کنوارپنے سے اسے انگوٹھیاں پہننے کی آرزو رہی جو ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے دل کو یوں تسلی دے لی۔ "انگوٹھیاں نہیں تو کیا ہوا۔ بندے بالیاں نہیں تو میرا کون ہرج ہو رہا ہے۔ میرا مرد سلامت ہے اور بچے خوش و خرم۔ کیا انھیں ننگا بھوکا رکھ کر میں بالیاں اور انگوٹھیاں پہنوں؟ لوگ کہتے ہیں کہ ہوٹل والا اپنے بچوں کو گاہکوں کا بس خوردہ کھلا کر پالتا ہے۔ میں تو اپنے کھلیان کا عمدہ چاول ان کو کھلاتی ہوں۔ البتہ بچی کی آنکھ سے ذرا تشویش ہے۔ خدا کرے وہ چنگی ہو جائیں پھر مجھے کچھ اور نہیں چاہئے۔ میرے بچے اللہ رکھے خاصے صحت مند اور تنومند ہیں۔ میرا بڑا بچہ شیطان کی آنکھ میں خاک دھول، ایسا دکھائی پڑتا ہے جیسے دس سال کا شیر کا بچہ۔ پروردگار تو نے بھلے ہمیشہ صحیح سالم تو مند بچے دیئے۔ آخری بچہ بھی اگر قبل از وقت پیدا ہو کر مرا نہ ہوتا تو اس وقت گھر میں رینگتا پھرتا۔"

یہ سوچتے سوچتے اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ مہینہ دو مہینہ میں پھر اس کے بچہ ہونے والا تھا۔ بات یہ خود فکر کی ہوتی ہے لیکن وہ سراسیمہ اور فکرمند نہ تھی۔ جیسے جیسے بچہ اس کے پیٹ میں حرکت کرتا اسی کو ایک گونا راحت اور مسرت محسوس ہوتی۔

اتنے میں اس چھوٹی سی دیہاتی سڑک کے اس پار ایک دروازہ کھلا جس میں سے دھواں لپٹ لپٹ نکل رہا تھا۔ یہ اس کے شوہر کے عزاد بھائی کا گھر تھا اور اسی کی بیوی کوڑا پھینکنے باہر نکلی تھی۔ ماں نے اسے آواز دی:—

"او ہو بھابی! تم ابھی پکا کر رہی ہو میں تو ختم بھی کر چکی۔"

"ہاں بھابی!" اس نے جواب دیا "تم بڑی محنتی اور سگھڑ ہو۔ تم جھٹ پٹ اپنا کام کر کے نچنت ہو جاتی ہو۔ مجھے تو ابھی چاول پکانے ہیں۔"

ماں بولی "نہیں بھابی! بات یہ ہے کہ میرے بچے جلد بھوکے ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد کھانا پکا کر انھیں کھلا دوں"
اپنے ہی اندر لے جاتے ہوئے بھابی نے کہا "نہیں ایمان کی بات ہے کہ بھابی تم جو سلیقہ مند اور ہاتھ کی تیز ہو میرے تو ابھی چاول بھی نہیں ابلے"
شام کے دھندلکے میں ماں کچھ لیے آرام اور سکون سے بیٹھی ہوئی نرم نرم ہوا اور غروب آفتاب کے سہانے سماں کا لطف اٹھاتی رہی۔ اس کا چہرہ قناعت اور سکون کا آئینہ تھا۔ اسے اطمینان تھا اس کے بچے اچھے تھے۔ خود اس کے ہاتھ پاؤں میں ابھی دم تھا اور میاں اس کا مضبوط اور نوجوان۔ غرض اس کے ہاں امن چین اور سلامتی کی فضا طاری تھی اور ایک اطمینان آفریں سکوت۔
"تھوڑا دلیہ اور دو ماں" بچے نے پیالہ بڑھاتے ہوئے اس سکوت کو توڑا۔ ماں نے اٹھ کر اس کا پیالہ پھر بھر دیا۔ اب کہ جو باہر نکلی تو دیکھا آفتاب اس کے کھیت کے پار جہاں وہ دن بھر شوہر کے ساتھ محنت کرتی رہی تھی، غروب ہونے کو تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درختوں کے بیچ ایک بڑا سونے کا طبق تھما ہوا ہے اور آہستہ آہستہ اندر دھنسا جا رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوجھل اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ سنہری روشنی میں کوئی اس طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ اس کا شوہر تھا۔ ہل ایک شانے پر دھرے دوسرے ہاتھ سے کوٹ کے بٹن درست کرتے ہوئے خراماں خراماں گھر کو لوٹ رہا تھا۔ اس کی سبک رفتاری ایسی تھی گویا کوئی بوجھ اس کے کندھے پر تھا ہی نہیں۔ ایک گنگناہٹ اس کے لبوں پر تھی جو رفتہ رفتہ الاپ میں بدل رہی تھی۔ گانے کا اس کو بڑا شوق تھا۔ آواز پائیدار تھی اور اس میں کافی لوچ بھی تھا۔ گیت بھی مزے مزے کے یاد تھے۔ فرصت کے دنوں میں چائے کی دوکان پر دوست احباب اس کو آ گھیرتے۔ فرمائش کر کر کے اس کے گیت سنتے۔ وہ شوق سے مزے لے لے کر گاتا۔ سننے والے بھی توجہ سے سنتے۔ اس سے لطف اٹھاتے اور اس کے دلپذیر راگ پر سر دھنتے اب جیسے جیسے وہ دروازے کے قریب آتا گیا گانا بھی دھیما ہوتا ہو گیا اور الاپ پھر دھن میں تبدیل ہو گئی۔ یہ اس کا چہیتا عشقیہ گیت تھا جس کی آواز بازگشت سے وہ خود لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دروازے کے پاس آ کر اس نے ہل شانے سے اتارا اور اسے دیوار سے لگا کر ۴
کھڑا کر دیا۔ بڑھیا جو پیٹ بھر کھانا کھانے کے بعد اونگھ رہی تھی چونک پڑی اور۔ اس طرح کہ گویا وہ لیٹی ہی رہنا چاہتی اور سلسلہ جاری تھا۔ کہنے لگی:—
"میں کہتی ہوں بیٹا! میرا بیٹا مٹر کی کھچڑی بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ چاول میں کچھ مٹر بھی ڈال دیا کر، اس سے کھچڑی بہت لذیذ ہو جاتی ہے"
بیٹا ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے ایک قہقہہ لگا کر بولا:—
"ہاں اماں! تم سچ کہتی ہو مٹر کی کھچڑی مجھے بہت اچھی لگتی ہے"
دروازے کے باہر ننھی لڑکی کھانا کھا کر پیالہ صاف کر کے خاموش بیٹھی تھی۔ اب سورج بھی چھپ چکا تھا اور وہ آنکھ کھول کر ادھر ادھر کھلے دیکھنے کی ہمت کر سکتی تھی۔ ماں پھر باورچی خانہ میں گئی اور گرم گرم کھانے سے پیالہ بھر کر مرد کے سامنے رکھا۔ یہ ایک کسر را پرانا سوندھا سا چینی کا پیالہ تھا جس پر سفید اور نیلے نقش و نگار رہتے سے اس کو لبالب بھرتے ہوئے ماں نے ایک انڈا بھی پھوڑ کر اس میں ڈال دیا۔ انڈے وہ بڑے جتن سے اپنے شوہر کے لئے بچا رکھتی۔ چاول کی بھاپ میں انڈے کی سفیدی منجمد ہونے لگی۔ انڈے وہ خود نہ کھاتی بچوں کو بھی نہ دیتی۔ دل میں کہتی کہ مرد دن بھر کڑی محنت کرتا ہے اس کو ضرورت ہے انڈے اور گوشت کی تاکہ قوت بنی رہے اور ہاتھ پاؤں چلا سکیں۔ لڑائی جھگڑے تو میاں بیوی میں کیسے دن ہوتے مگر شوہر کو مزے لے لے کر چٹخارے بھرتے ہوئے کھاتے دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو جاتا اور وہ پھولی نہ سماتی۔ لڑائی جھگڑا وہ سمجھتی زبان کا ہے دل کا نہیں۔ تاہم کبھی زبان پر بات تک نہ لاتی۔ وہ سلامتی کی امن ہے۔ تکرار کے وقت ترکی بترکی جواب دیتے اور شوہر کو سخت سست کہتے میں بھی وہ نہ چوکتی مگر اس کے آرام و راحت کے خیال سے کبھی غافل نہ ہوتی۔ شوہر مزے لے لے کر کھاتا رہا۔ پھر ماں سے بولا "تم کہتی تھیں نا اماں انڈے سے کھچڑی کی لذت بڑھ جاتی ہے"

سب اچھا

کو میں نے تمہارے بیٹے کے حلوے میں ایک تازہ انڈا پھوڑ کر ملا دیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ گڑ بھی کا کیسا اچھا جوڑ ہے۔ اب تو ہو گیا اطمینان تمہیں؟"

بڑھیا نے یہ سنتے ہی کہا "اچھا کیا بیٹی بہت اچھا کیا۔ کیا انڈا تازہ تھا؟ تب تو اور بھی اچھا ہوا۔ میں ہمیشہ مرد کو انڈا کھلانے پر زور دیتی رہی ہوں اور اگر انڈے تازہ تازہ گھر کے ہوں تو پھر ان کا کیا کہنا۔ یوں نوالہ حلق سے اترا نہیں کہ کھوئی ہوئی طاقت لوٹ آئی۔"

ماہنامہ شاہراہ دہلی

اردو زبان میں نئے ادب اور صحت مند ادب کا ایک روشن آئینہ

جسے ہر گھر میں ہونا چاہیے

ہندوستان میں اردو کا تنہا رسالہ ہے جو انسانیت دوست

شاہراہ ادب کا ذخیرہ چھ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ پیش کر رہا ہے

پرانے اور نئے ادیبوں کی بہترین کاوشیں پیش کرنے والا

شاہراہ

نہ صرف ہندوستان میں بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے

- سال میں ایک ہزار سے زیادہ صفحے
- تین خاص نمبر
- ۸ ہر فی جلد
- ۰۰ صفحے اور تصاویر
- زرِ سالانہ نو روپے
- ششماہی پانچ روپے

ایڈیٹر: ظ۔ انصاری — دفتر: اردو بازار۔ دہلی

چھ ماہ کی مسلسل محنت کے بعد

فنکار (دہلی)

اپنا خاص نمبر پیش کرتا ہے

(۴۰۰) صفحات اور (۲۵) تصاویر

پر مشتمل اس ادبی ذخیرے کو زندہ جاوید بنانے میں ملک کے چوٹی کے ذہنی فنکاروں نے اپنے قلم سے سیاہی نہیں خونِ جگر ٹپکایا ہے۔

ایڈیٹر: پرکاش پنڈت

سالانہ چندہ دس روپے، رجسٹری سے بارہ روپے — فی جلد

ششماہی — پانچ — چھ — ساڑھے تین روپے

مکتبہ فنکار۔ اردو بازار۔ دہلی

پیام تعلیم

پیام تعلیم کا نام ہی صحت مند حلوات کا ضامن ہے

بچوں کے پسندیدہ رسالے

پیام تعلیم کا سالنامہ بچوں کے لیے اس سال کا بہترین تحفہ ہوگا۔ یہ سالنامہ نومبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوگا۔

پیام تعلیم کا سالنامہ ۱۹۵۵ء باتصویر

چند لکھنے والے

مولانا اسلم جیراجپوری، حامد اللہ افسر، آل احمد سرور، نور الحسن ہاشمی، مرزا ادیب، مسعود حسین خاں
واثق جونپوری، حبیب تنویر، الیاس عباسی، سلامت اللہ، محمد یونس، ممتاز حسین
بیگم قدسیہ زیدی، یکتا امروہوی، ہاجرہ بیگم، سراج انور، نجمہ سلطان، وغیرہ وغیرہ

سالانہ چندہ مبلغ چار روپیہ ادا کرنے والوں کو یہ نمبر مفت ملے گا — قیمت ایک روپیہ

ادارہ: حامد علی خاں — اطہر پرویز

منیجر پیام تعلیم۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی

انور معظم

عورت کی موت[۱]

کردار

سہیل — اردو ادب کا نمائندہ
شمع — عورت
انجم — وہ کردار جو سہیل کی آنکھ میں بصیرت کا سرمہ بنانا چاہتا ہے
پروفیسر — اردو ادب کا وہ کردار جو عورت کے حسن اور ادب کے وقار دونوں سے مرعوب ہے۔
نجمہ — وہ بھی ہو ئی عورت جو اپنی صنف کی طرف سے فکر مند ہے۔
ثریا — نئے تقاضوں کا کچا مجسمہ جو نہیں چاہتا کہ کسی کا محبوب بنے۔

نجمہ: (شمع کا ہاتھ بغور دیکھتے ہوئے) لکیریں کہتی ہیں کہ تم ایک عورت ہو اور تمہاری شادی ایک مرد کے ساتھ ہوگی۔

شمع: (مسکراتی ہے) اور کیا کہتی ہیں لکیریں؟

نجمہ: کہتی ہیں کہ یہ مرد تم سے مل چکا ہے۔

شمع: یہ لکیریں نہیں تم کہہ رہی ہو ..... اور ایسی باتوں کا جواب تمہیں ثریا خوب دے سکتی ہے۔

(ہارن۔ موٹر رکنے کی آواز)

یہ کون آیا؟ نجمہ! دیکھو تو کہیں ثریا تو نہیں؟

نجمہ: (دریچے سے نیچے دیکھ کر تصدیق کرتی ہے) ہاں، وہی ہے بکمبخت یاد کے ساتھ آجاتی ہے۔

(پاؤں کی تیز چاپ قریب آتی ہے۔ ثریا داخل ہوتی ہے)

ثریا: شمع تسلیم! آہا۔ او۔ پروفیسرنی بھی موجود ہے۔ یا تو ہے نصیب جو ہم پھوٹے نصیبوں سے ملاقات ہو جائے۔

شمع: کیا بات ہے ثریا! بہت تھکی تھکی نظر آرہی ہو؟

نجمہ: ہاں جیسے ثریا بیگم ہمالہ سر کر کے چلی آرہی ہیں۔

ثریا: (ٹیکھے انداز میں) ارادہ، لو چھاج تو چھاج چھلنی بھی بولیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ تجھے پروفیسر نے آن! ہر کیسے نکلنے دیا؟.. (شمع سے) شمع! تجھے کچھ معلوم ہے؟

شمع: ہاں کہہ رہی تھی کہ میرا نام بتلایا تب کہیں، بڑی مشکلوں کے بعد پروفیسر نے یہاں آنے کی اجازت دی۔ ورنہ وہ تو کہہ رہے تھے ... ...

ثریا: (پروفیسر کے سے پیرائے میں) "اوہ! دیکھو تم نے پھر شمع کے گھر جانے کا نام لیا۔ تم ہی کہو تم پچھلی مرتبہ کب گئی تھیں؟ یہی ایک آدھ روز پہلے؟ کیوں ہاں! ..... ہے نا؟ اور اب پھر جانے کو تیار بیٹھی ہو ..... میں کہتا ہوں موسم خراب ہے، آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں، دن اداس،

---

[۱] یہ ڈرامہ ترمیم و اضافے سے قبل آل انڈیا ریڈیو (حیدرآباد) سے براڈکاسٹ ہو چکا ہے

راتیں خاموش۔ راستے اکیلے اور تم اکیلی۔۔ ۔ نہیں نہیں، تمہیں
میری قسم نہ جاؤ۔ بڑی اچھی ہے نجمہ میری!۔۔۔ کہو ایک شعر سنو گی!

نجمہ: (گھبرا کر ملی جلی ہنسی کے ساتھ) دیکھ رہی ہو شمع! کمبخت غضب
کرتی ہے۔

شمع: (ہنستی ہوئی) میں کہتی ہوں بیہ مرے گی بھی تو گلاب کی طرح ہنستی ہوئی

ثریا: (بکھلاتا شعر ختم کرتے ہوئے) اور اب بتلاؤ اے مرجھائی ہوئی
کلیو! تم آج کالج کیوں نہیں آئیں؟

شمع: نجمہ! جواب دو۔

نجمہ: توبہ ہے اس پھلجھڑی سے کون بات کرے

شمع: ثریا! کیا آج کالج میں کوئی خاص جلسہ تھا؟! تمہاری کوئی
تقریر ہونے والی تھی؟ سنا ہے تمہاری جادو کی تقریروں نے
کالج کے ہر ذکر و مونث کو مسحور کر رکھا ہے۔

ثریا: کیا خاک تقریریں ہوں۔ مجھے سکنڈ ہڑی بنے تین ماہ ہو چکے
کالج کے کرتا دھرتا نہ اب توجہ کرتے ہیں نہ جب۔ ان کی مدد
حاصل کرنے کیلئے دامن پھیلائے پھرتی ہوں مگر ہر جگہ سے کھا
جواب ملتا ہے۔ ادھر حوا کی بیٹیوں کا یہ حال کہ جلسوں کو کامیاب
بنانا اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ ایک جلسے میں جب میں نے اپنی تقریر ختم
کی تو پیچ ماز حال میں صرف ایک تالی بجی سنائی دے رہی تھی۔

(نجمہ اور شمع ہنس دیتی ہیں)

نجمہ: کیوں نہ ہو! کیوں نہو۔ ثریا بیگم ایسی قابل ہی تو ہیں۔

ثریا: پھول کی طرح کھلی جارہی ہو! جو ابھی کانٹوں کی طرح الجھ
پڑوں تو دامن چھڑانا مشکل ہو جائے۔

شمع: چپ بھی رہو نجمہ۔ ہاں ثریا! تم راوی کی طرح جاری رہو۔

ثریا: شاباش! دیکھو کتنی سعادت مند ہے شمع۔

شمع: (کسی قدر بگڑ کر) آخر لپیٹ لیا نا مجھ کو بھی ..... دیکھو ثریا!
کہے دیتی ہوں اگر......

ثریا: ہاں ہاں . . . دھمکی نہ دو شمع! تم سے بڑا ڈر لگتا ہے۔
(لہجہ بدل کر) خیر کام کی بات یہ کہ آج تم کالج نہ آئیں اور ایک
اچھا سا مشاعرہ کھو دیا۔

شمع: (جیسے بھول ہو گئی) توبہ اللہ ۔۔ میں تو بھول ہی گئی۔۔۔۔
(اشتیاق سے) کیسا ہوا مشاعرہ۔ کون کون آئے تھے؟

ثریا: مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔ اشعار معزز مہمانوں کی طرح غلط
دل میں چلے آرہے تھے۔ تحسین و آفریں سر بہ گریبان کرکے
کیا کہیے!

شمع: (ایک اندرونی استفسار سے بے چین ہو کر) کون زیادہ پسند کیا گیا۔

ثریا: سہیل۔

شمع: (چونک کر) سہیل!

ثریا: کیوں؟ تم چونک کیوں پڑیں؟

شمع: ہیں؟..... نہیں تو.....

نجمہ: ثریا! یہ آجکل سوتے جاگتے یونہی بہت چونکنے لگی ہیں۔۔

شمع: نہیں ثریا! سب جھوٹ ہے۔

ثریا: (شک پیدا ہوتا ہے) لیکن اس وقت کونسی خاص بات تھی نجمہ؟

نجمہ: یہ تو چونکنے کی شہ کھڑی ہے۔

شمع: نجمہ! (پریشان ہو جاتی ہے)

ثریا: ہوں! تو یوں کہو شمع نے اجالے کا جال پھیلا دیا ہے.....

شمع: (گھبرائی ہوئی) اللہ جانتا ہے ثریا! ..... (نجمہ کی طرف دیکھتی
ہے) نجمہ! نہ جانے تم دونوں کیا کیا سمجھ بیٹھی ہو۔

ثریا: ہاں جی۔ بڑی بھولی ہیں آپ! (لہجہ بدل کر) شمع!..... ادھر
دیکھو!..... ہم سے آنکھ ملاؤ..... یوں نہیں..... یوں...
ہاں اب کہو کیا بات ہے۔

شمع: (جلدی سے) بات کچھ نہیں ثریا! . . .

ثریا: (روکتے ہوئے) خبردار۔ خبردار جو کوئی بات چھپائی۔ تمہیں
تو معلوم ہے میں قیامت کی نظر رکھتی ہوں۔

شمع: (نہیں جانتی کہ کیا کہے کیا نہ کہے) اللہ جانتا ہے ثریا!

ثریا: ہاں اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ فی الحال میں جاننا چاہتی ہوں۔

شمع: (معصوم یقین آفرینی سے) یہ ثریا! کوئی بات نہیں (نجمہ کی
طرف دیکھتی ہے) نجمہ تم کہہ دونا!

نجمہ: (بے ساختہ) تو گویا اجازت ہے؟

شمع: نہیں نہیں..... وہ نہیں..... میرا مطلب ہے۔

ثریا: اچھا (سمجھتے ہوئے) تو یہ پروفیسر نجمی بھی شریک راز ہے (نجمہ سے)
نجمہ! یاد رکھو اگر تم نے کچھ چھپایا۔

نجمہ: بتاتی ہوں۔

ثریا: شاباش! چلو شروع کرو۔

نجمہ: تم خاموش ہو جاؤ۔ ہمہ تن گوش ہو جاؤ۔ اور سنو..... ایک دن رات میں.....

ثریا: نہ نہ..... دن میں یا رات میں؟..... ٹھیک ٹھیک بتاؤ...

نجمہ: توبہ ہے! تم کتنی بکی ہو گی؟ اور اب بیچ میں نہ بولنا..... سنا ہے ایک رات جب کہ کائنات سنگھار کر رہی تھی ایک شاعر وجد میں آیا۔ احساس بیدار ہوا۔ جذبات نے شعر کا لباس پہنا اور اٹھلاتے ہوئے لبوں پہ مچلنے لگے..... اتفاق دیکھئے وہاں ایک شاہزادی بہاروں کی سیر میں مصروف خرام تھی.....

شمع: (بے تاب ہو کر) خدا کے لئے نجمہ.....

نجمہ: شہزادی نے ایک پھول توڑا..... پھول لٹی بیکسی کا پیرہن، ادھر شاعر کا دل تڑپ اٹھا۔ ادھر شہزادی سہم گئی..... شاعر کا سلسلہ نگاہوں نگاہوں میں شہزادی کی آنکھوں میں پہنچا، آنکھوں نے اسے دھڑکا کر دل میں سمو دیا.....

ثریا: (مسکرا کر)..... آہ..... کیا راز کھلا ہے!..... یوں کہو شمع نے اپنے پروانے کو خود ڈھونڈ لیا۔

شمع: (بے چارگی سے) تم دونوں نے آج مجھے ستانے کی ٹھان لی ہے۔

ثریا: نہیں شمع! تو بیکار پریشان ہے۔ بعض تو ہمارے اڑے جاتے ہیں۔ اچھا ہے تو کہو نجمہ! کیا افسانہ دونوں طرف سے یا.....

نجمہ: یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ اتنا جانتی ہوں کہ انجم کی سالگرہ پہ جب ہم نے دعوت کی تھی تو اس میں سہیل بھی آئے تھے۔ وہاں ان دونوں میں کافی دیر تک بات چیت ہوئی تھی۔

ثریا: (سوچتے ہوئے) ہوں..... بات کافی آگے بڑھ چکی ہے..... کیوں شمع؟..... شمع!..... ارے یہ کدھر چلی گئی..... شمع!..... شمع!

(سازینہ بجتا ہے)

دوسرا سین

پروفیسر: شمع، شمع، شمع۔ ہر وقت شمع کا ذکر۔ ہر دل شمع کا نام ہے۔ آخر تم عورتوں کی دوستی اتنی گہری کیوں ہوتی ہے۔

نجمہ: یہی بات تو اس سے آپ لوگ کہہ اٹھے ہیں جاتے ہیں۔

پروفیسر: بھئی واہ! بالکل یہی بات کل انجم نے کہی تھی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ کئی روز سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب بھی پوچھنے کا ارادہ کیا اتنی ہی بار بھول گیا..... اور خدا کی مار پھر بھول رہا ہوں۔

نجمہ: توبہ ہے! یا تو آپ کہہ ڈالئے یا مجھے کچھ کہنے دیجئے۔

پروفیسر: ہاں دیکھو یاد آ گئی کمبخت۔ دراصل میں یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ تم مجھ سے جو بات کئی دن سے کہنا چاہتی تھیں وہ کیا ہے؟

نجمہ: بات یہ ہے کہ..... آپ سے ایک مشورہ لینا ہے۔

پروفیسر: (حیران) مشورہ! اور مجھ سے؟ (ہنستا ہے) اچھا بھئی مجھ سے اگر اتنی ہی خوش ہو تو ذرا زحمت۔ ہاں ارشاد۔

نجمہ: بات یہ ہے..... کہ..... اچھا پہلے یہ بتائیے شمع کیسی لڑکی ہے؟

پروفیسر: شمع! انجم کی بہن! خدا نظر بد سے بچائے، بڑی ہی اچھی لڑکی ہے۔ سلیقہ مند، تعلیم یافتہ، قابل لائق.....

نجمہ: اور آپ سہیل کو کس قدر جانتے ہیں۔

پروفیسر: سہیل! وہ شاعر! اسے تو میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔ بڑا ہی عجیب شاعر!..... اس کے دل میں حسن رہتا ہے اور عشق اس کے گھر کا نگہبان ہے۔

نجمہ: اگر یہ حسن مجسم ہونا چاہے..... تو؟

پروفیسر: کیا مطلب؟

نجمہ: یعنی اگر سہیل کے دل کو روشن کر دیا جائے تب؟

پروفیسر: روشنی کی قسم! میں کچھ نہیں سمجھا۔ اور صاف کہو۔

نجمہ: یہی کہ اگر..... (کمال کرتی ہے) اگر سہیل کے دل میں شمع روشن کر دی جائے..... تو کیسا رہے گا؟

پروفیسر: (آہستہ آہستہ دہراتا ہے) سہیل کے دل میں شمع..... (یکلخت سمجھ کر) سمجھ گیا۔ تم چاہتی ہو کہ شمع اور سہیل کو ایک کر دیا جائے..... ہا ہا کیسا اچھوتا خیال سوجھا ہے۔ سچ کہتا ہوں نجمہ! اگر تم نجمہ نہ ہوتیں تو ایک فلسفی ضرور ہوتیں۔

نجمہ: فلسفہ بعد میں چھانٹئے گا۔ یہ بتلائیے آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟

پروفیسر: میں کیا کر سکتا ہوں؟ (سوچتے ہوئے) میں کیا کر سکتا ہوں..... (ایک خیال آتا ہے) مگر..... کیا شمع اسے پسند کرے گی؟

نجمہ: (دکھ چک کر) ہاں ہو سکتا ہے کہ ...... شمع ہی کی پسند ہو۔
پروفیسر: تو یوں کہو تم سب کے گرکی ہو۔ سچ کہتا ہوں نجمہ اگر تم نجمہ نہ ہوتیں تو ایک کامیاب وکیل ضرور ہوتیں ......
اچھا میں شمع کے ...... ابا جان سے تو نہیں البتہ اس کے بھائی انجم سے اس کا ذکر کر دوں گا۔ انجم میرا شاگرد بھی تو رہ چکا ہے۔

(سازی وقفہ)

تیسرا سین

پروفیسر: یعنی ...... میرا مطلب تم سمجھ گئے نا انجم؟
انجم: جی ہاں پروفیسر صاحب! آپ اطمینان رکھیں۔ میں ابا جان کو راضی کر لوں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان باتوں کو خود میرا دل بھی محسوس کرتا ہے۔ زندگی کے ان بڑے مسائل کو صرف جبر ہی سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ اب ان میں دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہو چکی ہیں۔ اگر انہیں محسوس نہ کیا جائے تو زندگی کی مسرت دم توڑ دیتی ہے ...... اور ...... میں شمع باجی کی مسرت کو سدا سرسبز دیکھنا چاہتا ہوں۔
پروفیسر: معقول۔ بڑے سمجھدار ہو۔ آخر کو میرے شاگرد رہ چکے ہو۔
انجم: شکریہ۔ اب اجازت دیجئے۔
پروفیسر: خدا حافظ ...... سنا تم نے انجم! شمع سہیل کے دل کا اجالا بننے والی ہے۔ ویرانہ آباد ہو جائے گا۔ خاموشی بولنے لگے گی۔ نغمہ گانے لگے گا۔ کیسی دھوم مچے گی!

(شہنائی)

(سازی وقفہ)

چوتھا سین

(انجم داخل ہوتا ہے)

انجم: اچھا! باجی! کس آسمان پر ہو باجی؟
شمع: (داخل ہوتی ہے) کیا بات ہے؟ کیا آسمان گر رہا ہے؟ کیوں اتنے پریشان ہو؟
انجم: اف باجی! آپ نہیں جانتیں، میں صرف پریشان ہوں بلکہ بہت پریشان ہوں، الجھا ہوا ہوں، دنیا سے بددل ہو گیا ہوں۔ کیونکہ تم گھر سے کیا گئیں، چمن سے بہار چلی گئی، پھولوں سے مہک کھو گئی، خنک سے رنگینی چلی گئی۔
شمع: (دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ) آج تو شاعری بری طرح سوار معلوم ہوتی ہے۔
انجم: نہیں باجی! میں خود آجکل ہوائی گھوڑوں پر سوار رہتا ہوں ...... بے کلی مجھے اپنے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے ...... کیا ہوں ......
شمع: مذاق چھوڑو۔ بتاؤ امی اچھی ہیں، ابا واپس آ گئے؟
انجم: مذاق چھوڑا، ابا نہیں لوٹے۔ امی اچھی ہیں اور کہلوایا ہے "اچھی رہو آنکھوں کی روشنی دل کی راحت"!
شمع: ثریا اور نجمہ سے ملنے گئے تھے؟
انجم: گیا تھا۔ پروفیسر صاحب سے چند اچھے اچھے اشعار سنے مگر ملے۔ نجمہ آپا نے سلام کہا ہے اور ثریا؟ خدا بچائے عجیب لڑکی ہے۔ کانٹے دار جھاڑی کی طرح ہوتی ہیں کہ کوئی پاس سے گزرے اور الجھا لوں۔
شمع: (ہلکی ڈانٹ کے لہجے میں) انجم ...... یوں کسی پر تنقید نہیں کیا کرتے۔
انجم: تنقید نہ کروں تو کیا انہیں سر پر بٹھاؤں۔
شمع: لیکن انجم! کسی کو برا بھلا کہنا کتنی بری بات ہے۔
انجم: جی نہیں میں کسی کو برا بھلا نہیں کہتا۔ برا کہتا ہوں یا بھلا اور یہ دوسری بات ہے کہ مجھے بھلائی بہت کم نظر آتی۔
شمع: (ٹال کر) اوہ! تم نے تو بحث چھیڑ دی ...... مجھے تم سے کچھ کام تھا۔
انجم: مجھے معلوم ہے۔ سہیل بھائی جان کا کوئی کام ہوگا۔
شمع: نہیں ...... (ہچکچاہٹ کو چھپاتے ہوئے) یونہی کچھ دوا منگوانی تھی۔
انجم: (چونک کر) دوا؟ کس کے لئے؟ کون بیمار ہے؟
شمع: بیماری کوئی نہیں۔ یونہی میرے سر میں کچھ درد سا رہتا ہے۔
انجم: میں خوب جانتا ہوں باجی۔ آپ اپنی حالت چھپانے میں کمال رکھتی ہیں۔ سچ بتلائیے کتنے دنوں سے بیمار ہیں آپ ...... دیکھوں تو آپ کا ہاتھ۔

شمع: (محبت سے) چل بڑا ڈاکٹر بنا ہے ..... دیوانہ!
انجم: (پریشان) انگارستان کی قسم باجی! کتنا گرم ہے آپ کا ہاتھ۔ اور آپ کہتی ہیں کچھ نہیں ہوا
شمع: تو اب دوا لاتے ہو یا کسی اور سے منگواؤں
انجم: نہیں میری باجی! یہ میں چلا۔ لیکن باجی! .... یہ بھائی جان کہاں ہیں؟
شمع: (تامل کرتی ہے) وہ؟ ...... نگارستان میں ہوں گے۔
انجم: (اپنے آپ سے) باجی بخار میں جل رہی ہیں اور وہ نگارستان میں غزل لکھواں ..... وہ شاعر ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں؟

(سازی وقفہ)

پانچواں سین

نجمہ: سنیے! ...... (داخل ہوتی ہے) کہاں چلے گئے؟ ابھی تو یہاں تھے .....
پروفیسر: ا! ..... کیا کہہ دیا ہے ..... گناہ آگہی ..... نجمہ! ا! کیا خوب کہہ دیا ہے ظالم نے۔ میں نے کہا نجمہ! تم نے سنا؟ شاید تم نے نہیں سنا ..... پھر سے سنو ...... (نجمہ کے تیور دیکھتا ہے) ..... مگر ایسا معلوم ہوتا ہے آج ہنسی تم سے روٹھی ہوئی ہے اور تم اداسی کو سنوار رہی ہو۔ میں سچ کہتا ہوں نجمہ! اگر تم نجمہ نہ ہوتیں تو روتا ہوا بادل ضرور ہوتیں۔
نجمہ: (جو پروفیسر کی تقریر ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی) غالباً آپ کی بات ختم ہو گئی؟
پروفیسر: بالکل بالکل۔
نجمہ: اب بتائیے کہ سہیل صاحب کہاں ہیں۔ کس حال میں ہیں؟
پروفیسر: اس شاعر کا پتہ نشان پوچھتی ہو۔ اس کا کیا ٹھکانہ۔ وہ تو موت کی طرح مصروف رہتا ہے۔ ہمیشہ کسی سوچ میں نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی چیز کھو گئی ہے جسے پالینے کے لئے وہ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔
نجمہ: مگر اب انھیں کس چیز کی تلاش ہے؟ ..... شمع اور سہیل کی شادی کو بارہ ماہ گزر چکے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے اتنے ہی دور ہیں جتنا چاند سورج سے۔ شمع شاعر کے پاس ہے۔ وہ اس کی روشنی میں اشعار لکھتا ہے مگر اپنے دل میں روشنی نہیں کرتا۔
پروفیسر: (بات پر یقین نہ کرتے ہوئے) یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ ممکن ہے کہ اندھا آنکھیں پانے کے بعد بھی ان سے نہ دیکھے۔
نجمہ: اندھا ان آنکھوں سے دنیا کو تو دیکھ رہا ہے، لیکن ان آنکھوں میں چھلکتے آنسو کیونکر دیکھ سکتا ہے ..... شمع کب تک زبان بند رکھے گی!
پروفیسر: راستے سدا سیدھے نہیں ہوتے۔ مسافر بھٹک ہی جاتے ہیں۔ تم مطمئن رہو۔ سہیل ایک شاعر ہے۔ آج نہیں تو کل اسے اپنی غفلت کا احساس ہو جائے گا۔
نجمہ: خدا بہتر جانتا ہے۔ مجھے تو وحشت سی ہونے لگی ہے ... اچھا ..... میں ذرا ثریا کے یہاں ہو آتی ہوں۔
پروفیسر: اچھا جاؤ۔ میں تنہا بیٹھ کر تنہائی پر ایک نظم کہہ ڈالتا ہوں۔

(سازی وقفہ)

چھٹا سین

ثریا: کیا خوب لکھا ہے ..... (پڑھتی ہے ایک محویت کے عالم میں)۔ "آواز زندگی کا ثبوت ہے۔ نغمہ آواز کا گھر ہے۔ انسان اس گھر میں رہتا ہے۔ یہ گھر اسے عزیز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سنگیت کے بغیر زندگی بے جان ہے۔ یوں کہو موسیقی زندگی کا تنفس ہے۔ انسان دنیا میں آتا ہے اور راحت کو تلاش کرتا ہے۔ اسے راحت ملتی ہے مگر کب جب کہ آرزوؤں کی رونق ماند پڑ جاتی ہے ..... ہاں ..... راحت ..... آرزوؤں کی موت ہی کا نام ہے۔" (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) کیسے اچھے خیالات ہیں۔

(نجمہ داخل ہوتی ہے)

نجمہ: اور مشکل یہ ہے کہ یہاں آرزوؤں کی پیدائش کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو پاتا۔

ثریا: پروفیسرفا کی خدمت میں تسلیم! آج ہمارے جھونپڑے میں چاند کیسے طلوع ہوگیا؟

نجمہ: ستاروں کی خبر لینے چلی آئی تھی۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ ستارہ اوجِ ثریا پر ہے۔

ثریا: ہاں۔ وہ سہیل کے خیالات تھے..... نجمہ! شمع بڑی خوش نصیب ہے جو اسے ایسا جادوگر نصیب ہوا۔

نجمہ: شمع اور خوش نصیب!..... تم ساحل پر کھڑی موجوں کا تماشہ کر رہی ہو۔

ثریا: تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ سہیل وہ سہیل نہیں جو نظر آتے ہیں۔

نجمہ: نہیں بلکہ سہیل صرف وہی ہیں جو نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں۔

ثریا: (کھوئی ہوئی ایک سانس کے ساتھ) ہوں۔ نجمہ! چند روز ہوئے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے حیران سا کر دیا۔

نجمہ: سہیل کے متعلق؟

ثریا: ہاں۔

نجمہ: (اشتیاق سے) کون سا واقعہ؟

ثریا: وہ مجھے عجیب و غریب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ تو ہوا یوں کہ ایک ہفتہ پہلے میں تفریح کی خاطر نگارستان چلی گئی۔ وہاں میں نے ایک کنج میں سہیل صاحب کو دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں تھے۔ جونہی میں سامنے سے گذری، انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ پاس بلا لیا۔ کچھ دیر تک اچھی باتیں کیں۔ لیکن اس کے بعد بہکنے لگے۔ ایک عجیب سرور کے عالم میں تھے۔ مخمور نظروں سے تکتے ہوئے بولے:-

(سہیل کی آواز پیدا ہوتی ہے)

سہیل کی آواز — ثریا..... تم ثریا ہو؟ اور زمین پر؟..... (ہلکی ہنسی) میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں..... یہ تمہارے بال ہیں جن میں رات کی سیاہی گھلی ہے۔ تمہارا چہرہ، اس میں پہلی بارش کی شادابی ہے..... تمہاری آواز! اس نے شہد پی رکھا ہے۔ تمہاری باتیں! تم باتیں نہیں کرتیں منتر پڑھتی ہو..... صبح شام کا دھندلکا ہے تم جیم کی روشنی ہو..... (کھو جاتا ہے)

کون جانے کون پیارا ہے۔

ثریا: سچ کہتی ہوں نجمہ! ان کی ان باتوں سے میں اتنا گھبرائی کہ انھیں اسی نشہ میں چھوڑ کر چپکے سے چلی آئی۔

نجمہ: ہاں۔ ان کی اسی طبیعت نے تو شمع کی عمر گھٹانی شروع کر دی ہے۔

ثریا: پھر، اب کیا ہوگا؟

نجمہ: کیا ہوگا! یہی کہ شمع روتی رہے گا اور شاعر ہنستا رہے گا۔

(سازندی وقفہ)

ساتواں سین

سہیل: (ہنستا ہے) شاعر ہنستا رہے گا..... ہنستا رہے گا..... اور کیوں نہ ہنسے گا؟ شاعر دنیا کا تبسم ہے۔ ہاں شاعر دنیا کا تبسم ہے۔ (ہنسی) (آہٹ) کون آیا؟ تو میری دنیا میں کون آرہا ہے؟ شمع! تم کھڑی ہو؟..... خوب یاد آیا۔ تم کو میری ہنسی سے شکایت ہے۔ تم کہتی ہو کہ میں ہنستا

۴۱ ہوں اور تم کو ہنسنے نہیں دیتا۔ (ہنستا ہے) تم کہتی ہو کہ میں چپ رہتا ہوں اور تم سے اچھی باتیں نہیں کرتا — شمع! تم مجھ سے وہ مانگتی ہو جو میرے پاس نہیں ہے۔ جب تم میرے سامنے آتی ہو تو میں اپنے آپ سے دور چلا جاتا ہوں۔ میں تمہارا سراپا دیکھتا ہوں اور بے خود ہو جاتا ہے۔ تم میرے قریب آتی ہو تو جاتو ایک مرصع غزل میرے دل میں ڈھل جاتی ہے۔ تمہارے لب مجھ سے بات کرنے کے لئے کھلتے ہیں تو میں حیرت کرنے لگتا ہوں کہ پھول کیسے بات کرنے لگا ہے۔ تمہارے گیسوؤں کے سیاہ آبشار کو دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں رات ہو گئی۔ تمہاری صورت دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ چاند نکل آیا۔ آنکھوں سے آنکھیں چار کرتا ہوں تو ستارے بھڑک اٹھتے ہیں۔ دل لرز جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں چاند چمکتا ہے اور تارے بھی دمکتے ہوں، یہ کیسے ممکن ہے معبود!!

شمع: (درد کروٹ بدلتا ہے) کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ مجھ کو پہچانیے۔ میں تو شمع ہوں آپ کی شمع۔

سہیل: ہاں تم شمع ہو۔ اسی لیے تمہاری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کون جانے تم جلا ہی دو مجھ کو۔ تم کو مجھ سے دور ہی رہنا چاہیے ...... وہ دیکھو آسمان پر چاند سب سے دور ہے ۔ مگر ۔ سب کے دل میں ہے! تم میرے دل میں نہیں رہو گی؟ بولو' جواب دو..... تم خاموش ہو ۔ نہیں بولتیں مجھ سے؟ ۔ (زیر لب) کتنی ظالم ہو تم۔

شمع: (تڑپ کر) سہیل۔

سہیل: دیکھتیں نہیں، کتنا گہرا سکوت ہے ..... جیسے کسی ویران جزیرے میں قدرت کی لاش بے گور و کفن پڑی ہو.... چاروں طرف سناٹا.... اور اکیلا چاند...... اتنا بڑا آسمان اور اس میں اکیلا چاند! بے چارہ چاند اور ہم زمین والے اسے اپنی تنہائی کا ساتھی سمجھتے ہیں..... تم بھی ایسے ہی لگتی ہو نا شمع!

شمع: (پھوٹ پڑتی ہے) چاند سے میرا ساتھ؟..... یہ مجھ سے کہہ رہے ہو؟ (سسکیاں)

۴ سہیل: تم سے نہیں تو کس سے کہوں؟ تم چاہیے جواب دو چاہے چاہے خاموش رہو۔ تمہاری مرضی تم خاموشی رہو گا حسن خاموش رہے گا۔ خاموش..... خاموش حسن کتنا عجیب ہوتا ہے۔

شمع: (سسکیوں میں) بہت اچھا میرے شاعر! میں خاموش رہوں گی۔ چاند کی طرح اکیلی اور کرن کی طرح خاموش رہوں گی!

سہیل: خاموش ہو گئے۔ شمع خاموش ہو گئی۔ اب اندھیرا ہے۔ چاروں طرف..... گھور اندھیرا....

(سازی وقفہ)

آٹھواں سین

انجم: بھائی جان کی خدمت میں تسلیم!

سہیل: (بغور دیکھتے ہوئے) انجم؟ ہاں..... ہو بہو انجم...... جھل مل' جھل مل' ابھی سامنے ابھی اوجھل۔

انجم: باجی کہاں ہیں؟

سہیل: بڑے پریشان دکھائی دیتے ہو؟

انجم: (دل کی جلن دبائے ہوئے) میں آپ سے بھی کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ لیکن باجی کہاں ہیں؟

سہیل: انجم کو شمع کی تلاش ہے۔ خود ڈھونڈ لو۔

انجم: باجی..... (اور چلاتا جاتا ہے) باجی!

(شمع اندر ایک کمرے میں کوچ پر لیٹی ہے۔ کوچ دریچے سے متصل ہے دریچے سے چند زرد پھول جھانک رہے ہیں۔ پھولوں نے یہ زردی شمع سے مستعار لی ہے۔ انجم کی آواز سنتی ہے پر اٹھ نہیں سکتی۔)

شمع: کون؟

(انجم داخل ہوتا ہے)

شمع: انجم؟ میرا بھیا!..... آ ہی گیا آخر..... آؤ..... آؤ میرے پاس..... یہ تم میری صورت کیا تک رہے ہو؟ کوئی نئی بات دکھائی دے رہی ہے کیا؟ جیسے کچھ ہو گیا ہے مجھے ..... (ہنسنے کی کوشش کرتی ہے)..... دیوانہ.. ..... میں تو بالکل اچھی ہوں۔ ہنستی ہوں، بولتی ہوں..... اپنے انجم سے باتیں کر سکتی ہوں..... اور...... اور..... ہائے انجم! مجھے اس طرح نہ دیکھ..... (نڈھال ہو جاتی ہے۔) میں اچھی ہوں انجم' بالکل اچھی ہوں.......

انجم: (آہستہ آہستہ) آپ اچھی ہیں..... آپ اچھی ہیں باجی؟... آپ جو ہمیشہ دوڑ کر مجھے سینے سے لگایا کرتی تھیں آج میرے دس ماہ بعد ملنے پر میرے استقبال کے لیے بستر سے اٹھ بھی نہ سکیں..... یہ زرد چہرہ..... سوکھے بال..... سہمی ہوئی آواز..... ! ۔ نہیں نہیں ۔ یہ آپ نہیں باجی! تصویر کے رنگ اڑ چکے، صرف خاکہ رہ گیا ہے۔

شمع: (پاس بچھا جاتی ہے) کیسے سمجھاؤں اسے۔ میں وہی ہوں انجم! تیری شمع باجی۔

انجم: مجھے معلوم تھا۔ جب میں یہاں سے جا رہا تھا اسی وقت آپ نے مجھ سے دوا منگوائی تھی۔ آپ نے اپنے انجم سے اس وقت کچھ نہیں کہا۔ (بے تابانہ) کس مرض نے آپ کو پسند کیا ہے۔ باجی؟

ح: کسی نے نہیں۔ مجھے کوئی مرض نہیں۔ مان لو انجم۔
م: کیسے مان لوں باجی؟ ـــ باجی اب کوئی بات راز نہیں۔ تحریا اور نجمہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ کو اس حالت میں پہنچانے والے صرف بھائی جان ہیں۔
ح: ان کا نام نہ لاؤ انجم۔
م: انہی کی مرضی نے آپ کو شمع کی طرح پگھلایا ہے۔
ح: میں عورت ہوں۔ اور عورت نے ہمیشہ مرد کی مرضی کا انتظار کیا ہے۔
م: جھوٹ ۔۔۔ کون کہتا ہے کہ عورت انتظار کرتی ہے۔ یہ مرد کا جادو ہے جو عورت کے سر چڑھ کر بول رہا ہے عورت کا مقام ہمیشہ فاتح کا مقام ہوا کرتا ہے اور یہ مقام مرد کا بخشا ہوا نہیں فطرت کا عطا کیا ہوا ہے۔
ح: لیکن عورت نے اس مقام کو خود کبھی طلب نہیں کیا۔
م: وجہ؟
ح: عورت مرد کی شکست کا سبب بننا گوارا نہیں کر سکتی۔
م: (تلخی سے) افسوس! یہ عورت کی جانی پہچانی بھول ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ عورت کی اسی کمزوری نے مرد کو زود رسا اور بیکار رکھا ہے اور اب..... میں ایک ایسے ہی مرد کے پاس اس کی طاقت کا بھرم کھولنے جا رہا ہوں۔
ح: ٹھہر جاؤ انجم!
م: نہ روکئے باجی! میں آپ کی آنکھوں کو روتے نہیں دیکھ سکتا میں وہ آنکھیں کھولوں گا جنھیں آنسوؤں سے بیر ہے۔ شمع سحر ہونے سے پہلے نہیں بجھے گی۔
ح: تم طوفان جگانے جا رہے ہو انجم! ـــ نہ جاؤ! ایسا نہ ہو کہ سحر ہونے سے پہلے ہی شمع [illegible] کر رکھ دیا جائے ...... انجم!

(سازی وقفہ)

نواں سین

ل: آ گئے؟ دیکھ لیا شمع کو؟
م: دیکھ لیا۔

سہیل: کیسی ہے؟
انجم: (جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے) کیسے کہوں؟
سہیل: نہیں کہہ سکتے؟..... (ہلکی ہنسی) ..... ہاں ..... تمہارے پاس وہ آنکھ کہاں؟ میرے پاس وہ دل ہے جو آنکھیں بھی رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف تمہیں اور شمع کو بلکہ تمہارے اور شمع کے جذبات کو بھی دیکھ سکتا ہے۔
انجم: نہیں شاعر! اگر یہ سچ ہوتا تو تمہاری آنکھیں اتنا بڑا دھوکا کبھی نہ کھاتیں۔
سہیل: دھوکا؟..... تمہیں معلوم نہیں؟ ـــ میں نے ان آنکھوں میں معصومیت کا کاجل چھپا رکھا ہے
انجم: مجھے ڈر ہے شاعر! کہیں یہ جل ان آنکھوں سے بہہ کر تمہارے دل کی گنہگاری کو نمایاں نہ کر دے ..... شاعر!
سہیل: کہو!
انجم: تم نے کبھی روتی ہوئی شمع دیکھی ہے۔
سہیل: روتی ہوئی۔
انجم: ہاں جس کے سینے میں شعلہ سویا ہوتا ہے۔ جب یہ شعلہ جاگ اٹھتا ہے تو روشنی دینے لگتا ہے۔ وہی شمع جو کسی کی زندگی میں اجالا کرنے کے لئے اپنی حیات کو پگھلا دیتی ہے۔ جس کا کام خود جلنا اور دوسروں کو جلانا ہوتا ہے۔
سہیل: (بے خود ہو کر) انجم! حسن کو بیان تم کر رہے ہو اور میں جھوم رہا ہوں۔ حسن ہی میری زندگی ہے۔ عشق کو زندہ رکھنے کیلئے اس کی روح قبض ہو جانا ہی بہتر ہے۔
انجم: (جیسے دل پر دہکتا انگارہ رکھ دیا گیا ہو) اتنے زہریلے ڈنک نہ چلائیے بھائی جان! کیا اسی دن کے لئے آپ نے باجی کو اپنایا [illegible] صرف اپنی شاعری کو آب حیات پلانے کیلئے آپ اس کی حیات گھٹا رہے ہیں۔
سہیل: تم شمع کا ذکر کر رہے ہو؟..... شمع! وہ تو میرے تخیلات کی دنیا ہے۔
انجم: اور پھر تم اسے اجاڑنے پر تلے ہو۔ جانتے ہو شاعر! اگر اس دنیا میں قیامت آ جائے تو تمہارا جینا کیونکر ممکن ہوگا۔

سہیل: اس دنیا کا پروردگار میں ہوں۔ اس دنیا میں قیامت برپا کرنے کے لئے بھی میری مرضی کی ضرورت ہے۔

انجم: نہیں شاعر! خدا کی قسم تم اس دنیا کے ناخدا تو نہیں مگر ایک ڈوبتی کشتی کے نادان ناخدا ضرور ہو۔ شمع کو کیا معلوم کہ اس نے جسے اپنا کھویا چاہا ہے وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی کشتی کے بادبان گرا چکا ہے۔ وہ کیا جانتی تھی کہ تم موجوں سے لڑنے والے ملاح نہیں بلکہ موجوں کی سرکشی کا لطف اٹھانے والے شاعر ہو۔ کون جانتا تھا۔ کہ ساگر کی اتھاہ گہرائیوں سے ساحل تک بچا لے جانے والا جیون ساتھی پانی کی پہنائیوں سے ہی مسحور ہو کر رہ جائے گا۔

سہیل: پھر شمع مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ کیا اسے ایک پروانہ کی ضرورت تھی؟

انجم: ہاں ——— تم محسوس نہیں کر سکتے؟ شمع کی قدر پروانے کے طواف ہی میں پوشیدہ ہے۔ لیکن شمع کو پروانہ نہیں ملا۔ اسے کیا ملا؟ ——— سنو، مجھ سے سنو! ——— اس نے بادل کے چمکتے ہوئے کناروں کو دیکھا اور سمجھ بیٹھی کہ اس بادل کے پیچھے چاند چھپا ہوا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ وہ چاند نہ تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی منو۔ ہچکیاں تھیں۔ جونہی سورج غروب ہوا، بادل تاریک ہوئے اور اس اندھیرے میں شمع جلنے لگی ——— مگر اسے پروانہ نہیں ملا۔ اسے کیا ملا؟ ——— سنو! مجھ سے سنو! ——— کھجوروں کے ہجوم میں تاروں کے چھاؤں میں، چاند کی چاندنی میں، اس نے ایک مرمریں بت کو دیکھا اور مسحور ہو گئی۔ مگر جونہی وہ آگے بڑھی بت کی سرد سنگی ضرب نے اسے بے جان سا کر دیا۔ وہ اس کے سرد سخت پیروں کو پکڑ کے رونے لگی ——— شمع رونے لگی۔

سہیل: (شاعر کے جذبات میں ایک ان جانی ہلچل پیدا ہو چکی ہے) انجم تم میری روح کو زہر دینا چاہتے ہو۔

انجم: ہاں میں وہی عمل تمہارے ساتھ کرنا چاہتا ہوں جو تم نے میری باجی کے ساتھ کیا ہے۔ تم باجی کے قاتل ہو۔ تم نے شمع کو زہر دیا ہے!

سہیل: (الفاظ دہراتا ہے) میں نے شمع کو زہر دیا ہے؟ ...... (کانپ کر) کیسے خوفناک الفاظ ہیں.... نہیں نہیں۔ میں نے زہر نہیں کچھ اور دیا ہے..... کچھ اور دیا ہے .... میں بتلاؤں میں نے، ایک شاعر نے، ایک عورت کو کیا دیا ہے ...... آہ ...... یہ میرے دل سے پوچھو ..... لو! اب میرا دل کچھ کہنے لگا ہے۔ غور سے سنو۔ وہ کہہ رہا ہے۔

میں بہت امیر تھا، بہت امیر۔ میرے پاس
اتنی دولت تھی کہ دولت میرے آگے اپنا
دامن پھیلائے رکھتی تھی۔ سونے اور چاندی
کے دیوتا میرے درشن کے لئے دلوں ترستے
تھے۔ کیوں نہ ترستے؟ میرے پاس جو کچھ
تھا وہ انمول تھا...... پوچھو میں کیا نہیں
تھا! ——— میں دنیا کا پروردگار تھا۔ میرے
قبضے میں سات سمندر اور سات آسمان تھے۔
پھول میرے لئے کھلتے۔ بلبلیں مجھ کو رجھاتیں
چاند سورج میرے لئے طلوع ہوتے۔ تارے
مجھ سے میری راتیں مانگتے..... مگر! شمع
نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ میں نے بے مانگے
اسے سب کچھ دے دیا
میں نے اپنے آنسوؤں کو اکٹھا کیا اور شمع
کے بالوں میں موتیوں کی طرح پرو دیا۔
میں نے چاند کو آسمان سے اتارا اور
کہا "دیکھو چاند! انھیں راتوں میں طلوع ہونا۔"
آسمان پر تارے جھلملا اٹھے۔ میں نے کہا
"شمع جہاں نظر کرے تم وہاں کھل جانا!"
سات سمندر بل کھانے لگے۔ میں نے انھیں
سنبھالا اور شمع کی مدھ بھری آنکھوں میں بہا دیا
گلشن میں پھول کھلے۔ میں نے انھیں سجا دیا

۴۴

"دیکھو اب شمع ہی تمہاری تر و تازگی ہے۔"
یہ سن کر بلبل چلا اٹھی۔ میں نے اسے
شمع کی زبان بنا دیا!
...... انجم! سنا تم نے؟ میں نے شمع کو اپنا سب
کچھ دے ڈالا۔

(شاعر نے عورت کو کائنات کا سنگھار
دے ڈالا۔ مگر...... تنہا اب بھی نامکمل
ہے۔ اس تکمیل کو عورت کا دل محسوس کرتا
ہے۔)

انجم: شاعر! تم نے شمع کو سب کچھ دے دیا۔ تم نے حسن کو سمیٹا اور شمع پہ سے نچھاور کر دیا۔ مگر اس کے بعد؟ کیا ہوا جانتے ہو؟ — لو اب میں کہتا ہوں۔ سنو! یہ آپ کسی اور سے سننے کو نہ ملے گی — تم نے اپنی راتیں اس کے سپرد کر دیں۔ کیا تم نے سوچا کہ ان میں کتنا سناٹا ہے۔ کتنی اداسی ہے...... اس کا دل کیسا گھبراتا ہو گا ان راتوں میں شاعر —

سہیل: تم ایک نئی بات کہہ رہے ہو انجم!

انجم: تم نے اسے چاند دے دیا۔ لیکن نہ جانے کیسا بھولپن تھا کہ چاندنی اپنے پاس رکھ لی۔ چاند ہو چاندنی نہ ہو تو ایسے چاند کو کیا کہتے ہیں۔ جانتے ہو شاعر؟ — راکھ — جلی ہوئی راکھ! تم نے اسے چاند نہیں، دل کی چنگاریاں چھپانے کے لئے گرم گرم راکھ عطا کی تھی شاعر!

سہیل: (بے بسی سے) کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

انجم: تم نے شمع کی آنکھوں کو خشک پایا اور ان میں سات سمندر بہا دیئے۔ مگر شاعر تم نے وہ شور نہیں سنا جو ان سمندروں نے طوفان لا کر برپا کر رکھا ہے؟

سہیل: میں نہیں سن سکتا انجم! — بس کرو۔

انجم: تم نے پھولوں کو تر و تازگی دی تھی۔ نادان شاعر! تمہیں کیا معلوم کہ یہ پھول مدت ہوئی مسکرانا بھول چکے۔ ان کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ خوشبو اڑ چکی۔ اب ان میں اور کاغذی پھولوں میں کوئی فرق نہیں۔

سہیل: (انتہائی کرب سے) تم کب تک کہتے رہو گے انجم

انجم: شمع کو تم نے ایک بلبل بھی عطا کی تھی (تلخ ہنسی) اسے پھولوں کے چمن میں نغمہ سرا ہونے کے لئے تم نے بلبل کو آشیانہ بنایا گیا تھا! لیکن میرے شاعر! کبھی شمع کے دل سے کان لگاتے تو تم سنتے کہ اس دل میں سوائے بلبل کی آہ و فغاں کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔

سہیل: میرے دل میں آگ بھڑک اٹھی ہے انجم!

انجم: آگ کو دبائے رکھو۔ تم نے تاروں سے کہا تھا کہ شمع کی نظروں کے ساتھ کھل جانا (ہنسی) شمع کی زندگی کے اے نادان یہ وردگار! تو نے یہ تارے اس کی راتوں کو منور کرنے کے لئے دیئے تھے لیکن کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کی راتیں کہیں ان تاروں کو گنتے گنتے ہی نہ کٹنے لگیں۔

سہیل: میں جل رہا ہوں۔ میں جل رہا ہوں۔

انجم: تم جل رہے ہو؟ — کیسی ہوتی ہے یہ جلن؟ — وہ
۴۵ بھی شمع بن چکی ہے۔ مرتی شمع — شمع — شمع —

(شمع چلی آتی ہے)

شمع: (ڈوبتی ہوئی آواز میں) آپ! ہاں آپ ہی تو تھے... آپ ہی کی آواز تھی۔ آپ نے مجھے بلایا ہے۔ میں آ گئی سہیل! مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟ — دیکھو نا! میں تو چل بھی نہیں سکتی......

سہیل: (شاعرانہ بصارت کھو کر شمع کو پہلی مرتبہ عورت کے روپ میں دیکھتا ہے) آہ شمع! آج تم کیسی نظر آتی ہو۔

انجم: لو دیکھ لو شاعر! اگر پہلے نہیں دیکھا تھا تو آج دیکھ لو تم بھی کیا یاد کرو گے کہ انجم نے تمہیں چلتی پھرتی شمع دکھائی ہے جو وقت پڑے تو بول بھی سکتی ہے۔

شمع: سہیل! تم خاموش کیوں ہو؟ مجھے ہول آ رہا ہے۔ ...... تم چپ کیوں ہو میری راحت!

انجم: راحت (قہقہہ) سن رہے ہو شاعر! شمع کی راحت (قہقہہ)

شمع: سہیل، بولو...... ہنسو۔ دیکھو! میں بھی ہنس رہی ہوں۔

انجم: (قہقہہ) دیکھ رہے ہو شاعر! شمع پگھل رہی ہے اور
ہنس رہی ہے..... تماشہ ہے!! (قہقہہ)

شمع: انجم! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ پاگلوں کی طرح کیوں ہنستا ہے؟

سہیل: (مدہوش) پاگل؟ کون پاگل ہے؟ انجم یا میں؟.....
(لہجہ بدل کر) شمع! انجم کہتا ہے میں نے تمھیں شمع بنا کر
جلایا ہے۔

شمع: سچ تو کہتا ہے انجم!

سہیل: (لڑکھڑا کر) سچ کہتا ہے؟!

شمع: ہاں، تو کیا ہوا؟..... تم اداس نہ ہو میرے شاعر!.....
شمع کا کام ہی جلنا ہے۔ اگر شمع نہ جلے تو اجالا کیسے ہوگا
اور اجالا نہ ہو تو انسان دیکھے کیونکر؟ یہ قدرت کا
قانون ہے سہیل! پھول ایک مرتبہ مرجھاتا ہے تاکہ تم
دوسری مرتبہ مسکراسکو۔ اس پھول پر ترس کھاؤ گے
تو پھول ہی پر ظلم کرو گے۔ سمندر اپنی روح کھو کر بادل
بنتا ہے۔ بادل قطرے بن بن کر برس جاتا ہے۔ ہر بوند
ایک ایک کونپل بن کر دھرتی کے سینے پر کھل اٹھتی ہے
.....اس دنیا میں ایک کی موت دوسرے کی تخلیق کا
پیغام ہے — سن رہے ہو شاعر!

سہیل: (بے خودی کے عالم میں) کہتی جاؤ۔ میری دنیا سنور
رہی ہے شمع! کہتی جاؤ۔

شمع: میرے شاعر! میں شمع تھی۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا۔
.....میں آج سے نہیں ہزاروں سال سے اسی طرح جلتی
رہی ہوں۔ میرا نام عورت ہے۔ جس وقت دنیا ختم
ہو گی اور خداوند قدوس دنیا کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا
تو ہر نئے باب کی سرخی عورت کے خون سے لکھی جائیگی۔
عورت کے خون ہی نے تاریخ عالم کو رنگین بنایا ہے۔
اگر تم نے میری جان لے کر اپنی شاعری کو زندہ رکھا تو
کیا برا کیا۔

انجم: کیا ہو رہا ہے آپ کو باجی! ہوش میں آئیے۔ بھائی جان
کچھ کیجئے! ورنہ شمع وقت سے پہلے خاموش ہو جائے گی۔

سہیل: جا رہی ہو شمع؟ لیکن خدارا بتلاتی جاؤ کہ جب تم نے
میرا سب کچھ لے لیا تو میرے سینے میں اب تک میرا
کیوں دھڑک رہا ہے؟

شمع: تم سدا مدہوش اور بے خبر ہو شاعر! تمہارا دل
سینے میں کہاں؟ وہ میرے پاس ہے۔ تم اس کے ٹکڑے
ٹکڑے کر کے اپنی دولت کی شکل میں مجھے دے!
تمہارے سینے میں اب صرف میرا پیکر ہی جیتا پھرتا ہے
جا رہی ہوں لیکن جاتے جاتے تمہاری دولت تمہیں دے
جاؤں گی۔ تمہارا دل دوبارہ زندہ کر تی جاؤں گی

سہیل: شمع! تم خاموش ہوئی جا رہی ہو، تم میری شاعری
کا عنوان تھیں۔ نہ جاؤ شمع! میری نظمیں بے
کے اچھی نہ لگیں گی۔

انجم: باجی! مجھ سے بولو باجی! اپنے بھیا سے۔

شمع: میں اب کسی سے نہ بولوں گی۔ میری باتیں سننا ہو
شاعر کی نظموں کو پڑھ لیا کرنا۔ آج سے اس
میں عورت کی صورت کے ساتھ عورت کی سیرت
سانس لیا کرے گی۔ اب میں جاتی ہوں۔
مٹ جائے گی مگر سیرت باقی رہ جائے گی
مجھے کتنی نیند آ رہی ہے۔

(مر جاتی ہے)

سہیل: (بے حس و حرکت) سو گئی! شمع سو گئی؟
ہوں۔ میری شاعری بیدار ہے۔ میں تمہیں
زندہ کر دوں گا۔ زندہ کر دوں گا۔ زندہ کر

(پس منظر کی غم آگیں موسیقی)

(فیڈ آؤٹ)

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالبؔ

وحید اختر

صغرا آپا کے نام

مری عزیز بہن، بنتِ خاکِ گنگ و جمن — نسیم باغ اودھ، نکہتِ ہوائے دکن
بہت ہی دور ہے تو آج اُن ہواؤں سے — جنھوں نے پالا ہے تجھ کو مثالِ سرو و سمن
نہ بھولی ہوں گی مرے دیس کی فضائیں ابھی — جنھوں نے تیرے دل و ذہن میں کھلائے چمن
تجھے جنوب سے آئی ہوئی ہواؤں میں — ملے گی عہدِ تمنا کے نشتروں کی چبھن
وہ یادیں میں بھی نہیں جن کے حال سے آگاہ — سسکتی ہوں گی ابھی تھام کر ترا دامن
نئے دیار کی جاں بخشی و تازہ محفل میں — کسے خبر کہ ترے واسطے ہے کتنی گھٹن
نظامِ جبرِ سیاست کے اک اشارے نے — تجھے وطن سے نکالا، کیا غریب وطن

مری شفیق بہن! مجھ سے آج دور ہے تو — مگر یہ بُعد ہی ہم کو قریب لایا ہے
اسی مسافرتِ دلِ کسی کے عالم نے — تری نگاہ کو عالم نیا دکھایا ہے
وہ لوگ جو کہ وطن میں بھی ہیں غریب وطن — غم ان کا اب ترے دل میں کہیں سمایا ہے
دلِ گداختہ پہلے سے تو نے پایا تھا — گدازِ شمع مگر اس میں آج آیا ہے
انھیں غموں سے تجھے وہ فراخ قلب ملا — کہ اس پہ اب غمِ انسانیت کا سایا ہے
انھیں غموں نے تجھے وسعتِ نظر دے کر — مری حیات کا ہر پیچ زخم سمجھایا ہے

مجھے یہ شکوہ کہ احباب بھی سمجھ نہ سکے — وہ آگ جس میں مری روح جلتی رہتی ہے

وہ آرزو، وہ تمنا، وہ شوق جس کے لئے — دھڑکتا رہتا ہے دل، سانس چلتی رہتی ہے
کہیں خلوص و محبت کی جنس مل نہ سکی — ہر ایک دل کی دکاں پر سوال کر آیا
کسی کی آب میں پائی نہیں وفا کی چمک — ہر آبگینہ کو میں دیکھ بھال کر آیا
نہ اقربا میں محبت، نہ دوستوں میں وفا — بھلا یہ زیست کٹے بھی تو کس طرح سے کٹے
نہ راہ میں کوئی سایہ، نہ ہم سفر، نہ شفیق — طلب کی سختیٔ پیہم گھٹے تو کیسے گھٹے
کبھی جو ترکِ طلب کا خیال بھی گذرے — خود اپنی عمر کے لمحات ڈسنے لگتے ہیں
تقاضے وقت کے کرتے ہیں یورش پیہم — فضائے ذہن میں شعلے برسنے لگتے ہیں

ہر ایک سمت سے حاصل ہوئی تھی مایوسی — ہر ایک رشتۂ امید کھو چکا تھا میں
مٹا رہا تھا غمِ دیگراں کے داغوں کو — خود اپنے عہد تمنا کو رو چکا تھا میں

بہت ہی دور سے ایسے میں آئی تیری صدا — بہت قریب سے جیسے کسی نے تھام لیا
کچھ ایسے پیار سے تو نے مجھے کہا "بھائی" — کہ پھر سے میری امیدوں نے زندگی پائی
ترے طفیل کسی سے مجھے گلا نہ رہا — کسی سے کوئی بھی شکوہ مجھے ذرا نہ رہا
تری نگاہ کرم کا جو آسرا پایا — غمِ حیات کی راہوں میں پھر سے لوٹ آیا
وہ تشنہ لب کہ مقدر ہوئے تھے جس کا سراب — ترے خلوص نے اس کو دیا ہے جام شراب
وہ بد نصیب جو دامن دریدہ پھرتا تھا — ترے خلوص نے دامن کو اس کے سی ڈالا

متاعِ کون و مکاں کو بھی جس نے ٹھکرایا
ترے خلوص نے اس سرگراں کو اپنایا

غفور انیس

عہدِ نو کا فیصلہ

زندگی ہنگامۂ ظلمات میں
سسکیاں بھرتی رہی روتی رہی
زخم ہائے روح کو دھوتی رہی
غم کے زہریلے کٹھن لمحات میں
ذہنِ انساں میں درخشاں صبح و شام
لمحہ لمحہ کروٹیں لیتے رہے
شمعِ عزمِ نو کو لَو دیتے رہے
فکر کو دیتے رہے جامِ دوام
آج ہر ذرہ ہے خورشید آشنا
رفعتِ افلاک ہے محوِ الم
خوف سے لرزاں ہیں فرسودہ صنم
جیسے طوفانوں کی آتی ہو صدا
منظرِ قدر و قضا کچھ اور ہے
عہدِ نو کا فیصلہ کچھ اور ہے

سعدی تسکین

ایک نظم

۴۹

راہ پُر پیچ تھی، مگر ہمدم
زندگی کی سیاہ راتوں میں
تیری الفت کی روشنی پا کر
سمتِ منزل قدم اٹھایا تھا
منزلِ شوق جب قریب آئی
لُٹ گیا قافلہ مرے دل کا
جب بھی تنہا اداس راتوں میں
دل مرا ڈوب ڈوب جاتا ہے

اس حسیں یاد کے سہارے پر
زندگی سے نباہ کرتا ہوں

راشد افسر

سراب

کسی سے دور مجھے جب کسی کی یاد آئی
حریم دل میں عجب کشمکش سی ہونے لگی
کسی کی یاد کے دھندلے نقوش ابھرنے لگے
تو بند ضبط کے ٹوٹے اور آنکھ رونے لگی

دریچے میرے تصور کے کھل گئے اک دم
تو آنسوؤں کے دھندلکے میں کوئی لہرایا!
کسی کی زلف شکن در شکن بکھرنے لگی
مرے جہانِ تصور میں کوئی لوٹ آیا

وہی نگاہِ کرم جس کا آسرا لے کر
میں زندگی کے نشیب و فراز سے گزرا
وہی حسین تبسم جو آسرا تھا کبھی
کسی کے چہرۂ زیبا پہ یک بیک بکھرا

چمک سی آنکھوں میں لہرا گئی محبت کی
حیا کے مارے کسی کو حجاب آ ہی گیا
نگاہیں جھک گئیں سرخی سی رخ پہ پھیل گئی
کہ جیسے دور میں جامِ شراب آ ہی گیا

گلابی بھیگے ہوئے ہونٹ تھرتھرانے لگے
بڑے ہی پیار سے میرا کسی نے نام لیا
ہوئی جو برقِ تمنا مری رگوں میں رواں
تو دونوں ہاتھوں سے دامن کسی کا تھام لیا

کسی کے حسن میں کھویا رہا یونہی کچھ دیر
خرد نے بڑھ کے پکارا کہ جاگ محوِ سراب
جہانِ عشق میں ہے وجہ انقلاب شباب
ہے خونِ دل سے گلستانِ آرزو شاداب

صدا خرد کی جو آئی تو خواب سے جاگا
نظر اٹھا کے ستاروں کا بانکپن دیکھا
چمک چمک کے ستاروں نے روشنی کھوئی
فلک کے راج دلاروں کو بے کفن دیکھا

یہی نظامِ فلک ہے یہی نظامِ زمیں
اندھیری رات میں دیپک جلایا جاتا ہے
فلک پہ رات کو تارے سجائے جاتے ہیں
نظامِ شب کو دمِ صبح ڈھایا جاتا ہے

50

ظ۔ انصاری
شاہد صدیقی

بحث

غزل

ہمارے دوست ظ۔ انصاری نے جون کے "شاہراہ" میں (جب سے کہ انھوں نے "شاہراہ" کی ادارت سنبھالی ہے) اداریہ کے تحت "غزل گوئی" کے عنوان سے غزل کے موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے جس میں بحث کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔ یوں تو اردو ادب میں ایک عرصہ سے غزل کے بارے میں اختلاف رائے موجود ہے اور اس کی حمایت و مخالفت میں بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے لیکن ادھر پانچ چھ سال سے خاص طور پر جب سے کہ ہمارے نوجوان اور ترقی پسند شاعر غزل لکھنے کی جانب زیادہ مائل ہو گئے ہیں پھر ایک بار ایک صنف سخن کی حیثیت سے غزل موضوع بحث بن گئی ہے اور ہمارا بھی یہ خیال ہے کہ یہ بحث ہونی چاہیے تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے چنانچہ اس ماہ سے ہم بھی "سب رس" میں اس بحث کا آغاز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انصاری کے خیالات (جو انھوں نے جون اور اگست کے "شاہراہ" میں ظاہر کئے تھے) اور شاہد صدیقی کے جواب کے ساتھ کر رہے ہیں۔

امید ہے کہ ہمارے نقاد اور شعرا حضرات اس بحث میں ضرور دلچسپی اور حصہ لیں گے۔ آئندہ ماہ ہم رشید الدین خاں یا ڈاکٹر حفیظ قتیل کا مقالہ پیش کریں گے۔ ہم ڈاکٹر یوسف حسین خاں سے بھی خواہش کر رہے ہیں کہ وہ اس موضوع پر کچھ لکھیں۔ یوسف صاحب نے غزل پر کافی پڑھا، سوچا اور لکھا ہے۔ اس بحث میں ان کے حصہ لینے سے مسئلہ کے صاف ہونے میں یقیناً مدد ملے گی۔

ادیب

غزل گوئی

غزل بڑے مزے کی چیز ہے۔ یہی اس کا حسن ہے اور اسی میں ایک ادبی خطرہ پوشیدہ ہے۔ مزے کی خاطر غزلیں گنگناتے ہیں۔ اختصار کی وجہ سے اور بیان کی ایک مخصوص گھلاوٹ کی وجہ سے غزل کے الگ الگ اشعار دوہوں کی طرح زبان زد ہو جاتے ہیں اور اسی کی وجہ سے بعض لوگ اس بھول میں آ جاتے ہیں کہ غزل کہو تو مقبولیت جلد نصیب ہوگی۔ پھر یہ کہ غزل دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں کچھ بے ضرر بھی ہے۔ موقع بے موقع سنائی جا سکتی ہے اور کھپ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اوسط درجہ کی غزل کہہ لینا اس درجہ آسان ہے کہ اس کے لئے کسی محنت، انہماک، مطالعہ، مشاہدے اور ریاضت کی ضرورت نہیں جس طرح کبھی سڑک پر بیل گاڑیوں کے چلتے چلتے ڈگر بن جاتی ہے اور گاڑی بان اسی ڈگر پر دونوں پہیئے ڈال کر راستے کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور سو رہتے ہیں اسی طرح غزل کی ڈگر اس کا قافیہ اور ردیف ہیں جن پر مصرعوں کے دونوں پہیئے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور پھر زیادہ فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یوں تو آسانی کو غزل کی راہ سے ادب میں زندہ رہنے اور اپنی پدری جائے رکھنے کا ایک بہانہ مل جاتا ہے۔ ان تمام اسباب سے آجکل غزل گوئی کا بڑا دور دورہ ہے۔

شاہراہ اور دوسرے ادبی رسالوں بلکہ اخباروں کی ڈاک اگر دیکھی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نوجوانوں کی ڈار کی ڈار اسی طرف پرواز کر رہی ہے اور بڑا ڈھیر انہی غزلوں کا موصول ہوتا ہے کہ اگر ہر اچھا رسالہ ان میں سے اوسط درجے کی غزلیں چھاپنے کو تیار ہو جائے تو صرف غزل نمبر شائع ہوا کریں۔ ان حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ غزل گوئی کو اعتدال پر لانے کے لئے پھر وہ آواز بلند کی جائے جو حالی نے اب سے کوئی ستر برس پہلے اٹھائی تھی اور جس سے یقیناً اردو ادب میں تندرستی کے آثار پیدا ہوئے تھے۔

امید نہیں بندھتی کہ غزل گویوں کی بے سری فوج ان سطروں کو کسوٹی پر پرکھے گی اور کچھ سوچے گی لیکن غزلوں کے اکثر ماحول میں جو تنقیدی شعور پایا جاتا ہے وہ اس سلسلے میں ایک صحت مند ذہنی فضا پیدا کرنے میں مزید مدد دے سکتا ہے (جون ۱۹۵۴ء)

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں   اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

ہم نے جو ایک بار سے زیادہ "غزل گوئی" پر لے دے کی تو اس کے جواب میں بعض مخلص لوگ ادبی تنقید کی یہ الف بے دہرا رہے ہیں کہ کوئی صنف سخن بھی آپ سے آپ زود گردانی کے قابل، فضول اور رجعت پرست نہیں ہوتی۔ انکار کس کو ہے؟ لیکن واضح رہے کہ جس خطرے سے ہم آگاہ کرنا چاہتے ہیں وہ "صنف غزل" نہیں ہے بلکہ غزل گوئی کا حد سے بڑھا ہوا رجحان ہے۔ نثر یا نظم کی کسی خاص صنف کی طرف سے لاپروائی اور کسی دوسری صنف کی طرف پورا جھکاؤ محض اتفاقی نہیں ہوتا۔ اس کے کچھ سماجی اور ذہنی اسباب ہوتے ہیں۔ (مثال کے لئے "واسوخت" کا نام لیا جا سکتا ہے)

۱۹۴۷ء کے بعد سے یکایک غزل گوئی کی طرف لوگ کیوں کھنچے چلے جا رہے ہیں؟ کیا غزل کے کچھ ایسے اوصاف سامنے آگئے ہیں جو پہلے معلوم نہیں تھے یا غزلوں سے بہتر اور زیادہ کھلے ہوئے اصناف سخن کی ضرورت نہیں رہی! یا شاعروں پہ قوت فرمانروا کا جبر شدید ہو گیا ہے اور رمز و ایما، اشارے کنائے کے بغیر بات کہنا دشوار ہو گیا ہے یا قوم انقلابی ہماہمی سے فارغ ہو چکی ہے اور اب بزمیہ شاعری کی چھاؤں میں ستانا چاہتی ہے؟ یا ہمارے شاعروں کے کاندھے اس فرض سے ہلکے ہو چکے کہ وہ قوم کو سماجی اور تہذیبی شعور بھی دیتے رہیں۔

اگر ان میں سے کوئی سبب نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر کوئی اور سبب ہے غزلوں کی طرف شاعر کے بڑھتے ہوئے رجحان کا۔ پھر اندیشہ ہے کہ یہ سب ذہن و شعور کی سہل پسندی اور تن آسانی سے۔ غزلوں میں چونکہ تعمیم مزا دیتی ہے۔ دو مصرعوں میں لفظوں کے رچاؤ، ترکیب کے بہاؤ اور لہجے کی نرمی کے ساتھ ایک بات کہہ دینا کافی ہوتا ہے اس لئے کہنے والے کو سہولت رہتی ہے کہ وہ چند مخصوص خیالات کو اپنے اور پڑھنے والے کے درمیان چند جانی پہچانی چیزوں کو موضوع سخن بنا لے اور ایک رنگ کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں کی پھلجھڑیاں چھڑاتا رہے جس سے سننے اور پڑھنے والے اپنے اپنے طور پر مزا لیتے رہیں۔

اگر اس "خوردہ فروشی" کا تماشا کرنا ہو تو چند رسائل سامنے رکھئے، ان کی غزلیں جمع کیجئے، سب ہی لے دے کر چند موضوعات ہوں گے۔ ردیفوں اور بحروں کے علاوہ ایک اکتا دینے والی یکسانی ہوگی اور حد ہے کہ مشکل سے بیس تیس تراکیب و اصطلاحات ایسی ہوں گی جن میں سے کسی ایک کو چن کر غزل کی پیشانی پر لیبل کی طرح لگا دیا ہوگا اور اس کی بدولت وہ غزل کی ترقی پسندی، غزل کا ارتقائی مرحلہ اور غزل کا اگلا قدم کہا جائے گا۔ ان ترکیبوں اور اصطلاحوں میں چمن، بہار و خزاں، راہ، رہنما، منزل، دار و رسن، فسانۂ غم دل، غم حیات، زلف کائنات، عشق، عقل و جنون و عشق کے الفاظ اور لوازم شامل ہیں۔

یہ ذہنی تکان ہے اور ادبی ریاضت سے جی چرانے کا نتیجہ۔ جنھیں ادب کی شادابی عزیز ہے انھیں اس مجہول خوردہ فروشی کی فضا کو توڑنے میں جدوجہد کرنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس جدوجہد میں غزل فنا نہیں ہوگی بلکہ اس کے اردگرد پروانوں کا ہجوم کم ہو جائے گا اور ایک نارمل صحت مند فضا بحال ہو جائے گی۔ (اگست ۱۹۵۴ء)

ظ۔ انصاری

بیچاری غزل

جب سے ظ۔ انصاری صاحب "شاہراہ" کے ایڈیٹر بنے ہیں اس وقت سے ہمارے ادب کے اس ترجمان میں جہاں کئی خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں وہیں ایک ایسا رجحان بھی ابھر آیا ہے جسے موجودہ دور میں کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ میری مراد غزل کی اس مخالفت سے ہے جس میں ظ۔ انصاری کا قلم آجکل فنتری کن مصروف ہے۔ آپ جون ۱۹۵۴ء سے لے کر تازہ ترین اشاعت تک کوئی نمبر اٹھا کر گہری نظر سے اس کا مطا

کیجئے آپ کو ایسا محسوس ہوگا گویا ظ۔ انصاری نے شاہراہ کی عنان ادارت سنبھالتے ہی قسم کھائی تھی کہ اردو غزل کی جڑ کاٹ کر ہی دم لیں گے اور ایسا محسوس ہوگا گویا آپ اپنی اس قسم کو پورا کرنے کے سلسلے میں کوئی پہلو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے، کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ آمادہ نہیں۔ یہاں تک کہ آپ بات شروع کرتے ہیں وامق جونپوری کی تعریف سے اور تان ٹوٹتی ہے غزل کی مخالفت پر۔

ایسے عالم میں میرے نزدیک غزل گوئی کے حد سے بڑھے ہوئے رجحان پر غور کرنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ظ۔ انصاری کے اس رجحان پر غور کریں جو غزل کی شدید مخالفت کے رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے اور یہ پتہ لگائیں کہ ظ۔ انصاری جیسا ذہین، باشعور اور معاملہ فہم ادیب غزل کی نسل کو ختم کرنے کے لئے جس سرگرمی کا اظہار کر رہا ہے وہ کہیں شاہراہ کی گرمیٔ بازار باقی رکھنے کی فطری خواہش کا نتیجہ تو نہیں؟

ظ۔ انصاری سے اپنی صاف گوئی کی معافی چاہتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کم سے کم میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں۔ میری رائے یا غزل کی مخالفت کسی صحت مند تقاضے پر مبنی نہیں ہے بلکہ میں تو اسے نیک نیتی کے عنصر سے بھی خالی پاتا ہوں۔ میری یہ رائے ان دلائل کے مطالعے سے بھی تقویت پکڑتی ہے، جو غزل کی مخالفت میں اپنا دعویٰ دائر کرتے ہوئے ظ۔ انصاری صاحب نے پیش کئے ہیں۔ انھوں نے شاہراہ کے مختلف نمبروں میں غزل پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ کسی سائنٹفک سوچ بچار کی بجائے نفسیاتی الجھن کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔

ان اعتراضات کی نوعیت ملاحظہ ہو:۔

۱) غزل کے الگ الگ اشعار دوہوں کی طرح زبان زد ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے بعض لوگ اس دھوکے میں آ جاتے ہیں کہ غزل کو تو مقبولیت جلد نصیب ہو گی۔

مجھے ان سطروں میں اعتراض سے زیادہ مغالطہ دینے کی کوشش کارفرما نظر آتی ہے اور ظ۔ انصاری اس دھوکے میں آتے ہوئے
۵۳ محسوس ہوتے ہیں کہ اشعار کا زبان زد ہونا ان کے فارم سے تعلق رکھتا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی شعر کو زبان زد یا دلنشین بنانا خود اس کے حسن اور اثر کا ایک عمل ہے۔ یہاں غزل اور نظم کے درمیان کوئی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ شعر مجموعی طور پر اچھا ہو تو طبیعتیں اسے لازماً قبول کر لیتی ہیں خواہ وہ غزل کا ہو، مثنوی کا، بلکہ اگر ظ۔ انصاری صاحب غور کریں تو انھیں یاد آ جائے گا کہ اکثر رباعیوں اور مرثیوں کے اشعار بھی زبان زد ہو جاتے ہیں۔

۲) "غزل دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں بے ضرر بھی ہے۔ موقع بے موقع سنائی جا سکتی ہے اور کھپ جاتی ہے"

اس اعتراض پر گفتگو کرنے سے پہلے مجھے یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ میں اس کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھا۔ اگر غزل کے بے ضرر ہونے سے انصاری کی مراد یہ ہے کہ غزل گو شاعر کسی استبداد پسند حکومت کی دار و گیر سے نسبتاً محفوظ رہ سکتا ہے تو میں انھیں مجروح کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کا مشورہ دوں گا۔ ہمارا یہ نوجوان شاعر محض غزل لکھتا ہے اور اسی غزل نے اس پر جو مصیبتیں نازل کی ہیں ان سے سب ہی واقف ہیں۔ جہاں تک غزل کے موقع بے موقع سنائے جانے اور کھپ جانے کا تعلق ہے میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اعتراض ہر صنف سخن پر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے مشاعروں اور جلسوں میں ایسی بے موقع نظمیں سنی ہیں، جن کا جواب نہیں اور پھر لطف یہ کہ وہ اچھی طرح کھپ بھی گئی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے بے موقع کھپ جانے کا "حادثہ" ہمیشہ نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ مزدوروں کے کسی جلسے میں اس طرح نغمہ ریز ہوں ؎

اڑی زلف چہرے پہ اس قدر کہ شبوں کے راز مچل گئے

یا شہزادیوں کے اجتماع میں یوں لب کشائی فرمائیں کہ ؎

تشنۂ خوں مری اطراف کہاں سے لانا

تو معاف کیجئے یہ بیچاری غزل یا نظم کا قصور نہیں ہوگا بلکہ خود آپ کی خطا ہو گی۔

۱) اوسط درجے کی غزل کہہ لینا اس درجہ آسان ہے کہ اس کے کہنے میں کسی محنت، کسی انہماک، مطالعہ، مشاہدے اور ریاضت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بات جب اوسط درجہ کی ہے تو میں ظ۔ انصاری صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس درجہ کی کوئی ادبی تخلیق کسی محنت، کسی انہماک، مطالعہ، مشاہدے اور ریاضت کی محتاج نہیں ہوتی۔ ہمارے ادب میں اوسط درجہ کی کہانیاں، اوسط درجہ کے ناول، اوسط درجہ کی نظمیں اور اوسط درجہ کی غزلیں روزانہ لکھی جاتی ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ظ۔ انصاری کے خیال میں اوسط درجہ کی غزل لکھنا آسان ہے اور دوسرے اصنافِ سخن میں اوسط درجہ کی تخلیق گویا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

ان اعتراضات کے بعد ظ۔ انصاری نے یہ نسخہ تجویز فرمایا ہے کہ:

"غزل گوئی کو اعتدال پر لانے کے لئے پھر وہ آواز بلند کی جائے جو حالی نے اب سے کوئی ستر سال پہلے بلند کی تھی:"

بہتر ہوتا اگر ظ۔ انصاری صاحب غزل کے خلاف تنہا آواز بلند کرتے رہتے اور حالی کا ذکر درمیان میں لا کر مرحوم کا ہم آواز بننے کی کوشش نہ کرتے اس لئے کہ حالی نے ستر سال پہلے جو آواز اٹھائی تھی وہ ہرگز غزل کے خلاف نہ تھی بلکہ ان پامال اور فرسودہ موضوعات شعر کے خلاف تھی جو ہماری اردو شاعری پر بری طرح مسلط ہو گئے تھے۔ اگر ظ۔ انصاری کی بات کو مان لیا جائے یعنی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حالی غزل کے خلاف تھے تو اس کے ساتھ ہی حالی جیسے بزرگ کو "ریاکار" بھی ماننا پڑے گا اس لئے کہ انھوں نے غزلوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔

اگست ۷۴ء کی اشاعت میں بھی ظ۔ انصاری صاحب نے غزل کے خلاف اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش فرمائی ہے لیکن اس دفعہ ان کے لہجے میں پہلے کی سی جھنجھلاہٹ نہیں ہے۔ مجھے اس تبدیلی کے اسباب کا علم نہیں لیکن میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس اشاعت میں ظ۔ انصاری نے یہ وضاحت کی ہے کہ وہ جس خطرے سے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں وہ صنفِ غزل نہیں بلکہ غزل گوئی کا حد سے بڑھا ہوا رجحان ہے۔ میں اس سلسلہ میں بھی مختصراً اتنا عرض کر دوں گا کہ حد سے بڑھا ہوا تو ہر رجحان خطرناک ہوتا ہے خواہ وہ غزل گوئی کا ہو یا نظم نگاری کا، افسانہ نویسی کا ہو یا اداریہ لکھنے کا۔ ظ۔ صاحب ایک ماہنامہ کے مدیر ہیں اور وہ اپنی ڈاک سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس صنف پر طبع آزمائی کرنے والوں کا رجحان حد سے بڑھا ہوا ہے۔

اگست ہی کی اشاعت میں غزل کو نشانۂ ملامت بناتے ہوئے ظ۔ انصاری صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "اگر اس خوردہ فروشی کا تماشا کرنا ہو تو چند رسائل سامنے رکھیے۔ ان کی غزلیں جمع کیجئے۔ سب ملا کے دس بیس چند موضوع ہوں گے"

اتفاق سے آجکل میرا "ذوقِ تماشا" حد سے بڑھا ہوا ہے اور یہ بحث چونکہ ظ۔ انصاری صاحب کی تحریروں سے پیدا ہوئی ہے اس لئے میں نے شاہراہ کے وہ تمام پرچے محفوظ کر لئے ہیں جو موصوف کی ادارت میں شائع ہوئے ہیں۔ میں نے ان پرچوں میں شائع شدہ غزلیں اور نظمیں جمع کر لی ہیں۔ فرصت ملتے ہی سب رس کے ذریعہ سے یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ان غزلوں کا کیا مقام ہے اور نظموں کو کونسا درجہ حاصل ہے۔

اور یہ بھی کہ دس بیس چند موضوع خوردہ فروشوں کے ہاں ملتے ہیں یا تھوک فروشوں کی دوکان پر؟

شاہد صدیقی

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

صفی لکھنوی

ضی عبدالغفار
انصاری

مشاعرے

اردو زبان میں مشاعرے کو بہت بڑی تہذیبی حیثیت حاصل ہے۔ مشاعرہ ایک مقبول قسم کا ادبی اسکول ہے جس میں شاعر کا براہ راست تعلق اپنے سننے والوں سے ہوتا ہے۔ اس سے اگر ایک طرف عوام کے ادبی ذوق کی تربیت اور ان کی ذہنی تفریح ہو سکتی ہے تو دوسری طرف شاعر بھی بہت کچھ سیکھ سکتا اور اپنے آپ کو ان سے قریب تر کر سکتا ہے جن کے لئے وہ لکھتا ہے۔

مشاعرے کی روایت جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اردو کے سوا دنیا کی کسی اور.....
.....زبان میں نہیں ہے جس کو یقیناً باقی رکھنا چاہئے۔ لیکن ادھر مشاعروں کی کثرت سے بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ بجائے فائدہ کے نقصان ہو رہا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس خیال کی تائید میں ہمیں قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک مختصر سا مضمون عنایت فرمایا ہے جس کے ساتھ ہم ظ۔ انصاری کا وہ ادارتی نوٹ بھی دے رہے ہیں جو انھوں نے جون کے "شاہراہ" میں لکھا تھا۔

یوں تو بظاہر اس میں کوئی بات بحث طلب نظر نہیں آتی لیکن ہو سکتا ہے کہ قاضی صاحب اور ظ صاحب کی بعض باتوں سے کسی کو اتفاق نہ ہو۔ لہٰذا اس سلسلے میں اگر کوئی صاحب کچھ لکھنا چاہیں تو ہم بخوشی اسے "سب رس" میں شائع کریں گے۔ ادیب

شاعروں کی اصلاح کیجئے

شاعر نہ صرف زندگی کا عکاس اور مصور ہوتا ہے بلکہ زبان اور تہذیب کا معمار بھی ہوتا ہے۔ وہ زبان کو سنوارتا ہے اور قومی روایات کو زندہ رکھتا ہے۔ اس لئے جب مجھے شعر و شاعری کی محفلوں کا معیار گرتا نظر آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تہذیب کی دیواریں گر رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان محفلوں کا رنگ بگڑا ہوا ہے۔

یوں تو گھر گھر مشاعروں کا چرچا ہے لیکن مشاعرے بازی ایک بدہضمی ہو گئی ہے۔ شہد بہت مفید غذا ہے۔ لیکن ایک ہی دفعہ پاؤ بھر یا آدھ سیر شہد کھا لیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ مشاعروں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہے کہ بدمذاقی بڑھتی چلی جا رہی ہے اور مشاعروں کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ سامعین کی حالت یہ ہے کہ ان میں ۹۹ فیصد صرف تفریح کے لئے مشاعروں میں آتے ہیں۔ سینما میں نہ گئے دو چار مشاعرے کی "ہو حق" میں گزار دیئے۔ ان صاحبوں کو نہ تو ان محفلوں کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ وہ یہ سمجھ کر آتے ہیں کہ زبان کی شاعری سے وہ لطف اندوز ہونے آئے ہیں وہ آج کل کن مشکلات میں مبتلا ہے اور کس قدر ان کی خدمات کی محتاج ہے۔ یہ لوگ جب مشاعرے سے اٹھ کر جاتے ہیں تو راستے میں صرف اتنی سی بات انھیں یاد رہتی ہے کہ فلاں شاعر نے کیا خوب باندھا تھا اور کس قدر شگفتہ زمین میں غزل کہی تھی۔ صبح تک یہ باتیں بھی وہ بھول جاتے ہیں اور شاعروں کا اصل مقصد یعنی یہ کہ مشاعرے

کے ذریعے سے دلوں میں اردو زبان کی محبت استوار کی جائے، فوت ہو جاتا ہے۔ میں تو اس حالت کو دن رات دیکھتا ہوں اور کڑھتا ہوں۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے اسی حالت کو اس طرح بیان کیا تھا کہ:۔

یہ نہ کیسا ہی گو ربط میں بھی نہیں پاتا ہوں — بس کلام اپنا جا کے سنا آتا ہوں
وہ یہ کہتے ہیں کہ کیا خوب کہا ہے واللہ — میں یہ کہتا ہوں کہ آداب بجا لاتا ہوں

مشاعروں کی یہ حالت عام مذاق کی پستی کا ایک صحیح عکس ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت ان لوگوں کی ہو رہی ہے جو مشاعرے کی محفلوں کا انتظام کرتے ہیں یا تو شخصی نمود کا جذبہ یا سیاسی مصلحتیں ان کو ان محفلوں کے ترتیب دینے کی ترغیب دیتی ہیں۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ملک کے "بڑے آدمیوں" اور نیتاؤں اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں سے تقرب حاصل کرنے کی خواہش یہ بہانہ پیدا کرتی ہے یعنی ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے۔

گزشتہ سال علی گڈھ کی نمائش میں چند گھنٹوں کے لئے چلا گیا تو میں نے یہ دیکھا کہ نمائش کے پلیٹ فارم پر نیتا پرستی اور سرکاری عہدہ داروں کے تقرب کی خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی وزیر صاحب محفل سے اٹھے ایسا معلوم ہوا کہ محفل کی شمع گل ہو گئی اور پروانے اڑ گئے۔ سارا پلیٹ فارم خالی ہو گیا اور صرف شعرا بیٹھے رہ گئے۔ وہ کیسا تکلیف دہ اور شرمناک منظر تھا۔ اس طرح مذاق سخن کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو زبان کی محبت نہیں ہے جس کے تحت مشاعرے کرائے جاتے ہیں بلکہ وہ اور ہی کچھ بات ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سرکاری عہدہ داروں کا انتخاب نہ کیا جائے۔ لیکن یہ کیا غضب ہے کہ ان کاموں کے لئے ایسے سرکاری عہدہ داروں کا بھی انتخاب کیا جائے جو ایک مصرعہ صحیح نہ پڑھ سکتے ہوں۔ یہ شاعری کے آرٹ کی سخت توہین ہے۔

اب میں شعرائے کرام سے بھی کچھ عرض کروں گا۔ ایسی محفلوں سے جہاں عامیانہ مذاق کے مظاہرے ہوتے ہیں، ان کو اٹھ جانا چاہئے اور فقرہ بازی، بدمذاقی کے خلاف پوری قوت سے احتجاج کرنا چاہئے تب ہی وہ عوام کی پست مذاقی کی کچھ اصلاح کر سکیں گے۔ اگر وہ ان باتوں کو گوارا کرتے رہیں گے تو عوام کے مذاق کی اصلاح کرنے کے بجائے خود ہی اس بدمذاقی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مجھے اپنے نوجوان بھائیوں سے بھی کچھ کہنا ہے، جو شاعر بننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ دولت خداداد ہوتی ہے اور فطرت کے تقاضے شاعر بناتے ہیں۔ یہ بڑھئی یا لوہار کا فن نہیں ہے جس کو سیکھا جائے۔ کوئی شخص صرف اس لئے شاعر نہیں ہو سکتا کہ وہ چاہتا ہے کہ شاعر بنے بعض وقت اشتہائے باطل اور اشتہائے صادق کا فرق سمجھ میں نہیں آتا تو بدہضمی ہو جاتی ہے۔

اپنے نوجوان بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ شعرگوئی کے شوق میں مبالغہ سے کام نہ لیں۔ اس سلسلہ میں انھیں ایک لطیفہ سناتا ہوں جب میں حیدرآباد میں اخبار نویس تھا تو ایک دفعہ اپنے اخبار کے لئے ایک مترجم کی ضرورت ہوئی۔ اشتہار دیا تو عثمانیہ یونیورسٹی کے متعدد گریجویٹوں نے درخواستیں دیں۔ ایک نوجوان نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے معاشی حالات بیان کئے اور اصرار کیا کہ ان ہی کا تقرر کر دیا جائے۔ میں نے ان کے حالات سے متاثر ہو کر ان کا تقرر تو کیا لیکن انھیں سمجھا دیا کہ محنت سے نہ گھبرائیں۔ انھوں نے مجھے بھی یقین دلایا کہ وہ اتنے ضرورت مند ہیں کہ دل لگا کر کام کریں گے لیکن ایک ہفتہ کے بعد وہ میرے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ انھیں ان کے فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے۔ بیچارے بہت شرمائے ہوئے اور افسردہ تھے اور سبکدوش ہونے پر اصرار کر رہے تھے۔ میں سمجھا کہ شاید انھیں کوئی بہتر نوکری مل رہی ہے اور میں نے ان سے کہا کہ اگر ایسا ہے تو مجھے خوشی ہوگی لیکن وہ فرمانے لگے کہ ان کے استعفے کا سبب یہ نہیں ہے۔ آخر مجھے بہ اصرار دریافت کرنا پڑا کہ آخر سبب کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ کیا عرض کروں مجھے کچھ شعرگوئی کا شوق ہے اور مشاعروں میں جاتا ہوں۔ رات ہی کے وقت میں شعر لکھا کرتا ہوں اور رات ہی کو مشاعرے ہوتے ہیں۔ یہاں آپ کے اتنا کام کرنا پڑتا ہے اس لئے شعر و شاعری کا شغل بند ہو گیا ہے۔ لہٰذا ملازمت سے دست برداری ضروری ہو گئی!

کیا کروں کرکسی قدر بعضے کہا بہر حال اس کے بعد تو جب کوئی نوجوان ملازمت کی تلاش میں آتا تھا تو میں اس سے پہلا سوال یہی کرتا تھا کہ آپ شاعر تو نہیں ہیں؟ اس قسم کی شعربازی ہمارے نوجوانوں کے حق میں مفید نہیں ہو سکتی ۔ یہ تو ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ اردو زبان کے ادب اور شاعری کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں مشاعروں کے قدیم آداب محفل اختیار کرنے چاہئیں اور اس معاملہ میں سنجیدگی کو مذاق کی شرط سمجھنا چاہئے ورنہ مشاعروں کی کثرت مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوگی ۔ آرٹ سستا اور بازاری بن جائے گا اور اس کی روح فنا ہو جائے گی ۔

قاضی عبد الغفار

یہ مشاعرے کم کیجئے

ملک میں جیسے جیسے بدحالی، بیروزگاری اور روزمرہ کی مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں اسی رفتار سے اردو والوں کے مشاعرے بھی بڑھ رہے ہیں ۔ شہر شہر اگلی گلی مشاعرہ اور مشاعرے ہیں جائیے تو حیرت ہوتی ہے کہ بقول ظریف

شاعر اتنے تو نہیں صدی تعلیم سو میں سات کی

آدمی کو صرف روٹی کی بھوک نہیں ہوتی، راحت و آسائش اور تفریحات کی بھوک بھی ہوتی ہے ۔ تہذیبی اور روحانی بھوک بھی ہوتی ہے لیکن ہر غذا ہر وقت مناسب نہیں ہوتی ۔ عوام کی تہذیبی اور روحانی بھوک کے لئے جو مشاعروں کا بھوسا آجکل بے حساب مہیا کیا جا رہا ہے وہ نہ اردو ادب کے لئے کچھ ایسا مفید ہے نہ عوام کی تربیت کے لئے اور نہ خود شاعروں کے لئے ۔

آئے دن جگہ جگہ مشاعرے جانے کا کچھ سبب وہ لوگ بھی ہیں جو ذوق نہ ہونے کی مجبوری سے کتابیں نہیں پڑھتے روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے سینما نہیں دیکھ پاتے، علم یا شعور نہ ہونے کی وجہ سے کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکتے اور جن پر زندگی کی بہت سی راہوں کے دروازے یا تو سماج کی موجودہ بناوٹ نے بند کر رکھے ہیں یا خود ان کی کور ذوقی نے بند کر لئے ہیں ۔

اردو میں بے تحاشا مشاعروں کی ایسی وبا پھیلی ہے کہ ان کی تہذیبی حیثیت ختم ہوتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ وہ حیثیت بن گئی ہے جو پچھلی صدی میں خانقاہوں اور مزاروں کی ہو گئی تھی کہ کچھ یار دوستوں کی محفل بھی کچھ ہو حق ہو گئی کچھ تماشا رہا اور کچھ بیہودگی ۔ مشاعروں کی یہ گرم بازاری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ گلی گلی چیچک کے دانوں کی طرح شاعر پھوٹ پڑے ہیں ۔ اور ان میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خود کو سماج کی ہر بندش سے بے پروا علم اور شعور کے ہر تقاضے سے بے نیاز اور فن کی ہر ایک ریاضت سے بری سمجھتے ہیں ۔ کچھ اپنا نام روشن کرتے ہیں، کچھ اردو ادب کی رسوائی کرتے ہیں ۔

جب کوئی چیز رسم عام میں داخل ہو جائے تو بہت لوگ بے سوچے سمجھے اسی پر چل پڑتے ہیں ۔ مشاعروں کا بھی یہی حال ہے ۔ وہ شخص جو اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتا صرف اسی کو ہمسروں میں نمایاں ہونے کا ذریعہ بنا لیتا ہے کہ لکھے پڑھے لوگوں سے موضوع پر شعر کہے یا کہلوائے اور مشاعروں میں اپنے کبتر کی تیزی سے مارا ئے ۔ جن میں صلاحیت نہیں ان کا اتنا نقصان نہیں ہوتا ۔ دراصل نقصان ہوتا ہے ان ذہین اور با صلاحیت لوگوں کا جو دیکھا دیکھی خود بھی اسی ڈگر پر چل دیتے ہیں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں وہ جو قدم اٹھا سکتے تھے ادھر سے ناقص ہو جاتے ہیں ۔ پھر نقصان ہوتا ہے ان اہل محلہ کا جو رات کو دن گزاری کے لئے مشاعرے میں آ بیٹھتے ہیں اور رات گئے تک شاعروں کی طبع آزمائی انہیں سونے نہیں دیتی ۔ نقصان ہوتا ہے اردو زبان کا کہ وہ لوگ جن کے دل میں اردو کا درد ہے ۔ لیکن تقاضا اس کی ترتیب میں زبان کی توسیع کی خاطر کچھ ڈھنگ کا کام کر ڈالتے ۔ لیکن رفتہ رفتہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ یہ اردو کی خدمت ہو رہی ہے اور بالآخر نقصان ہوتا ہے اردو ادب کا کہ بغیر ان شاعروں کے کلام سے اردو ادب کا اندازہ کرتے ہیں اور اپنے اسی سے سیر ہو کر اکتا جاتے ہیں ۔ سوچا جائے کہ ان ہزاروں روپیہ جو داد اور بیت خوب پر ہی خرچ ہوتا ہے اس سے جگہ جگہ اردو لائبریریاں قائم ہو سکتی ہیں جن میں اچھا ادب مہیا کیا اور اخبارات منگا کر رکھے جا سکتے ہیں اور لوگوں کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی جا سکتی ہے ۔ شام سے رات کے مدرسے قائم ہو سکتے ہیں جن میں ان پڑھ بالغوں اور غریب بچوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھایا جا سکتا ہے ۔

سبط حسن

[illegible]

فلموں میں نئے رجحانات

بلراج ساہنی
ترجمہ۔ احمد مکی

میں فلمی دنیا میں ۱۹۴۰ء کے قریب داخل ہوا تھا۔ سب سے پہلے جس فلم ساز کے ساتھ تبادلۂ خیالات کا موقع ملا اس کا عقیدہ تھا کہ فلم دیکھنے والے عوام کی ذہنی عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلم بناتے وقت ہدایت کار، کہانی نویس، اداکار سب کو اس بات کا خیال رہے کہ وہ کسی طرح بھی عوام کی سمجھ پر بوجھ بار نہ ڈالیں۔ ہر وقت یہ یاد رکھیں کہ وہ بارہ تیرہ برس کے بچوں کے لئے فلم بنا رہے ہیں۔

میں اس زمانے میں ولایت سے لوٹا تھا۔ دل میں بڑی بڑی امنگیں لے کر آیا تھا۔ اپنے وطن کی آب و ہوا کیلئے ترسا ہوا تھا۔ میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ میرے ہم وطن جاہل ہیں۔ لیکن اس فلمساز کے ساتھ رہنے سے کچھ دن بعد ہی پتہ چل گیا کہ عوام کی دماغی عمر بارہ برس کی رہے یا نہ رہے خود فلمساز کی ذہنی عمر اس سے بھی کم ہے۔

اس واقعہ کو گزرے ہوئے آٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اس لئے انہیں کے حساب کے مطابق بارہ برس والے کی عمر اب تک بیس نہیں تو سولہ سترہ برس ضرور ہی ہونی چاہیئے اور اس بات کا ثبوت بھی مل سکتا ہے۔ "پرنیتا" "دو بیگھہ زمین" "ہم لوگ" جیسے فلموں کا اتنا دوران کی کامیابی سے امید اور زمانہ کے ساتھ عوام کے شعور میں یقیناً ارتقاء رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میں نیو تھیٹرز اور پربھات کے کچھ پرانے فلم یاد آتے ہیں تو ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ اس وقت بھی ہمارے عوام کی عمر بارہ برس سے کچھ اوپر ہی تھی۔ لیکن جب میں اس فلمساز اور اس جیسے دوسرے فلمسازوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ وقت کی رفتار نے ان کی عمر میں اضافہ نہیں کیا بلکہ وہ کچھ اور بھی پیچھے ہو گئے ہیں۔ ۵۸

۱۹۴۶ء بڑا اہم سال تھا۔ جہازیوں کی بغاوت۔ بمبئی میں عوام پر گوروں کی ہولناک گولہ باری، 'رشید ڈے'، پوسٹل ہڑتال، شولاپور حقیقتاً ملک کی زندگی میں طوفانی انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء کا سال آیا جس میں ملک اور بے گناہ عوام دونوں کے ٹکڑے ہوئے، آزادی کے استقبال میں جوش اور امنگوں کے ساتھ ساتھ خون کا بھی سیلاب آیا اور ایسے مناظر دیکھنے میں آئے جو کبھی نہیں بھلائے جا سکتے۔

لیکن کیا ان میں سے کسی ایک واقعہ کو بھی سچائی اور حقیقت پسندی کے ساتھ کسی فلمساز نے پردہ سیمیں پر پیش کرنے کی کوشش کی؟ نہیں تو کیا یہ سوچنا بیکار نہیں کہ فلموں میں کس قسم کے رجحان ہیں۔ کسی غیر معروف شہر میں بھٹکے ہوئے اندھے شخص کی چال ڈھال میں جو رجحان نظر آتا ہے وہی آپ سمجھ لیجئے کہ ہماری فلمی دنیا میں بھی ہیں۔

لیکن ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ تین چار فلم ایسے بھی بنے جو واقعی بہت اہم تھے۔ بمل رائے کا "ہمراہی"، نتن بوس کا "مزدور"، احمد عباس کا "دھرتی کے لال" اور اچھوت رانا ڈے کا "گڑیا"۔ اس میں سوائے "ہمراہی" کے کسی فلم نے بھی آمدنی کے لحاظ سے کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس کی وجہ صرف عوام کے شعور کی کم عمری ہی نہیں تھی شاید کچھ اور بھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ "مزدور" فلم میں نے شملہ میں دیکھا تھا۔ کس طرح سرمایہ دار مزدوروں کو لوٹتے ہیں۔ کس طرح بھی یونینوں کو توڑتے اور جھوٹی یونینوں کو کھڑا کرتے ہیں اس کا کچا چٹھا پوری صداقتوں کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ جس وقت میں یہ فلم دیکھنے گیا 'سینما ہال ریلوے کے مزدوروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف ان کی کالی کالی وردیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں حیران تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ریلوے کی تمام یونینوں نے ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فلم سے ریلوے مزدوروں میں بڑا جوش اور حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ اس کے کچھ ہی مہینے بعد خبر ملی کہ کانپور میں جب یہ فلم دکھایا گیا تو شہر کے ڈپٹی کمشنر نے سینما گھر کے مالک کو تیسرے ہی دن بلایا اور اسے کہا اس فلم کی نمائش فوراً روک دی جائے کیونکہ مزدور لیڈروں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہر مزدور اس فلم کو ضرور دیکھے۔ اس لئے شہر کے مزدوروں سے

گیا پکچر جبر ا ہوا تھا۔ مالک کو کافی آمدنی کی توقع تھی۔ اس نے ڈپٹی کمشنر صاحب کے سامنے بڑا واویلا کیا لیکن سب بے سود رہیں اور مجبوراً وہاں فلم ہٹا دینا پڑا۔

"دھرتی کے لال" اور "نگر پا" فلم کے ساتھ ذاتی طور پر میرا گہرا تعلق تھا کیونکہ اس میں میں نے اور میری مرحومہ بیوی دمینتی نے اہم رول ادا کئے تھے۔ "دھرتی کے لال" انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن نے بنایا تھا۔ قارئین جانتے ہیں کہ یہ غیر پیشہ ور فنکاروں کا ایک ادارہ ہے۔ میرے خیال میں دنیا کے کسی سرمایہ دار ملک میں امیچیور فنکاروں کے کسی ادارہ نے اتنی بڑی ہمت نہ کی ہو گی۔ ہندوستان تو اس وقت ایک غلام تھا۔ آج تک فرانس، انگلینڈ، امریکہ وغیرہ جیسے آزاد ملکوں میں بھی شاید ہی کسی امیچیور ادارہ نے ایسا قدم اٹھایا ہو۔

"اپٹا" کے فنکاروں کے ساتھ ساتھ جو ہندوستان کے ہر صوبے سے آکر بمبئی میں جمع ہوئے تھے عام لوگ بھی اس کام میں شریک ہوئے اور بغیر کسی پیسے کے لالچ کے یہ بہت اہم بات تھی۔ اس فلم میں ۱۹۴۳ء کی اس بھیانک تباہی کی داستان کو پیش کیا گیا تھا جس سے بنگال دوچار ہوا تھا۔ اس فلم کو جس نے دیکھا ہے تعریف کرنے پر مجبور ہوا ہے اور تسلیم کیا کہ قحط کی دردناک کہانی کو پوری صداقت اور حقیقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اتنی بڑی ذمہ داری اس وقت شاید کوئی فلمساز نہ اٹھا سکتا تھا۔ اس فلم میں کام کر کے مجھے اتنی ہی مسرت حاصل ہوئی جتنی کسی صداقت پسند ہندوستانی کو اتنا احسان کرنے سے ہوتی ہے۔

"دھرتی کے لال" آمدنی کے لحاظ سے کامیاب نہ ہوا۔ اس کا الزام بھی عوام کی ناواقفی کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ فلم بنانے والوں میں جوش تو بہت تھا لیکن فلم تکنیک کا تجربہ کم تھا۔ تکنیک کے اعتبار سے اس میں بہت سی کمزوریاں رہ گئی تھیں جن کی وجہ سے کہانی میں ڈھیلا پن پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی وہ یہ کہ اس مقدس اجتماعی کام کے رہنماؤں میں وہ سچا اور بے غرضانہ جوش نہ تھا جو ان کی رہنمائی میں کام کرنے والوں میں تھا۔ ان میں باہمی اتحاد کی جگہ اختلاف نے لے لی تھی۔

59 "نگر پا" کی کہانی یورپ کے ممتاز ڈرامہ نگار ابسن کے ڈرامہ "ڈالس ہاؤس" سے ماخوذ تھی اور دمینتی کی اداکاری بھی اس فلم میں خوب تھی۔ لیکن عجیب بات یہ کہ یہ فلم بھی بند ڈبوں میں بند پڑی ہے۔

ان فلموں کے بعد بھی اب تک کچھ اور اچھے ترقی پسند اور حقیقت افروز فلم بنے ہیں جن میں سے بعض کے نام اوپر لکھ چکا ہوں۔ ان کے علاوہ دس بارہ نام اور بھی ہیں۔ مجموعی طور پر تقریباً بیس اچھے فلم بنے ہوں گے۔ اچھے سے میری مراد ایسے فلموں سے ہے جن میں سیاہیات کے ساتھ ساتھ تکنیک بھی اچھی ہے۔ لیکن یہ تعداد دریا میں ایک قطرہ کے برابر ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دوران میں صرف بمبئی میں ہی کم سے کم ایک ہزار فلم بنے ہوں گے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فلمی دنیا دو جماعتوں میں منقسم ہے۔ ایک جماعت ترقی پسندوں کی ہے جو فلم میں سماجی حقیقتوں اور ترقی پسند نظریات کو لانا چاہتی ہے۔ دوسری جماعت قدامت پسند ہے جو اس آرٹ کو صرف کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے اور اپنے طریقوں میں کوئی تبدیلی کرنا نہیں چاہتی۔ یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ ایسی کوئی جماعت بندی مجھے نظر نہیں آتی۔ چاہے فلمساز ترقی پسند ہو یا رجعت پرست سب سے بڑا سوال اس کے سامنے یہی ہوتا ہے کہ وہ فلم سے نقصان نہ اٹھائے بلکہ نفع حاصل ہو۔

اس لئے وہ طرح طرح کے سمجھوتے اپنے آرٹ کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ سمجھوتے ترقی پسند بھی کرتے ہیں اور قدامت پرست بھی۔ کئی بار تجربہ ہے کہ ایسے لوگ جنہیں ترقی پسند کہہ کر بہت اونچا چڑھایا جاتا ہے۔ ایسے سمجھوتے اپنے آرٹ اور ضمیر کے ساتھ کر ڈالتے ہیں۔ جنہیں سمجھوتے کی جگہ زیادتی اور ناانصافی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند اور قدامت پرست دونوں اپنے اپنے فارمولے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ترقی پسندوں کا نظریہ ہے کہ زندگی کے بھیانک اور تاریک پہلوؤں کو اور بھی بھیانک بنائیں اور آنے والے انقلاب کا جتنا ڈھول پیٹیں گے اتنا ہی فلم کامیاب ہو گا۔ رجعت پرست فلمساز یہ سمجھتے ہیں کہ جتنے اچھے گانے اور جتنی حقیقت سوز کہانی ہو گی اتنا ہی زیادہ ان کا فلم کامیاب رہے گا۔

سچ یہ ہے کہ

یہ دونوں فارمولے پچھلے چھ سالوں سے ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں جہاں بھی آرٹ کو فارمولوں میں پھنسا دیا جائے گا وہیں عوام اس سے مایوس ہو جائیں گے۔ جو زبان یا جو ادب فارمولوں میں پھنس جائے گا اس کی ترقی ختم ہو جائے گی۔ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے اور یہی اصول فلموں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

فلموں کے ماہروں نے پتہ لگایا ہے کہ فلم میں عوام اپنی زندگی کی ہو بہو اور سچی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیمرے کے ذریعہ زندگی کی سچی اور ہو بہو تصویر پیش کرنا بہت بڑا آرٹ ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس آرٹ کو یورپ اور امریکہ کے فلمسازوں نے خوب حاصل کیا ہے۔ یہاں تک کہ کئی بار وہ جھوٹ کو بھی ایسی صفائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ سچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے امریکی فلم جو عام طور پر اخلاقی نقطۂ نظر سے بڑے گھٹیا ہوتے ہیں، ہمارے ملک میں تماشائیوں کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ایسے فلم کم ہی بنائے گئے ہوں گے جن میں تمام واقعات شروع سے آخر تک سلیقہ سے دکھائے گئے ہوں۔

صداقت اور حقیقت اب عوام کی اہم خواہش ہے۔ اس سے احتراز کرنا اب بہت دشوار ہو گیا ہے۔ صداقت اور حقیقت پسندی کا یہ مطلب نہیں کہ عوام کو صرف رلایا ہی جائے یا محبت کی کہانیاں پیش کرنا بالکل ختم کر دیا جائے۔ زندگی میں خوشی بھی ہے غم بھی، ہنسی بھی ہے آنسو بھی، محبت بھی ہے نفرت بھی۔ زندگی کٹھور بھی ہے نازک بھی۔ زندگی بڑی مکمل اور بھرپور ہے۔ اس کے کسی بھی پہلو کو مکمل اور بھرپور انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے عوام یقیناً لطف اندوز ہوں گے اور فلم ضرور کامیاب ہوگا۔ میرے خیال میں آہستہ آہستہ ہمارے فلمساز، ہدایت کار اور ادیب وغیرہ اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ "دو بیگھہ زمین" جیسے فلم اسی رجحان کے مظہر ہیں۔

لیکن یہ صداقت پسندی کا پودا آزاد آب و ہوا ہی میں پروان چڑھ سکتا ہے۔ گھٹے ہوئے اور تنگ ماحول میں نہیں پنپ سکتا۔ آجکل اس پر حکومت کی جانب سے بھی بڑی پابندیاں ہیں۔ اگر ہمارے فلموں میں حقیقت نہیں ہے تو اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے فلمسازوں کو سنسر بورڈ کا ڈر لگا رہتا ہے۔ یہ مثل مشہور ہے "سچ کڑوا ہوتا ہے" اس لئے اگر سچے حقیقت پسند فلم بنائے جائیں گے تو کسی نہ کسی کو تو ضرور کڑوے لگیں گے۔ مگر حکومت کو چاہیئے کہ اس تلخ حقیقت پر سے پابندی ہٹا لے جس کو پیش کرنے سے تمام لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ٦٠

ساتھ ہی ساتھ حکومت پر لازم ہے کہ تاریخی عظیم شخصیتوں اور تاریخی اہم واقعات کو سامنے رکھ کر خود سچے اور حقیقت پسند فلم بنائے جن کے ذریعہ نہ صرف عوام کی تفریح ہو بلکہ ان کے دلوں میں خدمت وطن کا جذبہ بھی موجزن ہو سکے۔ اس قسم کے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔

گذشتہ چھ برسوں میں فلم انڈسٹری نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں ان سے ہم بہت سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کی فلم انڈسٹری نے اور ہماری حکومت نے سبق سیکھے تو ہم یقیناً فلموں میں نئے رجحانات کا تذکرہ کرنے کے لائق ہو جائیں گے۔ ابھی تو سب کو اسی بات کا انتظار ہے کہ کب ہمارے عوام، ہماری فلم انڈسٹری اور ہماری حکومت نابالغی کے دور سے نکل کر عہد بلوغت میں قدم رکھتی ہے۔

ہندوستان کے جواں سال جواں فکر شاعر

اظہار ملیح آبادی

کا پہلا مجموعہ کلام "نئے ترانے" ہزارہا خوبصورتیوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے منظر عام پر آگیا۔
اتنی ساری خوبصورتیوں کے باوجود قیمت صرف فقط روپے آٹھ آنے رکھی گئی ہے۔ فوراً آرڈر دیجئے۔

اسٹار اینڈ کمپنی بک سیلرس منظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن

(ریویو)

دروازہ

عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کی پہلی کامیاب فلم

شاہد صدیقی

فلم "دروازہ" کی کہانی سننے سے پہلے اس کے نمایاں کرداروں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لیجئے۔

ایک نوجوان جو حال ہی میں انگلستان سے واپس آیا ہے اور محبت پر روایات کو قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتا ہے —— ایک نوجوان بیوہ جو امنگوں اور ترنگوں کے موسم میں رسم و رواج کی زنجیروں سے بندھی پڑی ہے —— ایک شاعر باپ، جس کے افکارِ عالیہ شرمندۂ گوش سماعت ہونے کا موقع نہیں پاتے —— ایک ماں جو سماج کی پرانی قدروں کے خول میں بیٹھی ہوئی اپنی اولاد کے سہرے تو دیکھنا چاہتی ہے لیکن اس کی خواہشوں اور مسرتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتی —— ایک غریب بڑھی سیانی جس کی رسائی باورچی خانے سے مندا تک ہے لیکن جو اپنی بیوہ لڑکی کے درد کا درماں تلاش نہیں کر سکتی —— ایک جاگیردارنی جو نہ صرف اونچا سنتی ہے بلکہ اپنے لڑکے کی شادی کے سلسلے میں بلندی پر نظر بھی رکھتی ہے —— ایک الہڑ دوشیزہ جس کے تکیے کے نیچے اس کی محبوب کی تصویر رکھی رہتی ہے اور جس کا لرزہ دل ایک آوارہ شرابی کی بیوی بننے کے تصور سے دھڑکتا رہتا ہے —— ایک آوارہ شرابی جو بیک وقت دو جگہ فریب کاری سے کام لیتا ہے۔ اپنے خاندان میں اور جسم فروشی کی دوکانوں میں —— ایک سیدھا سادھا نوجوان جس کی جیب میں پورے گیارہ آنے پیسے ہیں اور جو ایک دولتمند گھرانے میں شادی کرنے کی تمنا رکھتا ہے —— اور ایک غنڈہ جو چند ٹکوں کی خاطر ٦١ سڑک پر کھڑے ہو کر شریفوں کی بے عزتی کرتا ہے اور دن کو رات بنانا چاہتا ہے۔

یہ کردار ہیں جنہیں "دروازہ" کی کہانی، گرتا ہوا، اوپر اٹھتا ہوا، ہنستا ہوا، روتا ہوا، ایک دوسرے کا گریبان پکڑے ہوئے، آپس میں لڑتے ہوئے، کبھی باہمی تعاون سے پیش آتے ہوئے اور کبھی موقع پا کر مقابل کا گلا دباتے ہوئے، غرض کہ مکمل طور پر بے نقاب کرتے ہوئے پردے پر پیش کرتی ہے اور تماشائیوں کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ کہانی نہیں زندگی کا ایک ایسا ٹکڑا دیکھ رہے ہیں جس کی اشاریت میں توضیح ہے اور جس کا اجمال تفصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

دروازے کی کہانی، عصمت چغتائی کی تخلیق ہے جس میں ان کی پوری ذہانت سمٹی ہوئی ہے۔ اس کہانی کا سب سے بڑا حسن یہ ہے کہ وہ زندگی سے الگ نہیں ہوتی، ہمارے ہندوستانی ماحول سے الگ نہیں ہوتی اور حقیقت نگاری کے اس اعلیٰ تصور سے الگ نہیں ہوتی جس سے آجکل ہمارے اکثر فلموں کی کہانیاں محروم رہتی ہیں۔ دروازہ دیکھتے ہوئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا: لیکن اس فلم میں دکھایا ہوا ہے جو زندگی میں عام طور پر ہوتا ہے مجھے پورے فلم میں صرف ایک مقام پر مبالغہ کی جھلک نظر آئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے عصمت اور شاہد لطیف نے محض ہیرو اور ہیروئن سے تماشائیوں کی ہمدردی میں اضافہ کرنے کی خاطر ان کی رسوائی کو اتنا شدید کر دیا ہے کہ وہ غیر واقعاتی رنگ اختیار کر گئی ہے۔ ورنہ عام طور پر ایسا بہت کم ہوتا ہے —— خاص کر مسلمان گھرانوں میں —— کہ بیوہ سے شادی کا ارادہ رکھنے والے پر سرِ بازار آوازے کسے جائیں یہاں تک کہ اسے ملازمت چھوڑنی پڑے۔

دروازے کی کہانی بالکل سادہ ہے۔ نہایت سیدھی سادی ہے۔ اس میں نہ محیر العقول واقعات ہیں، نہ ایسے حادثات ہیں جو دوسرے فلموں میں کہانی کی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے مجبوراً رکھے جاتے ہیں —— رشید انگلستان سے واپس آتا ہے، اس کی بچپن کی منگیتر زبیدہ بیوہ ہو چکی ہے لیکن اسے معلوم نہیں وہ اس کیلئے چوڑیاں [illegible] ہے مگر اسے پہنا نہیں سکتا۔ زبیدہ کے ہاتھ اب خالی ہی رہیں گے۔ بیوہ عورتیں چوڑیاں نہیں پہنتیں۔

ـــــ سدرس

بلکہ ان میں جو شریف ہوتی ہیں وہ دوسری شادی بھی نہیں کر سکتیں۔ رشید کا دل اس صورت حال سے کڑھتا ہے، وہ زبیدہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ یہ فیصلہ ساری دنیا کو اس کا دشمن بنا دیتا ہے۔ باہر لوگ اس پر فقرے کستے ہیں۔ گھر میں ماں اور باپ جیسی شفیق ہستیاں اس سے ناراض ہو جاتی ہیں۔ اسکول کے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑتا ہے۔ لیکن وہ اس طوفان میں ایک مثالی انسان کی طرح اور ایک چٹان کی طرح ڈٹا رہتا ہے۔ باہر کی رسوائی کا مقابلہ کرتا ہے۔ گھر کی ناراضی کا مقابلہ کرتا ہے اور آخر میں کامیاب ہوتا ہے۔

اس بڑی رومانی کہانی کے سارے میں ایک چھوٹی سی رومانی کہانی پرورش پاتی رہتی ہے۔ رشید کی بہن ثریا اس کے ایک دوست سے محبت کرتی ہے۔ وہ بھی ثریا کو چاہتا ہے لیکن رشید کے والدین اپنی لڑکی کو ایک آوارہ شرابی کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ بچپن میں دونوں کی منگنی ہو چکی ہے۔ رشید اس استدلال کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کرتا ہے۔ وہ خفیہ طور پر اپنی بہن کی شادی اس کے محبوب سے کر دیتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو تماشائی ایک توانائی محسوس کرتے ہیں جیسے شادی کا یہ انا طریقہ اپنی ناکامی پر آنسو بہا رہا ہے اور ایک نیا اصول ازدواج انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے۔

بیوی (عصمت چغتائی) کی کہانی کو شوہر (شاہد لطیف) نے بڑے سلیقہ کے ساتھ کاغذ سے اٹھایا ہے اور پردے پر رکھ دیا ہے۔ دروازہ دیکھ کر ہم اس رشتے کی اہمیت کے قائل ہو جاتے ہیں جو افسانہ نویسی اور ہدایت کاری کے درمیان پایا جاتا ہے اور جس کی مضبوطی یا کمزوری پر ایک فلم کی خوبی یا خرابی کا انحصار ہوتا ہے۔

میں ایسی بے شمار تصویریں دیکھ چکا ہوں جن کی کہانی اچھی ہوتی ہے لیکن جاہلانہ ہدایت کاری کہانی کے پورے حسن کو خاک میں ملا دیتی ہے اور ایسے فلم بھی میری نگاہوں سے گزرے ہیں جو کمزور کہانی کے باوجود ماہرانہ ڈائرکشن کے سہارے آگے بڑھتے ہیں، یہ صورت حال ایسے موقع پر پیدا ہوتی ہے جہاں کہانی نویس اور ہدایت کار کے درمیان اجنبیت ہو، ان کی ذہنی سطح میں اختلاف ہو، نقطۂ نظر میں فرق اور طرز فکر میں تصادم ہو اور شعور کے راستے الگ الگ ہوں۔ خوشی کی بات ہے کہ دروازہ دو ایسے دماغوں کی تخلیق ہے جو ایک دوسرے سے قریب ہیں بلکہ 61
نہایت ہی قریب ہیں!

دروازے کے مکالمے بہت اچھے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر زور دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہم عصمت چغتائی کے قلم سے گھٹیا قسم کے ڈھیلے ڈھالے، بھس بھسے غیر فطری، بے موقع، سپاٹ اور بے جان مکالموں کی توقع ہی نہیں رکھتے تھے۔ ہمیں ان سے جو امید تھی وہ انھوں نے تشفی بخش حد تک پوری کی ہے اور کئی مقامات پر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر مکالمے نگار صلاحیت سے محروم نہیں ہے تو قلم سے بھی نشتر کا کام لیا جا سکتا ہے۔

دروازے کے اداکاروں نے اچھی کہانی اور اچھی ہدایت کاری کا سہارا لے کر اپنی بہترین صلاحیتوں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہیں۔ شیکھر جو کئی فلموں میں کٹھ پتلی کی طرح اچھل کود دکھاتا رہا ہے، دروازے میں ایک ایسے نوجوان کا روپ دھار کر سامنے آتا ہے جو تعلیم یافتہ ہے، ذہین ہے، باغی ہے، دردمند ہے، ۔۔۔ اصول پرست ہے اور فرسودہ روایات کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ ہے۔ اس فلم میں شیکھر کی اداکاری دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اسی روپ کے لئے پیدا ہوا تھا۔

خیام، ایک دو فلموں کو چھوڑ کر تقریباً ہر تصویر میں شوخ چنچل اور کسی حد تک بازاریت لئے ہوئے کردار ادا کرتی رہی ہے لیکن دروازے کے خالقوں نے اسے ایک ایسی بیوہ بنا دیا ہے جو اپنے دکھوں کی سیاہ چادر اوڑھے ہوئے پوری کہانی میں ایک برباد روح کی طرح چپ چپ پھرتی رہتی ہے۔ دروازے میں اس کی اداکاری ہر فلم سے زیادہ کامیاب ہے!

اس فلم میں نذیر حسین، مدرا، پرتما دیوی، امیر بانو، منجو، نیلم، اور اے لطاف جیسے منجھے ہوئے اداکاروں نے بھی حصہ لیا ہے۔ ان میں ہر اداکار اپنے کردار کے "جوگ" کہئے "میں فٹ بیٹھا ہے" یعنی یہ کہ کسی کی اداکاری "گول" نہیں ہے۔

گانے جو مجروح، خمار اور رعاد لونے لکھے ہیں شاعری کے اعتبار سے بھی کافی وزن رکھتے ہیں اور ان سے وہ توقعات پوری ہو جاتی ہیں جو ہم ایسے شاعروں سے وابستہ کر سکتے ہیں جنہیں فلمی دنیا سے باہر بھی اہم مقام حاصل ہے!

سبارس

ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیاں

نتیجہ امتحان اردو دانی ـ جون ۱۹۵۴ء

حسب ذیل امیدواروں نے سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔

رول نمبر (۱۱۸) حسن (اول) مرکز بلدہ ـ رول نمبر (۱۴۲) مہرالنساء بیگم (دوم) مرکز بلدہ ـ رول نمبر (۱) محمد جلال الدین (سوم) مرکز بلدہ

مرکز بلدہ :-

کامیاب بہ امتیاز

۱۔ محمد جلال الدین
۱۱۳۔ سید شبیر حسین
۱۱۴۔ محمد عبدالقادر
۱۱۸۔ حسن
۱۲۲۔ میر ہدایت علی
۱۲۳۔ سید شاہ امیر حمزہ قادری
۱۳۴۔ مقبول احمد
۱۴۲۔ مہرالنساء بیگم

کامیاب

۲۔ محمد برہان
۳۔ دبیرالدین
۴۔ محمد مطیع الرحمٰن
۶۔ سید مختار حسین
۸۔ عزیز بیگ
۵۱۔ سید عبداللطیف
۵۲۔ سید عبدالمجید
۵۴۔ محمد یوسف
۵۵۔ محمد عبدالرحمٰن
۵۶۔ محمد غوث
۵۷۔ محمد رحمت اللہ خاں
۵۸۔ محمد فریدالحق صوفی
۵۹۔ محمد ظہیرالحق صوفی
۶۰۔ محمد شاکر الزماں خاں
۱۱۵۔ محمد عرفان اللہ
۱۱۶۔ محمد امام
۱۱۷۔ میر حامد علی
۱۲۱۔ محمد عثمان
۱۳۶۔ مرزا محمود حسینی
۱۳۸۔ محمد نظام الدین خاں
۱۴۰۔ غلام معین الدین
۱۴۱۔ محمد محبوب علی خاں
۱۰۔ عذرا بیگم
۱۱۔ سیدہ رحمت فاطمہ
۲۰۔ زلیخا بیگم
۳۲۔ رحمت النساء بیگم

مرکز ہمناباد :-

کامیاب بہ امتیاز

۱۸۔ محمد عبدالعلیم

کامیاب

۱۷۔ تاج الدین
۷۲۔ رفیق احمد
۷۵۔ عبدالقدیر
۷۸۔ محمد عبدالوحید
۷۹۔ سید صلاح الدین
۸۰۔ محمد تمیزالدین
۸۲۔ محمد صلاح الدین
۸۴۔ سید نوراللہ حسینی
۷۳۔ سیدہ خیرالنساء بیگم
۷۴۔ سیدہ مہرالنساء بیگم

مرکز کلیانی :-

کامیاب بہ امتیاز

۹۱۔ محمد جمال الدین باگ
۹۴۔ محمد عثمان پھولے
۹۶۔ محمد سلیم الدین باگ
۱۱۰۔ محمد سلیم الدین

کامیاب

۸۵۔ محمد محی الدین
۸۵۔ محمد عبدالقادر رضوی
۸۹۔ محمد یوسف نواز خاں
۹۲۔ محمد تاج الدین باگ
۹۵۔ محمد سلیم الدین پھولے
۹۰۔ محمد قطب الدین
۹۹۔ سید جلیل الدین
۱۰۵۔ محمد ابراہیم خاں
۱۰۸۔ غلام محمد خاں
۱۱۱۔ محمد قیام الدین

مرکز حیات نگر :-

کامیاب بہ امتیاز

۱۲۴۔ سید عبدالقادر
۱۲۵۔ عبدالغفار خاں
۱۲۶۔ محمد اکبر
۱۲۷۔ محمد ابراہیم
۱۲۹۔ محمد عبدالقادر
۱۳۲۔ محمد جعفر
۱۶۳۔ سید حبیب اللہ حسینی

کامیاب

۱۳۰۔ محمد عثمان
۱۳۱۔ محمد صابر
۱۳۳۔ محمد کلیم اللہ
۱۲۸۔ آمنہ بی
۱۶۴۔ سلمٰی بی

مرکز بیدر شریف

کامیاب بہ امتیاز

۱۴۵۔ زبیدہ بیگم
۱۴۸۔ حفیظ خاتون
۱۴۷۔ ظہورہ بیگم

کامیاب

۱۴۳۔ زبیدہ بیگم
۱۴۶۔ آمنہ بیگم
۱۴۷۔ شریف النساء بیگم
۱۵۰۔ افسر بیگم
۱۵۴۔ ممتاز بیگم
۱۵۶۔ مظہرالنساء بیگم
۱۵۷۔ فاطمہ صغریٰ
۱۵۸۔ بلقیس بیگم
۱۶۰۔ رحیم النساء بیگم

نتیجہ امتحان اردو عالم جون ۱۹۵۴ء

رول نمبر ۳ صغریٰ بی (مرکز بلدہ) اول

رول نمبر	۲	سیدہ علیم النساء بیگم	دوم
″	۵	نورالنساء بیگم	سوم
″	۶	محمد عبدالغفور	دوم
″	۷	سید عبدالواحد قمر	″
″	۹	محمد اقبال احمد	سوم
″	۱۱	محمد حنیف اصغر	دوم
″	۱۴	سید عبدالماجد حکیم	″

سید رئیس

آپ حیدرآباد ضرور تشریف لائیے

یہ نہ سوچیے کہ یہاں رہنے سہنے کے لئے آپ کا کوئی گھر نہیں!
کھانے پینے کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس لئے کہ شہر حیدرآباد میں

عزیزیہ ہوٹل

(قیام و طعام)

ایک ایسا عام ہوٹل ہے جو خاص ہوٹلوں کی سی کیفیت رکھتا ہے
اور جہاں آپ قیام فرما کر اپنے گھر جیسا سکون پا سکتے ہیں اور وہ بہترین اور
نان و بہترین غذاؤں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں یہاں ہر وقت آپ
پاکیزگی، نفاست اور صفائی پائیں گے ــــــــــ

آپ کا محبوب مرکز

عزیزیہ ہوٹل و قیام گاہ

نامپلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

سہس

20 APR 1955

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ سب رس حیدرآباد دکن

جلد (۱۷) شمارہ ۱۱، ۱۲ ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۵۴ء
جلد (۱۸) شمارہ ۱ ماہ جنوری ۱۹۵۵ء

نگران: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ: نجمہ سمیع • رمن راج سکسینہ • نصیر الدین ہاشمی

سالانہ چندہ: چھ روپے سکہ ہند — ششماہی چندہ: تین روپے سکہ ہند (رجسٹری فیس بذمہ خریدار) — فی پرچہ ۱۲ آنہ سکہ ہند

اس شمارے میں

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے مطبع ابراہیمیہ میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

پہلی بات

ادارہ

"سب رس" کا یہ نمبر جسے دراصل نومبر ۱۹۵۴ء میں نکلنا چاہیئے تھا اب جنوری ۱۹۵۵ء میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پورے دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد، جس کا ہمیں سخت افسوس ہے اور ہم اظہار افسوس یا معذرت خواہی کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں جبکہ اس کی تعویق میں بالکلیہ "سب رس" کی غیر متوازن مالی حالت ہی کو دخل رہا ہو اور اب بھی ہم بڑی مشکل سے یہ مشترکہ نمبر نکالنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ ہم چاہتے تو یہ تھے کہ نومبر، دسمبر ۱۹۵۴ء کا ایک مشترکہ نمبر نکل جائے اور پھر جنوری ۱۹۵۵ء میں ایک علاحدہ سالگرہ نمبر نکالا جائے۔ لیکن جو ہو سکا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ "سب رس" بند ہو جائے اور اگر آپ بھی یہی چاہتے ہیں تو اس کی توسیع اشاعت میں دلچسپی لیجئے۔ اس کی مالی حالت کو مستحکم بنائیے ورنہ اندیشہ ہے کہ ہماری اور آپ کی مرضی کے خلاف اسے بند کر دینا پڑے۔

اس دفعہ پروفیسر عبدالقادر سروری، جاں نثار اختر اور احمد مکی کے جو مضامین شریک اشاعت ہیں، وہ اورنگ آباد اردو کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ "سب رس" کا ایک نمبر کانفرنس ہی کے لئے مختص کر دیا جائے لیکن عین وقت یہ پیش آئی کہ وہ بہت سے حضرات جنھوں نے کانفرنس میں بجائے مقالے پڑھنے کے تقریریں کی تھیں اور بعد میں اپنی تقریروں کے خلاصے اور خاکے خود لکھ کر دینے والے تھے ہماری بار بار کی یاد دہانی کے باوجود نہیں دئیے اور اس طرح ہمارا خیال عملی جامہ نہ پہن سکا۔

جب کانفرنس کا ذکر آ ہی گیا ہے تو ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں اس کے بارے میں چند سطریں قلمبند کی جائیں —— یہ کانفرنس ۱۹ر اکتوبر سے ۲۱ر اکتوبر ۱۹۵۴ء تک اورنگ آباد میں ہوئی تھی۔ اس کے بھی اغراض و مقاصد وہی تھے جو آل حیدرآباد اردو کانفرنس کے تھے جو اپریل ۱۹۵۴ء میں بہت بڑے پیمانے پر ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس بھی ایک علاقے (حیدرآباد کی ریاست تلنگانہ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے علاقوں پر مشتمل ہے اور اورنگ آباد مرہٹواڑہ میں ہے) کی کانفرنس کے لحاظ سے بہت کامیاب رہی جس میں ادبی مسائل پر مباحثے ہوئے۔ ڈرامے پیش کئے گئے

اور مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کے اجتماع کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ اتنے زیادہ لوگ شاید ہی اورنگ آباد کے کسی مشاعرے میں آئے ہوں۔ اس کانفرنس میں حیدرآباد سے فضل الرحمٰن، حبیب الرحمٰن، عبدالقادر سروری، زینت ساجدہ، سلیمان اریب، شاہد صدیقی، سری نواس لاہوٹی، عالم خوندمیری، اختر حسن، حسینی شاہد، احمد مکی، اقبال متین، سردار سلیم، رابعہ بیگم، کنول پرشاد کنول، عزیز قیسی، اکبر حیدرآبادی، قیصر، شاذ تمکنت اور وحید اختر گئے تھے اور بمبئی سے جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، وشوامتر عادل، مظفر شاہجہاں پوری اور ادھو کمار آئے تھے۔

زیر نظر نمبر میں آپ "غزل" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھیں گے۔ اس کے مصنف رشید الدین خاں یہاں کے "دانشور طبقے" سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیاسیات اور تاریخ کے ایم۔ اے ہیں اور محبوب کالج میں لکچرار۔ انھوں نے یہ مضمون کافی محنت سے لکھا ہے۔ امید ہے کہ غزل کی موجودہ بحث میں یہ ٹھوس مضمون ایک سنجیدہ مطالعہ کی حیثیت سے پڑھا جائے گا۔

ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ یہ ادارہ (۲۵) سال سے اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ حیدرآباد میں اردو کی ترویج و اشاعت میں اس نے ایک تاریخی رول ادا کیا ہے۔ لکھنے والوں کی ہمت افزائی کر کے کتابیں چھاپ کر، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا ایک نادر ذخیرہ جمع کر کے، اردو امتحانات کا سلسلہ جاری کر کے، تحقیقی کام کرنے والوں کو فیلوشپ دے کر اور ادبی و تہذیبی کانفرنسیں منعقد کر کے یا ان میں ہاتھ بٹا کر ——
اور اب ۱۲ر جنوری سے ۱۴ر جنوری ۱۹۵۵ء تک ادارے کی سلور جوبلی منائی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں ہندوستان کے مشہور رباعی گو شاعر حضرت امجد حیدرآبادی کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریب بھی شامل کر لی گئی ہے جس میں امجد کی ادبی خدمات کے اعتراف کے علاوہ ان کی خدمت میں کیسۂ زر بھی پیش کیا جائے گا۔

امید ہے کہ آپ (خاص طور پر شہر حیدرآباد اور اضلاع کے اردو بولنے والے ادب دوست حضرات) مجلس استقبالیہ کی رکنیت قبول فرما کر اور کیسۂ زر میں اپنی طرف سے زیادہ سے زیادہ رقم ارسال کر کے ان دونوں تقریبوں کو کامیاب بنائیں گے۔

ہم ادارۂ "سب رس" کی جانب سے اپنے تمام قلمی معاونین اور قارئین کی خدمت میں نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ایک خط — ڈاکٹر حسین ظہیر کے نام

معرفت ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل کوئٹہ، بلوچستان
۱۱ ستمبر ۱۹۵۴

سجاد ظہیر

برادر شفیق و عزیز! آداب۔ دو مہینے سے زیادہ ہوئے مجھے آپ کا خط جرمنی میں لکھا ہوا ملا تھا۔ ۲۵ جولائی کو اسے پا کر بڑی خوشی ہوئی تھی گو کہ اس میں آپ نے جرمنی سے واپس ہوتے ہوئے یہاں نہ آسکنے کی اطلاع بھی دی تھی جس کی وجہ سے مایوسی ہوئی۔ اس وقت سے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں لیکن اس کی صورت نہ نکل سکی۔ اس کی تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ بنو کے خط سے مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ آپ گذشتہ ماہ لکھنؤ گئے تھے۔ وہاں آپ نے میرے خط دیکھے ہوں گے اور میرا احوال ان سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا۔ کل آپ کے بھیجے ہوئے رسالہ "سب رس" کی دو کاپیاں مجھے ملیں، ان میں سے ایک پر آپ کے ہاتھ سے میرا نام اور پتہ لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ آپ نے بھیجے ہیں۔ ان کا بہت بہت شکریہ۔ ڈاکٹر زور اور رسالے کے اڈیٹر سلیمان اریب کا بھی شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ باقاعدگی سے وہ اسے مجھے بھیجتے رہیں گے۔ حیدرآباد کی ادبی زندگی کی خبریں اور مانوس ناموں کی لکھی ہوئی نظمیں اور مضامین پڑھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بھی اسی دنیا کا باشندہ ہوں۔ اس سے نہ صرف میری واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اسیری کی تنہائی کی تکلیف بھی کچھ قدر کم ہو جاتی ہے۔ اس رسالے میں یہ پڑھ کر خاص طور پر خوشی ہوئی کہ حیدرآباد میں اردو کانفرنس دوستی اور عام تعاون کی فضا میں ہوئی۔ دوسری زبان والوں نے بھی اس میں حصہ لیا اور مقامی حکومت کے اراکین نے بھی اردو کے متعلق جائز مطالبات کو منظور کیا۔ کاش یو۔پی میں بھی ایسا ہی ہوتا۔

۱۶ اگست کو میرا اور میرے ساتھی بریگیڈیر صدیق کا تبادلہ بغرض علاج مچھ سے کوئٹہ ڈسٹرکٹ جیل کو ہوا۔ میرے دانتوں کی حالت جو تھی وہ تو آپ دیکھ ہی چکے تھے۔ دانتوں کے اسپیشلسٹ نے مجھے کئی بار دیکھا تھا اور کہا کہ تقریباً سب ہی باقی ماندہ دانت نکال کر نیا مصنوعی سٹ بنایا جائے۔ مچھ میں یہ ممکن نہ تھا۔ سال بھر سے میں نے گورنمنٹ کو اس کے متعلق درخواست دی تھی۔ خیر اب خدا خدا کر کے وہ کام یہاں پر شروع ہو گیا ہے۔ دانتوں کے نکالنے کا سلسلہ دو ہفتے سے جاری ہے۔ یہ کافی تکلیف دہ ہے۔ جسمانی تکلیف اتنی نہیں ہوتی جتنی ذہنی۔ نہ کچھ کھایا جاتا ہے ٹھیک سے اور نہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ اس خیال سے کتنی قدر تسکین ہوتی ہے کہ ان کے بعد جب مصنوعی دانت بن جائیں گے تو روز روز کی جھنجھٹ سے نجات ملے گی۔ کوئٹہ کی آب و ہوا آج کل اچھی ہے۔ ڈاکٹر اچھا معلوم ہوتا ہے اور یہاں پر عام حالات اس سے بہت بہتر ہیں جیسے کہ مچھ میں تھے۔ میری آنکھوں کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ دانتوں کا قصہ پاک ہو تو پھر ان کے لئے بھی اسپیشلسٹ کے لئے درخواست کروں گا۔

۱۴ جولائی کو افتخار مچھ سے ملنے کے لئے مچھ آئے تھے۔ وہ میرے لئے ایک ریڈیو، کتابیں، پھل، مٹھائیاں، کپڑے وغیرہ لے آئے اور معمولی اخراجات کے لئے کچھ رقم جمع کرا دی۔ لیکن ان سب سے زیادہ ان سے مل کر خوشی ہوئی۔ ہمارے لئے کسی عزیز یا دوست کا ملنا سب سے زیادہ مسرت کا باعث ہوتا ہے اور بلوچستان میں رہنے میں

ب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ ہم اپنے اس حق سے تقریباً محروم ہیں۔ افتخار نے مجھے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے یہاں سے میرے تبادلے کے لئے حتی المقدور کوشش کی لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اہل اختیار اس کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ میں نے مومن کا شعر پڑھا

محفل میں میرے نام کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

جہاں تک میری رہائی کا سوال ہے یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ چار سال والی سزا کے قیدی کو اگر جیل کی پوری ریمشن ملے تو اسے سال اور آٹھ مہینے میں رہا ہو جانا چاہئے۔ میری سزا ۵ جنوری ۱۹۵۳ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس حساب سے مجھے ۵ ستمبر ۱۹۵۵ء رہا ہو جانا چاہئے۔ فیض کی بیوی (Alys) کا میرے پاس خط آیا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ فیض کی رہائی کی تاریخ ۵ اگست ۱۹۵۵ء ہے۔ (ایک ماہ بھی گورنر سندھ کے حیدرآباد جیل کے معائنہ کے موقع پر خاص ریمشن ملا تھا جو معمولی ریمشن کے علاوہ ہے) چونکہ میری اور فیض کی سزا ایک ہی ہے اس لئے مجھے بھی اسی تاریخ کو یعنی اب سے گیارہ ماہ بعد رہا ہونا چاہئے۔ لیکن مجھے نہیں پورا ریمشن ملا ہے۔ اس کے متعلق میں نے بلوچستان کے نئے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات سے کہا تھا کہ یہ تو عجیب بات ہے کہ جب میرا جیل ریکارڈ صاف ہے تو مجھے راولپنڈی کیس کے دوسرے قیدیوں کے مقابلے میں (جو سندھ اور پنجاب کی جیلوں میں ہیں) بعد رہا کیا جائے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ایسا نہ ہوگا اور میں اس کی فکر نہ کروں۔ بہرحال دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ابھی گورنر جنرل ستان نے ہماری (Remission) کی درخواست پر بھی اپنا فیصلہ نہیں کیا ہے۔

اگر آپ وقت نکال کر چند دنوں کے لئے یہاں آجاتے تو بہت اچھا ہوتا۔ آپ سے ملے ہوئے ایک سال کے قریب ہوگئے یں۔ ویسے بھی ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ اگر آکر یہاں پر گورنمنٹ کے ذمہ دار افراد سے ں خاص طور پر وزیر داخلہ گرمانی صاحب سے تو، بہت ممکن ہے کہ اس سے میری رہائی کے متعلق معاملات صاف ہو جائیں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ گذشتہ مہینوں میں میں نے ایک چھوٹی سی کتاب اور لکھ کر ختم کی ہے۔ بڑی والی کتاب تو ً چار سو صفحوں کی ہے اور ماہ جنوری میں ختم ہوئی۔ یہ دوسری کوئی سو صفحوں کی ہے اور یہ "حافظ کی شاعری" کے متعلق ہے۔ حافظ میرا سب سے محبوب شاعر ہے۔ میں نے اس کے متعلق ایک دو مضامین پڑھے جن میں میرے بعض دوستوں نے ے رجعت پسند، قنوطی، فراری وغیرہ کہا تھا۔ یہ کتاب اسی کے جواب میں ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب انجمن ترقی اردو معتمد نے اسے لے لینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ رضیہ نے ان سے خط و کتابت کی ہے۔ پہلی کتاب بھی انھوں نے لینے کا وعدہ ا ہے۔ لیکن اب مشکل یہ ہے کہ یہ مسودے انھیں بھیجے کیسے جائیں۔ حافظ والی کتاب کی میں نے نقل بھی کر لی ہے اور اسے اہ سے زیادہ ہوئے جیل والوں کو دے دیا کہ جس کی بھی اجازت لینی ہو لے کر مجھے واپس کر دیں تا کہ رضیہ کے پاس دوں۔ لیکن ابھی تک وہ مسودہ مجھے واپس نہیں ملا ہے۔ بڑی کوفت ہے۔ مجھے امید تھی کہ ان کتابوں کی رائلٹی رضیہ بچیوں کو مل جائے گی تا کہ ان کی مالی مشکل کسی قدر کم ہو۔ لیکن میری کوشش کی تکمیل کے باوجود مسودے وہاں پہنچ ہیں سکے۔ میری ایک کتاب (تیسری) لاہور کے پبلشر کے یہاں دو تین سال سے پڑی ہے اور وہ حضرت اب گرفتار ئے۔ کتابوں کی اشاعت کے بارے میں میں سخت بدقسمت واقع ہوا ہوں۔ میرے کچھ مسودے اگر ضائع نہ ہوتے اور سب وقت سے چھپ جاتے تو کم از کم پانچ چھ کتابیں میری شائع ہو چکی ہوتیں اور میں دراصل "مصنف" کہے جانے کا تحق ہوتا لیکن اب تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ "بن میں مور ناچا کس نے دیکھا"۔

حافظ پر لکھنے کے سلسلے میں میں نے اپنی فارسی کی استعداد میں کافی اضافہ کیا اور بہت سے استادوں کی چیزیں ڑھیں لیکن اس سلسلے میں بھی کتابوں کے دستیاب ہونے میں بڑی دقت ہوئی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ فارسی کی وہ یں جو لکھنؤ، دہلی، لاہور وغیرہ میں چند سال پہلے سستے داموں بآسانی مل جاتی تھیں اب وہاں اور یہاں دونوں جگہ نایاب ہیں۔

سعدی کا دیوانِ غزلیات، دیوان نظیری، عرفی، بیدل وغیرہ نہیں ملتے۔ فردوسی کا شاہنامہ، نظامی اور جامی کی مثنویاں نہیں ملتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری کتاب میں حافظ کا دوسرے شاعروں سے مقابلہ نہیں ہو سکا۔ یہی اس کتاب کی بڑی کمی ہے۔ پھر بھی میرے خیال میں میں نے جو لکھا ہے لوگ اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کتاب میں خشکی نہ پیدا ہو اور حافظ کے کلام کی رنگینی کسی حد تک میری نثر میں بھی آ جائے! معلوم نہیں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔

اچھا اب حافظ کے دو شعر سنئے (جو زیادہ مشہور نہیں ہیں۔) ؎

اساس توبہ کہ در محکمی چو سنگ نمود ببیں کہ جام زجاجی چگونہ اش بشکست

دیکھئے کیسی لطیف بات کہی ہے! توبہ جس کی بنیاد پتھر کی طرح مضبوط معلوم ہوتی تھی۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ شیشے کے ایک نازک جام نے کس طرح اسے توڑ دیا!! دنیا میں تکلیف دہ اور بری چیزیں کس طرح پتھر کی طرح انسانوں کے سینے پر رکھی رہتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اب ان سے نجات ممکن ہی نہیں لیکن وہ طاقتیں جو بادی النظر میں حقیر اور کمزور معلوم ہوتی ہیں بالآخر اس پتھر کی طرح مضبوط خرابی پر حاوی ہو جاتی ہیں (اس لئے کہ وہ جام کی طرح پاک اور صاف ہوتی ہیں!) پھر اس شعر میں الفاظ دیکھئے کیسے مناسب استعمال کئے ہیں! محکمی، سنگ، اساس، بھاری بھرکم لفظ، جام اور زجاجی ہلکے، نازک الفاظ اور "چگونہ اش بشکست" سے جیسے پتھر میں دراڑ پڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کے ساتھ ایک غیر معمولی واقعہ کے ہونے پر حیرت اور تعجب کا اظہار!

دوسرا شعر عاشقانہ مضمون کا ہے ؎

خدا را اے رقیب امشب زمانے دیدہ برہم نہ کہ من با لعل خاموشش نہانی صد سخن دارم

یعنی اے میرے رقیب خدا کے لئے آج کی رات تو تھوڑی دیر کے لئے اپنی آنکھیں دوسری طرف کر لے۔ میں اس کے خاموش لبوں سے چھپ کر سو طرح کی باتیں کرنا چاہتا ہوں! (اصل میں اس شعر کی ساری خوبی اور لطافت 'لعلِ خاموش'، نہانی اور صد سخن میں ہے جن کا ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔) معشوق یا تو غصہ کی وجہ سے یا اور کسی نامعلوم سبب سے چپ ہے اور عاشق اس سے بات کرنے کے لئے بے چین ہے۔ لیکن سب کے سامنے بات کیسے ہو؟ وہ سو طرح (پیار، محبت، صلح صفائی وغیرہ) کی باتیں کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی خفگی ختم ہو۔ یہ باتیں خاموشی میں ہی اور علیحدہ ہی کی جا سکتی ہیں۔ دیکھئے یہاں پر اپنے دل کے اضطراب اور اشتیاق، معشوق کے حسن (لعلِ خاموش) اور حالات کی ناسازگاری کی کیسی دلکش، سچی اور حسین تصویر کھینچ دی ہے! اس شعر کے ایک دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ نہانی صد سخن دارم سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ جس طرح معشوق کے لعل خاموش، خاموش ہونے کے باوجود بہت سی باتوں کا اظہار کر رہے ہیں، اسی طرح میں بھی بغیر بولے ہوئے اس سے سو طرح کی باتیں اکیلے میں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ معنی زیادہ نازک ہیں اور غالباً حافظ کی مراد یہی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

کاش کہ ہم ایک ساتھ ہوتے اور دوست اور ہم جنس ہوتے، اور اچھی اور آزاد فضا میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کر سکتے! دوستی اور انس کی فضا میں بیٹھ کر باتیں کرنے کے لئے کتنے سالوں سے دل ترس گیا ہے۔ آپ نے اپنے خط میں جرمنی کی دلچسپ ملاقاتوں کا جو تذکرہ کیا ہے اسے پڑھ کر خاص طور پر مجھے اس کا احساس ہوا اور دل بہت تڑپا۔

چہ خوش است با تو یک دل سر حرف باز کردن سخن نہفتہ گفتن، گلہ دراز کردن

لیکن خطوں میں ان "نہفتہ" باتوں کا ذکر کیسے کریں اور دلوں کے وہ راز جو زبان سے بھی بمشکل بیان ہوتے ہیں قلم سے کیسے لکھیں۔ خدا کرے یہ جدائی کی مدت جلد ختم ہو اور ہم مل سکیں۔ اطمینان کے ساتھ! تاکہ ایک دوسرے کا دل کر سکیں اور زندگی کے ان پر لطف تجربوں کا تجزیہ جن سے زندگی میں حرارت اور رنگینی پیدا ہوتی ہے اور جو اگر ابھی بھی ہیں تو اپنی دل آفرینی نہیں کھوتے!

آپ کیسے ہیں اور آپ کے انسٹیٹیوٹ کی تعمیر اور اس کے کام کیسے چل رہے ہیں؟ عمارت پوری تیار ہوئی یا نہیں؟ بچے کیسے ہیں؟ سلمیٰ نے تو اب بی۔ اے پاس کر لیا ہوگا۔ ان کا کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ نے شاید لکھا تھا کہ آپ ان کو آکسفورڈ بھیجنے والے ہیں۔ وہاں وہ کیا پڑھیں گی؟ سلمیٰ کو میری طرف سے دعا اور پیار کہیے گا۔ اب تو وہ بڑی اور خوب صورت ہوں گی۔ ان سے کہیے کہ اگر جی چاہے تو مجھے خط بھیجیں۔ برسوں ہوئے ان کا خط آیا تھا اور اسے پاکر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ان کی ایک اچھی سی تصویر بھی تھی، اور رجو میاں کا کیا حال؟ اور چھوٹے میاں چنکو کیسے ہیں؟ امید ہے کہ ان کی صحت اب بالکل ٹھیک ہوگی۔ بھابی کو آداب۔ ان کی آج کل کیا دلچسپیاں ہیں۔ معصومہ آپا کی طرح وہ بھی سوشیل ریفارمر بن گئی یا نہیں؟ معصومہ آپا اور حسین بھائی جان کو میرا سلام کہیے گا۔

چند ہفتے ہوئے میں نے ریڈیو پر یہ خبر سنی کہ سید تقی بلگرامی ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے۔ اس خبر کو سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ تقی کو میری طرف سے بہت بہت سلام اور پیار کہیے گا اور اس شریفانہ عہدے پر فائز ہونے کی دلی مبارکباد۔ ویسے گذشتہ دنوں میں ہمیں انصاف کا جو تجربہ ہوا ہے اس سے طبیعت میں اس جانب سے کافی تلخی آگئی ہے۔ پھر بھی یہ ہمارے والد کا بھی پیشہ تھا اور بہرحال انسان انصاف کے خواہش مند تو ہمیشہ رہتے ہیں۔ امید ہے کہ تقی اچھے ہوں اور خوش ہوں اور ان کے بیوی بچے بخیریت ہوں۔ تقی میاں کو بھی میرا سلام کہیے گا۔

اس ہفتے مجھے حیدرآباد دکن سے بھیجا ہوا ہندی کتابوں کا بھی ایک پارسل ملا ہے۔ اس میں چھ کتابیں ہیں جو حیدرآباد کی ہندی پرچار سبھا نے شائع کی ہیں۔ یہ سری نیواس لاہوٹی نے بھیجی ہیں۔ براہِ مہربانی لاہوٹی کو میرا سلام کہیے گا اور ان کتابوں کے بھیجنے کا بہت بہت شکریہ ادا کر دیجیے گا۔ میں انھیں بڑی دلچسپی سے پڑھوں گا۔ مدتوں سے مجھے ہندی پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا اب انھیں پڑھ کر میں اپنی ہندی بھی دوبارہ ٹھیک کر لوں گا۔ میرے دوست کتابوں سے بہتر تحفہ میرے لئے نہیں بھیج سکتے۔

آپ حیدرآباد کے ایک نوجوان دانشور عالم خوندمیری کو جانتے ہیں؟ غالباً آج کل وہ وہاں کے کسی کالج میں فلسفے کے استاد ہیں۔ میں جب حیدرآباد گیا تھا تو ان سے ملا تھا۔ ان کا ایک مقالہ "اقبال اور ان کی شاعری" کے عنوان سے فروری مارچ ۱۹۵۵ء کے سب رس میں پڑھا جو آپ نے بھیجا ہے۔ یہ مقالہ مجھے بہت اچھا لگا۔ بڑی سنجیدگی اور غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ گو اس کی بعض باتوں سے مجھے کسی قدر اختلاف ہے۔ (مثلاً میرے خیال میں اقبال کے رجعتی پہلوؤں کو انھوں نے خاطر خواہ واضح نہیں کیا ہے۔) حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری سے رجعتی قوتوں کو جتنا سہارا ملا ہے۔ ترقی خواہ قوتوں کو اتنا نہیں ملا۔ ایسا کیوں ہے اس پر کھل کر لکھنے کی ضرورت ہے۔ عالم نے گو اس کے بارے میں لکھا ہے لیکن یہ پہلو دوسرے پہلو کے مقابلے میں کمزور ہے۔ اگر ان سے ملئے تو کہیے کہ اس کی طرف بھی توجہ کریں۔ ان کو میری طرف سے سلام اور پیار کہیے گا۔ سردار جعفری نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں اقبال پر جو لکھا ہے اس میں بھی مجھے یہی کمی نظر آتی ہے۔

مخدوم، کلیم اللہ اور مہدی سے ملئے گا تو میری طرف انھیں پوچھے گا اور سلام اور پیار کہیے گا۔ کلیم کا ایک بڑا اچھا خط مجھے جنوری میں ملا تھا۔ اس کا شکریہ۔ ان سے کہیے گا کہ اسی طرح کبھی کبھی مجھے لکھتے رہیں۔ دوستوں کے خط تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہوتے ہیں۔ گو میں ہمیشہ ان کو جواب نہیں دے سکتا لیکن ان کے خطوں سے زندگی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ رحمٰن کو بھی سلام (جو آپ کے ساتھ کام کرتے ہیں)

میرے دوست شوکت اللہ انصاری بھی تو آج کل حیدرآباد میں ہی ہیں۔ ان کو اور ان کی بیوی زہرہ کو بہت بہت سلام اور یاد ہیں! امید ہے کہ دونوں اچھے اور خوش ہوں گے۔ دیکھیں اب ہم اپنے ان سب دوستوں سے کب ملتے ہیں۔

میرا اکبر علی خاں بیرسٹر سے ملے گا تو میری یاد دلا دیجیے گا۔
میں نے جنوری ۱۹۵۱ء میں اپنی گرفتاری کے ایام کے علاوہ اپنے واسطے کاموں کی جو منصوبہ بندی کی تھی اس کے حساب سے تین سال میں مجھے تین کتابیں لکھ لینا چاہیے تھیں۔ دو تو لکھ لی ہیں۔ تیسری کتاب ابھی باقی ہے۔ یہ ایک ناول ہوگی۔ لیکن اب یہ جو دانتوں کے نکالنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس کی وجہ سے میری ہمت کسی قدر پست ہو گئی ہے۔ آج کل تو سنجیدگی سے پڑھنا بھی ممکن نہیں۔ پھر بھی کوشش کروں گا۔
کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس زمانے میں میں نے اتنا بہت سا جو پڑھا ہے اور اپنے علم میں اضافہ کیا ہے اس سے عقل اور سمجھ میں بھی کچھ اضافہ ہوا یا نہیں؟ علم حاصل کرنا تو نسبتاً سہل ہے۔ لیکن سمجھداری اور سوجھ بوجھ تو عملی زندگی کے تجربے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے جیل میں یہ ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف یہاں پر مزاج اور عادتوں میں چھوٹا پن اور کمینگی حاوی ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اخلاق بہتر ہونے کے بجائے اور گرتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کا احساس ہوتا ہے اور اپنی روک تھام کرتے ہیں لیکن ماحول کا ہر گھڑی مقابلہ کرنا ممکن نہیں! دراصل انسان کو قید ہو کر ہی آزادی کی قدر ہوتی ہے اور ؎

طائر کو میں پرواز میں جب دیکھو گاں ہو دا کرتی ہے تب اپنی مجھے بے بال و پری داغ

لیجیے میں نے آپ کو کتنا لمبا چوڑا خط لکھ ڈالا۔ یہ بھی میری بداخلاقی کا ہی ایک مظاہرہ ہے کہ یہ زیادہ تر میرے اپنے ہی بارے میں ہے۔ لیکن جب مہینوں اپنوں سے باتیں نہ کر سکیں تو اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔
ملک اگر وہاں ہوں یا آپ انھیں لکھیں تو میری یاد انھیں دلائے گا اور انعام ملنے پر بے حد بیکار کیا۔ سنا ہے کہ وہ اس روپیے سے مصنفوں کے لئے پونا اور دہلی کے پاس دو مکان بنوانے والے ہیں۔ کیا یہ خبر صحیح ہے (میں نے ایک ادبی رسالے میں پڑھی تھی) بڑا اچھا خیال ہے۔ انھوں نے کوئی نئی کتاب لکھ کر شائع کی ہو مجھے ضرور بھیجیں۔ وہ تو اکثر یورپ کا دورہ کرتے رہتے ہیں مجھے وہاں سے انگریزی اور فرانسیسی کی اچھی اچھی کتابیں کیوں نہیں بھیجتے؟ اور کبھی کبھی مصور پوسٹ کارڈ! یا اب وہ اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ اپنے پرانے دوستوں کو بھول گئے ہیں۔
اس خط کے ملنے کی رسید اور اس کا جواب جلد دیجیے گا ورنہ پریشانی رہے گی۔ میرا پتہ اوپر لکھا ہوا ہے۔
بہت پیار کے ساتھ
سجے
(سجاد ظہیر)

ڈاکٹر ملک راج آنند

○

چھن رہا ہے کچھ قفس کی تیلیوں سے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

فراق گورکھپوری

اردو ناول اور افسانے پر ایک نظر

(خطبۂ صدارت جو "ناول اور افسانہ" کے اجلاس میں پڑھا گیا)

پروفیسر عبدالقادر سروری

یہ بات بتلانے کی ضرورت نہیں کہ 'ناول اور افسانہ' اپنے اصطلاحی روپ میں 'اردو' بلکہ ہندستانی ادب اور تمام طور پر مشرق سے انیسویں صدی عیسوی میں روشناس ہوئے۔ اس سو برس کے عرصہ میں ان دونوں اصناف نے اردو میں نمایاں ترقی کی اور قومی زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ یہ بھی نشیب و فراز سے گزرتے رہے۔

اردو کے پہلے ناول کے بارے میں علماء میں اختلاف رائے ہے۔ کچھ حضرات نذیر احمد کے ناولوں کو اردو کے اولین ناول سمجھتے ہیں اور کچھ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کو پہلا مقام دینا چاہتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرشار کے بعد کے چند ناولوں کے سوا جو زیادہ تر روپ کی حیثیت سے ناول کہلا سکتے ہیں، نذیر احمد اور سرشار دونوں کے کارناموں میں داستان گوئی کی اگلی روایات اور قصے کے مغرب سے درآمد کئے ہوئے روپ کا سنگم ہوتا ہے۔ روپ یا ہیئت کے لحاظ سے اس میں شک نہیں کہ، ان کے کم عمر معاصر شرر کے ناول زیادہ ناول کہلا سکتے ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ اپنے عہد کے سماج کے مصور ہیں اور نذیر احمد کے قصے 'ہارڈی' کے ناولوں کی طرح اخلاقی اقدار کے حامل ہیں۔ شرر ان کے مقابلے میں مذہبی قدروں کو ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔ شرر نے اپنے کچھ ناولوں میں ہمارے سماج کے ناسوروں پر بھی نشتر زنی کی ہے۔ لیکن ان کے کچھ ناول تو محض مقصدی ناول ہیں جن میں "حسن کا ڈاکو" اور "اسرار دربار حرام پور" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ شرر کے ناول بھی ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب ہیئت میں ناول ہیں، روح میں ناول نہیں۔ ان میں پلاٹ ہیں، کردار ہیں، مکالمے ہیں غرض ناول کے سب ہی ظاہری لوازم ہیں لیکن روحِ حیات متحرک نہیں نظر آتی۔ گو یہ ناول مسلمانوں کی تاریخ کے مبالغہ آمیز رومانی مرقعے ہیں۔ تاہم ان اولین ادیبوں کے کارنامے بھی تاریخ ادب میں ایک معین مقام رکھتے ہیں۔ یہ دراصل اردو میں مغربی ناول کے اولین نقوش ہیں۔

شرر کے معاصرین میں حکیم محمد علیخاں کے ناول، اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصے کے لئے مقبول رہے لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کا مزاج ان کے لئے راس نہیں آ رہا ہے اور وہ اب بھولے بسرے قصے بن رہے ہیں۔

رسوا کی "امراؤ جان ادا" سے اردو ناول کے ارتقا میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ہندستانی سماج کی سچی کہانی کو ناول کی فنکارانہ ہیئت میں پیش کرنے کی یہ ابتدا ہے۔ مرزا رسوا کا یہ کارنامہ بھی معرکۃ الآرا بنا ہوا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ موضوع اور بیان کی خوبیوں کے ساتھ اس میں کئی فنی نقائص بھی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بہت سے واقعات یا (Episodes) اور بے شمار اشخاص کا پیچیدہ قصہ ہے جن میں سے ایک ہیروئین کے سوا کسی کا کردار نشو و نما نہیں پاتا اور چند نفیس انفرادی حیاتی مرقعوں سے قطع نظر اس کے کئی واقعات ایسے ہیں جو مرکزی شخص قصہ کے اطراف گھومنے والے

مرقعوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور خود ہیروئین "امراؤ" کا کردار (Kliedaskopeic) یا تیز رفتاری سے گھومنے والے حادثات کا شکار ہو کر سوانح سمندر میں بہتا ہوا تنکا نظر آنے لگتا ہے۔ کوئی چاہے تو اسے نفی کردار کا نمونہ سمجھ سکتا ہے۔ پھر بھی یہ ناول اردو میں ناول کے فن کے رچ جانے اور ہندستانی سماج کے نقوش کو ناول کے ذریعہ پیش کرنے کا نقطۂ آغاز ہے۔ رسوا اور پریم چند کے درمیان زمانے کے لحاظ سے زیادہ فاصلہ نہیں پھر بھی فن کے لحاظ سے میلوں کا پھیر نظر آتا ہے۔

اس بیچ میں ناول پر ایک گہرے رومانی رنگ کا نشو ونما ہونے لگا تھا۔ اس دبستان کے لکھنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری قابل ذکر ہیں۔ سجاد حیدر اردو سے ترکی ناول کو روشناس کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور نیاز کی "شہاب کی سرگذشت" کو کبھی کبھی نفسیاتی تحلیل کا قصہ بھی کہا گیا ہے۔ "شہاب کی سرگذشت" اتنا مختصر ناول ہے کہ رائیں اس کو "ناولچہ" یا "لمبی کہانی" ثابت کرنے کے درمیان چکر کھاتی رہی ہیں۔

اردو ناول کو معراج کمال پر پہنچانے کا سہرا پریم چند کے سر ہے۔ پریم چند نے بہت سے ناول لکھے۔ ابتدائی ناول جیسے "نرملا" اور "بازار حسن" جو ان کے فن کے ارتقاء میں نقش اول کہے جا سکتے ہیں، اردو کے اولین ناولوں کی طرح اخلاقی قدروں کے ناول ہیں تاہم ابتدا ہی سے ان کے یہاں زندگی کے اصلی تقاضوں کو سمجھنے اور ان کو ایک نئے اور دلکش انداز بیان میں پیش کر سکنے کی صلاحیت کے کافی ثبوت ملتے ہیں۔ "چوگان ہستی" سے پریم چند کے فن کا عروج شروع ہوتا ہے۔ اس ناول کے چند فنی نقائص سے قطع نظر اس میں پریم چند نے نئی زندگی اور پرانی روایات کی کش مکش کو دکھایا ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس ناول میں خود پریم چند، سورداس کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سورداس نے صنعتی انقلاب کو روکنے والی سعی ناکام ہے۔ کیونکہ انقلاب بہرحال انقلاب ہے۔ سورداس کی ناکامی عہد نو کے آغاز کا پیش خیمہ تھا جس میں ہندستان ان سارے مسائل سے دوچار ہونے پر مجبور تھا جو انقلاب کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پریم چند کا شاہکار "گودان" اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے شاید دنیا کے بہترین ناولوں کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ہیرو ہوری کے کردار کو پریم چند نے اس طرح ابھارا ہے کہ وہ ایک کسان نہیں رہا بلکہ کسانوں کی نسل کا نمائندہ بن گیا ہے۔ پریم چند کو ہندستان کے دیہات کی سادہ زندگی سے عشق تھا اور اس ناول نے اس عشق کو لافانی بنا دیا ہے۔

پریم چند کی تصوریت، مثالیں اور حقیقت نگاری واقعات کی فوٹو گرافی نہیں ہوتی بلکہ وہ مصور ہیں، چنانچہ ان کی تصویروں میں ان کا آدرش بھی موجود ہوتا ہے۔ ان کے کردار اکثر متوسط اور نیچے طبقے کے انسان ہوتے ہیں جن کے دل کی دھڑکنوں سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ اسی لئے ان کے ناولوں میں روح عصر جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

پریم چند کا فن بعد کی ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوا اور یہ تحریک خود بھی پریم چند سے متاثر ہوئی۔ ان کے ناولوں نے اردو ناول کا جو معیار قائم کر دیا تھا شاید وہ اب تک بھی مبارزت طلب ہے۔ ان کے معاصرین اور مقلدین میں سے کوئی ایک بھی ان کی منزل تو کجا اس کی سرحدوں تک بھی نہ پہنچ سکا۔

پریم چند کو آدرش بنا کر لکھنے والوں میں سدرشن اور علی عباس حسینی قابل ذکر ہیں۔ پریم چند نے سماجی اصلاح کی جو روح بیدار کر دی تھی اس نے ایک طرف تو خواتین میں زندگی کی لہر دوڑا دی، دوسری طرف انھیں ناول کو اپنے طبقے کی اصلاح کا ذریعہ بنانے پر بھی ابھارا۔ چنانچہ "روشنک بیگم"، "گودڑ کا لعل"، "اختر النسا"، "شوکت آرا" اور چند اور ناول اسی بیداری کا نتیجہ ہیں۔

ترقی پسند ادب کی تحریک جو ابتدا میں چند بغاوت پسند نوجوانوں کی بے راہ روی سمجھی جاتی تھی۔ آزادی کے حصول کے بعد اور اپنے ابتدائی سیاسی، سماجی اور معاشی پس منظر سے ہٹ کر اب ایک ہندستان گیر تحریک بن گئی ہے جس کے مختلف پہلو ہندستان کی ساری زبانوں کے ادب میں کسی نہ کسی حد تک پر تو فگن نظر آتے ہیں۔ ہر زبان کے ادیبوں کی ذہانت

کی مناسبت سے یہ پہلو مخصوص روپ میں ظاہر ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بات معنی خیز ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اثر اردو کے ادیبوں پر نظر آتا ہے۔ اس تحریک کے مثبت پہلوؤں میں سے یہ نہایت اہم ہے کہ اس نے ادب کو سنگِ مرمر کے برج سے نکال کر عام فضا میں ٹھہرا ہوا ماحول پھیلا کر کھڑا کیا۔ اس کی بدولت نہ صرف موضوعات میں انقلاب پیدا ہوا بلکہ ہیئت میں بھی تبدیلی ہوئی۔ جس طرح انگریزی ناول میں ہارڈی، ایلیٹ، ڈکنز وغیرہ کے زمانے کی قدریں بیسویں صدی میں بدل گئیں اردو ناول میں بھی نئے انقلاب کے بعد مذہب اور اخلاق کی پرانی قدریں گھٹ گئیں اور نئے لکھنے والے فرائڈ اور ینگ کے نظریوں سے متاثر ہو کر لاشعور کی الجھنوں کو بھی دیکھنے لگے۔ انگریزی ناول میں کا میتھن میکنزی " Passionate - Elopement " لکھ کر جذبات اور نفسیات نگاری کی نئی راہ کھول دی تھی۔ چنانچہ اس کے اثر کے تحت فرینک سوئنرٹن، جیمس جوائیس، لکھنے وغیرہ نے ناولوں کا جو سلسلہ شروع کیا وہ "آکسفورڈ ناول" سے موسوم ہوا تھا۔ اس خاص نقطۂ خیال کا اثر اردو ناولوں پر بھی پڑا۔ چنانچہ سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات"، کرشن چندر کی "شکست"، عزیز احمد کی "گریز" اور عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" اسی اثر کا ردِ عمل ہیں۔ ان میں شعوری اور لاشعوری کیفیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں محض داخلی الجھنوں کے مرقعے ہی نہیں ہیں بلکہ خارجی تحریکات اور اثرات کا بھی پرتو موجود ہے۔ کرشن چندر کے بارے میں ہمارے زمانے کے ایک نے لکھا ہے "تمام ترقی پسند ادیبوں میں کسی کا نام اس قدر توصیف اور عزت کا مستحق نہیں جتنا کرشن چندر کا ہے" اور اس کی وجہ کرشن چندر کی "بے لوث اور باخلوص انسانیت" بتائی ہے۔ ہندوستان کی طبقاتی کشمکش اور ہندوستانی عورت کی مظلومیت کے تلخ حقائق ان کے مشہور ناول "شکست" کے محرک ہیں۔ اس میں شیام کی شکست، طبقاتی کشمکش کی شکست اور ماضی کے نظام کی فتح بتائی گئی ہے۔ منظر نگاری میں کرشن چندر کا قلم بے مثل ہے اور ان کا اسلوبِ بیان، الفاظ کی جادوگری معلوم ہوتی ہے۔ اردو میں وہ ایک ایسے نئے اسلوب کے بانی ہیں جس میں قطعیت ہے، گھلاوٹ ہے اور ایک طرح کی رومانی رمزیت بھی ہے۔ ناول ان کے ہاتھ میں ایک سنجیدہ فن بن گیا ہے۔ نئی تحریک کے سلسلے میں قاضی عبدالغفار کا ناول "لیلیٰ کے خطوط" بھی قابلِ ذکر ہے۔ جو اپنی مخصوص ہیئت اور موضوع، ہر لحاظ سے ندرت رکھتا ہے۔

عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" میں شمن کی ذاتی الجھنوں ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ بدلتے ہوئے معاشرتی نظام کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں آزاد محبت، مخلوط معاشرہ سب ہی شامل ہیں۔ عزیز احمد نے لکھنے اور لارنس کی طرح جنسی جذبہ کی خطرناکی اور فطرتِ انسانی پر اس کے اثرات بھی دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ نئی تحریک کے سلسلے میں قاضی عبدالغفار کا ناول "لیلیٰ کے خطوط" بھی قابلِ ذکر ہے جو اپنی مخصوص ہیئت اور موضوع ہر لحاظ سے ندرت رکھتا ہے۔ حال میں ہمارے ناول پر "واقعیت سے گزر کر ماورائے واقعیت" (Sur-Realism) کا کچھ پرتو بھی پڑنے لگا ہے چنانچہ قرۃ العین حیدر اور اے حمید کے کچھ ناول اس اثر کے مظہر ہیں۔ ایسے ناولوں میں محض کرداروں کے اعمال اور افعال کا احتساب نہیں کیا جاتا بلکہ اعمال اور افعال سے آگے بڑھ کر جذبات اور محرکات کو بھی جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

لیکن بہ حیثیتِ مجموعی ہماری صدی کا ربعِ آخر ناول کے لئے ایسا سازگار نہیں رہا جیسا کہ افسانوں کے لئے۔ چنانچہ آل احمد سرور نے ایک مقام پر اردو میں اچھے، بلند پایہ اور بسیط ناولوں کی کمی کی شکایت کی ہے اور افسانوں کی زیادتی کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ کچھ اچھی علامت نہیں ہے"۔ وہ ناولوں کی کمی اور افسانوں کی زیادتی کو ادبی شعور کی کم مائیگی اور تخیل کی کم ہمتی کی دلیل بتاتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ناول طویل نظم کی طرح پہلے سے سوچا سمجھا ہوا ایک نظم چاہتا ہے جس طرح ایک عمدہ ناول خود زندہ رہ سکتا ہے اور اپنے خالق کو زندۂ جاوید بنا سکتا ہے۔

11

اسی طرح ایک معتدل طول کی نظم جو زندگی کے حقائق اور فلسفہ پر مبنی ہو چھوٹی چھوٹی نظموں کے ایک ضخیم مجموعے کے مقابلے میں بھی زندہ رہنے اور انفرادیت حاصل کر لینے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور کچھ اپنے انقراض پسند رجحان کے سبب طول طویل خاکوں پر کارنامے تیار کرنے کے لئے زیادہ سازگار نہیں۔ اس میں جو نفسیاتی پہلو مضمر ہیں ان پر روشنی ڈالنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن ایک بات یقینی ہے کہ جس طرح ضخیم دواوین کی کمی ہمارے شعرا کو اپنا صحیح مقام حاصل کرنے میں مدد دے سکتی ہے اسی طرح کہانیوں کی تعداد میں کمی اچھے کہانی لکھنے والوں کی شہرت کو ابھارنے کا باعث بن سکتی ہے۔

افسانہ یا جدید فنی کہانی سے اردو ادب کسی قدر بعد کو روشناس ہوا۔ خود مغربی ادب میں کہانی کا فن، ناول کے مقابلے میں بعد کی پیداوار ہے۔ اس کا ارتقاء میقاتی رسالوں کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ ہو گیا۔ اردو میں بھی میقاتی رسالوں کے فروغ کے ساتھ کہانی کو ترقی ہونے لگی اور گذشتہ ساٹھ، ستر سال کے قلیل عرصے میں اردو افسانے نے جو ترقی کی وہ بذات خود ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔

بعض نقاد تو اردو کہانی کا آغاز پریم چند ہی سے شمار کرتے ہیں۔ گو پریم چند کی فنی کہانیوں سے کچھ پہلے کہانیاں لکھی جانے لگی تھیں اور وہ پرانے دور کے قصوں کی طرح گہرا رومانی رنگ رکھتی تھیں۔ اس طرح کی کہانیوں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور سلطان حیدر جوش کی کہانیاں ایک زمانے میں کافی مقبول رہیں۔

پریم چند کی کہانیوں سے بلاشبہ اردو کہانی کی تاریخ میں ایک نیا صفحہ الٹتا ہے جیسا کہ ایک نقاد نے لکھا ہے۔

"پریم چند اردو کی اقلیم افسانہ نگاری کے پادشاہ ہیں۔ پریم چند کی ساری کہانیاں ہندوستانی سماج اور خاص طور پر دیہات کی سادہ زندگی کے حقیقی مرقعے ہیں۔ زندگی کے بنیادی حقائق اور اعلیٰ اخلاقی قدریں ان کے فن کا خاصہ ہیں۔ طبقاتی کش مکش کے بلیغ نقشے اور سماج کے مزدور طبقوں کے ساتھ پریم چند کی بے پایاں ہمدردی ان کے افسانوں کو مقدس مطالعہ بنا دیتے ہیں۔"

پریم چند کے اثر نے اردو افسانوں کا ڈول ہی بدل دیا۔ ایک دبستان افسانہ نگاروں کا اسی اثر کے تحت اٹھا جس میں سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانے میں مجنوں گورکھپوری نے "سمن پوش" کے ذریعہ غیر معتاد زندگی یا زندگی کے غیر معتاد واقعات کو افسانے کا موضوع بنانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے رومانی اور نفسیاتی افسانوں کے مقابلے میں ان افسانوں کو عام مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

اردو افسانوں میں "انگارے" کی اشاعت نے ایک نئے عہد کے آغاز کا صور پھونک دیا۔ اس مجموعے کے اکثر افسانوں میں حقیقت نگاری کی اسی تفریط کا شائبہ ملتا ہے جو جیمس جوائس کے اثر سے پیدا ہونے لگی تھی۔ یہ نیا اسلوب اردو کے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں بھی بڑا مقبول رہا۔ نئے افسانہ نگاروں کے کارناموں میں فرائڈ کے نظریۂ جنس کی تفسیریں، لاشعور کی الجھنیں، مارکس اور ہیگل کے جدلیاتی فلسفے کی ترجمانی، ایمرسن اور ٹالسٹائی کی انسان دوستی کے نقوش اور ہیم، موپساں کی ندرت نگاری، غرض وہ سارے نقطۂ خیال ملتے ہیں جو نئے دور میں فکر کے محیط رہے ہیں۔

نئے لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی اور عزیز احمد وہ فنکار ہیں جو نفس اور جنس کو زندگی کا سب سے بڑی قدر سمجھتے ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، اے حمید، مہندر ناتھ، ہاجرہ مستور اور خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی اور اپندر ناتھ اشک نے فن کو زندگی کا رہبر اور رہنما بنایا۔

ی مساعی نے افسانے کے موضوعات، اسالیب، فن اور ہئیت سب میں اتنا انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ ان فنکاروں
پو شہ کار دنیا کے شہ کاروں کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاری کے ماضی اور حال پر نظر ڈالتے ہوئے اس فن کا مستقبل بہت تابناک دکھائی دیتا ہے۔
ے سخت سے سخت نقاد کو دوسری صنفوں میں کچھ کوتاہیوں کی شکایت ہو سکتی ہے لیکن افسانے کی ترقی کا
اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تاہم جس طرح اردو ناولوں میں حیات اور نفس انسانی کے بہت سے پہلو ابھی
ئی اور تحقیق کے منتظر ہیں اور ان پر اچھے ناول لکھنے کی ضرورت ہے، اسی طرح افسانوں میں بھی نئے موضوع اور
نقطۂ خیال توجہ طلب ہیں۔ یہ زمانہ سائنسی حقیقتوں کے بے نقاب ہونے کا زمانہ ہے۔ اس لئے "محض" جنس
بھوک" کے اطراف ہمارے نوجوان افسانہ نگاروں کے ذہنوں کے گھومتے رہنے سے افسانوں کی وسیع دنیا میں
زوری تحدید عائد ہو جاتی ہے۔ اب "نظریۂ حیات ادب کے لئے" کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ نہیں رہا۔ اس لئے ہمارے
ں سیخت افسانہ نگاروں کو حیات کے دسیع تر حقائق کی چھان بین کرنی ہوگی اور روس کی مادیت اور
یت پسندی کے ساتھ ساتھ فرانس اور امریکہ کی تخیل پسندی سے بھی کام لے کر افسانوں کو مالا مال کرنا ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی سلور جوبلی۔ تقریبوں کا پروگرام

— ۲۷ جنوری ۱۹۵۵ء روز پنجشنبہ ۵ بجے شام بمقام سٹی کالج

۱۔ خیر مقدم — نواب لیاقت جنگ بہادر
۲۔ روئیداد — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۳۔ خطبۂ افتتاحیہ — آنریبل ڈاکٹر بی رام کشن راؤ چیف منسٹر
۴۔ پیامات
۵۔ مقالہ تلنگی ادب
۶۔ تلنگانہ میں اردو ادب — پروفیسر سید محمد
۷۔ شکریہ — پروفیسر عبد القادر سروری معتمد مجلس استقبالیہ

دوسری تقریب — ۷ بجے شام۔ افتتاح ادارہ ادبیات اردو کالج بمقام خانقاہ عنایت الٰہی قریب مسلم جنگ پل۔

۱۔ کالج کا تعارف — جناب پی ہنمنت راؤ صاحب ڈپٹی منسٹر ال ایکاری
۲۔ رسم افتتاح — آنریبل ڈاکٹر بی رام کشن راؤ چیف منسٹر

تیسری تقریب — ۷-۳۰ شام — لوک گیت

چوتھی تقریب — ۸-۳۰ رات — عشائیہ

پانچویں تقریب — ۲۸ جنوری ۱۹۵۵ء روز جمعہ ۵ بجے شام بمقام زنانہ کالج

۱۔ مقالہ مرہٹی ادب — سیتا مادھو راؤ ناظم تعلیمات
۲۔ مہاراشٹرا میں اردو ادب — رفیعہ [illegible]
۳۔ کنڑی ادب — جناب سید ضیا [illegible]
۴۔ کرناٹک میں اردو ادب — زینت ساجدہ
۵۔ نظمیں (ترنم کے ساتھ)
۶۔ تقریر صدارت — آنریبل کاشی ناتھ راؤ ویدیہ۔ اسپیکر

چھٹی تقریب — ۷ بجے شام بمقام زنانہ کالج "شام غزل"

ساتویں تقریب — ۸-۳۰ بجے رات "ڈرامہ بھاگ متی"

آٹھویں تقریب — ۲۹ جنوری ۱۹۵۵ء روز شنبہ ۵ بجے شام بمقام نظام کالج

۱۔ مقالہ ہندی ادب — جناب راج کشور پانڈے۔
۲۔ پنجاب، سندھ، گجرات اور اتر پردیش میں اردو ادب — پروفیسر عبد القادر سروری
۳۔ بنگال، بہار اور مدھیہ پردیش میں اردو ادب — ڈاکٹر حفیظ قتیل
۴۔ نظمیں (ترنم کے ساتھ)
۵۔ روئیداد اردو امتحانات — مولوی سید علی اکبر صاحب
۶۔ تقسیم اسناد و تقریر صدارت — آنریبل گوپال راؤ ایکبوٹے وزیر تعلیم

نویں تقریب — ۹-۳۰ رات بمقام نمائش عثمانیہ مشاعرہ ہوگا جس میں حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے شعرا کلام سنائیں گے۔

دسویں تقریب — ۳۱ جنوری ۱۹۵۵ء روز دوشنبہ ۵ بجے شام۔ بمقام سٹی کالج

۱۔ حضرت امجد کی خدمت میں سپاسنامہ بصدارت ڈاکٹر عبد الحق مدراس

اردو شاعری میں ہئیت کے تجربے

جاں نثار اختر

ادب ایک زندہ اور متحرک حقیقت ہے اور زندگی سے براہِ راست اپنا رشتہ رکھتا ہے۔ جیسے جیسے زندگی آگے بڑھتی ہے ادب بھی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے۔ اپنے اس ارتقائی نشو و نما میں اگر ادب ایک طرف زندگی سے متاثر ہوتا ہے تو دوسری طرف زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ادب کا مقصد نہ صرف سماجی حقیقت کی عکاسی ہوتا ہے بلکہ سماجی حقیقتوں کو بدلنا بھی ہے۔ البتہ اس کا اثر خارجی فطرت یا ماحول پر براہِ راست نہیں ہوتا بلکہ بالواسطہ ہوتا ہے۔ وہ انسان کے جذبات پر اثر انداز ہو کر اس میں ایک داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے، یہ داخلی تبدیلی عملی جد و جہد میں ڈھل کر سماجی زندگی میں انقلابات کے تغیر کا باعث بنتی ہے۔ "مختصراً" ادب کا مقدس فریضہ انسانی دل و دماغ کو سماجی بہتری کی جد و جہد کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ادب اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جو سماجی کش مکش، تاریخی حرکت، اور عملی جد و جہد کی ترجمانی کرتے ہیں اور عوامی زندگی کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ منشی پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے موقع پر اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا "ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے، وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔" حال میں ایلیا اہرن برگ نے اپنے مضمون The writer and his craft میں ادب کے موضوع کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں

The writer does not write for amusement nor to win fame. He wants to make people better, to make life more lofty, and he regards books as a moral weapon in that struggle.

سردار جعفری نے ایسے ہی موضوعات کو اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں حسین موضوع کا نام دیا ہے۔ "میری مراد حسین موضوع سے وہ موضوع ہے جس کے ذریعہ انسانوں کی زندگی کو خوبصورت بنایا جا سکے جس کا کوئی سماجی مقصد ہو۔ اسے میں موضوع کی معنویت کہوں گا۔ معنویت حسین نہیں ہوگی تو موضوع حسین نہیں ہوگا اور موضوع حسین نہیں ہوگا تو ادب حسین نہیں ہو سکتا۔

موضوع کے انتخاب کے ساتھ ساتھ موضوع کو پیش کرنے کا طریقہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور یہیں سے ادب میں ہئیت اور تکنیک کا سوال اٹھتا ہے۔

ہئیت اور موضوع کو ایک دوسرے سے علحدہ نہیں کیا جا سکتا، یہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ سماجی تبدیلی کے ساتھ جب ادب کا موضوع بدلتا ہے تو ہئیت بھی بدلتی ہے۔ البتہ ہئیت کی تبدیلی آہستہ آہستہ عمل میں آتی ہے۔ نئے موضوعات کی گہرائی اور ان کا پھیلاؤ پرانی ہئیت کے سانچوں کو اندر سے بدلنا شروع کرتا ہے۔ ہئیت میں یہ تبدیلیاں نئے استعمالات

(نئی) تشبیہوں، نئی تلمیحوں، نئے محاکات یا نئی امیجری، الفاظ کے انتخاب کے نئے سلیقہ، نئی تراکیب اور نئے آہنگ کی صورت میں رونما ہونی شروع ہوتی ہیں اور بتدریج ترقی کر کے ایک نئی ہیئت اور نئی ٹیکنک کو جنم دیتی ہیں۔ میں نے نئی ہئیت اور نئی ٹیکنک کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نئی ہئیت یا نئی ٹیکنک، پرانی ہئیت یا ٹیکنک سے اپنا رشتہ توڑ کر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس طرح سوچنا بڑی غلطی ہوگا۔ جدید ہئیت، قدیم ہئیت کی بنیادوں ہی پر تعمیر ہوتی ہے۔ تسلسل ارتقار کے جو قوانین فطرت اور سماج میں رائج ہیں وہی ادب اور آرٹ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف نئے موضوع اور قدیم ہئیت کا اندرونی تضاد نئی ہئیت کو جنم دیتا ہے تو دوسری طرف Law of negation of the negation کے تحت جدید ہئیت قدیم ہئیت سے صالح اور توانا عناصر اخذ کر کے عالم وجود میں آتی ہے۔

اگر ہم قدیم ادوار میں ادب کی مختلف اصناف کے پیدا ہونے کے اسباب پر غور کریں تو ہمیں موضوع اور ہئیت کے رشتے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور جب ہم اس رشتے کو سمجھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہئیت کی حیثیت صرف فنی اور جمالیاتی ہی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ مثنوی، قصیدہ یا غزل کی اصناف نے جن ادوار میں جنم لیا ہے اور اپنے لئے جو موضوعات چنے ہیں اور ان موضوعات کے اظہار کے لئے جو ہئیت اختیار کی ہے اس پر اس عہد کی چھاپ موجود ہے۔ مثنوی نے نویں اور دسویں صدی میں ایران میں اس وقت جنم لیا جب عربوں کا تسلط ایران پر تھا اور ایران کی قومی آزادی کی جدوجہد ابھر رہی تھی۔ اس صنفِ سخن کا اہم نمائندہ فردوسی ہے۔ کیا مثنوی کے Form کو جنم دینے میں اس موضوع کا دخل نظر نہیں آتا جس کا مقصد ایران کی عظمت، اپنے اسلاف کے کارنامے، اپنے عظیم کرداروں کی شخصیت اور ان کی جدوجہد کی اسپرٹ کی تفصیل سے بیان کر کے عوام کے دلوں کو گرمانا اور آزادی کی لگن کو ابھارنا تھا، ظاہر ہے کہ اس موضوع کو نہ تو غزل کی ہئیت اپنا سکتی تھی اور نہ یہ موضوع قصیدہ کی صورت اختیار کر سکتا تھا جس میں ایک قافیہ کی پابندی لازمی اور ضروری تھی۔ قصیدے نے جس کا موضوع حکمرانوں کے جاہ و جلال اور روسا کی شان و شوکت کا اظہار کر کے بالواسطہ جاگیرداری نظام کی موافقت میں ذہنوں کو مستحکم اور برقرار رکھنا تھا۔ اپنی ہئیت میں پرشکوہ الفاظ اور دقیق اصطلاحات، بلند آہنگ نوائی، بعید از قیاس تشبیہات اور استعارات کو اپنایا تاکہ خاطر خواہ اثر پیدا کر سکے اور کیا غزل جس کی علیحدہ صنفی حیثیت ایران میں بنی اور جس کے عروج و توانائی کا اصل زمانہ ایران پر تاتاری حملے کے بعد کا ہے۔ اپنی ہئیت میں اس دور کے انتشار کو ظاہر نہیں کرتی۔ غزل کے لئے اپنے موضوع کے لحاظ سے جو زیادہ تر عشقیہ جذبات کی ترجمانی یا تصوف اور اخلاق کے مختلف مسائل کا اجمالی بیان رہا ہے۔ رمز و کنایات یا محذوفات کے طریقے کو اپنانا ناگزیر سا تھا۔

اردو شاعری نے جس جاگیردارانہ دور میں آنکھ کھولی اور جن تاریخی خیالات میں پروان چڑھی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے موضوعات کے لئے انھیں اصناف کو اپنائے اور اسی ٹیکنک اور ہئیت کو کام میں لائے جو فارسی شاعری کی ساختہ اور پرداختہ تھی۔ اس وقت ہندستانی نظام معیشت کی تقریباً وہی حالت تھی جو ایران میں رہ چکی تھی اس لئے ادب میں بھی شاعری کا وہی ڈھانچہ بخوبی کام دے سکتا تھا۔ یہ حالت ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی تک رہی۔ احتشام حسین نے اپنے مضمون "مواد اور ہئیت" میں اردو شاعری کے اس دور کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ "مادی انقلاب کے بغیر تمدن کی قدریں نہیں بدلتیں۔ چنانچہ نہ شاعری کے مواد میں کسی نئے فلسفہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور نہ اسلوب میں۔" احتشام حسین کے اس مختصر سے جملے میں پوری بات آجاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندستانی سماج ایک مادی اور معاشی انقلاب سے دوچار ہوا تو بیرونی سرمایہ داری کے خلاف قومی جذبات بیدار ہونا شروع ہوئے۔ اردو شاعری میں بھی رفتہ رفتہ حب الوطنی، عقل پسندی، انسان دوستی اور سامراج دشمنی کے عناصر پیدا ہونے لگے۔ حالی، آزاد اور شبلی وغیرہ نے اس نئے موضوع کو نظم کی ہئیت عطا کی۔

حالی اور آزاد کے زمانے سے لے کر اقبال اور جوش تک اردو نظم کے نئے موضوعات قدیم ہیئت کے سانچوں ہی میں ڈھلتے رہے۔ اقبال اور جوش کے یہاں قدیم ہیئت کی خارجی ساخت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ البتہ اپنے اپنے موضوعات کے انتخاب، نئی تشبیہوں، تلمیحوں اور علامتوں کے استعمال، الفاظ اور تراکیب کی نئی تراش خراش اور اپنے اپنے صوتی آہنگ سے دونوں نے قدیم ہیئت کو اندرونی طور پر ضرور متاثر کیا اور اپنے اپنے مخصوص اسلوب کی تعمیر کی۔ ہیئت کی خارجی صورت میں تبدیلی کی چھوٹی چھوٹی کوششیں مثلاً "قافیہ کو ترک کر دینا" مولانا شرر، اسماعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی کے یہاں ضرور پائی جاتی ہیں۔ اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ قافیے کی بے جا پابندی کی طرف لوگوں کا دھیان جانے لگا۔

رفتہ رفتہ اردو شعرا نظم میں بندوں کی نئی ترکیب، صوتی قوافی کا استعمال، مستزاد کے ڈھنگ پر نظموں اور گیتوں کا نیا انداز اختیار کرنے لگے۔ ان میں حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، اختر شیرانی اور عظمت اللہ خاں وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ حفیظ اور ساغر کے یہاں ہیئت کی یہ تبدیلی بقول احتشام حسین صوتی اور نغماتی کیف پیدا کرنے سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ البتہ عظمت اللہ خاں کے ہیئت میں تجربات کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے "ہندوستانی سنگیت کی آمیزش سے نئی راہیں نکالیں"

ترقی پسند تحریک کی ابتدا ۱۹۳۶ء سے ہوئی۔ ترقی پسند شاعروں نے اقبال اور جوش کی روایتوں کو آگے بڑھایا۔ سامراج دشمنی اور آزادی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ مزدور اور کسانوں کی بڑھتی ہوئی تحریکوں کو اپنایا اور عوام کی زندگی اور ان کے مسائل کو ادب و شاعری کے دائرے میں داخل کر دیا۔ اردو شاعری روز بروز عوامی اور انقلابی موضوعات، قومی اور بین الاقوامی مسائل اور امن اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو اپناتی گئی۔ ہیئت میں بھی نئے تجربے تیزی سے رونما ہونے لگے۔ ترقی پسند شاعر نئے مواد اور نئے موضوع کے لیے نئی ہیئت کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ جو تجربے انھوں نے کیے ان میں بعض موزوں اور کارآمد ثابت ہوئے اور بعض ناقص اور خام اور بعض مہلک اور مضرت رساں۔

ہیئت کے جو تجربے مفید ثابت ہوئے اور مقبول ہوئے ان میں ایک تو وہ نظم ہے جو دو دو شعر کے قطعہ نما بندوں سے مرتب ہوتی ہے۔ ابتداءً اس ہیئت کو طباطبائی نے اپنی نظم "گورِ غریباں" میں جو گرے کی Elegy سے ماخوذ ہے برتا تھا۔ انھوں نے اس میں دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیے کی پابندی کے ساتھ پہلے اور تیسرے مصرعے میں بھی قافیے کا التزام ضروری رکھا جس کی وجہ سے بیان کی دشواری خاصی بڑھ گئی۔ ترقی پسند شعرا نے پہلے اور تیسرے مصرعوں میں قافیے کے اس غیر ضروری التزام کو رد کر دیا اور یہ ہیئت دو دو شعروں کے بندوں پر مشتمل ہوتی جس میں بیان کی بہت زیادہ سہولت پیدا ہو گئی۔ آج اردو شاعری میں یہ ہیئت سب سے زیادہ مقبول نظر آتی ہے۔ اردو کا آج کوئی رسالہ اٹھا لیجیے دس نظموں میں سے سات آٹھ نظمیں اسی ہیئت میں کہی گئی ہوں گی۔

دوسری ہیئت جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ نظم معریٰ ہے۔ اس میں اوزان کو برقرار رکھتے ہوئے شعر میں قافیے کی قید و بند کو مسترد قرار دے دیا گیا ہے۔ اس ہیئت میں قافیے کی قید اٹھ جانے کی وجہ سے موضوعات کے اظہار کے لیے کہیں زیادہ گنجائش اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس ہیئت کو مقبول بنانے میں فیض کی دلکش شاعری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میری نظم "خاک بدل" جسے میں اپنی اچھی نظم کہہ سکتا ہوں اسی ہیئت میں کہی گئی ہے۔ اس ہیئت میں لازمی طور پر قافیہ لانے کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی خوبصورتی اور دلکشی سے غزل کی ہیئت کا امتزاج بھی ہو جاتا ہے جس کی مثال جذبی کا "نقاد سے خطاب" ہے۔ پابند نظم نگاری میں آج یہ سب سے زیادہ دلکش اور ہمہ گیر ہیئت بن گئی ہے۔

ہیئت کا ایک اور دلکش اور حسین تجربہ ہمیں کیفی اعظمی کی نظم "تلنگانہ" میں ملتا ہے جو دو بحروں کے حسین امتزاج کے ساتھ کہی گئی ہے اور جس کی وجہ سے لہجہ کا وہ اتار چڑھاؤ اس نظم میں پیدا ہو گیا ہے جو اس نظم کے مواد اور موضوع

تقاضا تھا۔ یہ تجربہ عام نہیں ہو سکا لیکن کیفی کی اس نظم نے ایک نئی ہئیت کی طرف کامیاب اشارہ ضرور کیا ہے جس میں یقیناً گنجائشیں ہیں۔ البتہ دو بحور کے امتزاج سے نظم کو ترکیب دینے کے لئے بڑی فنی چابکدستی اور ساتھ ہی صوتی آہنگ پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

اردو شاعری میں ایک اور نئی ہئیت جس نے ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد جنم لیا وہ آزاد نظم ہے جو قافیے سے آزاد ہے' اور اگرچہ پوری نظم کے ڈھانچے کو مخصوص بحر کا پابند رکھتی ہے لیکن ہر مصرعے میں مقررہ بحر کے ارکان کی تعداد تبدیل کرتی رہتی ہے۔ آزاد نظم کو ابتداً لوگ قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ بعض اسے شاعری ہی ماننے کو تیار نہ تھے۔ بعض کے نزدیک یہ ہئیت اردو زبان کے مزاج کے خلاف تھی اور ماضی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ لوگ یہ بات نظر انداز کر جاتے تھے کہ نظموں میں بندوں اور اشعار کی مختلف ترتیبیں، نظم معریٰ کی صورت میں قوافی سے آزادی، گیتوں کی مختلف شکل میں تجربے، ہندستانی سنگیت کی بنیاد پر نئی ہئیت کی کوشش اور ساتھ ہی قدیم ادب میں نثر مرجز کی روایت۔ یہ سب کے سب آزاد نظم نگاری کے لئے زمین تیار کرتے آئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس ہئیت کی تشکیل میں غیر ملکی لٹریچر کے اثرات کو بہت بڑا دخل ہے۔ یہ ہئیت ماضی کی روایتوں کو لے کر اور بیرونی اثرات کو اپنے میں سمو کر حال کی ضرورتوں سے تحت پیدا ہوئی بہرکیف وہ مخالفت کا دور تو گذر گیا آج نظم آزاد ہماری شاعری کے موضوعات کے لئے ایک مفید، وسیع اور کارآمد ہئیت بن چکی ہے۔ اس ہئیت کو جنم دینے میں ن۔ م۔ راشد کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی شاعری کے مواد سے ہم اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے اس اقدام کا ہمیں ضرور اعتراف کرنا پڑے گا۔ اس ہئیت کو ابتدا ہی میں ایک سخت مرحلے سے گذرنا پڑا۔ جب میراجی کے ہاتھوں یہ نئی ہئیت ابہام اور اشاریت کا بری طرح شکار ہو کر رہ گئی۔ اشاریت اور ابہام کی تحریک نے دراصل انیسویں صدی کے وسط میں فرانسیسی شاعری کے آغوش میں جنم لیا تھا۔ اس تحریک کے بانی بودلیر (Baudelaire) ورلین (Verlaine) اور میلارمے (Mallarme) وغیرہ تھے۔ میلارمے کے الفاظ میں "شاعری میں ہمیشہ ایک چیستاں چاہئے اور ادب کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ تخیل کی مدد سے اشیاء کی تخلیق کرے"۔ اس نئی تحریک نے جہاں جرمنی اور انگریزی مصنفین کو متاثر کیا وہاں ہمارے ادب میں اس کے پیش رو میراجی نظر آتے ہیں۔ میلارمے سے پہلے بھی مشرق و مغرب کے ادب میں یوں تو اشاریت (Symbolism) کی مثالیں ملتی ہیں لیکن وہاں یہ اظہار کا ایک "ذریعہ" تھا اور یہاں اسے "مقصود" قرار دے لیا گیا تھا۔ ابہام و اشاریت اس حد پر پہنچ کر سیدھا طریقۂ اظہار نہیں رہ جاتے کیونکہ ابلاغ (Communication) جو ادب کا مقصد ہے فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ میراجی اور ان کے اسکول کے شاعروں کی نظموں میں ابہام و اشاریت کا یہ رجحان ان کے موضوعات کا بھی تقاضا تھا جو جنسی کجروی (Sexual Perversion) اور لاشعوری کارفرمائی (the working of the Unconscious) پر مشتمل رہے ہیں۔ پھر بھی اس ابتدائی دور میں اس ہئیت میں ہمیں کئی کامیاب اور بلند نظمیں ملتی ہیں جن میں مخدوم محی الدین کی نظم "استالین" سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ آزاد نظم کو پوری طور پر ابہام و اشاریت کے دھندلکوں سے نکالنے میں سیاسی، تمدنی اور معاشرتی موضوعات سے اسے آشنا کرنے میں نئی امیجری سے اس کے خد و خال سنوارنے میں جعفری کا بڑا حصہ ہے۔ یہ ہئیت اگرچہ ادبی دنیا میں بہت پھیل گئی ہے لیکن ابھی اسے پوری طور پر قبول عام حاصل نہیں ہوا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ عوام میں اسے قبول کرنے کی ایک نفسیاتی آمادگی پیدا ہو گئی ہے۔

آزاد نظم کے سلسلے میں ایک تجربہ آزاد نظم اور پابند نظم کے امتزاج سے بھی کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ طویل نظموں کے لئے مفید اور بار آور ہے۔ اس کی ایک کامیاب مثال جعفری کی نظم "ایشیا جاگ اٹھا" ہے۔

موجودہ آزاد نظم میں تین چار خامیاں ہمیں آج بھی عام طور پر نظر آتی ہیں جن کو دور کرنے کی طرف آزاد نظم لکھنے والوں کو

تو یہ دینی چاہیئے پہلا نقص جو عام طور پر نظر آتا ہے مصرعوں کی ایسی جگہ توڑ دینا ہے جہاں علم بیان کے اصول سے انھیں نہ توڑنا چاہیئے۔ اس سے بیان میں جھول پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا نقص بحر کے استعمال کے سلسلے میں ہے۔ بعض اوقات مصرعے کے آخری رکن کو درمیان میں توڑ کر بقیہ آدھے رکن سے دوسرے مصرعے کی ابتدا کر دی جاتی ہے۔ یہ چیز نظم کی روانی میں فرق ڈالتی ہے اور اس کے آہنگ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہر مصرعہ سالم رکن ہی سے شروع ہونا چاہیئے۔

تیسرا نقص نئی امیجری کے بارے میں ہے۔ امیجری میں تاثر کی وحدت لازمی چیز ہے۔ آزاد نظموں میں اکثر اوقات امیجری میں تاثر کی یہ وحدت قائم نہیں رہتی جس کی وجہ سے پڑھنے والے کے ذہن پر جیسا اثر مرتب ہونا چاہیئے نہیں ہوتا۔

چوتھا نقص یہ ہے کہ آج بھی اکثر جگہ آزاد نظم شاعرانہ خصوصیات سے دور ہو کر نثر پارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح نہ صرف ناہمواری کا احساس ہوتا ہے بلکہ یہ نثر نما ٹکڑے نظم کے پورے تاثر کو زائل کر کے رکھ دیتے ہیں۔

ان اسقام کو دور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ محض تھوڑی سی توجہ چاہتے ہیں۔

نظم نگاری کی ان ہیئتوں کے علاوہ غزل کی ہیئت آج بھی زندہ اور مقبول ہے۔ غزل کی ہیئت ہمارے منفرد سیاسی، سماجی، تمدنی خیالات اور جذبات کو (میں نے منفرد کا لفظ استعمال کیا ہے جو منتشر سے مختلف ہے) پیش کرنے کا آج بھی واحد ذریعہ ہے۔ حالی جنھوں نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی تھی، ان کے زمانے سے لے کر غزل نے ترقی پسند تحریک تک پہنچتے پہنچتے بہت کچھ اپنا چولا بدلا ہے۔ اقبال نے غزل کو ایک نئی توانائی اور نیا حسن بخشا۔ حسرت، یگانہ، فراق اور فیض نے غزل کو بہت کچھ دیا اور رفتہ رفتہ اس کے مزاج کو جدید دھاروں کی طرف موڑا۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر سیاسی اور بین الاقوامی حالات کا عکس بھی غزل میں رچنے لگا جس کی مثالیں ہم مجروح کے کلام میں یا جذبی کی نئی غزلوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ غزل کی خارجی صورت وہی رہی لیکن اندرونی طور پر غزل کی ہیئت نئے موضوعات سے متاثر ہوئی اور ایک نیا لہجہ اور نیا آہنگ غزل میں سنائی دینے لگا۔

ابھی میں جو سمپوزیم "اردو کی جدید غزل" پر لکھنؤ میں منعقد ہوا ہے۔ اس میں ظ۔ انصاری نے غزل کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے کہ "غزل نے بدلتے ہوئے حالات کو قبول ضرور کیا ہے لیکن ابھی تک ایسی غزل ہمارے سامنے نہیں آئی جو پوری کی پوری جدید تر سیاسی اور سماجی مسائل، سائنسی تحقیقات یا فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہو اور اگر آئے تو وہ کامیاب نہ ہوگی۔" اس کا سبب ان کے خیال میں یہ ہے کہ غزل اپنی ہیئت کے اعتبار سے "سیاسی اور سماجی شعور کی سطح کو بلند کرنے میں زیادہ مفید نہیں۔" مجھے اس رائے سے بڑی حد تک اختلاف ہے اس لئے کہ غزل "جذبات کی زبان" ہے۔ ظ۔ انصاری غزل سے یہ توقع کیوں کرتے ہیں کہ وہ نظم کی طرح بیانیہ انداز اختیار کر کے سیاسی اور سماجی مسائل کو منطقی استدلال کے ساتھ پیش کرے۔ حالانکہ اعلیٰ نظمیں بھی سیاسی اور سماجی مسائل کو منطقی استدلال کے ساتھ "بیان" نہیں کیا کرتیں۔ بیان ([illegible]) اور اظہار کے فرق کو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ بہرکیف سیاسی اور سماجی کشمکش جن سیاسی اور سماجی فلسفوں کو جنم دیتی ہے، سائنسی اور سماجی علوم جو ذہنی روشنی اور بیداری ہم میں پیدا کرتے ہیں وہ نفسی کیفیات میں ڈھل کر جدید غزل کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ غزل یقیناً لامحدود نہیں ہے۔ اس ہیئت کے اپنے (Limitations) ہیں لیکن کوئی ہیئت بھی حدود سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، بے شک نظم کے حدود غزل سے وسیع تر ہیں لیکن ظ۔ انصاری کا یہ کہنا کہ "سماجی ضرورت کو آج کے حالات میں دوسرے درجے کی نظم اول درجے کی غزل سے زیادہ پورا کرتی ہے" بڑی نادانی کی بات ہے کیونکہ اول درجے کی غزل جو تاثر سامع کے دل و دماغ پر چھوڑتی ہے وہ دوسرے درجے کی نظم چاہے وہ سو اشعار پر کیوں نہ مشتمل

کبھی پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ تاثر پہلے درجہ کی نظم ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

البتہ ظ۔ انصاری نے اس طرف غزل کے بے تحاشا رجحان کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ یقیناً بڑی اہم ہے۔ ظ۔ انصاری نے کہا ہے کہ "غزل کا موجودہ احیا' ذہنی اور ادبی تن آسانی کا نتیجہ ہے جو سماجی فکر و تصور کے تغیرات کی وجہ سے ہماری شاعری میں آ گئی ہے"۔ یہ بات حقیقت پر ضرور مبنی ہے لیکن اس کے بھی دراصل دو پہلو ہیں۔ آج ہمارے سامنے وہ غزلیں بھی آ رہی ہیں جو زندگی کی کشمکش اور سماجی حقائق سے پیدا ہونے والے جذبات کی ترجمان ہیں اور وہ غزلیں بھی لکھی جا رہی ہیں جو اپنے موضوع میں قطعی رجعت پرستانہ ہیں۔ اس قسم کی غزلیں ہندستان میں بھی لکھی جا رہی ہیں لیکن پاکستان میں تو جیسے ان کا سیلاب امڈ آیا ہے، اس میں پاکستان کے چند غزل گو ضرور مستثنیٰ ہیں۔ پاکستان میں غزل کی ترقی کے نام پر اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کا مواد اور اسی زمانے کی لمبی لمبی ردیفوں کی ٹیکنک استعمال کی جا رہی ہے۔ غزل میں اس احیا پرستی (Revivalism) کے پیچھے دراصل پاکستان کی موجودہ سیاسی اور سماجی رجعت پرستی کے زبردست اثرات کام کر رہے ہیں۔ اس خطرناک رجحان کو روکنے اور ٹوکنے کی ضرورت ہے اور ظ۔ انصاری نے یہ بات بہت موقع سے چھیڑی ہے۔

بہر حال جہاں تک غزل کی ہیئت کا تعلق ہے' یہ ہیئت آج بھی خیالات کی جذباتی ترسیل (Emotional Communication) کا مقبول ترین ذریعہ ہے۔ اس ہیئت کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ آج غزل بھوجپوری' مراٹھی اور گجراتی ادب تک میں پہنچ گئی ہے۔

نظم اور غزل کی ان مقبول ہیئتوں کے علاوہ ایک ہیئت اردو شاعری میں جن گان (Folk Songs) کے اثرات سے پیدا ہو رہی ہے اور اس میں بھی کافی تعداد میں کامیاب چیزیں لکھی اور کہی گئی ہیں۔ مثلاً وامق کا بھوکا ہے بنگال وغیرہ۔ آج اس ہیئت کو بڑھاوا دینے کی جس شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اس کا سبب واضح ہے۔ آج ہمارا ادب متوسط اور مزدور طبقے تک تو پہنچ گیا ہے لیکن کسانوں تک نہیں پہنچ سکا ہے اور یہ کام جن گان (Folk Songs) کی ہیئت اپنائے بغیر تکمیل نہیں پا سکتا۔ جن گان کی ہیئت کو اپنانے کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ جن گانوں کی مروجہ ہیئت کو جوں کا توں اپنائیں اور ان میں نئے رجحانات اور نئے مسائل کی ترجمانی کریں۔ یہ کام اردو سے زیادہ ہندی ادب میں ہوا ہے اور جس کی بہترین مثالیں ہمیں ادھیکار کے گیتوں میں ملتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم جن گانوں کی ہیئت میں نئے رجحانات اور نئے مسائل کے بموجب مناسب اور موزوں تبدیلیاں کریں اور اس طرح ان قدیم ہیئتوں کی نشو و نما کو شعوری طور پر آگے بڑھائیں۔ یہ دونوں صورتیں مفید اور کارآمد ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اردو کے شاعر جو زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس فرض سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام بنیادی طور پر دیہات کے جن کویوں کا ہے جنھیں ترقی پسند تحریک نے اپنی ابتدا میں اپنایا تھا اور آج جن سے اپنا رشتہ تنظیمی حیثیت سے بالکل توڑ رکھا ہے۔ یا پھر ان شاعروں کی کوششیں اس سلسلے میں بارآور ہو سکتی ہیں جن کی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ دیہات میں گذرا ہو' جو وہاں کی مقامی بولی سے تعلق رکھتے ہوں' وہاں کے رسم و رواج' وہاں کے باشندوں کے رہن سہن' ان کی روزمرہ زندگی کے مسائل' ان کے دکھ سکھ' ان کے خوابوں اور خواہشوں سے پوری طرح واقف ہوں۔ یا پھر وہ شاعر یہ کام انجام دے سکتے ہیں جن کا تعلق کسان تحریکوں سے رہا ہو۔ جن کے ذریعہ دیہاتوں اور کسانوں سے انھیں واقفیت بہم پہنچ چکی ہو۔

اردو کے شاعر جو زیادہ تر متوسط طبقے سے ابھرے ہیں اور جن میں اکثر کا دیہاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا ان سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ کسان طبقے کے لئے شاعری کریں، دیہاتوں میں جائیں اور وہاں کسانوں کی زندگی کی حقیقتوں کو سمجھیں بوجھیں

ہ ان مسائل کو اپنی شاعری میں جن گیتوں کی ہئیت کے ساتھ ڈھالیں ' میرے نزدیک ایک میکانکی طریقہ ہے جو حقیقت پسندی کا
یں ہے۔ اس طرح وہ کسانوں کے مسائل کو اور جن گانوں کی ہئیت کو تو اپنی شاعری میں کھینچ تان کر لے آئیں گے۔ لیکن جن کا سما
(Folk Culture) کی اصل روح اپنے گیتوں میں نہ سمو سکیں گے اور نتیجے میں ان کے گیت بے اثر اور بے جان سی چیز
بن کر رہ جائیں گے۔ پھر سوال زبان کا بھی ہے۔ اگر یہ شاعر ان گیتوں میں اپنی زبان استعمال کریں گے تو وہ دیہاتی کسانوں
کے لئے اپنی بولیوں کے مقابل میں کبھی زیادہ دلکشی اور دلآویز نہیں ہو سکتی اور ان کی بولیوں میں گیت لکھنا ان شاعروں سے
چونکہ ممکن ہے۔

البتہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ترقی پسند شاعروں سے یہ مطالبہ جائز ہے کہ وہ عوامی ہئیتوں کو اپنا کے
جن میں جن گانوں کی ہئیت بھی شامل ہے مزدور طبقے کے لئے شاعری کریں۔ مزدور طبقے سے ان کا ربط (Contact) ایک
شہری ہونے کی وجہ سے ہر وقت ممکن ہے۔ وہ ان کی زندگیوں کا، ان کے کرداروں کا، ان کے مسائل کا، ان کی آشاؤں اور
ان کے آدرشوں کا گہرا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی دشوار طلب امر نہیں بن جاتا۔ وہ سادہ اور سہل زبان استعمال کر سکتے
ہیں اور اپنے طریقۂ اظہار (Mode of expression) کو تھوڑی سی محنت و کاوش سے آسان سے آسان تر بنا سکتے ہیں۔
ترقی پسند شاعری میں اس قسم کی آسان شاعری کرنے کی جدوجہد شروع سے جاری بھی ہے اور بہت سی کامیاب چیزیں لکھی
بھی جا چکی ہیں۔

عام طور پر ترقی پسند شاعر دو طرح کا ادب پیدا کر رہے ہیں۔ ایک متوسط طبقہ کے لئے دوسرا مزدور طبقے کیلئے۔
آج ان دونوں قسم کے ادب کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے ادب کو زیادہ
سے زیادہ پیدا وار چڑھانے کی ضرورت ہے جو دونوں طبقوں کے لئے برابر کی اپیل رکھتا ہو جو دونوں طبقوں کو متاثر کرنے
اور دونوں کے لئے جمالیاتی قدروں کی تسکین کا باعث بن سکے۔ اگرچہ طبقاتی سماج میں مکمل طور پر ایسا جامع ادب ممکن نہیں
لیکن جہاں تک متوسط طبقے اور مزدور طبقے کا سوال ہے بڑی حد تک ایک مشترک ادب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ صنعتی
شہروں میں آج مزدور کا سیاسی اور سماجی شعور پڑھے لکھے متوسط طبقے سے زیادہ پچھڑا ہوا نہیں ہے بلکہ اکثر تو مزدور متوسط
طبقے کے عام افراد سے زیادہ باشعور ملے گا۔ سوال دراصل ہئیت اور زبان کا ہے۔ ایسے ادب کو فروغ دینے میں حسب ذیل
طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں

(۱) ہم ایسی زبان کا استعمال کریں جو بول چال کی زبان کہلاتی ہے۔ اردو اور ہندی کے سہل اور عام فہم الفاظ
سے ہمیں اس زبان کا مرکب بنانا ہوگا۔

(۲) اظہار خیال اور طرز ادا کو بھی سہل اور سریع الفہم بنائیں تاکہ دونوں طبقوں کے لئے برابر سے کام دے سکے۔
اس سلسلے میں یہ بات اٹھائی جا سکتی ہے کہ بعض خیالات اور تصورات ہی پیچیدہ اور دقیق ہوتے ہیں اور ان کا اظہار
(Expression) سادہ اور سلیس انداز میں ممکن ہی نہیں لیکن یہ عذر کوئی بڑا عذر نہیں ہے۔ دقیق سے دقیق خیالات بھی سادہ
اور صاف طریقے پر بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ہاں اس کے لئے شاعر کو زبان اور بیان پر غیر معمولی طور پر قادر ہونے کی ضرورت
ہے۔ زبان اور بیان پر یہ غیر معمولی قدرت محنت اور کاوش سے ضرور پیدا کی جا سکتی ہے۔

(۳) ہمیں اپنے اظہار خیال اور طرز ادا کے لئے تشبیہیں، استعارے اور امیجری عام زندگی اور اس کے مظاہرات
سے اخذ کرنی چاہئے۔ ہمیں ایسی نئی تشبیہوں اور نئے استعاروں سے جو اجنبی اور دور از قیاس ہوں بچنا ضروری ہے۔

(۴) ہمیں ایسی تلمیحیں اور ایسی علامتیں منتخب کرنی پڑیں گی جو دونوں طبقوں کے لئے قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہوں۔

ان تلمیحوں اور علامتوں کو جو ہماری عوامی ہیئتوں میں استعمال ہوتی چلی آ رہی ہیں اور جن سے آج متوسط اور مزدور دونوں طبقے بخوبی آشنا ہو چکے ہیں، برقرار رکھتے ہوئے ہم نئی تلمیحیں اور نئی علامتیں، اپنے ملک کی تاریخ و تہذیب، اپنے عظیم تاریخی کرداروں، اپنے امر شہیدوں کے کارناموں، اپنے رسوم و روایات، اپنے کارخانوں اور ملوں، اپنے رقص و موسیقی، اپنے فن تعمیر اور فن صورت گری سے حاصل کر سکتے ہیں۔

(۵) اس ہیئت کو حسین اور دلکش بنانے میں ہمیں ہندستان کے کلچر کی اس جمالیاتی روح کو بھی اس میں سمونا ہوگا جس سے آج تک ہماری شاعری بڑی حد تک محروم رہی ہے۔

(۶) اس ہیئت کی ظاہری ساخت پابند نظم کی بھی ہو سکتی ہے، نظم معریٰ کی بھی ہو سکتی ہے جس نے آج غزل کو بھی اپنے میں رچانا اور بسانا شروع کر دیا ہے۔ اس کی ظاہری ساخت آزاد نظم کی بھی ہو سکتی ہے اور وہ ساخت بھی ہو سکتی ہے جو جن گانوں کی ہے یا ان سے اخذ کی جا رہی ہے۔

(۷) ہم وہ بحریں جو ہندی اور اردو میں مشترک ہیں یا ایک دوسرے سے اپنے آہنگ میں بہت قریب ہیں منتخب کر سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ ہمارے مقصد کے لئے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ نئی بحریں بھی ہم ایجاد کر سکتے ہیں لیکن ان کی تعمیر و تخلیق میں ہمیں ہندستانی موسیقی کی روح کی آمیزش ضرور کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں عظمت اللہ خاں کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس طرح جو ہیئت یا ہیئت کی مختلف صورتیں ابھر کر ہمارے سامنے آئیں گی وہ بہت بڑی حد تک دونوں طبقوں کے لئے مشترک طور پر دلکش، پر اثر اور حیات بخش ثابت ہوں گی۔ ان پر ہماری قومی زندگی اور اس کی عظیم روایات کی گہری چھاپ ہوگی۔ شاعری زندگی کے کتنے ہی بلند مسائل اور انسانیت کی کتنی ہی اعلیٰ قدروں سے بحث کیوں نہ کرے اور اپنے موضوع میں کتنی ہی بین الاقوامی کیوں نہ ہو اس کی ہیئت یقینی قومی ہوتی ہے۔ غیر ملکوں کی ادبی تحریکوں میں ہیئت کے تجربوں سے ہم ضرور فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھانا چاہیئے۔ لیکن اس میں ہمیں اندھی یا اندھا دھند تقلید سے بچنا چاہیئے۔ یہ کام (Synthesis) اور (assimilation) کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ غیر ملکی ہیئتوں کے کونسے عناصر کو ہماری زبان اور شاعری اپنے مزاج میں قبول کر سکتی ہے اور کونسے عناصر ہمارے لئے مخالف اور مضر ہوں گے، اس کی سوجھ بوجھ لازمی ہے۔

بہرکیف آج ہیئت کے تجربات کی طرف دھیان دینے اور راستہ ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت ہے جس میں ہم متوسط اور مزدور دونوں طبقوں کے لئے مشترک طور پر زیادہ سے زیادہ ادب پیدا کر سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے شاعروں کی نئی ابھرتی ہوئی پود ہماری شاعری میں نئی ہیئتوں کا تجربہ کرے گی اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرے گی۔ نئے شاعر ہماری شاعری کے مستقبل کے امین ہیں۔ آج کے شاعروں نے ہیئت کو جس منزل اور جس مقام تک پہنچایا وہ اسے اور بھی آگے لے جائیں گے۔

میں اس نئی نسل سے جوش کا ہم زبان ہو کر اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں ؎

اللہ کرے کہ میرے کمسن شعرا تم مجھ سے ہزار درجہ آگے بڑھ جاؤ

غزل

رشید الدین خاں

(۱)

تجرباتی اور تجزیاتی علوم کے فروغ، تاریخ کے جدلیاتی اور مادی نظریہ کی ترویج، انسانی آزادی اور مساوات کی فتحیابی، سماجی اشتراک اور بین الاقوامی معاشی، تکنیکی اور تہذیبی قربت، وابستگی اور باہمی انحصار نے پچھلے سو سال کے اندر فن کے نظریہ اور ادب کے نقطۂ نظر میں انقلابی تبدیلی پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے فن اور ادب کے زندگی اور سماج سے گہرے تعلق کو اتنا واضح کیا گیا ہے کہ آج مختلف الخیال نقاد اور مبصر اس نکتہ پر متفق ہیں کہ فن اور ادب زندگی کے آئینہ دار بھی ہیں۔ نقاد بھی اور رہبر بھی۔ ادب اور فن انفرادی احساسات کی جلوہ گری اور سماجی تاثرات کی نقش کشی اور رہبری سے نہ صرف جمالیاتی اقدار کو جنم دیتے ہیں بلکہ اسی طرح تہذیب کے سرمایہ میں بھی گرانقدر اضافہ کرتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کا ادب اور فن، اعلیٰ تہذیبی شاہکار ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہر ملک اور قوم کا ادب عالیہ (Classics) نہ صرف اس ملک اور قوم بلکہ ساری مہذب دنیا کی میراث ہے اور اسی خزانے سے فیض یاب ہو کر ہر عہد کے ادیب اور فنکار اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنا موضوع فکر و فن، ادبی مواد، انداز بیان، ہیئت اور اسلوب متعین کرتے ہیں۔ انہی روایات کی بنیاد پر نئے ادب کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور اس میں گلکاریاں کی جاتی ہیں۔ کیونکہ نیا ادب پرانے ادب کے ورثہ کو نہ صرف اپناتا ہے بلکہ اس میں اضافہ کرتا ہے اور آگے بڑھاتا ہے۔ اسی تسلسل سے ادبی اور تہذیبی زندگی قائم و دائم ہے۔

(۲)

ہر فنی تخلیق (Art Creation) کے چار جز ہوتے ہیں۔ دو خارجی اور دو داخلی۔ "ہیئت" اور "ٹیکنیک" خارجی جز ہیں اور "موضوع" اور "اختراع" داخلی۔ پھر "ہیئت" موضوع کی اور "ٹیکنیک" اختراع کی خارجی شکل ہے۔ اور اسی طرح "موضوع" ہیئت کی اور "اختراع" ٹیکنیک کی داخلی شکل ہے۔ ان چار اجزاء کے مجموعی تعلقات ہی سے فنی تخلیق ممکن ہے۔

ہیئت فنی سانچہ ہے اور فنکار کا سماجی اور تہذیبی ورثہ۔ ہر موضوع ایک موزوں اور مخصوص ہیئت میں ڈھلتا ہے، اس لئے فن اور ادب کی تخلیق میں ہیئت کی اہمیت واضح ہے۔ ٹیکنیک سے مراد علم اور اصول فن ہے۔ ٹیکنیک گنجینۂ تہذیب سے تحصیل فیض کا نام ہے۔ اس تحصیل سے نہ صرف فنکار کے تہذیبی اور تاریخی نقطۂ نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے، بلکہ فنی ارتقا کے مطالعہ اور اصول فن کی آگاہی سے موضوع کے انتخاب اور اختراع میں بھی مدد ملتی ہے۔ مگر ہر فن کا بنیادی جز "موضوع" ہے۔ وہ فنی تخلیق کی روح اور نکتۂ مرکزی ہے اور باقی تینوں اجزا اسی نکتہ کے گرد گھومتے ہیں لیکن کوئی موضوع فنی قالب میں "اختراع" کے بغیر ڈھلتا نہیں ہوتا۔ اختراع، ہر فنکار کا ذاتی

وصف اور اس کی انفرادیت کا اظہار ہے۔ اختراع سے مراد جدت تخلیق یا اجتہاد ہے اور وہ روح عصر کے تقاضوں کی بازیافت سے عبارت ہے۔ تحصیل ماضی اور اجتہاد حال یعنی "ٹیکنیک" اور "اختراع" کے ملاپ سے فن کی تخلیق میں اپج اور ندرت تو ضرور پیدا ہوتی ہے مگر تخلیقی فن کے لئے "موضوع" کی اہمیت اور اس موضوع سے ہئیت کی یگانگت ازبس ضروری ہے۔ موضوع اگر پیام فن ہے تو ہئیت پیام بردار ہے۔ موضوع خیال ہے اور ہئیت ترجمان خیال۔ اس لئے موضوع اور ہئیت میں گویا جان و قلب کا تعلق ہے "گل اور نکہت گل کا تعلق۔ یوں تو موضوع کے انتخاب میں تجربۂ ماضی، تولائے وقت اور امید سحر سب ہی سے مدد ملتی ہے مگر ہر موضوع شعوری یا غیر شعوری طور پر زمانۂ حال ہی کے واضح یا مخفی سوال، اہم مسئلوں اور بنیادی عقیدوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ گو اس ترجمانی کی روشنی میں بڑے فنکار اور ادیب بعض دائمی مضامین کو بھی چھو لیتے ہیں اور موضوع کی موقتی دلچسپی کو دیرپا لطف اور ابدی تاثیر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہر موضوع اس کی اختراع اور اس کے انداز بیان میں فنکار کی انفرادی شخصیت جھلکتی ہے۔ اس کے برخلاف ہئیت اور ٹیکنیک، فن اور ادب کے غیر شخصی (Impersonal) اجزا ہیں جس کو ہر اچھا فنکار اپنے موضوعی اختراع سے نکھارتا ہے کیونکہ خود موضوع ہئیت کو اور اختراع ٹیکنیک کو تراش لیتے ہیں۔

مرور زمانے کے ساتھ موضوع تو یوں بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن ہئیت کی تبدیلی کسی قدر تاخیر سے ہوتی ہے۔ کیونکہ موضوع کا تعلق تو براہ راست ادبی ماحول سے ہوتا ہے اور جوں جوں تہذیبی زندگی انقلاب پذیر ہوتی ہے، ادب اور ادبی مواد بھی بدلتا رہتا ہے مگر ہئیت کا تعلق ادبی ماحول سے بالواسطہ رہتا ہے۔ وہ توفنی سانچہ ہے جو بڑی کاوشوں سے بنتا ہے۔ اور اسی لئے بڑی مدت تک پائدار رہتا ہے اور مختلف ماحولوں کے ادبی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ موضوع کی رنگارنگی اور تنوع ہر بار ہئیت کو تبدیل نہیں کرتی۔ البتہ ٹیکنیک بدلتی جاتی ہے بلکہ اختراع سے خود نفس موضوع بھی بدلتا ہے مگر ایک حسین ہئیت سینکڑوں موضوع اور اسلوب کو زمانوں تک خوبصورتی سے اپنے اندر سمو سکتی ہے۔ ڈرامے کی ہئیت نے انسانی تاریخ کے مختلف زمانے دیکھے ہیں اور ہر زمانے میں اس ہئیت میں نئے نئے موضوع، نئی ٹیکنیک اور اختراع کے ساتھ سموئے گئے ہیں۔ جو آج بھی اپنی ادبی شوکت کے ساتھ انسانی فکر و نظر کی تاریخ کا شاندار کارنامہ ہیں۔ ایسکی لس (Aeschylus) اور ارسٹوفینس (Aristophanes) سے لے کر مارلو (Marlowe) اور شیکسپیئر (Shakespeare) اور مولیر (Moliere) اور شا (Shaw) تک ڈرامے کے موضوع میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی چلی آئی ہے اور گو ہئیت کے لوازمات بدلے ہیں۔ ٹیکنیک بدلی ہے اور اختراع کے طریقے بدلے ہیں لیکن ہئیت خود نہیں بدلی اور نئے ادب کی تخلیق کیلئے ہئیت کا بدلنا ضروری بھی نہیں ہے کیونکہ تخلیقی ادب عبارت ہے ٹیکنیک کی مہارت اور اختراع کی ندرت کے ساتھ موضوع کی جدت اور ہئیت کی یگانگت سے یعنی یہ کہ "علم" (ٹیکنیک اور ہئیت) اور "عمل" (اختراع اور موضوع) کے امتزاج سے تخلیقی ادب نہ صرف نیا ادب بنتا ہے بلکہ ادب عالیہ (Classics) بھی۔

(۳)

ہر ادب ایک مخصوص فضا میں پرورش پاتا ہے۔ سماج کا تاریخی پس منظر، تہذیبی نشیب و فراز اور فنی ماحول اس فضا کو باندھتا، نکھارتا اور محفوظ رکھتا ہے اور جیسے جیسے یہ پس منظر بدلتا جاتا ہے، فضا بھی رت بدلتی ہے کیونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی فضا میں تخیلات کے کھیت لہلہاتے ہیں اور یہ ادبی فضائیں تو سارے اصناف ادب کو پروان چڑھاتی ہے مگر بعض مخصوص ہئیت اور اسلوب کو جو عصری موضوعات کو حسن و خوبی سے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، زیادہ سنوارتی اور نکھارتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مختلف زمان و مکان میں مختلف اصناف ادب کو فروغ ہوا۔ مثلاً قدیم یونان میں ڈرامہ

مکالمہ (Drama and Dialogue) کی صنف زیادہ مقبول تھی۔ یونان کے تینوں مشہور و معروف ادبی فنکار۔ ایکیلس (Aeschylus)، صوفاقلیس (Sophocles) اور یوری پڈیس (Euripides) کی تصنیفات ڈرامہ کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔ افلاطون کے فلسفیانہ مباحث اور ارسطو کا بیشتر حاصلِ فکر، مکالمی ادب ہی میں ہم تک پہنچتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دوسرے اصنافِ ادب کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، غلط ہوگا۔ گو یہ صحیح ہے کہ ڈرامہ اور مکالمہ کو افضلیت حاصل تھی۔ اسی طرح قدیم ہندوستان، عرب اور عجم میں نظم کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ وید مقدس، مہابھارت اور رامائن کی کتھائیں، کالیداس کی شاعری، امراء القیس کی نظمیں، سبع معلقات، رودکی کے نغمے، فردوسی کا شاہنامہ، حافظ کا دیوان، اور رومی کی مثنوی وہ مہتم بالشان نمونے ہیں جو اس ادبی تاریخ پر صداقت کی مہر ثبت کرتے ہیں لیکن اس واقعہ کو نہیں بھولنا چاہیے کہ تقریباً ہر ادب کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ گو اپنے ارتقائی منازل میں بعض ادیبوں نے نظم کی صنف کو زیادہ قوی اور خوبصورت بنا دیا اور دوسرے ادیبوں نے کسی قدر جلد نظم کی صنف کو چھوڑ کر نثر کی صنف پر زیادہ دلچسپی دکھائی۔ اسی طرح قدیم روس میں ناول کی مقبولیت، قدیم روم میں آزاد بحر کی کامیابی اور فرانس میں افسانوی ادب کے فروغ کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ دکنی اردو کے قدیم نمونے بھی خواہ وہ قطب شاہی گولکنڈہ کے ہوں یا عادل شاہی بیجاپور یا گجرات اور اورنگ آباد کے زیادہ تر نظم ہی کی شکل میں ملتے ہیں۔ سندھ، پنجاب اور اودھ میں بھی ابتدائی اردو کی مثالیں نظم کی صنف میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ داستانو، قصص اور نثر کی دوسری ہیئت کو بہت بعد میں فروغ ہوا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں صحیح معنوں میں اردو نثر منظر عام پر آئی۔ ملا وجہی کی "سب رس" اور خواجہ گیسو دراز کی "معراج العاشقین" اردو نثر کی پہلی کتابیں ضرور ہیں مگر "عہد نثر" کی پیداوار نہیں ہیں اس لئے مستثنیٰ ہیں۔ مگر باوجود اس کے اردو ادب کی محفل میں شعر و شاعری کا چرچا رہا اور آج بھی ہمارے ادبی میزان میں شاعری ہی کا پلہ بھاری ہے۔

ہر ملک اور قوم کا ایک ادبی اور فنی مزاج بھی ہوتا ہے۔ یہ مزاج صدیوں کی تہذیب، معیشت، عقائد، سماجی نفسیات، مشاہدہ اور اجتماعی تجربات اور شعور کی آمیزش سے بنتا ہے اور ادبی اور فنی تخلیق میں سرایت کر جاتا ہے کیونکہ ادب اور فن کا تعلق تخیل کی وسعت، مشاہدہ کی گہرائی، تاثر کی شدت اور شعور کی بالیدگی سے ہوتا ہے اور یہ تخیل، مشاہدہ اور شعور خود سماجی اور تہذیبی نشیب و فراز سے متعین ہوتے ہیں۔ اس مزاج کو ہر طبقہ کے فنکار اپنی نظریاتی ضروریات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وسیع تقسیم کے لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق میں ادبی مزاج کا تانا بانا فکر و جستجو اور جذب و شوق سے بنا ہے اور مغربی ادب کا رجحان عملی اور مادی ہے۔ مشرق میں شعر و نغمہ کو جو عظمت حاصل ہے وہ مغرب میں ناول، افسانے اور واقعاتی مضامین کو حاصل ہے اس لئے دونوں علاقوں کے ادبوں کا تقابل اور موازنہ غلط تنقیدی عمل ہوگا۔ مثلاً اردو شاعری میں جو جذبات کے زیر و بم، انبساط اور غم کی سینکڑوں لطیف کیفیات اور باریکیاں ہمیں ملتی ہیں، اس کا پاسنگ بھی ہمیں ہولنڈیزی (ڈچ) زبان یا جرمن زبان میں نہیں ملے گا، کیونکہ ناچ و رنگ، لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ، آشفتہ سری اور آشفتہ بیانی مشرقی فن اور شاعری کی جان ہے اور یہ جانِ غزل کے قالب میں ڈھل کر قیامت ڈھاتی ہے۔ غالب نے شاید غزل ہی کے حسن سے متاثر ہو کر کہا تھا ؎

قیامت ہے اسدؔ اس کی ہر اک بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

غزل کا گلستانِ سخن کلام کا جنت نشاں ہے۔ اس کی آبیاری، فنی مشقت کے پسینے کے علاوہ حسنِ عمل اور عملِ حسن کی ہوتر نگی سے ممکن ہے۔

اسی ردوقدح میں یہ بحث مفید، اہم اور دلچسپ ہے کہ آیا اردو شاعری دورِ جدید کے تہذیبی تقاضوں کو خاطر خواہ طور پر پورا کر رہی ہے یا نہیں؟ اور کیا نئے موضوع اور مواد کی فراوانی، نئی ہئیت، نئی تکنیک، نئے اسلوب اور نئے استعاروں کو جنم دے رہی ہے یا نہیں؟ اور اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو کونسی فنی اور غیر فنی وجوہات ہیں جو اس کے تہذیبی فرض سے عہدہ برآ ہونے میں حائل ہیں۔ اس سلسلے میں ناقدین اکثر دو اعتراضات اردو شاعری پر عموماً اور اردو غزل پر خصوصاً کرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ فنی سانچے پرانے ہو چکے ہیں اور پامال شدہ ہئیت کو بار بار استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح ہر نئی شراب کو پرانے پیمانوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ بجا یہ کہ یاران میکدہ، پیمانۂ دیرینہ کی دلآویزیوں کے منکر نہیں۔ ان کو ساقی سے بس یہ گلہ ہے کہ پرانے جام و پیمانہ میں شراب تو خمار تو لاتی ہے مگر ساتھ ہی گزری بہاروں، افسانہ دیرانوں، پرانے جنون اور فرسودہ عشق کی یادوں کو تازہ کر دیتا ہے کیونکہ پیمانۂ دیرینہ میں بادۂ کہن ہی کا لطف آتا ہے حالانکہ نئی شراب سے نئے مزے، نئی مستی اور نئے جذبوں کی آس ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ نقش کشی، تخیل اور محاکات کا پس منظر بھی بدلنا چاہیے۔ بندھی ٹکی تشبیہات، مستعمل استعارات اور بے تکی تلمیحات، غیر فطری اور غیر حقیقی ہو چکی ہیں۔ کیونکہ گل و بلبل، شمع و پروانہ، ساقی و میخانہ، جنون و صحرا، اور کعبہ و بتخانہ سے موجودہ زندگی تقریباً بے تعلق ہے اور اس لئے موجودہ فن تقریباً بیگانہ ہو چکا ہے۔ یہ نقوش، یہ تصاویر آجکل کی جہاں ہیں میں حرف ادبی تاریخ کے طاق کہن کے ـــ یا طاق نسیاں کے ـــ نقش و نگار بن چکے ہیں۔ ان میں الجھنا گویا زندگی کی بین اور عاصر حقیقتوں سے منہ پھیر کر موہوم اور افکار رفتہ سرموز کا دامن تھامنا ہے اور تقاضائے وقت کو شکستہ روایات پر قربان کرنا ہے۔ اسی لئے وہ اقبال کے الفاظ میں شاعر سے تقاضا کرتے ہیں کہ

ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر

لیکن اس ضمن میں یہ سوالات بھی اٹھتے ہیں کہ کہیں بادہ خوار اپنا شوق میں ساقی سے غلط شکوہ اور بیجا تقاضا تو نہیں کر رہے ہیں؟ اور کیا اس کا امکان تو نہیں کہ میکش خود یادِ ماضی میں مخمور، جذب دروں سے عاری اور خمار نو سے بیگانہ ہیں۔ اگر یوں ہو تو ساقی کو کیوں روئے۔ اپنے حال پہ روئیے۔

(۵)

مندرجہ بالا سوالات کے تجزیے اور ان پر بحث سے پہلے مناسب ہوگا غزل کی ہئیت اور اس کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔

اردو شاعری اردو زبان کی طرح ہندی، فارسی سنجوگ کا نتیجہ ہے۔ اس کی عمارت کی بنیادیں ہندی بھاشا پر پڑی ہیں اور اس کے در و دیوار، محراب و منبر کی گلکاریاں زبان فارسی نے کی ہیں، مگر اردو غزل پر فارسی شعر و نغمہ کا رنگ گہرا ہے۔ غزل کی ہئیت ایران میں (بقول علامہ شبلی "شعر العجم") رودکی کی نظموں اور فردوسی کے شاہنامے کے بعد، دورِ انحطاط کی روایت پرست اور تعیش پسند سماجی ماحول کی پیداوار ہے۔ جیسے مشرق وسطیٰ، خصوصاً ترکی اور ایران کی دوسری تہذیبی میراث مغلوں اور ان سے پیشتر سلطنت دہلی کے شاہی خاندانوں جیسے خلجیوں اور تغلقوں کے ذریعہ ہندوستان آئی اور ہندوستان کی تہذیب کے رگ و پے میں سرایت کر گئی، اسی طرح وہاں کا فن شاعری ہندوستان پہنچ کر یہاں کے مزاج میں رچ بس گیا تھا۔ اردو غزل کا عروج ہندوستان میں مغلوں کی جاہ و حشم کے آخری زمانے میں ہوا جب کہ ان کی قومی معیشت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ یہ اپنا غلبہ عسکری، جاگیردارانہ نظام، مغربی ملوکیت کے استبداد کے مقابلہ میں اثر رہا تھا اور یہاں کا دیرینہ زرعی، حرفی سسٹم، نوآبادیاتی غلامی میں تبدیل ہو رہا تھا یا یوں کہیے کہ مغلیہ جاگیرداریت

کی آخری ہچکی اور مغربی سامراجیت کی اپنی مسکراہٹ کے وقفہ میں اردو غزل پروان چڑھی۔ یہ عجیب و نگیر تاریخی نکتہ غزل کی ترقی اور شدید پیچ' سماجی تنزل اور نزاع سے وابستہ ہے۔ شاید اسی تضاد کے دل شکن احساس سے تڑپ کر غا نبان سے خود غزل نے اپنا نوحہ یوں پڑھا تھا ؎

نہ گل نغمہ ہوں' نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اور شکست کی آواز ہونے کے محزوں شعور نے غزل کی زبان میں درد اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے غزل "فریاد کی لَے" اور "نالۂ پابند نَے" بھی ہے۔ ایک طرف اس میں گھٹی ہوئی' مدقوق اور ڈرپوک جاگیردارانہ سماج کے بھدّے نشانات ملے دوسری طرف اسی جاگیرداری سماج کی رزم و بزم کی دلکشی' حسن و عشق کی لطافتوں اور شان و شوکت کے زریں نقو ملتے ہیں۔ غزل کے اشعار میں جاگیردارانہ سماج کے دونوں رخ ــــ دیدہ زیب اور مکروہ ــــ جھلکتے ہیں۔ اس لئے اس سرمایہ میں گل و لالہ ہی نہیں خار و خس بھی ہیں۔ اس ذخیرہ کو اکٹھا کرنے میں اردو غزل حیرت انگیز حد تک فارسی غزل شاعری کی مرہون منت ہے چنانچہ اساتذہ اس امر کا فخریہ اعتراف کرتے تھے ؎

ریختہ بیدل میں ریختہ کہنا   اسداللہ خاں قیامت ہے

ولی اورنگ آبادی کا شعر ہے ؎

عرفی و انوری و خاقانی   مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن

آج تک بھی پوری طرح اردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل فارسی کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکی ہے۔ وہی ردیف و قافیہ وہی قواعد و ضوابط' اوزان اور عروض' وہی نقش کشی' محاکات اور تخیل' وہی روایتی موضوع سخن' وہی داخلیت عینیت پرستی' وہی معنوی اور منطقی بے ربطی' وہی تعین دلکشی' متعین الفاظ' خیالات' جذبات اور مشاہدات اسی گھٹی محدود فضا کی وجہ سے بعض نقاد اردو غزل کو فارسی کی نقالی کہتے ہیں۔ اس لئے یہ صحیح ہے کہ ایک طرح سے اردو شاعر اردو غزل کی تاریخ' فارسی اثر سے آزاد ہونے اور خود اپنی آزادانہ شخصیت بنانے کی تاریخ ہے۔ تین چار سو سال مدت میں غزل کی رنگین شخصیت نے مختلف نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ کئی بہاروں نے اس کے جوبن میں دلآویزی پیدا کی اور ان ساری موسمی تبدیلیوں کا کچھ نہ کچھ اثر آج بھی اس کے رنگ روپ پر عیاں ہے۔

عہد وسطیٰ کے ایران اور ہندستان کے جاگیردارانہ سماج' مذہبی اور تصوفانہ تہذیبی پس منظر اور سیاسی اح نے غزل پر روحانیت' عینیت اور داخلیت کی چھاپ لگادی تھی اور اس نظریاتی ماحول نے غزل کے فنی ضوابط میں جذ اشاریت' ابہام اور منطقی اور موضوعی بے ربطی کو لازم کر دیا تھا

ایران اور ہندستان جہاں غزل پروان چڑھی قدیم مذہبی گہوارے ہیں جن کا تہذیب اور تمدن صدیوں مذہبی اصلاحوں' عقائد کی تبدیلیوں اور ایمانوں کے ارتقا کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان کا ادبی سرمایہ ہزا دیومالاؤں' فوق البشری قصّوں اور حیرت انگیز روحانی داستانوں اور رزمیہ کہانیوں سے مالامال ہے۔ مذہب کی ہمہ گیری کی وجہ سے فن اور ادب میں روحانیت کا عنصر غالب ہے اور جہاں روحانیت کا تسلط ہو وہاں عینیت کا غلبہ احترام بدیہی اور لازمی ہے۔ مشرق کے فلسفۂ عینیت کا تعلق مشرق کے مذہبی ارتقا سے قریبی اور گہرا ہے۔ کیونکہ عینیت کو تصوف سے تقویت ملی اور تصوف مشرقی' بعد الطبیعیاتی اور مذہبی تجربات ہی کی پیداوار ہے۔ ہمار۔ اور عہد وسطیٰ کے ہر گوشۂ حیات پر روحانیت اور عینیت کے نظریاتی ماحول کا اثر پڑا ہے اور علمی مفروضوں' محدود فنی رموز' ادبی استعاروں اور تشبیہوں' تخیل اور مشاہدہ' شعور اور ضمیر' جذبات اور ادراک' غرض

سماجی زندگی کے وسیع علمی اور عملی تقاضوں پر اسی روحانیت اور عینیت کی نقش ہے۔ اس سے غزل کیونکہ بچ سکتی
اساتذہ متقدمین اور متوسطین کے بیشتر اشعار سند میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ میر کے دو شعر ہیں ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی   چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے   رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

کہتے ہیں۔

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا   غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

کے یہ شعر ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے   پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

غالب کے یہ اشعار

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد   عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
داماندگی شوق تراشے ہے پناہیں   دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ   جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں   ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں   اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے   جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور

پھر وہ معرکۃ الآرا قطعہ "اے تازہ واردان بساط ہوائے دل" اور اس کا مقطع ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

عینیت کی بہترین مثالیں ہیں۔ مرزا داغ کی غزل بے حمد کا شعر ہے ؎

دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں   [illegible]
دل لے بدعا دیا تو نے   لاکھ دینے کا ایک دینا ہے

جب کہ مروجہ عقیدہ یہ ہو کہ کائنات "آتما" کے ایک مرکب روپ یا روح کی ایک دلکش تصویر ہے اور سارا نظام شمسی
عین حیات ایک نامعلوم روحانی "قوت" (جس کو خدا کہیئے ایزد ذہن کہیئے یا تری مورتی، برہما، وشنو، شیوا) کے کرشمے سے
ہے۔ ایسی "قوت" جو خود نہیں "ظاہر" ہو سکتی یا "معلوم" کی جا سکتی ہے بلکہ اپنی قدرت اور تخلیق سے پہچانی جا سکتی ہے
کہ یہ ایقان سے کہا جائے کہ مادہ لایعنی شئے ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ "مایا" ہے اور دماغ کا فتور یا نظر کا دھوکا اور
" کا جواز داخلی ہے، خارجی نہیں، جسم ایک اٹل قدر اور روح ایک اٹل قدر اور ان کا کوئی نامیاتی رشتہ نہیں ہے
جسم فانی ہے اور روح لافانی اور ابدی اور چونکہ ان عقائد کے تسلیم کرنے میں عقل مانع ہوتی ہے اس نے عقل و خرد
دھوکا ہے صرف عشق و جذبہ حقیقت ہے تو کچھ عجب نہیں کہ "داخلیت" اور "جذباتیت" کو علوم و فنون میں فروغ ہو گا
دنیا اس زندگی کے ملزوم سمجھے جائیں گے اور فلسفہ قنوطیت اور نظریہ تقدیر تسلیم کیا جائے گا۔ اسی لئے غزل جیسی خوبصورت
اور جامع فنی ہیئت بھی اسی داخلیت اور جذباتیت کی آئینہ داری کرتی رہی ہے۔ درد کے اشعار ہیں ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے   میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

صنف رس

میر نے شاعری کو کتاب درد و غم سے تعبیر کیا ہے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے   درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

آتش کہتے ہیں ؎

کہوں کیا ہوئی عمر کیوں کر بسر   میں جاگا کیا بخت سویا کیا

نظیر اکبرآبادی کا شعر ہے ؎

دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیر   پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

غالب نے ایک مشہور قصیدہ میں خارجی دنیا کی بے مائیگی کی یوں تحقیر کی ہے ؎

ہر ذرہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم   لغو ہے آئینہ فرقِ جنون و تمکین
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم   درد یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ذوق و غالب کے یہ دو ہم مضمون شعر نظریہ تقدیر کو واضح کرتے ہیں ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات   رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج   شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غزل کی موضوعی نزاکت ہی نے اس میں اشاریت اور ایہام کو داخل کیا اور بحیثیت تکنیک کے میں تو سمجھتا ہوں کہ ا… اوصاف کی وجہ سے غزل کے حسن بیان میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ غزل عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا۔ اس لئے فنی اعتبار سے غزل صرف "ورد و فی جذبات" ، داخلی کیفیات اور قلبی واردات ہی کے لئے اختراع کی گئی تھی کیونکہ اجتماعی شعور اور خارجی مشاہدہ کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے دوسری اصناف سخن موجود تھیں جیسے آزاد نظم ، مثنوی ، مسدس ، قصیدہ ، مرثیہ وغیرہ۔ اسی لئے نورا للغات جلد سوم صفحہ ۵۵۲ میں غزل کی بابت لکھا ہے کہ "اصطلاح میں وہ اشعار جن میں حسن و عشق، وصال و فراق ، اشتیاق ، جنون ، یاس وغیرہ کی باتیں جو عشق سے متعلق ہیں کہی جائیں" اور ظاہر ہے کہ حسن و عشق ، جذب و شوق، غم و یاس کے نازک مضامین ، نفسیاتی تذکروں یا فلسفیانہ اور تصوفانہ نکتوں کے بیان میں اشارے ، کنایے ، اسرار اور رموز کے استعمال سے معنوی حسن پیدا ہوتا ہے۔ پھر اشاریت کا دامن تھام کر ان مضامین میں جو بانکپن پیدا ہو سکتا ہے وہ دوسری صورت اور لب ساری گری سے ناممکن ہے ؎

ولی   عزیزو کیا ہے پروانے کے دل میں   کہ جی دینا اسے آساں ہوا ہے
میر   آنکھوں سے جو پوچھا حال دل کا   اک بوند ٹپک پڑی لہو کی

سودا کا شعر اسی مضمون میں ہے ؎

اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے   ٹپکا تری آنکھوں سے کبھی لخت جگر بھی

اور پھر میر کے یہ دو نشتر ؎

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے   تری آنکھوں کی نیم خوابی سے
کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات   کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

غالب کی بہت سی غزلیں اشاریت اور رمزیت کی بہترین مثالیں ہیں جن میں سوز عشق ، نفسیاتی تجزیے اور فلسفہ ملتے ہیں۔ ردیف "الف" کی چند مثالیں اس کو واضح کریں گی ؎

بوئے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

قطعہ میں اشاریت کے رنگ میں عشق و حسن کا لاجواب تقابل کیا گیا ہے ؂

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام — گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو — یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو — واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی — جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا — یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ی غزل جس کا مطلع ہے ؂

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا

اشاریت اور رمزیت کے ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ جاگیرداری اخلاق کے ایک عجیب بے ڈھنگے اصول کے تحت محبوب یر کے صیغہ میں مستحسن سمجھا جاتا تھا اور تانیث کے صیغہ میں معیوب اور خارج از آداب۔ اس میں شاید عورت کی مجبوری ے زیادہ خانقاہوں اور عیش پسند جاگیرداروں کی غیر فطری جنسیاتی بے راہ روی کو بھی دخل تھا۔ اس لئے محبوب اننے کے لئے اشارے اور کنائے کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ تصوفانہ غزلوں میں بھی خدا کی تعریف اور توصیف کئے یں پڑتی تھی۔ بہرحال "معشوقِ حقیقی" اور "معشوقِ مجازی" دونوں کا ذکر غزل میں تمثیلاً اور اشارتاً ہی بہتر اور مستحسن ا اور اس کو نازک خیالی تصور کیا جاتا تھا اور پھر بعض نازک خیال اربابِ سخن کو یہ بھی گراں گزرا اور ان کے یاں تو ازک" اپنی انسانی شخصیت سے دست بردار ہو کر محض ایک علامت، ایک نئی رمز کا نکتہ، ایک غیر جنسی محبوبہ بن گیا ہے۔ ھوں نے تو محبوب کو دنیا و مافیہا سے پرے عالمِ تصور کی ایک بوالعجبی میں تبدیل کر دیا تھا۔ نظیر اکبرآبادی، مرزا غالب مومن خاں نے اس غلط تقلید سے احتراز کیا اور محبوب کو اس کے فطری جنس میں اس کے حقیقی حسن سے سنوارا۔ ابتدائی غزل کے چند اشعار ہیں ؂

نہ سرخیِ غنچۂ گل میں ترے دہن کی سی — نہ یاسمن میں صفائی ترے بدن کی سی
یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے — جھلک کسی کے دوپٹہ میں نورتن کی سی
ترا جو پاؤں کا تلوا ہے نرم مخمل سا — صفائی اس میں ہے ویسے تو نسترن کی سی

زل "وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" اردو زبان میں بے باک پاکیزہ اور فطری واردات عشق کی ل ہے اور ان کے اس شعر میں خیالی عشق نہیں، بلکہ ذاتی مشاہدہ ہے ؂

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں — ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

ہر آتا ہے کہ مومن کی شاعری میں موضوعِ عشق، فنی عشق نہیں ہے بلکہ شخصی تجربات اور حقیقی جذبات کی ترجمانی ی شاعری پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ان کی ایک مرصع اور بے مثال غزل کے یہ اشعار ؂

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

تی نہیں بلکہ ذاتی مشاہدہ اور واردات رفتہ کا بیان ہیں اور اس کا پتہ ان کے کلام میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ کیونکہ جو شاعر

سب میں

یہ کہے کہ ؎

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کاروبار شوق کسے — ذوق نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شور سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائی خیال کہاں

وہ محض گل و بلبل کی شاعری نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنے ہی سحر دلبران کی تعمیم سے پڑھنے والے کے بربط دل کے تار چھیڑ دیتا ہے اور اپنے دھڑکتے دل کی صدا سے سارے دھڑکتے دلوں کو متاثر کر دیتا۔ کیونکہ اپنے غم کو غم دوراں میں اور غم دوراں کو اپنے غم میں بدل دینا ہی اچھے شاعر کا کمال ہے۔

غزل کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل مضمون ہوتا ہے۔ ایک جداگانہ کیفیاتی وحدت اور اسی لئے اس کو "فرد" یا "بیت" کہتے ہیں۔ غزل میں معنوی، منطقی، کیفیاتی یا جذباتی تسلسل نہیں ہوتا مگر ہر شعر خود جامعیت کی بہترین مثال ہوتا ہے۔ (با ایں ہمہ فارسی میں بھی اور اردو میں بھی بہت سی مشہور غزلوں میں تسلسل موجود ہے خصوصاً میر، درد، نظیر، غالب اور مومن کی غزلوں میں) جہاں اس بے ربطی کی نظریاتی وجہ یہ ہے کہ غزل پر فلسفۂ عینیت اور تصوف کی چھاپ ہے وہاں یہ فنی وجہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ غزل کا تخاطب چونکہ محبوب سے ہوتا ہے اور عشق میں مسلسل سے زیادہ بے ربط اور مختلف النوع باتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے غزل عاشق کی کیفیاتی بے ربطی، موضوعی بے منطقی اور جذباتی تلون کی حامل ہے۔ ایک غزل ایک مکمل داستان عشق ہے جس میں امید و یاس، بیم و رجا، روز وصل و شب فراق، بندگی و آوارگی، خلوص و بوالہوسی، وفائے عاشق اور جفائے محبوب سب ہی کا ذکر ملتا ہے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ مخصوص سماجی اور تاریخی حالات کی وجہ سے اردو غزل نہ صرف اردو شاعری بلکہ اردو ادب کا جوہر بن گئی ہے۔ ہمارے ادبی خزانے میں غزل سے زیادہ آبدار اور بے بہا موتی اور کوئی نہیں ہے۔ غزل کی جامعیت اس کے اسلوب کی نزاکت اور جذبات کی گوناگوں نزاکتوں کا لطیف بیان اس کا حسن تعمیم (یعنی انفرادی تجربہ، مشاہدہ اور جذبہ کو وسعت دے کر سماجی اور تاریخی تجربہ اور مشاہدہ میں تبدیل کر دینا) اور حسن تخصیص (یعنی معمولی فکر کو خصوصی خیال بنا دینا) اردو ادب ہی نہیں بلکہ انسانی ادب کی گراں مایہ اور بے بہا میراث ہے۔

اختصار سے اردو غزل کے ارتقاء کو یا یوں کہہ لیجئے کہ غزل گو شعرا کے تسلسل کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس کا سرمایہ قطب شاہ والئ گولکنڈہ کی دکھنی زبان اور امیر خسرو دہلوی کے ہندوی کلام، ولی اور سراج اورنگ آبادی کی ابھرتی اردو زبان میں ابتدائی مشق سخن کے بعد میر اور درد کی جگر سوزی، انشاء، مصحفی اور آتش و ناسخ کی جولانیوں، نظیر کی عبارت رندانہ، مومن کی شگفتہ بیانی، غالب کی رفعت فکر اور ندرت ادا، حالی کی بغاوت، داغ کی شوخی، اقبال کی فلک پیمائی، یگانہ کی انفرادیت، حسرت کی اپچ، جگر کی رندی، فانی کی یاسیت، اصغر کے تصوف، فراق کی جنسیت اور دور حاضر میں فیض، مجاز، جذبی، مجروح جیسے شاعروں کی لہو ترنگی سے مالا مال ہے۔ علاقائی اعتبار سے دکن، دہلی، لکھنؤ، رامپور اور حیدرآباد اور پھر پنجاب اس کے گہوارے رہے ہیں اور تاریخی اعتبار سے سلطنت مغلیہ کے تنزل کے زمانے سے لے کر ریاست اودھ، رامپور، حیدرآباد اور انگریزی شہنشاہیت کے زمانے تک کے ڈھائی تین سو سال کی مدت میں اس کا فروغ ہوا۔

ابتدائی اردو شاعری میں غزل کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جو اس کو میر اور درد کے زمانے میں اور ان کے بعد حاصل

ورنہ دوسری اصناف سخن اور ہئیتیں مقبول اور مستقل تھیں۔ اس لئے دکنی اور سراج کی ابتدائی اردو میں طبع آزمائی کے بعد کافی زمانے تک غزل پر شعراء کی نظر عنایت نہیں پڑی۔ میر اور درد کے زمانے میں غزل پھر چمکی اور بعد میں مصحفی اور انشاء کی دہلی اور ناسخ اور آتش کے لکھنؤ میں اور زیادہ مقبول ہوئی۔ نظیر اکبرآبادی نے اس میں زندگی کی ساری رنگ رلیوں اور شور و شغب کو بھر دیا۔ پھر غالب اور مومن نے تو غزل کو چار چاند لگائے اور نئی نئی بندشوں، نئے نئے محاکات اور تخیل، جدید خیالات اور فلسفیانہ رموز سے اس کو وسعت اور گہرائی بخشی۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ غزل اردو شاعری کی بہت پرانی اور پامال شدہ ہئیت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گیسوئے اردوئے غزل ابھی منت پذیر شانہ ہے۔

(۶)

پچھلے سال ۱۹۵۳ء میں اردو کے دو ترقی پسند شعراء فیض اور مجروح کے مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ "دست صبا" فیض کی نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے اور مجروح کی "غزل" ان کی کل کائنات۔ یہ دو مختصر مجموعے مختصر نہیں ہیں کیونکہ ان چند بوندوں میں مستقبل کے طوفان چھپے ہیں اور ان کلیوں میں آنے والی بہار جھوم رہی ہے۔ فیض اور مجروح کا کلام اردو شاعری کا نشان راہ ہی نہیں، کہیں کہیں تو اگلی منزل کا پتہ بھی دیتا ہے ـــــ جمالیاتی منزل کا۔

فیض اور مجروح کی شاعری کے جائزے سے جہاں ایک طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غزل کی ہئیت میں آج بھی کئی نئے مضامین، داخلی اور خارجی حسن ادا کے ساتھ آسکتے ہیں، وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نئے موضوع کا بیان خود ہی نئے استعاروں، نئے اشاروں اور رموز اور نئی نقش کشی کو بھی جنم دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ غزل میں یہ نیا تجربہ ابھی زیادہ ریاضت اور فنی مشقت چاہتا ہے۔ فیض اور مجروح نے بڑی جرات اور دل گردے سے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہ کہنا حقیقت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ہوگا کہ ان کے کلام نے غزل کی ہئیت میں انقلاب برپا کر دیا ہے مگر اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ان کی کاوشوں نے غزل کا ایک نیا مرقع پیش کیا ہے جو غزل کے نئے اور خوش آئند مستقبل کا ضامن ہے۔

ہر فنکار کو دو قسم کے موضوع سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ موقتی اور ابدی۔ بعض مضامین کا جنم انسان کے ساتھ ہوا اور وہ ہنوز جوان ہیں۔ حسن و عشق کا موضوع کیونکہ پامال ہو سکتا ہے۔ وہ تو ہر زمانے کے دل کی دھڑکن اپنے سینے میں مستور لئے ہوئے ہے۔ ہجر کا غم، وصال کی آرزو ہر عہد میں ہر نفس کے ساتھ منسلک ہے اور اسی لئے ہر زمانے نے شعراء ان ابدی مضامین کے بدلتے ہوئے روپ پر نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ ایسے مضامین میں عنوان کی اپج نہیں دیکھی جاتی، ندرت بیان اور جدت ادا دیکھی جاتی ہے۔ موقتی موضوع کے اظہار میں البتہ فنی اختراع اور اجتہاد کو جانچنا چاہیئے۔ ہمارے شعراء نے اگر ابدی مضامین میں اپنی جولانی دکھلائی ہے تو اس کو ماضی کی نقالی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس حد تک تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ پرانی بات کس نئے ڈھنگ اور سلیقہ سے کہی گئی ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ پرانے موضوع میں نئی بات پیدا کرنا، پرانے اکے میں نیا رنگ بھرنا، پرانی شاہراہ سے نئی ڈگر نکالنا، اچھے فن کی ایک اچھی مثال ہے۔ فیض اور مجروح کے اشعار اس کی بلیغ تشریح ہیں۔ ان کے یہاں ابدی اور موقتی دونوں مضامین ملیں گے۔ ابدی مضامین میں نیرنگیٔ ادا اور موقتی مضامین میں بانکپن اور انوکھی جلوہ گری ہے۔

فیض کے اشعار میں نئے شعور، نئے پس منظر اور نئی محاکات کے ساتھ داخلی اور خارجی پہلو کا ملاپ اور آہنگ ہے۔ "دست صبا" کی ابتدا، اس لاجواب قطعہ سے ہوتی ہے جس میں حکومت وقت کے استبداد کا جواب دیا گیا ہے ؎

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

تقسیم ہند سے جو لاکھوں انسان خانماں برباد ہو گئے ان کے دل کی تڑپ کا بیان یوں آیا ہے ؎

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن — تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

پھر کہتا ہے ؎

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی — کہ شب کو چاند نہ نکلے، نہ دن کو ابر آئے

اور محکوم طبقہ کی ڈھارس یوں بندھاتا ہے ؎

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دستک دی — سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

اور اس نے طنز میں رنگ تغزل سیاسی شعور سے نکھرا ہے ؎

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی — تم ستم یا کرم کی بات کرو
خیر ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں — آپ اہلِ حرم کی بات کرو

"خیر" کا لفظ کیا شر انگیز اور شرارت انگیز ہے! "اہلِ حرم" پر کیا گذری ہوگی؟

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی — روزِ وصلِ صنم کی بات کرو
جان جائیں گے جاننے والے — فیض فرہاد و جم کی بات کرو

آزادی کا نوحہ یوں پڑھا ہے ؎

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری — قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

یہ شعر موجودہ غزل میں اشاریت کی بہترین مثال ہے۔

اور یہ غم ؎

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے — تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

اور وہ "کروں یا نہ کروں" والی غزل، شعری جدلیات کی خوبصورت مثال ہے۔ اس میں شیکسپیر (Shakespeare) کا مشہور (Soliloquy) "To be or Not to be" کا سرور، تکرار کا صوتی حسن اور دلکش (Rhythum) ہے ؎

فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں — ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں
جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل — وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں
جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس — مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

پھر اس غزل کا رمز اور استعارہ ملاحظہ ہو ؎

رنگِ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام — موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر — گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں — پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

اور یہ سادہ بیانی ؎

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب — آج تم یاد بے حساب آئے
جل اٹھے بزمِ غیر کے در و بام — جب بھی ہم خانماں خراب آئے
فیض تھی راہ سر بسر منزل — ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

اور یہ بجا تعلی ہے

فیض اوجِ خیال سے ہم نے　　آسماں سندھ کی زمیں کی ہے

فیض کی غزلوں کا رشتہ ان کی نظموں سے بہت قریبی ہے اور بسا اوقات نظم پر غزل کا اور غزل پر نظم کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ فیض کی شاعری کا یہ ایک مخصوص وصف ہے کہ ہر ہیئت شعری میں انھوں نے موضوعی اور جذباتی تسلسل برقرار رکھا ہے۔ اس اجتہاد نے فیض کی شخصیت کو منفرد اور یکتا کر دیا ہے۔ چنانچہ "دست صبا" کی نظم "طوق و دار کا موسم" ہے

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم　　نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم
گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم　　ہے آزمائش حسنِ نگار کا موسم
یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم　　یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

یا "اگست ۱۹۵۲ء" کے عنوان سے جو نظم کہی ہے اس میں بدلے ہوئے حالات کا جائزہ شاعر کی بالغ نظری اور بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں　　گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں　　گوشے چمن چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں
ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر　　کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل　　محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض　　سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

اس طرح مجروح کے مجموعے میں اردو غزل کا نیا روپ اجاگر ہے۔ مجروح کی بندشیں نہایت چست، زباں نہایت سلیس اور طرزِ فکر انوکھی اور دلکش ہے۔ فیض کے یہاں کبھی کبھی زبان کی غلطیاں ملتی ہیں۔ لیکن مجروح کے یہاں لطافت بیان کی فراوانی اور روانی ہے۔ ان کے چند رومانی اشعار جن میں یہ انا رنگ گہرا ہے بہت حسین ہیں ہے

کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں　　خیالِ صبح سے ہم آستیں بھگو دیتے
بہانے اور بھی ہوتے ہیں جو زندگی کیلئے　　ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

"بہانے" کا رشتہ "آرزو" سے غالب کی یاد دلاتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں "بھی" کا لفظ کس قدر بلیغ ہے!

جو دیکھتے مری نظروں پہ بندشوں کے ستم　　تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے

نظارے کا رونا کس قدر اچھوتا خیال ہے!

ہجر کی درازی کو شاعروں نے طول دے کر روزِ جزا سے ملا دیا ہے۔ اساتذۂ متقدمین، متوسطین اور متاخرین بھی ہجر کا دکھڑا رو دیئے ہیں۔ محرومیٔ قسمت کا رونا رویا ہے۔ مگر مجروح کی شبِ ہجر، شبِ انتظار اور شبِ کشمکش ہے اور امید و بیم کی کشمکش، مسلسل اور مکمل شب یاس نہیں۔ وہ تو چراغ آرزو کے جلنے اور بجھنے، پھر بجھنے اور جلنے کی داستاں ہے۔

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی　　کبھی اک چراغ جلا دیا، کبھی اک چراغ بجھا دیا

اور پھر یہ اشعار ہے

کس کس کو ہائے تیرے تغافل کا دوں جواب　　اکثر تو رہ گیا ہوں جھکا کر نظر کو میں
سیاہیاں شبِ فرقت کی ہم نفس مت پوچھ　　کسی کو یاد جو کیجیے تو یاد آ نہ سکے
نہ مٹ سکیں گی یہ تنہائیاں مگر اے دوست　　جو تو بھی ہو تو طبیعت ذرا بہل جائے

ہائے وہ ساعت کہ وقفِ شوق تھا ہر یک نفس — آہ یہ عالم کہ اب تیری تمنا بھی نہیں
ہم تو پائے جاناں پہ کر بھی آئے اک سجدہ — سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے
دلِ سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی — نگاہِ یار کہتا ہے کوئی افسانہ برسوں سے

اور وہ پانچوں غزلیں "ختم شورِ طوفاں تھا"، "مجھے سہل ہو گئیں منزلیں"، "آہ جانسوز کی محرومی تاثیر نہ دیکھ"، "ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا" اور "دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ" نئی نقش گری اور محاکات سے نئے جذبات کے پہلو، نئے رومان اور سماجی شعور کے امتزاج اور بانکپن کی حسین تصویریں ہیں ؎

ختم شورِ طوفاں تھا، دور تھی سیاہی بھی — دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی
التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو — رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

غالب نے "تیرِ نیم کش" کی شکایت کی تھی۔ مجروح کو یہ یقین نہیں ہے کہ خلشِ کم نگاہی، وجہِ التفات ہے یا بے رخی؟ اور پھر اس حسین تضاد کو دیکھئے ؎

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں — نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی
شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا — میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

اس شعر میں بعض اربابِ ذوق مابعد الطبیعیاتی عقیدہ وحدت الوجود کار فرما پاتے ہیں، مگر کیا اس میں فنکار کے اعتماد اور انفرادیت کا اشارہ نہیں ملتا؟ اور ان اشعار میں غنائی حسن اور جاذب نقش گری ملاحظہ ہے ؎

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے — ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے
وہ لجائے میرے سوال پہ کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر — اڑی زلف چہرہ پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

اور یہ دو شعر ؎

حادثے اور بھی گذرے تری الفت کے سوا — ہاں مجھے دیکھ مجھے، اب مری تصویر نہ دیکھ
دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار — رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

لیکن ان اشعار سے قطع نظر مجروح نے فیض کی طرح غزل میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا ہے۔ بھونڈا تبصرہ اور تبلیغی بکواس نہیں، حسین و دلفریب طنز اور دلکش تفسیر جو تاریخی مشاہدہ اور سیاسی شعور کی غمازی کرتے ہیں۔ یہی اجتہاد نئی غزل کا ایک مخصوص وصف ہے؟

ہزاروں ماہتاب آئے، ہزاروں آفتاب آئے — مگر ہمدم وہی ہے ظلمتِ غمخانہ برسوں سے
مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساقی — تجھے یہ ضد کہ خالی ہے مرا پیمانہ برسوں سے
ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھیں گے — چل اے عزمِ بغاوت چل تماشہ ہم بھی دیکھیں گے
نگارِ چمن کا کمانیں توڑتا ہے دم سرِ مقتل — بچالے آ کے اعجازِ مسیحا ہم بھی دیکھیں گے
کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاشِ دستِ رہبر — کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

کیا اس شعر کے رمز میں یہ نکتہ مخفی نہیں ہے کہ کاروان خود اپنی راہیں ڈھونڈھ کر اپنی منزلیں قائم کر لیتا ہے یعنی یہ کہ "نقشِ پا" کبھی خود بھی "جگمگا" اٹھتے ہیں۔ اور ان اشعار میں رومان اور پیغام دونوں شامل ہیں ؎

وہ کونسی صبحیں ہیں جن میں بیدار رہیں افسوں ترا — وہ کونسی کالی راتیں ہیں جو میرے نشے میں چور نہیں
سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے — کہتا ہے مگر یہ عزمِ جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

پھر یہ اشعار

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق — خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

پھر نئے استعارے اور نئی تشبیہیں ملاحظہ ہوں ؎

میں کہ ایک محنت کش میں کہ تیرگی دشمن — صبحِ نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے
اب زمیں گائے گی ہل کے ساز پر نغمے — وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
اہلِ دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم — اب گہر سبک ہوگا جَو کے ایک دانے سے

اور پھر رمزیت کی آڑ سے سیاسی حکمرانوں پر یہ طنز ؎

مجرم ستے جو ہم سو قید ہوئے صیاد مگر اب یہ تو بتا — ہر وقت یہ کس کو ڈھونڈھتے ہیں دیوار کے سائے زنداں میں

اور جدلیاتی مادیت کا ایک اہم نکتہ اس شعر میں عریاں ہے ؎

میں ہزار شکل بدل چکا چمنِ جہاں میں سن اے صبا — کہ جو پھول ہے ترے ہاتھ میں یہ مرا ہی لختِ جگر نہ ہو

اور بے بسی میں یہ امید کی کرن ؎

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے — میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کارواں سحر نہ ہو

اور یہ بلیغ تعلّی ؎

نظارہ ہائے دہر بہت خوب ہیں مگر — اپنا لہو بھی سرخیٔ شامِ دہر میں ہے

اور پھر یہ سوالیہ تکرار ؎

باعثِ جلوۂ گل دیدۂ تر ہے کہ نہیں — میری آہوں سے بہاراں کی سحر ہے کہ نہیں
دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آکر — سوچتا ہوں یہ تری راہ گذر ہے کہ نہیں
روئے مشرق کی قسم ہم کو ہے اتنا معلوم — شبِ دوراں ترے دامن میں سحر ہے کہ نہیں

اس غزل میں داخلی اور خارجی دونوں پہلو اپنی ہم آہنگی سے نغمہ کی تاثیر میں اضافہ کرتے ہیں۔ "روئے مشرق کی قسم" اور "شبِ دوراں" کی اشاریت کی حسین بندشیں ہیں اسی لئے نو شاعر کہتا ہے۔

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروحؔ — سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

مگر نئی ڈگر پہ چلتے ہوئے مجروحؔ نے کہیں کہیں نظریاتی غلو بھی کیا اور عجلت بھی کی ہے جس کی وجہ سے شگفتگی اور فنی حسن کا دامن چھوٹ گیا ہے اور بھونڈا انداز آگیا ہے۔

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا — ہو کے رہے گی دھرتی اپنی ملک ہمارا ہو کے رہے گا
امن کا جھنڈا اس دھرتی پہ کس نے کہا لہرانے نہ پائے — یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلہ مسے ساتھی جانے نہ پائے

(۷)

مندرجہ بالا مثالوں کی روشنی میں یہ اعتراض کہ غزل ایک فرسودہ اور پامال ہیئت ہے اور اس لئے موجودہ ادبی اور ذہنی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی سطحی اور میکانکی معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ اردو غزل کی زندگی ہی کیا۔ نظم کی ہیئت کو لیجئے صدیوں سے ہزاروں فنکاروں نے اس زمین میں فکر و نظر کے بیج بوئے اور اپنے حاصل سے ادب کے خزانے بھرے ہیں، نثر تو گویا ابتدائے آفرینش سے انسان کا مکالمہ، مخاطبہ اور تبادلۂ خیال کا آلۂ کار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض ہیئتوں

میں زیادہ اور بعض میں کم بنیادی تحدیدات ([illegible]) موجود ہیں۔ بعض ہیئتیں ہر عہد میں نو بہ نو شگفتگی کو خوش اسلوبی سے اپنے اندر سمو کر ایک نئے ڈھنگ سے ان کو ادا کرتی ہیں اور بعض دوسری اپنی حد بندی اور فنی تقاضوں کا وہم سے ہر عہد میں اور ہر حالت میں ساتھ نہیں دے سکتیں۔ مگر باوصف اس کے یہ کہنا کہ دو تین سو سال میں غزل کی ہیئت فرسودہ ہو چکی ہے ایک طرف اضطراری بیزاری کا پتہ دیتا ہے اور دوسری طرف تاریخ ادب سے غلط نتیجہ اخذ کرنے کا ثبوت ہے۔ غزل کی زمین ابھی قابل کاشت ہے، بہت محدود علاقے پر بار بار کاشت ہوئی ہے، داخلی مضامین کی فراوانی ہے اور ایسی فراوانی کہ دنیا کے ادبی خزانے میں لطافت جذبات اور نزاکت خیال کا ایسا بیش بہا سرمایہ مشکل سے ملے گا لیکن بہت وسیع میدان ابھی فصل سے بیگانہ ہے۔ سماجی موضوعات اور خارجی مشاہدات ادھر کچھ زمانے سے غزل میں داخل ہوئے ہیں۔ اگر خون جگر سے اس کی آبیاری ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ نیا سبزہ زار نہ لہلہائے۔ اگر فنکار عجلت، بے دلی اور فنی جہالت کا شکار نہیں تو وہ ضرور غزل جیسی خوبصورت ہیئت کے لطیف تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق اور حذق پائیں گے۔ غزل کے حسن کا دارومدار ردیف، قافیہ کی ہم آہنگی، رعایت لفظی، سلاست بیان، بلاغت زبان اور رمزیت پر ہے۔ غزل سے بڑھ کر شاید ہی کسی ہیئت میں اتنی جامعیت ہو۔ وہ تو قطرہ میں گنگا دکھلانے کا فن ہے۔

مرزا غالب کا شکوہ کہ ؎

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

جائز شکوہ تھا کیونکہ ان کے زمانے تک غزل میں شعراء خالص داخلی اور جذباتی مضامین باندھتے تھے اور نظم اور مثنوی وغیرہ جن میں خارجی مشاہدات، اجتماعی کیفیات اور سماجی نفسیات کا بیان آتا ہے، تقریباً متروک ہو چکی تھیں اس لئے ان کے پائے کا بڑا فنکار ظاہر ہے کہ اس ہیئت پرستی اور تحدید سے شاعری کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ لیکن آج جب کہ فنی بغاوت کے بعد غزل کے موضوع میں وسعت پیدا ہو چکی ہے بلکہ بنیادی موضوعی تبدیلی سے خود غزل کا مزاج بدل چکا ہے اور دوسرے اصناف سخن میں بھی شعراء طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ غزل کی ہیئت ایک پامال اور فرسودہ ہیئت ہے اور اس لئے اس کو خیرباد کہہ دیا جائے، بڑی بے ادبی اور سخن دشمنی کا ثبوت ہے۔ یہ غلط اور خطرناک رجحان ہمارے عہد کا ایک بڑا ادبی سانحہ ہے۔ جس کا مقابلہ ہر باشعور فنکار، نقاد اور اہل ذوق کو کرنا لازمی ہے۔ غزل کے نئے روپ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بنیادی تحدیدات کے باوجود غزل، نظم اور معرا شاعری کے ہمراہ نوائے وقت کو اپنے اندر سمو سکتی ہے اور بدلتی ہوئی زندگی کے ہم قدم، گل و بلبل کے روایتی رموز سے آگے بڑھ کر نئے جمال سے مسحور اور نئے جنون سے سرشار ہو سکتی ہے۔

اسی ہمہ گیری کا بیان مجروح نے یوں کیا ہے ؎

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

کسی عہد میں بھی نقش گری کا پورا خزانہ نہیں بدل جاتا۔ نئی تشبیہیں، نئی بندشیں جو زندہ حقیقتوں سے تعبیر ہیں ڈھلتی رہتی ہیں فیض اور مجروح ہی کے اشعار میں کئی نئے استعارے آئے ہیں۔ نئی بندشیں اور ترکیبیں ملتی ہیں اور پرانی تشبیہوں سے اشارے کئے گئے ہیں۔ اس لئے یہ اعتراض کہ عشق روایات پہ تقاضائے وقت کو قربان کیا جا رہا ہے صداقت اور تنقید پر مبنی نہیں ہے۔

غزل پر فنی اعتراضات میں سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں "داخلیت" کا عنصر غالب ہے۔ اور اس میں محض "دروں بینی" کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اور یہ کہ خارجی مادی حقائق کا بیان، اگر ممکن بھی ہے تو کسی قدر [illegible] اور اس بنیادی تحدید کی وجہ سے غزل کا وسیع نقطۂ نظر [illegible]

نہیں ہو سکتی یا ہونے میں دشواری پیش آتی ہے۔ مختلف تاریخی، تہذیبی اور نظریاتی وجوہ کی بنا پر غزل میں داخلیت جاگزیں
ہوئی مگر بدلے ہوئے حالات اور ابھرتے ہوئے نئے تہذیبی اور نظریاتی ماحول میں داخلیت غزل کا جزولاینفک باقی نہیں رہے
اور نہ رہے گی۔ اس لئے جہاں یہ اعتراض بظاہر وقیع اور اہم ہے وہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ درست ہوگا کہ
ہم ایک ہیئت کو ایک مطلق وصف سے ہمیشہ کے لئے ملزوم کر دیں کیا یہ بھی ایک قسم کی ہیئت پرستی نہ ہوگی؟ کیا غزل کا نیا
روپ ممکن نہیں ہے؟ بلکہ کیا غزل کا نیا روپ نہیں ہے؟ یہاں سوال تنقیدی معیار اور اصول کا بھی آجاتا ہے۔ ہمارے
نقادوں کو ماضی کی کسوٹی پر فنی تخلیق کو نہیں جانچنا چاہئے۔ کیا ضروری ہے کہ غزل کے لوازمات اور حسن کا وہی اٹل اور قطعی
معیار ہو جو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ فنکار خود بعض مرتبہ لے دی سے اپنی جدت کو نباہ نہیں سکتے۔ خود حسرت
نے اپنے نئے رنگ پر اکثر طنز کیا ہے اور آج بھی نقاد، ایک طرف تو اجتہاد اور اپج پر فنکار کو اکساتے ہیں اور دوسری طرف
کسی صالح اجتہاد حسین اپج کی داد دینے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ غزل میں سماجی بلکہ سیاسی اور اجتماعی پہلو خوبصورتی سے آیا
ہے اور آرہا ہے۔ کبھی بدصورتی اور بھونڈے پن سے بھی آیا ہے۔ غزل کا یہ نیا روپ کچھ عجیب نہیں کہ غزل کی صورت بدل
دے۔ کیونکہ موضوع کی تبدیلی مزاج کو بدل دیتی ہے۔ کہنہ ذوق سلیم پر شاید یہ گراں گزرے مگر مستقبل میں غزل کا یہی
رنگ روپ، یہی مزاج اور موضوع مقبول عام اور شہرت دوام کا باعث ہوگا۔

پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ غزل میں صرف داخلیت ہی کا پہلو جلوہ گر ہو سکتا ہے۔ تب بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ
غزل آج کی تہذیبی زندگی کے بہت سے لطیف تقاضوں کو پورا نہ کر سکے۔ انسانی جذبات کا خزانہ کبھی بھی ختم نہ ہوگا۔ وہ تو
جتنا لٹتا ہے اتنا ہی بڑھتا ہے۔ ہر نفس ایک کائنات ہے۔ ہر فرد ایک محشر خیال۔ ہر زمان و مکان میں انسانی جذبات کی
فراوانی اور رنگا رنگی قائم و دائم ہے۔ جب تک انسان، انسان کا دکھ درد، جدائی کا غم، دل کی دھڑکن، ملاقات کی
خوشی، حسن کی پرستش، عشق کی دیوانگی، سوز و ساز، کیف و مستی، قوس قزح، آبشار، نظارہ ہائے گوناگوں، تاروں کی
چمک اور ان کی چوٹ رگ جاں پر باقی ہے۔ داخلی زندگی کے مضامین اور مسائل بھی باقی رہیں گے۔ ان کے اظہار و بیاں
کے لئے جذبہ تخلیق بھی باقی رہے گا اور اس لئے غزل جیسی خوبصورت ہیئت بھی باقی اور کارگر رہے گی۔

دوسرا فنی اعتراض، ردیف قافیہ کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ ان کے التزام سے شعر کی تخلیق میں رکاوٹ پیدا ہوتی
ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ردیف قافیہ، پابندی سے زیادہ فنی سہولتیں ہیں۔ تجربہ سے یہ امر واضح ہے کہ معرا شاعری اور آزاد بحر
کے اوزان کی پابجائی کے مقابلہ میں ردیف قافیہ کے آسرے سے شعر کہنا نسبتاً سہل ہے۔ ردیف قافیہ کی پابندی بہت سے
عیبوں کو چھپا دیتی ہے اور شعر کی صوتی اور معنوی کیف کو بڑھا دیتی ہے۔ اس میں ایک قسم کا ترنم پیدا ہو جاتا ہے جو شعر کے
لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اس طرح ردیف اور قافیہ کے التزام سے تک بندی ممکن ہے مگر آزاد بحر اور معرا شاعری میں
تک بندی بالکل نہیں چل سکتی۔ اس لئے ردیف و قافیہ کو کڑی پابندی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ مگر یہ درست ہے کہ ان سے
فائدہ اٹھانے کے لئے فنی لزوم اور عروض وغیرہ سے گہری واقفیت ضروری ہے اور اس کے بعد ہی نئے سانچے ڈھالے
جا سکتے ہیں۔ مگر نئے سانچوں کو ڈھالنا ایک بات ہے اور پرانے پیمانوں کو توڑنا دوسری بات۔ فن میں شیوہ آذری
اور طریق براہیمی دونوں درکار ہیں۔ بت شکنی بھی اور بت تراشی بھی۔ تخریب سے زیادہ تعمیر پر دھیان ضروری ہے اور
اس کو اس رٹ سے الجھانا کہ ہر نئی تعمیر تخریب چاہتی ہے، جدلیاتی عرفان نہیں۔ ہٹ دھرمی اور ہکو اس سے بعض دفعہ
تعمیریں نئی بنیادوں پر ہوتی ہیں اور ...... پرانے ڈھانچوں کو مسمار کرنا غیر ضروری اور بے فائدہ ہوتا ہے۔ نئی
بستیوں کو آباد کرنے کی امنگ پرانی آبادیوں کو برباد کرنے کی لگن میں ضائع نہ ہونی چاہیے بلکہ اگر پرانی بستیوں

میں کچھ دیئے ٹمٹما رہے ہیں تو کیوں نہ انھیں روشن رکھا جائے بلکہ مقدور ہو تو کیوں نہ نئے تیل سے ان کی لو اور بڑھائی جائے۔ تہذیبی زندگی میں پرانے دیئے سے نئے دیئے تو جلتے ہی ہیں لیکن یوں بھی ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے کہ نئے دیئے سے پرانے دیئے کی لو اور بڑھے۔ اس سے فنی زندگی میں تسلسل اور ربط پیدا ہوتا ہے اور حال اور مستقبل کا رشتہ ماضی سے گہرا اور استوار ہوتا ہے۔ اچھی روایات کا احترام صحیح بغاوت کے مانع نہیں ہے۔ وہ تو جذبۂ بغاوت کو اجالنے میں تاریخ کے زریں کارناموں کی دہائی دیتا ہے۔ یہاں روایت کی دلدل میں پھنس کر تقاضائے وقت سے کنارہ کشی کرکے اپنے آپ کو ماضی میں دفنانا ہے۔ مجروح نے اسی خیال کو دوسرے پیرائے میں یوں واضح کیا ہے ؎

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

پھر غزل کا تقابل نظم یا مثنوی یا دوسرے اصناف شاعری سے کرنا ہی غلط ہے۔ غزل دوسرے اصناف سخن کی مخالف یا جانشین نہیں ہے بلکہ معاون اور ساتھی ہے۔ مختلف اصناف سخن، مختلف انسانی کیفیات، جذبات، تفکرات اور مشاہدات کے حامل ہیں اس لئے بقول ماؤ (Mao) کے ادب کے چمن میں سبھی پھولوں کو کھلنا چاہیئے کیونکہ ؎

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن

نئی ہیئت اور نئے فنی سانچوں کی بحث میں بعض معترضین یہ استدلال بھی پیش کرتے ہیں کہ بدلتے ہوئے معاشرہ کے فنی تقاضے ایک اچھے فنکار کو نئے سانچے ڈھالنے پر خود مجبور کر دیتے ہیں اور اس استدلال کو انگلستان، فرانس اور دیگر مغربی ممالک کی مثال دے کر موثر بنایا جاتا ہے۔ اس استدلال کے دو جز ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا مضمر۔ پہلے جز کی تاریخی حقیقت مسلم ہے یعنی یہ کہ مغربی ممالک میں نئے موضوع کے بیان کے لئے نئے سانچے ڈھالے گئے ہیں اس لئے اس سے ہمیں بحث نہیں۔ لیکن دوسرے تمثیلی جزو کا اطلاق ہمارے حالات پر نہیں ہوتا یعنی یہ کہ چونکہ مغرب میں فنی سانچے بدلے ہیں لہٰذا یہاں بھی بدلنے چاہئیں۔ یہاں دو چیزوں کا تذکرہ لازمی ہے۔ ایک یہ کہ ہمارا تاریخی پس منظر اور تہذیبی میراث مغرب سے جداگانہ ہے۔ یونان اور روم کو چھوڑ کر مغربی ممالک کی تاریخ، ہندستان اور دیگر مشرقی ممالک کے مقابلے میں بہت کم مدت کی ہے اور ان کے تہذیبی اور فنی تجربات بھی قلیل اور مختلف ہیں۔ اس لئے تہذیبی زندگی کی عمر اور تجربات کے اختلاف کی وجہ سے مشرق اور مغرب میں موازنہ اور تقابل غلط فہمی کا [illegible] ہوگا۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ مغرب میں سماج کا ڈھانچہ پچھلے تین سو سال میں بنیادی طور پر بدل چکا ہے مگر ہمارے سماج کی عمارت کی بنیادیں ابھی تک پورے طور پر نہیں بدلی ہیں۔ اس عبوری دور میں وہی صدیوں پرانا نقشہ ہنوز باقی ہے۔ وہی وسائل پیدائش دولت، وہی جاگیردارانہ نظام، وہی سامراجی اثرات اور نو آبادیاتی حیثیت، وہی ا تعلقات اور رشتے۔ مغربی ممالک میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ ایک قصۂ پارینہ بن چکا ہے بلکہ خود صنعتی ارتقاء کی ا کو تقریباً تین سو سال صنعتی عہد کے عروج کو تقریباً دو سو سال اور تنزل کو تقریباً پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر اور صنعتی دور کی اولین لعنت، سرمایہ داری اور اس کی پیداوار نئی سامراجیت کی وجہ سے یہاں تک نوبت پہنچ چکی زبان حال سے وہاں کے عوام اپنے جھوٹے خداؤں سے گویا یہ پوچھتے ہیں ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

مگر ایشیائی معاشرہ بنیادی طور پر جوں کا توں ہے جس کی اصل وجہ کچھ تو اس کی گہری زرعی بنیادیں ہیں اور بہت اہم وہ تین سو سال کی سامراجی غارت گری اور تباہی ہے جس نے نہ صرف صنعتی ترقی کا راستہ روکا بلکہ یہاں کی قدیم زرعی سنگٹھن (Agrarian-craft Economy) کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔ ایشیائی معاشرہ اور مغربی معاشرہ بنیادی

جداگانہ ہے اور اسی وجہ سے نہ تو ان کا موازنہ صحیح ہوگا اور نہ ایک کی مثال دوسرے پر صادق آسکتی ہے۔ مغرب کے
معاشی انقلاب نے وہاں کے سماج اور سیاست اور انسانی رشتوں کو بدلا ہے اور اسی بدلی ہوئی فضا میں روایات،
علوم و فنون، جمالیاتی نظام اور ادبی اسلوب سب ہی تبدیل ہوئے ہیں اور فنی اور تہذیبی مزاج بدلا ہے۔ شیکسپیر
(Shakespeare) اور بیکن (Bacon) کے عہد کا نظام جاگیرداری بدلا، گوئٹے (Groethe) اور نطشے
(Fitche) کا جرمنی بدلا، بالزاک (Balzac) اور والٹیر (Voltaire) کا فرانس بدلا اور اس کے ساتھ ادبی
اور فنی سانچے بدلے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ایلیٹ (Eliot) کے ویسٹ لینڈ (Wasteland) کا گرد و غبار
شیکسپیر (Shakespeare) کے شیروڈ فارسٹ (Sherwood Forest) کے نخلستان اور سبزہ زار سے بہت مختلف
ہے اور پال ایلوار (Paul Eluard) کے نغموں اور لوئی آراگاں (Louis Aragon) کی نظموں میں قدیم
فرانس کی جاگیرداری کا پرتو نہیں بلکہ جدید فرانس کی سماجی بدحالی کا عکس جھلکتا ہے۔ اس لئے ہیئت بھی بدلی ہے
اور تکنیک بھی۔ لیکن ہندوستان میں نہ صنعتی اور سماجی تبدیلی اتنی سرعت سے ہوئی اور نہ تخیلات کے ڈھانچے اتنی تیزی
سے بدلے ہیں۔ اس مقام کو تاریخی جدلیات کی حقیقت انگیزی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ رومانی اور میکانکی طریقے سے
سمجھنا محال ہے۔ پرانا مادی ماحول کسی قدر غیر بنیادی تبدیلی کے ساتھ باقی ہے اور اپنے اندر عبوری دور کے پورے
تضاد کو سموئے ہوئے ہے۔ پرانے تخیلات، ماحول، ادبی فضا، ہیئت اور اسلوب مخلوط طور پر نئے تکلفات،
نئی تکنیک، بدلتے ہوئے ماحول، نئی فضا اور جدید ہیئت اور اسلوب کے ساتھ باقی ہیں مگر اس تضاد میں سے نئی
ادبی تخلیق ابھری ہے۔ کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں گو ابھی بہت کچھ تبدیلی کی گنجائش ہے۔ اینگلز (Engles) نے کہا تھا
اگر مادی حالات تخیلات پر عمل کرتے ہیں تو تخیلات بھی مادی حالات پر عمل کرتے ہیں۔ اس عمل، رد عمل کے جدلیاتی
سلسلے سے تہذیب اور فن مالا مال ہوتے رہتے ہیں۔

(۸)

تاریخی تجزیہ بتاتا ہے کہ میر اور درد سے لے کر فیض اور مجروح تک اردو شاعری، اس کے سانچوں، نقش کشی
پس منظر موضوع فکر اور تشبیہات میں برابر تبدیلی ہوتی چلی آئی ہے۔ پورا مواد بدلا ہے۔ نئے سانچے ڈھالے
ہیں، پرانے سانچوں کی نئی قلعی کی گئی ہے، نئی تکنیک ایجاد کی گئی ہے۔ نئے عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ نئی مثبت
جمالیاتی اقدار ابھرے ہیں۔ اسلوب تبدیل ہوا ہے اور ادب کے تقریباً ہر شعبہ میں نئے تجربے کامیابی کے ساتھ کئے گئے
ہیں۔ پرانی شاہراہ سے ہٹ کر نئے راستے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ نئی شمعیں روشن ہوئی ہیں اور نئی منزلوں کی طرف
رواں ادب گامزن ہے۔ مگر نئی ڈگر پر چلنا، نئی منزل کی طرف بڑھنا، آہستہ آہستہ طے کرتا اور جو نئے سفر کالانا ہے۔
اس لئے یہ امید کرنا کہ سواری سخن، صبا رفتاری سے اس نئی راہ پر منزلیں طے کرے گی، ادبی اور تاریخی مشاہدہ
جھٹلانا ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ جگر اور حسرت نے غزل میں نئی بات پیدا نہیں کی ہے، کون جھٹلا سکتا ہے کہ ترقی پسند
شعراء نے پچھلے بیس برس میں نئی جمالیاتی اقدار تخلیق نہیں کی ہیں، غزل کا موضوع سخن بدلا ہے اور اس کے ساتھ اس کا
رنگ بدلا ہے۔ اس صدی کے دور اول کے غزل گو شعراء جیسے فانی، اصغر، حسرت اور جگر نے اپنے بیشتر کلام
میں بڑے اساتذہ کی نقالی کی ہے اور نقالی کی حد تک تو بہت اعلیٰ نقالی کی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے اشعار میں
مضامین کی ادائیگی میں نئے دو پیچ اور عصر حاضر کی جھلک ہے۔ اگر جگر کے رنگ تغزل میں ایک نیا نغمہ ہے اور اس

نغمہ میں ان کی انفرادی شان جھلکتی ہے جس میں ماضی کی تقلید نہیں تسلسل اور انوکھا پن ہے تو حسرت کے دیوان میں نئی روشنی کا اجالا نئے پس منظر کو چمکا دیتا ہے۔ حسرت نے بعض سماجی اور سیاسی موضوعات پر بہت مقبولِ عام غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل

کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر
کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آج کل

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیٔ وطن
دراصل ایک پیکرِ بے جاں ہے آج کل

حسرت کی بغاوت نے پہلے پہل غزل میں خارجی اور سماجی موضوعات کو داخل کر دیا ہے۔ لیکن ان کی "طرفہ تماشہ" طبیعت نے غزل میں زیادہ تر بقول خود کے "عاشقانہ" مضامین ہی باندھے ہیں۔ مگر جہاں کہیں بھی غمِ روزگار کا ذکر آگیا ہے وہاں ان کی غزل ایک نئے بانکپن کی پیش رسی کرتی ہے جو بعد کو آنے والے ترقی پسند شعراء میں "بانکی کج کلاہی" تک پہنچ گئی ہے۔ ان کے دیوان میں یہ رنگ بہت کم ہے مگر جہاں موجود ہے بہت گہرا ہے۔ اس قسم کی غزلوں میں ماضی کا تتبع تکنیک کی حد تک ہے مگر موضوع میں سیاسی شعور، سماجی احساس اور عوامی جذبات کا شاعرانہ جائزہ ہے۔ ان غزلوں میں حسرت نے وہ کمال نہیں دکھلایا جو ان کی عشقیہ غزلوں میں نظر آتا ہے لیکن وجہ ظاہر ہے۔ اس نئی زمین میں حسرت جیسے پختہ کار کو بھی سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا پڑا۔ یاد رہے کہ حسرت اپنے اجتہاد میں تقریباً اکیلے ہی تھے۔ اکبر الٰہ آبادی نے ظریفانہ انداز میں سیاسی طنز کو غزل میں رائج کیا تھا مگر حسرت نے اپنے پختہ اور بلند سیاسی شعور کی وجہ سے غزل میں سنجیدہ طنز کو داخل کیا ہے ؎

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حبِّ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

تا بہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

اور سامراج سے یوں مخاطب ہیں ؎

غیر ممکن ہے ہم سے طاعتِ غیر
اے جفاکار اور غریب آزار

روح آزاد ہے خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بیکار

اور یہ مجاہدانہ پیغام سنئے ؎

ابھی تم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب
بتا دو انھیں گرمِ پیکار ہو کر

فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی
نکل آؤ بے رحم و خونخوار ہو کر

وہ تم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
دغا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

فانی کے پاس ہندستان کے درمیانی طبقہ کی زبوں حالی کا مرثیہ ہے تو اصغر کا گریز اور فرار اس معیشت کا گریز اور فرار ہے جس کے دل کی دھڑکنوں اور دماغ کی پراگندگی کو اصغر نے زبان دی تھی اور جوش کے قہر و جلال کے پیچھے تو ہندستان کا سیاسی انقلاب، شاندار سماجی امنگیں اور عزمِ بغاوت بصد شان و شوکت نظر آتا ہے۔ پھر دورِ حاضر کے غزل گو شعراء مجاز، جذبی، فیض اور مجروح کی جدتِ طبع اور ندرتِ بیان سے غزل ایک نئے جلوہ اور آہنگ سے طرب انگیز ہے اور روا

داخلیت کے پردے میں سماجی شعور پنہاں ہے۔ اس میں عہدِ قدیم کی شبنم بھی ہے اور نیا شعلہ بھی۔ غزل کی یہ آتش نفسی نئی ہے درخشاندار ہے اور اسی لئے اس پرانے پیالے میں شراب دو آتشہ بھر کر جب نئے ساقی میخواروں کا خیر مقدم کرتے ہیں تو اس کی تندی و تیزی، کبھی کبھی پرانے بادہ کشوں یا بد حال میکشوں پر گراں گزرتی ہے۔

غزل کا بہت قدیم رنگ تو امیر خسرو کی مفروضہ پہلی اردو غزل کے اس شعر میں نمایاں ہے ؎

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

یا قطب شاہ کی اس غزل میں عیاں ہے ؎

پیا باج اک تل جیا جائے نا — پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج کیسے صبوری کروں — کہا جائے تم آ کیا جائے نا
قطب شاہ نہ دے کچھ دوانے کو پند — دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

قطب شاہ کے موضوع کو تو غالب ہی نے نیا سانچہ اس مصرع میں دیا تھا ؎

فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

خسرو کا شعر ذہن میں رکھ کر جذبی کے یہ دو شعر پڑھئے تو موجودہ غزل کا مزاج سمجھ میں آ جائے گا ؎

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں — ابھی مناظرِ دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں
ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار — ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

جبر کی یاس نے ان کو مژدۂ بہار میں بھی قید و بند کا سندیسہ سنایا تھا ؎

اک موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

مگر موجودہ غزل گو شاعر، شاہد صدیقی کو مستقبل پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے خلاف بھی دلیری کا سے اپنی "فصلِ گل" کے بارے میں حکم سے کہتا ہے ؎

جنھیں کل کی کوئی خبر نہیں وہ غمِ خزاں کا گلہ کریں
مجھے یہ یقیں ہے کہ فصلِ گل جو اب آئے گی تو نہ جائے گی

غالب نے خضر جیسے ازلی اور مثالی رہنما سے مایوس ہو کر کہا تھا ؎

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

مگر شاہد صدیقی رہنما سے مایوس ہو کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اس پر طنز کرتا ہے، شکوہ کرتا ہے اور اس سے صحیح رہبری کا تقاضہ کرتا ہے اور بگڑ کر کہتا ہے ؎

مجھے رہبروں سے ہے یہ گلہ کہ انھیں شعورِ سفر نہ تھا
کبھی راستوں میں الجھ گئے کبھی منزلوں سے گزر گئے

مومن کی ایک مشہور غزل کا حسین شعر ہے ؎

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا — اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

اور مجاز کی ایک تازہ غزل کا لاجواب شعر ہے ؎

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا — تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

یہ اپنا شاعر زلفوں کی سلامتی کے لئے موج ہوا سے جھگڑ پڑتا ہے، موجودہ شاعر کو دنیا کی بھی فکر ہے اور محبوب کی بھی اور اس لئے وہ اپنے سماجی اور تہذیبی فرائض کے بوجھ اور احساس سے بعض مرتبہ خود اہل زلف پر بھی طنز کرنے لگتا ہے۔ پرانی اردو غزل میں محبوب مقصود بالذات (End) تھا، نئی غزل میں محبوب مقصود بھی ہے اور سماجی مقصود کی جستجو اور تگ و دو میں ساتھی اور رازداں، کبھی رہبر اور کبھی راہی بھی۔ وہ اپنے عشق سے انسانیت اور اعلیٰ قدروں کے عشق کو اجاگر کرتا ہے اور اپنے غم سے غم روزگار تک پہنچتا ہے۔ شخصی محبت اور ملک اور آئیڈیل (Ideal) کی محبت میں تضاد نہیں، ہم آہنگی ہے۔ اسی نکتہ کو فیض نے اپنی نظم "دو عشق" میں واضح کیا ہے۔ آج منزل مقصود، محض انفرادی خوشدلی اور محدود نفسیاتی اور جنسیاتی تسکین اور معاشی فارغ البالی نہیں ہے بلکہ فرد اور سماج کی ہم آہنگی، ہمہ گیر ترقی اور اجتماعی آسودگی سے متعین ہے ــــ شخصی دلجوئی اور انبساط نہیں بلکہ سماجی خوشحالی اور متحدہ، متمدن اور ترقی پذیر زندگی کی عالمگیر مسرت ہے۔ اس لئے آج کا شاعر یگانہ کی زبان سے یہ شکوہ کرتا ہے؎

صد رفیق و صد ہمدم، پر شکستہ و دل تنگ   داو راستی زیبد بال و پر چمن تنہا

اور اس لئے پرانی اور نئی غزل کا بنیادی، اہم اور امتیازی فرق، موضوع اور مزاج کا فرق ہے۔ تکنیک اور اختراع کا فرق، لیکن سب سے بڑھ کر نظریاتی فرق ہے۔

(۸)

نئی غزل اور نئی شاعری کو سنوارنے اور نکھارنے کا فرض ہمارے فنکاروں پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ فن، ادب، تہذیب، سماج اور انسانیت کی ذمہ داری ان کو مشعل راہ بنتا ہے اور حسن کی نئی منزل کی طرف کاروان تہذیب کا جادہ پیما کرتا ہے۔ دل کو گرماتا ہے اور روح کو تڑپاتا اور نظریاتی انقلاب سے سماجی اور تہذیبی انقلاب کی بنیادوں کو استوار کرتا ہے، یعنی ان کو تو معماروں کی تعمیر کرتا ہے۔ معماروں کی تعمیر کا یہ کام بہت بنیادی، ضروری اور گرانقدر ہے اور انتہائی دشوار بلکہ جان لیوا ہے۔ اس اہم بالشان فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے معماروں کے معماروں کو پہلے خود اپنی تعمیر کا اہتمام کرنا ہوگا۔ آج ہمارے ادیب اور فنکار کم علمی کا شکار ہیں۔ یعنی یہ کہ بقول پروفیسر برنال (Prof. Bernal) "جتنا جاننا چاہئے اس سے کم جانتے ہیں" اس حقیقت کا ایمانداری سے اعتراف کرنا ضروری ہے۔ یہ نہ طعنہ ہے نہ انکسار نہ تحقیر، بلکہ امر واقعہ ہے۔ کم علمی ہمیں ابدی جہالت کے گڑھے میں ڈھکیل دیتا ہے۔ مگر اس کا اعتراف شاید علم کے دیئے روشن کرنے میں مدد دے۔ ہمارے ادب کا جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ اساتذہ اپنے علوم متداولہ اور فنون مروجہ سے خاطر خواہ بہرہ ور تھے۔ موجودہ فنکار اپنے عہد کے علوم اور فنون سے خاطر خواہ بہرہ ور نہیں ہیں۔ موجودہ علوم کی فراوانی اور ان کی ترقی اور وسعت کی برق رفتار حیرت انگیز ہے اور اس کے مقابلے میں انفرادی علمی تحصیل بہت حقیر معلوم ہوتی ہے۔ نئی سائنس اور ٹکنالوجی نے مادی دنیا کی شکل بدل دی ہے بلکہ خود مادہ اور اس کی ماہیت کے علم میں تبدیلی آگئی ہے۔ خارجی دنیا کی اس انقلابی تبدیلی نے ذہنی اور شعوری دنیا کی ساخت پر بھی بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ زمان و مکان کے تخیلات بدل گئے۔ وسعتیں کم ہوگئیں، دور قریب آگئے، سمندر سمٹ گئے، ہوائیں قبضہ میں آگئیں۔ خوف کا تصور نہیں رہا۔ پیداوار کے وسیلے بدل گئے۔ تعمیر کی قوتیں ظاہر ہوئیں۔ حسن کے نئے معیار بنے۔ دریاؤں کا سنجوگ ہوا۔ جہاں برف تھی وہاں کھیت ہیں، جہاں ویرانے تھے وہاں گلستاں ہیں۔ جہاں خموشی کا راج تھا وہاں نغمے ابل رہے ہیں۔ جہاں غلام تھے، وہاں آزاد ہیں۔ زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں، انسان آگے بڑھ رہا ہے۔ انسانیت ایک ہو رہی ہے۔ دنیا سمٹ کر ایک بستی بنتی جا رہی ہے۔ ایسی دنیا میں فنکار کا معیار بھی مختلف ہو چکا ہے اور بلند ہو گیا ہے۔ ہمارے فنکار کو ایسی دنیا کے ایسے معیار پر پورا اترنا ہے۔ اس لئے فنکار

کی نظریاتی، تخیلاتی اور جذباتی تربیت ضروری ہے۔ جمالیات آداب کی واقفیت اور لحاظ اور فنی ورثے سے قریبی تعلق ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آج جس سماج میں فنکاروں سے تخلیق کی یہ اعلیٰ امیدیں وابستہ ہیں۔ اس میں زندگی اور اس کی آسودگی کی معمولی ضروریات کو پورا کرنا کتنا کٹھن کام ہے۔ تخلیقی ادب کو جنم دینے والے خود اپنی زندگی کو موت کے پنجے سے چھڑانے میں اپنی توانائیاں صرف کر دیتے ہیں مگر کیا کیجئے کہ اسی دلدل سے نکلنا ہے اور نکالنا ہے۔ انسانی تہذیب کا یہ عجیب دلگیر مگر حکیمانہ نکتہ ہے کہ وہ جو شعور رکھتے ہیں اپنے شعور کو بھگتتے بھی ہیں۔ بائرن (Byron) نے بڑے ملال سے کہا تھا "علم غم ہے کیونکہ وہ جو وسیع علم رکھتے ہیں؛ مہلک حقیقت کو پانے کے لئے گہری مشکلات بھی سہتے ہیں:"

"Knowledge is sorrow. For they who know the most
must suffer the deepest, for the fatal truth"

ابھی ہمارے فنکاروں کو مثبت جمالیاتی قدروں کو جنم دینا ہے۔ موضوع میں بلاغت اور بیان میں فصاحت داخل کرنا ہے تاکہ غالب کے اس دعوے کے حریف بن سکیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

سماجی تقاضے، تاریخ اور تنقید، بڑی تمنا سے ان کی طرف نگراں ہیں۔ کیا وہ ان کو آزردہ کریں گے؟

دو ماہی
گجر
جسے ہند و پاک کے ممتاز ادیبوں
کا تعاون حاصل ہے جنوری کے آخری
ہفتے تک آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔
ترتیب کار
نجم الثاقب شحنہ
وحید اختر
شاذ تمکنت
گجر پبلشنگ ہاؤس ۱-۱۷ مجرد گاہ۔
معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن

ادب اور فلم کا علمبردار
ماہنامہ
نغمہ
حیدرآباد دکن
جسے ملک کے تمام مستند ادیبوں کا تعاون حاصل ہے
صفحات (۹۶) فی پرچہ ۶/
زر سالانہ چار روپے
ہر شہر میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے
ماہنامہ نغمہ۔ رزاق پورہ۔
حیدرآباد دکن

کلرک

عزیز قیسی

دن کی محنت گواہ ہے جن کی
زندگانی تباہ ہے جن کی
ان جفاکش حقیر ذاتوں کو
روز دفتر چبا کے تھوکتے ہیں
اور سوکھی چٹائیاں شب بھر
نیند کا انتظار کرتی ہیں

مضطرب نیند کے کچوکوں سے
فکرِ نانِ جویں کے پنجوں سے
آخرِ شب کے خواب کی تحریر
صبحدم روز اپنے بستر پر
لوحِ دل پر بچھا کے اٹھتا ہوں
ورقِ دل سجا کے اٹھتا ہوں
آس اک گلبدن کے آنے کی
آرزو کھل کے مسکرانے کی
عزم بزمِ شفق سجانے کا
جوش ایک انقلاب لانے کا
ایک بیچے ہوئے قلم کے تلے
ایک اک آس قتل ہوتی ہے
ایک اک گیت تلملاتا ہے
ایک اک لمحہ خون روتا ہے

سوچتا ہوں کہ ایسے عالم میں
آنسوؤں کی شراب جائز ہے

طعنۂ اقتدار کا خنجر
خونِ غیرت سے سوکھتا ہی نہیں
ایک بے مایہ جرعۂ مے سے
آنسوؤں کے دیئے نہیں بجھتے
اہلِ حاجت کی چیختی نظریں
چھوڑتی ہی نہیں میرا دامن
فائلوں کے سیاہ مقتل میں
ٹیڑھے میڑھے حروف کا دامن
ہر سویرے کو ڈھانپ لیتا ہے
حسرتیں خون میں نہائی ہوئی
سر اٹھاتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں
میری آنکھوں کے آگے مرتی ہیں

سوچتا ہوں کہ ایسے طوفاں میں
اک تبسم گناہ ہے شاید
جانے کب فرصتِ گناہ ملے
کب تبسم کی جلوہ گاہ ملے
کب دلِ زار کو پناہ ملے

ویرانہ —— شاذ تمکنت

یہ دشتِ زیست یہ گرمی یہ دوپہر یہ فضا
یہ کس جگہ تری زلفوں نے ساتھ چھوڑ دیا

بھٹک بھٹک سا گیا ہوں ہر ایک جادہ پر
قدم قدم پہ اثر ہے تری نگاہوں کا
یہ روز و شب کا دھندلکا سہارا بھی نہیں
فریب خوردہ ہوں شاید تری پناہوں کا

ٹپک سکا نہ کبھی آنکھ سے سرشکِ نشاط
میں تیرے حسن کا آئینہ دار تھا کہ نہیں
تو ہی بتا دے حریمِ متاعِ لطف و کرم
کہیں خدائے عبادت شعار تھا کہ نہیں

دکھائی دیتی ہیں راہیں ورائے موت و حیات
کہاں کہاں ترے غم کا چراغ جلتا ہے
بہت بدل بھی چکا رنگ صبح و شام مگر
یہ تیرا درد ہے کروٹ کہاں بدلتا ہے

گلہ گزار نہیں اجتناب کا تیرے
ہے یاد مجھ کو وہ کم کم سپردگی تیری
نیازِ عجز سے ملتی ہوئی سی کیفیت
وہ چور چور نگاہیں کبھی کبھی تیری

تھکے تھکے سے شب و روز مضمحل سی فضا
اتر چکا ہے رگِ جاں میں زہرِ ہجر و وصال
نوا کے معنیٔ رنج و خوشی بدل بھی چکے
نظر میں رقصِ تمنا جبیں پہ گردِ ملال

ترا سکوت کہ کو دے رہی ہے میری حیات
سخن کی آنچ کہ سینوں کے زخم کھل جائیں
وہ چال جیسے کوئی دل کی دھڑکنوں پہ چلے
کھنکتا لہجہ کہ سازوں میں راگ کھل جائیں

نہ جانے کتنی تمنائیں مجھ کو روتی ہیں
نہ جانے کتنی امیدوں کا شرمسار ہوں میں
سلگتی حسرتیں مدفون ہیں مرے دل میں
نہ جانے کب سے چراغِ سرِ مزار ہوں میں

حنائیں ڈوبے ہوئے سینکڑوں فسانے ہیں
مرے نصیب کہ جن سے لہو ٹپکتا ہے
مری حیات ہے یا شعلہ زار دیدہ و دل
مری صدا ہے کہ خونِ گلو ٹپکتا ہے

پذیرائی

وحیداختر

اپنے کو دیتے شب و روز کی تنہائی سے
میں نے گھبرا کے پکارا تھا کسے کیا معلوم
دستِ تخئیل نے کن زلفوں میں کی شانہ کشی
مدتوں چھپ کے سنوارا تھا کسے کیا معلوم

خود تراشیدہ بتوں ہی کی پرستش کر کے
ذہن کو رشکِ صنم خانۂ آذر سمجھا
میرے پندارِ طبیعت نے محبت میں بھی
اپنے ہی ساختہ اصنام کو معبود کہا

میرا اشہکار مرے ذہن کے بت خانہ سے
جانے کب یورشِ افکار اڑا لائی تھی
میں نے پایا نہ کسی محفلِ خوباں میں اسے
جستجو اس کی بہت شہر نگاروں میں کی

جا کے ہر کوئے بتاں میں اسے آوازیں دیں
چاک دل، زخم جگر، دیدۂ تر دکھلائے
وہ مرا محرمِ اسرار کہیں مل نہ سکا
ہر نگر میں اسے خود دیدہ و دل ڈھونڈ آئے

اور تھک ہار کے جب آبلہ پا بیٹھ گیا
تیرے قدموں کی صدا پاس سے یوں آئی ہے
میں یہ سمجھا کہ مرے ذہن کی دیواروں سے
میری گونجی ہوئی آواز ہی ٹکرائی ہے

آنکھ بھر کر تجھے دیکھا تو یہ محسوس ہوا
جیسے پوجا ہے تخیل میں تجھ کو برسوں
تیرے اندازِ تکلم سے ہوا دل کو یقیں
گفتگو کی ہے خیالوں میں تجھی سے پہروں

تو نے سازِ دلِ مضطر پہ رکھا یوں مضراب
عشق نے چھیڑ دیئے ہیں نا شنیدہ نغمے
قربِ محتاط کی مانوس حرارت پا کر
کھل اٹھے شاخِ تمنا پہ ہزاروں غنچے

خندۂ زیر لبی سے ترے معلوم ہوا — کیسے کلیوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے
تیرے مہکے ہوئے انفاس نے بتلایا ہے — کس کی خوشبو میں بسی بادِ صبا آتی ہے

تو نے آنکھوں سے پلائی تو ہوئی ہے یہ خبر — آبِ حیواں کی روایات کہاں سے آئیں
تابشِ مصحفِ رخسار نے کی ہے تفسیر — شعلۂ طور کی آیات کہاں سے آئیں

میرے ویران شب و روز کی صحراؤں میں — تو نے وہ شمع جلائی کہ بجھا بھی نہ سکوں
دل کی ہر دکھتی ہوئی رگ کو چھوا ہے کچھ یوں — بھولنا چاہوں جو تجھ کو تو بھلا بھی نہ سکوں

میری راتوں میں تری یاد کے تاروں کا ہجوم — مہرِ دیدار کی امید سے صبحیں روشن
قرب کی آنچ سے چمکائی ہوئی دوپہریں — شامیں تیرے ہی تصور کی شفق کا دامن

تیری چاہت نے دیا ہے جو گلاب تازہ — دل کے گلدستۂ رنگیں میں سجا رکھا ہے
مئے امید سے لبریز ہے امروز کا جام — گردِ اندیشہ سے دامن کو بچا رکھا ہے

تو اگر چاہے تو وہ خواب حقیقت بن جائیں
میں نے اب تک جنھیں سینے سے لگا رکھا ہے

○

سحر کا پیامی

س۔ ل۔ عشرت

(سجاد ظہیر کے نام)

ترے یقیں کے قدم ڈگمگا نہیں سکتے
ترا وجود ہے آزاد جیل خانے میں
اجل[1] بھی تجھ کو حیات دوام بخشے گی
اک اور باب کھلا عشق کے فسانے میں

سمجھ رہے ہیں کہ زنجیر کی جھنکاروں میں
جوان و تند عزائم کو بند کر دیں گے
سمجھ رہے ہیں کہ اک جنبش قلم سے تمام
وطن کے راج دلاروں سے جیل بھر دیں گے

بزرگ دوست تو مجبور ہو نہیں سکتا
تری نظر مہ و پرویں پہ ڈالتی ہے کمند
ترا وجود ہے اس تیرگی میں مشعل راہ
ترے عظیم ارادے رہیں گے یوں ہی بلند

سمجھ رہے ہیں کہ اب رائفل کی گو
گرجتے چڑھتے طوفاں کو روک سکنے
سمجھ رہے ہیں کہ پھانسی کے ایک جھٹکے[1]
دل عوام کی دھڑکن کو روک دیگا

یہ سامراج کے پٹھو یہ ظلمتوں کے نقیب
نگل چکا ہے جنھیں آج بے حسی کا جذام
بہ ایں خباثت قلب سیہ سمجھتے ہیں
کہ چل پڑے گا حکومت کا یہ ذلیل نظام

سمجھ رہے ہیں کہ سازش کا آسرا لے کر
تری سحر کی بشارت کا خون کر دیں گے
سمجھ رہے ہیں کہ تاریکیوں میں الجھا کر
تری نظر کی حرارت کا خون کر دیں گے

سمجھ رہے ہیں کہ قانون کے شکنجے میں
تری صداقت بیباک کو کچل دیں گے
سمجھ رہے ہیں کہ ان آہنی سلاخوں میں
عظیم جراءت بے باک کو کچل دیں گے

ہزار جیل کی تاریکیوں میں بند کر
مگر یہ عظمت کردار مر نہیں سک
ہزار طوق و سلاسل سے تجھ کو زیر کر
کبھی بھی جراءت بیکار مر نہیں

---

[1] دوران مقدمہ میں وکیل سرکار نے شدت سے پھانسی کا مطالبہ کیا تھا۔

غزل اس نے چھیڑی.....

حمید الماس

آج بھی میرے خیالوں کی حسیں وادی میں
مسکراتے ہیں تری یاد کے اجلے سے کنول
مدتیں بیت گئیں تجھ سے جدا ہو کے مگر
میرے ماضی کو کبھی چھو نہ سکی بادِ اجل
تیرے وعدوں کا تبسم تیری باتوں کا جمال
دلِ برباد تمنا کے لئے وجہ نشاط
وہ ہر اک لمحہ جو گزرا ہے ترے پہلو میں
دے گیا ہے مری افسردہ امنگوں کو ثباتؔ[1]

ذرے ذرے پہ یہاں تیرا نشہ طاری ہے
روز و شب شام و سحر غم کی فسوں کاری ہے

رات کی کوکھ سے جب صبح جنم لیتی ہے
غم خاطر تری دوری کے ستم سہتا ہے
نغمہ خواں ہوتے ہیں جب ماہ و ستارہ کے طیور
قلب احساس کی آنکھوں سے لہو بہتا ہے
نغمہ و شعر کے ہنستے ہوئے پیمانوں میں
مسکراتی ہے تری یاد کی رنگین شراب
اور غم خانۂ فرقت کے ہر اک گوشہ سے
چھڑنے لگتے ہیں تیرے درد کے بے تاب رباب
اکثر اوقات دمِ فکر یہ آتا ہے خیال
رک گئی کیوں ترے الطاف و محبت کی ہوا

سوتے سوتے نیند آتی ہے ارمانوں کو
اونگھنے لگتی ہے ماضی کی پر اسرار فضا

مصحفِ دل پہ منقش ہے تری اک اک بات
یاد ہیں اب بھی مجھے کیف کے رنگیں لمحات

جب ترے پیار کی ہر سانس کا محبوب پیام
بخش دیتا تھا مرے پیکرِ تخیل کو خرام
جب تصور مرے ماضی سے سنور جاتا ہے
ایک اک لمحہ ترے غم سے جلا پاتا ہے
پھر بھی غم ہے کہ تری یاد سے دنیائے خیال
پا نہیں سکتی رخِ شاہدِ قربت کا جمال
اور پھر دل ہے کہ بے تاب ہوا جاتا ہے
جانے یہ وہم سا کیوں دل میں امڈ آتا ہے
تیرے احساس کے رنگین چمن زاروں میں
میری یادوں کی ہواؤں کا گزر ہے کہ نہیں
اور ماحول کی خوش رنگ طرب گاہوں کو
دلِ برباد تمنا کی خبر ہے کہ نہیں

ایک مدت سے مرا دل ہے ترے غم سے ملول
کیوں نہیں ہوتا مرے در پہ مسرت کا نزول

---

[1] صوتی لحاظ سے نشاط کا قافیہ ثبات استعمال کیا گیا ہے

فلسفۂ عشق

نورجہاں نقوی

(شیلی کی نظم "Love's Philosophy" کا آزاد ترجمہ)

چشمے اٹھلاتے ہوئے جا ملے دریاؤں سے
نیلگوں بحر سے دریا ہوئے مصروفِ کنار
اپنے دامن میں لئے جذبۂ شیریں دوام
چلی آتی ہے صبا خلد سے باعزّ و وقار

کوئی شئے دہر میں تنہا نہیں رہنے پاتی
سب بہم ہیں ..... کہ یہ قدرت کا ہے آئینِ عجیب
سبھی سرشار ہیں مقصود کو اپنے پاکر
کیوں مجھی کو نہیں اے دوست ترا قرب نصیب

ذوقِ پابوسیٔ افلاک میں کہسار بڑھے
گل سے سرگوشیاں کرتی ہے نسیمِ گلزار
کارفرما ہے ہر اک شئے پہ جنوں خیز نشاط
جنّتِ دیدہ ہے امواج کا یہ بوس و کنار

سینۂ بحر میں ہے جذبِ شعاعِ مہتاب
کس قدر شاد و طربناک ہے دنیائے حسیں
مہرِ انور کا یہ جھک جھک کے بلائیں لینا
بڑھ گئی رفعتِ افلاک سے کس درجہ زمیں

پرتوِ مہر، یہ دریا، یہ تلاطم خیزی
گنگناتی ہوئی اٹھلاتی ہوئی بادِ صبا
جب نہیں تم تو تمنّائے مسرت بھی نہیں!
پھونک دے کوئی جہاں کی یہ طربناک فضا!!

آخری رات

مرزا شکور بیگ

اس حالیہ ریل کے حادثہ سے متاثر ہو کر جو ۲۷ر ۲۸ر ستمبر ۱۹۵۴ء کی درمیانی شب میں جنگاؤں اور رگھوناتھ پلی (حیدرآباد دکن) کے درمیان "دسنتی" ندی کا پل ٹوٹ جانے کی وجہ سے ہوا اور جس میں سینکڑوں آدمی مرے۔

ابر تھا چھایا ہوا اور زور کی برسات تھی ماہ ستمبر کی اٹھائیسویں وہ رات تھی
سب کو دامن میں چھپائے ریل جب چلنے لگی ہاتھ اپنے چپکے چپکے زندگی ملنے لگی
ریل کے ڈبوں کے اندر کی فضا پرنور تھی اور باہر زلف پھیلائے شب دیجور تھی
بھر رہی تھی ریل فراٹے نہایت جوش میں قافلہ یوں جا رہا تھا موت کی آغوش میں
بعض بیٹھے اونگھتے تھے بعض محو خواب تھے منزل مقصود کی دھن میں سبھی بیتاب تھے
کچھ نظر آتا نہ تھا ایسی بھیانک رات تھی ریل کے چاروں طرف برسات ہی برسات تھی
تین چھوٹے چھوٹے خانوں کا وہ پل آنے کو ہے اب "دسنتی" اپنا پورا زور دکھلانے کو ہے
ریل اس بدبخت پل کے پاس جب جانے لگی موت کے ہونٹوں پہ ہلکی سی ہنسی آنے لگی
سینکڑوں ارماں لئے جو عالم فانی میں تھے گھڑ گھڑاہٹ سی ہوئی اور سب کے سب پانی میں تھے
دل ہلانے والی کچھ چیخیں اٹھیں اور رہ گئیں دہر کی ناپائداری کا فسانہ کہہ گئیں
اب نہ اپنے کا پرائے کا کسی کو ہوش تھا اور اس چھوٹی سی ندی میں بلا کا جوش تھا
سیکڑوں پیر و جواں ندی کی تہہ میں رہ گئے بیسیوں ایسے تھے جو دھارے میں میلوں بہہ گئے
کچھ مسافر بچ گئے، سمجھے یہ اپنے شاد تھے زیست کے بندھن سے باقی سب کے سب آزاد تھے
پل نہیں ٹوٹا قضا کا در جو تھا وا ہو گیا دیکھتے ہی دیکھتے کیا تھا ابھی کیا ہو گیا
سن کے اکثر آ گئے امداد دینے کے لئے بعض موقع پر گئے کچھ لوٹ لینے کے لئے

قیمتی جانوں کا جب یوں ہو گیا قصہ تمام
لیڈروں نے اپنی ہمدردی کے بھجوائے پیام

ڈنڈا کتھا

شرورسا ڈنڈا

برا کتھا تلگو فوک آرٹ کا ایک فارم ہے جس میں کوئی قصہ نظم اور نثر کی آمیزش سے تمثیلی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ فارم تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ تلگو فوک آرٹ کے ایک قدیم مقبول فارم سے جس کو سہولت کے لئے تلگو بیٹے کا نام دیا جا سکتا ہے اور جس کے ذریعہ مذہبی اور اخلاقی قصے بیان کئے جاتے تھے اخذ کیا گیا ہے اور آج پورے آندھرا میں بیحد مقبول ہے۔ برا کتھا کا رواج دراصل اس زمانے میں زیادہ ہوا جب کہ تلنگانے میں جاگیرداروں اور زمینداروں کے خلاف کسانوں کی لڑائی شروع ہوئی اور آج برا کتھا سیاسی خیالات کے اظہار کے لئے شاید سب سے زیادہ موثر فارم کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

برا کتھا کو عام نظموں کی طرح شاعر نہیں سناتا بلکہ برا کتھا سنانے والے دلم (اسکوارڈ) تیار کئے جاتے ہیں یہ دلم تین آدمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں ایک آدمی کے پاس ستار کے قسم کا ایک ساز ہوتا ہے اور دوسرے کے پاس مجیرے اور تیسرے کے پاس برّا (صراحی کی شکل کا ایک باجا جس کے دونوں طرف چمڑا منڈھا ہوا ہوتا ہے) ستار والا آدمی لیڈر ہوتا ہے جو کھڑے ہو کر گاتے ہوئے کتھا سناتا ہے اور اس کے دونوں ساتھی بیٹھے ہوئے مجیرے اور برّا بجاتے اور بیچ بیچ میں (جیسا کہ پہلے سے طے ہوتا ہے) اپنے ساتھی سے سوالات کرتے جاتے ہیں۔ اور وہ ان کو جواب دیتا جاتا ہے اور اسی انداز سے کتھا آگے بڑھتی جاتی ہے۔

سرور ڈنڈا نے یہ نظم اسی برا کتھا کی تکنیک پر لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں پوری طرح تو وہ تکنیک نہیں آئی لیکن اس کی ایک جھلک ضرور موجود ہے۔ ڈنڈا حیدرآباد کا ایک مقبول عوامی شاعر ہے جو "معیاری اردو" کے بجائے یہاں کے ہزاروں لاکھوں عوام کی زبان میں شاعری کرتا ہے اسی وجہ سے ڈنڈا کی شاعری کی افادیت کا دائرہ بہت وسیع اور صد و رس ہے۔

(ادارہ)

میں کتھا سناتا ہوں بھئی چڑی موڑی غپ چپ[1]

بھارت کے بھاگ جاگے — سرکار یہ ہماری

انگریز یاں سے بھاگے — سنکھیا کے ناد پیاری

اک ہور قدم آگے — کوڑی کو پیکی ہاری

میں سوچ بتاتا ہوں بھئی چڑی موڑی غپ چپ — میں سوچ ————

میں کتھا سناتا ———— — میں کتھا سناتا ————

---

[1] بچوں کا ایک کھیل جس میں ایک بچہ جو "چور" بنتا ہے، دوسرے تمام بچوں کو جو چپ رہتے ہیں اپنی حرکتوں سے ہنسانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو بچہ ہنس دے یا بول پڑے وہ "چور" بن جاتا ہے۔ [2] اور [3] آندھرا [4] بھی

ہنس ہنس کو دل لیے سو
وعدے الٹن[1] کیے سو
مل جل کو غم سپیے سو

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

بچوں تو گولی چل گئی
ہر گھر میں ہولی جل گئی
یہ بات جگ کو کھل گئی

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

منصوبہ پانچ[2] سالہ
سب کا کریا دوالہ
سادھو بچا نہ لالہ

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

ہر عہدہ دار اعلیٰ
آفت کا ہے پرکالا
لبی[3] کا کھانے والا

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

نیں نیت[4] سو ستم گاڑے
جنتا کو زندہ گاڑے
کیا رات کیا دن دھاڑے[5]

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

قانون ہے نرالا
جھوٹوں کا بول بالا
سچوں کا منہ ہے کالا

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

پھیکے پڑے ہیں میلے
روپیہ نہ پاس دھیلے
ایک جیتا[6] سو بھیتے

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

دوزخ ہیں دواخانے
ڈاکٹر کے سو بہانے
ترساں ہیں ننھے تانے

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

پنڈت[7] بچا نہ مولی
کھاندے کو لگی جھولی
ٹھگوں کی بنی ٹولی

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

بن پیر کی اڑائے سو
دوستاں کو لڑائے سو
سولی پو چڑھائے سو

میں سونچ ____________
میں کتھا سناتا ____________

---

۱ انھوں نے ۲ کیا ۳ طرح طرح کے ۴ جو ڈھائے ۵ مولوی ۶ کندھا ۷ پہ ۸ رشوت

معین احسن جذبی

چمن سے لالۂ و گل کے سلام آتے ہیں
ہمارے نام جنوں کے پیام آتے ہیں

نہ جانے ساقیٔ بزمِ رس پہ آج کیا گزری
کہ میکدے کوئے تشنہ کام آتے ہیں

وہ جن کی منزلِ مقصود کہکشاں سے پرے
ہمارے ساتھ بس اک چند گام آتے ہیں

وہ خوش خرامیٔ آوارگانِ راہِ وفا
جہاں سے دار و رسن کے مقام آتے ہیں

مجروح سلطانپوری

(ہندستان کا ہاتھ ایک عوامی حکومت (چین) کی طرف پہلی بار بڑھتے دیکھ کر۔)

آ ہی جائے گی سحر مطلع امکاں تو کھلا
ہم نوا قفل تو ٹوٹا در زنداں تو کھلا
آج لائی تو صبا اک گلِ چینی کا پیام
وہ بھی زخم کی صورت لب خنداں تو کھلا
ہے تو ہاتھوں میں کوئی سازِ دہ زنجیر بھی
رقص پابند سہی حلقۂ دوراں تو کھلا
سیلِ رنگ آ ہی رہے گا کبھی اے کشت چمن
ضرب موسم تو پڑی بند بہاراں تو کھلا
دل تلک پہنچے نہ پہنچے مگر اے چشم حیات
بعد مدت کے ترا پنجۂ مژگاں تو کھلا

درد کا درد سے رشتہ ہے چلو اے مجروح
آج یاروں سے یہ اک عقدۂ آساں تو کھلا

خلیل الرحمٰن اعظمی

پہلے بھی سہے ہیں رنج بہت پر ایسی گھڑی کب آئی ہے
کتنی کالی کالی راتیں کتنی گہری تنہائی ہے
میرے من کے ساگر میں ڈوبو تو شاید جان سکو
جو جو آنسو میں نے پئے ہیں ان میں کیا دانائی ہے
کس کس طور زمانے بھر کے ہم نے کچوکے کھائے ہیں
تم بھی سن کر رو دو گے یاں ہنس ہنس عمر بتائی ہے
ہم بے پروا عاشق تیرے ہم غم دوراں کو کیا جانے
جس کے کارن تجھ کو چھوڑا اس غم کی دہائی ہے
جل جل کر ہم خاک ہوئے تب جاکے نگاہیں نکھری ہیں
ہائے وہ جسم ناز کہ جس میں آئینے کی صفائی ہے
جن گلیوں میں اعظمی صاحب آپ بہت بدنام ہوئے
پھر بھی آپ وہیں جاتے ہیں اس میں کیا دانائی ہے

متین سروش

مسلط ہیں دماغوں پر روایات کہن اب بھی
اندھیرے میں بھٹکتا ہے غرور علم و فن اب بھی
یہ مانا دیکھ لیں سب جلوہ گاہیں علم و عرفاں کی
ترے دل میں نہیں پہنچی حقیقت کی کرن اب بھی
چراغاں ہم کریں کیا آمد فصل بہاراں پر
کہ خون دل میں ہے ڈوبی ہوئی صبح چمن اب بھی
زمانہ دیکھ کر جس کو خوشی سے جھوم اٹھا ہے
وہ خلعت ہے چمن کی لالہ و گل کا کفن اب بھی
نشیمن جس نے پھونکے ہیں ہزاروں ہمنواؤں کے
اسی صیاد پہ تکیہ ہے کیوں اہل چمن اب بھی
گرا دیوار حائل لاکھ تم سحر سیاست کی
ہمارے منتظر ہیں گلشن و کوہ و دمن اب بھی
وہی عزم ستیزہ کار ہے ذوق شہادت کا
لرز اٹھتا ہے اکثر عرصۂ دار و رسن اب بھی
حدیث آرزو رس گھولتی ہے گوش فطرت میں
ہمارے زمزمہ خواں ہیں لب سرو و سمن اب بھی
نوائے حق کہیں رکتی ہے جبر دار و زنداں سے
نمایاں ہے سروشؔ اپنا یہ انداز سخن اب بھی

اکبر حیدرآبادی

چرچے ہمارے آج نہ ہوں کیوں چمن چمن
ہم ہی تو بن سے ہیں بہاروں کے پیرہن

زیرِ قدم ہے وسعتِ صحرائے شش جہات
بجلی کا ہے نہ بادِ صبا کا کوئی وطن

ہنگامہ ہائے محفل و بازار ہم سے ہیں
ہم ہی چراغِ راہ ہیں ہم ہیں شمعِ انجمن

جلتے ہیں جس کے پھول خود اپنی ہی آگ میں
دکھلا دیا جنوں نے وہ ویرانۂ چمن

ہم ہی ہلاکِ خنجرِ بے مہریٔ عصر ہیں!
منسوب ہیں ہمیں سے حکایاتِ کوہکن

آتی ہے ایک ایسی بھی ساعت حضورِ عشق
جب حسن کو بھی ہوتی نہیں جرأتِ سخن

کیا جذبۂ لطیف ہے احساسِ عشق بھی
اک آگ دھیمی دھیمی سی ہلکی سی اک چبھن

جو ہر مذاقِ شعر کو سیراب کر سکے
دامن میں ہے غزل کے وہ سرمایۂ سخن

اے دوست بن چکے ہیں امانت عوام کی
میری حیات میری نظر میرا شعر و فن

اکبر ہے کس کا ذکر [illegible] میں
ہے نغمہ سنج کس کے لیے پائلِ رسن

اثر مجیدی

قیامت تم سے شرماتی رہے گی
تمہیں تاریخ دہراتی رہے گی

ہماری داستانِ زخمِ دل پر
تمہیں کب تک ہنسی آتی رہے گی

رہیں گے تابہ کے ہم پایہ جولاں
یہ کب تک زلف بل کھاتی رہے گی

گزر جاؤں اگر دامن کشیدہ
گلوں کی آبرو جاتی رہے گی

نشیمن تو بہر عنواں بنے گا
یہ بجلی یوں ہی لہراتی رہے گی

نہ کیجے آسمانوں کی تمنا
زمیں بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی

یعقوب عثمانی

اشکوں میں وہی جوش تمنا زاد باقی ہے
ابھی دل میں خدا رکھے کسی کی یاد باقی ہے
سر منزل فریب رہنما کا توڑ مشکل تھا
غنیمت ہے کہ شوق مرحلہ ایجاد باقی ہے
ہنسی آتی ہے تیرے اس غرور دام داری پر
کوئی پھندا ابھی ثابت آج اے صیاد باقی ہے
تباہی گھیرنے والی تھی آخر کن سفینوں کو
تہِ گرداب شور "ہرچہ بادا باد" باقی ہے
ابھی سے بند ہو گئی ہچکی چمن افروز کلیوں کی
ابھی تو داستانِ نکہت برباد باقی ہے
زبان وقت کل سے اک نیا افسانہ چھیڑے گی
بہت تھوڑی سی یعقوب آج کی روداد باقی ہے

مصطفےٰ علی اکبر گرامی

زخم دل ہیں انھیں ہر حیلہ ابھرنا بھی تو ہے
اے مرے دوست تری بزم سنورنا بھی تو ہے

مئے گلرنگ ہو یا زہر ہلاہل کچھ ہو
اپنا پیمانۂ خالی مجھے بھرنا بھی تو ہے

حیلۂ برہنہ پائی نہیں شایاں جنوں!
انھیں کانٹوں کے بیاباں سے گزرنا بھی تو ہے

یوں تو عنوانِ جنوں کب کے بدل بھی جاتے
میرے شانوں پہ تری زلف بکھرنا بھی تو ہے

ہیں بہت جینے کے سامان ترے حسن کی خیر
غم نصیبوں کو ترے عشق میں مرنا بھی تو ہے

شہاب جعفری

ہمدردیاں تو دردِ نہاں کی دوا نہیں
اے غمگسار تجھ پہ کبھی غم پڑا نہیں
سب مبتلائے کشمکشِ روزگار ہیں
ورنہ جہاں میں کس سے امیدِ وفا نہیں
ترکِ تعلقات پہ آنسو نکل پڑے
چھوٹے ہیں اور کسی کو کسی سے گلہ نہیں
اس نے دغا نہ کی تو بڑی بات کیا ہوئی
مجبوریاں بھی ہوں گی وہ دل کا برا نہیں
یوں ہی کہا تھا رنگِ زمانہ کو دیکھ کر
ورنہ "خدانخواستہ" تم بیوفا نہیں
اچھا تو الوداع — پیر اے طالبِ اجل
کیا تجھ کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں
جینا پڑے تو بوالہوسو لو نہ نامِ عشق
مرنا ہی زندگی میں ثبوتِ وفا نہیں
غم کو نباہ لو تو بڑی چیز ہے شہاب
غم زندگی کے حق میں کچھ ایسا برا نہیں

بشر نواز

رات آ پہنچی ہے اب صبحِ درخشاں کے قریب
ہیں یقیں کی بھی حدیں عالمِ امکاں کے قریب

ہر کلی پوچھتی ہے موسمِ گل کچھ تو کہے
کیوں صبا لوٹ گئی آ کے گلستاں کے قریب

سوچتا ہوں کہ یہی حاصلِ الفت تو نہیں
یہ جو اک ٹیس سی اٹھتی ہے رگِ جاں کے قریب

کیا خبر نکہتِ گل آئے ادھر بھی کہ نہیں
تھک کے بیٹھا تو ہوں دیوارِ گلستاں کے قریب

کتنی الجھی ہوئی راہوں کو سلجھانا ہے ابھی
کانپ اٹھی آ کے نظر زلفِ پریشاں کے قریب

ہم نے چاہی تھی رہائی، یہ تمنا تو نہ تھی
جشنِ آزادی منائیں درِ زنداں کے قریب

غفور انیس

ہائے اک تو کہ مہرباں نہ ہوا
دل سے اپنا جو بدگماں نہ ہوا
بزم رنداں میں شہر خوباں میں
تیرا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا
تیرے در پہ پڑے رہے ورنہ
اہل دل کا کوئی مکاں نہ ہوا
سنتے ہیں موسم بہار آیا
گلستاں پھر بھی گلستاں نہ ہوا
کوئی تجھ بن حریفِ حسن ترا
نہ ہوا زیرِ آسماں نہ ہوا
حرم و دیر میں جو سر نہ جھکا
منکرِ حسنِ گل رخاں نہ ہوا

سعادت نظیر

خدا معلوم جب غنچے ہنسے شبنم پہ کیا گزری
تبسم کی فضاؤں میں دیدۂ پرنم پہ کیا گزری

بتا اے ہمتِ دل! گردشِ پیہم پہ کیا گزری
تری تابانیوں سے ظلمتِ عالم پہ کیا گزری

غمِ جاناں ہی کیا کم تھا؟ غمِ دوراں بھی اپنایا
خدا جانے اسیرِ گیسوئے پرخم پہ کیا گزری

جو ہے بے درد اس کو درد کا احساس ہو
ستم گر کی بلا جانے ستم سے ہم پہ کیا گز

ہاں فرق اسیری کا اور آزادی میں جب کوئی
پوچھو اس گھڑی اپنے دل پرغم پہ کیا گزری

قطعات

شاہد صدیقی

حسین فاطمی کی شہادت پر

وطن سے حافظ و سعدی کی کیا خبر آئی
نظر میں پھرنے لگا کربلا کا نظارا
مقام اور ہے حالات اور ہیں لیکن
کسی یزید نے پھر اک حسین کو مارا

محمد علوی

دھیرے دھیرے مچل رہا ہے دل
چاند کے ساتھ چل رہا ہے دل
کتنی آہستہ کٹ رہی ہے رات
کیسا رک رک کے چل رہا ہے دل

•

آنکھیں ہیں کہ بھونرے ہیں بہکتے ہوئے دو
رخسار ہیں یا پھول مہکتے ہوئے دو
زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
لب ہیں کہ ہیں انگارے دہکتے ہوئے دو

•

کوئی پہلو قرار ہے نہ سکوں
کیا کروں تجھ کو اے دلِ محزوں
میرے بس میں نہیں، دگر نہ میں
اتنا پاگل نہیں کہ پیار کروں

•

راہ سے دور ہو گئے ہیں تو کیا
تھک کے ہم چور ہو گئے ہیں تو کیا
کل نئے ولولے ابھاریں گے
آج مجبور ہو گئے تو کیا

چینی کہانی

اپاہج

پا۔ چن
ترجمہ:۔ شاہد صدیقی

پاچن کا اصلی نام لی۔ پی۔ کن ہے، وہ ۱۹۰۴ء میں سیچواں کے صوبہ میں پیدا ہوا۔ اس نے کئی ناول لکھے جن میں تین المیئے خاندان، بہار اور خزاں بہت مشہور ہیں۔ ان کے ذریعہ سے پاچن نے قدیم جاگیرداری کے خلاف نوجوانوں کی جدوجہد بیان کی ہے، ۱۹۳۷ء تک جاپانی حملے سے پہلے اس کے کئی ناول بہت مقبول ہوئے۔ مخالف جاپان جنگ کے زمانے میں اس کی تحریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۵۲ء میں چینی مصنفوں کے وفد کا ممبر بن کر وہ کوریا گیا جہاں اس نے چشم دید واقعات کی بناء پر کئی کہانیاں لکھیں۔ یہ کہانی اسی مجموعہ سے لی گئی ہے۔

ایک صبح میں چینی عوامی رضاکاروں کی ایک یونٹ کے پولیٹکل ڈپارٹمنٹ میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک امریکہ کے دو بمبار ہوائی جہازوں نے وادی کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں پر بمباری شروع کر دی۔ اس گاؤں میں صرف دس خاندان آباد تھے۔ بمباری کے بعد گاؤں میں ایک تہائی مکانات تو بچ گئے، باقی سب تباہ ہو گئے۔ تین کوریائی شہری موت کی آغوش میں سو گئے اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔

حملے کے فوری بعد ہمارے چینی والینٹیر گاؤں والوں کی مدد کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ ان میں سب سے پہلے جس شخص نے تباہ شدہ گاؤں کی حدود میں قدم رکھا وہ پولیٹکل ڈپارٹمنٹ کے شعبہ تعلیم و تشہیر کا سکریٹری کامریڈ وانگ چنگ تھا۔ وہ بڑی پھرتی کے ساتھ ایک جلتے ہوئے مکان میں داخل ہوا اور ایک اپاہج لڑکے کو لئے ہوئے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس لڑکے کی ماں بھی کسی رشتہ دار کے مکان سے نکل کر اپنے بچے کے پاس آ گئی۔ اس نے کامریڈ وانگ کو محبت بھرے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا اور اپنی آنکھوں میں احسان مندی کا جذبہ لئے ہوئے آنسو بہانے لگی۔

میں وادی کی ایک مٹی سے بنی ہوئی جھونپڑی میں کامریڈ وانگ کے ساتھ ہی رہتا تھا اور حالانکہ ہم دونوں صرف دو ہفتے پہلے ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان دوستی کا ایک مستحکم رشتہ پیدا ہو چکا تھا۔ کامریڈ وانگ کی عمر تقریباً پچیس سال تھی، قد متوسط تھا اور وہ خاصہ تندرست نظر آتا تھا۔ کوریا کے مقامی باشندے اس سے محبت کرتے تھے اور وہ ان کی زبان میں اچھی طرح بات چیت کر سکتا تھا۔

گاؤں والوں کی حتمی مدد کرنے کے بعد وہ پولیٹکل ڈپارٹمنٹ واپس آ گیا لیکن اب اس کا حلیہ ہی دوسرا تھا، اس کے چہرے پر اور ہاتھوں پر زخموں کے نشانات تھے۔ خاص کر اس کا بایاں ہاتھ بری طرح زخمی تھا۔ اس کے کپڑے بھی جل گئے تھے۔ یونٹ کے ڈاکٹر نے اس کے زخموں پر مرہم لگا دیا اور بائیں ہاتھ پر پٹی باندھ دی۔

رات کے وقت زخموں کے درد کی وجہ سے اسے نیند نہیں آئی اور وہ اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایسی حالت میں میرے لئے بھی سو جانا ناممکن تھا۔ چنانچہ ہم دونوں اندھیرے میں باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران میں میں نے کامریڈ وانگ سے مجھ تفصیلی واقعات معلوم کرنے چاہے۔

"مجھے تین مہینے پہلے کے واقعات سے ابتدا کرنی چاہئے" — وانگ نے کہا — "یہاں آنے سے پہلے ہم لوگ دوسرے گاؤں میں تھے اور عارضی طور پر گاؤں والوں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس گاؤں میں پچپن سے زیادہ خاندان آباد تھے اور بچوں کی تعداد بھی بہت تھی۔ تقریباً ہر گھر میں چند بچے تھے اور ان کی اکثریت قریب کے ایک مدرسے میں پڑھنے جاتی تھی۔ تمام بچے شام کے وقت مدرسے سے واپس آکر کچھ ناشتہ کرتے اور پھر گھروں سے نکل کر کھیل کود اور ناچ گانے میں مصروف ہو جاتے۔ اپنے فرصت کے اوقات میں ان بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھنا میرے لئے ایک تفریح کی حیثیت رکھتا تھا۔

"ہمارے دفتر کے سامنے ایک گھر تھا لیکن میں نے اس گھر سے نکل کر کسی بچے کو مدرسہ جاتا ہوا نہیں دیکھا، حالانکہ جب بھی اس گھر کے قریب سے گذرتا تو اس کی کھڑکی میں مجھے ایک بچہ نظر آتا جس کا سر منڈا ہوا تھا اور جس کا بنیادی چہرہ ہمیشہ مسکراتا رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بچے کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ یہ بچہ ہر وقت ایک گول آئینہ ہاتھ میں اٹھائے رہتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ بچہ بیمار ہے پھر بھی میں یہی سوچتا رہا کہ یہ بچہ کس بیماری میں مبتلا ہے اور اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ میں ہر وقت آئینہ رہنے کے کیا معنی ہیں؟

اس گھر میں تین ہستیاں اور تھیں۔ ایک سن رسیدہ جوڑا اور ایک متوسط عمر کی عورت۔ بڑھیا کو چینی رضاکاروں سے بات چیت کرنے میں بڑا لطف آتا تھا، خواہ وہ اس کی زبان بالکل نہ سمجھتے ہوں۔ بڑھیا ان سے گفتگو شروع کر دیتی اور اگر وہ جواباً اپنا سر ہلاتے رہتے تو اس کی تسکین کے لئے کافی تھا۔ مجھے اس بڑھیا سے قریب ہونے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا پڑا۔ ایک روز جب کوریائی باشندوں کی تعطیل کا دن تھا۔ بڑھیا مجھے اپنے گھر لے گئی اور مجھے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی روٹیاں کھانے کی دعوت دی۔ میں اس کی دعوت کو رد نہیں کر سکتا تھا چنانچہ مجھے گرم روٹیاں کھانی پڑیں جنھیں لوبیا ڈالنے سے بھر کر بنایا گیا تھا۔

کھانے کے دوران میں ہم باتیں کرتے رہے۔ میں نے بڑھیا سے پوچھا کہ وہ بچہ جو ہر وقت آئینہ سے کھیلتا رہتا ہے، کون ہے۔ بڑھیا نے مجھے بتایا کہ وہ اس کا پوتا ہے اور اس کی عمر تیرہ سال ہے۔ پہلے وہ کہیں اور رہتا تھا لیکن آجکل اپنی ماں کے ساتھ اسی مکان میں ہے۔ پھر بڑھیا مجھے اس بچے کے کمرے میں لے گئی۔ وہ ایک کانگ[1] پر بیٹھا ہوا جغرافیہ کی ایک کتاب دبی آواز میں پڑھ رہا تھا۔ ایک کونے میں اس کی ماں بیٹھی ہوئی سلائی کا کام کر رہی تھی۔ جیسے ہی بچہ کی نظر ہم پر پڑی اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور مجھے سر کے اشارہ سے سلام کیا۔ گو اس کے چہرے پر سرخی نہیں تھی، پھر بھی وہ کافی صحت مند نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی دادی سے پوچھا کہ اسے باہر جانے کی اجازت کیوں نہیں دیتی۔ بڑھیا نے بچے کی طرف حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر خود اپنے پیروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا کہ امریکی ہوائی جہازوں کی بمباری کے دوران میں دونوں پاؤں بیکار ہو چکے ہیں۔

میں بچہ سے باتیں کرنے لگا اور جب میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے پنسل اٹھائی اور قریب رکھی ہوئی میز کی طرف اپنا جغرافیہ کی کتاب کے پچھلے صفحے پر چینی زبان کے تین لفظ لکھے "ما۔ کرنانگ۔ یو" اور پھر وہ خود انھیں الفاظ کو کوریائی تلفظ کے ساتھ

---

[1] چینی مکانات میں چھوٹے چھوٹے چبوترے ہوتے ہیں جنھیں تخت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

دھرا دیا۔ بچے نے تینوں الفاظ بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھے تھے۔

آئینہ کو میز پر رکھا دیکھ کر میں نے بچے سے پوچھا — "کیا تم ہر وقت آئینہ دیکھنا پسند کرتے ہو"۔ اس نے سر کے اشارے سے اعتراف کیا اور آئینہ ہاتھ میں لے کر اسے الٹنے پلٹنے لگا۔ میں بچے کا مفہوم بالکل نہیں سمجھ سکا۔ میں نے آئینہ اپنے ہاتھ میں لیا لیکن مجھے اس میں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔ بچے کو مزید سوالات کرکے پریشان کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اسے خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ برآمدے میں آ کر میں نے اپنے جوتے پہن لئے جہاں بڑھیا مجھے رخصت کرنے کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا — "بچے کا باپ کہاں ہے"۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں مجھے بتایا کہ جب گاؤں پر "سنگمن رہی" کے سپاہیوں نے قبضہ کیا تو اس بچے کے باپ کو گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں گولی مار دی گئی۔ میں نے بڑھیا کو غلیظ یادوں سے بچانے کے لئے کوئی اور سوال نہیں کیا۔

دو دن کے بعد پھر اسی مکان کے قریب سے گزرا اور میں نے دیکھا کہ لی کوانگ یو حسب معمول اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا آئینہ سے کھیل رہا ہے، میں اور قریب چلا گیا۔ اس کی ماں اور دادی دونوں باہر گئی ہوئی تھیں اور اس کا دادا کسی دوسرے کمرے میں تھا۔ میں مکان کے اندر داخل نہیں ہوا، بلکہ کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر بچے سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے دریافت کیا — "کیا تمہارے پیروں میں درد ہوتا ہے"۔ اس نے نفی میں جواب دیا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا — "کیا تم کبھی اسکول گئے ہو"۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ماہ پہلے اسکول جاتا تھا۔

آخر میں جب میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ ہر وقت آئینہ سے کیوں کھیلتا رہتا ہے تو وہ مسکرایا اور آئینہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے آئینہ کو اوپر اٹھایا اور چاروں طرف گھمایا۔ مکان کے سامنے چند بچے کھیل رہے، گا رہے تھے، ناچ رہے تھے اور ان کا عکس آئینہ میں تیر رہا تھا۔ میں نے آئینہ لی کوانگ یو کو واپس کرتے ہوئے کہا — "میں اب سمجھ گیا"۔ — بچے کے چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہو گئے، ہم دونوں تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور ہمارا تکلف دور ہو گیا۔ جب میں جانے لگا تو بچے نے مجھ سے کہا کہ آپ پھر آئیے اور کبھی کبھی آتے رہیے۔

دوسری صبح میں اس گھر کے قریب سے گزر رہا تھا کہ بوڑھی عورت سر پر ایک گٹھری لئے ہوئے باہر نکلی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بازار جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر رک کر میں نے اس سے بات چیت کی اور بچے کے پیروں کی نسبت دریافت کیا۔ بڑھیا اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی — "اب کوئی امید نہیں ہے۔ بچے کے دونوں پاؤں بیکار ہو چکے ہیں اور علاج کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے"۔ — بڑھیا نے مجھے بتایا کہ — "حملے کے وقت لی کوانگ یو اسکول میں تھا، امریکی ہوائی جہازوں نے اسکول پر بمباری کی، کئی بچے مر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ لی کوانگ یو کا آدھا جسم جلتے ہوئے ملبے کے نیچے دب گیا۔ علاج کے بعد اس کی جان تو بچ گئی لیکن وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا"۔ — بڑھیا نے آخر میں کہا — "بچہ ابھی تک مایوس نہیں ہوا ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کی ٹانگیں اچھی ہو جائیں گی اور وہ تندرست ہو کر دوبارہ اسکول جانے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ مجھ میں اور اس کی ماں میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اسے حقیقت سے خبردار کر سکیں اور یہ بتا سکیں کہ وہ عمر بھر کے لئے اپاہج ہو چکا ہے"۔ — جب بڑھیا نے یہ الفاظ کہے تو اس کے گالوں کی جھریاں آنسوؤں میں ڈوب رہی تھیں۔

اس کے بعد میں اکثر لی کوانگ یو سے ملتا۔ جب جب بھی میں سوچتا کہ یہ معصوم بچہ کھڑکی پر نہیں چڑھ سکتا اور باہر کھیلتے ہوئے بچوں کی طرف آئینہ کی مدد سے دیکھ سکتا ہے تو اس سے میری ہمدردی بڑھ جاتی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی تنہا اور مغموم زندگی کم سے کم قابل برداشت ہو جائے۔ میں نے اسے دو گانے سکھائے اور با تصویر رسالے دیئے۔ اس کے جواب میں اس نے مجھے اپنی زبان سکھائی اور میں نے اس زبان کی وہ ابتدائی کتاب پڑھی جو لی کوانگ یو پہلے پڑھ چکا تھا۔

دو ہفتے بعد صبح کے وقت میں اپنے دفتر سے باہر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لی کوانگ یو اپنے مکان کی دہلیز پر بیٹھا ہوا سڑک پر گزرنے والوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔

"تم باہر کس طرح آ گئے؟" میں نے خوشی اور حیرت کے ساتھ اس سے پوچھا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ اچھا ہو گیا ہے۔
"مجھے یہاں رکھ دیا گیا ہے" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ چونکہ مجھے کمپنی کے ہیڈ کوارٹر میں ایک کام تھا، اس لئے میں نے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا — "وہاں"۔ میں نے اسے بتایا کہ اسے پہلے کے مقابلے میں اچھا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے اور یہ امید ظاہر کی کہ وہ بھی خوش اور مطمئن ہوگا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ کہنے لگا — "میں یہاں سے جا رہا ہوں"۔

میں کسی قدر پریشان ہو گیا اور جلدی سے پوچھنے لگا — "تم کہاں جا رہے ہو۔"

اس نے کہا — "میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔ ہم لوگ کل چلے جائیں گے۔"

بچہ نے مجھے اپنا نیا پتہ دیا اور بات پر اصرار کیا کہ میں اس سے ملتا رہوں۔ ٹھیک اسی وقت اس کی ماں کی آواز آئی۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کیا لی کوانگ یو اندر آنا چاہتا ہے۔ بچے نے کچھ دیر اور باہر ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور پھر مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس بات کا پکا وعدہ لیا کہ میں اس سے ملتا رہوں گا۔

"میں تم سے ضرور ملوں گا اور کل تمہیں خدا حافظ کہنے بھی آؤں گا"۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام تھا اس لئے میں رخصت ہو گیا۔

میں نے اپنا پورا دن کمپنی کے ہیڈ کوارٹر میں گزارا۔ دوسرے دن علی الصبح مجھے رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹر جانا تھا میں سہ پہر کے وقت وہاں سے واپس ہوا۔ مجھے خوف تھا کہ شاید میں لی کوانگ یو کو خدا حافظ نہ کہہ سکوں لیکن جیسے ہی میں گاؤں کی حدود میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ اس کی ماں ایک گٹھڑی سر پر رکھے ہوئے جا رہی ہے اور دو پہیوں کی ایک صندوق نما گاڑی کو بھی کھینچ رہی ہے جس میں لی کوانگ یو ننگے سر بیٹھا ہوا ہے۔ جیسے ہی میری نظر اس پر پڑی میں نے اسے آواز دی اس نے جواب دیا اور ساتھ ہی اس کی ماں کی آواز بھی سنائی دی۔ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا اور اس کے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر بولا — "تو اب تم گھر جا رہے ہو وہاں احتیاط کے ساتھ رہنا۔"

اس نے میرے ہاتھوں کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے پوچھا — "آپ مجھ سے ملنے آئیں گے؟" — میں نے اس سے دوبارہ وعدہ کیا۔ اس کی ماں درمیان میں بول اٹھی — "کامریڈ ڈانگ! آپ ہمارے یہاں ضرور آیئے۔ میرا بچہ آپ کو یاد کرتا رہے ہم آپ کے بہت شکر گزار رہیں"۔ بچہ نے اپنی ماں کا ساتھ دیا — "ہم اپنے گھر میں آپ ہی کے متعلق سوچتے رہیں گے"۔

ہم ہاتھ ملا کے اور جدا ہو گئے۔ اس موقع پر مجھے فوری خیال آیا کہ رجمنٹ کے کمانڈر نے مجھے تھوڑی سی مٹھائی دی تھی جو اس کے گھر سے آئی تھی اور اس وقت بھی میری جیب میں موجود ہے میں گاڑی کے پیچھے دوڑا وہ مٹھائی بغیر کچھ کہے ہوئے بچہ کی گود میں رکھ دی اور واپس پلٹ آیا۔ بچہ نے کئی بار میرا نام لے کر پکارا اور اس کی ہر آواز کے ساتھ میرا غم بڑھتا گیا۔

بہت دن تک میں لی کوانگ یو سے ملنے کے لئے وقت نہیں نکال سکا۔ پھر کئی بار میں نے اس کی دادی سے اس کا حال پوچھا اور یہ معلوم کر کے مطمئن ہو گیا کہ لی کوانگ یو خیریت سے ہے۔ اسی دوران میں بڑھیا بھی صرف چند ہی مرتبہ اس سے مل سکی تھی لیکن اس کی ماں دو دفعہ آئی اور مجھ سے بھی ملی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا بچہ مجھے ہر وقت یاد کرتا ہے

اور اپنے یہاں بلانا چاہتا ہے۔

جب میرا تبادلہ یہاں ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ لی کوانگ یو وادی کے کنارے والے گاؤں میں رہتا ہے۔ ضروری انتظامات سے فارغ ہو جانے کے بعد میں اس کے گھر گیا۔ وہ اپنے چھوٹے سے مکان کے صحن میں ایک چٹائی پر بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور میرے ہاتھوں کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا جیسے انھیں چھوڑنا ہی نہیں چاہتا۔

"کامریڈ ڈانگ! میں بہت دن سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں اور اب پہلے سے اچھا ہوں" ۔۔۔ وہ بولا

میں بہت متاثر ہوا اور اس سے پوچھا کہ کیا اب وہ چل سکتا ہے؟ اس نے گردن ہلائی اور نفی میں جواب دیا لیکن اسے امید تھی کہ تھوڑے دن بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو جائے گا ۔۔۔ "میری ٹانگوں میں اب کافی طاقت آگئی ہے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد میں کبھی کبھی اس سے ملتا رہا، چاندنی راتوں میں جب مجھے کوئی کام نہ ہوتا تو میں لی کوانگ یو کے گھر چلا جاتا ۔۔۔ کامریڈ ڈانگ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ۔۔۔ "تمہارے یہاں آنے سے پہلے میں اکثر لی کوانگ یو سے ملتا رہا ہوں" ۔۔۔ اور سلسلہ بیان جاری رکھا ۔۔۔

"صبح جس وقت دشمن کے ہوائی جہازوں نے حملہ کیا میں لی کوانگ یو کے متعلق بہت فکر مند تھا۔ جیسے ہی بمبار ہوائی جہاز واپس ہوئے۔ میں اس کے گھر پہنچا۔ اس وقت گاؤں والے آگ بجھانے میں مصروف تھے اور لی کوانگ یو کے گھر سے شعلے بلند ہو رہے تھے، جیسے ہی میں نے دروازے میں قدم رکھا دھوئیں کی ایک چادر نے میرے چہرے کو جھلسا دیا۔ میرے لئے آنکھیں کھولنا ناممکن تھا۔ میں پیچھے مڑا اور میں نے آوازیں دینی شروع کیں ۔۔۔ لی کوانگ یو ۔۔۔ لی کوانگ یو۔

دھواں میری آنکھوں میں نشتر چبھا رہا تھا اور میرے آنسو مسلسل جاری تھے۔ ٹھیک اس وقت میں نے معصوم بچہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنی ۔۔۔ ماں ۔۔۔ ماں ۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میرا سگا بھائی مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ میں موت کی پروا کئے بغیر دھوئیں کے مرغولوں کو چیرتا ہوا مکان کے صحن میں داخل ہو گیا لیکن آگے بڑھنے کے لئے صحیح سمت متعین نہ کر سکا۔ جیسے ہی میری نظر اس کمرے پر پڑی جس میں لی کوانگ یو رہتا تھا کوئی انجانی قوت کشاں کشاں اس طرف لے چلی۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ بچہ کو پکارتا ہوا میں ایک کھڑکی کے ذریعہ کمرے میں کود گیا۔ بچے نے اپنی باہیں میری طرف پھیلا دیں۔ اور کچھ کہا جسے میں سمجھ نہ سکا۔ میں نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور کھڑکی کے راستے سے باہر آ گیا۔ اسی وقت ایک جلتی ہوئی لکڑی میرے بائیں ہاتھ پر آ گری۔ ساتھ ہی ایک بھڑکتے ہوئے شعلے نے بھی اسی ہاتھ پر حملہ کیا۔ لیکن اس وقت مجھے اپنی تکلیف محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ میرا دماغ صرف یہی سوچ رہا تھا کہ لی کوانگ یو کو کس طرح بچایا جائے مجھے اپنے درد کا بالکل احساس نہ تھا اور صرف لی کوانگ یو کی زندگی کو محفوظ رکھنا ہی میرا مقصد بن گیا تھا۔ میں بھاگتا ہوا صدر دروازے سے باہر نکل گیا لیکن گر پڑا۔ دوبارہ اٹھ کر تیزی سے سیدھی طرف دوڑا اور جب میں نے لی کوانگ یو کو شعلوں سے دور ایک درخت کے نیچے بٹھا دیا اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں جل گیا ہوں۔ میرے چہرے اور ہاتھ میں تکلیف ہے

خوش قسمتی سے لی کوانگ یو محفوظ تھا۔ اسے صرف غش آ گیا تھا۔ لیکن وہ جلد ہی ہوش میں آ گیا۔ وہ بار بار میرا نام لے رہا تھا ۔۔۔ کامریڈ ڈانگ ۔۔۔ کامریڈ ڈانگ۔

میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھوڑی دیر گزری تھی کہ اس کی ماں بھی آ گئی۔ جیسے ہی اس نے بچے کو دیکھا وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ڈانگ چنگ ایک دم خاموش ہو گیا اور اس نے کروٹ بدل لی۔ میں اس خیال میں تھا کہ وہ از سر نو گفتگو شروع

کرے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور کمرے پر سکوت چھا گیا۔ آخر کار مجھے پوچھنا ہی پڑا ـــ "پھر کیا ہوا؟"

"بعد کے واقعات تم بھی جانتے ہو" ـــ وانگ چنگ نے جواب دیا ـــ "اب ہمیں سو جانا چاہیئے۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ میں نے نیند کے انتظار میں اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن نیند بہت دور تھی۔ کامریڈ وانگ بھی بستر میں مسلسل کروٹیں بدل رہا تھا اور بیدار تھا۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو" ـــ میں نے پوچھا ـــ "کیا تمہارے زخموں میں بہت تکلیف ہے؟"

"ان زخموں کی کوئی اہمیت نہیں" ـــ کامریڈ وانگ نے کروٹ بدلتے ہوئے جواب دیا ـــ "لیکن جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں مجھے محسوس ہوا کہ معصوم ٹی کوانگ یو اپنی باہیں پھیلائے مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ مجھے بار بار اسی کا خیال ستا رہا ہے، جس سے تمام کوریائی بچوں کا تصور وابستہ ہے۔ ہم انہیں ہنستا کھیلتا کودتا دیکھ کر ان سے محبت کرنے پر مجبور ہیں۔ بچے کس طرح ہمارا ہاتھ تھام کر ہمیں "چچا" یا "کامریڈ" کہتے ہیں۔ ان بچوں نے دشمن کے بمبار جہاز دیکھے ہیں۔ پھٹتے ہوئے بم دیکھے ہیں۔ بندوقیں اور سنگینیں دیکھی ہیں۔ آگ اور خون کے ہنگامے دیکھے ہیں اور اپنے عزیزوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے پھر بھی وہ زندہ ہیں، بلند ہمت ہیں اور پر امید ہیں۔ ہم ان بچوں سے محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

میں نے آج جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ آج یہ حقیقت میرے سامنے پہلے سے زیادہ روشن ہے کہ جب کسی شخص کا دل انسانی محبت سے معمور ہوتا ہے اس وقت وہ کسی خطرے کی پرواہ نہیں کرتا کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتا اور ہر مرحلہ میں آمادہ رہتا ہے۔ آج جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے اگر ضرورت ہوئی تو کسی دن تم بھی یہی کرو گے۔ اس لئے کہ تمہارا دل بھی انسانی محبت سے خالی نہیں ہے۔"

مطبوعات انجمن ترقی اردو

حیات سرسید

سید مرحوم کے ان گنت احسانات ہماری قوم پر ہیں۔ وہ ہماری قوم کے سب سے بڑے آدمی تھے اور بڑے آدمیوں کے کارنامے قوم میں زندگی کی روح پیدا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں سید مرحوم کی عظیم الشان زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے تاکہ عام پڑھنے والے ان کے بڑے بڑے کاموں اور ان کی زندگی کے خاص پہلوؤں سے واقف ہو جائیں۔

اس کے مرتب نور الرحمان صاحب بی۔ اے ہیں۔ کتاب اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور ملک کے تمام بڑے بڑے لوگوں نے تعریفی خطوط سے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔

قیمت: تین روپئے آٹھ آنے

انجمن ترقی اردو علیگڈھ

کسانوں کی دھرتی

(ایک سماجیاتی مطالعہ)

نجمہ نکہت

سرسبز و شاداب کھیتوں کے اس خوبصورت سے دیہات میں بڑے بڑے رازیوں میں چھپے پڑے ہیں کہ ان کا کریدنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ حیدرآباد سے دس میل دور سورج گڑھ ہے۔ یہاں میں نے ڈیڑھ سال کی طویل مدت تک رہ کر ان رازوں کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ بڑی بڑی باولیاں، باغ اور پہاڑوں پر کھلے ہوئے ننھے منے حسین پھول، سبزہ زار اور ٹھنڈے پانی کے نالے جو گھنے درختوں اور چھوٹے چھوٹے سرمئی پہاڑوں کے بیچ سے بہتے ہیں، جنگلی بطیں! سچے الگ الگ گروہ بنائے، نالوں میں پانی کے دھاروں پہ تیرتی ہیں۔

یہاں حیدرآباد کے مشہور جاگیردار نواب لعین الدولہ نے اپنی شان و شوکت کی بڑی بڑی نشانیاں چھوڑی ہیں۔ لعین باغ جو آج اپنی ویرانیوں کے ساتھ بھی بڑا دلکش ہے مگر وہ بھیانک باولی جس کو دیکھ کر میرے سینے میں متلی کے غبار سے ابھرنے لگتے ہیں اور اس باولی پہ بنے ہوئے لاتعداد اندھیرے کمرے جو لعین الدولہ کی عیاشی و سیہ کاری کے بھاری بوجھ تلے دبے پڑے ہیں جن میں دیہات کی بیسیوں کنواری لڑکیوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کے لعین الدولہ کا دھندلایا ہوا رعب دار چہرہ دیکھا اور پھر اپنے کومل بدن سے کپڑے کی آخری دھجی بھی اتار دی۔ اپنی التجاؤں کو اندھیرے کی گمبھیرتا میں سلا دیا وہ لڑکیاں جن کے بیاہ میں کسی نے گیت نہیں گائے، کسی نے شہنائی نہیں بجائی —— وہ ان کمروں سے اپنی ذرا دہائی اور گھناؤنی سہاگ رات منا کے یوں نکلیں جیسے لعین الدولہ نے ان کے سارے بدن کا لہو نچوڑ لیا ہے۔

انھوں نے اپنی جھکی ہوئی نظروں سے ہال کی دیواروں پر ٹنگی ہوئی شیر کی کھالوں کو دیکھا۔ لعین الدولہ شکار کرنے کے بعد ہمیشہ ان کی کھالیں کھنچوا لیا کرتا تھا مگر بے جان کھالیں اپنا خوفناک منہ کھولے، دانت نکالے لعین الدولہ کو گھورتی تھیں۔ لڑکیاں —— جن کی روح کھینچ لی گئی تھی ان کے تھکے ہوئے بھاری قدموں کی چاپ اب بھی سناٹے میں سنائی دیتی ہے۔ ان لڑکیوں کے گھروں میں شاید ان کے بوڑھے ماں باپ اپنے اپنے دروازے پر بیٹھے صبح کے انتظار میں پگڈنڈیوں کو گھورتے، تھرتھراتے ہوئے ہاتھ ایک دوسرے سے رگڑتے اور سوچتے کہ ہم اپنے کلیجوں کو کب تک جاگیرداری کے نشتر سے چھدنے دیں۔ ہم کب تک صبح کے انتظار میں جھونپڑے کی چوکھٹ پر بیٹھے رہیں ——

رات بھر عیاشی کر کے صبح لعین الدولہ اپنے نواب دوستوں کے ساتھ اس باولی پر بیٹھ کر شراب پیا کرتا تھا اور باورچی سیروں گوشت بھون بھون کر اس کے آگے رکھتے جاتے تھے۔ لعین الدولہ صرف ایسے ہی وقت ہنستا تھا جب وہ شیر مار کے کھال کھنچوا لیتا یا دیہاتی لڑکیوں کو مضبوط بانہوں میں دبوچ کر ان کے کپڑے اتار لیتا۔ وہ ایک کامیاب شکاری تھا جو جانتا تھا کہ کھیلتی زندگی کا شکار کر کے اس کو ننگا کر دیتا تھا جس کی خوابگاہ کی دیواروں پر ان لڑکیوں کی عریاں تصویریں ٹنگی تھیں جن کو اس نے زبردستی اپنے محل میں داخل کیا تھا —— قیمتی قالین، نرم گدے دار مسہری اور گلدانوں میں سجے ہوئے

حسین پھول —— یہ عجیب سی شکارگاہ تھی جہاں شام ہی سے اتھالیں گونجتیں، شراب کے شیشوں کے چھناکے سنائی دیتے اور معین باغ اپنی تنہائیوں میں نم آنکھوں، تھرتھراتے ہونٹوں اور ننگے جسموں کو چھپا لیتا اب معین الدولہ کے اس بیٹے نے جس کو آج معین باغ ترکے میں ملا ہے، یہی ساری دلچسپیاں بھی ترکے ہی میں پائی ہیں آج وہاں ان ہی کا رکھا ہوا مہتمم ہے جو آئے دن ان کی دعوتیں کرتا ہے تاکہ اس کی یہ نوکری قائم رہے۔ آج بھی معین باغ میں سیندھی کے گھڑے لنڈھائے جاتے ہیں، آج بھی شکار کے بہانے عیاشی ہوتی ہے۔ معین الدولہ کے مونے مہتمم صاحب کے ڈرائنگ روم کی زینت بنے ہوئے ہیں اور شیر کی کھالیں ان کے تخت پر پڑی رہتی ہیں۔

معین باغ سے آگے معین الدولہ کا "کتے خانہ" ہے جو اب کھنڈر بن چکا ہے مگر کتوں کو باندھنے کی پتھر کی میخیں اب بھی وہاں گڑی ہیں۔ یہاں معین الدولہ کے نجیب الطرفین کتے رہا کرتے تھے۔ چاندی کی زنجیریں ان کے گلوں میں بندھی ہوتی تھیں اور نواڑی پلنگ ان کے سونے کے لئے بچھائے جاتے تھے۔ اس کتے خانے پر آٹھ آدمی ملازم تھے جو کتوں کی حفاظت آرام و غذا کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے اور رات کو فرش پر سوتے تھے —— یہ آدمی تھے مگر نجیب الطرفین نہیں تھے اور معین الدولہ کے ہر کتے کے پاس اس کا اپنا شجرہ موجود تھا جو اس کی خاندانی روایات کو ظاہر کرتا تھا اور ان نوکروں کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کے پردادا کون تھے —— یہ نوکر جوان کتوں کو نہلاتے۔ برش کرتے اور چاندی کی زنجیروں کو دیکھ کر سوچتے کہ کاش اس زنجیر کی چار کڑیاں ہی مل جائیں جس سے ہم بیوی کی چوڑیاں بنا لیتے۔ مگر معین الدولہ بڑا ہوشیار آدمی تھا وہ [illegible] دیتا تھا۔ اس نے سارے دیہات میں آم کے پیڑ لگوائے تھے کہ تمام غریب کسان اور مزدور گرمیوں میں ان کے آم مفت کھائیں۔ اس نے گاؤں کی لڑکیوں کو یوں ہی تھوڑا اپنے عزت کیا تھا، وہ پیسہ پھینکا کرتا تھا جیسے ساہوکار وقت بے وقت کام آنے کے بہانے چپکے چپکے سود بڑھاتا جاتا ہے —— اس طرح وہ سارے گاؤں کا مالک تھا، اس کو لاتعداد جاگیریں ملی تھیں۔ حیدرآباد کے چپے چپے پر معین الدولہ کا حکم چلتا تھا۔ وہ اپنی امارت اور رعب سے دیہاتیوں کی زندگی بھی چھین لیتا تھا اور یوں سکے آگے پیسہ پھینکتا کہ غریبی جھک جاتی اور نہیں جھکتی تو طاقت اور حکومت سے جھکائی جاتی یہاں تک کہ غریبی کی کمر ٹوٹ جاتی اور آنکھوں کی چمک بجھ جاتی۔ کھیت چھین لینے کی دھمکی ان کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ ڈال دیتی اور پسینہ میں ڈوبا ہوا سفید بالوں والا سر حضور کے آگے جھک جاتا۔

ابا شہاب الدین کی درگاہ کے سامنے معین الدولہ کی شکارگاہ ہے جہاں معین الدولہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے آتا تو بڑا شاندار انتظام ہوتا۔ یہ محفوظ بنگلہ کافی اونچائی پر بنا ہے۔ اس کے ایک طرف حمایت ساگر نظر آتا ہے۔ دوسری طرف گاؤں کی آبادی ہے۔ یہاں معین الدولہ دنوں ٹھہرتا.... اور شیر اور چیتے کا شکار کرتا تھا۔ اب اس بنگلہ میں ابو نصر جیلانی رہتے ہیں —— ابو نصر بہت اچھا عالم ہے، بہت ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی جو زندگی کا شیدائی ہے اور صداقت و حق کے لئے اپنی آواز بلند کرتا ہے۔ آج معین الدولہ کی اس شکارگاہ میں ایک ایسا آدمی ہے جو ہنستی بولتی زندگی دیکھنا چاہتا ہے، وہ جو زندگی کو شکار کرنے کا قائل نہیں ہے۔

سورج گدھ میں پائیگاہ کا قائم کیا ہوا دواخانہ بھی ہے، چھوٹا سا دواخانہ جو صرف تین کمروں سے مل کے بنا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں ڈاکٹر ہمیشہ دوائیں اور دوا کی خالی شیشیاں بیچ لیا کرتا اور کمپونڈر اپنی پرائیویٹ پریکٹس چلاتا تھا۔ معین الدولہ کے زمانے کا ڈاکٹر دواخانے کے پورے عملے سے خانگی کام لیا کرتا۔ چنانچہ آج دواخانہ کا پورا عملہ

زمانے کی باتیں بڑی دلچسپی سے سناتا ہے۔ وارڈبوائے ان کے گھر میں کنویں سے پانی لاکے بھرتا تھا۔ چپراسی گھر کا سودا لاتا تھا اور دائی من ڈاکٹر کی بھینسیں چرانے کے لئے سارا دن جنگل میں گھومتا تھا۔ دواؤں کی الماریوں میں ڈاکٹر صاحب کے کپڑے رکھے جاتے تھے اور آج جس الماری میں دواخانے کے اوزار رکھے رہتے ہیں اس میں ان کی بھینس کو گھاس ڈالی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مدراسی تھے اور پیسے کمانا خوب جانتے تھے۔ مریضوں سے زیادہ ان کو اپنی پروا تھی۔ ان کو مریض کی لاش کے پاس بیٹھے فیس کا مطالبہ کرتے گاؤں کے سب ہی لوگوں نے دیکھا ہے۔ فیس لیتے ہی وہ شہر چلے جاتے، تفریح کرتے اور بھول جاتے کہ ان کے کسی مریض نے آج دم توڑ دیا۔ وہ مریضوں سے اس طرح پیسے لیتے کہ اگر مریض مفلس ہے تو اس کو اپنی ماں یا بیوی کے کپڑے بیچنے پڑتے۔ ڈاکٹر نے کبھی اپنے جائز و ناجائز طرز عمل کو سوچا ہی نہیں ڈاکٹر—— جو ڈاکٹر نہیں تھا بلکہ ایسا مریض تھا جس کو ہر طریقے سے پیسہ اکٹھا کرنے کی بیماری ہوگئی تھی۔

جب نئی دوائیں آتیں تو آدھی دوائیں ان کے گھر میں رکھی جاتیں اور آدھی ڈسپنسری میں رکھی رہتیں۔ سال گذر بھی جاتا اور دوائیں ختم ہونے میں نہ آتیں کیونکہ کمپونڈر ہمیشہ پانی ملا کے ان کی سطح برابر کر دیتا۔ ڈاکٹر نے یہی نہیں کیا۔ انھوں نے یہ بھی کیا کہ صفائی کے عملہ کو ہمیشہ تنخواہیں کم دیں۔ ہمیشہ نئے نئے عذر کئے، نئی نئی باتیں ڈھونڈیں اور اپنی جیب بھرتے رہے۔ انھوں نے کئی غریب دیہاتیوں کو دواخانے کی نوکری دلانے کے بہانے سیکڑوں روپے ہضم کئے۔

میں نے جب ان کو دیکھا تو وہ واقعی مجھے ڈاکٹر نہیں دکھائی دئیے۔ موٹے موٹے ہونٹ، سیاہ رنگ، سرخ آنکھیں اور پیشانی پر گہری شکنیں۔ ان کی جوان لڑکیاں ان کی آواز پر کانپ جاتیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کے پڑھنے لکھنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر سب سے پہلے عشقیہ خطوط لکھنے لگتی ہیں۔ ان کو گھر کی کھڑکی سے باہر جھانکنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ کسی سے ملنا جلنا وہ پسند کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو اس زمانے میں پنشن ہوگئی تھی اور وہ اپنے دیوان خانے میں بیٹھے نئے ڈاکٹر کو دواخانہ آتے جاتے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتے۔ میں نے ان کو جب بھی دیکھا افسردہ دیکھا جیسے انھیں ذہنی الجھن ہے، اذیت ہے میں نے جب بھی ان سے ادھر ادھر کی باتیں کیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نئے ڈاکٹر کی ہمدردی اور خلوص کو بیوقوفی اور لونڈا پن سمجھتے ہیں جیسے وہ چاہتے ہوں کہ کاش میں پھر اپنی جگہ پہ آجاؤں تو ان مریضوں کو جی بھر کے لوٹوں اور بتاؤں کہ پیسہ کمانا کس کو کہتے ہیں۔ اکثر انھوں نے مجھ سے کہا۔

"بچہ! یہ ڈاکٹر صاحب مریضوں کو سر چڑھا لیتے ہیں اور یہی بری بات ہے۔ ابھی سے ڈاکٹر صاحب کو سختی سے پیش آنا چاہیئے اور فیس کے لئے غریب آدمیوں سے بھی مطالبہ کرنا چاہیئے۔ یہ حرامزادے غریب نہیں ہیں غریب ظاہر کرتے ہیں ——"

اور میں نے دل ہی دل میں جواب دیا "ہاں یہ حرامزادے ہیں کیونکہ ان کو تمہاری ضرورت ہے ——"

میں نے یہ بھی دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نئے ڈاکٹر کی ہر دلعزیزی سے بوکھلا گئے ہیں —— ان کو یہ بھی شکایت ہے کہ نیا ڈاکٹر کبھی فیس نہیں لیتا اور مریضوں کی پرانی عادت بگاڑتا ہے —— نیا ڈاکٹر یہ چاہتا تھا کہ وہ اس دواخانے کے پیچھے اتنی محنت کرے، رات دن اتنا کام کرے کہ اس کے یہاں سے جانے کے بعد بھی یہاں کے لوگ اس کو یاد رکھیں۔ اس نے دواخانے کے اندھیرے کمروں میں بجلی لگوائی۔ اس نے بے نام و نشان دواخانے کا بورڈ بنوایا۔ رات رات بھر اپنی نیندیں کھوئیں، محنت کی دواخانے کی عمارت پر سفیدی پھروائی، دواخانے کا پھاٹک لگوایا، لان ڈلوائی، اور طبیب جی کے اشتراک سے دواخانے کا دفتر بنایا۔ دواخانے کا دفتر، جہاں قلم دوات بھی نہیں تھی —— وہاں دفتر

کا پورا سامان ہے۔ دروازے پر نیلے پھولوں کی بیل ہے اور مریضوں کی لمبی چوڑی قطار — یہ ڈاکٹر نعیم الدولہ کے زمانے کا ڈاکٹر نہیں ہے۔

دوا خانے سے آگے بچوں کا اسکول ہے۔ مڈل اسکول کی یہ وہ عمارت ہے جہاں نعیم الدولہ کی بیگمات چلمنوں کے پیچھے رہتی تھیں۔ جہاں "کوڑا بیگم" بھی تھی۔

کوڑا بیگم نعیم الدولہ کی وہ ظالم بیوی تھی جو باندیوں، غلاموں اور نوکروں کو ذرا سی غلطی پر کوڑے لگواتی تھی اور خود سامنے کھڑی ہوکر چلاتی "اور مارو"، "خون میں نہلا دو حرامزادوں کو"—

یہ باندیاں کسانوں اور مزدوروں کی بیٹیاں تھیں جو نعیم الدولہ کی جنسی خواہشوں کی تسکین بھی کرتی تھیں اور ان کی بیگمات کے ہاتھ پیر بھی دباتی تھیں۔ کھانا بھی پکاتی تھیں، برتن بھی مانجھتی تھیں اور جب کوڑے کھا کھا کے ان کی پیٹھ سے خون نکل آتا، ان کے سینے نیزے میں اُبھر آتے تو وہ اپنی تاریک کوٹھڑی میں پڑی اپنے گھر کے آنگن کا تصور کرتیں جہاں نیم کے گھنے سائے میں ان کا بابا حقہ گڑگڑاتا تھا، جہاں ماں چولہے کے پاس بیٹھی دھواں لگی آنکھوں کا پانی پونچھتی جاتی اور بچوں کو پکار پکار کر کہتی "اے چھبو! اندر آجا۔ شام ہوگئی ہے اور باہر کھیل رہے ہے"۔

"ارے گوریا چل ادھر— ہانڈی میں پانی بھر لا"۔

"لچھو ذرا باہر کی اُور دیکھ راجاں نہیں آئی کیا—؟ کھیت کاٹنے گئی تو وہیں رہ گئی"۔

ماں جو کوستی تھی تو پیار بھی کرتی تھی— جو مارتی تھی تو سینے سے بھی لگاتی تھی— اور یہاں بیگم بھی مارتی ہیں، سرکار بھی مارتے ہیں۔ یہ قید کی زندگی جانے کب تک رہے گی۔ کیا کیا جی چاہتا ہے گھر دیکھنے کو۔ چھوٹی بہن جوان ہوگئی ہوگی۔ بابا سے تو کھانسی کے مارے کھیتوں کا کام بھی نہیں ہوتا ہوگا، ماں چولہا دیکھتی ہوگی، بہن اکیلی کھیت کاٹتی ہوگی۔ چھبو کتابیں لے پڑھنے جاتا ہوگا۔

"اری چل وہاں سے—" کوڑا بیگم چیختی اور باندیاں دم سادھے، نظریں نیچی کئے، ہاتھ باندھے اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑتیں—

میں نے اس بنگلے کو جو دیکھا جو اب بوسیدہ ہوچکا ہے جس کی چھت جھک آئی ہے اور دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی ہیں جہاں کوڑا بیگم چلمن کے پیچھے بیٹھی اپنی چیل جیسی تیز آنکھوں سے محرم کا میلہ دیکھتی تھی وہاں اب ستون اپنی جگہ چھوڑ رہے ہیں اور آگے ڈھلک آئے ہیں۔ کوڑا بیگم کا کوڑا انہی کے ساتھ اس عمارت سے غائب ہوگیا اور وہ جگہ جہاں ان کی زرتار مسند اور مخملیں گاؤ تکیہ ہوتا تھا آج وہاں کسی انسان کے قدم نہیں جاسکتے۔ اسی برآمدے سے کمروں کے سلسلے شروع ہوتے ہیں جہاں نعیم الدولہ کی اور بیگمیں رہتی تھیں۔ نعیم الدولہ جو عورت اور شراب پر مرتا تھا جو زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنے پاس قید کر لینا چاہتا تھا جس کی دانست میں دنیا کی ساری لذتیں عورت کی ذات میں سمٹ آئی تھیں جو عورت کو پیسے کا لالچ دیتا تھا، زبردستی قابو میں لاتا تھا اور اپنے محل میں داخل کرکے خوش ہوتا تھا۔

جہاں نعیم الدولہ مخملی دکمخواب کی مسندوں پر بیٹھ کر اپنی بیگموں اور باندیوں سے پیار اور محبت کرتا تھا جہاں ہوس تھی، بلا تھا۔ گندگی تھی آج وہاں گاؤں کے ننھے منے غریب لڑکے پڑھتے ہیں، معصوم مسکراہٹوں، ننھی ننھی شرارتوں اور دبی دبی سرگوشیوں میں اپنی باتیں ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں—

اور جس آنگن میں باندیاں دبی دبی کبھی کبھی گھوما کرتی تھیں وہاں اب یہ لڑکے کبڈی کھیلتے ہیں "چور کی بلا" کھیلتے ہیں اور

ہر سال نئی منزلیں طے کرتے ہیں۔

اور آگے بڑھئے تو گاؤں کی "چاوڑی" ہے۔ یہاں پولیس اسٹیشن ہے۔ تین منزلہ عمارت جہاں خاکی وردیاں ہوتی ہیں جن کی فرعونیت سے غریب کسان اور مزدور تنگ آگئے ہیں جو ہر غریب آدمی کو اپنے شکنجہ میں کس لیتی ہے۔

پولیس ـــ جس کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی بھی آدمی کے متعلق کوئی بھی الزام عائد کرکے چالان کر دے، حوالات میں لے چلے، مارے پیٹے، جھوٹی شہادتیں پیش کرے اور مقدمہ کھڑا کر دے۔ پولیس جو بڑے بڑے ڈاکوؤں سے ہر ماہ مقررہ رشوت لیتا ہے اور غنڈوں کی پشت پناہی کرتی ہے۔ جو گھڑی بھر میں پانسہ پلٹنا جانتی ہے۔ پولیس اسٹیشن کی تین منزلہ عمارت میں خاکی وردیاں اکڑ اکڑ کر چلتی ہیں۔ مونچھوں پر تاؤ دے دے کر غریبوں کے فرشی سلام قبول کرتی ہیں۔ یہ بھکاری وردیاں جو ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہیں اور پھر بھی معزز بنی رہتی ہیں۔ یہ ہاتھ جو بے گناہوں کو مارتے ہیں، بے قصوروں کو الٹا لٹکا دیتے ہیں عورتوں کی عزت چھین لیتے ہیں اور ظالموں کی پیٹھ سہلاتے ہیں ـــ یہ ہاتھ حکومت کے محافظ کیسے ہو سکتے ہیں۔

اس تین منزلہ عمارت میں عجیب اندھیر مچی رہتی ہے۔ یہاں ہزاروں کی رشوت لی جاتی ہے۔

ٹرک پر چالیس روپے، رکشا پر دو روپے اور سیکل پر جو چاول لے جائے جاتے ہیں اس پر آٹھ آنے کا "معمول" مقرر ہے ـــ پولیس بلیک مارکٹنگ کرنے والوں کا سہارا ہے۔

یہاں وہ غریب کسان جو رشوت نہیں دے سکتے عمارت کی تیسری منزل پر لے جائے جاتے ہیں۔ لاتیں، گھونسے اور تھپڑ ان کسانوں کے منہ سے خون اگلواتے ہیں۔ دانتوں اور گالوں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ تیسری منزل کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے نچلے طبقے کی مرمت ہوتی ہے ـــ تیسری منزل جہاں بے گناہ کے لئے کوئی شہادت نہیں مل سکتی۔ مار کھانے والا وہاں کوئی شہادت حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ پولیس اسٹیشن کی تین منزلہ عمارت کا مصرف اس وقت میری سمجھ میں آیا جب میں نے لاتعداد آدمیوں کو زخمی دیکھا۔ اس عمارت کو دیکھ کر گاؤں والے نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ یہ عمارت جس کو خاکی وردیاں اپنی خود غرضی کے لئے استعمال کرتی ہیں

اس عمارت سے آگے ساہوکار ہیں۔ موٹے توندیل سیٹھ جو کسانوں اور مزدوروں کو قرض دیتے ہیں۔ کسان مزدور قرض لینے پر مجبور ہیں۔ وہ زیور، گاڑی، بیل تک رہن کر کے قرض حاصل کرتے ہیں اور کبھی ساہوکار سے یہ نہیں پوچھتے کہ سود کتنا ہوگا، کس حساب سے ہوگا۔ صرف ساہوکار کے احسان مند ہو کے پلٹ آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ساہوکار نے قرضہ دے کر بڑا تیر مارا ہے۔ ساہوکار اپنی پیشانی پر اتنی شکنیں پیدا کر لیتا ہے کہ ان کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہی کیا کم ہے کہ ساہوکار ان کے آڑے وقت کام تو آجاتا ہے، بڑا دیالو سیٹھ ہے ـــ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ساہوکار نے جو کچھ کیا ہے اپنے لئے کیا ہے، اپنی دولت کو بڑھانے کے لئے، کسانوں کو لوٹنے کے لئے ـــ ساہوکار نے چڑیمار کی طرح جال پھینکا اور پھنسا لیا۔ قرضہ کی ساری کارروائی ایک طرفہ ہوتی ہے۔ ساہوکار ہی اصل رقم لکھ کے سود لگا لیتا ہے اور کسان اپنا انگوٹھا روشنائی میں ڈبو کر کاغذ پر لگا دیتا ہے اس سے زیادہ اس کو کچھ نہیں آتا ـــ ساہوکار سود وصول کرتا جاتا ہے اور اصل رقم کبھی ادا نہیں ہوتی۔ کسان زبان نہیں ہلا سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر سیٹھ کے خلاف ایک آواز بھی اس کی زبان سے نکل گئی تو سیٹھ کبھی اس کے خراب وقت پر روپیہ نہیں دے گا۔ یوں زیور سود کی نذر ہو جاتا ہے یا بیلوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ یوں ساہوکار سب کا پیسہ اپنی مٹھی میں دبا کے اجارہ دار بن جاتا ہے۔ یہاں کسان مزدور اپنا گھربار لٹا چکے ہیں۔ ان کے برتن، زیور اور دھوتیاں ساہوکار کے پاس ہیں۔ نہ سود ادا ہوتا ہے نہ سامان گھر آتا ہے۔ سیٹھ گالیاں دیتا ہے۔ ماں بہنوں کی گندی اور ذلیل گالیاں سن کر بھی وہ

ساہوکار کے پاس جانے پر مجبور ہیں۔

میں سوچتی ہوں ساہوکار کا پنجہ زیادہ دنوں تک ان کی گردن نہیں دبوچ سکتا۔ یہ گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی، جہاں آج ان توندیل سیٹھوں کی بے ایمانی پروان چڑھتی ہے وہاں انہی کسانوں کے گھر ہوں گے مگر آج یہ بے ایمانی کتنی پھل پھول رہی ہے۔

اسی سلسلے میں گاؤں کی کانگریس کمیٹی کا دفتر ہے جس کے دروازے پر ہمیشہ تالا پڑا رہتا ہے۔ یہ تالا صرف گاندھی جینتی، پندرہ اگست یا ری پبلک ڈے کے موقع پر کھلتا ہے۔ جھاڑ پونچھ ہوتی ہے، قومی جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔ تقریریں ہوتی ہیں اور شام کو پھر بھاری تالا کانگریس کے منہ پر پڑ جاتا ہے۔ دفتر کا نام ہی نام ہے جہاں کام کرنے والا کوئی نہیں۔ تقریریں یوں تیار کی جاتی ہیں کہ چار پانچ آدمی سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور ہر ایک کی قیمتی رائے تقریروں کی شکل میں مجمع کے سامنے پیش کر دی جاتی ہیں۔ لوگ انہیں سنتے ہیں اور شام تک بھلا دیتے ہیں۔ جن الفاظ میں خلوص نہیں ہوتا وہ یاد نہیں رہتے۔

آگے چل کر ڈاکخانہ ہے۔ چھوٹے سے گاؤں کا چھوٹا سا ڈاکخانہ ـــــ عمارت بہت چھوٹی ہے اور ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی کاہل افیونی کا گھر ہے۔

اسی کے بعد آٹے کی گرنی ہے جس پر کمپونڈر کا لڑکا کام کرتا ہے۔ یہ محنت کش لڑکا جو اپنے سب بھائیوں سے مختلف ہے اور خود محنت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اور جوان بھائی باپ کی کمائی پر پلتے ہیں جو آوارہ ہیں، گاؤں کی لڑکیوں کو تاکتے ہیں اور یہ لڑکا صبح سے شام تک محنت کر کے جب گھر آتا ہے تو آٹے کا غبار اس کے بالوں اور چہرہ پر چھایا رہتا ہے اور محنت سے چور بدن تھک کر چٹائی پر گر پڑتا ہے۔

گلی کے موڑ سے سورج گڑھ کا ریلوے اسٹیشن دکھائی دیتا ہے۔ اسٹیشن جاتے ہوئے بمبئی والے سیٹھ کا مکان ہے۔ بمبئی والا سیٹھ جو گلاب جامن بناتا ہے ایسے گلاب جامن حیدرآباد میں کہیں نہیں ملتے۔ بمبئی والا سیٹھ بزنس مین ہے۔ ایسا بیوپاری جو اپنی ماں کو گلاب جامن کھلا کے قیمت وصول کر لیتا ہے جو گاؤں کے بڑے آدمیوں کو بھائی، چچا اور ماموں کہہ کر پکارتا ہے۔ اور مفت کام نکالنے کا عادی ہے مگر اپنے بنائے ہوئے گلاب جامن کسی کو مفت نہیں کھلاتا ـــــ سیٹھ بمبئی والا ہے نا ـــ سب کو سالا سمجھتا ہے ـــــ "سالا ہم تو بیوپاری ہے، اصول تو سالا برتنا ہی پڑتا ہے"۔
اور یہ سالے اصول جو صرف قیمت وصول کرنا جانتے ہیں قیمت ادا کرنا نہیں جانتے۔

ریلوے اسٹیشن پر گاؤں کی عورتیں، مرد اور لڑکیاں، بڑے بڑے بانس کے ٹوکروں میں گوبھی، ٹماٹر اور مونگ پھلی لئے بیٹھی رہتی ہیں۔ شہر جا کے ترکاریاں بیچتی ہیں۔ ان میں سے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں جو شہر کے اسکول میں بڑی جماعتوں میں پڑھتے ہیں کتابیں تھامے، صاف ستھرے کپڑے پہنے اسکول جانے کے لئے بار بار ریلوے اسٹیشن کی گھڑی دیکھتے ہیں۔ تلگو میں بڑی بڑی آواز سے باتیں کرتی ہوئی عورتیں پان کھا کھا کر پٹریوں پر تھوکتی ہیں۔ گردن ہلا ہلا کر، آنکھیں گھما گھما کر گھریلو باتیں کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے مٹی سے کھیلتے ہیں ـــــ مرد بیڑیاں سلگا کر پٹریوں کو بار بار گھورتے ہیں۔

اسٹیشن کی دوسری طرف ڈاک بنگلہ ہے، جس کی کھڑکیاں اور دروازے اکثر بند رہتے ہیں۔ تحصیلدار یا کلکٹر کے آنے

سب رس

ڈاک بنگلے میں رونق آجاتی ہے اور کسانوں کے چہروں کی رونق ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ ویسے ڈاک بنگلے کے برآمدے میں خارش زدہ کتے پڑے رہتے ہیں۔ ڈاک بنگلے کی عمارت کافی خوبصورت لگتی ہے۔

ڈاک بنگلے سے آگے بس اسٹینڈ ہے۔ بس اسٹینڈ کے پاس پان بیڑی، سگریٹ کی دوکان ہے جہاں رکشا والے سواریوں کے انتظار میں ایک دوسرے کو مغلظ گالیاں دے کر وقت گزارتے ہیں۔ فلمی گانے گاتے ہیں اور ایک دوسرے سے ستا مذاق کرتے ہیں۔

بائیں طرف ظفر طیب جی اور جمال الدین طیب جی کی کوٹھیاں ہیں ـــ ظفر طیب جی کی زندگی واقعی بورژوا طبقے کی زندگی ہے ان کی زندگی میں وہ سارے بنے بنائے اصول کام کرتے ہیں جن کو اس طبقہ نے جنم دیا ہے۔ ان کی حسین بیوی اتنی ذہین ہے کہ ہر موضوع پر بے تکان بول سکتی ہیں۔ دنیا کے ہر موضوع کے متعلق ان کی معلومات بہت وسیع ہیں اور ان کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ وقت گزرنے کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ ان کی بڑی بیٹی جو بورژوا زندگی سے مذہبی زندگی کی جانب بڑی تیزی سے آئی ہے اس سے باتیں کرتے ہوئے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی اس میں بہت غلط طریقہ سے ہوئی ہے اور وہ مذہبی موضوع کے علاوہ اور کسی موضوع پر کچھ بول ہی نہیں سکتی۔

جمال الدین طیب جی اور ان کی بیوی کی زندگی گھریلو زندگی ہے۔ جمال الدین برما میں گورنر کے سیاسی مشیر تھے اور جب دوسری جنگ عظیم میں برما پر بمباری ہو رہی تھی تب پیدل برما سے ہندستان آئے تھے۔ اب ان کو پنشن ہو گئی ہے اور وہ اپنے دیہاتی باغ میں مرغیاں پالتے ہیں۔ مرغیاں پالنے کا ان کا شوق بہت پرانا ہے۔
ان کی بیوی معمر ہونے کے باوجود بہت تیز چلتی ہیں، گھریلو کام کاج کرتی ہیں اور اپنے بیرونی دوستوں کو خطوط لکھتی ہیں۔ گاؤں بھر کی مصیبتوں میں ہاتھ بٹانے کو اس طرح آگے بڑھ جاتی ہیں جیسے یہ تکلیف ان کی اپنی تکلیف ہے۔ ہر مصیبت میں اس طرح مسکرا پڑتی ہیں جیسے مصیبت مسکراہٹوں سے دور ہو سکتی ہے۔ وہ دوسروں کے دکھ پر اس طرح تڑپتی ہیں جیسے اپنے دکھ پر تڑپ سکتی ہیں۔ ان کو زیادہ سے زیادہ دوست بنانے کا بڑا شوق ہے اور واقعی ان کے پاس باہر کے ملکوں سے کافی تعداد میں خطوط آتے ہیں ـــ

سورج گڑھ کی اس آبادی کے اطراف دھان کے جھومتے ہوئے کھیت ہیں جن کی خوشبودار بالیاں ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ دور دور تک میٹھی خوشبو پھیلا دیتی ہیں اور کسان صرف ان بالیوں کی خوشبو سونگھتا ہے، مزہ نہیں چکھتا ـــ یہاں اکثر کسانوں کی زمین نہیں ہے۔ وہ یہاں زمینداروں کی، پٹیل پٹواریوں کی اور ساہوکاروں کی زمین پر بیگار کرتے ہیں یا پھر زمیندار اپنی زمین کسانوں کو قول پر دیتا ہے اور یہ حساب یوں ہوتا ہے کہ زمین کا جو لگان زمیندار سرکار کو دیتا ہے اس کا دگنا قولدار سے وصول کرتا ہے۔ جب کبھی فصل خراب ہو جاتی ہے تو قولدار کو بک جانا پڑتا ہے۔ اپنے بیل، اپنی گاڑیاں اور بچا کھچا اناج زمیندار کو دے کر بھی وہ قرض دار ہو جاتا ہے اور پھر اس کے پاس زمین کی آس بھی نہیں رہتی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ قولدار اپنا دانہ، اپنے بیل اور اپنی محنت کے عوض زمیندار کو دگنا لگان دیتا ہے۔ فصل کی خرابی پر بھی اس کو زمیندار سے ہوئے قول کے مطابق دگنا لگان دینا پڑتا ہے۔ کسانوں کی عورتیں کھیتوں میں مزدوری کرتی ہیں۔ کھیت کھپنا (چھوٹے چھوٹے الگ الگ فاصلے سے لگانا)، کھیت کاٹنا، نالیاں بنانا اور بھوسہ الگ کرنا اور سارا دن اس کڑی محنت کے عوض

ان کو کھیت سے گری پڑی ترکاری مل جاتی ہے۔ چار مٹھی اناج مل جاتا ہے یا مزدوری کے دو چار آنے بڑی مشکل سے ان کی پسینے سے بھیگی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیئے جاتے ہیں اور وہ سوچتی ہیں ابھی اس تھکے ہوئے جسم کے ساتھ ان کو گھر جا کے بچوں اور شوہر کے لئے روٹی پکانا ہے، چٹنی پیسنا ہے اور تب کہیں پیال کی گھاس پر رات گئے کمر سیدھی ہو سکے گی — رات بھر ننھے بچے چھاتیوں سے چپٹے رہتے رہیں۔ پھر صبح ہوگی۔ پھر چولھا جلے گا اور پھر تنگ جھونپڑیوں میں دھوئیں کی کڑواہٹ آنکھوں میں جلن پیدا کرے گی اور جلتی آنکھوں کو ساڑی کے میلے پلو سے پونچھتی ہوئی ننھے کو کمر سے لٹکائے وہ کھیتوں میں کام کرنے جائیں گی۔

سورج گڈھ کے بڑے سیندھی خانے میں کسان سیندھی پیتے ہیں، ناچتے ہیں، گاتے ہیں، ہنستے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں۔ مگر یہ ہمیشہ نہیں ہوتا۔ ہمیشہ کسان خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ پیتا ضرور ہے کہ بدن کی تھکن اتر جائے، زندگی میں تھوڑا سا لطف آ جائے۔ تھوڑی سی دیر کو ساری پریشانیوں اور مصیبتوں سے چھٹکارا مل جائے مگر وہ ہمیشہ پی کے ناچتا گاتا نہیں بلکہ اکثر پی کر اپنی گھر والی کو پیٹتا ہے، بچوں کو مارتا ہے اور مغلظات بکتا ہے جیسے یہ پریشانیاں انہی کی ذات سے پیدا ہوئی ہیں۔ وہ سیندھی اسی طرح پیتا ہے جیسے شہر میں محنت کرنے والا چائے پی کر چاق و چوبند ہو جاتا ہے اور پھر تازہ دم ہو کر اپنے کام میں جٹ جاتا ہے۔ سیندھی کسان کی چائے ہے جو اس کی تھکن اتارتی ہے۔ اس کو تازہ دم کر دیتی ہے۔ پی کر وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس کے تھکے ہوئے جسم کو آرام مل گیا ہے۔ اس کی دکھتی کمر اور پنڈلیاں سکون پا گئی ہیں۔

سورج گڈھ کا کسان آج بھی زمینداروں کی مٹھی میں دبا ہوا ہے۔ آج بھی وہ زمینداروں کے کھیتوں پر بیگار کرتا ہے۔ اس کی محنت، اس کی آرزوئیں اور اس کی امیدیں آج بھی زمیندار خرید لیتا ہے۔ اس کی محنت کا معاوضہ آج بھی زمیندار کو ملتا ہے اور کسان سونا اگلتی ہوئی زمین کو حسرت سے دیکھتا رہ جاتا ہے۔
کسانوں کی عورتیں گرمیوں میں سورج گڈھ کے کنجے کاٹتی ہیں (کنجے گھاس کے میدانوں کو کہتے ہیں) تپتے ہوئے ماتھے پر پسینے کے قطرے سیندور دھو ڈالتے ہیں۔ چولی پسینے میں بھیگ کر جسم سے چمٹ جاتی ہے اور گرم زمین پر ننگے تلوے جلتے ہیں۔ سیاہ اور سانولے ہاتھوں کی انگلیوں میں درانتی موٹے موٹے چھالے ابھار دیتی ہے۔

سورج گڈھ میں ایسے کسان بھی رہتے ہیں جن کی اپنی زمین تھی مگر اب نہیں ہے۔ وہ گرمیوں میں درخت کاٹتے ہیں اور سارا دن ان کی ننگی پیٹھ پر گرمیوں کا دہکتا ہوا سورج چمکتا ہے۔ ان کی عورتیں لکڑیوں کے گٹھے سروں پر اٹھائے گھومتی پھرتی ہیں۔ خاک آلود چہرے دھوپ کی شدت سے سیاہ پڑ جاتے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں اور پھٹے ہوئے کپڑوں سے ان کا پسینے میں بھیگا ہوا جسم یوں لگتا ہے جیسے وہ نہا کے آئی ہیں۔
یہاں زمیندار باغ میں رہتے ہیں، اپنے کمروں میں لیٹے ریڈیو سنتے ہیں۔ اپنی بیویوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ اپنے بچوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے اور سورج گڈھ کی گلیوں، پگڈنڈیوں اور میدانوں میں گھومنے والے محنت کش جسم دھوپ میں تپتے ہیں، ہانپتے ہیں، پسینہ بہاتے ہیں۔ ان کے ننگ دھڑنگ بچے دبلے اکڑے ہاتھ پاؤں اور پھولا ہوا پیٹ لئے کنجے کی گرم گھاس پر پڑے رہتے ہیں۔ کسان دم بھر درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر موٹی جوار کی روٹیاں اور املی کا کھٹا کھاتا ہے۔ باولی کا گرم پانی پیتا ہے اور دھوپ میں کام کرتا ہے
چھاؤں میں بیٹھ کر بیڑی سلگاتا ہے۔ تھکی ہوئی انگلیاں چٹخاتا ہے تو زمیندار کا کارندہ گھنے پیڑ کے نیچے چارپائی

بیٹھا چلاتا ہے "ابے چل کام پر آ"۔

میں نے ڈیڑھ سال کی اس مدت میں کسانوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی آرزوئیں اور ان کی امیدیں جو
ں پوری نہیں ہوتیں۔ ان کی حسرتیں، ناکامیاں اور بے چارگی جو آج بھی ان کی زندگی سے لپٹی ہوئی ہے۔ کسان
ھان اگاتا ہے، ترکاریاں اگاتا ہے اور خود جوار کی روٹی اور املی کا کھٹا کھاتا ہے۔ اس کو یہ دھان کبھی نصیب
ں ہوتے۔ یہ دھان زمینداروں کے گوداموں میں چلے جاتے ہیں۔ بیوپاریوں کے پاس بلیک مارکٹ کی نذر ہو جاتے
ا اور وہاں سے ٹرک میں بھر کے شہر میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ کسان اس دھان کو بوریوں میں بھر کے ٹرک پر
د دیتے ہیں اور خالی ہاتھوں اور خالی کھیتوں کو دیکھ کر سوچتے ہیں کہ کاش ان کے اپنے کھیت ہوتے تو ان کی
نت ان کو بھی اس اناج کا مالک بنا سکتی۔ یہ اناج جو ان کی محنتوں اور کوششوں سے پیدا ہوا ہے۔ ان کا لہو کھیتوں
ں پسینہ بن کر ٹپکا ہے اور لہو کے قطرے اناج کی بالیاں بن کے لہرائے ہیں مگر یہ لہر ان کا اپنا ہونے کے باوجود زمیندار
ہے۔

میں آج سورج گڈھ سے جا رہی ہوں اور یہ امید لے کر جا رہی ہوں کہ جب یہاں دوبارہ آؤں گی تو سورج گڈھ
ا دھرتی پر کسانوں کے ذاتی کھیت ہوں گے۔ ان کے بچے ان کی بیویاں اور ان کی مائیں اس دھرتی پر اجنبی بن کر
یں رہیں گی۔ یوں رہیں گی جیسے وہ ان کھیتوں کی شہزادیاں ہیں۔ ان کی آرزوئیں اور ان کی امیدیں خود ان کے
م آئیں گی۔ ان کے بچے اسکول جائیں گے۔ ان کی بیویاں دوسروں کی زمین پر مزدوری نہیں کریں گی۔ اپنے کھیتوں کے
م میں شوہروں کا ہاتھ بٹائیں گی۔ محنت کر کے ان کو رونا نہیں پڑے گا۔ انہی کنجوں میں گیت گا گا کر وہ درانتی سے
ماس کاٹیں گے۔ اس وقت ان کو محنت کر کے خوشی ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کا مستقبل سنوار سکیں گے۔ ان کی اپنی دھرتی
ونا اگلے گی۔ ان جھونپڑیوں کی بجائے ان کے چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے گھر ہوں گے۔ پھر ان کو ساہوکاروں
کے پاس بکنا نہیں پڑے گا۔ ان کے پڑھے لکھے بچوں کو ساہوکار چکمہ نہیں دے سکے گا۔

اور سورج گڈھ کی دھرتی نعیم الدولہ کی نہیں، زمینداروں کی نہیں، کسانوں کی دھرتی ہوگی۔

شب کے پیک سفر کو روکے کوئی
جانے والے قمر کو روکے کوئی
تھک کر سرِ زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
رو کے رو کے سحر کو روکے کوئی

جوش ملیح آبادی

رحمت اللہ

عزیز قیسی

نیم یار جنگ کی ڈیوڑھی کے صحن کے آگے، بڑے دروازے سے لگے ہوئے باڑے کی ایک تاریک کوٹھری میں رحمت اللہ پیدا ہوا تھا۔

وہ رات رحمت کے بوڑھے نانا کو اب تک یاد ہے۔ سردیوں میں کپکپاتی ہوئی رات ــــ باڑے کے سارے کمرے گل ہو گئے تھے۔ سامنے سڑک بالکل ویران ہو چکی تھی۔ رحمت کا بوڑھا نانا، دمے کی تکلیف سے عارضی سکون پا کے ابھی ابھی لیٹا تھا۔ اس کی پلک بھی جھپکنے نہ پائی تھی کہ کراہتی ہوئی بیٹی نے باپ کو جھنجھوڑا۔ بیٹی شام ہی سے کشمکش میں مبتلا تھی۔ شام ہی سے وہ اپنے باپ کو بتانا چاہتی تھی کہ اسے درد ہو رہے ہیں۔ کم عمر بیٹی ــــ صرف ماں کو اپنے درد بتا سکتی ہے۔ مگر رحمت اللہ کی ماں کسی سے اپنا راز کہہ نہ سکی تھی۔

باپ نے ہی اسے اس عمر تک پالا پوسا تھا۔ اس سے پہلے بھی جب وہ جوان ہوئی تھی تو اسے بے اختیار اپنی ماں کی یاد آ گئی تھی۔ اس رات بھی وہ اپنی ماں کو تلاش کرتی رہی تاکہ اسے بتا سکے کہ...... مگر اس کی ماں اسے کہیں نہ ملی۔ آخر کار وہ شرماتی، شرماتی، روتی سسکیاں بھرتی اپنے باپ کے قریب آئی۔ باپ نے سر پہ ہاتھ پھیرا ــ "کیا ہے میری بچی؟"

"بابا ــــ" وہ آگے کچھ کہہ نہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میری بچی، میری نازو!" باپ نے اسے چھاتی سے لپٹا لیا ــــ "کیا بات ہے؟"

روتے روتے نازو نے کہا "مجھے کچھ ہو گیا ہے بابا۔ مجھے کچھ ہو گیا ہے" ــــ باپ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک آئی۔ ایسی چمک جو ماں کی آنکھوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس نے اسے پچکارتے ہوئے کہا ــــ "تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

اور پھر باپ نے ماں بن کے اس سے سب کچھ پوچھا اور سب کچھ سمجھا دیا۔ بیٹی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

ابھی جوان ہو کر ایک سال بھی نہ بیتا تھا کہ نازو کا بیاہ ہو گیا۔ نہ ڈھولک پر تھاپ پڑی نہ ڈوپٹے چنے گئے۔ نہ مہندی پیسی گئی نہ ہلدی۔ جس رات باپ نے بیٹی کو بدا کیا۔ اس دن اس کے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ کمرے میں بتی جلی ہی نہیں۔ بیٹی نے نہ جو تھی دیکھی نہ چھوگی ــــ ایک بار اپنے دولہے کے پاس گئی تو بیوہ بن کر ہی اس کمرے سے لوٹی ــــ

باپ اب کے رو بھی نہ سکا۔

جس رات بیٹی واپس آئی۔ اس رات اسے بڑے زور کا دورہ پڑا۔ سانس سینے میں نشتر بن کر چبھتی رہی اور حلق کے راستے یہ نشتر آنکھوں تک ابھرتے رہے۔ پہلوؤں میں جیسے بھالے لگ رہے تھے۔ اب سے پہلے جب بھی اسے دورہ اٹھتا تو وہ زیر لب دعا مانگتا کاش نازو آ جائے۔ اس کا سینہ سینکے اور گرم چائے کی پیالی اسے بنا کر دے اور پھر رات گئے دیر تک اس کا سر دابتی رہے ...... مگر آج اس نے زیر لب دعا نہیں کی۔ کپکپاتے ہاتھ اٹھائے اور درد کی شدت سے کراہتے ہوئے بلند آواز سے دعا کی۔

"خدایا میری نازو کو بھیج دے۔ ورنہ میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔"

اس نے دعا ختم بھی نہ کی تھی کہ دروازہ چرچرایا اور نازو آنکھوں میں آنسو بھرے، ننگی کلائیاں لئے، ایک میلے کپڑے کی گٹھری سنبھالے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی دعا مقبول ہو گئی۔ ایک لمحہ کیلئے اس کی آنکھوں میں خوشی چمک اٹھی مگر دوسرے ہی لمحے بجھ گئی

باپ سے لپٹ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ باپ کو کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بیوہ کلائیوں اور چھپے آنسوؤں نے پوری کہانی سنادی ــــ

وہ اب کے تو تڑپ کر رہ گیا مگر ایک آنسو بھی آنکھ میں ابھر نہ سکا اور اس نے اپنے آپ کو اور اپنی دعا کے اثر کو کوسا۔ آج پھر بیٹی سرہانے نسسکی کر اتنی بیٹھی ہوئی تھی۔ درد سے وہ سسکی جا رہی تھی۔ بوڑھے نے بتی جلائی اور کھانستا کھنکھارتا اٹھ بیٹھا ــــ

"اچھا ابھی دایا کو بلا لاتا ہوں" ــــ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا وہ ابھی یہ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے کہ اسے بتی گل کرنی پڑی۔

لاجونتی بیٹی شرم سے اتنی سکڑی کہ بوڑھا جو شوہر، ماں اور دایا بن چکا تھا' اپنے ہاتھ پھیلائے، بیٹی کی سرد لاش پر سر پٹخنے لگا۔ ابھی ایک لمحہ پہلے نانند کا بدن پھڑک رہا تھا نس نس میں تشنج تھا۔ ہاتھ پاؤں اکڑ رہے ہوئے تھے اور آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں اور ایک لمحے کے بعد باپ نیم برہنہ سرد جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب کے بھی آنسو نہیں تھے۔ اس باڑے میں ایک ایسی گھڑی بھی آتی ہے جب مسکراہٹ کے ساتھ آنسو کو بھی دہلیز لانگنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

باپ بڑی دیر تک جوان بیٹی کی لاش پر لیٹا رہا۔ بچہ رات بھر روتا رہا کسی ہمسایہ نے خبر نہ لی اور جب سورج نکل آیا تو اس نے بیٹی کی لاش پر سفید چادر اڑھادی اور کہیں سے پھول لیتا آیا۔ اس ہار میں ایک گلاب بھی ٹنکا ہوا تھا۔ اس نے پھول بیٹی کے سر سے باندھ دیئے اور دیر تک سرہانے بیٹھا اسے گھورتا رہا۔ ننھا ننھا سا بچہ لاش کے پہلو سے چپٹا ہوا چلا رہا تھا۔ اس نے اسے گود میں اٹھا کر بوسہ لیا اور پھر بچہ کو لاش کے پہلو میں لٹا دیا۔ ایک دو لمحے لاش کو گھورنے کے بعد وہ پھر بیٹی کی پیشانی چومنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔

"سہاگن مری ہے"

"ابھی کنواری تھی"

"میری لاجونتی"

بوڑھا جانے کیا کیا کہتا رہا۔ باڑے میں لاش کا اٹھنا آسان کام ہے مگر بچے کا پلنا مشکل ہے۔ بوڑھے نانا کو صرف اس قدر یاد ہے کہ اس نے اپنے نواسے کو بڑی مصیبتوں سے پالا ہے۔

جب کسی سے وہ اپنے نواسے کا تعارف کراتا تو بڑے فخر سے کہتا "یہ رحمت اللہ ہے" اللہ کی رحمت ــــ سمجھے میرا نواسہ' میرا بیٹا' میرا باپ ــــ"

اور پھر وہ ہنسنے لگتا۔ ایک ہی لمحے بعد وہ سنجیدہ ہو جاتا۔ "اسے بڑی مصیبتوں سے پالا ہے"۔ اس ایک جملے میں کتنا اختصار تھا۔ کتنا دردناک اختصار۔ اس کا اندازہ سننے والے کو نہیں ہو سکتا۔

جب رحمت اللہ سیانا ہوا تو باڑے میں سوائے اپنے نانا کے کسی کو پسند نہ تھا۔ دبلا پتلا' سیہ فام' تپسی چوڑی' آنکھیں اندر دھنسی ہوئی' چہرے پر مکھیاں بھنبھناتی ہوئی ــــ رحمت نے بارہا بچوں میں کھیلنے کی کوشش کی مگر کسی نے اس کو قریب نہ آنے دیا۔ ہمیشہ بچے اسے پیٹ کر، گرد میں نہلا کر واپس کر دیتے اور رحمت اپنی اس شکست کا بدلا اپنے نانا سے لیتا۔ وہ روتا ہوا آتا اور بپھر کر نانا کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا۔

"ان لوگوں نے مجھے مارا ہے"۔ وہ نانا کو گھونسے مارنے لگتا۔

بوڑھا ہنستا ــــ "ارے تو کیا ساری دنیا کا بدلہ مجھ سے لے گا"

"ہاں"

پھر بوڑھا اسے منانا ۔۔۔ "بیٹا میں تیرا نانا ہوں ۔ مجھے نہیں مارنا چاہیئے"

"نانا ہو تو کیا ہوا میں نانا کو بھی ماردوں گا"

اور بوڑھا ہنس دیتا ۔ دیر تک باڑے کے کمرے میں بوڑھے کے قہقہے گونجتے اور رحمت اللہ شام تک روٹھا ہوا رہتا ۔

جب کبھی رحمت کے دشمنوں کے پاؤں کو دھکا لگتا تو بوڑھا اپنے دمے سے چپکے سکڑتے سینے سے تکیہ لگائے رات بھر بیٹھا رہتا ۔ جانماز بچھی رہتی اور وہ اپنے لکڑی لکڑی ہاتھوں کو اٹھائے دعا مانگتا ۔۔۔ "خدایا اس کی آئی مجھے آجائے"

رحمت اللہ کو جب اس نے پڑھانا لکھانا شروع کیا تو اس کا سب سے پہلا جملہ بوڑھے پر ہی ہوا ۔ رحمت اللہ نے کھوج کھوج کر بوڑھے کی زندگی کے سارے بخیے ادھیڑ دیئے ۔۔۔ "میری ماں کیوں مری" ۔۔۔ رحمت اللہ نے پوچھا ۔

بوڑھا کوئی جواب نہ دے سکا ۔

"بولو نانا ! نہیں تو میں تم کو مار ڈالوں گا"

"اسے میں نے مار دیا بیٹا" ۔۔۔ بوڑھے کی آنکھوں میں گمبھیر سنجیدگی آ گئی ۔۔۔ "تیری ماں اس لئے مر گئی کہ میں غریب ہوں ۔ میرے پاس ۔ اس کے لئے پیسے تھے نہ تیری ماں کی زندگی بچانے کے لئے کوئی تدبیر تھی ۔ نہ میرے پاس رہنے کو مکان تھا اور نہ اسے پہنانے کو کپڑے تھے ۔ یہاں تک کہ میں نے تیری ماں کی شادی بھی ایک بوڑھے سے کر دی تھی ۔ پیسہ میرا ہمیشہ سے دشمن رہا بیٹے ۔ اس لئے تیری ماں مر گئی"

رحمت بڑے دکھ اور غور سے سنتا رہا ۔ اس نے بوڑھے سے لپٹ کر کہا "تو میں پیسے کو مار ڈالوں گا"

بوڑھے کی سنجیدگی رخصت ہو گئی ۔ وہ ہنسنا ہی چاہتا تھا کہ رحمت اللہ نے دوسرا سوال کر دیا ۔۔۔ "میرے پاس رحمان کے جیسے کپڑے کیوں نہیں ہیں"

"ہیں" ۔۔۔ اور بوڑھے نے نیا قمیص نکال کر رحمت اللہ کو پہنا دیا ۔ رحمت اللہ کی کھنچی ہوئی مٹھی ڈھیلی پڑ گئی ۔ لیکن جب وہ اسکول سے واپس آیا تو وہ بپھرا ہوا تھا اور اس نے آتے ہی نانا کو گھور کر دیکھا ۔

"کیا ہے ؟" ۔۔۔ بوڑھا مسکرا دیا ۔

"تم مر کیوں نہیں جاتے نانا پھر میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا"

بوڑھا فاقے کر کر کے رحمت اللہ کو ساتویں درجے تک لے آیا ۔ اب رحمت کے پاس ایک بڑھیا فونٹن پن ، ایک اچھا پنسل ، چھ سات جلد والی کاپیاں اور دو ایک اچھے جوڑے تھے ۔ یہ دو جوڑے بوڑھا اپنے ہاتھوں سے دھو کر رحمت کو پہناتا تھا اور اپنے ہاتھوں سے اسے سجا کر اسکول بھیجا کرتا تھا ۔

جب رحمت اللہ آٹھویں درجے میں آیا تو بوڑھے نے اپنے وظیفے کے دو روپے بیچ دیئے اور رحمت اللہ کو ایک سیکل دلا دی ۔ مگر رحمت اللہ خوش نہیں ہوا ۔ اس نے منہ بسور کر کہا ۔

"نانا ہم لوگ موٹر سیکل کب لیں گے ۔

"ارے اسی کو موٹر سیکل سمجھ"

"مجھے ایسا سمجھنا نہیں آتا"

رحمت اللہ کے پر لگ گئے ۔ اب وہ جہاں جانا چاہتا جا سکتا تھا ۔ سیکل دلانے کے دوسرے روز رحمت اللہ نے بوڑھے سے سنما دیکھنے کے لئے پیسے مانگے اور بوڑھا پہلی مرتبہ اپنے لاڈ پیار پر پچھتایا ۔ رحمت اللہ رات میں دو بجے گھر آیا ۔ بوڑھے نے اس وقت دروازہ

نہیں کھائی تھی۔ رحمت اللہ بھی شرمندہ شرمندہ سا تھا۔ اس نے روٹی کھائی اور سو رہا۔ لیکن بوڑھے کو دھکے نے اور آج کے واقعے کی تکلیف نے سونے نہ دیا۔ اس نے جانماز سنبھالی ــــ "خدایا اسے بری صحبت سے بچانا!"
مگر بوڑھے کو ایسے محسوس ہوا جیسے پہلی بار اس کی دعا مقبول نہیں ہوئی اس لئے کہ دوسرے ہی مہینے بوڑھے کو اپنے وظیفے کا ایک روپیہ اور بچانا پڑا اور رحمت کو نئے کپڑے بنانے پڑے اور گھڑی دلانی پڑی۔
گھڑی دلانے کے تیسرے روز رحمت اللہ رات بھر گھر نہیں آیا۔ اور تیسرے روز جب وہ گھر آیا تو بوڑھے نے دھیمی آواز میں پوچھا ــــ "رات کہاں رہے بیٹا!"
رحمت اللہ شرمندہ ضرور تھا مگر اب کے وہ ڈرا نہیں۔ اس نے تڑ سے جواب دیا ــــ "جہنم میں"
بوڑھے نے آہستہ سے رحمت اللہ کا جواب دہرایا ــــ "ہاں جہنم ہی میں ہوں گے"
رحمت اللہ تو روٹی کھا کر بستر پہ لیٹ گیا لیکن بوڑھا بڑی دیر تک سوچ میں گم رہا۔ آخر اس نے رحمت کو پکارا۔
"رحمت اللہ"

"اوں"

"بیٹا میں تجھے روکوں گا نہیں۔ تو جہاں چاہے جا سکتا ہے ــــ جب تیری ماں جوان ہوئی تھی اسے میں نے ماں بن کر سب کچھ سمجھایا تھا۔ اب میں تجھے باپ بن کر سمجھاتا ہوں۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ عورتوں سے بچ کر رہنا۔ مجھے دیکھ یہ عمر ہونے کو آئی میں نے کسی عورت کو آج تک بری نظر سے نہیں دیکھا۔"
رحمت اللہ کروٹ بدل کر سو گیا لیکن بوڑھا سو نہ سکا۔ دوسرے روز بوڑھے نے فہیم یار جنگ کے بیٹے کی سفارش سے رحمت اللہ کو نوکر کرا دیا۔ رحمت اللہ بہت جھنجھلایا۔
"مجھے نوکری نہیں کرنی ہے۔ مجھے تم نے ذلیل کر دیا نانا۔ اس سفارش کی کیا ضرورت تھی۔"
بوڑھے نے بڑی منت سے کہا ــــ "بیٹا اب نوکری کر لو۔ سنی سفارش کے بغیر تو نوکری مل نہیں سکتی۔ نوکری کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟"
تین دن تک رحمت اللہ پیچ و تاب کھاتا رہا۔ نہ وہ اسکول ہی گیا اور نہ نوکری قبول کی۔ لیکن تیسرے دن اس نے نانا سے کہا۔
"تم کو اب میرا خرچ بار ہونے لگا ہے۔ اچھا تو میں نوکری کر ہی لیتا ہوں۔"
اور جب وہ نوکری پر جانے تیار ہوا تو بوڑھے نے اسے قریب بلا کر کہا ــــ "رشوت کبھی نہ لینا۔ میں نے زندگی بھر رشوت نہیں لی۔ کسی کو ستانا بھی نہیں۔ میں نے زندگی بھر کسی کا دل نہیں توڑا۔"
"ٹھیک ہے ــــ" رحمت اللہ بڑبڑایا ــــ "نصیحت رہنے دیجئے۔ میں بچہ نہیں ہوں" ــــ اور سیکل پہ سوار ہو کر چل دیا۔
رحمت اللہ نوکری ملنے کے بہت خوش تھا۔ ہر روز تنخواہ کے علاوہ نیا پیسہ ملا کرتا تھا۔ دن رات پیسے سے سابقہ تھا۔ بہت جلد ہی اس کی انگلیوں میں انگوٹھیاں، سائیکل میں ڈائنمو اور منہ میں پان اور زردہ آ گیا۔ اور بوڑھے کو باڑے کے کمرے سے نکال لایا۔ لیکن بوڑھا خوش نہیں ہوا۔ اس نے رحمت اللہ سے کہا ــــ
"یہ پیسہ بڑا دھوکے باز ہوتا ہے بیٹا۔ اس سے ذرا خبردار رہ کر دوستی کرنا۔"
پھر رحمت اللہ کی شادی ہوئی۔ آج بوڑھے کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ رحمت اللہ شادی کے بعد بوڑھے سے بالکل بے نیاز ہو گیا۔ پھر بھی بوڑھا خوش ہی رہا۔ اسی اثنا میں اس نے سنا کہ رحمت اللہ کسی کا دل نہیں توڑتا۔ کچھ پیسے والوں سے رشوت لیتا ہے اور غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ کام بہت تیز کرتا ہے۔ اس کے افسر اس سے بہت خوش ہیں ہر شام اس کے پیچھے غرضمندوں کی بھیڑ ہوتی ہے جنہیں وہ کبھی نہیں جھڑکتا۔ یہ غرضمند گھر تک بھی آنے لگے تھے۔

بوڑھا ایک حد تک خوش تھا۔ وہ کہتا چلو۔ خون کا اثر اتنا تو باقی ہے کہ میرا نواسہ کسی کا دل نہیں توڑتا۔ غیرت مند تو خیر وہ بچپن ہی سے ہے۔ کسی سے مانگتا کیا ہوگا ـــــ اور واقعی رحمت اللہ نے کسی سے رشوت مانگی نہیں۔ لوگ خود اسے لاکر دیتے تھے۔

بوڑھا کچھ دنوں کے لئے مطمئن ہوگیا اور جیسے یہ اطمینان ایک طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ ایک رات رحمت اللہ نشے میں دھت آیا۔ وہ اپنی سیکل کہیں چھوڑ آیا تھا۔ بوڑھا دمے کی وجہ سے کھانستا کھنکارتا بیٹھا تھا۔

رحمت اللہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا ـــ "سالی کلمۂ طیبہ پڑھنے لگی۔ نعرۂ تکبیر کہتی تھی"

نواب زادے نے فخریہ جواب دیا ــــ "یہ مسلمانوں کا خون بول رہا ہے۔ سب مسلمانوں کی اولاد ہے"

رحمت اللہ نے قہقہہ لگا کر کہا ــــ "ہاں ہم نے بھی اپنا خون آج شامل کر دیا"

نانا ہکا بکا اٹھ بیٹھا۔ رحمت اللہ اپنے نانا سے مخاطب ہوا ــــ

"ہم پر فخر کرو نانا۔ ہم اپنے خون کو گلی گلی جھونپڑی جھونپڑی پہنچا رہے ہیں"

بوڑھا سن ہوگیا۔

رحمت اللہ نشے میں بولتا جا رہا تھا ــــ "تم کنجوس ہو نانا۔ تم نے اپنا خون کسی کو نہیں بانٹا۔ تم نے زندگی بھر کسی عورت کا مزہ نہیں چکھا۔ زندگی بھر شراب تو شراب، شربت کی بوند تک نہیں پی۔ تم نے سمندر میں رہ کر اپنی زندگی کو پیاسا رکھا۔ تم ذلیل ہو نانا، ذلیل ہو۔ ایک دم ذلیل ہو"

بوڑھا اپنے جوان نواسے کو مار سکتا تو شاید ایسا مارتا کہ رحمت اللہ کے جسم سے خون پھوٹ نکلتا۔ مگر نہ تو اس نے رحمت اللہ کو کبھی مارا تھا نہ مارنے کی اس میں سکت تھی۔ بوڑھے نے لرز کر بددعا دی ــــ "خدا مجھے موت دے یا تجھے"

رحمت اللہ نے جس کی پیشانی پر پسینہ جمع ہوگیا تھا اور جس کی آنکھوں میں آگ سی دہک رہی تھی، بپھر کر نانا کو طمانچہ لگایا۔

"میری موت کی دعا کرتا ہے۔ کالی زبان کا بڈھا۔ میری ماں کو اس نے مار دیا۔ رشید!" ــــ وہ اپنے دوست سے مخاطب ہوا ــــ "اس نے، اس کی قناعت نے میری زندگی تباہ کر دی۔ اور ابھی تک اس نے مجھے فہیم یار جنگ کا احسان مند بنا رکھا ہے۔ مجھے ساری دنیا میں اپنے گھر میں جنم دے کر یتیم ہونے کا اعلان کر دیا ــــ"

بوڑھا یہ سب کچھ سننے سے پہلے ہی اندھیرے کا دامن تھامے چلا گیا تھا ـــ اپنے باڑے میں ـــ اور رات بھر وہ باڑے کے کمرے کی تاریکی میں پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ آج جیسے برسوں کے رکے ہوئے آنسوؤں کے بہہ جانے کا دن تھا۔

رحمت کو یہ یاد بھی نہیں تھا کہ رات اس نے اپنے بوڑھے نانا کو خون کے آنسو رلایا ہے۔ وہ صبح ناشتہ کرکے دفتر چلا گیا۔

رحمت اللہ کی بیوی ـــ اس سے بڑی سہمی ہوئی رہتی تھی۔ اسے ہمت بھی نہ ہوئی کہ وہ اس کا ذکر کرتی۔ دن رات کی مصروفیت میں رحمت اللہ کو یہ یاد بھی نہیں رہا کہ اس کا کوئی بوڑھا نانا تھا۔

کبھی کبھی جب اسے خیال بھی آتا تو وہ بوڑھے کو بھولنے کی کوشش کرتا، جیسے وہ اس کا منہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی گراوٹ سے آنکھ ملانا نہیں چاہتا تھا۔ بوڑھے نے بھی جانے یہ مدت کیسے بسر کی۔

اس دوران میں رحمت اللہ نے سینکڑوں روپے کمائے۔ لیکن کبھی اسے بوڑھا آج کی طرح یاد نہ آیا۔ آج رحمت اللہ کو بوڑھے کی باتیں رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں ـــــ "یہ پیسہ بڑا دھوکے باز ہوتا ہے"

جب اسے نوکری سے علٰحدگی کا نوٹس ملا تو رحمت اللہ پریشان نہیں ہوا تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ شہر بھر میں کئی لوگ اس کی جان پہچان کے ہیں۔ اس کے ملنے والے ہیں۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑ چکے ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو کوئی کام مل ہی جائے گا۔ اس کے جسم کے کپڑے پھٹنے لگے۔ انگوٹھیاں گروی ہوگئیں۔ سائیکل کسی مہاجن خانے کی نذر ہوگئی۔ یہاں تک کہ فاقوں کی نوبت آگئی ..... دو سال کی اس طویل مدت

اس نے کسی سے سفارش کی کوشش نہیں کی اور ان ہی دنوں وہ ایک بچہ کا باپ بھی بن گیا۔ اس نے سنا کہ نانا آیا تھا۔ اس نے کھلونے بچے کو دیئے اور بہو کو جھولا دے کر چلا گیا۔ بہو نے لاکھ روکا مگر وہ رکا نہیں۔

سڑکیں ناپتے ناپتے، فاقے کرتے کرتے جب رحمت اللہ عاجز آگیا تو اس نے رکشا سنبھال لی۔ ہر چند اس کا کمزور ڈھانچہ اس قابل نہ تھا کہ وہ اتنی مشقت اٹھا سکے لیکن اس کے سوائے کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس دوران میں ایک بار وہ اپنے دفتر کے گیٹ کے سامنے بھی گیا۔

کل تک جو لوگ رحمت اللہ کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے انھوں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ ایک صاحب نے اسے روکا۔ رحمت اللہ نے نظریں چرانا چاہا مگر ان صاحب نے اسے آخر پکڑ ہی لیا۔ صورت دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا — "تم رحمت اللہ ہو نا۔"

"نہیں — رحمت اللہ نے کہا

"جھوٹ کہتے ہو" — ان صاحب نے پہچاننے کی کوشش کی

"نہیں۔ میں رحمت اللہ نہیں ہوں۔ میں لعنت اللہ ہوں۔"

وہ صاحب ہنسے — خیر کوئی بھی ہوں گے۔ کرایہ کر دگے۔"

اور بغیر جواب سنے وہ بیٹھ گئے۔

رحمت اللہ بھی چپ ہو گیا۔ اس کی غیرت میں اب وہ سرکشی باقی نہیں رہی تھی۔ چار کمان پر اتر کر انھوں نے اسے دو آنے دیئے۔ رحمت اللہ نے واپس کر دیئے۔

"بڑی مستی ہے۔"

"رحمت اللہ سے نہ رہا گیا — اس نے کہا —

"ہاں تم جیسے کمینوں سے اب بھی کہیں زیادہ دل کا امیر ہوں سمجھے — تم جیسوں پر میں نے اب تک سینکڑوں روپے لٹا دیئے ہیں۔ ان دو آنوں کو کیا سمجھتا ہوں۔"

"اچھا" — انھوں نے طنزیہ کہا — "تبھی تو لنگوٹی لگ گئی۔"

رحمت اللہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ اس نے ایک زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ لیکن آگے اسے کچھ یاد نہیں رہا۔

رحمت کی بیوی نے چادر اوڑھ لی اور نانا کے پاس پہنچی۔

"نانا حضرت چلیئے۔ ان کی زندگی کی خیر نہیں۔"

بوڑھا نہ رویا نہ پریشان ہوا۔ جیسے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ رحمت اللہ کا یہی انجام ہونے والا ہے۔ اس نے رحمت اللہ کی بیوی کے چہرے پر موت کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ لاٹھی اٹھائے چپ چاپ آیا اور رحمت اللہ کو اپنے باڑے میں اٹھا لایا۔

رحمت اللہ بے ہوش پڑا تھا۔ بدن پھنک رہا تھا۔ نس نس میں تشنج تھا۔ ہاتھ پاؤں اکڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں اکڑ ہو گئی تھیں۔ بوڑھا اس کے سرہانے بیٹھا اسے گھورتا رہا۔

"مجھ سے نہیں بولے گا پگلے! — میں تیرا باپ ہوں۔ تیرا نانا ہوں۔ میں تیری ماں ہوں بیٹے۔ میں تجھ سے خفا نہیں ہوں۔ آنکھیں کھول —"

مگر رحمت شرمندہ تھا۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو نانا کو دیکھ کر گردن پھیر لی۔ بوڑھے نے اپنی طرف اس کا چہرہ پھیر کر کہا —

"بڑا غیرت مند بیٹا ہے۔ بڑا خودار ہے۔ مجھ سے اب نظر بھی نہیں ملائے گا۔"

سفید چادر اوڑھائے بوڑھا رحمت اللہ کے سرہانے بیٹھا رہا۔ شام کی سیاہی میں بوڑھے کی بینائی گم ہوتی جارہی تھی۔ اس نے رحمت کی بیوی سے کہا ––––

"بہو طاق میں کچھ پیسے ہوں گے۔ ان کے پھول لے آ۔"

بہو ہچکچا رہی تھی۔ پلکوں میں آنسوؤں کا سمندر چمک رہا تھا۔ بوڑھے نے کہا ––––

"جا۔ میری بچی! ––– اب پردہ، حیا، شرم سب بالائے طاق ہیں ––– اور ہاں دیکھ ان دو چار پھولوں میں ایک گلاب کا پھول بھی ٹنکا کے لانا۔ مجھے لاشوں پر گلاب چڑھانے کی بڑی آرزو ہے۔"

بہو روتی، سسکیاں بھرتی گئی اور پھول لے آئی ––– چادر پر پھول ڈالے۔ بڑی دیر تک بوڑھا رحمت اللہ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ دروازے سے سر لگائے بچے کو گود میں لئے رحمت کی بیوی سسکیاں بھرتی کھڑی تھی۔ بوڑھے نے جلدی سے اس کی گود سے بچہ چھین لیا اور بچے سے کہنے لگا ––––

"تیرے بابا کو پیسے نے مار ڈالا ہے۔ پیسہ نے۔"

رحمت اللہ کا بچہ بوڑھے کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ––– "تو میں پیسے کو مار ڈالوں گا۔"

بوڑھا بچہ کی نظر کی تاب نہ لاسکا اور اس نے بچے کو لاش کے پہلو میں لٹا کر غور سے دیکھا اور پھر غصے میں کہنے لگا۔

"میں ایک کو پال پوس کر جوان کرتا جاتا ہوں اور تو ان کی لاشیں سنوارتا جا۔ دیکھیں گے کون تھک جائے گا آخر میں۔ تو یا میں......"

رحمت کی بیوی سنتی رہی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ بوڑھا یہ سب کس سے کہہ رہا ہے۔ بوڑھا اپنے جواب کا منتظر گم سم بیٹھا رہا لیکن کالی تاریک کوٹھری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو

نفسیات افواہ

نفسیات ایک وسیع علم ہے جس کے مختلف عنوانات ہیں۔ انگریزی زبان میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں۔

اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے لکھی تھی۔ اس افواہوں کی نوعیت کا نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کیا گیا ہے۔

قیمت:۔ ایک روپیہ بارہ آنے

انجمن ترقی اردو۔ علیگڈھ

پانچ کی پتی

هربنس سنگھ دوست

صاحب کوٹ پہن گھر سے نکلے تو کلوے نے اطمینان کا سانس لیا۔ دو گھنٹے سے دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم پسینہ سے تر ہوا جا رہا تھا۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے کونے میں پڑی ہوئی ردی کی ٹوکری میں سے پانچ کا نوٹ نکالا۔ — پانچ روپے، اس کی سب سے بڑی چوری۔

"پانچ کی پتی" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ چمک پڑا۔ نوٹ کو نیکر کی جیب میں ٹھونس کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور ٹرنک کھول کر اپنی رنگین چار خانے والی بش شرٹ اور جین کی خاکی پینٹ نکالی اور گنگناتے ہوئے پہننے لگا۔

"کوئی کیا جانے متوالا ......"

کپڑے بدل کر اس نے جوتے پہنے۔ پھر مالک کے کمرے میں آ کر ہلکی سی پالش کر لی اور پانچ کا نوٹ ٹٹولتا ہوا باہر نکل آیا۔ پھر کچھ سوچ کر رامو مالی کی جھونپڑی کی طرف مڑا۔

"رامو دادا — میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ گھر کا خیال رکھنا۔"

"کہاں چلے کلوے آج یہ بن ٹھن کے" — رامو مالی نے اسے نظر بھر کر دیکھتے ہوئے کہا — "آج تو رنگ میں نظر آتے ہو۔"

وہ ایک ثانیہ کے لئے ٹھٹکا۔ پھر سنبھلتے ہوئے بولا — "ذرا چچا کے یہاں جا رہا ہوں۔"

اور بغیر جواب کا انتظار کئے وہ احاطے میں سے باہر نکل گیا۔ اسے اپنی کامیابی پہ خوشی ہو رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں صاحب کو پتہ چل جاتا تو — ! تصور سے ہی وہ کانپ اٹھا لیکن پھر اپنی دانائی پہ مسکرانے لگا۔ اس بار کس صفائی سے اس نے چار آٹھ آنے نہیں بلکہ پورا پانچ کا نوٹ پار کر دیا تھا اور اسے ردی کی ٹوکری میں چھپا دیا تھا تاکہ اگر مالک کو پتہ چل جائے کہ اس کا ایک نوٹ کم ہے تو یہ بڑی صفائی سے انکار کر دے اور اس کے بعد تھوڑی سی ایکٹنگ کرے اور ٹوکری سے نکال کر دے دے کہ شاید رات کو گر پڑا ہوگا اور وہ صبح کاغذ سمجھ کر جھاڑو دیتے وقت ٹوکری میں ڈال گیا ہوگا۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ مالک نے کوٹ پہن کر جیب سے پرس نکالا اور اسے سبزی کے چار آنے پیسے دے کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت اس کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے باہر ہی تو آ پڑے گا۔

وہ آج اپنے آپ کو کسی امیر زادے سے کم نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ اس کے لئے پہلا موقعہ تھا کہ پانچ روپئے ایک ساتھ اس کی جیب میں تھے۔ وہ جھومتا ہوا چلنے لگا۔

نل کے قریب سے گزرتے وقت وہ رک گیا۔ گگو پانی بھر رہی تھی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور نل پہ اور کوئی نہیں تھا۔

"میں نے کہا سرکار اچھی ہے؟" کلوے نے نل کا سہارا لے کر ذرا جھکتے ہوئے کہا۔
"آج کدھر چلے ہیں ......؟" گلو مزید مسکراتے ہوئے بولی۔
"بس جل گئی ہمارا رنگ دیکھ کر ۔" کلوے نے اسے چھیڑا ۔ "آج جیب گرم ہے۔ کہہ دے تیرے لئے کیا لاؤں
— پھر کہے گی....."
"ارے جا..... جیب میں چھ آنے ہوں گے۔ چلو دیکھا۔"
"تو کیا سمجھتی ہے گلو — آج ذرا تو منہ سے پھوٹ تو سہی....."
"ارے میں کہتی ہوں ......" گلو نے بھری ہوئی بالٹی اٹھائی۔
"اچھا میں خود ہی لاؤں گا۔ تو بھی کیا یاد کرے گی۔ کسی رئیس ......" اتنا کہنے کے بعد اس نے عاشقانہ انداز سے کھانسا اور چلتے ہوئے بولا
"کل ملنا نہ بھولنا —"
وہ سڑک پر چلنے لگا۔ وہ گلو سے محبت کرتا تھا۔ گلو بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ دونوں انتظار کر رہے تھے کہ کس طرح اپنے اپنے مالک کو سمجھائیں اور شادی کر لیں لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ آج جیب کے نوٹ کا خیال آتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ گلو کے لئے ایک مالا لیتا آئے گا۔ ایک، ڈیڑھ روپے کی تو آ ہی جائے گی۔ وہ اسے دے گا اور پھر وہ آپس میں سگائی کریں گے۔ وہ خیال سے ہی جھوم اٹھا۔
بازار شروع ہو رہا تھا۔ ایک سیلون کو دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ وہ شیو کرا لے پھر خود ہی اسے ہنسی آ گئی۔ ابھی ڈاڑھی ہے ہی کہاں جو شیو کرا سکے۔ بس مسیں بھیگ رہی تھیں لیکن وہ سیلون میں داخل ہو گیا۔ سیلون بالکل خالی تھا۔
"آئیے ۔۔۔" ایک حجام اس کی طرف بڑھا ۔ "بال بنائیے گا۔"
"نہیں شیو اور مالش۔"
وہ کرسی پر بیٹھا تو اسے گدگدی سی ہوئی اور جب حجام اس کی تھوڑی پر برش سے صابن لگانے لگا تو اس کی ہنسی نکل گئی لیکن بڑے ضبط کے ساتھ بیٹھا رہا۔ استرا چلا تو عجیب قسم کی لذت سی محسوس ہوئی جس سے وہ آج تک ناآشنا تھا۔ اوپر کے ہونٹ کے اوپر جو بھورے بھورے بال تھے صاف ہو گئے۔ پھر مالش ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ ہمیشہ مالش ہوتی رہے اور وہ بیٹھا رہے۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد حجام جب اس کے رخساروں پر اسنو ملنے لگا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے شرم سی آنے لگی۔
"بس بس رہنے دو"
واہ! وہ کسی سے کیا کم تھا۔ آئینے میں وہ اپنے آپ کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر نوٹ نکال کر حجام کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چار روپے اور بارہ آنے لے کر وہ باہر نکلا۔ آج وہ اپنے آپ کو کسی اور ہی دنیا میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے چلنے لگا۔
ایک پنواڑی کے یہاں وہ رکا۔ آج وہ بیڑی کیوں پیتا! چونّی نکال کر اس نے پنواڑی کے سامنے پھینکی اور آرڈر دیا۔
"دو کیپسٹن"
پنواڑی نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر دو آنے اور دو کیپسٹن سگریٹ نکال کر دے دیئے۔
"پاکٹ دو نہ بھئی ۔۔۔" کلوے نے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔
پنواڑی نے خاموشی سے ایک خالی پیکٹ دے دیا۔ کلوے نے ایک سگریٹ اس میں رکھ کر پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

اور دوسرا وہیں رسّی سے سلگا کر ہونٹوں میں دبا لیا۔

مینار ی کی ایک دکان کے سامنے اس نے اخوک کمار اسٹال سے ایک طویل کش لیا اور سگریٹ کی گردن دبا کر اسے نیچے پھینک دیا۔ پھر بوٹ کے پیچھے تھے مسلتے ہوئے بالکل امیرزادوں کی طرح مخاطب ہوا۔ "کوئی مالا دکھاؤ تو بھی"۔

بہت سی مالائیں سامنے بکھر گئیں۔ ایک مالا اسے پسند آ گئی۔ بالکل اصلی موتی معلوم ہوتے تھے لیکن دام زیادہ تھا۔ تین روپیے اس نے دو روپیے کہا۔ ڈھائی روپیے میں سودا ہو گیا اور مالا لپیٹ کر اس کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ وہ اسے جیب میں ڈال کر آگے بڑھا۔

پھر اس نے چار آنے کا ایک رومال خریدا۔

پھر پالش کروانے کی غرض سے ایک پالش والے کے پاس چلا گیا۔ دو آنے وہاں دیئے۔ دو آنے اسے زیادہ معلوم ہوئے لیکن جوتوں کی چمک دیکھ کر دل پھڑک اٹھا۔

چوک میں جا کر اس نے سارے پیسے نکال کر دیکھے۔ دو اٹھنیاں اور تین چوانیاں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بہت کچھ خرید چکا ہے اور ابھی بہت کچھ خرید سکتا ہے۔ وہ ایک کھمبے کے سہارے کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے —— اب کیا کیا جائے —— یہ سوال بہت دیر تک اس کے دماغ میں گردش کرتا رہا۔

سامنے "لائٹ ہاؤس" میں "لیلیٰ مجنوں" چل رہا تھا وہ اندر جا کر تصویریں دیکھنے لگا۔ ابھی شو شروع ہونے میں بہت دیر تھی۔ اس نے سوچا کہ چلو دیکھ لیا جائے لیکن پھر یہ خیال آتے ہی کہ اتنی دیر گھر سے غائب رہنا ٹھیک نہیں ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس دوران میں وہ دوسرا سگریٹ بھی پی گیا۔

پھر اس نے آدھا پیکٹ اور لے لیا۔

قریب آدھ گھنٹہ وہ وہاں کھڑا بازار کا نظارہ کرتا رہا لیکن کیا کیا جائے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر اسے ایک خیال سوجھا اور اس خیال سے وہ مسرور ہو گیا۔ سامنے "انڈیا کافی ہاؤس" تھا۔ لوگ اندر جا رہے تھے۔ کیوں نہ وہ بھی اندر جائے اور یہاں کی چیزوں کا کچھ مزا چکھے۔ ہلکی ہلکی بھوک بھی تو محسوس ہو رہی ہے۔ یہ سوچ کر وہ دروازے میں چلا گیا۔

اندر بے حد بھیڑ تھی۔ عورتیں، مرد قہقہوں پہ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ باتوں سے باتیں نکل رہی تھیں۔ مسکراہٹوں پر مسکراہٹیں ابھر رہی تھیں۔

اس نے پورے ہال کا جائزہ لیا۔ بغور دیکھتا رہا۔ پھر ایک خالی میز پہ جا بیٹھا۔ لچکیلی کرسی تھی۔ اس نے دو تین بار اسے لچکایا۔ بڑا اچھا لگا۔

پھر وہ ٹیبل پہ پڑی ہوئی لسٹ دیکھنے لگا، لیکن وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ ایم یو ٹی —— مٹ ٹی اوا ین —— ٹن کے علاوہ وہ کچھ نہ پڑھ سکا۔ اس نے اسے پھر میز پر رکھ دیا۔ اتنی دیر میں بیرا آ گیا۔

"کیا چاہیئے ساب؟" —— کہاں تو وہ خوف کھا رہا تھا کہاں جیسے آسمان پر چلا گیا۔ "ساب" اسے بڑا اچھا لگا۔ اس نے امیرانہ انداز سے پوچھا۔

"گرم کیا ہے؟"

"سب کچھ گرم ہے ساب"

"تب بھی ——"

"آملیٹ، مٹن کٹلٹ، چاپ ......" بیرے نے بہت سے نام گنوا دیئے۔

اسے کچھ بھی تو سمجھ نہ آیا۔ اس کے علاوہ وہ قیمت سے ڈر رہا تھا کہ نہ جانے کس چیز کا کیا دام ہو۔ اس کی سمجھ پر "چاپ" ہی اچھی طرح آیا۔ اس کے علاوہ وہ آلو چاپ کئی بار ہوٹلوں وغیرہ میں کھا چکا تھا۔ ہوٹلوں میں اس کا دام ایک آنہ ہوتا ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ دو آنے ہوگا۔

"دو چاپ لے آؤ۔"

بیرا چلا گیا تو اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے ماچس مانگ کر سلگایا اور بڑے ٹھاٹ سے پینے لگا۔ میز کے نیچے اچھی طرح ٹانگیں پھیلا کر اس نے کرسی کو ذرا سا ٹیڑھا کیا اور کش پر کش لگانے لگا۔

تھوڑی دیر میں چاپ آگئے۔ ایک چائے کے لئے بھی کہہ دیا گیا۔

اس نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ کانٹے اور چھری سے کھا رہے ہیں۔ اس نے بھی کوشش کی لیکن پھر ہاتھ سے کھانے لگا۔ چاپ بہت مزیدار تھے۔ گوشت سے بھی مزیدار۔ اس کی بھوک اور تیز ہوگئی لیکن اس نے اسے دبایا کیونکہ وہ گلو کو ا... دینے کے لئے ستار سے ایک بکس خریدنا چاہتا تھا تاکہ گلو کو وہ سیکڑوں روپے کا مال معلوم ہو۔

چائے پینے کے بعد وہ بیرے کا انتظار کئے بغیر کاونٹر پر چلا گیا۔ بیرا اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ یعنی بل اس ہی لکھا جا رہا تھا۔ اس نے پیسے ہاتھ میں تھام لئے۔

بل اس کی طرف بڑھا یا گیا۔

اس نے نظریں اٹھائیں۔

جیسے اس پر بجلی گر پڑی۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ پیروں سے زمین نکل گئی...... سامنے اس مالک کھڑا غصہ میں بل کھا رہا تھا۔ نظروں کا ملنا تھا کہ ایک طمانچہ گال پر آکر پڑا۔

"نمک حرام..... چوری کرتے لاج نہ آئی۔"

سارے کے سارے پیسے پلیٹ میں پھینک کر اس نے ایک چھلانگ لگائی اور یہ جا وہ جا..... جب اس کو اطمینان ہوگیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں تو وہ رکا۔ ذہن میں پھر وہی سوال تھا جو کچھ دیر پہلے تھا کہ کیا کیا جائے ــــ؟ لیکن اب وہ اپنی نوعیت بالکل بدل چکا تھا اور اور پہلے سے کہیں زیادہ نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔

خواتین اور بچوں کا واحد مشترکہ ماہنامہ

کرنیں

جسے کرشن چندر۔ کیفی اعظمی۔ مرزا ادیب۔ رضیہ سجاد ظہیر۔ صالحہ عابد حسین۔ پرکاش پنڈت۔ پریم ناتھ پردیسی۔ راجہ مہدی علیخاں۔ جہاں بانو نقوی۔ سرلا دیوی۔ ہنس راج رہبر۔ جگن ناتھ آزاد۔ غلام ربانی تاباں اور بہت سے دوسرے چوٹی کے فنکاروں کا تعاون حاصل ہے۔

قیمت: سالانہ ۴ روپے فی پرچہ ۶ آنے

ایڈیٹر: شفیقہ فرحت بی۔ اے، ڈپ جے چیتا ۱۔ کرنیں نیو کالونی۔ ناگپور ۱

(نمونہ، پانچ آنے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیجئے!)

دیوانی

آمنہ ابوالحسن

سانولی رانی ـــــ اس نے ہولے سے پکارا۔

دور کہیں کلاک ٹاور نے نو بجائے ـــــ "میں جا رہا ہوں رانی" ـــــ وہ بولا اور اسے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ دھوپ میں کولتار کی سڑک چمک رہی تھی جیسے ابھی ابھی رات کے خمار کے بعد انگڑائی لے کر جاگ اٹھی ہو

وہ تیز تیز قدم بڑھاتا چلنے لگا۔ آج اس نے کار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ چاہتا تھا اپنے ذہن کی سبک رفتاری کے ساتھ اپنے قدموں کی آہنگ کو بھی ملائے اور وہ چلتا رہا ...... دفتر آیا بھی گذر بھی گیا۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ آج کسی سنسان جگہ جانا چاہتا تھا۔ ایسی جگہ یہاں وہ اپنے ذہن کا نفسیاتی تجزیہ کر سکے جہاں وہ یہ سوچ سکے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ صحیح ہے یا غلط ـــــ؟

کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے وہ سانولی رانی کو سڑک سے اٹھا لایا تھا۔ ایک پاگل لڑکی کو جسے دنیا پاگل سمجھتی تھی مگر جس میں اسے دیوانگی کا شائبہ تک نظر نہ آتا تھا۔ کیا دنیا یونہی کہتی ہے یا وہ بے وقوف بنا ـــــ یہی وہ سمجھنا چاہتا تھا۔ اس نے پائپ میں تمباکو بھر کر لمبا طویل کش لیا۔ پھر ایک گھنے پیڑ کے سائے میں بیٹھ گیا۔ اسے یہ بھی خیال نہ آیا کہ گذرتے ہوئے تانگے والے راہگیر اسے دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ اس کا سرج کا قیمتی سوٹ۔ آئینے کی طرح چمکتے جوتے۔ منہ میں جلتا ہوا پائپ، وہ ـــــ جو ایک عہدے دار تھا جو دفتر میں اپنے ماتحت بیسیوں لوگوں پر بڑی شان سے حکومت کرتا تھا ...... وہ خود آج اپنے جذبات کا محکوم تھا ـــــ

پائپ کے متواتر کشوں کے ساتھ اس نے اپنے دل کو بھی ٹٹولا۔ وہاں ایک انوکھے قسم کا پیار تھا۔ ایک ایسا جذبہ جو انانیت اور استبداد سے کوسوں دور تھا۔ کیا ہوا اگر آج وہ عہدہ دار ہے۔ کبھی اس نے بھی تو زمانے کی بے درد ٹھوکریں کھائی تھیں۔ دنیا کی نظروں میں تماشا بنا تھا۔ لوگ اسے بھی تو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ دبی دبی سرگوشیاں چبھتی ہوئی پھبتیاں۔ اڑتے ہوئے قہقہے۔ مگر اس نے ان قہقہوں کی پرواہ نہ کی۔ ان پھبتیوں کو اپنے ذہن میں داخل نہ ہونے دیا۔ شاید اسی وجہ سے ...... اسی وجہ سے محض اپنی محنت کے راستے پر چل کر وہ آج عہدے دار بن بیٹھا۔ دو آنسو اس کی آنکھوں میں آئے ـــــ ان تلخ یادوں پر ـــــ مگر وہ انھیں پی گیا۔ یہ آنسو ساگر انھیں بہنے کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ ساگر کی طرح بہتے جاتے ہیں۔ انھیں تو پہلے ہی بند باندھ کر روک دینا چاہیے۔ یہاں آنسوؤں کی ضرورت نہیں خود اعتمادی کی ضرورت ہے یہ دنیا بڑی سنگدل ہے۔ اسے محض آنسو نہیں پگھلا سکتے۔ اس پر قہقہے لگانے ہی سے وہ ٹھیک ہوتی ہے۔ "لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے" اس نے سوچا اور اطمینان سے پیر پھیلا لئے ـــــ پائپ بجھ رہا تھا۔ اس نے ڈبیا نکال کر تمباکو بھرا اور پھر اپنے خیالات میں محو ہو گیا ـــــ

یہی تو سڑک تھی جس پر سے وہ گذر رہا تھا مگر مقام یہ نہ تھا۔ دور یہاں سے دور کولتار ہی کی سڑک پر مگر پر رونق اور آباد سڑک پر اس نے سانولی رانی کو دیکھا ـــــ وہ ہاتھ پھیلائے ایک ایک سے پوچھ رہی تھی ـــــ بتاؤ میری ماں کہاں ہے ـــــ میرا باپ کہاں ہے ـــــ میرے پیار کا منبع کہاں ہے ـــــ؟

اس نے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ اس کی نظریں وحشت زدہ تھیں اور چہرہ بے رونق۔ زرد دھانے کھنڈے ہوئے

رخساروں پر کبھی کبھی آنسو ڈھلک آتے پھر وہ انھیں اپنے آنچل سے پونچھ لیتی ـــــ لوگ ہنس رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے جو زیادہ منچلے تھے۔ وہ اسے بہلا رہے تھے۔

تمہاری ماں ـــــ وہ زمین کی طرف دیکھتے ـــــ شاید اس کے اندر ہے۔

تمہارا باپ ـــــ وہ اوپر دیکھتے ـــــ شاید آسمان پر ہے۔

پھر وہ اسے بتاتے ـــــ "وہ جو اندھیری گلی ہے نا ـــــ وہاں جاؤ ـــــ وہیں شاید تمہارے پیار کا منبع ہے ـــــ وہیں جو تمہارے چہرے جیسی ویرانی اور ڈراؤنی پرچھائیاں دن بھر بھوتوں کی طرح ناچتی رہتی ہیں ـــــ جاؤ ـــــ جاؤ نا ـــــ" وہ اس کا ہاتھ آگے بڑھتے پھر چھوڑ دیتے۔ ایک ادھیڑ عاشق قسم کا آدمی بول اٹھتا ـــــ "چلو میرے ساتھ تمہارے ماں باپ دونوں میرے گھر میں" ـــــ سب ہنستے وہ سب کو وحشت زدہ نظروں سے دیکھتی۔ پھر زمین پر گر جاتی۔ اس کی ہچکیاں اس کے ہونٹوں پر مچلتیں اور آنسو خشک زمین پر گر کر جذب ہو جاتے ـــــ میری ماں ـــــ میرا باپ ـــــ وہ زور زور سے چلاتی......

لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے پھر زور سے کہتے ـــــ دیوانی ہے دیوانی ـــــ پاگل خانہ لے جاؤ اسے ـــــ اس کا دماغ چل گیا ہے......

یہی سن کر اس نے کار روک لی تھی۔ کسی انجان جذبے نے اس کے دل کی گہرائیوں میں سر اٹھا کر کہا تھا "وہ پاگل نہیں تم پاگل ہو ـــــ اسے زمین سے اٹھا لو" ـــــ اور وہ ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی میں لا بٹھایا تھا ـــــ لوگوں نے اسے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے ـــــ

گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹکی۔ اس نے پوچھا تھا ـــــ "تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو۔ کیا میرے ماں باپ یہیں دفن ہیں ـــــ اس کی آنکھوں میں کتنی بیچارگی تھی اور کیسی پیاسی ویرانی جیسے کسی نے مدتوں سے اسے پانی نہ پلایا ہو ـــــ وہ نرمی سے بولا ـــــ "تمہارے ماں باپ ـــــ میں انھیں ڈھونڈ دوں گا تم فکر نہ کرو۔ چلو......" اور وہ پریشان نظروں سے دیکھتی زینہ پر چڑھ گئی۔

اس بڑے گھر میں اس نے اپنے آپ کو بہت اجنبی محسوس کیا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی پھر خاموش ہو جاتی۔ سنگ مرمر کے ایک مجسمے کے پاس وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر پوچھا ـــــ یہ تمہیں پسند ہے ـــــ؟

اس نے سر اٹھایا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ زار زار رو رہی تھی۔

وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی سے کہا ـــــ اگر یہ تمہیں پسند ہے تو اسے لے جاؤ۔ اپنے پاس رکھ لو ـــــ مگر اسے مجسمے کو اس نے نگاہ بھی نہ لگایا لرزتی آواز میں صرف اتنا بولی ـــــ "میرے بابا کی میز پر ایسا ہی مجسمہ رکھا رہتا تھا" ـــــ پھر وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

اس نے دل میں سوچا وہ ضرور کسی اچھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ کسی متمول گھرانے کی جہاں اس قسم کی زیبائش کوئی نئی بات نہیں وہ دیر تک سوچتا رہا کہ اسے کس طرح بہلائے۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ کسی خاص سبب کی وجہ سے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی ہے۔

اس نے خاموشی سے کھانا منگوایا تھا اور پھر اس کے سامنے رکھ کر اٹھ گیا تھا ـــــ ایک لفظ تک کہے بغیر ـــــ جس آہستگی سے وہ اٹھا تھا اسی آہستگی سے لڑکی نے کھانے کی طرف دیکھا تھا پھر وہ آہستہ آہستہ نوالے اٹھاتی گئی۔ کھانا کھا کر وہ وہیں سو گئی۔ سر ٹکائے۔ بیٹھی بیٹھی ـــــ

اس نے پھر ایک بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کے نقوش میں کتنی ملایمت تھی اور کیسا پیارا رچاؤ۔ ایک لچک، ایک لہراؤ، ایک نغمگی ـــــ گردش میں آئی ہوئی، صدیوں میں دھندلائی ہوئی جیسے کوئی راگ کسی نومشق کے ہاتھوں پڑ کر بگڑ گیا ہو اور مخصوص لے کے بچھڑے ہوئے سر اس سے نکل رہے ہوں۔

وہ خاموش اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ دو گھنٹے کی مسلسل نیند کے بعد جب وہ جاگی تو جلدی سے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اپنی حالت کو محسوس کیا پھر استعجاب کی جھلک اس کی آنکھوں میں نمودار ہوئی اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا — آؤ — وہ نرمی سے بولا۔

آپ — آپ کون ہیں — اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

میں — میں ایک انسان ہوں — ڈرو نہیں یہاں بیٹھ جاؤ — اس نے کرسی بڑھائی۔ وہ بے حرکت اس پر بیٹھ گئی۔

تمہاری طبیعت اب کیسی ہے —؟ اس نے جرأت کر کے پوچھا۔

مجھے کیا ہوا ہے —؟ وہ تعجب سے بولی

کچھ بھی تو نہیں — تم شاید تھک گئی تھیں اس لئے سو گئی تھیں۔

اس نے اپنے ذہن پر بار ڈالا — وہ سوچنے لگی پھر یکایک بولی — آپ مجھے کہاں سے لائے ہیں — کہاں سے؟

تم — تم یہیں تو آئی تھیں — نہ جانے کس طرح — شاید تم کہیں جا رہی تھیں اور راستہ بھول گئیں —

میں — میں شاید اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ رہی تھی — وہ یاد کر کے بولی۔

کہاں ہیں تمہارے ماں باپ —؟ اس نے ہولے سے پوچھا تھا۔

کہاں —؟ مجھے نہیں معلوم — یہی تو میں تم سے پوچھ رہی ہوں — وہ اٹھ کھڑی ہوئی —

تم مہاجر ہو —؟ اس نے رک رک کر پوچھا۔ وہ کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ جاننا چاہتا تھا' یہ اس کے لئے ضروری تھا۔

وہ خاموش رہا۔ اس سوال کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ پھر بولا — دیکھو تم کچھ آرام لے لو بہت زیادہ غیر مطمئن معلوم ہوتی ہو۔ جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی ہم انھیں ڈھونڈھنے جائیں گے۔

سچ — اس نے غمناک آواز میں اس طرح پوچھا جیسے اسے اعتبار نہ آ رہا ہو۔

بالکل سچ — تم مطمئن رہو — وہ پھر بیٹھ گئی تھی۔

اس دن سارا وقت وہ گھر ہی پر رہا تھا۔ بہت خاموشی سے دیکھتا اور پھر اس کی حفاظت کرتا ہوا۔

پھر دو روز گزر گئے — تیسرے روز ناشتے کے وقت وہ بولی — "اب مجھے جانے دیجئے۔ میں نے آپ کو بہت تکلیف دی —" وہ اس کے مہذب لہجے اور اچانک اخلاق پر حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں تین روز پہلے والی ان کی کیفیت گھوم گئی۔ وہ بولا — "کوئی بات نہیں۔ تکلیف کاہے کی۔ تم یہ بتاؤ اب کہاں جاؤ گی —؟"

وہ اس سوال پر گھبرائی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کیا اور بولی — "یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم مگر میں ضرور ایک دن ڈھونڈھ لوں گی۔ میں نے انھیں کھو دیا ہے .... کھو دیا ہے" — اس کے جذبات پھر بھڑکے جیسے جلتی چنگاریاں بجھ بجھ کر بھڑکا رہی ہوں۔

"کیا تم میری ایک بات مانو گی — صرف ایک بات" — وہ بڑی نرمی سے بولا تھا

"کونسی —؟" اس نے خیالات سے چونک کر پوچھا۔

"کچھ دن اور ٹھیر جاؤ — پھر چلی جانا —"

وہ ایک دم گھوم کر اسے دیکھنے لگی پھر تیزی سے بولی — "نہیں — میں جاؤں گی —"

اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا اب وہ کس طرح ان بھڑکتے ہوئے جذبات کو قابو لائے۔ اسے ایک ہی صورت نظر آئی اگر وہ اصرار کرے تو وہ چپکے سے اٹھ کر اسے راہ بتا دے۔ مگر — پھر نہ جانے کیا بات ہوئی وہ آپ ہی آپ بیٹھ گئی بغیر کچھ کہے۔ اس نے گھوم کر نہ اس کو دیکھا نہ کچھ بولی صرف ہولے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں — اور پھر دن بیتتے گئے، اسے ہر روز انتظار رہا کہ وہ نہ جانے کب جانے کے لئے اصرار کر بیٹھے مگر اس نے ایک بار بھی کچھ نہ کہا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جانے کے ارادے کو بھول گئی ہو۔ وہ تعجب سے دیکھتا رہا۔ اس کی تبدیلیاں حیرت انگیز تھیں۔ اب وہ آہستہ آہستہ ایک ذی ہوش لڑکی بنتی جا رہی تھی۔ منہ سے بہت کم بولتی مگر حرکات اس کی ترجمانی کرتے۔ وہ دلچسپی سے ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ خود بھی ہم کسی نہ کسی کام میں اپنے آپ کو مصروف رکھتی۔ بس کبھی کبھی یہ ہوتا کہ اس کے چلتے ہوئے ہاتھ رک جاتے پھر وہ بڑی گہری نظروں سے دور خلاؤں میں گھورنے لگتی جیسے انھوں نے اس کا کچھ چھین لیا ہو۔ پھر چند بے جوڑ سسکیوں، چند بے ربط آنسو آنکھوں سے چھلکتے اور وہ جلدی سے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی —

ایسے وقت وہ ہمیشہ اس سے دور ہو جاتا — اس کے پاس سے ہٹ جاتا —

پھر ایک رات آئی — اندھیری اور سرد — باہر خنک ہوائیں یوگین دلیا کے بیلوں میں چلاتی پھر رہی تھیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ کسی کے فراق میں نالے بلند کر رہی ہوں۔ کہرے اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے جیسے وہ رات کے اندھیرے کو پوری طور پر اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہو اور وہ خاموش چیسٹر پہنے، مفلر کو کانوں پر لپیٹے، لحاف میں پیر چھپائے پڑھنے میں مصروف تھا۔

دروازہ اچانک کھلا — وہ اندر آ گئی۔

وہ چونکا، پھر کتاب رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بجلی کی سی تیزی سے اسے خیال آیا۔ کہیں وہ اس خوفناک اندھیری رات میں باہر جانا تو نہیں چاہتی —؟ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اس نے جھرجھری لے کر اپنے ہاتھ دستانوں میں چھپا لئے۔

"کیا بات ہے — کوئی کام ہے —؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

بغیر جواب دینے کی پروا کئے بغیر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا ہے —؟" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں" — وہ اطمینان سے بولی۔

"پھر — پھر —" وہ سوچنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

تھوڑا عرصہ خاموشی میں گزرا۔ صرف بند دریچوں پر ہوا کے برفیلے تھپیڑے محسوس ہوتے تھے اور خنکی کا احساس جو روح تک کو منجمد کرنے پر تلا ہوا تھا۔

وہ بظاہر کتاب پڑھ رہا تھا مگر کن آنکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا۔

کمرے کی سرد خاموشی میں یکایک اس کی آواز گونجی — "تم بہت مصروف ہو گیا —؟"

وہ کتاب ہاتھ سے رکھ کر جلدی سے بولا — "نہیں تو — یوں ہی کتاب دیکھ رہا تھا۔ تمہیں کچھ کہنا ہو تو کہو" بالکل اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں تمہیں کچھ کہنے آئی ہوں — سن سکتے ہو" — وہ آہستگی سے بولی۔

"ضرور" — وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"ایسی ہی ایک رات تھی" — اس نے کہنا شروع کیا — "بالکل ایسی ہی۔ باہر دیوانی ہوا چل رہی تھی

بڑے بڑے پیڑ تک اس طرح لرز رہے تھے جیسے ابھی کوئی دم میں زمین سے آلگیں گے۔ اس رات میرے گھر میں بہت بڑا جھگڑا ہوا تھا — جائیداد کا جھگڑا — میری ماں تو بچپن ہی میں مر چکی تھی مگر باپ زندہ تھا — وہ رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکے اور آواز بارِ الم سے دب کر تھرا گئی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر بڑی ہمت کر کے بولی — "وہ بہت شفیق تھے ان کے جیتے جی مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ ہوئی، مگر ہم بہن بھائیوں میں آپس میں بنتی نہ تھی۔ ہم کئی تھے مگر متحد نہیں۔ ان کی زندگی میں تو ہم بڑی یکسوئی سے جیتے رہے مگر پھر — پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ تمہیں شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ ہم سب پڑھے لکھے تھے۔ پھر بھی جو انانیت اور حکومت کا جذبہ میرے بڑے بہن بھائیوں میں بھرا ہوا تھا۔ وہ کبھی حال کم نہ ہوا۔ انھوں نے بہت کچھ دوسروں سے سیکھا مگر اپنی ان کمزوریوں کو دور نہ کر سکے وہ بات بے بات الجھتے، لڑتے اور پھر طعنوں پر اتر آتے جیسے وہ بہن بھائی نہیں، بڑے گہرے دشمن ہوں۔ بس اسی بات نے ایک بڑا طوفان اٹھایا۔ میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ میں اپنے ماں باپ کو ڈھونڈھنا چاہتی تھی۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ اس بھری دنیا میں آخر مجھے کس پر چھوڑ گئے ہیں۔ کون یہاں میرا ہے جسے میں اپنا سمجھوں۔ میں گھنٹوں روتی مگر مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا۔ میں جہاں جاتی وہیں مجھے خوف ہوتا پھر لوگوں نے میرا تماشہ بنا لیا۔ وہ ہر طرف سے مجھے گھیر لیتے اور مجھے خود محسوس ہوتا جیسے میں ایک جیتا جاگتا تماشہ بن گئی ہوں۔ میرے بہن بھائی ایک روز مجھے پکڑ لے گئے۔ انھوں نے کئی روز تک مجھے بند رکھا۔ پھر میں ایک روز موقع پا کر چپکے سے نکل گئی۔ میرا اب وہاں دل لگتا تھا جیسے خونی سپاہی سنگین اٹھائے ہر طرف پہرہ دے رہے ہوں۔ جیسے کوئی اپنا نہ ہو سب بیگانے سب اجنبی۔ یہاں تک کہ جھاڑ پات پھول پھل دھوپ چھاؤں سبھی کچھ مغموم لگتے"...... وہ خاموش ہو گئی — صرف اس کے ہاتھ لرزتے رہے اور ہونٹ کپکپاتے —

"پھر —" اس نے محویت سے چونک کر پوچھا تھا۔

"پھر — میں نے کہا نا میں نے گھر چھوڑ دیا۔ میں نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا مجھے وہاں ڈر لگتا تھا، پکڑے جانے کا خوف — یہاں چلی آئی اور اپنے ساتھ ایک ہی چیز لائی — ایک ہی چیز — اس نے پلو سے ایک تصویر نکالی — یہ میرے بابا ہیں —" وہ بولی —

اس نے جھک کر دیکھا۔ ایک معمر سا آدمی اپنے نقوش میں بہت کچھ اس کی جھلکیاں لیے اطمینان سے کرسی پر نیم دراز تھا۔ چہرہ بڑا باوقار مگر مسکراہٹ بڑی نرم ملائم اور تیکھی — اس نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے کر پوچھا تھا — ہم اس کو آنلارج کروائیں گے ہاں۔"

"سچ — ؟" وہ مسرور ہو گئی۔ پھر منہ بنا کر بولی "کہیں تم مجھے دھوکا تو نہیں دے رہے ہو۔ کہیں تم اس تصویر کے ساتھ مجھے پولیس میں تو نہیں مشتہر کرا دو گے — ؟" اس وقت اس کی آنکھوں میں کتنی خوفناک چمک تھی۔

"پگلی — اس نے ہنس کر کہا تھا — کیا تم اتنا ڈرتی ہو — ؟"

"ہاں — اب تو مجھے اپنے آپ سے بھی خوف آتا ہے —" وہ سہم کر بولی۔

"تم مجھ پر بھروسہ رکھو میں حیوان نہیں —" اس نے اعتماد اور خوشی سے مغرور ہو کر کہا تھا۔

پھر وہ تصویر انلارج کروا لایا۔ اس پر ایک بڑا سا زریں ہار ڈال کر جب وہ تصویر اس کے کمرے میں لے گیا تو اس نے بے اختیار تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی اور دیر تک اس سے تقاتل پیار بھری نظروں سے تصویر کو دیکھتی رہی پھر وہ تشکر کے بوجھ سے دب کر اس کے قدموں پر گر پڑی تھی — پگلی —

وہ اس دن کتنا مسرور رہا۔ اس نے سوچا۔ لین دین بھی ایک تہذیب ہے۔ ہم لیتے بھی ہیں دیتے بھی۔ اس میں نہ تشکر ہونا چاہئے نہ احسان بلکہ صرف دوستی۔

اور یہ دوستی کا جذبہ اس کے لئے کتنا نیا ثابت ہوا، کتنا زندگی سے بھرپور۔ اس کا پتہ بعد چلا —
تمہارا نام کیا ہے —؟ اس نے اس روز پہلی بار اس سے پوچھا تھا۔
نام تو میرا مہر نگار ہے مگر وہ مجھے سانول رانی کہتے تھے — میں سانولی ہوں نا — وہ مسکرائی
اچھا — وہ خود بھی مسکرایا۔
یہ مسکراہٹ اس کے روم روم سے نکلی تھی جو اس کی روح میں پیوست ہو گئی۔
سچائی — اس عریاں حالت میں کتنی صاف شفاف، روشن اور مزین تھی۔ اس بے داغ ضمیر کی طرح جس پر خون کا ایک چھینٹا بھی نہ پڑا ہو — ہوا سے چند پتے گرے — وہ چونکا — سوچتے سوچتے گھنٹوں گزر چکے تھے۔
اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اس کی پیٹھ جھاڑ کے تنے سے لگے لگے اکڑ چلی تھی۔ اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ پائپ بجھ چکا تھا۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے جیسے ہزاروں ٹن بوجھ رکھ دیا گیا ہو۔ جیب سے ڈبیا نکال کر اس نے تمباکو بھرا اور دیا سلائی کھینچ کر لگا دی — ایک شعلہ ابھرا — پہلے سنہری پھر ہلکا نیلا اور بجھ گیا — پائپ آگ پکڑ کر سلگ رہا تھا، دھیرے دھیرے جیسے اس کا دل پہلو میں دھڑک رہا تھا — راستہ بالکل سنسان تھا۔ کوئی راہگیر بھی اس وقت سڑک پر نہ تھا، البتہ کولتار میں نہائی سڑک اب بھی دھوپ میں اس طرح چمک رہی تھی جیسے ان آتشیں کرنوں میں غسل کرنا صرف اسی کی ہمت ہو۔
وہ مسکرایا — سانول رانی — اس نے سوچا — وہ کب تک رانی رہے گی۔ بنت مریم —!! کیا شادی کے بعد وہ ہالہ اس کے چہرے کے اطراف نہ رہے گا جو اب پڑا ہوا ہے — پاکیزہ — پرنور...... ایک لمحے کو اسے خوف ہوا کہیں اس کے ورثا اسے چھین نہ لے جائیں — وہ کانپا — بڑی زور سے پھر اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں جیسے اپنے ذہن کی پوری قوتوں سے جائیداد کے مسئلوں کو سلجھا رہا ہو۔ گرم ہوا کا ایک بھبکا اس کے چہرے کو لگا وہ ہوش میں آ گیا۔ اسے اپنی حالت پہ ہنسی آئی — کیا اب وہ خود پاگل ہو رہا تھا؟ — اس نے قہقہہ لگایا اور اطمینان سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا — دروازہ بند تھا — اس نے زور سے کھٹکھٹایا — رانی — دروازہ کھولو — دروازہ کھولو — اور پھر — وہ ایک ایسے شدید جذبے کے تحت مجنونانہ انداز میں اندر گھسا جیسے سب کچھ اپنی آغوش میں لے لے گا —

(تیسری قسط)

ماں

پرل بک

ترجمہ: جسٹس احمد محی الدین انصاری

(۳)

جب نئی کاشت کی سیم کی بیلوں میں پھول نکل آئے۔ پھلیاں بننے لگیں اور "گرڈر" کے پودے جو انھوں نے تیل نکالنے کی خاطر بو رکھے تھے لہلہاتے ہوئے پیلے پیلے پھولوں سے جھومنے لگے اور ساری فضا بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔ ماں کے چوتھا بچہ پیدا ہوا۔ ان کا رہنا شہر یا قصبہ کا ہوتا تو وقت پر کوئی دایا اجرت پر بلوائی جاتی۔ اس گاؤں میں تو کوئی دایا تھی بھی نہیں۔ ایسے چھوٹے دیہاتوں میں پاس پڑوس والیاں ہی ایک دوسرے کے اڑے وقت کام آجاتی ہیں اور بڑی بوڑھیاں صلاح مشورہ دیتی اور نگرانی کرلیتی ہیں۔ بڑی بوڑھی عورتوں کا وجود بھی غنیمت ہی ہوتا ہے۔ بچہ کا پیدا ہوتے ہی پھنس جانا یا غلط طور پر باہر آنا یا اسی قسم کی کوئی اور پیچیدگی ناتجربہ کار ماؤں کے لئے بڑی کٹھن ہوتی ہے اور بعض اوقات بڑی بدحواسی اور سراسیمگی کا موجب۔ ماں تو ہاتھ پاؤں کی بہت مضبوط تھی اور سخت سے سخت درد برداشت کرلیتی مگر خوش نصیبی سے کوئی پیچیدگی اور دقت پیش ہی نہ آئی۔ بچہ آسانی سے پیدا ہوا۔ پچھلی مرتبہ جبکہ اس کا تیسرا بچہ کچھ قبل از وقت پیدا ہو گیا تھا وہ تیار نہیں تھی اور بالکل تنہا تھی۔ مگر اس نے اس ناگہانی بپتا کو اچھی طرح جھیل لیا البتہ اس پر ہاتھ ملتی اور آنسو بہاتی رہی کہ نو ماہ کی مشقت اکارت گئی اور بچہ جی نہ سکا۔

بھاوج سے اوس کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ اسے بلا لیتی اور اس کے وقت پر خود مدد کے لئے جاتی تھی۔ آج بھی موسم بہار کے مسرت بخش اور سکون پرور سمے میں جبکہ چاروں طرف چین اور اطمینان کی فضا طاری تھی وہ حسب معمول اپنے کھیت میں "کھجائی" کر رہی تھی۔ دفعتاً اس کو متوقع وقت نزدیک آتا دکھائی دیا۔ کھجائی کا "بکھرن" لے کر وہ گھر لوٹی۔ اس کو دیوار سے لوٹا کر راستہ کے اس پار بھاوج کو آواز دی جو تالاب کے پاس کپڑے دھو رہی تھی۔ یہ ایک نیک طینت اور ہمدرد عورت تھی۔ گول چوڑا سا چہرہ، پھولے ہوئے کشادہ نتھنے، بڑی سی ناک اور مضبوط جبڑے اس کے اولوالعزم ہونے کا پتہ دیتے تھے۔ رنگ پھیکا پھیکا زردی مائل تھا مگر لب سرخ اور موٹے موٹے۔ یہ ایک بکواسی ٹائپ کی عورت تھی۔ شوہر اس کا خاموش سا اور چپ چاپ کام کرنے کا خوگر تھا مگر یہ خوب بڑبڑاتی رہتی تھی۔ وہ ماں کے بلاوے پر دوڑتی ہوئی آئی اور ایک کٹورا دونا اپنے ساتھ لائی۔ آتے آتے کبھی اس کو پکارا، کبھی اس کو آواز دی پھر پاس آکر کہنے لگی:

"بی بی میں دعا مانگتی رہتی تھی کہ میری اور تمہاری زچگی کبھی ایک ہی زمانے میں نہ ہو۔ بھلا ہوا نا، دیکھو اس وقت مجھے فرصت تھی۔ میرے تو ابھی کچھ اور دن باقی ہیں۔ میں ڈر رہی تھی کہ نہ جانے کس کا پہلے وقت آئے۔ چلو تمہارے فارغ ہونے کا وقت پہلے آگیا۔ تمہیں بھی فراغت ہو جائے گی اور مجھے بھی اطمینان رہے گا۔"

اس گڑبڑ میں پاس پڑوس کی کچھ عورتیں جمع ہو گئیں اور کہنے لگیں

"کیا تمہارے درد شروع ہو گئے ہیں؟ نیک بخت بی بی خدا تم کو مبارک کرے اور چاند سا فرزند دے"
ایک ہمسائی جو بیوہ تھی اور لاولد، اور ذرا جھگڑالو واقع ہوئی تھی بولی:—

"بہن جب تک میاں سلامت ہے خوب سے بچے جن لو۔ مجھ غریب کو دیکھو بچہ کی اتنی آرزو دل میں ہے مگر پہلو میں مرد نہیں"

ماں یہ سن کر مسکرا دی، سوائے شکریہ کے اور کوئی جواب نہ دیا۔ اب اس کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی وہ اندر جا گئی بوڑھی ساس خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی تھی اور جامہ سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ پوپلے منہ سے بڑبڑاتی ہوئی بہو کے پیچھے چلی۔

"میں سدا اچھی رہی ہوں بی بی۔ میرا جب کبھی زچگی کا وقت آتا ...... اور ہاں میرے تو نو بچے ہوئے تھے نا ..... کیسے مضبوط، صحیح سالم اور توانا ..... یہ بچے کس طرح کھیلتے کودتے پروان چڑھے ...... ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی بی بی—"

مگر کوئی اس کی بکواس پہ کان دھرتا نہ تھا۔ ماں ایک چوکی پہ دم لینے بیٹھ گئی۔ چہرے پہ سے بال ہٹائے اور جوڑا کھول کر بال صاف کرنے لگی۔ اس کے ہاتھوں سے پسینہ چھوٹنے لگا تھا۔ یہ کھیت کی تکان کا پسینہ نہ تھا۔ جب اس نے کرتے کے دامن سے اپنا منہ پونچھ لیا تو پھر کھلے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا باندھا۔ درد شدت سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی حالت اضطراب میں وہ متوقع وقت کا انتظار کرتے ہوئے لیٹ گئی۔ بڑھیا پاس ہی بیٹھی تنگ لیتی رہی مگر بھاوج اس کا خیال ہٹانے اور دل بہلانے کے لئے ہنسی مذاق کرتی جاتی۔ ماں درد کرب سے نڈھال چپ چاپ تھی۔ کبھی تو مارے درد کے دوہری ہو ہو جاتی۔ کمرہ کا دروازہ بھاوج نے اندر سے بند کر رکھا تھا۔ بچہ جو باہر رہ گیا تھا یہ غیر معمولی بات دیکھ کر گھبرا گیا اور لگا دروازہ پیٹنے اور بلبلانے۔ وہ رو رو کر چلا رہا تھا۔

"میری ماں کو اندر کیوں بند کیا گیا ہے دروازہ کھول دو۔"

ماں نے کہا— "موئے کو باہر ہی کھڑا رہنے دو" اس وقت تو مجھے کمبخت چین ملتا۔"

بھاوج نے دروازہ کی شگاف سے اس کو چمکارا اور سمجھایا کہ دم بھر چپ رہو بیٹا۔ تمہاری ماں کام میں مصروف ہے۔ بڑھیا نے بھی اندر ہی سے ہاں میں ہاں ملا دی اور لاکھ بچہ کو سمجھایا مگر وہ کب ماننے والا تھا۔ دادی نے ہزار کہا کہ "چپ رہ بیٹا! میں تجھے مٹھائی کھانے کے لئے پیسہ دوں گی۔ ذرا ادھر ادھر کھیل کود کر آ۔ پھر دیکھ تیری ماں ایک ننھا منا چاند سا کھلونا تجھے دیتی ہے—" لیکن بچہ بچہ ہی ہے۔ جب ایک مرتبہ وہ ضد کرنے لگے تو پھر اس کو سمجھانا کارے دارد ہے۔ وہ اس طرح بے وقت دن میں گھر کا دروازہ اس مضبوطی سے بند ہوتا دیکھ کر ڈر گیا تھا کہ نہ جانے میری ماں کو کیا ہو گیا؟ وہ کیوں تڑپ رہی ہے۔ وہ دروازہ کھولنے کے لئے بدستور ضد کرتا رہا۔ دیکھا دیکھی بچی بھی بھائی کے ساتھ فریاد میں شریک ہو گئی اور دونوں مل کر ننھے ننھے ہاتھوں سے دروازہ پیٹ کر چلانے لگے۔ ایک طرف اپنی تکلیف اس پر بچوں کا یہ رونا چلانا۔ ماں سے ضبط نہ ہو سکا۔ غصہ سے جھنجھلا گئی۔ اٹھ کر دروازہ پہ آئی اور کواڑ کھول کر لونڈے کے دو ہاتھ رسید کئے اور بولی— "نامرادو سب مارے ہیں۔ مانتا ہی نہیں۔ میں کیا مر گئی ہوں جو تو اس طرح چلا رہا ہے۔ ناحق میرا ہلکان کر رہا ہے۔ ناشدنی ایک تو تھا ہی اب دوسرا بھی آ رہا ہے۔ تم دونوں مجھے کیا جیتا رہنے دو گے! میری جان لے کر چھوڑو گے۔"

مارنے کو تو غصہ میں اس نے بچہ کو مار دیا مگر پھر بچوں کی سہمی ہوئی حالت پہ دل بھر آیا۔ وہ لڑکے کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولی— "خیر آتا ہے تو اندر آ جا اور دیکھ لے یہاں کوئی تماشا نہیں ہے—" بچہ یہ سن کر مبہوت سا ہو گیا تھا

اس کے قدم بھی نہ اٹھ سکے۔ ماں بولی ــــ "بھابی دروازہ کھولا ہوا ہی چھوڑ دو۔ بچے مجھے گھر کے اندر بند بیٹھے دیکھنے کے عادی نہیں۔ خواہ مخواہ ان کا خون خشک ہو رہا ہے" ــــ بچے اندر لائے گئے۔ وہاں تھا ہی کیا؟ چچی کو غصے سے گھورتے دیکھ کر لڑکا گھبرا گیا۔ فوراً بہن کا ہاتھ پکڑ کر لگا بھاگنے۔ بچی نے جو اندھیرے میں آنکھیں مل مل کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی کوئی مزاحمت نہ کی اور بھائی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اب سب ہی خاموش بیٹھے وقت کا انتظار کرتے رہے۔ ماں درد اور تکلیف سے بیقرار اور مضمحل تھی مگر دانت بھینچے ہوئے خاموش لیٹی رہی۔ آس پاس والیاں اپنے اپنے گھر کے ذکر اذکار اور گپ شپ میں مصروف تھیں۔ خاص کر اس شخص کے حالات کا بڑے مزے لے لے کر تذکرہ ہو رہا تھا جو سڑک کے اس کنارے علیحدہ رہتا تھا۔ کیا لت تھی اسے جوے بازی کی۔ کیسے وہ گھر بار اور کھیت کا کام کاج چھوڑ چھاڑ بیوی سے لڑ جھگڑ کر کنبہ کی ساری پونجی لے لوا چمپت ہو گیا تھا۔ اس کی بےبس بیوی کیا روک سکی۔ ایک جھٹکا دے کر چلتا ہوا۔ وہ بیچاری واویلا کرتی ہوئی دروازہ پر کھڑی دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کا دکھڑا سب نے سنا تھا۔ بھاوج بولی ــــ "ایسا بھی تو نہیں کہ سوا کچھ پیسہ جیت کر کبھی بال بچوں کے لئے لاتا ہو۔ منحوس، بدقسمت ایسا تھا کہ بازی میں ہمیشہ ہار اسی کی ہوتی مگر احمق برابر کھیلنے جاتا" ــــ بڑھیا کو جو موقع ملا ایک آہ سرد بھر کر اس نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ زمین پر پیک تھوک کر بولی ــــ

"واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔ آدمی کبھی ہارے تو کبھی جیتے بھی۔ یہ بھی کوئی کھیلنا ہے کہ ہمیشہ ہارتا ہی جائے۔ سچ ہے بی بی بعض لوگ بڑے ہی بدبخت ہوتے ہیں اور سدا ہارتے ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ میرا لال ایسا نہیں۔ وہ کھیلتا کم ہے مگر جب کھیلنے جاتا ہے کچھ جیت کر ہی لاتا ہے۔"

ماں کے درد اور تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا اور بالآخر درد و کرب کی انتہا ہو گئی۔ بھاوج نے بڑھ کر اس کو سنبھالا اور ٹھیک سے لٹا کر نومولود کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر صاف کپڑے سے اس کو پونچھ پانچھ کر اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد آواز دی ــــ "مبارک ہو بہن۔ بیٹا مبارک" ــــ ماں بھی کچھ سنبھلی اور حواس جمع کئے۔ ہمت کر کے دوسروں کے سہارے سے اٹھی اور پلنگ پر جا لیٹی۔ پیہم تکلیف اور اتنی صعوبت کے بعد اب جو سکون ملا وہ فوراً سو گئی۔ اور دیر تک سوتی رہی۔ اس اثنا میں بھاوج نے پانی گرم کیا۔ بچہ کو نہلا دھلا کر صاف کپڑے میں لپیٹ کر ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔ ماں کچھ ایسی تھکی ہوئی اور مضمحل تھی کہ غفلت میں اس کو مطلقاً خبر نہ ہوئی۔ بچہ کی ننھی ننھی چیخیں بھی اسے بیدار نہ کر سکیں۔ بھاوج نے سب کام کر دیا اور کمرہ صاف کر کے اپنے گھر چلی گئی۔ جاتے ہوئے بڑھیا سے کہہ گئی کہ بہو بیدار ہو تو ذرا مجھے آواز دے لینا۔ میں آ کر زچہ کو کھلانے پلانے کا بندوبست کر جاؤں گی۔ کچھ دیر بعد لڑکا چھوٹے بچہ کو دیکھ کر چچی کے پاس آیا اور بولا ــــ "چچی تمہیں معلوم ہے میرے ہاں ایک ننھا منا بھائی آیا ہے" ــــ تو وہ شوربہ کا پیالا بچے کو تھماتے ہوئی بولی ــــ "ارے پگلے! بچہ کہاں سے آیا ہے معلوم بھی ہے تجھے؟ میں نے ہی تو تم لوگوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے تیری ماں کو لا کر دیا ہے" "یہ تو میرے لئے ہے، میری بہن کے لئے بھی ایک لا دو نا چچی!" ــــ اس نے چچی سے فرمائش کی اور شوربہ پینے لگا۔ وہ غور کر رہا تھا کہ کیا سچ مچ یہ بچہ اب ان کے ہاں رہ جائے گا۔ کہیں کوئی اسے واپس نہ لے جائے۔ چنانچہ وہ پوچھ بیٹھا ــــ "چچی اب ہم اس بچہ کو رکھ لیں یا تم اسے لے کر جاؤ گی" ــــ اس معصومانہ سوال پر ساری عورتیں ہنسنے لگیں۔ بڑھیا نے بھی سب کے ساتھ قہقہہ لگایا مگر پھر اسے افسوس بھی ہوا کہ میرا پوتا اتنا احمق نکلا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ بہت ہوشیار ہے۔ ماں کی پچھلی کیفیت اور موجودہ حال دیکھ کر سمجھ گیا ہوگا کہ بچہ کہاں سے آیا ہے"!

ماں اب جاگ گئی۔ بھاوج نے اسے بھی ایک شوربہ کا پیالا لا دے دیا اور وہ احسان مندی سے بولی ــــ "تم بھی کتنی

نیک ہو بھائی! میرے اڑے وقت کتنا کام آئیں۔ میں کیسے اس مہربانی کا شکریہ ادا کروں؟" ـــــ اس پر وہ بولی نے "بھائی اس میں مہربانی اور شکریہ کی کون بات ہے۔ تم بھی ہمیشہ میرے اڑے وقت کام آتی ہو۔ وہ انسان ہی کیا جو ایک دوسرے کے کام نہ آئے۔"

الغرض دونوں بھابیوں میں باہمی ہمدردی اور محبت و خلوص کا اضافہ ہوتا گیا اور احسان مندی کے تعلقات بڑھتے رہے اور ہمیشہ سچے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کی مدد کرنا ان کا شیوہ اور خوشی، غمی میں ایک، دوسرے کے شریک رہنا ان کا شعار تھا۔

(۴)

یہ تھا بی بی کا حال مگر میاں کے رنگ کچھ اور ہی تھے۔ زندگی کی بے کیفی اور یکسانیت اسے مطلقاً نہ بھاتی۔ کولہو کے بیل کی طرح ہر روز وہی کام اور وہی خستگی اور تکان ہی۔ نئے بچے کی پیدائش بیوی کے لئے تو نئی مسرت اور نئی مصروفیتوں کا سامان لاتی مگر میاں کی زندگی میں کوئی خوش آئند تبدیلی نہ پیدا کر سکی۔ جیسا ایک بچہ ویسے ہی دوسرا۔ پالنے پوسنے کھلانے پلانے اور پیٹ دان چنے جانے کا فکر جُدا اور ان کی دکھ بیماری کے افکار مستزاد۔ پھر یہ بڑے ہوں گے، شادی بیاہ کریں گے اور خود بچے جنیں گے۔ غرض جہاں دیکھو بچے ہی بچے اور ان کا سلسلہ لامتناہی۔ اسی گاؤں میں وہ خود پیدا ہوا تھا۔ یہیں بچپن بیتا جوانی آئی مگر سوائے اس کے کہ کبھی کبھار پہاڑیوں کے اس پار ندی کے کنارے جو بڑا قصبہ تھا وہاں "سودا سلف" لینے چلا جاتا۔ اس کی دنیا اسی گاؤں کے مزرعوں اور کہساروں تک محدود تھی۔ مشاغل بھی ہمیشہ یکساں اور بے لطف رنج آنکھ کھولی تو دیکھا وہی دنیا ہے۔ وہی زمین، وہی آسمان جو کل تھا۔ وہی میدان وہی کھیت۔ صبح سے شام تک ہل جوتتا رہتا شام میں پیچھے کی طرف وہی پہاڑیوں کا نہ بدلنے والا منظر اور سامنے وہی ٹوٹا پھوٹا خس پوش جھونپڑا جہاں پیدا ہوئے اور بڑے ہو کر جوان ہوئے۔ ہاں اسی خستہ حال گھر میں جہاں بچپن میں تو ماں باپ کے سونے کے لئے پلنگ بچھ جاتا تھا مگر جیسے جیسے شعور آیا گھر کے دوسرے حصہ میں چٹائی کا بستر نصیب ہوا۔ جب وہ خود بڑا ہو گیا شادی ہوئی اور گھر بار اپنا ہوا۔ بیوی بچوں کے ساتھ وہ خود پلنگ پر سونے لگا تھا اور گھاس کا پلنگ اور چٹائی کا بستر بوڑھی ماں کے حصہ میں آیا بس یہی تبدیلیاں تھیں اس کی زندگی کی۔ ورنہ ہر چیز جس طرح بچپن میں تھی اب بھی ہے۔ وہی چولہا، وہی برتن، وہی پلنگ، وہی بستر، وہی رضائی۔ شادی پر البتہ چند نئی اشیاء کی صورت نظر آئی اور گھر میں چند چیزوں کا اضافہ ہو گیا۔ طاق میں ایک شمعدان اور مقوے کی بنی ہوئی ایک نئی مورتی آئی۔ یہ مورتی دولت کے دیوتا کی تھی۔ کاریگر نے اس کا چہرہ بڑا ہی ہنستا، بشاش اور ہنس مکھ بنایا تھا۔ اسے سرخ، سبز، زرد، نیلے، رنگ برنگ کے کپڑوں میں ملبوس رکھا جاتا مگر اس کے باوجود گھر والوں کی قسمت میں کوئی خوش آئند تبدیلی ہوتی نظر نہ آتی۔ ان کے چہرے ویسے ہی زرد اور بے رونق رہے۔ نہ دولت ملی نہ خوشحالی۔ نہ سکھ میسر ہوا نہ فارغ البالی۔ وہ دل ہی دل میں اس دیوتا کو دیکھ کر کڑھتا اور برا بھلا بھی کہہ ڈالتا۔ "اسی نے بچاری یعنی گھر کے رہنے والے تو نکبت و افلاس اور گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور دولت کا دیوتا اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا ہے۔" وہ کبھی تو صاف کہہ دیتا کہ "رحم و ہمدردی تو تم میں نام کو نہیں دکھائی دیتی۔ تمہارا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ پھر بس یہ سے تمہارا مسکرانا اور ہنستا ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے"

کبھی سجا۔ وہ کبھی منانے کے لئے پاس کے قصبہ میں چلا جاتا یا بارش کے دنوں میں جب کھیت پر کوئی کام نہ ہوتا وہ گاؤں کی ہوٹل میں جا کر نکمے دوستوں کے ساتھ ایک دو شیشہ سرکی یا تاڑی کھینچ لیتا۔ بس یہ ایک تبدیلی تھی مشاغل کی تو بس یہ وہ کم کبھی جاتا۔ وہاں سے گھر پہنچتے تو پھر وہی بیوی، وہی بچے، بیوی ایسی جو ہر حال میں ... [illegible]

دیکھ کر اس کا دل بیٹھ جاتا۔ وہ اپنے جی میں کہتا "تف ہے ایسی زندگی پر۔ صبح کی نیند حرام۔ سویرے جلدی اٹھو۔ ین جوتو۔ زمین بھی کس کی؟ سوائے اس کے ایک خاندانی ٹکڑے کے باقی سب زمیندار سے قول پر لی ہوئی۔ جس پر محنت تو یہ لوگ کرتے ہیں اور وہ شہر میں آرام سے بیٹھا مزے اڑاتا ہے اور فصل پر غلہ لینے وہ یا اس کا مختار آموجود ہوتا ہے۔ اس کے باپ دادا اسی زمین پر محنت کرتے آئے تھے۔ جو حالت ان کی تھی آج اس کی بھی ہے۔ دن بھر محنت کرو، شام کو گھر لوٹو۔ کھانے کو کیا ہے وہی دال بھات۔ ادنیٰ قسم کی غذا۔ اچھے چاول اور عمدہ غلہ علیحدہ اٹھا کر رکھ دینا پڑتا تاکہ بیچ باچ کر دوسری ضروریات پوری کی جاسکیں۔ ورنہ ادنیٰ اناج کے دام کتنے؟ غرض جو میسر ہو زہر مار کر دو اور پیٹ کی آگ بجھاؤ۔ تھک تھکا کر پڑ رہو۔ صبح وہی بیل کا جوا کندھے پر۔ پھر کھیتوں سے پیداوار بھی تو پوری نہیں ملتی۔ بڑا حصہ زمیندار کو دے دینا پڑتا ہے اور کچھ نذرانہ اس کے علاوہ کارندے کے لئے۔ جب اس کارندہ کا اس کو خیال آ جاتا.... تو اس کے سینہ پر سانپ لوٹ جاتا اور جی جل اٹھتا...... وہ سوچتا کہ کاش میں بھی ایسا مختار اور بے فکر ہوتا ہرہ خوش خوش۔ لباس اچھا اور قیمتی۔ شہر کی بافراغت زندگی۔ ہلکا پھلکا کام، نذر نذرانے۔ سواری، شکار کی سقت اور ہر طرح کا عیش و آرام!

ایسے دنوں میں جبکہ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے وہ کچھ چڑچڑا ہو جاتا اور بیوی سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا۔ ذرا ذرا سی بات پہ بگڑ بیٹھتا۔ وہ اول تو طرح دے جاتی۔ مگر تنگ ہو کر جب طیش میں آ جاتی ڈانٹ ڈپٹ کر بیوی کو خاموش کر دینے میں کامیاب ہو کر اسے کچھ تسلی ہو جاتی اور دل کی کچھ بھڑاس نکل جاتی۔ بیوی بھی مصلحتاً یا لاآخر رفع شر کے لئے چپکی ہو جاتی۔ ورنہ تھی وہ بھی تند مزاج اور تیز زبان۔ بھاگتی میں کبھی میاں سے نہ دبتی۔ بچوں کا معاملہ البتہ کچھ اور تھا۔ بچوں پر وہ شاذ و نادر ہی غصہ کرتی۔ ان کے ساتھ ماں کا برتاؤ نہایت نرم اور شفقت آمیز ہوتا۔ میاں بیوی کے لڑائی جھگڑے عموماً دیرپا نہ ہوتے۔ میاں دیر تک غصہ کی پرورش نہ کرتا۔ بیوی کو منہ پھلائے دیکھ کر میٹھی باتوں سے پھر منا لیتا۔ مگر جب وہ بچوں کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھتا۔ ڈانٹ ڈپٹ کرتا یا ان کے رونے چیخنے پر طمانچہ رسید کر دیتا تو بیوی برداشت نہ کر سکتی۔ آگ بگولہ ہو جاتی۔ بچوں کے معاملہ میں وہ شیرنی کی طرح تھی۔ جھپٹ ہی تو پڑتی۔ اس کی نظروں میں بچہ بچہ ہی تھا۔ اس کا قصور کیا اور باز پرس کیسی؟ میاں کو بہرحال زیادتی کا قصور وار ٹھہرالی اور میاں کے لئے یہ احساس شدید ناگوار اور ناقابل برداشت ہو جاتا کہ عورت کی نظر میں بچے ہی عزیز ہیں اور میاں کی کوئی ہستی نہیں۔

ایسی ہی گھریلو ناچاقیوں کے دنوں میں چند روزہ چھٹیاں ہی، جو تہواروں کے موقعوں پر یا جاڑوں کے بیکاری کے ایام میں نصیب ہوتیں کچھ بے مزہ ہی گزرتیں۔ وہ یا تو دن بھر اینڈتا پڑا رہتا یا جی چاہا تو ہوٹل جا کر ایک دھیالی چائے پی اور یار دوستوں سے جوے کے دو چار داؤں کھیل لئے۔ جوے کے معاملے میں وہ کچھ قسمت کا دھنی انہوا تھا۔ گھر سے جو کچھ لے جاتا اس سے کچھ زیادہ ہی لے آتا۔ وہ اگر تن تنہا ہوتا۔ بال بچوں کا فکر۔ گھر بار کے جھگڑے اور کھیت کی مشقت اس کے سر نہ ہوتی۔ تو شاید جوے بازی ایک سہل اور کامیاب طریق زندگی ہوتا مگر فرصت اب اسے کہاں میسر تھی۔ محنت نہ کرے تو کنبہ کا پیٹ کیسے پلے۔ کبھی کبھار وہ جو ایک دو داؤں کھیل لیتا اس میں بار بار دوستوں کی واہ واہ اسے بڑا مزہ دیتی گو وہ محنت بھی ضرورت کے مطابق ہی کرتا مگر پھر بھی کام اس کا سب ہی تھا۔ اس کے باوجود اس کی سبک اور نازک انگلیاں بھدی اور سخت نہ ہوئیں اور پانسہ پھینکے کی میں کوئی فرق نہیں آیا

ادھر ماں سدا اپنی ہی دھن میں رہتی۔ اس نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ بچوں کے باپ کے جی میں کیا کیا آرزوئیں ہیں اور کن کن منصوبوں کی وہ دل میں پرورش کر رہا ہے۔ جوئے بازی بیوی کو پسند نہ تھی۔ وہ دیکھتی کہ میاں کھیل کا شائق ہے اس کو لت پڑ جائے گی مگر یہ سوچ کر کہ اس کا جی بہلتا ہے اور کوئی مالی نقصان بھی نہیں تو........ وہ کوئی روک ٹوک نہ کرتی۔ دوسری عورتوں میں جب وہ مل بیٹھتی تو سنتی کہ انھیں ہمیشہ یہی رونا رہتا ہے کہ ان کے خاوند کس طرح ہوٹل میں جا کر اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی ٹھوکر آتے ہیں۔ ماں یہ سن کر کچھ فخر سا محسوس کرتی۔ کئی بار دوسری عورتیں کہتیں کاش میرا نامراد شوہر بھی تمہارے میاں کی طرح پانسہ پھینکنے میں مشاق اور سبکدست ہوتا! بھابی تمہارا میاں تو استاد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جادو ہے اس کی انگلیوں میں۔ ایسا جادو کہ جوے کی بازی کا پیسہ بس اسی کی طرف کھنچتا چلا آتا ہے۔ یہ سن کر وہ مسکراتی اور خاموش ہو جاتی۔ اسے تسلی ہوتی کہ چلو کم از کم اس بارے میں تو مجھے اپنے میاں سے شکایت کا کوئی محل نہیں ہے۔

میاں کی اور حرکتوں پر جہاں وہ گرم ہو جاتی اور گھر سر پہ اٹھا لیتی اچھی طرح کھیت پر پورا وقت مسلسل اور پیہم محنت نہ کرنے کا اسے شوہر سے گلہ نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مرد عورتوں کی طرح پیہم اور مسلسل محنت نہیں کیا کرتے۔ بچوں کی مانند ایک ہی کام سے ان کا جی گھبرا اٹھتا ہے۔ وہ ابھی کام ہی کر رہی ہوتی کہ میاں "بکھر" چھوڑ چھاڑ کہیں سایہ میں گھاس پر لیٹ جاتا اور تھوڑی دیر اسی طرح پڑا رہتا۔ زبان کی وہ تیز تھی مگر دل کی بری نہ تھی۔ جب کبھی اس کاہلی پہ وہ میاں کو ملامت کرتی اور وہ ٹکا سا جواب دے دیتا کہ میں تو اپنے حصہ کا کام کر چکا۔ اتنی محنت میرے پرورش کے لئے کافی ہے تو وہ پوچھتی میں بھی اگر اسی طرح اپنے حصہ کا کام کر کے پڑ رہوں تو بچوں کا پیٹ کیوں کر بھرے گا؟ میاں تھا حاضر جواب۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بیوی کو سوائے طعن و تشنیع کے کوئی جواب سجھائی نہ دیتا اور بعض اوقات وہ اس سے متجاوز کر کے غصہ میں اسے سخت سست بھی کہہ ڈالتی اور اس طرح ...... کبھی کبھار ان میں لڑائی ہو جاتی۔ بالخصوص اس وقت جبکہ وہ غلہ، سبزی پرال یا اور کوئی شئے قصبہ کو فروخت کرنے لے جاتا اور لوٹتے ہوئے کوئی فضول سی چیز خرید لاتا۔ یا کام کے دنوں میں پی پلا کر بدمست پڑا رہتا تو وہ میاں سے دلی لگاؤ اور احترام کے باوجود غصہ سے کھولنے لگتی۔ ایسے موقعوں پر اس کی خفگی دیرپا اور غصہ شدید ہوتا اور ایسے قابل ملامت واقعہ کے بعد گھنٹوں نہیں دنوں وہ کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہوتا رہتا حالانکہ میاں کو یاد بھی نہ رہتا کہ ناراضگی اور خفگی کا سبب کیا ہے۔ ناگوار بات وہ جلد بھول جاتا مگر جب تک بیوی کے دل کی بھڑاس نہ نکل جاتی وہ برابر کڑکڑ کرتی رہتی۔

خزاں کے موسم میں ایک ایسی ہی افتاد پڑی۔ وہ عمدہ چاول فروخت کرنے بازار گیا۔ آتے ہوئے آدھے پیسوں سے اس نے ایک انگوٹھی خرید لی اور مزے میں پہنے ہوئے گھر لوٹا۔ اس نے سمجھا تھا انگوٹھی سونے کی ہے مگر وہ سونے کی نہ تھی۔ کسی نے اسے جھگا دے دیا تھا۔ جونہی بیوی کی نظر اس انگوٹھی پر پڑی وہ جھلا اٹھی اور کڑک کر بولی۔ "لو منہ تمہارا ہے۔ تمہیں اس انگوٹھی پہ روپیہ ضائع کرتے ہوئے کچھ شرم بھی نہ آئی۔ میں کھیت پر جان ماروں۔ بھاڑ ہر یوں اور آپ کو سوجھتی ہے آرائش اور سنگھار کی! گاڑھی محنت کی کمائی یوں جھوٹے ملمع کی انگوٹھی پہ ضائع کونسی عقل کی بات تھی۔ کیا تم نے کسی اور محنتی ایماندار کسان کو یوں سونے کی انگوٹھی پہن کر اکڑتے دیکھا ہے؟ یہ تو پیٹ بھرے دولتمند بےفکروں کے چونچلے ہیں۔ ہم جیسے غریب کنگالوں کو زیب نہیں دیتے ...... ہونہہ۔ پھر خریدتے وقت اتنا تو سوچا ہوتا کہ سونے کی انگوٹھیاں کہیں چند چاندی کے ٹکوں میں ملتی ہیں!"

اپنے شوق کی چیز پہ بیوی کی یہ ملامت۔ اس کو بھی تاؤ آ گیا۔ ایک باغی بچے کی طرح غصہ میں کڑک کر

"اری دیوانی تو کیا جانے سونا! سونا ہے یہ خالص سونا۔ شاید کسی دولت مند کے گھر سے چوری گئی ہو۔ بیچنے والے نے لوگوں کی آنکھ بچا کر چپکے سے مجھے علیحدہ لے جا کر اپنے دامن کے اندر سے اس کی ایک جھلک دکھائی تھی اور چپکے چپکے اس کا سودا کیا۔" وہ بولی — "جی! تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا یہ نرا کاٹھ کا الو ہے آسانی سے جھانسے میں آ جائے گا۔ آخر ہوا بھی وہی! خیر سونا ہی سہی مگر بھلے آدمی اتنا تو سوچا ہوتا کہ تجھ جیسے کنگال دہقان کے ہاتھ میں اصل سونے کی انگوٹھی دیکھ کر لوگ کہیں گے کیا؟ چوری کے الزام میں دھر نہ لئے جاؤ گے اور جیل کی ہوا نہ کھاؤ گے؟ وہاں تمہارے کھلانے پلانے کا بندوبست کون کرے گا اور پھر تمہیں چھڑا کر لانے کی سبیل کیا ہوگی؟"

"اری بس۔ تجھے تو ایسے برے شگون ہی سوجھتے ہیں" میاں بولا۔ بیوی نے اس پہ کہا — "اچھا ذرا دیکھوں یہ تمہاری سونے کی انگوٹھی" — اس پہ جیسے کوئی بچہ اپنا چہیتا کھلونا اپنے ساتھ کھیلنے والے کو دینے میں پس و پیش کرتا ہے میاں نے بھی — "نہیں بتاتے" — کہہ کر ہاتھ پیچھے چھپا لیا۔ انگوٹھی اس کا کھلونا ہی تو تھی۔ بیوی نے جو ہاتھ بڑھایا اس نے جھٹک دیا اور جھنجھلا کر بولا — "چل' پرے ہٹ۔ بڑی آئی انگوٹھی پہ کھنے والی!" — بیوی کو طیش آ گیا وہ اس پہ جھپٹ پڑی اور اس کا منہ نوچ لیا اور بولی — "موئے مسرف نکھٹو! تجھے شرم نہیں آتی!" — اور تڑا تڑ دو تین دو ہتڑ بھی رسید کر دئیے۔ میاں بچارا اس غیر متوقع حرکت پر بھونچکا سا رہ گیا۔ جھٹ سے انگوٹھی انگلی سے نکال کر دے دی — "لے دیکھ اور اپنی آنکھیں سینک" — "میں جانتا ہوں تو کیوں لال پیلی اور غضب ناک ہو رہی ہے۔ یہی اگر میں تیرے لئے لایا ہوتا تو بولتی — واری جاؤں' بلی بلی جاؤں" — بیوی یہ سن کر پھر جھلا اٹھی کیونکہ ایک حد تک میاں کا خیال صحیح ہی تھا۔ وہ ہمیشہ دلگیر رہا کرتی تھی کہ کوئی دن تو ہوتا کہ اوروں کی شوہروں کی طرح اس کا میاں بھی کبھی اس کے لئے کوئی زیور کا تنکا لا کر دیتا۔ کبھی تو اس کو توفیق ہوتی کہ بیوی کو کوئی تحفہ دیتا۔ اس کو یہ آرزو ہی رہی کہ میاں اس سے کہتا — "بی بی۔ یہ زیور میں خاص تیرے لئے بنوا لایا ہوں" — مگر میاں کو اس کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ بیوی نے طعن اور ملامت کی نظروں سے میاں کو گھور کر دیکھا۔ میاں کا دل اپنی زبوں حالی اور بے لطف زندگی اور شوق کی چیز کی پامالی پہ بھر آیا۔ وہ بولا — "میری ایک خواہش کی چیز پر تیری یہ جلن اور یہ لعن طعن۔ میری ہر آرزو تیرے دل میں خار کی طرح کھٹکتی ہے۔ تو بس یہ سمجھتی چلی جاتا کہ جو چار پیسے ہم کماتے ہیں وہ ان کے پیٹ کی آگ بجھانے میں صرف ہو جائیں۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پلنگ پہ جا پڑا اور بسورنے لگا — "ہائے رے میری پھوٹی تقدیر" — کہہ کر دونوں ہاتھ منہ پر رکھ دئیے۔

بوڑھی ماں بیٹے اور بہو کا جھگڑا خوف و ہراس سے دیکھ رہی تھی۔ دوڑی دوڑی بیٹے کے پاس آئی کہ رو رو کر جان ہلکان نہ کرے' کہیں بیمار نہ ہو جائے۔ گو وہ بہو کو چاہتی تھی مگر اب ملامت کرنے لگی — "اری بیوی! شرم کر' کوئی اس طرح سے لڑا کرتا ہے" — بچے بھی ماں کو جھگڑتا اور سنگدل سمجھ کر اور باپ کو روتا دیکھ کر اس کی ہمدردی میں دھاڑیں دھاڑیں رونے لگے۔ مگر ماں کا غصہ ٹھنڈا ہونے کے ابھی کچھ آثار نہ تھے۔ میاں نے زمین پہ انگوٹھی پھینک دی تھی۔ اس نے اٹھا کر دیکھی۔ دانت سے اسے چبا کر جانچا اور خیال کیا کہ جیسا میاں نے سمجھا تھا شاید سونے ہی کی ہو۔ اگر یہی بات ہوئی تو سودا کچھ برا نہیں کسی اور کو بیچ لیں گے اور شاید کچھ زیادہ دام ہی کما لیں۔ وہ سوچ رہی تھی بعض اوقات مسروقہ مال سستا مل جاتا ہے مگر اتنا سستا بھی تو نہیں کہ سونا چاندی کے بھاؤ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے میاں نے دام دیئے ہوں زیادہ اور بتلائے کم۔ مگر دانتوں میں دبانے سے انگوٹھی پہ کوئی نشان نہ پڑا۔ نرم سونے پہ تو ذرا سے دباؤ پہ نقش پڑ جاتا ہے مگر یہ جوں کا توں ہی رہی۔ اب تو اسے اور بھی غصہ آیا اور چیخ اٹھی — "ارے یہ تو نرا پیتل ہے" — منہ سے انگوٹھی

نکال کر اس پر تھوک دیا اور زمین پر پھینک کر بولی — "تجھ میں ذرہ برابر بھی عقل ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ یہ پیتل ہے ملمع بھی کوئی گت کا نہیں۔"

ایک رنج اس کو یہ بھی تھا کہ میاں کو کسی نے یوں آسانی سے ٹھگ لیا۔ بچوں کے رونے بسورنے کی پروا نہ کر کے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی وہ کھیت پر کام کرنے چلی۔ بڑھیا بڑبڑاتی رہی — "میں جب جوان تھی شوہر کو ناراض نہیں کرتی تھی اور اس کو اپنی مرضی پر چلنے دیتی تھی۔ بیوی کو شوہر کی خوشی کی خاطر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو درگزر کر دینا چاہئے۔" — ایسی گفتگو سے کیا بیوی کا غصہ ٹھنڈا ہونے والا تھا۔ وہ کڑھتی ہوئی چلی گئی۔ دیر تک کھیت پر کام کرنے کے بعد خزاں کی ٹھنڈی ہواؤں نے بتدریج اس کے مزاج میں اعتدال پیدا کر دیا۔ پہاڑ کا منظر جس کی سبزی خزاں کے ہاتھوں گندمی رنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ نیلا آسمان۔ مرغابیوں کی پھڑپھڑاہٹ غول در غول جنوب کی جانب اڑی جا رہی تھیں۔ گزرتے ہوئے سال کی فضا کا یہ عالم۔ غرض ان سب کا اس کے دل پر اثر ہوا۔ اب وہ پھر حسب معمول نیک دل، مہربان اور شفیق ماں بن گئی۔ ہاتھ اس کے نرم نرم زمین میں گیہوں دانے بونے میں جلد جلد چل رہے تھے۔ اب اس کے دل کو سکون اور قرار آ چکا تھا۔ شوہر کے ہمیشہ کے ہنس مکھ چہرے اور اس کے محبت بھرے دل کا خیال آیا تو وہ کچھ منفعل اور نادم ہوئی اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی کہ میں نے ناحق اتنی سی بات پر اس کے دل کو ٹھیس لگائی۔ بیچارہ کتنا ملول اور دلگیر ہو گیا تھا..... خیر گھر چل کر اس کا مرغوب پلاؤ پکا کر اس کو کھلاؤں گی اور پھر منا کر راضی کر لوں گی۔ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ اس کی خوشی کی خاطر مجھے تھوڑا نقصان برداشت کر لینا چاہئے تھا۔ یہ سوچتے ہوئے کام ختم کر کے جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی گھر چلی کہ جلدی سے چولہا چڑھاؤں۔ میاں اب تک تکیہ میں منہ ڈالے غمگین اور ملول لیٹا ہوا تھا۔ نہ آہٹ پر متوجہ ہوا اور نہ کوئی بات کی۔ ہاں راستے کے نالے سے جھینگے بھی پکڑ لائی تھی۔ چاول کے ساتھ ملا کر پلاؤ تیار کیا اور طباق بھر کر اس کے سامنے لائی۔ مگر اس نے اٹھانا تو درکنار پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بیوی نے منت سماجت کی اور اپنے قصور کی معافی مانگی۔ اس نے جواب دیا — "بیوی تیری برکت نے میرا دل توڑ دیا اور زندگی بے مزہ کر ڈالی۔ لے جا یہ اٹھا۔ اب اس وقت کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔" بیوی نے زیادہ حجت کرنا مناسب نہ جانا اور کھانا وہیں میز پر رکھ کر دوسرے کام کو جانے لگی۔ باوجود اقرار قصور اور معافی مانگنے کے میاں کے نہ ماننے سے اسے بہت رنج ہوا۔ بڑھیا نے بھی بیٹے کو سمجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر سب بے سود۔ بیوی کے غصہ کا پارہ پھر چڑھنے لگا اور دانت کاٹی ہوئی باہر آ گئی۔ کتا سامنے آیا اور بھوک کے اظہار میں پاؤں چاٹنے لگا۔ وہ واپس لوٹی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ جب میاں نے کھانا نہیں کھایا تو میں کیوں کھاؤں۔ لاؤ یہ کھانا اسی کو ڈال دوں۔ پھر سوچا نہیں اچھی اچھی غذا یوں کتے کو ڈال کر ضائع کر دینا کوئی عقلمندی نہیں۔ پلاؤ کی دیگچی طاق پر رکھ دی اور کچھ باسی چاول ساگ میں ملا کر کتے کے آگے ڈال دیئے اور دلگیر و ملول باقی ماندہ تخم ریزی کیلئے کھیت پر چلی گئی۔

رات کو جب وہ سونے کیلئے پلنگ پر آئی۔ ایک جانب چھوٹے بچے اس سے لپٹ گئے۔ دوسری جانب اس کا میاں بھی سویا ہوا تھا۔ سارا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ بے چارا بھوکا ہی سو گیا ہے۔ یہ بھی ایک بھولا بچہ ہی تو ہے۔ جس طرح سارے کنبہ کا اسے فکر اور خیال ہے اس کے ساتھ بھی اسے ہمدردی کرنی چاہیئے اور حتی الامکان اس کی رفاقت۔ صبح سویرے ہی چپکے سے اٹھی۔ دبے پاؤں باورچی خانے میں گئی، تازہ کھانا تیار کیا۔ بوڑھی ساس اور بچوں کو کھلایا۔ میاں ابھی پلنگ ہی پر پڑا ہوا تھا۔ قریب جا کر دلجوئی کی باتیں کرنے لگی اور منت سماجت کرتے ہوئے ناشتہ لے آئی۔ میاں نے یہ دیکھ کر کہ بیوی اپنی حرکت پر منفعل اور نادم ہے اور بھوک بھی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی اس کی درخواست قبول کر لی۔ بیمار کی طرح پلنگ سے اٹھا۔ منہ دھو کر آہستہ آہستہ لقمے لینے لگا۔ کھانا تھا مرغوب اس پر بھوک مستزاد۔ بیوی اس کے پاس بیٹھی ہوئی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے سیر ہو کر کھایا اور لڑائی کا قصہ رفت گذشت ہو گیا۔

فلم اور اخلاق

احمد مکی

فلم نام ہے اس نقش متحرک کا جس سے حیات انسانی کے خد و خال کو پیش کیا جائے جس کے ذریعہ پردۂ سیمیں پر کسی ملک یا قوم کے افعال و اعمال، کردار و اطوار، تمدن، معاشرت اور رسم و رواج کو چلتی پھرتی شکل میں نمایاں کیا جائے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے تجربات، سنی سنائی روایات اور کتابوں کے مطالعہ سے زیادہ نظری اور عینی مشاہدات سے متاثر ہوتا ہے اور یہی عینی مشاہدات اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کیونکہ مشاہدات سے تجربات اور تجربات سے ایقان، ایقان سے عزم اور عزم سے اعمال و افعال سرزد ہوتے ہیں اور یہی اعمال و افعال کبھی حیات انسانی کو بہشت زار نشاط بنا کر سکون بخشتے ہیں اور کبھی جہنم اساس وادی تاریک کے خارزار میں تڑپنے اور بے چین ہونے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ انسان جیسا دیکھتا ہے ویسا سوچتا ہے اور جو سوچتا ہے وہ کرتا ہے اور جیسا کرتا ہے ویسے ہی تلخ و شیریں تجربات حاصل کرتا ہے۔ پس انسانی زندگی کو سنوارنے اور فکر و نظر اور ذہن و تصور کی تربیت کے لئے فلم ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔

فلم اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس سلسلہ میں راجندر سنگھ بیدی نے بڑی اچھی مثال دی ہے۔ سنئے۔

"ادب اور فلم آرٹ اظہار کی دو قسمیں ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں اس پر بھی جدا ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے ایک بڑا خاندان ہے جس میں دادا سے لے کر پوتے تک بیسیوں رشتے ہیں اور ان رشتوں کے اعتبار سے ادب اور فلم چچیرے بھائی ہیں۔ بھائی کی یہ نسبت بہن کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ادب ایک لڑکا ہے جو بہت سیدھا سادا ہے زیادہ باتیں نہیں کرتا اور نہ بہت پھل پل جاتا ہے۔ بہت کیا تو اس نے زرتار جاکٹ پہن لی۔ لیکن اس کے برخلاف فلم ایک دوشیزہ ہے جسے دوسروں کی نظروں میں بچنے اور قابل قبول ہونے کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ خالی خولی تن ڈھانپ لینے سے اس کا کام نہیں نکلتا وہ جب پہنتی ہے زرق برق لباس پہنتی ہے جو آنکھوں کو چکا چوند کر دے۔ چہرے کو پاؤڈر اور غازہ سے آراستہ کرتی ہے۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتی ہے۔ آنکھوں کو دنبالہ دار بناتی ہے تاکہ اچھے اور شریف گھرانے کا نوجوان اس کی طرف راغب ہو جائے اور اس کی شادی کا مسئلہ حل ہو اور اس کے بعد وہ ساری زندگی سکھ اور چین سے گزار سکے۔ جہاں ادب اپنی کتاب کی صورت میں کہتا ہے "پڑھنا ہے تو پڑھئے نہیں تو پھینک دیجئے" وہاں فلم کی دوشیزہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اس کے سامنے زندگی بھر کی روٹیوں کا سوال ہے۔ ایک بڑا اہم اقتصادی سوال ہے۔ وہ اپنا گھر بسائے بنا نہیں رہ سکتی۔ لڑکا کنوارہ بھی رہ جائے تو گھر کی آبرو میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اگر لڑکی دروازے سے نہ اٹھائی جا سکے تو بہت بڑی بے عزتی کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لئے جب وہ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کوئی حرکت کرتی اور ناز و ادا اور عشوہ طرازی

سے کام لیتی ہے تو اس کے اس فعل کو کسی حد تک ہمیں ہمدردی کی نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے"۔

بیدی صاحب نے ادب اور فلم کا جو فرق بیان کیا ہے اس سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ یہ معصوم لڑکی یہ دوشیزۂ فلم بدقسمتی سے برے لوگوں کے ہتے چڑھ گئی۔ خود غرض اور زر پرست تاجر اسے انگلی پکڑ کر گندہ بازار میں لے پہنچے اور اس کی دوشیزگی کی تمام تقدیس داغدار کر کے اسے طوائفیت کا عادی بنا دیا۔ اس کے بناؤ سنگھار اس کی تزئین و زیبائش میں تو روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ لیکن اس کی روح میں خطرناک اور زہریلے جراثیم سرایت کرتے چلے گئے۔ انتہائی گندہ اور گھناونے۔

صنعت فلمسازی جب سے منافع خور ادب نا شناس سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں پہنچی اس کی مٹی پلید ہو گئی۔ آرٹ، شعر اور موسیقی کو خالص جلب منفعت کا ذریعہ بنایا گیا۔ بہت کم ایسی تصویریں ہیں جن میں حقیقی زندگی کا ہلکا سا عکس نظر آتا ہے۔ ورنہ عام طور پر فلمیں عشق و محبت کی فرسودہ روایات اور غیر شائستہ، بھونڈے مذاق سے بھری ہوتی ہیں اور محبت کی ان کثیف داستانوں میں بھی نہ زندگی کی صداقتیں ہوتی ہیں نہ نفسیات محبت کی صحیح وضاحت نہ ندرت بیان کا شائبہ نظر آتا ہے نہ جدت بیان کی جھلک رہتی ہے۔ ایک ہی پلاٹ ہوتا ہے جو تھوڑے رد و بدل کے ساتھ ہر تصویر میں دھرا دیا جاتا ہے۔ دو مست شباب دل اور دو مضطرب نگاہیں کسی اتفاقی حادثے یا اچانک ملاقات سے ٹکرا جاتی ہیں۔ ہیروئن کا پہلے سے کوئی منگیتر ہوتا ہے جس سے وہ نفرت کرتی ہے۔ اگر یوں نہیں تو ہیرو کی منگیتر یا چاہنے والی ہوتی ہے جس سے ہیرو بھاگتا ہے کبھی کبھی دو نگاہوں کا تصادم دونوں کے اضطراب کا باعث بن جاتا ہے۔ محبوب اور محبوبہ کی بے چینی و بے قراری کو کوئی چیز دور نہیں کر سکتی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت انھیں اپنے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتی۔ درمیان میں والدین مزاحمت کرتے ہیں مگر بے سود۔ رسم رواج رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں لیکن بے کار۔ دونوں کسی نہ کسی طرح شادی کر لیتے ہیں۔ والدین، رقیب روسیاہ اور سماج و رواج منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور سب کو سرشاران محبت اور جانبازان عشق کے سامنے سپر ڈال دینی پڑتی ہے۔

میں نے آج سے دس سال پہلے یہی بات کہی تھی اور آج بھی وہی بات کہہ رہا ہوں کیونکہ اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی فلموں کے پلاٹ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہی باتیں جو اس وقت موجود تھیں آج اس سے بھی پست حالت میں نظر آتی ہیں۔

غرض کہ جب حسن، شعر اور موسیقی کے امتزاج کے ساتھ ایک فلم عوام میں مقبول ہوتی ہے تو دوسرا فلم ساز اس سے تیز تر اس سے عریاں تر تصویر تیار کر دیتا ہے۔ چنانچہ حریفانہ مسابقت جذبہ محبت کے لطیف جذبات کی توہین کر رہا۔ اور شائستگی کو الٹی چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ ان تصاویر میں جو تفریحی عنصر شامل ہوتا ہے اس سے بھی خوش مذاقی اور سنجیدہ ظرافت کی علانیہ تذلیل ہوتی ہے۔ چند احمقانہ حرکتوں، جسم کے عجیب و غریب انداز سے تھرکنے، چہرے کے نفرت انگیز آثار چڑھاؤ اور ساوانہ کے مصنوعی زیر و بم کا نام ظرافت رکھا گیا ہے۔

گانوں کے اعتبار سے بھی یہ فلمیں عجیب مضحکہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔ ان گانوں کا مقصد عام طور پر تماشائیوں کے سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنا ہوتا ہے۔ گانوں کا محل وقوع بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتا۔ اگر کسی کا باپ مر گیا تو فرط گریہ میں ایک عدد نغمہ الا دیا گیا۔ گویا یتیمی کا داغ لگتے ہی روح نغمہ بیدار ہو جاتی ہے۔ جہاں کسی مصیبت کا سامنا ہوا ایک دلدوز گیت گا کر کلیجہ ہلکا کیا گیا اور اس "نغمۂ الم" سے نہ صرف یہ کہ گانے والا تنہا متاثر ہوتا ہے بلکہ سننے والے بھی چٹکیاں بجانے لگتے ہیں۔ مصیبت اور غم کے وقت تو فلموں میں گانا ازبس ضروری اور لازمی ہے۔ جب ہیروئن یا ہیرو کسی مصیبت یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو تماشائی کا دل مطمئن ہو جاتا ہے کہ بس اب ہال نغموں سے گونجنے ہی والا ہے۔ اسی طرح ہیروئن کے ساتھ شمع کا پگھلنا۔ خفیہ ملاقات اور رنگین گفتگو کے وقت درخت پہ کوئل یا کبوتر کا سر سے سر جوڑے نظر آنا۔ مسرت و شادمانی کے وقت کسی سہیلی یا اگر وہ دستیاب

نہ ہو تو طوطے یا کسی اور پنچھی سے رازدارانہ گفتگو کرنا، آسمان پر چاند اور باغ میں پھول کھلنا، آبشار کی روانی اور درختوں کا جھومنا، مایوسی اور ناکامی کے وقت ایک فقیر کا فرشتۂ غیب کی طرح نمودار ہو کر تسلی بخش گیت گانا، شادی بیاہ اور عیش و نشاط کے وقت شوخ و شنگ لڑکیوں کا مردوں کے ساتھ رقص کرنا۔ یہ ہماری فلموں کے ضروری اجزا ہیں۔

غرض کہ ہماری فلمیں نہ تو آرٹ کی کوئی صحیح خدمت کرتی ہیں نہ تفریح کا باعث بنتی ہیں۔ ہاں نئی پود میں بداخلاقیوں اور عشق فرمائیوں کا پرچار ضرور ہی کامیابی سے کر رہی ہیں۔ جب معصوم نوجوان ان عریاں مناظر اور ہیجان انگیز واقعات کو دیکھتے ہیں تو ان کے خوابیدہ جذبات میں آگ سی بھڑک اٹھتی ہے۔ حسین چہروں کی رنگین برق پاشیاں، نکھرے ہوئے شباب کی قیامت زائیاں اور مطربان خوش نوا کی نغمہ باریاں جب اپنی بے پناہ شوخیوں، بے حجابیوں اور عریانیوں کے ساتھ جنت نگاہ اور فردوس گوش بنتی ہیں تو نوجوان کے چنچل ارمان انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ انسان نیکی کے بجائے بدی کی جانب تیزی سے مائل ہو جاتا ہے۔ جوانی کی منطق گناہ کی تاویلات اور معصیت کے دلائل کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ ترغیب معصیت میں بڑی دلکشی ہوتی ہے۔ ہماری بیشتر فلمیں زہر کی ایسی گولیاں ہیں جن پر شکر چڑھی ہو۔ کھانے میں میٹھی، اثرات میں نہ صرف تلخ بلکہ ہلاکت آفریں بھی جن کا خطرناک زہر بڑی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ نوجوانوں کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور تکلف برطرف نوجوان ہی کیوں۔ ان معصیت بدوش کفر سامانیوں کو دیکھ کر تو زاہدان خشک کے کعبۂ دل کے آثار شکستہ بھی منہدم ہو کر زمین پر آ رہتے ہیں۔

اگر ابتدا سے اس وقت تک کی فلموں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل فلموں کا جو اخلاقی معیار تھا آج اس سے بھی بہت پست ہو گیا ہے اور معیار کی اس پستی کا عوام کے اخلاق و کردار پر بہت مضر اثر پڑتا چلا جا رہا ہے۔ نوجوان جو باتیں فلموں میں دیکھتے ہیں انھیں کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فلم "قسمت" دیکھ کر بہت سے نوجوان اشوک کمار کی طرح جیب پر ہاتھ صاف کرنے کی مشق کرنے لگے۔ کاردار کی ایک تصویر کا گانا تھا "ارے پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے بھائی نے۔۔۔ بہت سے منچلوں نے یہ مصرعہ یاد کر لیا اور راہ چلتی نوجوان لڑکیوں کو ستانے لگے۔ یہ فلمیں کس قسم کا اخلاقی درس دیتی ہیں اس کے بارے میں کرشن چندر کا کہنا ہے۔

> "تعلیم یافتہ عورت ایک اچھی بیوی، ماں اور بہو نہیں بن سکتی وہ لڑکا جو غیر ملک میں تعلیم کیلئے جاتا ہے ہمیشہ ناخلف اور سوتیلی ماں ہمیشہ نامہربان ثابت ہوتی ہے۔ ماں باپ اپنی اس اولاد کے لئے ہمیشہ قربانی پیش کرتے ہیں جو اس کے اہل نہیں ہوتے وہ شخص جو پرانی ریت اور پرانے رواج توڑتا ہے آخر کف افسوس ملتا ہے ...... ہماری فلموں کے مطابق ایک آئیڈیل گھر وہی ہو سکتا ہے جہاں تعلیم کی جگہ جہالت، ہمدردی کی جگہ توہم پرستی اور جذبۂ انکشافات کی جگہ رواج ہوں۔ ہمارے ہیرو روٹی کے لئے کوئی کام نہیں کرتے وہ ہمیشہ نغمہ و سرود میں پڑے رہتے ہیں، محبت کی پرکیف وادی میں چہل قدمی کرتے ہیں یا غم فرقت میں ان کے چہروں پر پژمردگی چھا جاتی ہے۔ ان فلموں کو دیکھنے کے بعد بغیر کسی مشکل کے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ہندوستان ایک وسیع کارخانہ محبت ہے جہاں لوگ دوسرا کوئی کام کرتے ہی نہیں...... اس سوسائٹی کی بنیاد انسانی جدوجہد پر نہیں بلکہ قسمت پر قائم ہے جس کام کو دیوتا کر سکتے ہیں انسان اسے بگاڑ نہیں سکتا ہندوستانی فلموں میں اس قنوطیت کے زہر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ امرت بنا دیا جاتا ہے ...... ہماری فلمیں شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ سماجی اہمیت اور کچھ سماجی باتوں کا پرچار بھی کرتی

ہیں مثلاً جہالت کا، توہم پرستی کا، حتیٰ کہ انسانی نیم جاں ارادوں کا، کھٹور قسمت کا، ہمدردی کا اور عینک کا۔"

ان تمام خرابیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ بہت سے نااہل اور جاہل افراد اس صنعت میں داخل ہوگئے۔ انھوں نے پیسوں کے بل بوتے پر اپنی من مانی کرنی شروع کر دی۔ مشہور مزاحیہ اداکار ڈکینٹ کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک گدھا فلم اسٹوڈیو کے اندر چلا آیا۔ ڈکینٹ نے جھک جھک کر سلام کرنا شروع کر دیا۔ دوستوں نے وجہ پوچھی تو اس نے انتہائی متانت و سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا کہ "تم دیکھتے نہیں یہ گدھا کتنی بے تکلفی کے ساتھ اسٹوڈیو میں آگیا ہے۔ کیا عجب ہے یہ بھی فلمیں بنانے لگے اور ہمیں اس کا حکم ماننے پر مجبور ہونا پڑے۔"

یہ فقرہ طنز ہے ان نااہل فلمسازوں اور ہدایت کاروں پر جو جاہل اور ناتربیت یافتہ ہونے کے باوجود فلمی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور جن کے بارے میں منٹو کا کہنا ہے کہ:

> ان پڑھ اور جاہل آدمی جو دستخط کرنے کی بجائے انگوٹھا ثبت کرتا اور سب کچھ بن سکتا ہے فلم ڈائرکٹر نہیں بن سکتا۔ فلم ڈائرکٹر بننے کیلئے بہت سی صلاحیتوں کی ضرورت ہے اس کا مطالعہ وسیع ہونا چاہیئے۔ اس کی نظر میں گہرائی ہونی چاہیئے۔ اس کے خیالات میں پختگی ہونی چاہیئے اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اسے انسان ہونا چاہیئے تاکہ وہ انسان کی داستان بطریق احسن بنا سکے۔"

لیکن ایسے انسانوں کا دنیا میں کال ہے جس کی وجہ سے "انسان" کی داستان بننے کی بجائے فحاشی کا جی کھول کر پرچار کیا جانے لگا۔ جنگ کے زمانے میں اس قسم کی تصویروں کی بہتات ہوگئی۔ تماشائی گندہ اور لچر تصویریں دیکھنے لگے ان فحش تصویروں کی گرم بازاری دیکھ کر فلمسازوں کے ہاتھ کامیاب نسخہ آگیا۔ انھوں نے سستی اور گھٹیا تصویریں بنانی شروع کر دیں عوام کو تفریح کی ضرورت تھی۔ وہ بھی اس قسم کی فلموں سے دلچسپی لینے کے عادی بن گئے۔ ان کے ذوق کا معیار بھی پست ہوگیا۔ ناقدین فن نے چیخنا شروع کر دیا کہ ایسی بیہودہ فحش اور عریاں تصویروں کو روکو۔ فلمسازوں نے معذرت کے ساتھ جواب دیا کہ "صاحب ہم کیا کریں ہم تو عوام کی خواہشات اور ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ عوام جیسی تصویریں چاہتے ہیں ویسی ہی تیار کی جاتی ہیں۔ پہلے عوام کے ذوق کا معیار بلند کیجئے پھر ہم سے شکایت کیجئے۔ ہم اچھی تصویریں بناتے ہیں تو ناکام ہو جاتی ہیں اور جب ایسی "چالو" تصویریں تیار کی جاتی ہیں تو چاندی برسنے لگتی ہے۔ عرصہ تک یہی کشمکش رہی انجام کار عوام کا شعور بیدار رہا۔ انھوں نے خود ہی اس کا فیصلہ کر دیا۔ وہ اب اس قسم کی بے مقصد اور بیہودہ فلموں سے اکتا گئے اور انھوں نے ہیجان انگیز فلموں سے دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ فلمسازوں کے تمام فارمولے ناکام ہونے لگے انھوں نے کبھی مار دھاڑ کی کہانیوں کا سہارا لیا کبھی حسین چہروں کے آنچل کو تھاما مگر ہر تدبیر ناکام رہی۔ تعلیم یافتہ اور باشعور فنکار فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، دشوا متر عادل، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جان نثار اختر اور پریم دھون جیسے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے زندگی کی صداقتوں اور حقیقتوں سے آگاہ کیا اور گو ابھی ان لوگوں کو پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی پھر بھی کچھ تبدیلی ضرور نظر آنے لگی اور بعض تصویروں میں زندگی کے خد و خال جھلکنے لگے۔ عوام جس چیز کے منتظر تھے انھوں نے جی کھول کر ایسی فلموں کی حوصلہ افزائی کی۔ زر پرست فلمساز بوکھلا گئے۔ اب بھی اعتراف کرنا ہی پڑا کہ واقعی ہم سے بڑی بھول ہوئی۔ ہماری فلمیں اصلی زندگی کی ترجمانی نہیں کرتیں۔ میں نے

میں بعض فلمسازوں اور ہدایت کاروں سے ملاقاتیں کی تھیں اور سوال کیا تھا کہ اپنی تعداد دیر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اس وقت بعض نے بڑے رازدارانہ انداز میں لیکن دبی زبان سے معیار کی پستی کا اقرار کیا تھا مگر آج تو وہ علانیہ اور برملا اس کا اعتراف کرنے لگے ہیں ــــــ شانتا رام کا کہنا ہے۔

"ہم نے ٹیکنیک، فوٹو گرافی، اسپیشل ایفیکٹ اور ساونڈ ریکارڈنگ میں خاطر خواہ ترقی کی ہے لیکن بنیادی چیز یعنی کہانی کو پس پشت ڈال دیا۔"

کیدار شرما کا قول ہے:۔

"عوام پر فلموں کا نفسیاتی اثر ضرور پڑتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری اکثر فلمیں عوام کے اخلاق و کردار پر مضر اثر ڈال رہی ہیں۔"

گرو دت کا خیال ہے:۔

"فلمسازوں نے آسان سا گر ڈھونڈھ لیا ہے کہ ہیرو اور ہیروئین کے لئے نامور آرٹسٹ لئے جائیں اور فلم میں آدھے درجن بھڑکتے ہوئے نغمے اور کچھ رقص شامل کر دیئے جائیں۔ ان کے بل بوتے پر فلم چل نکلے گی لیکن فلموں کی یک رنگی سے جنتا بیزار ہو گئی۔ اب سطحی اور عارضی تدبیروں سے کام نہیں چلے گا۔ فلمی نظام کو یکسر بدلنا ہوگا۔"

دلسکھ پنچولی نے مشورہ دیا ــــ

"فلم تیار کرنے کے لئے وقت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ عوام کا ذوق تبدیل ہو گیا ہے۔"

پریم ناتھ نے کہا:ــــ

"میں جنسی کشش کو آلہ کار بنا کر فلم کو کامیاب بنانے کا سخت مخالف ہوں۔ ان پروڈیوسروں کو شرم آنی چاہیئے جو انسان کے جنسی جذبات کو ابھار کر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔"

کشور ساہو نے سمجھایا:ــــ

"ہمیں سب سے پہلے عوام کا معیار زندگی بڑھانا ہوگا۔ معاشی اور اقتصادی الجھنوں پر قابو پانا ہوگا اور یہ سب ایک عوامی نمائندہ حکومت کے زیر سایہ ہی ہو سکتا ہے۔ فلمساز اس قسم کی کہانی منتخب کرتے ہیں جو عوام کے چھچھورے احساسات کو چھیڑ سکے۔ سفلی جذبات کو بیدار کر دینا بہت آسان ہے۔ اس لئے فلمساز شارٹ کٹ اختیار کرتا ہے۔"

بمل رائے نے بتایا ــــ

"فلموں کی حقیقت پسندی کا انحصار موضوع کے ساتھ برتاؤ پر ہے۔ سب سے پہلے تو خود کہانی میں فطری اور حقیقی زندگی کی جھلک ہونی چاہیئے۔ اس میں زندگی کی سچائیاں اور حقیقتیں سموئی ہونی چاہئیں اور اس کے کردار زندہ اور متحرک ہونے چاہئیں کہ دیکھنے والوں کو حقیقت کے روپ میں نظر آسکیں۔"

دیوکی بوس نے چیتاونی دی کہ:ــــ

"ہمارے سماج اور زندگی میں غیر قدرتی اور مصنوعی رجحانات نے اندھیر مچا دیا ہے۔ حقیقی

زندگی سے بھاگنا خودکشی کے مترادف ہے اور ہماری فلمیں اس خودکشی کی ترغیب دینے کا ذریعہ بن گئی ہیں ہماری موجودہ فلمیں ایسی ہوتی ہیں جو انسانی جذبات و احساسات کو آگ کی طرح بھڑکاتی ہیں۔ آگ کبھی تسکین نہیں پاتی:

ضیا سرحدی کا عقیدہ ہے کہ:۔

"آرٹسٹ زندگی کے حقائق سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ ورنہ اس کا آرٹ فنا ہو جائے گا"

اتنے مشہور اور ممتاز فلمسازوں اور ہدایت کاروں کے اعتراف کے بعد کون ہے جو اب فلموں کے گن گانے کی ہمت کرے گا۔ عریانی اور بے ہنگی جو آج کی فلموں کا طرۂ امتیاز ہے وہ نہ صرف ہندستان بلکہ یورپ میں بھی اچھی نگا ہوں سے نہیں دیکھی جاتی اس سلسلہ میں اٹلی کے مشہور ہدایت کار ڈی سیکا کی رائے ہے:۔

"آج کل نئے نئے فلم اسٹار تلاش کر کے جنسی کشش پیش کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ ان کی ٹانگیں اور جوبن کا ابھار کچھ اس ڈھنگ سے اسکرین پر دکھایا جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کے جنسی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ ان میں نفسیاتی خواہشات بڑھتی ہیں اور ان کے جنسی رجحانات و خیالات کو ہوا ملتی ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے جنسی کشش ہی کسی فلم میں سب کچھ نہیں۔ اعلیٰ معیاری اداکاری فلم کی جان ہوتی ہے اس پر توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ فلمسازوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ کسی فلم میں جتنی زیادہ جنسی کشش پیش کی جائے گی اتنی ہی وہ فلم شائقین میں مقبول ہوگی۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بہت کم ایسے فلم نواز ملیں گے جو فلموں میں جنسی کشش پسند کرتے ہیں۔ لیکن فلم دیکھنے والوں کی اکثریت نیم عریاں رقص اور لباس دیکھ کر شرم سے منہ پھیر لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ جو لوگ کسی فلم میں کوئی اخلاقی سبق، تمدنی بلندی اور عورت کو شرم وحیا کی منہ بولتی تصویر دیکھنے کے لئے سینما جاتے ہیں۔ ان کے لئے فحش مناظر، نیم عریاں ناچ اور انتہائی باریک لباس میں ہیروئین کو نیم برہنہ دیکھنا دماغی کوفت اور ذہنی بیزاری کا باعث ہوتا ہے اور ان کی نظر میں عورت اپنے اس بلند مقام سے گر جاتی ہے کیونکہ عورت ہی مرد کے بلند اخلاق و شرافت کی ضامن ہوتی ہے۔ جب وہ خود ہی اپنی سطح سے گر کر اپنے حسن و شباب کی نمائش کرے گی تو اس کے لئے لوگوں کے دلوں میں احترام اور نظروں میں قدر و قیمت قدرتی طور پر کم ہوتی چلی جائے گی اس لئے فلم کی کامیابی کے لئے اس میں اخلاقی پہلو ہونا ضروری ہے"

بہرکیف فلمسازوں اور ہدایت کاروں میں اپنی غلطی کا احساس بذات خود مبارک اور حوصلہ افزا علامت ہے جس سے یہ گمان بجا نہیں کہ اب وہ راہ راست پر آرہے ہیں اور اب وہ وقت دور نہیں جب ہم فلموں کے اخلاقی معیار کو کچھ بلند پائیں گے۔ اب عوام کو زیادہ دنوں تک خالی باتوں سے بہلایا نہیں جا سکتا۔ وہ اچھی چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اچھی چیز پا کر اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ کیفی اعظمی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ:۔

"ہمارے انگریز آقا کہتے تھے کہ ہندستانی اتنے غیر مہذب اور پسماندہ ہیں کہ ہم ان کو غلام رکھنے پر مجبور ہیں۔ وہ آزادی اور جمہوریت جیسی نعمتوں کی قدر نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہندستانی فلمساز کہتے ہیں کہ ہندستان کے لوگ اتنے جاہل ہیں، بدمذاق اور ابتذال پسند ہیں کہ ہم ویسی فلمیں بنانے پر مجبور ہیں۔ وہ صحت مند اور ترقی پسند فلموں کی قدر نہیں کر سکتے" انگریز اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ہندو مسلم منافرت کو پیش کرتے تھے۔ اور فلمساز حضرات "دھرتی کے لال" وغیرہ کی ناکامی کو بہانہ بناتے ہیں۔

"دونوں باتوں کو مقابل میں رکھ کر سوچئے یہ منطق کہاں سے درآمد کی گئی ہے۔ میں یہ اعتراف تو بے جھجک کروں گا کہ صدیوں کی غلامی، جہالت، پسماندگی اور موجودہ فلموں نے ہمارا مذاق بہت حد تک بگاڑا ہے۔ لیکن جیسے جیسے سماجی زندگی میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اسی رفتار سے ہمارا مذاق اور شعور بدل رہا ہے۔ اس پر غریبی کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے۔ افلاس بیروزگاری اور مہنگائی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے تقاضے اور دنیا کے عوام کی بیداری اور فتوحات سب کا عکس ہمارے ذہنوں پر پڑ رہا ہے۔ کل ہم جن فلموں کی قدر نہ کر سکے یہ ضروری نہیں کہ آج بھی ان کی قدر نہ کریں"۔

بہرحال اب فلموں میں فوری تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہدایت کاروں اور فلمسازوں کو چاہیئے کہ ڈی سیکا، بمل رائے اور دیوکی بوس کے مشوروں کو پیش نظر رکھیں اور ان خرابیوں کو دور کریں جو آج نہ صرف عوام کے اخلاق پر مضر اثر ڈال رہی ہیں بلکہ تجارتی لحاظ سے بھی ان کے لئے نقصان رساں بن رہی ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے کہا کہ:-

"سب سے پہلے ہمیں عوام کا معیار زندگی بڑھانا ہوگا۔ معاشی اور اقتصادی الجھنوں پر قابو پانا ہوگا اور یہ سب ایک عوامی نمائندہ حکومت کے زیر سایہ ہی ہو سکتا ہے"۔

لیکن نہ جانے وہ وقت کب آئے گا اور ہمیں کتنی مدت اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا۔ مگر حال ہی میں "فلم رائٹرس ایسوسی ایشن" قائم ہوئی ہے۔ ہماری خوش آئند توقعات اس سے وابستہ ہیں۔ یقین ہے کہ باشعور فنکاروں کی یہ جماعت ان شکایات کو دور کرانے کی کوشش کرے گی۔

آپ حیدرآباد ضرور تشریف لائیے
یہ نہ سوچئے کہ یہاں رہنے سہنے کے لئے آپ کا کوئی نہیں یا کھانے پینے کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔
اس لئے کہ شہر حیدرآباد میں
عزیزیہ ہوٹل (قیام و طعام)
ایک ایسا ہوٹل ہے جو خاص ہوٹلوں کی سی کیفیت رکھتا ہے اور جہاں آپ قیام فرما کر اپنے گھر جیسا سکون پا سکتے ہیں اور وجیٹیرین اور نان وجیٹیرین غذاؤں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہاں ہر وقت آپ پاکیزگی نفاست اور صفائی پائیں گے
آپ کا محبوب مرکز عزیزیہ ہوٹل و قیام گاہ
نامپلی اسٹیشن روڈ
حیدرآباد دکن

(ریویو)

ممتا

شاہد صدیقی

خواجہ احمد عباس کے اس فلم کی کہانی عجیب ہے۔ اس میں وہ ہیرو نہیں ہے جو ہمارے اکثر فلموں میں نغمہ و شعر کی مدد سے اظہار عشق کرتا ہے، وہ ہیروین نہیں ہے جو کتھا کلی کے ذریعہ سے اپنے محبت بھرے دل کی دھڑکنیں پیش کرتی ہے اور وہ ویلن نہیں ہے جو ایک ہاتھ میں لٹھ اور دوسرے میں چاقو پکڑ کر اپنے سے دس گنی تعداد رکھنے والے دشمنوں کو مار بھگاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس فلم میں گانے بھی نہیں ہیں۔ جن کی سریلی دھنیں وقفہ وقفہ سے تماشائیوں کو کہانی کے واقعات کی اصلیت و عدم اصلیت سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

اور چونکہ خواجہ احمد عباس کے اس فلم میں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ اس لئے وہ ایک مثالی فلم ہے، ایک شاندار کارنامہ ہے اور ایک قابل فخر پیش کش ہے۔ ممتا فلمسازی کی تاریک اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں کو مٹا کر ایک واضح اور سیدھا سادھا راستہ بناتا ہے۔ وہ فرسودہ روایتوں کو توڑتا ہے اور ایک صحت مند روایت قائم کرتا ہے۔ "ممتا" نے ہمارے فلم سازوں کے سامنے ایک نصب العین رکھ دیا ہے اور اگر دوسرے لوگوں نے بھی اس نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کی تو یہ خود ان کیلئے اور ہمارے ملک کیلئے ایک خوشگوار انقلاب کے ہم معنی ہوگا۔

اس فلم کا افسانہ آج کے ہندستان کی حقیقت ہے اور اس کے کردار موجودہ حالات کے پیدا کردہ ہیں۔ ایک ماں قحط کی لائی ہوئی مصیبتوں سے پریشان ہو کر اپنے ننھے منے بچے کو اناتھ آشرم کے دروازے پر رکھ جاتی ہے تاکہ وہ بھوک اور موت سے محفوظ رہے۔ یہ بچہ ماں سے جدا ہو کر ہندستانی زندگی کے مختلف گوشوں میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ نشیب و فراز سے گزرتا ہے، پھولوں اور کانٹوں میں رہتا ہے۔ حالات کے سرد و گرم چکھتا ہے۔ تاریکی اور روشنی سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ محبت اور نفرت کے تماشے دیکھتا ہے اور پھر ماں کی گود میں پہنچ جاتا ہے۔ کھونے اور پانے، بچھڑنے اور ملنے کی یہ داستاں اتنی سادہ، اتنی دلکش اور اتنی پر اثر ہے کہ تماشائی محو ہو کر رہ جاتے ہیں۔

جب آپ "ممتا" دیکھیں گے تو ایسا محسوس ہوگا گویا اپنے دلیش کو ننگا دیکھ رہے ہیں۔ اس کے تمام زخم آپ کے سامنے بے نقاب ہیں اور سارے حسین خط و خال بھی عریاں ہیں۔ وہ غنڈا جو بچے کے گلے میں سونے کا لاکٹ دیکھ کر اسے مار ڈالنا چاہتا ہے، لیکن بچہ اس کی زخمی انگلی پر پٹی باندھتا ہے اور خوف سے محفوظ رہنے کی خاطر اس کے قریب لیٹ جاتا ہے تو اس کی انگلیاں جواب دینے لگتی ہیں اور جب وہ دیکھتا ہے کہ گلا گھونٹ دینے کی کوشش بچے کے جسم میں گدگدی پیدا کر رہی ہے تو وہ زندگی کی عظمت کو سمجھ لیتا ہے اور اپنا چاقو توڑ کر سزا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔

اور وہ گوری جو اس غنڈے سے محبت کرتی ہے اور اپنی محبت کی روشنی میں اسے سیدھے راستے پر لانا چاہتی ہے اور دیواروں پر سینما کے پوسٹر لگانے والا وہ بچہ جو موجودہ سماج میں ایمانداری کو بیماری سمجھتا ہے، پنڈت نہرو کی تقریریں پڑھتا ہے اور وزیر اعظم بننے کے خواب دیکھتا ہے اور وہ بدمعاش جو بچوں کو اوزار بنانا چاہتا ہے اور بچوں سے بھیک منگوا کر زندگی کے دن گزارتا ہے، اور وہ شرابی جو پرانی یادوں کے بھول جانے ہی کو زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہے اور جس کے دل میں کسی سبھو کا

کی ایک گالی پھانس کی طرح چبھ رہی ہے اور متوسط درجہ کا وہ انسان جو دس بچوں کا باپ ہونے کے باوجود ایک بے سہارا بچے کو پناہ دیتا ہے اور رئیس یا محمد کے ذریعہ ایک شاندار مستقبل تعمیر کرنا چاہتا ہے اور وہ مداری جو ہندستان کا شہرہ آفاق جادو (Rope Trick) دکھاتا پھرتا ہے اور اپنی حسین بیوی کو آسمان پر پہنچا کر چند ٹکے کماتا ہے ۔ اور وہ سیٹھانی جو سب کچھ رکھتے ہوئے بھی اولاد سے محروم ہے اور اپنے شوہر کو توجہ دلانے کے بجائے بھگوان سے اولاد کی بھیک مانگتی ہے اور سیٹھ صاحب جو بلیک مارکٹ میں لاکھوں روپے کماتے ہیں لیکن دل کے سکون سے محروم ہیں اور سب سے آخر میں لیکن سب سے اہم وہ ماں اور بچہ جنھیں حالات نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے لیکن جو ایک دوسرے سے ملنے کیلئے بیتاب ہیں ۔ "منا" کے اداکاروں کی اکثریت پختہ مشق ہے اور ہر اداکار نے اپنے کردار کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے ۔ ترپتی مترا ایک ماں کے روپ میں بہت کامیاب ہے ۔ ڈیوڈ نے ایک ایسے غنڈے کے کردار کو نباہنے میں کامیابی حاصل کی ہے جس کا دل ابھی بنجر نہیں ہو سکا ہے ۔ رنجنا ان عورتوں کی نمائندہ ہے جو اپنے محبوب کے عیبوں سے بھی محبت کرتی ہے اور ان عیبوں کو محاسن میں بدل دینا چاہتی ہے ۔ جانی واکر مترا ای کا کردار پیش کرنے میں آج اپنا جواب نہیں رکھتا اور "منا" میں ہدایت کار کی توجہ نے اس کے فن کو اور بھی نکھار دیا ہے ۔ سنموہن کرشن نے ایک مشکل کیریکٹر کو اپنی فنی مہارت کے ذریعہ آسان بنا کر پیش کیا ہے ۔ اچلا دس بچوں کی ماں بن کر بھی چاق و چوبند ہے اور اس کے تیور کہہ رہے ہیں کہ اگر اسے ایک درجن بچوں کی ماں بنا دیا جاتا تب بھی اس کے ماتھے پر بل نہیں پڑ سکتا ۔ ادم پرکاش "منا" میں مداری بنا ہے اور فلم دیکھتے ہوئے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس صنعت میں داخل ہونے سے پہلے بھی اس کا پیشہ یہی ہو ۔ اس کی بیوی کی حیثیت سے شمی نے کہانی کے حسن کو بڑھانے میں بہت کچھ حصہ لیا ہے ۔ بیراج ایک لکھ پتی سیٹھ کی شان سے فن کی بلندی کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے ۔

سلوچنا چیٹرجی نے اپنے فن اور اپنے جسم کی بناوٹ سے کام لے کر ایک دولتمند عورت کے کردار کا سارا بوجھ اٹھا لیا ہے جگدیپ نے ایک محنت کش اور بلند حوصلہ بچے کی روح کو پوری طرح سمجھا ہے اور کیمرے کے سامنے رکھ دیا ہے ۔ ان سب کے علاوہ ننھی اداکارہ بے بی ناز نے بھی اپنی اداکاری کے ذریعہ یہ ثابت کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ کسی اچھے ہدایت کار کی رہنمائی میں کمسن بچے بھی آرٹ کے پیچیدہ راستوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ گزر سکتے ہیں ۔

بلا شبہ "منا" کے تقریباً تمام اداکار تعریف کے مستحق ہیں اور ان سب نے پورے فنی خلوص اور فنی دیانتداری کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک چھوٹے سے بچے رومی کے سامنے ان سب کا فن زانوے ادب تہ کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس بچہ کی تخلیق ہی اس کردار کے لئے ہوئی ہے اور اس کی ذہنی جسمانی ساخت میں کچھ ایسے عناصر رکھ دیئے گئے ہیں جو فن اداکاری کا لازمہ ہیں ۔ اس کی چال ، اس کے چہرے کے تاثرات ، اس کا انداز گفتگو ، غرض کہ اس کی ہر حرکت غور سے دیکھنے کے قابل ہے اور جب غور کیا جائے تو اس نتیجہ تک پہنچنا ضروری ہے کہ ننھا رومی اپنے ننھے سے کردار میں تحلیل ہو گیا ہے اور اس کی روح کے فنی خلوص نے "رومی" اور منا کے درمیان امتیاز کرنا مشکل کر دیا ہے ۔ یہ عجیب بات ہے کہ فلم میں بڑے بڑے ماہر فن اداکار کام کرتے ہیں لیکن جس منظر میں رومی نہیں ہوتا اس میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ جی چاہتا ہے کہ منظر کے کسی گوشے سے نکل کر ایک بار "منا" نظروں کے سامنے آ جائے اور جب ایسا ہوتا ہے تو ماحول زیادہ جاندار اور زیادہ دلکش بن جاتا ہے ۔

خواجہ احمد عباس پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں اور ہم ان سے بہتر مکالموں کی توقع ہی کر سکتے تھے ۔ "منا" میں انھوں نے بلاشبہ ہماری اس توقع کو پورا کیا ہے بلکہ فلمی مکالمہ نگاروں کے لئے ایک مثال قائم کر دی ہے ۔ منا کے تمام مکالمے کرداروں کی خصوصیات ، نفسیاتی کیفیات اور ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہیں [illegible]

چپکانے والے بچے کی گفتگو سنتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی "حیثیت" سے بڑھ کر بات کر رہا ہے۔

فلم میں ایک بات اور بھی کھٹکتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خواجہ صاحب اپنے موضوع اور مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے فن کے تقاضوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ فلم کے بعض کردار ڈائرکٹر کے اشارے پر غیر فطری انداز میں چولا بدل رہے ہیں۔ ایک شرابی بچے کے دو جملوں سے متاثر ہو کر اپنا سرمایہ حیات زمین پر پھینک دیتا ہے اور چور بازار کا دھندا کرنے والا سیٹھ ایک منٹ میں اس دھندے سے توبہ کر کے شریف آدمی بن جاتا ہے۔ کہانی کے ان مقامات پر خواجہ صاحب کی اصلاح پسندی غالب آجاتی ہے اور وہ نیکی کا پیغام دینے کی عظیم الشان خواہش کے تحت کرداروں میں تدریجی تبدیلی پیدا کرنے کی بجائے انھیں معجزاتی انداز سے بدل کر رکھ دیتے ہیں۔

"منا" کی فوٹوگرافی انتہائی دلکش ہے۔ زاویوں کا انتخاب اور روشنی و تاریکی کے تناسب کا تعین کرتے ہوئے فوٹوگرافر نے بڑی جسارت کا ثبوت دیا ہے جس کی وجہ سے ہر منظر خواہ قریبی ہو یا بعیدی انتہائی جاذب نظر آتا ہے۔ علاوہ ایڈیٹنگ بھی بے عیب ہے اور ہر آواز کو اتنے ہی حجم کے ساتھ ریکارڈ کیا گیا ہے جتنا کہ اس کے موثر ہونے کے لئے ضروری تھا۔

اسی طرح ایڈیٹنگ کے سلسلے میں بھی عمل اور رد عمل اور اثر اور جوابی اثر کو اجاگر کرنے کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے اور فلم کی ترتیب کو ماہرانہ کہا جا سکتا ہے۔

منا کی پس منظری موسیقی انل بسواس کے کمال فن کا ایک تازہ ثبوت ہے، ستار سے نکلے ہوئے سُر طبلے سے نکلنے والی تال سے ہم آہنگ ہو کر جب سماعت تک پہنچتے ہیں تو منظر کا مجموعی اثر اور بھی بڑھ جاتا ہے اور تماشائی ہمہ تن چشم و گوش ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ایک ایسے زمانے میں جبکہ ہماری ہندوستانی فلم انڈسٹری پر ادبار کے بادل منڈلا رہے ہیں اور اکثر فلمساز زندگی اور آرٹ کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر محض تجارتی کامیابی کی دھن میں بہ یک وقت قتل اور خودکشی کے مرتکب ہو رہے ہیں، خواجہ احمد عباس نے "منا" بنا کر فلم انڈسٹری اور ملک کے عوام پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ خواجہ صاحب کے اس کارنامے سے ان کے ہم پیشہ لوگ کیا سبق لیں گے۔ انھیں تیوروں کے ہار ملیں گے یا سخت تنقیدیں برداشت کرنی ہوں گی۔

لیکن جہاں تک ہندوستانی عوام کا تعلق ہے میں بہت پر امید ہوں اور جہاں جہاں "منا" دکھایا جا چکا ہے وہاں کی رپورٹ میری امید کو یقین میں بدل رہی ہے۔ صاف اور مختصر الفاظ میں بات صرف اتنی ہے کہ منا جس طرح فنی لحاظ سے کامیاب ہے تجارتی نقطہ نظر سے بھی اسے اسی طرح کامیاب رہنا چاہیے۔ ہندوستانی عوام کو یہ ثابت کر دکھانا چاہیے کہ وہ خوبی اور حسن اور سچائی اور عظمت کی قدر جانتے ہیں اور یہ اسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہر وہ ہندوستانی جو فلم دیکھنے کی استطاعت رکھتا ہے اپنے ملک کی اس گرانقدر تخلیق ا اس شاندار کارنامہ کو دیکھنے سے محروم نہ رہے۔

"منا" جیسی تصویروں کی مقبولیت ہی ہندوستان کے گمراہ فلمسازوں کے شانے ہلا سکتی ہے اور انھیں غفلت اور غرض مندی کی نیند سے بیدار کر کے "منا" کی طرح بہترین تصویریں بنانے کی طرف مائل کر سکتی ہے۔

●

ہوا اور موجیں اس ملاح کے ساتھ ہوتی ہیں جس کے ساتھ ارادہ ہو۔

ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان

کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی

20 SEP 1955

سب رس

ماہنامہ
حیدرآباد دکن

جلد (۱۸) | اپریل تا جولائی ۱۹۵۵ء اگست | شمارہ ۸۴۳

نگراں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ادارہ

رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی

سالانہ چندہ چھ روپے سکہ ہند

قیمت ایک روپیہ

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے "دار الطباعت" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

فہرست

پیارے لال شاکر میرٹھی
کے خطوط

(۱)

بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد

لکھنؤ
۱۵ جنوری ۱۹۱۲ء

العصر
اے ہائی کلاس السٹریٹڈ منتھلی

عالیجناب مہاراجہ بہادر دامت فیوضہم۔

آداب عرض۔

جناب کو شاید یاد ہوگا کہ میں نے الہ آباد سے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا۔ میں نے کالیداس کی نظم "رتو سنگھار" کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے پروفیسر اقبال کو بھی اس کے متعلق تحریر کیا تھا اور غالباً انھوں نے بھی جناب کو تحریر کیا ہوگا کہ میں اس کتاب کو جناب کے نام نامی پر معنون کرنا چاہتا ہوں۔

اب وہ کتاب پندرہ سو کی تعداد میں چھپ رہی ہے۔ جو ڈیڈیکیشن میں نے لکھا ہے اس کی نقل جناب کے ملاحظہ کے لئے ارسال خدمت ہے۔

جناب کا عطیہ مضمون "بھاکا کی شاعری" نومبر کے "العصر" میں درج ہوا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی العصر پر نظر عنایت مبذول فرمائیے گا۔

ارادہ ہے کہ جنوری میں حیدرآباد دکن آؤں۔ اگر خدا کی مرضی سے ایسا ممکن ہوا تو قدمبوسی کی عزت حاصل کروں گا۔

زیادہ ادب۔

نیازکیش
پیارے لال شاکر
مالک و ایڈیٹر رسالہ "العصر" لکھنؤ

(۲)

دفتر رسالہ العصر
لکھنؤ۔ ۲۶ر فروری ۱۹۱۴ء

مرزا پبلشنگ کمپنی
لٹریری اینڈ سائنٹفک پبلشرز

بجناب ہز اکسلنسی مہاراجہ بہادر راجہ راجایان راجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد یمین السلطنت جی۔ سی۔ آئی۔ ای

عالیجاہ — آنجناب کے ارشاد کے بموجب اکسیر سخن کی (۲۵) جلدیں بصیغہ رجسٹری آج کی ڈاک سے روانہ خدمت عالی کی گئی ہیں۔ امیدوار ہوں کہ ان کو قبول فرما کر مرہون منت فرمائیے گا۔

جناب نے حکم فرمایا تھا کہ میں کتب مذکور بذریعہ ویلیو پے ایبل ارسال خدمت کر دوں۔ لیکن میں نے عمداً اس کارروائی سے گریز کیا ہے۔ جو کچھ جناب عنایت فرمائیں گے وہ دلی شکریہ کی موجب ہوگی اور یہ نہ صرف مجھ پر بلکہ زبان اردو پر جناب کا احسان عظیم ہوگا۔ کیونکہ العصر کے اجرا کا سب سے بڑا مقصد زبان اردو کی خدمت کرنا ہے۔

اکسیر سخن کے انطباع کا انتظام اس وقت کیا گیا تھا جب کہ میری مالی حالت درست تھی اور اسی خیال سے میں نے پندرہ سو جلدیں اس کی طبع کرائی تھیں۔ اتفاقاً بنک کا دیوالیہ نکلنے کے باعث میری ساری پونجی (پونے دو ہزار روپے) ضائع ہوگئی۔ جب اکسیر سخن چھپ کر تیار ہوئی تو دوسری آفت کا سامنا کرنا پڑا کہ مطبع کا بل ادا کرنے کے لئے کچھ پاس نہ تھا۔

العصر کی اشاعت کا بھی اب جدید انتظام کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ ہفتہ عشرہ میں پرچہ حاضر خدمت ہوگا۔

امید ہے کہ جناب کی طرف سے جلد مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع عنایت فرمایا جائے گا۔ زیادہ ادب

خادم

پیارے لال شاکر

—(۳)—

بنام صادق حسین صاحب عبار

منروا پبلشنگ کمپنی
لٹریری اینڈ سائنٹفک پبلشرز

آفس آف العصر
لکھنؤ۔ ۱۹ر مارچ ۱۹۱۴ء

جناب مکرم بندہ تسلیم۔

گرامی نامہ مورخہ ۱۰ر مارچ موصول ہو کر باعث مسرت ہوا۔ میں نہایت خوش ہوں کہ عالیجناب ہز اکسلنسی سر مہاراجہ بہادر یمین السلطنت نے "اکسیر سخن" کو پسند فرمایا اور کشادہ دلی کے ساتھ داد دی۔ آپ عنایت فرما کر سرکار دام اقبالہٗ کی خدمت میں میری طرف سے اس عزت افزائی کا شکریہ عرض کر دیجئے۔ نیز سرکار معزز نے جو دو سو روپے کلدار بطور انعام عطا فرمائے ہیں اس کے لئے بھی پیشگی شکریہ عرض کرتا ہوں۔

اس سے پیشتر ہی میں یہ عریضہ ارسال کر چکا ہوتا۔ مگر انعام مذکور کا انتظار کرتا رہا کہ رسید و شکریہ دونوں ایک ساتھ ہی تحریر کر دوں۔ چونکہ اب تک منی آرڈر نہیں ملا لہٰذا میں نے خیال کیا کہ شاید کثرت کار کے باعث آپ کو خیال نہ رہا ہو۔ اب یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں۔ اگر اب تک روپیہ روانہ نہ کیا ہو تو عنایت فرما کر بھجوا دیجئے۔ موجب شکریہ ہوگا۔ زیادہ نیاز۔

خادم
پیارے لال شاکر
مالک و ایڈیٹر رسالۂ العصر لکھنؤ

—(۴)—

منروا پریس۔ لکھنؤ
۱۳ر اپریل ۱۹۱۴ء

العصر
اے ہائی کلاس اسٹینڈرڈ اردو منتھلی

جناب مکرم بندہ تسلیم۔

میں کسی ضروری کام سے باہر چلا گیا تھا۔ واپس آکر کتب و رسلہ کا پیکٹ اور گرامی نامہ وصول ہوا۔ کتابوں کے لئے [illegible] میرے ساتھ ہے۔ میری جانب سے دلی شکریہ عرض کر دیجئے۔ آئندہ کے لئے

سرکار معظم نے جو امداد کی امید دلائی ہے اس کے لئے بھی قبل از وقت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے شاید اس سے پیشتر عرض کیا تھا کہ بنکوں کا دیوالیہ نکلنے کے باعث میری تمام پونجی (بقدر ۱۴۰۰۷ روپے) ضائع ہو گئی۔ اسی وجہ سے العصر معرض التوا میں رہا۔

عالیجناب ہزاکسلنسی نے جو دو سو روپے اکسیر سخن کے صلہ میں بطور انعام مرحمت فرمائے ہیں ان سے "العصر" کی از سر نو اشاعت میں بہت امداد ملی ہے۔ مجھے اس بات سے زیادہ مسرت ہے کہ آنجناب نے قدر دانی فرما کر میری ہمت بندھائی۔ اس لئے کہ اب میرا ارادہ ہے کہ کالیداس کی دوسری نظم "میگھ دوت" (قاصد ابر) کا بھی اردو نظم میں ترجمہ کر دوں۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اکسیر سخن دس، گیارہ ماہ کی مدت میں تیار ہوئی تھی۔ سنسکرت کے ایک ایک شعر نے تین تین، چار چار دن لئے۔ میں نے اس بات کی بہت کوشش کی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اختصار سے کام لوں اور اسی اختصار کی پابندی کی وجہ سے زیادہ فکر اور دماغ سوزی سے کام لینا پڑا تھا۔

بزم خیال کا حق تصنیف سرکار معظم نے بلحاظ ہمدردی مجھے عنایت فرمایا ہے اس کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد اس کو شائع کر کے نفع اٹھا سکوں۔ آجکل میری حالت بہت خراب ہے۔ جیسا کہ آپ کو واضح ہو چکا ہوگا اور کتاب اس قدر ضخیم ہے کہ اس پر لاگت بھی زیادہ آئے گی۔ اس قدر جرات بھی نہیں کر سکتا کہ سرکار معظم سے اس کی اشاعت کے لئے اعانت کی درخواست کر دوں۔ بہر حال میں فکر میں ہوں کہ کیوں کر بزم خیال کو جلد شائع کر دوں۔ یقین ہے کہ کچھ انتظام ہو سکے گا۔

میرا ارادہ ہے کہ جدید ایڈیشن میں بجائے تین جلدوں کے ایک ہی جلد مکمل شائع کی جائے۔ ۲۰×۲۶/۸ کے سائز پر قریب ساڑھے پانچ سو صفحے ضخامت ہوگی۔

سرکار معظم کی خدمت میں میری جانب سے ان کی دلی ہمدردی و قدردانی کا دلی شکریہ ضرور عرض کر دیجئے۔ امید ہے کہ آپ بھی میرے حال زار پر ترحم کی نظر فرماتے رہیں گے۔ آپ کی ذات سے بھی مجھے سفارشی امداد کی توقع ہے۔ زیادہ نیاز۔

خادم

پیارے لال شاکر

―――(۵)―――

العصر

اے ہائی کلاس اسٹینڈرڈ اردو منتھلی

ابریس۔ لکھنؤ

۵ جون ۱۹۱۴ء

جناب مکرم بندہ تسلیم۔

عرصہ سے جناب نے یاد نہیں فرمایا۔ جناب ہزاکسلنسی کی نظم "ریویو اکسیر سخن" کے جواب میں بندہ نے بطور شکریہ ایک نیاز نامہ ارسال خدمت کیا تھا۔ اس کے جواب سے ابھی تک محروم ہوں۔ امید واثق ہے کہ عدیم الفرصتی سے ہو، اس کی کوئی اور وجہ نہ ہوگی۔

میں العصر کی توسیع اشاعت و ترقی کی غرض سے اس ماہ میں حیدرآباد آنے والا ہوں۔ چونکہ وہاں میرا کوئی ایسا شناسا یا جان پہچان نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے رہائش کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے لہٰذا جناب کو تکلیف دیتا ہوں۔ براہ نوازش مطلع فرمائیے کہ حیدرآباد میں ایسا ہوٹل کونسا ہے جہاں ہر طرح کا آرام ہو اور اس کے ساتھ ہی جناب ہزاکسلنسی بہادر کی ڈیوڑھی کے قریب ہو کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے میں آسانی ہو۔ امید ہے کہ اس تکلیف دہی کے لئے معاف فرمائیے گا۔ وہاں میرا قیام

صرف چند روز ہوگا۔ اگر زیادہ دن تک وہاں قیام کرنا پڑا تو میں خود انتظام کر لوں گا۔ جناب ہزایکسلنسی بہادر کی خدمت میں میری طرف سے بندگی عرض کر دیجئے گا۔ والتسلیم۔

خادم
پیارے لال شاکر
از دفتر رسالہ "العصر" لکھنؤ

(۶)

بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر
حیدر آباد دکن

سرکار والا — آداب گذارش ہے کہ کل شام میں نہ جا سکا کیونکہ دھوبی کپڑے نہیں لایا۔ آج لانے کو کہا ہے۔ امید ہے کہ آج شب کو میں روانہ لکھنؤ ہو جاؤں گا۔

سرکار کے حسب الحکم یاد دہی کے طور پر میں یہ عریضہ لکھتا ہوں۔

(۱) (۱) اعلیٰ حضرت کی تصویر (۲) مہاراجہ چندو لال بہادر کی تصویر
(۳) مہاراجہ نریندر بہادر کی تصویر (۴) سرکار کی تصویر

یہ چاروں تصویریں اگر جلد مجھے لکھنؤ بھجوا دی جائیں تو باعث شکریہ ہوگا۔ سرکار کی تصویر دیوان کے لئے بھی درکار ہوگی سو یہی اس کے کام بھی آ جائے گی۔

(۲) "قدوم سلطانی" کے تصویروں کے بلاک اور مہاراجہ چندو لال بہادر کی تصویر کا بلاک ٹھیکہ کمپنی کو ہدایت کر دی کہ میرے پتہ پر لکھنؤ بھیج دیں۔

(۳) سرکار کی دیوان کی صحت کے لئے مولوی رحمت اللہ رعد صاحب کو لکھ دیا جائے کہ پروف مع اصل مجھے بھیج دیا جایا کرے۔ نیز مطلوبہ اوراق مع اصل بھی ارسال کر دیا جائے تاکہ غلط نامہ مرتب ہو سکے۔

(۴) مطبوعہ اوراق کی مضمون کی تکمیل کے لئے بھی ضرورت ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی گذارش ہے کہ نواب فخر الملک بہادر سے سرکار ضرور میری سفارش فرمائیں کہ کوئی ملازمت مل جائے۔ جبکہ خود انھوں نے سرکار سے وعدہ فرمایا ہے تو سرکار کا ذرا سا اشارہ بھی کافی ہوگا۔ یہاں مستقل قیام کا میرا انتظام ہو جائے گا تو گویا میری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور اگر سرکار توجہ فرمائیں گے تو میں ضرور مراد کو پہنچ جاؤں گا۔ انشاء اللہ۔ زیادہ ادب

دعاگو
پیارے لال شاکر

(۷)

لکھنؤ — ۹ اگست ۱۹۱۶ء

سرکار والا — بعد ما وجب گزارش ہے کہ جس روز میں حیدر آباد سے روانہ ہونے والا تھا اسی شام کو مجھ تار ملا کہ بندہ زادہ (عمر ساڑھے چار سال) بالا خانہ سے گر گیا ہے۔ سخت پریشانی اور بے اطمینانی کی حالت میں میں وہاں سے روانہ ہوا۔ میرے یہاں پہنچنے سے پیشتر ہی بہت کچھ دوڑ دھوپ ہو چکی تھی۔ آتے ہی میں خود بھی اس کے علاج وغیرہ کا کوشش

مہیا ہوگیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بچہ اب بالکل تندرست ہے۔

"قدوم سلطانی" کا ترجمہ شروع کر دیا گیا ہے اور یقین ہے کہ جلد حاضر خدمت کر سکوں گا۔ انشاء اللہ۔

نامی پریس سے دیوان کے مطبوعہ اوراق اور آئندہ پروف اب تک نہیں آئے۔ غالباً رعد صاحب کو اب تک تحریر نہ کیا گیا ہوگا۔ اگر دفتر کو ہدایت کر دی جائے تو باعث صد شکریہ و احسان ہوگا۔ سرکار والا کے حالات وغیرہ کی تکمیل کے لئے دیوان کے مطبوعہ اوراق کی مجھے بے حد ضرورت ہے۔

یقین ہے کہ نواب فخر الملک بہادر کے یہاں سے میری گذارش کے متعلق میرے حق میں مفید جواب ملا ہوگا۔ اب تک مجھے کوئی اطلاع براہ راست نہیں ملی۔ سرکار کی توجہ درکار ہے۔

سرکار والا نے جو دیباچہ "کلیات شاداں" پر تحریر فرمایا ہے میری خواہش ہے کہ میں اس کو "العصر" میں بھی شائع کر دوں۔ اس کے لئے تصویر کی ضرورت ہوگی۔ میں نے سرکار سے تصاویر کے متعلق عرض کیا تھا اور حسب الحکم غبار صاحب کو بھی یاد دہی کے لئے کہہ دیا تھا۔ غالباً تصاویر میرے نام روانہ کر دی گئی ہوں گی اور یا اس عریضہ کے پہنچنے پر روانہ کر دی جائیں گی۔ میں نے چار تصویروں کے لئے گذارش کی تھی۔ (۱) مہاراجہ چندو لال بہادر (۲) سرکار والا (۳) مہاراجہ نریندر بہادر (۴) اعلیٰحضرت اور سرکار نے ان چاروں کے لئے حکم فرمایا تھا۔ مجھے دیدی جائیں۔ ان کیلئے پھر عرض کرتا ہوں۔ زیادہ ادب۔

خادم
پیارے لال شاکر (میرٹھی)

(۸)

بتوسط مسٹر اے جارس اینڈ کو
دی مال لکھنؤ

۵ مارچ ۱۹۱۸ء

سرکار عالی — آداب کے بعد گذارش ہے کہ یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء سے میں سخت مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اکتوبر میں نیاز مند نے ایک مطبوعہ خط ارسال خدمت کیا تھا جس سے سرکار عالی کو واضح ہوا ہوگا کہ نولکشور پریس نے اپنے مطالبہ کی ادائیگی کے لئے میرے اسباب کو قرق کرا لیا تھا۔ کئی دفعہ درخواست دے دے کر میں نیلام ملتوی کراتا رہا۔ مگر آخری تاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۱۸ء نیلام کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ ۲ مارچ کو تمام اسباب وغیرہ سرکاری مال خانہ میں داخل ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے پھر درخواست دی اور بمشکل بہزار دقت ایک ماہ کی اور مہلت لی۔ یہ گویا آخری مہلت ہے۔ اگر اس اثناء میں روپیہ ادا ہوگیا تو خیر ورنہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۸ء کے بعد اسباب وغیرہ نیلام ہو جائے گا۔ چونکہ مکان سے سب چیزیں اٹھ گئی ہیں لہذا مجبوراً میں اپنے اہل و عیال کو ہمراہ لے کر ایک دوست کے گھر میں پناہ گزیں ہوں۔ اس وقت میں ایسی پریشانی اور بے سر و سامانی کی حالت میں ہوں کہ خدا دشمن کو بھی ایسا دن نہ دکھائے۔ نہ صرف میں بلکہ میرے بال بچے بھی دوسروں کے کپڑے پہن پہن کر اپنے دن کاٹ رہے ہیں۔ سب کاروبار بند ہے۔ العصر البتہ جاری ہے کہ اس کی اشاعت کا دو سالہ معاہدہ تھا۔ اس ماہ کے آخر میں وہ معاہدہ ختم ہو جائیگا۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے متعلق خود مجھے علم نہیں۔ خدا اس مصیبت سے نجات دے تو پھر آئندہ کے لئے بھی انتظام ممکن ہوگا۔

مطبع کا مطالبہ تو زیادہ تھا مگر اس پانچ ماہ میں تقریباً ایک ثلث رقم میں عدالت میں داخل کر چکا ہوں۔ اب (۱۱۰۰) باقی ہیں۔ عدالتی مصارف اور پانچ ماہ کا سود (بحساب تین فیصد سالانہ) اس رقم میں اور اضافہ ہوگا۔ میں نے

بوساطت نواب عماد الملک بہادر سر فریدوں جنگ سے کئی بار درخواست کی مگر اب تک انھوں نے توجہ نہیں فرمائی ورنہ میں آسانی اس مصیبت سے بچ جاتا۔ آج میں نے پھر ایک عریضہ نواب عماد الملک بہادر کی خدمت میں ارسال ہے۔ کیا تعجب کہ وہ پھر ایک دفعہ سر فریدوں جنگ کو میری حالت زار کی طرف توجہ دلائیں۔

یہ عریضہ میں نے سرکار عالی کی خدمت میں اس غرض سے ارسال کیا ہے کہ آنجناب پر میری موجودہ حالت منکشف ہو جائے۔ چونکہ سرکار نے ہمیشہ مجھ پر کرم فرمایا ہے اور وقت بے وقت میری مدد فرمائی ہے۔ لہٰذا متوقع ہو اس وقت بھی میری مدد فرمائے گا۔ اس وقت میں جناب سے صرف ڈھائی سو روپے کا سوال کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے ا ہے کہ اگر سر فریدوں جنگ بہادر امداد پر آمادہ ہو جائیں گے تو پانچ سو روپے نظام گورنمنٹ سے مل جائے گا۔۔ سرکار عالی کی گزشتہ عنایات کی بنا پر امید ہے کہ اس وقت میری ضرور دستگیری فرمائیں گے اور نہ صرف مجھ کو اور بیوی کو بلکہ چھ معصوم بچوں کو تباہی و بربادی سے بچائیں گے۔ زیادہ باادب۔

اس عریضہ کا جواب اس پتہ پر عنایت ہو جو میں نے انگریزی میں پیشانی پر لکھ دیا ہے۔

منتظر عنایات

خادم۔ پیارے لال شاکر

(۱)

بتوسط مسرز اے عارس اینڈ کو

دی مال لکھنؤ

۱۸ مارچ ۱۹۱۸ء

سرکار عالی — بعد ماجب گزارش ہے کہ بندہ نے ایک عریضہ ۵ مارچ سنہ حال کو ارسال خدمت کیا جس میں اپنی موجودہ مصیبت و پریشانی کی کیفیت درج کر کے جناب سے کچھ امداد چاہی تھی تاکہ آنے والی ذلت و رسو سے محفوظ رہ سکوں۔

میں پھر سرکار عالی کو اس عریضہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں اور متوقع ہوں کہ اس مصیبت کے وقت میں ضرور یہ امداد فرمائیں گے۔ وہ عریضہ میں نے بڑی امیدوں کے ساتھ ابلاغ خدمت کیا تھا اور خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم اور سرکار کی ذات والا صفات سے امید ہے کہ میں شرمندہ نہ ہونگا۔

سرکار عالی نے کئی بار مجھ غریب پر رحم فرمایا ہے۔ مگر یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے زبان کھول کر دست سوال در کیا ہے۔ جناب خود خیال فرما سکتے ہیں کہ اگر موجودہ پریشانی اور مصیبت سے بچنے کا کوئی اور چارہ کار ہوتا تو میں سرکار کو تکلیف دینے کی جراءت نہ کرتا۔ جب کہیں کوئی اور سہارا نظر نہیں آیا تو میں نے سرکار کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا ہے کہ اپنا محسن اور سرپرست خیال کرتا ہوں زیادہ ادب

خادم

پیارے لال شاکر

مالک و ایڈیٹر رسالہ "العصر" لکھنؤ

منتخب دیوانہا

از:- جناب تحسین سروری صاحب

"اردو مثنوی کا دکنی دور" کے عنوان سے اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۵۲ء و فروری ۱۹۵۳ء کے مشترکہ شمارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا مضمون چھپا ہے جس میں موصوف نے دکنی مثنویات کے ارتقاء اور ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور دکنی مثنویات کی فہرست بھی دے دی ہے۔ دور دکن کے قدیم دور کی مثنویات میں سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" پر کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس مثنوی کی فنی خرابیوں اور شاعرانہ خوبیوں پر بھی بڑی تیز نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب سراج کی غزل گوئی پر چند جملے تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان کا دیوان "منتخب دیوانہا" غزلیات کی عمدگی کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا ہے"۔

مجھے اس مضمون میں "منتخب دیوانہا" ہی کے سلسلے میں کچھ لکھنا ہے۔ اس لئے کہ "منتخب دیوانہا" نہ تو سراج کے دیوان کا نام ہے اور نہ سراج کی غزلیات کی عمدگی کی وجہ سے اس کی شہرت ہے۔

سراج اورنگ آبادی پر سب سے پہلے مولوی ظفر یاب خاں نے ایک مضمون لکھا تھا جو مرحوم ضامن کنتوری کے رسالہ "لسان الملک" (۱۹۲۲ء) میں شائع ہوا اور ان کی مثنوی "بوستان خیال" پر مولانا احسن مارہروی مرحوم کا ایک مضمون رسالہ "سہیل" بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد مرقع سخن (جلد اول)، مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور میں بھی سراج کے حالات اور ان کے کلام پر ایک مقالہ چھپا۔[1] آخر میں دیوان سراج کے متعدد قلمی نسخوں اور مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں کو سامنے رکھ کر پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب نے "کلیات سراج" مرتب کیا جو ۱۹۴۰ء میں مجلس اشاعت دکنی مخطوطات (حیدرآباد دکن) کی طرف سے چھپ چکا ہے۔ یہ کلیات بڑی تقطیع کے (۶۷۴) صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں مرتب کا (۱۲۸) صفحات کا فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے جس میں "سراج، ان کی شاعری" اور ان کے تلامذہ و احباب کا پڑی خوبی سے جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا مضمون پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر صرف مولانا احسن مرحوم ...... کا مضمون تھا اور انھیں کلیات سراج کے طبع ہونے کا کوئی علم نہیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ سراج کی دوسری مثنویات کا ذکر نہ کر سکے۔ حالانکہ کلیات میں سراج کی بارہ مثنویات شریک ہیں۔

---

[1] مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ حیدرآباد کے ایک قدیم رسالہ "سحر" میں ۱۳۴۲ء کے کسی شمارے میں سراج اورنگ آباد پر ایک مضمون چھپا تھا۔ اس کے علاوہ کئی سال قبل "معارف" (اعظم گڈھ) میں بھی کسی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا۔ افسوس کہ یہ دونوں مضامین مجھے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ پروفیسر سروری صاحب نے بھی ان کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ شاید موصوف کی نظر سے بھی یہ مضامین نہیں گزرے۔ (تحسین سروری)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ سید عبداللہ صاحب نے سراج کے دیوان کا نام جو "منتخب دیوانہا" بتایا ہے سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ "منتخب دیوانہا" سراج کی ایک تالیف کا نام ہے۔ جس میں فارسی کے اساتذۂ قدیم و جدید کا منتخب کلام بترتیب حروف تہجی اسمائے شعراء در رعایت ردیف جمع کیا گیا ہے۔ جو سراج نے ۱۱۵۲ھ کے بعد شعرگوئی ترک کر کے یہ دلچسپ مشغلہ اختیار کیا تھا جس کی تکمیل ۱۱۶۹ھ میں ہوئی اور "منتخب دیوانہا" اس کا تاریخی نام ہے۔ پروفیسر سروری صاحب کے مقدمۂ کلیات سراج اور دیگر مضامین میں سراج کی اس تالیف کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اس کی اہمیت خاص کر اس لئے ہے کہ اس کے شروع میں سراج نے ایک دیباچہ لکھا جس میں اپنے کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ اسی کا اقتباس لچھمی نارائن شفیق نے اپنے تذکروں "چمنستان شعراء" (۱۱۷۵ھ) اور "گل رعنا" (۱۱۸۲ھ) میں پیش کیا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سید عبداللہ صاحب نے سراج کے حالات پڑھتے وقت "منتخب دیوانہا" کا جہاں ذکر آیا ہے کوئی توجہ نہیں دی۔ موصوف کو صرف "بوستان خیال" کے متعلق مقالہ تیار کرنا تھا۔ لیکن چاہئے تھا کہ جس شاعر پر وہ لکھ رہے ہیں اس کی دوسری تصنیفات و تالیفات کے متعلق بھی معلومات حاصل کرتے۔ کم از کم "چمنستان شعراء" ہی دیکھ لیتے۔

"منتخب دیوانہا" کا اب تک صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہوا ہے جو کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ لیکن اس میں سراج کا وہ دیباچہ نہیں جس کے نہ ملنے کا مرتب "کلیات سراج" کو بڑا افسوس ہے۔

پروفیسر سروری صاحب کی دسترس میں جس قدر مواد تھا اس سے کام لے کر موصوف نے سراج کے منتشر حالات کو بڑے عمدہ پیرائے میں یکجا کر دیا ہے۔ تاہم سراج کے خاندانی حالات، ان کی صحیح تاریخ پیدائش اور تعلیم و تربیت کا حال نہ معلوم ہو سکا تھا۔ منتخب دیوانہا سے شفیق نے سراج کے خود نوشت حالات کا جو ایک حصہ نقل کیا ہے اسی کو پروفیسر سروری صاحب اور دیگر اہل تحقیق غنیمت جانتے تھے۔ اتفاق سے سراج کے مرید و جانشین شاہ پروانہ کی مرتبہ کتاب موسومہ "انوار السراج" (۱۲۰۲ھ) کا ایک ناقص الآخر نسخہ مجھے مل گیا۔ اس نسخے میں سراج کا حسب و نسب اور ان کے خاندان کا مختصر سا حال درج ہے۔ اور اس میں سراج اور ان کے عہد سے متعلق کچھ ایسے بھی واقعات موجود ہیں جن کا کسی دوسری کتاب میں ملنا دشوار ہے۔[1] پروفیسر سروری صاحب نے سراج کے ایک شعر کی مدد سے ان کا سن پیدائش ۱۱۲۸ھ قرار دیا تھا۔ لیکن پروانہ نے دوشنبہ ۱۳ صفر ۱۱۲۴ھ کو پیدا ہونے کی اطلاع دی ہے۔ شاہ پروانہ نے سراج کے جو حالات لکھے ہیں۔ اس لیے مستند ہیں کہ اس نے خود سراج کی زبانی سنے تھے۔ اسی کتاب میں پروانہ نے ایک اور نئی بات یہ بتائی ہے کہ سراج کے والد درویش محمدؒ نے "ظہور راحد" سے سراج کی پیدائش کا سن نکالا تھا۔

"انوار السراج" میں سراج کا تقریباً سارا اردو کلام بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ "منتخب دیوانہا" اور اس کا مکمل دیباچہ بھی اس میں موجود ہے۔ میں نے اس نسخہ سے استفادہ کر کے رسالہ اردو بابتہ ماہ اپریل ۱۹۵۱ء میں ایک مضمون "سراج اور پروانہ" کے عنوان سے شائع کروایا تھا۔ "منتخب دیوانہا" کے متعلق لوگوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ شفیق نے اس کے دیباچے کی جو عبارت نقل کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی شاید اس کا کوئی ایسا ٹکڑا رہ گیا ہے جس میں سراج نے کچھ اور اپنے حالات بیان کئے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں شفیق کی منقولہ عبارت کو چھوڑ کر دیباچہ کا بقیہ حصہ اور غیر اہم باتوں کو خارج

---

[1] شاہ پروانہ نے اسی کتاب میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ انھوں نے ایک اور کتاب بھی "اضواء السراج" کے نام سے مرتب کی تھی جس میں شاہ سراج کے ملفوظات کو جمع کیا گیا ہے اور اس میں سراج کے حالات زندگی زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں لیکن اس کتاب کا اب تک کوئی نسخہ دستیاب ہوا نہ اس کا کہیں ذکر آیا۔ (محسین سروری)

پیش کر دیا تھا' اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ شفیق نے جو عبارت نقل کی ہے' اس کے علاوہ ایسی کوئی بات نہیں رہ گئی جو سراج کے حالات پر بہتر روشنی ڈال سکے۔

سراج اورنگ آبادی فارسی کے بھی شاعر تھے، لیکن کتب خانۂ آصفیہ کے نسخۂ "منتخب دیوانہا" میں ان کے فارسی کے اشعار نہ ہونے سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے اپنی طبیعت کے انکسار کی وجہ سے اپنے شعروں کو اس انتخاب میں جگہ نہ دی۔ لیکن پروانہ کے اسی نسخے نے اس قیاس کو بھی غلط ثابت کر دیا۔ دراصل سراج نے دیباچے کی عبارت ختم کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "میرا کلام اس لائق نہیں کہ سخن سنجان کامل کے ساتھ شامل کیا جائے۔ اس لئے اپنے چند شعر اس مقام پر نمونے کے طور پر لکھ دیتا ہوں تاکہ سخن فہموں کو یہ معلوم ہو کہ اس انتخاب کا مولف موزوں طبع بھی ہے"۔ اس جگہ تمام و کمال فارسی کے وہی اشعار ہیں جو "تذکرۂ شعرائے دکن" میں عبدالجبار خاں آصفی نے نقل کئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان اشعار کی ترتیب بھی دونوں میں ایک سی ہے۔ آصفی کے تذکرے میں ان شعروں کو دیکھ کر پروفیسر سروری صاحب نے خیال کر لیا تھا کہ مولف تذکرہ کی نظر سے سراج کا کوئی فارسی دیوان بھی گزرا ہوگا۔ میں نے سروری صاحب کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کیا تھا کہ آصفی نے "منتخب دیوانہا" کا کوئی ایسا نسخہ ضرور دیکھا ہوگا جس میں سراج کا مکمل دیباچہ بھی تھا اور اسی دیباچہ سے اپنے تذکرہ میں انھوں نے سراج کے فارسی اشعار نقل کر لئے۔

البتہ اپنے مضمون میں میں نے سراج کا ایک قطعہ پیش نہیں کیا تھا جس سے "منتخب دیوانہا" کی تاریخ نکلتی ہے۔ یہ قطعہ رباعی کی بحر میں ہے اور اس عبارت کے ساتھ سراج نے اسے لکھا ہے۔

"چوں تالیفش در سنہ ہشت و ستین و مایہ و الف
صورت بست، رباعی بدینگونہ بر صفحہ نشست"

این نسخہ کہ وارد ز سخن عنوانہا　　یک قطعہ زمین است در و بستانہا
چوں منتخب کلام ہر دیوانش　　تاریخ شدہ منتخب دیوانہا

شاہ پروانہ کی ہستی سراج کے سلسلے میں بڑی اہم ہے۔ سراج کے وہ حد درجہ معتقد اور ارشد تلامذہ میں تھے اور یہ سراج بھی انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے انتقال کے چار ماہ بائیس روز قبل پروانہ کو اپنا "وصی وارث و جانشین" بنا دیا تھا۔ سراج کے انتقال کے بعد پروانہ سراج کے شاگرد اور دوست میر عبدی متین سے شاعری میں اصلاح لیتے رہے اور دیگر علوم و فنون میں میر غلام علی آزاد بلگرامی جیسے یکتائے روزگار سے مستفیض ہونے کا انھیں موقع ملا۔

ان کا نام ضیاء الدین اور پروانہ تخلص تھا۔ شاہ پروانہ کے نام سے مشہور تھے۔ برہان پور میں پیدا ہوئے لیکن اورنگ آباد میں نشو و نما پائی۔ ان کے حالات تذکروں وغیرہ میں بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن خود انھوں نے "انوار السراج" کے شروع میں اپنے بھی حالات سپرد تحریر کئے ہیں۔ ان کا کلام سوز و گداز سے بھرا ہے لیکن کمیاب ہے۔ "انوار السراج" کے حاشیے پر ان کا کلام موجود ہے جو سراج کے تتبع میں لکھا گیا ہے لیکن جیسا کہ شروع میں کہا گیا یہ نسخہ چونکہ آخر میں ناقص ہے اس لئے اس میں حرف الف کی ردیف کی کچھ غزلیں ہیں۔ البتہ مثنویات پوری موجود ہیں۔

یہ سب باتیں میں نے اپنے مضمون میں کافی تفصیل سے بیان کر دی تھیں پھر ان کو دہرانا بے فائدہ ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ایک غلط فہمی کو دور کرنے میں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ شاہ پروانہ کے نسخۂ "انوار السراج" پر ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ کسی دوسرے مضمون میں اس کے دوسرے پہلوؤں کو پیش

کیا جائے گا۔ البتہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "منتخب دیوانہا" کا مکمل دیباچہ یہاں نقل کر دیا جائے۔ اس لئے یہ کوئی غیر معمولی چیز نہ ہونے کے باوجود سراج اورنگ آبادی جیسے شاعر کی تحریر ہونے کی وجہ سے اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ اس دیباچے کا پھر کبھی دستیاب ہونا فی الحال ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس کے چھپنے سے اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت بھی ہوگی اور دستبرد زمانہ سے محفوظ بھی ہو جائے گا۔

دیباچہ منتخب دیوانہا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ کتاب شرح و بیان حمد سخن آفرینست کہ فہرست جمع اسمار صفاتے راجع بذات اوست و مطلع قصیدۂ کلام زبان نعت صاحب دینے است کہ رباعی اصحاب اخیار موزوں از حمایدِ صفات او خصوصاً فردِ منتخب غزل کائنات کہ حدیث لحمک لحمی و کلام انا و علی من نور واحد بذات شامیست و مثنوی رنگین آل طہ و لیین کہ کریمۂ انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس اہل البیت درشان او نازل ورد جان معنی آشنایان اسرار حقانیت وظیفہ زبان سخن سنجان فیض سبحانی چنانچہ ایں کمیچ زبان دبستان تحقیق سراج الدین حسینی اورنگ آبادی متخلص بہ سراج زبان حال بایں مقال مترنم دارد ؎

ز دیوان قضا دارم دو بیت منتخب از بر

محمد مطلع است و حسن مطلع حیدر و صفدر

لیکن زبان دریں مقدمات معترف بہ عجز و قصور است و طوالت کلام دریں امور نزدیک مختصر پسنداں نامنظور۔ لہٰذا بہ تحریر او جب رخصت روانی قلم میدہد کہ ایں فقیر از سن دوازدہ سالگی بہ غلبہ شوق بجہت ہفت سال جامۂ عریانی در بر داشتہ و بہ تکلیف نشۂ بے خودی اکثر در سواد روضۂ متبرکہ حضرت برہان الدین غریب شبہا بروزے آورد و از جوش بہار مستی اشعار شور انگیز و ابیات درد آمیز بہ زبان فارسی از کمین جان بر سر زبان می آمد و بہ اقتضائے احوال خامہ را بہ تحریر آن آشنا نمی ساخت احیاناً شوق مندی حاضر الوقت می بود بجہت طلاوت ذائقۂ طبع خود کاغذ را سیاہ می نمود اگر آں اشعار تمام بہ تحریر در آمد۔ دیوان ضخیم ترتیب می یافت چوں تقاضائے عمر قابل آں ہمہ سخن سنجہا نبود با ستماع آں موزونات حالے عالمی در ورطۂ تعجب افتادہ از جملہ الہامات بہ تصور می آورد بعد انقضائے مدت مسطورہ تلاش لذت تحقیق محرک رگ جاں گردید تا بآں وساطت بجناب معانی شریعت غرا مسالک طریقت الاخفیٰ واقف حقیقت المولے عارف معرفت الکبریٰ قتیبہ مریدان راسخ الیقین و صاحب الایمان کعبۂ مستفیضان کامل الصدق و البرہان حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمن چشتی کہ در سال مقدس درسنہ احدی و ستین و مایہ والف اتفاقی افتادہ مستعد ارادت گشتہ فیضیاب ارشاد گردید و جرعہ از بزم حمایۂ آں ساقی شراب ہدایۃ موافق حوصلہ خود چشید دراں ایام برائے پاس خاطر عزیز عبدالرسول خاں صاحب کہ برادر طریق ایں فقیر اند اکثر اشعار آمد۔ در زبان ریختہ بہ سلک سطور منسلک گشت ایشاں آں جواہر متفرق را کہ قریب پانچ ہزار بیت بود بترتیب ردیف مردف نمودہ۔ حصہ مشتاقان خاص گردید و رفتہ رفتہ شہرۂ تمام یافت کہ بعوام ہم رسیدہ و بعد چندے بہ لباس فاخرہ الفقر فخری ممتاز گردید و از بہان روز موافق امر مرشد برحق تا حالت تحریر کہ سال ہفدہم است۔ زبان از دامن سخن موزوں کشید۔ لیکن چوں سخن لذت سرشت ازلی بود اکثر بسیر گلزار اشعار استادان عندلیب طبع خود را

سروری ساخت و ہرجا دیوان اوستادرا شنید اگر بہ قیمت میسر می آمد غنیمت می انگاشت والا عاریتاً بوعدهٔ اتمام سیر می گرفت تا شناسد ہرکہ شد دلدادهٔ سخن بیت رنگین را بجائے بیت آبروے بتان آخر بخیال گذشت کہ این دعا زسر بگذر برده و اگر اتفاق سفر افتاد این بارگران صورت نمی بندد لااقل اکثرے دیوانہا شعراء قدیم و جدید و بعضے از تذکرہ ہائے ... ادله الی آخره سیر نموده چیزے کہ مرغوب طبع صاف پسند افتاد آنرا جدا بر صفحۂ قرطاس ثبت نموده بترتیب تہجی اسمار شعراء برعایت ردیف دیوان علیحده ترتیب داد نامش دیوان منتخب نہاد تا ہرگاه خار خار شوق رگ جان بجز اشید سیر این مجموعۂ رنگین تسلی میتواند بخشید و بعد فنا ترکیب عنصری ہر قدردان سخن کہ بہ گلگشت این گلشن بخران می نموده مطلع طبع خورسند ... بفاتحه خیر روح مولف را شاد نماید۔ چون تالیفش در سنہ تسعہ و ستین ومایہ و الف صورت بست رباعی تاریخ ... بر صفحہ نشست۔

این نسخہ کہ وارد زسخن عنوانہا | یک قطعہ زمین است در و بستانہا
چون منتخب کلام ہر دیوانست | تاریخ شده منتخب دیوانہا

... خلف پاره ہائے موزونات سابق این فقیر لیاقت آن ندارند کہ در سلک گوہر ہائے آبدار اشعار سخن سنجان کامل ... سلک شوند ازین جہت مشتے نمونہ خروارے بیتے چند بطریق یادگار درین جا نگارش یافت تا سخن فہمان رنگین ... دستے بہ تحسین برارند و دریابند کہ مولف این دیوان منتخب طبع موزونے در رشتہ و آن اینست۔

جلوهٔ دوست مرا نہ پرده کشیدم دیدم | انچہ از نغمۂ عشاق شنیدم دیدم
گل بیرنگ حقیقت کہ پیدا ماتم بود | ہمچو اشک از مژهٔ خویش چکیدم دیدم
دانہ ساں ریشۂ سرسبزی من دامن بود | خاک گردیدم و از خاک دمیدم دیدم

کاسر خونین جگراں قابل تحسین کردند | مژهٔ اشک فشاں دامن گلچین کردند
تاپدانند کہ حیراں پریرو ے بود | قبر دیوانہ ام از آئینہ سنگین کردند
بوسۂ چند ہوس دارم ازین لب شکراں | کز تبسم دہن آئینہ شیرین کردند

شوق من با مہر ہر خار کہ گلبازی کرد | چون قد یار بمن شیوۂ طنازی کرد
حیرت دید خبردار ز حالم بدلش | بے زباں آئینہ را آئینہ غمازی کرد
ہرکہ از سیر گلستان جمالش گلچید | آفرین بر نگہ بلبل شیرازی کرد

روے او از مے گلگوں عرق افشاں شده است | در پری خانہ آئینہ چراغاں شده است
گل بسر دار دو از سیر چمن می آید | چشم بد دور کہ امروز گلستاں شده است

از آبروے کج تو دلم کے سہل شود | شنیده ام کہ گوشت ز ناخن جدا شود

رنگ گل بوے سمن وارد و لیکن شعلہ خوست | لالہ ساں در سینہ دارم داغ نافرانیش

نورِ ایماں نیست شیخ معرفت اظہار را   قشقۂ کفرست داغِ سجدہ بر پیشانیش

سبزۂ صحن چمن خار کفِ پائے من است   سایہ پرورد خطِ پشت لب ایام توام

بیم شرم وصل او خو خیالم می کند   شکر للہ نیستم شرمندۂ روئے کسے

سخنے کز دہن تنگ تو بیروں آید   نکہتِ غنچۂ تصویرِ عدم مے دانم
چوں چراغِ سحر از جان شدہ ام سیر سراج   دامن افشاندن او بہر کرم مے دانم

سینہ صافاں در تلاشِ خود نمائی نیستند   بے غرض در خانۂ آئینہ ما آئیم ما

دل چو در وصفِ دہن تنگ تو نی کردم قلم   زیر مشق از ورقِ دیدہ ما عنقا می کرد

نمازِ عشق ادا کردنیست عاشق را   خوشم کہ دست زجانِ شستم و وضو کردم

بیگانہ است ازیں چمن سر بسر خزاں   ہر کس کہ ہمچو غنچہ بپاس دم آشناست
ہر صید دیدہ ایم ز صیاد رم کند   صیادِ ما ز صید بطرزِ رم آشناست

جاں دادن خونیں جگراں بے سبب نیست   از گوشۂ ابروے تو ایما شدہ باشد

شد سراپائے من از خطِ شعاعی روشن   ہر سر مو بہ تنم خارۂ تصویر کہ بود

آتشے در دلِ داسوختہ افتاد سراج   باز سیماب ز خاکستر اکسیر چکید

رباعی

اے آنکہ بہارِ گلشنِ امکانی   در پردہ نہاں بصورت انسانی
با ذاتِ احد توئی صفات احمدؐ   جاں را بدنے و وہم را جانی

اے آنکہ بخویشتن گرفتاری تو   بیجاست کہ در تلاش دیداری تو
کے جلوۂ مہر بر تو پرتو فگند   تا در کفِ سایۂ دیواری تو

تا بوالہوس از عشق پریشاں شدہ است   از کردۂ خویشتن پشیماں شدہ است
آں شوخ بجز مہرہ جمد حر نخرید   با سودۂ لخت دل چہ ارزاں شدہ است

حیدرآباد میں انگریزی تعلیم کا آغاز اور ارتقاء

از:- جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب

تاریخوں سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں انگریزی تعلیم بہت دیر سے آغاز ہوئی۔ برطانوی ہند کے خلاف انگریزی سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ تنفر رہا۔ اگرچہ عیسائی مشن کی جانب سے دو اسکول گرامر اسکول (چرچ آف انگلینڈ کی جانب سے) ۱۸۳۴ء میں قائم ہوا۔ دوسرا کچھ عرصہ کے بعد رومن کیتھولک چرچ کی جانب سے آل سینٹ اسکول قائم ہوا اردو اور انگریزی میں تعلیم ہوتی تھی لیکن ایک عرصہ دراز تک ان مدارس میں زیادہ تر پست اقوام کے لوگ جو عیسائی مذہب قبول کر لیتے تھے تعلیم پاتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلیٰ اور اوسط طبقے کے لڑکے ان مدارس میں نہیں پاتے تھے۔ البتہ ۱۸۸۰ء کے بعد اوسط اور اعلیٰ طبقہ کے لڑکے بھی یہاں تعلیم پانے لگے۔

۱۸۰۳ء سے ۱۸۴۶ء تک حکومت کا کوئی ایسا مدرسہ قائم نہیں ہوا تھا جس میں انگریزی تعلیم ہوتی ہو اور نہ مدارس مذکورہ مدرسوں کے علاوہ دوسرے کسی خانگی مدرسہ میں انگریزی کی تعلیم ہوتی تھی۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک جن مدرسوں کا پتہ چلتا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:-

مدرسہ حیدرآباد۔ مدرسہ فخریہ۔ مدرسہ مولوی فخر الدین۔ مدرسہ مولانا آزاد۔ مدرسہ عزات۔ مدرسہ نور الہدیٰ۔ مدرسہ میدان صاحب۔ مدرسہ ابو تراب۔ مدرسہ حسنیہ۔ مدرسہ شجاعیہ۔ مدرسہ فیض وغیرہ۔ ان تمام مدارس میں عربی، فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی انگریزی کی تعلیم قطعاً نہیں ہوتی تھی۔

(۱) حکومت نظام کی جانب سے اولاً ۱۸۴۶ء میں میڈیکل کالج قائم ہوا۔ یہاں ڈاکٹروں کی تعلیم اردو زبان میں ہوتی تھی۔ ۱۸۸۴ء تک اردو ہی میں تعلیم ہوتی رہی۔ کئی اشخاص نے اردو میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اچھی نام آوری حاصل کی تھی۔ ۱۸۸۴ء سے یہاں اردو زبان کے بجائے انگریزی میں تعلیم ہونے لگی۔ یہ انگریزی تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام تک ہوتی رہی۔ اس کے بعد پھر اردو میں تعلیم ہونے لگی تھی جو ۱۹۴۸ء تک بدستور باقی رہی۔ ۱۹۴۸ء سے پھر انگریزی میں تعلیم ہونے لگی۔

(۲) ۱۸۵۴ء میں حکومت نے مدرسہ دار العلوم قائم کیا۔ یہاں علوم مشرقی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ درس نظامیہ کے موسوم نصاب کی تعلیم ہوتی تھی۔ ۱۸۶۲ء تک یہی ٹریننگ اسکول تھا۔

۱۸۸۲ء میں جب حیدرآباد میں برطانوی ہند کے نظم و نسق کے اصول پر انتظام مملکت چلایا جانے لگا تو بتدریج یہ مسئلہ سامنے آیا کہ سررشتۂ تعلیم کی ترقی بھی برطانوی ہند کے اصول پر ہونی چاہئے اور مغربی علوم و فنون کے ساتھ انگریزی زبان ہی ذریعہ تعلیم دی جانی ضروری ہے۔ اس وقت برطانوی ہند میں تین یونیورسٹیاں کامیابی سے چل رہی تھیں (کلکتہ، بمبئی، مدراس) اور بعض جدید یونیورسٹیوں کی تجویز ہو رہی تھی اور تمام ملک ہند میں جا بجا انگریزی زبان کے کالج۔ اسکول قائم ہو گئے تھے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا انھوں نے فارسی ہی نہیں بلکہ سنسکرت سے بھی قطعی کنارہ کشی کر لی تھی اور

سب کے سب انگریزی تعلیم کے لئے کالجوں اور اسکولوں کی طرف سیلاب کی طرح بڑھنے لگے تھے۔ دہلی کالج توڑ دیا گیا اس کا اثر حیدرآباد پر بھی ہوا۔ مدرسہ عالیہ انگریزی تعلیم کے لئے قائم ہوگیا۔ اس کے مدنظر دارالعلوم پر زوال آگیا (یعنی مشرقی علوم پر اوس پڑ گئی) لیکن پھر کچھ عرصہ کے بعد یعنی ۱۸۹۷ء میں دارالعلوم کو پنجاب یونیورسٹی سے ملحق کردیا مدرسہ دارالعلوم ۱۹۰۷ء تک پنجاب یونیورسٹی سے ملحق رہا اور عربی فارسی امتحانات مولوی۔ مولوی عالم۔ مولوی فاضل منشی۔ منشی عالم۔ منشی فاضل کی تعلیم ہوتی تھی۔ یہ امر مبالغہ نہیں ہے کہ ۱۸۹۱ء سے لے کر ۱۹۰۶ء تک دارالعلوم کی ترقی قرطبہ اور بغداد کی علمی ترقیوں کا منظر پیش کرتی رہی۔ برطانوی ہند اور خود حیدرآباد میں انگریزی تعلیم کے بڑھتے ہوئے شوق کے باوجود اس درسگاہ کی رونق روز افزوں ترقی کرتی گئی۔

۱۸۹۷ء کے بعد تو دارالعلوم کے مقابلے میں خالص انگریزی تعلیم کا کالج (جس کا تذکرہ آگے آتا ہے) پست نظر آنے لگا تھا۔ دارالعلوم کے شاندار نتائج نے حکومت کے سامنے ایک ایسا معیار قائم کردیا کہ انگریزی کالج اس مرتبہ کو کبھی اس کی گرد کو نہ پہنچ سکا تھا۔ حکومت نے اس مشرقی تعلیم کے شوق کے مدنظر اضلاع کے مدارس میں جو انگریزی کے لئے مخصوص تھے۔ طلبہ کے بڑھتے ہوئے شوق کے مدنظر مشرقی تعلیم کی جماعتیں منشی، مولوی، دبیر، عالم وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کردیا تھا۔ دارالعلوم کے ساتھ ساتھ ان مدارس کے طلبہ پنجاب یونیورسٹی میں بھی شریک ہوتے تھے۔

غرض کہ ۱۹۱۷ء تک دارالعلوم صرف عربی، فارسی، اردو کی تعلیم کا مرکز رہا۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

(۳) ۱۸۵۶ء میں انجینئرنگ کا اسکول قائم ہوا۔ یہاں بھی اولاً اردو زبان میں تعلیم ہوتی تھی۔ اس مدرسہ نے مسٹر ولکنس کو ۱۸۶۸ء میں ناظم تعلیمات مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۸۸۴ء کے بعد یہاں بھی انگریزی میں تعلیم ہونے لگی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس کی تعلیم اردو میں ہونے لگی تھی۔ ۱۹۴۸ء سے یہاں کی تعلیم بھی انگریزی میں ہوگئی۔

(۴) ۱۸۵۹ء میں پہلا سرکاری مڈل اسکول قائم ہوا جس میں انگریزی زبان میں تمام علوم کی تعلیم ہونے لگی۔ ۱۸۶۰ء میں بلدہ حیدرآباد و بعد اضلاع میں (۱۱) اسکول تھے جن میں سے صرف ایک اسکول میں تعلیم انگریزی کی ہوتی تھی۔ یہ چادرگھاٹ اسکول سے موسوم کیا گیا۔ ۱۸۷۵ء میں یہاں مدارس میٹرک کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور مدراس یونیورسٹی کے امتحانات جاری کئے گئے۔

(۵) ۱۸۸۰ء میں سرکاری مدارس کو چار درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یعنی ہائی اسکول۔ مڈل اسکول۔ اپر اور لوئر پرائمری۔ لیکن ان تمام مدارس میں انگریزی میں تعلیم نہیں ہوتی تھی۔ صرف چند مدرسوں میں انگریزی کی تعلیم کا انتظام تھا۔ باقی مدرسوں میں اردو اور فارسی میں تعلیم ہوتی تھی۔

(۶) ۱۸۷۰ء میں حیدرآباد کالج قائم ہوا یعنی چادرگھاٹ ہائی اسکول کو کالج بنادیا گیا۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی جماعتوں تک انگریزی میں تعلیم ہونے لگی۔ کالج کے پہلے صدر ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیا تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہٹنے سے کالج کے انتظامات خراب ہونے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک کے لئے بی۔ اے کو مسدود کردینا پڑا۔ بالآخر ۱۸۸۷ء میں حکومت نے چادرگھاٹ ہائی اسکول سے کالج کا تعلق منقطع کر کے اس کی نگرانی میں مدرسہ عالیہ (جو اعلیٰ طبقہ کے بچوں کے لئے ہائی اسکول قائم ہوا تھا) کے ساتھ وابستہ کر کے نظام کالج سے موسوم ہوا۔

(۷) ۱۸۹۲ء میں جب نظام کالج کی بنیاد استوار ہوچکی تو اورنگ آباد کے ہائی اسکول کو بھی درجۂ

چودہ سال تک قائم رہا لیکن اس عرصہ میں اس کے طلبہ کی تعداد چھ سے آگے نہ بڑھی بسنہ ۱۹۰۵ء میں حکومت نے اس کالج کو برخاست کر دیا۔

(۸) جیسا کہ تذکرہ کیا گیا کہ نظام کالج سنہ ۱۸۸۷ء میں قائم ہوا اور عرصہ دراز تک مدراس یونیورسٹی سے اس کا تعلق رہا لیکن طلبہ حیدرآباد کے لئے یہ کالج سازگار ثابت نہیں ہوتا تھا۔ اس کے سالانہ کئی لاکھ کے اخراجات کے مقابلہ میں کامیاب طلبہ کی تعداد ہمیشہ کم سے کم تر رہی اس کے مقابلہ میں جب سنہ ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو گئی تو اور ذریعہ تعلیم اردو رکھ کر انگریزی زبان بطور لازمی زبان کے رکھی گئی تو امتحانات کے نتائج شاندار ظاہر ہونے لگے تھے۔

(۹) سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد مڈل اور ہائی اسکول میں اضافہ ہونے لگا اور انگریزی تعلیم [illegible] [illegible] ہونے لگی۔

(۱۰) اس موقع پر یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ حیدرآباد میں علماء اور [illegible] [illegible] جو اپنے لڑکوں کو انگریزی تعلیم دلانا بمنزلہ گناہ سمجھتا تھا۔ حتی کہ سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد بھی کئی خاندان اس [illegible] رہے۔ چنانچہ بعض خاندان یہ ہیں۔

حیدرآباد کے قاضیوں کا خاندان۔ نرخی کا خاندان۔ صدر الصدور کا خاندان۔ صدیقی خاندان، مولوی اکبر کا خاندان۔ مولوی خیرالمبین کا خاندان۔ شیخن صاحب کا خاندان۔ زرد علی شاہ کا خاندان۔ مولوی حسن عطاء اللہ کا خاندان وغیرہ[۱]

(۱۱) یہ تو لڑکوں کی تعلیم کا حال ہوا۔ لڑکیوں کے لئے تعلیم کی جانب حکومت نے سنہ ۱۸۸۵ء میں توجہ کی اور پانچ سال کے بعد یعنی سنہ ۱۸۹۰ء میں حیدرآباد میں نام پلی ہائی اسکول قائم ہوا۔ مدراس یونیورسٹی کی تعلیم ہونے لگی اور سرکاری طور پر سنہ ۱۹۰۶ء میں چار لڑکیاں امتحان میٹرک میں شریک ہوئیں۔ لیکن کسی نے کامیابی حاصل نہیں کی۔ سنہ ۱۹۱۱ء کے بعد تعلیم نسواں کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ ہونے لگی۔ بالآخر عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت سنہ ۱۹۲۵ء میں زنانہ کالج قائم ہوا اور دو سال کے بعد ایف۔ اے میں پہلی مرتبہ لڑکیوں نے شرکت کی۔ اب تو خواتین پی ایچ۔ ڈی یعنی ڈاکٹری کی ڈگری بھی حاصل کر رہی ہیں۔

اس تفصیل کے قطع نظر انگریزی تعلیم کی ترقی کے متعلق غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ مرحوم نظام میر محبوب علی خاں کے با اختیار ہو کر مسند نشین ہوتے یعنی سنہ ۱۸۸۳ء م سنہ ۱۳۰۰ھ میں حیدرآباد میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے۔ انگریزی تعلیم ترقی کرنے لگی۔ کالج اور اسکول قائم ہوئے۔ حیدرآباد کے لئے ایک علیحدہ یونیورسٹی کی تحریک بھی خود انگریزوں کے اشارہ سے آغاز ہوئی تھی[۵] اس زمانے میں کانگریس کی تحریک ہندوستان میں آغاز ہوئی اس زمانے میں انگریزی تعلیم حیدرآباد میں زیادہ نہیں پھیلی تھی اس لئے کانگریس کی تحریک کا چرچا عام نہ ہو سکا۔ اس کو انگریزی تعلیم کا پہلا دور قرار دیا جا سکتا ہے

۱۔ گریز (مرزا مہدی خاں۔ ص ۱۲۹

۲۔ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی از عبدالقادر سروری ص ۱۴ تا ص ۱۵

۳۔ حیدرآباد کی قدیم؟

۴۔ خواتین عہد عثمانی

۵۔ مضمون نگار صاحب کا یہ خیال غلط ہے بسنہ ۱۹۳۴ء میں ایک کتاب عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ڈاکٹر زور صاحب نے لکھ کر شائع کی تھی جس میں شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ ملک میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور ملکی زبان میں جملہ علوم و فنون کی تعلیم

(سلسلہ دیکھو صفحہ ۱۸)

ڈاکٹر اگھورناتھ اور ملا عبد القیوم مرحوم حیدرآباد میں جدید تعلیم کے معمار تصور کئے جا سکتے ہیں۔ مغربی تعلیم اور سائنس کی تعلیم کی جانب توجہ کرنے کے علاوہ جبری اور لازمی تعلیم کی تحریک ملا عبد القیوم نے آغاز کی تھی جس کی صراحت ملا عبد القیوم کے حالات میں درج کی گئی ہے۔

انگریزی تعلیم کا دوسرا دور ۱۸۹۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اب انگریزی تعلیم ترقی کر گئی تھی۔ کانگریس سے دلچسپی بڑھنے لگی۔ پرائمری۔ مڈل اور ہائی اسکول میں اضافہ ہونے لگا اور ان مدارس میں انگریزی میں تمام فنون کی تعلیم ہونے لگی۔

۱۹۱۱ء کے بعد جب موجودہ حضور نظام (راج پرمکھ) مسند نشین ہوئے تو تعلیم کی جانب اور زیادہ توجہ کی گئی المالطیفی ناظم تعلیمات مقرر ہوئے اور سررشتہ تعلیمات میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ حیدرآباد ایجوکیشن کانفرنس اس زمانہ میں قائم ہوئی۔ جس میں ہندو مسلمانوں نے ساتھ ساتھ حصہ لیا۔ چنانچہ کیشو راؤ صاحب۔ وامن نائک صاحب۔ بال کندرام سری کشن صاحب۔ مسز نائیڈو۔ مولوی مرتضیٰ مرحوم۔ ملا عبد الباسط صاحب۔ مولوی اکبر علی۔ مرزا محمد بیگ وغیرہ اصحاب اس کے پلیٹ فارم سے تعلیمی جد و جہد کرنے لگے۔

سر اکبر حیدری اور سید راس مسعود کی کوششوں سے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم ہونے کی کارروائی (جو گزشتہ پچاس سال سے حیدرآبادی رفارمروں کا خواب تھا) عملی صورت اختیار کرنے لگی۔ بالآخر ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کا منشور (چارٹر) نافذ ہوا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے اور مجاہدوں کی جد و جہد کی۔۔۔۔ قدر صراحت کر دی جائے تاکہ آئندہ نسلوں کے لئے اپنے قابل فخر پیش رو اصحاب کے کارناموں کا علم ہو سکے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۵۱) ڈالنے کا خیال نواب مختار الملک سالار جنگ اعظم کے عہد ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ماہ شعبان ۱۲۹۲ھ کو مولوی شیخ احمد حسین نواب رفعت یار جنگ اول نے اس بارے میں جو عرضداشت نواب مختار الملک کی خدمت میں پیش کی تھی اس کے اقتباسات اور تشریح اس کتاب کے صفحات (۴۳ تا ۵۰) میں درج ہیں۔ نواب مختار الملک نے اس تحریک کو پسند کیا تھا اور اس پر اپنی رائے ان الفاظ میں لکھی تھی۔

"ہمہ را حرفاً حرفاً دیدم و مسرور شدم و تحسین کردم۔ خدا کند کہ تمام اہل ملک را محبت ملکی و قومی بمقبولیت حاصل شود۔ در اکثر مطالب اتفاق دارم و ایں تدبیر را مفید پندارم۔"

غرض یہ تحریک نواب سالار جنگ اول کے زمانے کی ہے مگر معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی منظوری اور خوشنودی کے باوجود ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی اور مکمل درسگاہ کیوں قائم نہ ہو سکی۔ البتہ نواب رفعت یار جنگ اول کا قائم کیا ہوا مدرسہ اعزہ اب تک موجود ہے جو ان کی تعلیمی دلچسپی اور جد و جہد کی یادگار ہے۔

نواب رفعت یار جنگ اول کی تعلیمی دلچسپی کی تفصیل "تاریخ دار العلوم" (مطبوعہ مطبع صحیفہ سے) بھی معلوم ہوتی ہے جس کو آج سے بیالیس سال قبل مدرسہ دار العلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کے موقع پر بتاریخ ۱۴ ؍ شوال ۱۳۳۲ھ اس عظیم الشان جلسہ میں مولوی اسد اللہ صدیقی صاحب (مخاطب نواب صدیق یار جنگ بہادر رکن عدالت العالیہ) نے پڑھ کر سنایا تھا جس کی صدارت نواب سالار جنگ ثالث مدار المہام وقت نے کی تھی۔ اس میں ناموران دار العلوم کے سلسلہ میں تفصیل پیش کی گئی تھی۔

"مسلمانوں نے اپنا ایک نظام تعلیم تیار کر لیا تھا جو ملک و حکومت کے اختلافات کے باوجود ساری دنیا میں بہت یکسانیت رکھتا تھا اور مسلمانوں کے عروج کے زمانے کا ساتھ دے چکا تھا۔ اور مقاموں کی طرح ہندوستان میں بھی قرآن مجید کی عائد کردہ رواداری کے تحت اسلامی حکومتوں نے غیر مسلموں کو مذہب و تہذیب کی طرح تعلیم کی بھی مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ علماء اور پنڈتوں کو یہ ہندی نظام اٹھے تعلیم ابتدائی مدارج سے لیکر اعلیٰ ترین تحقیقات تک کی ضرورتوں پر حاوی تھے۔

زمانے نے ہندوستان کے بڑے حصے کی حکومت انگریزوں کو دلائی تو انھوں نے اپنی رعایا کے مختلف طبقات کی تعلیمی خود مختاری کو روا رکھنا پسند نہ کیا اور ان کے مشہور سیاست ساز تعلیم میکالے نے مدارس کے ذریعے ہندی جسموں میں انگریزی روح جاری و ساری کرنے کے مقصد کی تدبیریں بتائیں اور نافذ کرائیں۔ جامعات ابھی کچھ دیر تھی لیکن انگلستانی اصول کے کالج و مدارس برطانوی ہند میں چوطرف کھلنے لگے۔ اس ماحول میں سرسید مرحوم نے اپنی قوم کی ضرورت پر غور کرنا اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے وسائل پر مقالے لکھنا شروع کیا اور مدرستہ العلوم علی گڑھ کی تحریک آغاز ہوئی جو اپنی نوبت پر حیدرآبادی حکام کے غور و فکر کو مدعو کرنے لگی۔ سالار جنگ اول کے سفر انگلستان سے بھی اسی خیال کو تقویت ہوئی کہ انگریزی اصول تعلیم کی اتباع کی جائے اور انھیں اصول پر دارالعلوم کی تعلیمی سیاست میں ترمیم کی جائے۔

مسٹر بلنٹ کی جامعہ اسلامیہ

عین اس وقت جب سرکار عالی مغربی نظام تعلیم کے لئے متوجہ و آمادہ تھی مصر کے حالات میں انقلاب ہونے لگا اور مہدی سوڈانی کی کامیابیاں یہ خطرہ پیدا کرتی سمجھی گئیں کہ کہیں ہندی مسلمان بھی اسے مہدی موعود نہ مان لیں۔ اس کے اثرات انگریز مستشرقین نے اپنے ارباب حکومت کو سمجھا دیئے علاج سے قبل ہندی مسلمانوں کی نفسیات کی جانچ کرنے مسٹر ولفرڈ بلنٹ کو ہندوستان بھیجا گیا۔ وزیراعظم گلاڈاسٹون سے واقفیت نے اسے لارڈ رپن کے دور وائسرائی میں نیم سرکاری حیثیت دلا دی۔ مسٹر بلنٹ نے یہ تو معلوم کر لیا کہ مہدی سوڈانی کو ہندی مسلمان مہدی موعود ماننے پر تیار نہیں ہیں لیکن انگریزی تعلیم سے مسلمانان ہند کی عمومی بے اعتنائی اور ان کے قومی اور مذہبی تعلیم کے اداروں کا حکومت سے بالکل الگ استحکام تنظیم اور جوش سے ہندوستان میں چوطرف قائم رہنا ایک نیا مرض نظر آنے لگا۔ اس کے علاج کے نسخے سر ولیم ہنٹر، ڈاکٹر لائٹز اور مسٹر ولفرڈ بلنٹ الگ الگ سوچنے لگے۔ آخر یہ تجویز ہوئی کہ مشرقی اور اسلامی تعلیم کی حوصلہ افزائی تو کی جائے لیکن اسے سرکاری نگرانی و اہتمام میں لے کر اسے بے ضرر بنا دیا جائے۔ پنجاب یونیورسٹی۔ خاص کر اس کا شعبہ مشرقیہ اسی کا نتیجہ تھا۔ مسٹر بلنٹ نے ایک تجویز پیش کی جو حسب معمول دوسروں کے خرچ پر اپنا مقصد پورا کراتی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ ایک مسلم یونیورسٹی حکومت حیدرآباد کے زیر اثر مغرب و مشرق کے امتزاج (اور عملاً مسلم دنیا کو مغربیت میں رنگنے) کے لئے قائم کی جائے۔

مسٹر بلنٹ کی اس تحریک کو حکومت برطانوی ہند اور حکومت انگلستان کی نیم سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ اور اسی سلسلے میں اس نے دو مرتبہ حیدرآباد کا سفر کیا۔ ایک دفعہ بطور خود اور دوسری دفعہ لارڈ رپن کے ساتھ حضرت غفران مکان آصف جاہ سادس کے جشن حصول اقتدار میں شرکت کے لئے۔ مسٹر بلنٹ نے حیدرآباد کے سیاسی معاملات میں بھی مشورہ دینا شروع کیا۔

مسٹر بلنٹ کی مسلم یونیورسٹی کی تجویز اخباروں میں بھی آئی اور عہدہ داروں کے سامنے بھی محی الدولہ۔ عمادالملک۔

محسن الملک وغیرہ سے شخصی تبادلۂ خیال بھی ہوا۔ بالآخر حضور نظام نے بھی اسے پسند فرمایا اور لارڈ رپن کے حیدرآباد سے چلے جانے کے بعد مسلم یونیورسٹی کے اورنگ آباد، گلبرگہ یا بیدر میں کسی مقام پر قائم ہونے کی بڑی حد تک عملی کارروائی آغاز ہوگئی۔ یہاں تک تحریک آگے بڑھ گئی کہ خود باغ عامہ حیدرآباد میں حضور نظام کی سرپرستی میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا اور حیدرآباد میں غالباً پہلا موقع تھا کہ جلالت مآب فرمانروائے حیدرآباد کی صدارت میں پبلک جلسہ ہوا جس میں حضور نظام اور مدار المہام وغیرہ نے پبلک تقریریں فرمائیں اور انگریزی رزیڈنٹ بھی شریک ہوا۔ یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ گلاڈ اسٹون کی لبرل وزارت کی شکست اور قدامت پسندوں کا برسراقتدار آجانا اور لارڈ رپن کا پالیسی سے شدید اختلاف کے باعث استعفے پر مجبور ہونا اور خود مسٹر بلنٹ کا واپس چلا جانا اس تحریک کے یکایک حیدرآباد میں دب جانے سے بالکل بے تعلق نہیں ہیں۔ مسٹر بلنٹ نے جو کتاب "انڈیا انڈر رپن" لکھی ہے اس میں حیدرآباد کی مسلم یونیورسٹی پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے:

ہماری پچھلی نسل کا یہ باعث عبرت رجحان رہا ہے (جس سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو سبق لینا اور احتراز کرنا چاہیئے) کہ اپنے حلیف بزرگ کا منشاء دیکھتے ہیں تو ایک عظیم الشان آل انڈیا مسلم یونیورسٹی کا اسکیم بنا لیتے اور اس کے وسائل کی فراہمی کے لئے ہر ایثار پر تیار ہو جاتے ہیں اور پھر اگر اسی حلیف کی خاموشی میں کچھ اور منشاء پاتے ہیں تو نہ صرف جامعہ کا منصوبہ فراموش کر دیتے ہیں بلکہ خود موجود الوقت مدرسہ دارالعلوم کی سطح پست سے پست تر کر دیتے ہیں اور فی نفسہ کسی اسکیم کے اچھے یا برے ہونے کی بنا پر رائے نہیں قائم کی جاتی۔ پھر مکرر برطانوی سفیر مقیم کا اشارہ ہوتا ہے تو دارالعلوم کی تنظیم جدید کر کے اسے جامعہ پنجاب سے ملحق کر دیتے ہیں اور عرصے تک ہمارا ملک اسی میں مگن رہتا ہے کہ ہمارے ملک کا نظام تعلیم برطانوی ہند کی موقر جامعات مدراس و پنجاب کا حلقہ بگوش ہے۔

بہرحال مدرسہ دارالعلوم ہی نے باوجود کسمپرسی کے ملک کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا اور اسی کی غیر روحانی عمارتوں اور سادہ صحبتوں میں تربیت پاکر ملک کے ایک بڑے مفکر مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم نے پندرہ سالہ عمر ہی میں اس پر غور کرنا شروع کیا کہ حیدرآباد کی عام پستی اور خاص کر تعلیمی پستی کا باعث اور علاج کیا ہے۔

مسلم یونیورسٹی حیدرآباد کا منصوبہ ختم ہو چکا تھا۔ مولوی محمد مرتضیٰ اپنی انیسؔ سالہ عمر سے اپنے غور کے نتائج ۱۳۱۷ھ میں حیدرآباد سے متعلق شائع ہونے والے اخبارات مدراس (جریدہ روزگار۔ مخبر دکن۔ نیر آصفی) نیز مشیر دکن حیدرآباد میں شائع کرنے شروع کئے۔ یہ مضامین نواب محسن الملک کی تحریک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بعد سے آغاز ہوئے اور مہاراجہ کشن پرشاد کی وزارت کے بعد قوت سے شائع ہونے لگے۔ ان کا ماحصل یہ تھا کہ جب اپنی رعایا ہی کے لئے برطانوی ہند میں مسلم یونیورسٹی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے تو اچھے حکمران و رعیت دونوں کے مشترکہ فرائض کی عمدہ بجا آوری کے لئے ضرورت ہے کہ ہمارے ملک میں عام تعلیم کو ترقی دی جائے۔ ملک کی تاریخ و جغرافیہ کی جانب اہتمام کیا جائے۔ نصاب کی اصلاح ہو۔ ہر قسم کے علوم و فنون ملکی زبان اردو میں لائے جائیں۔ مدرسہ دارالعلوم کے ابتدائی مدارج میں ریاضی و طبیعیات وغیرہ شامل ہوں اور وہیں اعلیٰ مدارج تکمیل بھی قائم ہوں۔ اس وقت وہ یونیورسٹی کے فوری قیام کو ملک کے حالات کے لحاظ سے ہوسکنے والی بات نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے صرف سررشتہ تعلیمات کی اصلاح کے مشتاق تھے۔

اسی زمانے میں راقم الحروف کے والد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم (رجسٹرار بلدہ) بھی حیدرآباد کے نظم و نسق اور اصلاح ملک کے معاملات پر اخبار مخبر دکن (مدراس) میں مضامین لکھتے رہے۔ انھوں نے ان مضامین میں نیز مسلم یونیورسٹی کی تحریکات اور خاص کر مسٹر بک پرنسپل مدرسۃ العلوم علیگڈھ کالج کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ بھی مطالعہ کیا جس میں اس کی توضیح تھی کہ مطلوبہ دس لاکھ روپیے کے سرمائے کا منافع کس طرح مسلم یونیورسٹی میں صرف ہوسکے گا۔ اس کے مطالعے سے ان

کے ذہن رسا میں فوراً حیدرآباد کے لئے یونیورسٹی کی ضرورت اور امکان کا خیال پیدا ہوگیا۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء م ۱۳۲۱ھ میں انہوں نے اصلاح تعلیمات حیدرآباد کے متعلق ایک طویل مضمون اخبار "مخبر دکن" میں شائع کرایا کہ ممالک محروسہ میں نظام کالج، دارالعلوم اور دیگر تعلیمی ادارے موجود ہیں اور صرف نظام کالج کے اخراجات سالانہ ایک لاکھ سے زائد ہیں تو کیوں نہ حیدرآباد میں ایک مستقل یونیورسٹی قائم کی جائے جس کا روپیہ سرکار مہیا کرے اور جامعہ مدراس کی ماتحتی سے نجات حاصل کرلی جائے۔

اس مضمون نے ملک میں علحدہ جامعہ کی ضرورت کا احساس خاص خاص اشخاص کے حلقے میں پیدا کر دیا۔

اس زمانے میں مدراس یونیورسٹی کے سخت ترین نتائج امتحانات نے (جس میں ممالک محروسہ کے کل (۱۱۱) طلبہ میں سے جو میٹرک میں شریک ہوئے تھے صرف سات کامیاب ہوئے تھے۔ دوسرے سال بھی نتائج میں ایسی ہی سختی رہی اور ہمارے مقامی افسران درسگاہ مسٹر سیٹن اور مسٹر اسرج نے برافروختہ ہوکر بجائے مدراس یونیورسٹی کے کلکتہ یونیورسٹی سے تعلق پر زور دینا شروع کیا۔ بہت سے طلبہ ملک کی دوسری جامعات میں بھی جاکر تعلیم پانا شروع کئے۔ مسٹر سیٹن نے کلکتہ یونیورسٹی سے مراسلت بھی کی اور باضابطہ تحریک معتمدی تعلیمات میں اس کے متعلق روانہ کرائی۔ نواب عماد الملک جو مدراس یونیورسٹی کے رکن سینٹ (مجلس رفقاء) تھے۔ مدراس ہی کی تائید میں رہے۔ اس موقع پر نواب فخر الملک معین المہام تعلیمات نے اپنی رائے وضاحت سے ظاہر کی کہ ملک کے لئے علیحدہ یونیورسٹی قائم کرلی جاسکتی ہے مگر نواب وقار الامراء مدار المہام نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ تاہم معاملہ کینٹ کونسل تک گیا اور کارروائی لارڈ کرزن وائسرائے کا مقرر کردہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کے شائع ہونے تک ملتوی کر دی گئی۔

مگر حیدرآباد کے مسئلہ تعلیم پر مولوی مرتضیٰ مرحوم اور مولوی عبدالقادر مرحوم کے مضامین سے عام طور پر حیدرآباد میں اکثر افراد ملتفت ہونے لگے۔ پھر اپنے مضامین کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۰۲ء م ۱۳۲۲ھ میں مولوی مرتضیٰ نے "روح ترقی" کے نام سے اپنی بلند نظر تالیف شائع کی۔ اس میں ثابت کیا کہ حیدرآباد کے لئے ایک جامعہ کی ضرورت ہے جس کے بغیر ملک کی ترقی نہیں ہوسکتی اور یہ کہ ذریعہ تعلیم اردو ہونا چاہئے۔ اس کتاب کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔

"بیشک قرار صرفہ کے باوجود نظام کالج کی حالت سنسان کیوں ل ہے اسٹاف کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں کرسکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ملک میں علم کا شوق نہیں۔ جب کہ مشرقی کالج دارالعلوم کے نتائج ایسے اعلیٰ نکلے ہیں جن کی نظیر ہندوستان کے کسی کالج میں شاید بمشکل ملیگی اور یہ بھی پیش نظر ہے کہ ملکی طلبہ بکثرت نظام کالج چھوڑ کر دوسرے شہروں میں جاتے ہیں اب بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ مدراس یونیورسٹی کی غلامی نے اس کو بے حس کر رکھا ہے جیسا کہ مسٹر ہاڈسن سابق پرنسپل نے بھی رائے دی تھی کہ مدراس یونیورسٹی سے تعلق چھوڑ دینا چاہئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات اور دوسرے یونیورسٹیوں کے مغربی امتحانات میں ایک بین فرق موجود ہے اور یہی فرق ہے جو دونوں کالجوں کے نتائج میں صاف نمایاں ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ نظام یونیورسٹی کی پیاری اور عالیشان تجویز میدان عمل میں نہ آجائے دو تجویزیں نہایت سہل اور ضروری ہیں جن سے خود نظام یونیورسٹی کی صورت زیادہ تر نزدیک ہوجائیگی۔

(۱) یوروپین کالجوں کے نمونے پر ایک سوسائٹی جو طلبہ کے خاموش دلوں میں ملکی تخیل کی ولولہ انگیز روح پھونکیں گے اور ان میں کام کرنے کا شوق پیدا ہو۔

(۲) فیلو سسٹم جس سے ان میں علمی زندگی پیدا ہو اور وہ اپنے روشن ستارے بنا سکتا۔[1]

---

[1] روح ترقی

اس کتاب میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق جو تفصیلی وضاحت کی گئی ہے اس کا اقتباس بھی قابل ملاحظہ ہے

"ابنائے ملک اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنی اس عام زبان (اردو) کو تازہ رکھیں۔۔۔

وہ دن ہے جس نے ملکی لحاظ سے اردو کی ضرورت سمجھی اور بندگان عالی کے عہد میمنت مہد میں اردو کو یہ عظمت نصیب ہوئی کہ وہ ہندوستان کی اعلیٰ دیسی حکومت کی سرکاری زبان بنی۔ حضور شاہ دکن کی مربیانہ نظر عاطفت اور فیض عام نے ہی اردو زبان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مصنفین کو یہ طاقت بخشی کہ وہ اپنے گراں پایہ نتائج علم کو جو دوسرے نامور علمی مرکزوں کے پر مغز جدید تحقیقات سے گھٹے ہوئے نہ ہوں دنیا کے روبرو پیش کریں جن سے اردو زبان کلاسیکل زبانوں کی اعلیٰ صف میں نظر آئے اسی بناء پر اب حیدرآباد اردو کا مرکز ہو سکتا ہے اور سلطنت کا استحکام اسی میں مضمر ہے کہ اس شاہی زبان کو عام ملکی تعلیم کا آلہ قرار دیا جائے۔ اسی میں شاہ کی اطاعت ہے اور اسی میں ملک کی بہبودی اور عام تعلیم کے لئے کافی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کے برخلاف بیانات محض لغو اس ہیں[1]"

کلکتہ یونیورسٹی رپورٹ شائع ہوئی اور حکومت برطانوی ہند نے طے کر دیا کہ حیدرآباد کا تعلق صرف مدراس یونیورسٹی سے رہے اور پنجاب یونیورسٹی نے اچانک دار العلوم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ ڈاکٹر ارگھور ناتھ نے فوراً انجمن معیار العلوم قائم کر کے امتحانات لینے شروع کر دیئے اور مولوی مرتضیٰ مرحوم کی ہدایت و اصلاح سے حسین لطف اللہ مرحوم طالب علم مدرسہ دار العلوم (برادر حاجی حافظ عبد العظیم صاحب بانی کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد) نے نظام یونیورسٹی کے نام سے ایک مضمون "مخبر دکن" میں لکھا جس میں اب سرکار عالی کی علیحدہ یونیورسٹی کے قائم ہونے کے امکانات پر روشنی ڈالی۔ نیر آصفی (مدراس) میں بھی مدار المہام کے نام کھلی چٹھی کے طور پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک چھپی تھی جس کا اقتباس رسالہ اردو (اپریل ۱۹۲۱ء) میں چھپا ہے۔

نواب محسن الملک کی تجویز کو مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد نے منظور کر لیا تھا کہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کے امتحانات مستقل ہوں اور سرکاری اہتمام ہی میں لئے جائیں۔ اس کے متعلق مولانا شبلی مشورے کے لئے بلائے گئے اور انھوں نے رسالہ ندوہ میں مملکت آصفیہ اور مشرقی یونیورسٹی کی ضرورت پر روشنی ڈالی اور جلد دار العلوم اور اس کے متعلقہ مدارس میں علیحدہ نصاب و امتحان کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

اسی زمانے میں مولوی عزیز مرزا معتمد تعلیمات اور محمد اکبر حیدری صاحب معتمد فینانس نے مدراس کے بجائے بمبئی یونیورسٹی سے نظام کالج وغیرہ کے الحاق کی کارروائی کی جو بعض وجوہ سے ختم ہو گئی۔

اس طرح مدراس یونیورسٹی کا تعلق تو نظام کالج وغیرہ سے قائم رہا اور اکثر افراد بیرون ملک جا کر مصارف زحمت ہائے کثیرہ سے تعلیم پانے لگے۔

روزنامہ صحیفہ (حیدرآباد) کے اجراء، انجمن طلبہ قدیم دار العلوم اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کی بدولت حیدرآباد کیلئے علیحدہ یونیورسٹی اور ممالک محروسہ کے لئے برطانوی ہند کی جامعات و نصاب کے بجائے ہر ایک قسم کی تعلیم اور نصاب کے لئے مدارس کے رہنے اور ان کا تعلق خود اختیارانہ ہونے کے مطالبات عام طور پر چھپ گئے۔ لیکن اس کے پر بھی عام طور پر نظام کالج کے متخرجین مدراس یونیورسٹی ہی سے تعلق برقرار رہنے پر زور دیتے اور ملکی جامعہ کے راستہ میں روڑے اٹکاتے رہے۔

---

[1] روح ترقی

سر محمد اکبر حیدری اور ڈاکٹر الما لطیفی میں سے ہر ایک حیدرآباد کی یونیورسٹی کے قیام کا اعزاز خود لینے کا خواہاں تھا اور یہ کشمکش بھی منزل مقصود کو دور کر رہی تھی ۔

۱۳۳۶ھ میں دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کے چند ماہ بعد جب حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو حیدری صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں بیان کیا تھا ۔

" دارالعلوم اور مدرسہ فوقانیہ کا انتظام اسی نہج پر کیا گیا ہے ۔کتب کے متعلق بڑی چھان بین کی جا رہی ہے ۔عمدہ مدرس اور علماء کے انتخاب میں بہت غور وفکر کیا جا رہا ہے ۔ ضروری سامان بھی رفتہ رفتہ مہیا کیا جا رہا ہے اور جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے اور خدا نے چاہا تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دور پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم وفنون بن جائے گا "

اس کے ایک سال بعد جامعہ میسور قائم ہو گئی اور پونا کے اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں سر عبدالرحیم نے بھی حیدرآباد کو اپنی علیحدہ یونیورسٹی قائم کرنے کا مشورہ اپنے صدارتی خطبے میں دیا۔مگر مقامی عہدہ داروں کی متذکرہ کشمکش نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے محتاط افسروں کو اجلاس اورنگ میں بھی حیدرآباد یونیورسٹی کا مطالبہ پیش کرنے سے باز رکھا البتہ روزنامہ صحیفہ میں اس کے مطالبات اور تفصیلات شائع ہوتے رہے ۔

اس اثنا میں مسٹر سید راس مسعود ناظم تعلیمات ہو گئے اور انجمن کی ہمت افزائی اور مشورت کے بعد معتمد تعلیمات حیدری صاحب نے وہ یادداشت پیش کی جس میں بیان کیا گیا تھا کہ ۔

" غرض موجودہ طریقۂ تعلیم کی دورنگی اور بے اصولی کو مٹانے اور ان خطرناک اور تباہ کن نقائص کو رفع کرنے کے لئے جو موجودہ طریقۂ تعلیم نے پیدا کئے ہیں اور جو گھن کی طرح ہمارے نظام تمدن ومعاشرت ، قوائے دماغی وجسمانی کو اندر ہی اندر کھائے چلے جا رہے ہیں ۔ ہمیں ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صحیح اصول تعلیم ، ملکی ضروریات اور قومی خصائص پر قائم ہو ۔جس میں قدیم وجدید دونوں طریقوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو تعلیمی بھی اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی تالیف وتراجم کا کام بھی کرے اور جو تربیت ذہن اور تحصیل علوم دونوں کے لئے اپنی ہی زبان یعنی اردو کو کام میں لائے ۔ یہ یونیورسٹی اپنی نوعیت کی پہلی یونیورسٹی ہو گی ۔ اس جدید وقدیم ، مشرق ومغرب ، فلسفہ وسائنس ، دین ودنیا دونوں کا اس طور سے امتزاج ہو گا کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص رفع ہو جائیں اور قدیم وجدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو گا "

اس پر ۲۹؍ جمادی الآخر ۱۳۳۵ھ م ۱۸؍ خورداد ۱۳۲۶ف م ۲۲؍ اپریل ۱۹۱۷ء کو نواب فخر الملک بہادر نے جو عرض داشت دربارۂ قیام حیدرآباد یونیورسٹی پیش کی وہ چار ہی دن بعد ۴؍ رجب ۱۳۳۵ھ روز پنجشنبہ منظور ہو کر گئی ۔ یہ فرمان خسروی یہاں درج کیا جاتا ہے ۔

حکم

" بملاحظہ عرضداشت صیغہ تعلیمات مورخہ ۲۹؍ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ جس کے ساتھ ایک یادداشت گزرانی گئی ہے جس میں ہز اکسلنسی دی وائسرائے کے ایک اسپیچ کے ایک اقتباس کے ساتھ

چند عائدین و مدبرین کے آرا کی نقل کر کے حیدرآباد کے خاص حالات کے لحاظ سے یہاں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت و مناسبت بتائی گئی ہے:

• حکم :- مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمی، دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔ اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دیا جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکورہ اصول محولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد" ہوگا اور ہر اہم و اصولی امر کی نسبت جو اس کارروائی میں پیدا ہو صراحت کر کے میری منظوری وقتاً فوقتاً حاصل کی جاتی رہے۔"

شرحدستخط مبارک

۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ پنجشنبہ

(شرحدستخط امین جنگ بہادر (صدر المہام پیشی مبارک)[1]

اس تفصیل سے واضح ہے کہ حیدرآباد میں انگریزی تعلیم کی جانب برطانوی ہند کے بہت بعد توجہ کی گئی تھی۔ اس میں وسعت بھی بہت تویق سے ہوئی جبکہ کلکتہ، بمبئی، مدراس کی یونیورسٹیاں اپنے قیام کے نصف صدی ختم کر چکیں تو اس وقت عام طور سے حیدرآباد میں انگریزی تعلیم کی جانب توجہ کی گئی تھی۔

---

[1] تذکرہ دارالعلوم ص۱۶ تا ص۲۷

حضرت شاہ نعمت اللہ ولی

از :- ڈاکٹر ایم حفیظ سید ایم اے ۔ پی ایچ ڈی ۔ ڈی لٹ

آپ سید جلال الدین بن امیر نظام الدین احمد کے فرزند ارجمند تھے ۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ - ۹۸۸ھ) کے عہد میں گولکنڈہ آئے ۔ سلطان ابراہیم علماء اور فقراء کا قدرداں اور ان کا معتقد تھا ۔ اس کے عہد میں گولکنڈے میں سلسلۂ قادریہ[1] کے متعدد بزرگ تشریف لائے تھے جن میں شاہ میراں حموی بغدادی اور شاہ لطیف محی الدین قادری بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں ۔ شاہ میراں حموی کو سلطان ابراہیم قطب شاہ نے اپنی ایک لڑکی بیاہ دی تھی ۔

حضرت شاہ نعمت اللہ ولی بھی بادشاہ کی قدردانی سے سرفراز ہوئے اور گولکنڈے میں قلعہ کی مشرقی جانب ایک عالیشان دو منزلہ خانقاہ تعمیر کرائی جس کے دونوں پہلوؤں پر دو گنبد تھے جو اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہیں ۔ یہ خانقاہ اور اس کے اطراف کا باغ اور وہ باولی جس کے متصل حجرے میں حضرت شاہ صاحب اعتکاف فرمایا کرتے تھے خاص اہتمام سے تعمیر کرائے گئے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا دنیاوی جاہ و جلال بھی بہت زیادہ تھا ۔ گمان غالب ہے کہ آپ سے بھی سلطان ابراہیم قطب شاہ کی کوئی شہزادی منسوب[2] ہو ۔ کیونکہ درگاہ کے پہلو میں ایک قبر بغیر کسی کتبہ کے موجود ہے اور اس کی وضع قطع بالکل ویسی ہی ہے جیسی سلطان کی اس شہزادی کی قبر کی ہے جو حضرت شاہ میراں حموی بغدادی سے منسوب تھی ۔ یہ قبر اسی درگاہ میں موجود ہے ۔

حضرت شاہ صاحب کی اولاد میں سے ایک صاحب سید ولی اللہ حسینی حیدرآباد میں دروازہ دبیرپورہ کے باہر بی کے علم کے قریب قیام پذیر ہیں ۔

حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کا اصلی نام نعیم الدین تھا جو آپ کے مزار کے سرہانے پتھر پر کندہ ہے آپ صحیح النسب سید تھے ۔ آپ کا نسبی سلسلہ حضرت حسن مثنیٰ ابن حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منتہی ہوتا ہے ۔ آپ کے اجداد میں جلال الدین، امیر نظام الدین اور سید شہاب الدین نام کے کئی بزرگ گزرے ہیں ۔

---

[1] سلسلہ چشتیہ کے بھی کئی بزرگ اس دور میں گولکنڈہ آئے جن میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے نواسے حسین شاہ ولی بہت مشہور ہیں اور سلطان ابراہیم قطب شاہ نے اپنی ایک لڑکی ان کو بھی بیاہ دی تھی ۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ کی ایک ملکہ بھی بیدر کے حضرت سید ملتانی بادشاہ قادری کے خاندان کی دختر تھیں ۔ اس ملکہ سے جو شہزادہ پیدا ہوا اس کا نام شاہ عبدالقادر رکھا گیا تھا لیکن سیاست کے داؤں پیچ کی وجہ سے سلطان ابراہیم قطب شاہ کے بعد تخت نشین نہ ہو سکا ۔ اور اپنے چھوٹے بھائی محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں بیدر کے علماء، مشائخین اور امراء کی تائید سے تخت سلطنت پر قبضہ کرنا چاہا لیکن ناکام رہا ۔

[2] حضرت شاہ صاحب کے لوح مزار پر "الحکم للہ تعالیٰ" کندہ ہے ۔ یہ عبارت عام طور سے گولکنڈہ کے شاہی مزاروں پر پائی جاتی ہے ۔ اس سے بھی سلطان ابراہیم قطب شاہ سے رشتہ داری کی تائید ہوتی ہے ۔

درگاہ ایک مرتفع چبوترے پر واقع ہے جو مصفا سنگ خارا کا ہے۔ مزار پر سنگ موسیٰ کا حاشیہ بھی ہے اور اچھے عمدہ خط میں آیت الکرسی کندہ ہے۔ سرہانے کے لوح مزار کی جانب چہاردہ آئمہ معصومین کا درود شریف اور دوسری طرف حضرت شاہ صاحب کی تاریخ وفات اور پورا شجرہ نسب درج ہے۔

مزار کے سرہانے مصفا سنگ موسیٰ کا ایک مینار نما چراغدان بھی ہے اور اس چبوترے پر دو اور قبریں بغیر کسی کتبہ کے موجود ہیں۔ چبوترے کے سرہانے، اس سے بالکل متصل وہ باولی ہے جس کے کمرے میں حضرت شاہ صاحب اکثر عبادت و ریاضت اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ مزار شریف کے پائنتیں ایک قدیم آہنی دروازہ ہے اس کی تعمیر کو آج پورے پونے چار سو سال گزر چکے ہیں لیکن رونق وسہانا پن اب تک ویسا ہی قائم ہے۔ حضرت کا عرس ہر سال ہر جمادی الثانی کو بڑی دھوم سے ہوتا ہے۔

حضرت نے محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ - ۱۰۲۰ھ) کے عہد حکومت میں، ۸ جمادی الثانی ۱۰۰۱ھ کو وفات پائی۔ مزار کا کتبہ درج ذیل ہے۔

"در سابع جمادی الثانی ۱۰۰۱ھ از عالم فنا بہ دار بقا رحلت فرمود۔ سید نعیم الدین نعمت اللہ بن جلال الدین بن امیر نظام الدین احمد بن جلال الدین بن امیر زین الدین بن نظام الدین احمد بن شاہ میر بن تاج الدین بن شہاب الدین حسن۔"

حضرت کی وفات کے بعد گولکنڈہ اجڑ گیا۔ وہاں کی ساری رونق اور آبادی حیدرآباد میں منتقل ہوگئی کیونکہ حیدرآباد کی تعمیر ۱۰۰۰ھ ہی میں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے شروع کی تھی اور اہل گولکنڈہ کو حکم دیا تھا کہ اس نئے شہر میں آباد ہو جائیں۔

زیر نظر مختصر قلمی مثنوی تین سو چار (۳۰۴) اشعار کی حامل ہے۔ جس میں سے دو سو چھیاسی (۲۸۶) اشعار متن کے ہیں اور مندرجہ ذیل اٹھارہ شعر ایسے ہیں کہ ان میں کا ہر ایک مصرع مستقل عنوان ہے جس کے تحت میں باقی اشعار ہیں جو حد درجہ جاذب اور ان میں ایک قسم کی کشش موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

گنج گہر ثنائے سبحان	تعلیم سخن بہ طوطی جان	لو بادۂ گلشن نصیحت	آوازۂ بلبل محبت
بینائی چشم نعت احمدؐ	نور دل تابع محمدؐ	تعلیم نگار نقش صیاد	تعویذ فسون مار بیداد
طرازی نفس جبلت آئین	ارشاد دل حقیقت آئیں	معراج بہ لامکان عرفاں	خاصیت کیمیائے اصرار
تسبیح و نماز و ذکر و اخلاص	بیت المعمور خلوت خاص	خورشیدی عاشقاں تمامی	سرمایہ فیض اسم ساقی
فیروزی طالع خداداد	بنیاد مقام تربیت آباد	سرگرمی جام ہوش پرواز	دوران شراب ساقی راز
قطب تمکین و قطب دوراں	آوازۂ نام شیکر داں	فیض مردان ہفت اقلیم	فرمان ملوک ملک تسلیم
ہشیاری والہائے شیدا	شیدائی محو ذات والا	وصف کرم و کرامت قطب	شرح برکات و محبت قطب
خورشید حضور قطب عالم	آئینہ صدق و فخر آدم	ظلمت گاہ برون پرستاں	صفوتکدہ درون مستاں
بیت اللہ مجمع کرامات	بسم اللہ نامۂ مناجات	حضرات کعبۂ سلامت	محراب دعائے استقامت

جذب اور کشش کا یہی حال پوری مثنوی کا ہے۔ یہ مثنوی تصوف کی جان ہے جس میں خصوصیت سے نفس کشی کی تعلیم دی گئی ہے۔ ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد، پھر نعت شریف اور مدح اصحاب کرام، معراج شریف کا فضائل ضروریہ اور نفس سرکش سے بچنے کی تدبیریں، اس کی تیز بیانی اور طرازی کا حال، ہر جگہ ادب کا لحاظ اس۔

تصوف کی جان، عرفان لامکان کی سیر، اخلاق اور احسان کی خاص تعلیم، تسبیح، نماز، ذکر، اخلاص، خلوت وجلوت کا بیان، پھر اپنے کو تخاطب کرتے ہوئے نصیحت کے پیرائے میں تصوف کی باریکیاں بتائی ہیں۔ قطب، غوث، اوتاد ان کے فرائض اور بزرگوں کے فیوض کا ذکر ہے۔ آخر میں مناجات اور دعا ہے۔

غرض کہ صاحبان ذوق و بصیرت کے لئے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔

عرصہ ہوا مخطوطات کی تلاش کرتے ہوئے میں بیجاپور پہنچا۔ اتفاقاً اس سلسلے میں ایک غریب شخص سے ملاقات ہوئی۔ استفسار سے معلوم ہوا کہ اس کے اسلاف صاحب علم تھے اور وہ خود جاہل مطلق ہے۔ معماری کا پیشہ کرتا ہے۔ اس نے ایک قلمی نسخہ مُطلّا، مذہّب، خطِ شکستہ میں لکھا ہوا قیمتاً مجھے مرحمت فرمایا۔ وہ یہی نسخہ تھا۔ یہ نسخہ عرصہ تک میرے پاس پڑا رہا۔ میں نے بڑی محنت و کاوش سے اسے صاف کرایا اور اس کوشش میں رہا کہ حضرت مصنف شاہ نعمت اللہ صاحب کے کچھ حالات معلوم ہو جاتے تو اسے شائع کیا جاتا۔ چنانچہ کئی مشہور اور قابل حضرات سے رجوع کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر میں مشہور و معروف ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ سے حیدرآباد میں ملا اور اس کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے حد درجہ کرم فرمایا اور قبل اس کے کہ شاہ صاحب موصوف کے حالات بتاتے مجھے اپنے ہمراہ لے کر حضرت شاہ صاحب کے مزار کی زیارت کرائی اور جستہ جستہ حالات بھی بتائے۔ چنانچہ یہ کل حالات انھیں کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں جس کے لئے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میں یوں بھی ڈاکٹر صاحب کے گوناگوں احسانات کا زیر بار ہوں، اور صدق دل سے خدائے تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ خدا انھیں جزائے خیر مرحمت فرمائے۔ یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ اس مثنوی کی اشاعت کے انتظام کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہے۔ ہم سب آپ کے اس بار کرم سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ فجزاہم اللہ خیراً۔

کتاب گنج طلسم

تصنیف

حضرت شاہ نعمت اللہ ولی قدس سرہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گنج گہر ثنائے سبحان

سبحان کی تعریف کا موتیوں کا خزانہ

اے دادہ تجسم آدمی جاں — گنجے بہ طلسم کردہ پنہاں
اے وہ ذات جس نے آدمی کے جسم میں — جان ڈال کر طلسم کا ایک خزانہ پوشیدہ کردیا
زیں گنج بہ چشم نارسیدہ — حیراں شدہ در طلسم دیدہ
نالائق جسم میں اس خزانے کے طلسم (گنج طلسم) — کو دیکھ کر دیدہ (آنکھ) حیران ہوگیا
آں دم کہ طلسم برکشاید — ایں گنج نہفتہ وانماید
جس وقت طلسم کھل جائے گا — یہ پوشیدہ خزانہ ظاہر ہوجائے گا

تعلیم سخن بہ طوطیٔ جاں

طوطیٔ جان کو سخن کی تعلیم

اے طوطی خوشنوا سخن سنج — بردار طلسم خویش از گنج
اے خوش آواز، سخن سنج طوطی — اپنا طلسم، خزانے سے اٹھالے
روشن نفسِ دردل کشائی — بیروں ز قفس چرا نیائی
تو روشن نفس اور صاحب دل ہے — پنجرے سے باہر کیوں نہیں آتی
اے سبز لباس سرخ منقار — بکشائے زبانِ دل بگفتار
اے سبز لباس، لال چونچ والی — زبانِ دل سے کلام کر
در آئینہ نقش خویش دیدی — با صورتِ خویش آرمیدی
آئینہ میں تونے اپنا نقش دیکھا — اپنی صورت سے آرام حاصل کیا
پنداشتۂ کہ ہم زبان است — نے نے غلطی کہ ایں نہ آنست
تونے جانا کہ وہ ہم زبان ہے — نہیں نہیں تونے غلطی کی یہ نہیں ہے

او در پسِ آئینہ نہفتہ — گوید کہ بگو تو نیز گفتہ
وہ آئینہ کے پیچھے چھپ کر — کہتا ہے کہ تو بھی ہمارے قول کو کہہ
آئینہ حجابِ تست بردار — تا چہرہ نماید آں نکو کار
آئینہ تیرا پردہ ہے، اسے اٹھا دے — تاکہ وہ نکوکار چہرہ دکھا دے

نو بادۂ گلشن نصیحت

باغ نصیحت کا تحفہ

شیریں دہنا شکر فشاں شو — از روے زمیں بر آسماں شو
اے شیریں دہن شکر فشاں (چھاڑنے والا) ہو جا — روے زمیں سے آسمان پر چلا جا
شد سبزۂ تو بدل بزردی — پرواز بہ لا مکاں نکردی
تیری سبزی، زردی سے بدل گئی — تو نے لامکاں کی سیر نہیں کی (پرواز)
در چشم کسے کہ دانہ خوار است — انجیر بہشت ناگوار است
اس کی نظر میں جو کہ دانہ خور ہے — بہشت کی انجیر ناگوار (ناموافق) ہے
گر حوصلۂ تو پر شد از قند — از گل شکری جہاں فرو بند
اگر تیرا پوٹا (حوصلہ) قند سے بھر گیا — تو اپنی مٹھاس (گل شکری) سے دنیا کو مغلوب کر
گر سیب رسد ترا بمنقار — ز آسیب زیاں گلو نگہدار
اگر تیری چونچ میں سیب پہنچے — نقصان کی تکلیف سے گلے کو محفوظ رکھو
فرتوت شدی بہ توت خواری — چوں بید ازیں چہ برگ داری
تو بہت بڑھی ہو گئی ہے شہتوت خوری سے — بید کی طرح اس سے کیا؟ کہ پتے رکھتی ہے تو
ہر میوۂ آرزو کہ چیدی — در باغِ جہاں بہی نہ دیدی
امید کا جو میوہ کہ تو نے حاصل کیا — باغ دنیا میں کوئی بہتری نہ دیکھی
بر دست کسے کہ یک انار است — صد دانۂ اشک در کنار است
جس کے ہاتھ میں ایک انار ہے — رشک و حسد کے سَو دانے اس کے پاس ہیں

آوازۂ بلبل محبت

بلبل محبت کا راگ

دیدیم ہزار بلبل مست — صد دیدۂ آرزو بگل بست
ہزاروں مست بلبلوں کو ہم نے دیکھا — جنھوں نے سو طرح کی امیدیں پھول سے وابستہ کیں
شب تا بسحر فغاں کشیدہ — یک چشم زدن نیار میدہ
رات سے صبح تک آہ و نالہ کرتی رہیں — ایک لحظہ بھی انھوں نے آرام نہیں کیا

آمد چو نسیم و غنچه وا شد | بویش بدماغ آشنا شد
جب نسیم چلی اور کلی چٹکی | اس کی خوشبو، ان کے دماغ میں پہنچی
پرواز گل و گلاب کرده | وال سوخته را کباب کرده
انھوں نے گل و گلاب پہ پرواز کی | اور اس سوختہ کو کباب کردیا
بلبل بهزار حسرت و رشک | در دیدهٔ او گلاب شد اشک
بلبل، ہزار حسرت اور رشک سے | اس کی آنکھوں میں آنسو، گلاب ہو گیا
هر گل که درین چمن شگفته | از دیدهٔ بلبلان نهفته
جو پھول کہ اس چمن میں کھلا | بلبلوں کی نظر سے پوشیدہ ہے
گر دیده بآن چمن کشائی | اینجا بهوس دگر نیائی
اگر اس چمن میں تو آنکھ کھولے | تو اس جگہ (دنیا) دوسری لالچ میں نہ آئے
هنگام بهار بگذرد تیز | مَی نوش و طرب فزای و گل ریز
بہار کا زمانہ تیزی سے گذر جائے گا | شراب پی، عیش کر اور پھول لٹا
دل تنگ بخانه می نشینی | صحرائے فراخ چون نه بینی
دل تنگ ہو کر گھر میں تو بیٹھتی ہے | جیسے تو وسیع جنگل نہیں دیکھتی ہے
گل خنده زنان دهن کشاده | نرگس بکرشمه بار داده
پھول ہنستے ہوئے، منہ کھولے ہوئے ہیں | نرگس، ناز و ادا کو بار دیے ہوئے ہے
سرسبز ستاده سرو دل جوی | کوکو زده فاخته ز هر سوی
سرو، دل جو سرسبز کھڑا ہوا ہے | ہر طرف سے فاختہ کوکو کی آواز نکال رہی ہے
هر کس بهوای خویش زد گام | آرام گرفته با دل آرام
ہر شخص نے اپنی خواہش کے موافق قدم بڑھایا | اپنے دل آرام (محبوب) سے آرام حاصل کیا
تو بر سر خاک تیره ماندی | تاریک شدی و خیره ماندی
تو زمیں پر میلی کچیلی دھندلی | اور سست پڑی ہوئی ہے
گر هست ترا هوای گلزار | رو دیدهٔ باغبان بدست آر
اگر تجھے گلزار کی خواہش ہے | جا اور مالی کا دل اپنے ہاتھ میں لے

ن بپرده زگل پیچ

بینائی چشم نعت احمد

آن دیده که ره برد بمنزل | زین چشم دل است و صاحب دل
جو دیدہ (آنکھ) کہ منزل پر پہنچا دے | وہ یہی چشم دل ہے اور صاحب دل
گلهای چمن ز خندهٔ اوست | رضوان و بهشت بندهٔ اوست
چمن کے پھول اس کی ہنسی سے ہیں | رضوان اور بہشت اس کے غلام ہیں

ن آن

حُوراں دو رُویہ صف کشیدہ — چشمش ز حیا درو ندیدہ
حوریں دونوں جانب صف بستہ ہیں — اس کی آنکھ شرم سے انھیں نہیں دیکھتی ہے
ابروش نمودہ قابَ قوسین — دیدہ بدو دیدہ عین در عین
اس کی ابرو قاب وقوسین سے ظاہر کی گئی ہے — دونوں آنکھوں سے دیکھ کر آمنے سامنے
یارانِ گزینِ او بہم یار — ہر چار یکے و ہر یکے چار
اس کے برگزیدہ دوست آپس میں یار ہیں — چاروں ایک ہیں اور ہر ایک چار ہیں
دانا دل و حق گزین و خوش خوی — خنداں لب و تازہ عیش و خوش روی
وہ دانا دل، حق اختیار کرنے والے، خوش خو — خنداں لب، تازہ عیش اور خوبصورت ہیں

نورِ دل تابع محمدؐ

ہر جسم گزیں کہ جانِ قوم است — مانند نبی میانِ قوم است
ہر برگزیدہ جسم جو کہ قوم کی جان ہے — وہ قوم میں نبی کی طرح ہے
روشن روشے کہ پیرو اوست — مانند دو مغز بیں و یک پوست
جو عقلمند کہ اس کا تابع ہے — اسے ایک چھلکے میں دو مغزوں کی طرح سمجھ
طے کردہ رہِ زمین و افلاک — ز آلائشِ جسم جانِ او پاک
زمین و آسمانوں کا راستہ طے کئے ہوئے — جسم کی آلائش سے اس کی جان پاک ہے
ہر ذرہ کہ مہرِ او گزیند — با ماہِ فلک قریں نشیند
جو ذرہ کہ اس کی محبت اختیار کرتا ہے — وہ آسمان کے چاند کے پاس بیٹھتا ہے
پائے رہِ ششش ز گِل نماند — کو دست بدست میرساند
اس کے چلنے کا پیر کیچڑ و مٹی سے عاجز نہیں رہتا — کہ وہ ہاتھوں ہاتھ اسے پہنچاتا ہے

تعلیم نگارِ نقشِ صیاد

اے باز ز صید دیدہ دربند — تا طعمہ دہد ترا خداوند
اے باز! شکار سے باز آ — تاکہ خدا تعالیٰ تجھے غذا دے
یک کبکِ دری تراز بون است — در گردنِ تو ہزار خون است
ایک پہاڑی چکور تیرے لئے برا ہے — تیری گردن پر ہزار خون ہیں
مرغابیِ بحر غوطہ خوردہ — از دستِ تو جاں بدر نبردہ
سمندر کی مرغابی غوطہ لگا کر — تیرے ہاتھ سے جان سلامت نہ لے گئی
دُرّاج ز بیمِ تو بنالد — تیہو سرِ خود بخاک مالد
تیتر تیرے خوف سے روتا ہے — تیہو اپنا سر مٹی میں ملتا ہے

گر دیدۂ تیز بیں کشائی از وحشتِ خود کنی رہائی
اگر تو اپنی تیز بیں آنکھ کھولے تو تو اپنی وحشت سے رہائی پائے
شائستہ دستِ شاہ گردی جاں پرور و دیں پناہ گردی
بادشاہ کے ہاتھ پر بیٹھنے کے لائق ہو جائے جان پالنے والا اور دین کا محافظ ہو جائے
بر بستر اد کنی نشیمن فارغ ز ہزار دوست و دشمن
اس کے بستر پر بسیرا لے ہزار دوست اور دشمن سے مطمئن ہو جائے
ایمن منشیں دریں گذر گاہ کو ہیست نہفتہ زیر ہر کاہ
اس گذرگاہ (دنیا) میں بے خوف نہ بیٹھ ہر گھاس کے نیچے ایک پہاڑ پوشیدہ ہے

تعویذ فسونِ مارِ بیداد

ظالم سانپ کے کر و فریب سے حفاظت

ہر چند کہ نفسِ تو زبوں است ماریست کہ بستۂ فسون است
اگرچہ تیرا نفس برا ہے وہ ایک جادو میں بندھا ہوا سانپ ہے
زافسوں چو گہے دہن کشاید ترسم کہ دل ترا گزاید
مکر و فریب سے کبھی منہ کھولتا ہے میں ڈرتا ہوں کہ تیرا دل ڈس لے
آں سرورِ عارفاں خدا دوست بیروں شدہ ہمچو مار از پوست
وہ عارفوں کا سردار خدا دوست باہر نکل آیا جیسے سانپ کینچلی سے
سی سال کشید محنت و رنج تا مار برآمدش از سرِ گنج
تیس سال، مشقت و تکلیف برداشت کی حتیٰ کہ سانپ خزانے پر سے ہٹ گیا
چوں دید نکو در آخرِ کار بر گنج نشستہ بود آں مار
آخر کار جب اس نے اچھی طرح دیکھا تو خزانے پر وہ سانپ بیٹھا تھا
دائم بتو مار ہم نشیں است ہر جا کہ روی تو در کمیں است
ہمیشہ سانپ تیرا ہم نشیں ہے جہاں تو جاتا ہے وہ تیری تاک میں ہے
چوں بگذری از بلند و پستی شکر انہ بگو بُرد کہ رستی
جب اونچ نیچ سے تو گزر جائے شکریہ ادا کر چل کہ رہائی پائی

طراری نفسِ حیلت آئیں

نفس مکار کی تیز زبانی

ایں دودِ سیہ کہ نور پوش است با دیدہ نظر بعقل و ہوش است
یہ کالا دھواں جو کہ روشنی کو پوشیدہ کرنے والا ہے حقیقت میں اس کی نظر عقل و ہوش پر ہے

با مردِ خرد فسونِ دانا — با رائے رزین قوی توانا
وہ خردمند کے ساتھ مکار عقلمند ہے — رائے زن (مدبر) کے ساتھ توی طاقتور ہے

در علمِ تدبرش زمانہ — در زُہد حدیث زاہدانہ
علم میں زمانے کا معلم ہے — زہد و عبادت میں زاہدانہ حدیث ہے

در ہندسہ شکلہائے موزوں — تحریر کند ز دورِ گردوں
علم ہندسہ میں موزوں و مناسب شکلیں — زمانے (دور گردوں) کی پیمانا ہے

منطق ہمہ اصطلاح او داں — حکمت بزبان او فرو خواں
علم منطق سارا کا سارا اس کی اصطلاح جان — علم حکمت کو اس کی زبان پر حقیر جان

یک نکتہ ز فکر او اشارت — یک حرف ز فنِ او عبارت
اس کی فکر کا ایک نکتہ اشارت ہے — اس کے علم و فن کا ایک حرف پوری عبارت ہے

در علمِ سلوک رہنمون است — صفوت ز تصوفش برون است
علم سلوک میں رہنما ہے — صوفیت (صفوت پاکیزگی) اس کے تصوف یا لاتاہی

در علمِ مغالطات آگاہ — از چرخ کند چو دلو در چاہ
علم مغالطات میں خبردار ہے — آسمان سے ایسا معاملہ کرتا ہے جیسے ڈول کنوئیں

ایمن مشوازِ مطالعِ[۱] او — آگاہ شوازِ طوالعِ او
اس کی مطالع سے بے خوف نہ ہو — اس کی روشنیوں سے آگاہی حاصل کرے

او جملہ مقاصد تو داند — در شرحِ[۲] مواقفش نماند
وہ تیرے سب مقاصد جانتا ہے — جو شرح مواقف میں نہیں ہیں

مغرور مشو بہ نکتہ دانی — مشغول کنش اگر توانی
نکتہ دانی سے مغرور نہ ہو — اسے اپنے ساتھ مصروف رکھ اگر ہو سکے

ارشادِ دل حقیقت آمیز

حقیقت آمیز دل کا ارشاد (سیدھی راہ دکھانا)

روئے دل خود ز بہرہ یابی — از خدمتِ دوستاں نتابی
اپنے دل سے بہرہ یاب ہو تو — تو دوستوں کی خدمت سے سرتابی نہ کر

چوں خدمتِ تو گزیدہ گردد — شغلت بحق آرمیدہ گردد
جب تیری خدمت پسندیدہ ہو جائے گی — تو خدا کے ساتھ تیری مصروفیت مطمئن ہو جائیگی

بے باک مرو ادب نگہدار — تا گل دہدت سنانِ ہر خار
بے دھڑک نہ چل، ادب محفوظ رکھ — تاکہ ہر خار کی نوک تجھے پھول دے

---

۱ علم منطق کی ایک کتاب۔

۲ شرح مواقف، علم کلام کی ایک کتاب۔

پیوستہ طہارتِ بروں کن   آہنگِ صفائے اندروں کن
ہمیشہ ظاہری پاکی اختیار کر   (پھر) باطنی صفائی کا قصد کر
بے نیّتِ خاص ہر عبادت   در عام بود برسم و عادت
ہر عبادت بغیر کسی خاص نیت کے کر (نہیں ہوتی)   اگرچہ رسم و عادات کے موافق یہ عام ہے
چوں خوے طبیعتت نماند   جبریل ترا فرشتہ خواند
جب تیری طبیعت میں خو (عادت) باقی نہ رہے گی   تو جبریل[۲] تجھے فرشتہ کہے گا
ہمت چو بلند شد ز پستی   بر سدرہ نشیں بہوش و مستی
جب پستی سے (تیری) ہمت بلند ہو گئی   تو ہوش (عقل) اور مستی کے ساتھ سدرۃ المنتہیٰ پر بیٹھ
ہر جا کہ رسی مگیر آرام   بردار نصیب و بیش نہ گام[۳]
جس جگہ تو پہنچے آرام نہ لے   اپنا حصہ لے اور قدم آگے رکھ

معراج بلا مکانِ عرفاں

لا مکانِ عرفاں کی سیڑھی

اے سدرہ نشین عرش پیمائے   جائے تو بروں شدہ است از جائے
اے سدرہ نشیں اور اے عرش پیما (سدرۃ المنتہیٰ پر بیٹھنے والے)   تیرا مرتبہ، جگہ سے بالا تر ہے
ایں کہنہ رباط را رہا کن   ہنگامِ درَو شدہ دعا کن
اس پرانے مسافر خانے کو چھوڑ   کھیت کاٹنے کا وقت ہو گیا، دعا کر
زیں چار گہر کہ یک مزاج است   در عالم رنگ و بو رواج است
یہ چار عنصر (گوہر، موتی) جو ایک مزاج ہیں   اس عالم رنگ و بو (دنیا) میں رائج ہیں
بر عاشق آں جہان یک رنگ   صحرائے فراخ ایں جہان تنگ
اُس جہان یک رنگ (جہان آخرت) کے عاشق پر   اس جہان (دنیا) کا وسیع جنگل تنگ ہے
ایوان فلک نہ پایۂ تست   نُہ چرخ بہ زیر سایۂ تست
فلک کا محل تیرے مرتبہ کا نہیں ہے   نو آسمان تیرے زیر سایہ ہیں
ہیہات کہ قدر خود ندانی   بر روئے زمیں چہ آسمانی
افسوس تو اپنی قدر روئے زمیں پر نہیں جانتا ہے   کس قدر بلند ہے تو
پیری و ہنوز طفل ہوشی   افسوس کنی اگر نکوشی
تو بوڑھا ہو گیا اور ابتک لڑکوں جیسی عقل رکھتا ہے   اگر کوشش نہ کرے گا تو افسوس کریگا
برنا و قوی و چست پائی   از مہد زمین بروں نیائی
جوانمرد، قوی اور تیز قدم ہے تو   زمیں کے بستر سے باہر نہیں آتا ہے

---

[۳] بردار بقصدِ پیشتر گام۔

گہ تیغ کشی وگہ کماں را اندا ختہ گیر پہلواں را
کبھی تو تلوار چلاتا ہے اور کبھی کماں تو پہلوان کو پچھاڑنے والا ہے

خصم تو چو پہلواں نشستہ تو گردن پہلواں شکستہ
تیرا دشمن، پہلوان کی طرح بیٹھا ہے تو نے پہلوان کی گردن توڑ دی ہے

در پہلوئے تست خصم پنہاں تو کردہ تن حریف بے جاں
تیرے پہلو میں دشمن چھپا ہے تو نے دشمن کا جسم بے جان کر دیا ہے

از زور بر آر سر بزاری باشد کہ سرش بپا در آری
اگر نالہ وزاری میں، زور وقوت سے تو سر اٹھائے تو ممکن ہے کہ اس کے سر کو کچل دے

تا پنجہ بحق قوی نگردد از زور تو ایں غوی نگردد
جب تک تیرا رشتہ (پنجہ) خدا کے ساتھ قوی نہ ہو جائے گا تیری طاقت سے یہ گمراہ (غوی) نہ بھاگے گا

خاصیت کیمیاے احساں

کیمیائے احساں کی خاصیت

با ہر کہ کنی بدل مدارا چوں موم شود زسنگ خارا
جس کی دل سے تو خاطر کرے گا وہ موم کی طرح ہو جائے گا سخت پتھر سے

یک لطف اگر کنی باحسان صد بندہ ترا شود بفرمان
اگر احسان سے ایک مہربانی تو کرے گا تو سو بندے (غلام) تیرے حکم پر چلیں گے

گر لقمہ نہی بحلق دشمن شمشیر ترا نہد بگردن
اگر دشمن کے حلق میں تو ایک لقمہ رکھے گا تو تیری تلوار، اپنی گردن پر رکھے گا

پیشانی پیل اگر بخاری بر گردن او کنی سواری
ہاتھی کی پیشانی اگر تو کھجلائے گا (یعنی آنکس لگائے گا) تو اس کی گردن پر تو سواری کرے گا

گر پنجہ بہ پشت شیر مالی پیش تو کند بجاں شغالی
اگر شیر کی پیٹھ میں تو پنجہ گاڑ دے گا تو تیری وہ دل سے (لومڑی کی طرح) خوشامد کرے گا

ویں نفس خبیس تو زکفراں گردن کشد از کمند احساں
اور تیرا یہ کمینہ نفس، نافرمانی کی وجہ سے احسان کی کمند سے گردن کشی (انحراف) کرتا ہے

سر باز زند چو سر بر آری آں بہ کہ بطاعتش گزاری
پھر وہ گردن مارے گا جب تو سر اٹھائے گا یہی بہتر ہے کہ اس کو اطاعت میں لگائے رکھ

تسبیح و نماز وذکر واخلاص

اخلاص گزیں نیاز پیش آر تسبیح ہزار دانہ بگذار
خلوص اختیار کر، اظہار محبت سے پیش آ ہزار دانے کی تسبیح (ہزارہ) چھوڑ دے

پشمینہ کلہ تمام بسر نہ — دستارِ گراں سبک ز سر نہ
ادنی کپڑا (موٹا کپڑا) یعنی نمدے کی ٹوپی سر پر رکھ — گراں قیمت والی پگڑی سر سے اتار
آرائش ریش و شانہ کردن — سنت نبود بہانہ کردن
داڑھی کی آرائش اور کنگھا کرنا — سنت نہیں ہے، بہانہ (حیلہ) ہے
در دیدہ ز سرمہ میل کردی — از گریہ چرا نہ نیل کردی
آنکھ (دیدہ) میں سرمے کی سلائی کی تو نے — گریہ و زاری سے کیوں نیلی نہیں کی
از دیدنِ ہر چہ کینہ زاید — آں بہ کہ بچشم تو نیاید
جس چیز کے دیکھنے سے کینہ پیدا ہوتا ہے — اچھا ہے کہ وہ تیری آنکھ میں نہ آئے
کوتاہ امل دراز غم باش — تا رازِ نہاں ترا شود فاش
کوتاہ امید دراز غم (بہت غمگین) رہ — تاکہ پوشیدہ بھید تجھ پر فاش ہو جائے
در گوشہ اگر بخود نشینی — انوار خدا درو ببینی
گوشے میں اگر تو تنہا بیٹھے — تو خدا کے انوار اس میں تو دیکھے

بیعت المعمور خلوت خاص

خلوت چہ بود ز خویش رستن — نے حجرہ بروے خلق بستن
خلوت کیا ہے؟ خودی سے نجات پانا (اپنوں سے چھوٹنا) — نہ حجرہ (عبادت کی کوٹھڑی) لوگوں پر بند کرنا
فارغ ز دل و سادہ لوح بودن — زنگِ دل خویشتن زدودن
بے فکر، اور سیدھا سادھا بھولا بھالا ہونا — اپنے دل کا زنگ (میل) چھڑانا
از ہستی خود کنارہ کردن — در عالمِ جاں نظارہ کردن
اپنی ہستی (وجود؛ زندگی) سے علیحدہ ہونا — عالمِ [illegible] میں نظر کرنا
[illegible] — آں حجرہ شود منزلِ یار [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — شہر [illegible] دکان و بازار
[illegible] — [illegible] دکان اور بازار [illegible]
[illegible] — تیرے گزری نشاں نہ گشتی
[illegible] — کوئی تیر [illegible] نشانہ [illegible]
[illegible] — در گور شدی و نے بمردی
[illegible] — تو قبر میں گیا (مرگیا) اور لیکن نہیں مرا تو (حقیقت میں مردہ نظر آتا ہے [illegible])
[illegible] — چوں در صفِ عاشقاں در آئی
[illegible] — جب تو عاشقوں کی صف میں داخل ہوا
[illegible]

زاں پیش کہ بے نوا بمیری — از گوشہ بیا بہ توشہ گیری
اس سے پہلے کہ تو بے کسی کی موت مرے — گوشے سے توشہ گیری (سامان آخرت) میں آ

خورشید عاشقاں تمامی
تمامی عاشقوں کی چمک

زادِ رہِ عاشقاں غم اوست — یک دوئی و یکدلی دوا و درست
اس کا غم عاشقوں کا زاد راہ ہے — یکجہتی ایک دوا اور یہ درستی ہے

انداختہ بارِ خاطر از دوش — جز او ہمہ را ہمہ فراموش
دوش (کاندھا) سے بارِ خاطر پھینک کر — خدا کی یاد سے سوا سب بھول جا

از خوانِ ابیتُ سیر گشتہ — بے گرسنگی دلیر گشتہ
ابیتُ (انکار کیا میں نے) کے خوان سے سیر ہو کر — بھوک پر دلیر ہو کر

ن گشتی — خفی

ز آغازِ وجود تا بانجام — دیدند جہاں دانہ و دام
ابتدائے آفرینش سے آخر تک — دنیا دانہ و دام (دانہ جال) معلوم ہوتی ہے

یک روز بود جہانِ فانی — در جنبِ جہانِ جاودانی
ایک روز یہ جہانِ فانی (دنیا) — جہانِ جاودانی (آخرت) کے پہلو میں ہے

روشن شدہ از نگاہِ ایں قوم — آں نیز پئے صلوٰۃ یا صوم
اس قوم (اہل اسلام) کی حفاظت سے روشن ہو گیا — وہ بھی نماز یا روزے کی وجہ سے

ن صوم

سرمایۂ فیضِ اسمِ سامی
اسمِ سامی کا سرمایۂ فیض

نعمت کہ بگو یکے از ایشاں — مجموع نشستہ و پریشاں
نعمت جو کہ ان میں سے ایک ہے — اکٹھا بیٹھا ہے اور پریشان

بسیار جفائے چرخ دیدہ — در گردشِ خود کم آرمیدہ
آسمان کی جفائیں بہت دیکھی ہیں — اپنی گردش (چکر، چلنا پھرنا) میں کم آرام کیا ہے

لب بستہ و دیدہ ہا کشادہ — از حیرتِ خود خبر نہ دادہ
لب بستہ ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی — اپنی حیرت (تحیر) کی اسے خبر نہیں ہے

امروز مگر زیادہ شد مست — کایں راز نہاں بہ گفتہ پیوست
آج شاید زیادہ مست ہو گیا ہے — کہ اس بھید کو اس نے ظاہر کر دیا

اے خامۂ نقشبندِ پرکار — اے پیکرِ دل نشیں نگہدار — م
اے نقاش اور اپنے کام میں ہوشیار قلم — اے دل نشیں صورت، خیال رکھ

از صورت ایں خیال بگذر   تا بگذرد ایں خیالت از سر
اس خیال کی صورت سے گزر جا   تاکہ تیرا یہ خیال سر سے نکل جائے
در پردہ کشائے نقشِ ایں راہ   تا آگاہ شود ازو دِل آگاہ
اس راستہ کے نقشوں کو در پردہ فاش کر   تاکہ اس سے دل آگاہ (بیدار مغز) خبردار ہو جائے
راہِ دگر است ایں گدا را   ذوقیست سماع آشنا را
اس فقیر کی راہ دوسری ہے   عارف (آشنا) کے سنانے کا ذوق ہے
طرزِ دگر است ایں سخن را   رازِ تو نشاید انجمن را
اس بات کا دوسرا طرز ہے   تیرا راز مجلس (انجمن) کے لائق نہیں ہے
بکشائے نفس کہ مے بسوزی   صحرائے وجود وے بسوزی
سانس کھینچ کہ جلا دے   اس کے وجود کے جنگل کو جلا دے
اے خامہ پختہ سوز خامی   کز آتشِ دل زباں تمامی
اے پختہ سوز (جلن میں پختہ) قلم، تو خام ہے   کہ تیری زبان سرتاسر (بالکل) آتشِ دل ہے
برگرد آر زبان و لب فرو بند   پروانۂ عشق و مشعلے چند
زبان کو قابو میں رکھ اور لب بند کر   عشق کا ایک پروانہ اور کچھ شمعیں
مشکیں نفسے برآر از سر   گر خونِ دل است نافۂ تر
مشک آلودہ سانس سر سے نکال   اگر نافۂ تر، دل کا خون ہے
برگو سخنے کہ گفتن ارزد   تا فہم سخن وراں بلرزد
بات کہہ، کہ کہنا ہی مناسب ہے   تاکہ سخنوروں کی عقل کانپ اٹھے

فیروزئے طالع خدا داد

خدا داد نصیبے کی کامیابی

اقبالِ کسے کہ رہنموں شد   زیں منزلِ آتشیں بروں شد
جس کا اقبال رہ نما ہوا   اس آتشین منزل سے باہر ہوا
بربست کمر کشاد دل را   بر خاک نہاد آب و گل را
اس نے کمر باندھی اور دل کھولا   زمین پر مٹی اور پانی (جسم) کو رکھ دیا
بگذاشت ہوا چو باد و بگذشت   شد کوہ بزیر پاے او پست
اپنی خواہش ہوا کی طرح چھوڑ دی اور گزر گیا   پہاڑ (کوہ) اس کے پاؤں تلے پست ہو گیا
صحرائے فراخ[1] دید در پیش   دل تنگ نشد ز غربتِ خویش
اطمینان کا جنگل سامنے دیکھا   اپنی مسافرت سے دل تنگ نہ ہوا
رازے کہ ز مرداں شنیدہ   تا چشم نہد بدیدہ دیدہ
جو راز کہ اس نے لوگوں سے سنے   پلک جھپکنے میں دیکھ لئے

[1] فراخ

بنیادِ مقام نزہت آباد

نزہت آباد مقام کی بنیاد

آنجاست ہر آنچہ در دِل آید   بے آرزوے تو رُخ نماید
اس جگہ ہے جو دل میں آتا ہے   بغیر تیری خواہش کے ظاہر ہوتا ہے
ز آنجا چو بپائے دل برآید   در گلشنِ بے نشاں درآید
اس جگہ سے جب دل کے پیر سے باہر آتا ہے   تو بے نشان باغ میں داخل ہوتا ہے
اے کاش کہ آرمیدے آنجا   تا من گل خود بچیدے آنجا
کاش وہ اس جگہ آرام کرتا   تاکہ میں اپنا پھول اس جگہ چنتا

سرگرمیٔ جام ہوش پرواز

ہوش پرواز جام کی سرگرمی

اے مست سخن زباں نگہدار   داماں ز کجا و جیب و دستار
اے مست سخن، زبان محفوظ رکھ   دامن اور گریباں اور پگڑی کہاں
بیہوشی و مستی و خرابی   کز ہستیٔ او نشاں نیابی
بے ہوش اور مست و خراب ہے تو   کہ اس کی ہستی کا پتہ تونے نہ پایا
گر باز بسوے ہوش آرند   از بادہ بنائے و نوش آرند
اگر دوبارہ ہوش میں لائیں   شراب سے نائے اور نوش کی طرف لائیں
تا چنگ زند ببزم رنداں   بیروں شدہ از جفائے زنداں
جب تک رندوں کی محفل میں چنگ بجے   قید خانے کی تکلیف سے نجات رہے
آں را کہ دہد نوائے او گوش   خود را کند از ہوا فراموش
جس کو اس کی آواز سنائی دے   وہ اپنی خواہش فراموش کر دے
در جام کسے کہ بادہ ریزد   تا روزِ قیام بر نخیزد
جس کے پیالے میں شراب انڈیلی جائے   وہ قیامت تک نہ اٹھے
با ہر کہ نگہ کند بمستی   بیروں کندش ز خود پرستی
جس کی طرف وہ مستی سے دیکھ لے   اسے خودی (خود پرستی) سے باہر کر دے

دورانِ شراب ساقیٔ راز

ساقی راز کی شراب کا دور

ساقی نظرے کہ بیقرارم   از چشم تو چشم بادہ دارم
ساقی ایک نظر، میں بیقرار ہوں   تیری چشم کرم سے شراب کی امید رکھتا ہوں

آں مے کہ بکام دل گوارد   خورشید بمژۂ کمک در آرد
وہ شراب جو دلی مقصد کے لائق ہو   خورشید کو آنکھ کی پتلی میں حاصل کردے
گلرنگ کند لباس ہستی   ہوش دگر آورد بمستی
لباس ہستی کو گلرنگ کردے   مستی میں دوسرا ہوش لے آوے
گر سرخی او بہ دیدہ بیند   یاقوت بہ خونِ دل نشیند
اگر اس کی سرخی آنکھ دیکھ لے   تو یاقوت، خون دل میں بیٹھ جائے

قطبِ تمکین و قطبِ دوراں

دورانِ فلک کہ تیز گرد است   سرگشتۂ خاکِ پائے مرد است
آسمان کی گردش جو کہ تیزی سے پھرنے والی ہے   وہ انسان کے پاؤں تلے کی مٹی میں پریشان ہے
ایوانِ فلک کہ تابناک است   از پرتوِ نورِ جانِ پاک است
آسمان کا محل جو کہ چمکدار ہے   وہ جان پاک کے نور کا پرتو ہے
خورشید کہ روشنی نماید   از بینش او نظر کشاید
سورج جو روشنی دیتا ہے   اس کی بینائی سے آنکھ کھولتا ہے
ایں ہفت کواکب جہاں تاب   از پنج حواس او نظر یاب
دنیا کو روشن کرنے والے یہ سات ستارے   اس کے حواس خمسہ سے فیض یاب ہیں
ہر نیک و بدے کہ درمیان است   بر حکمتِ حکم او روان است
ہر اچھا اور برا، جو موجود ہے   اس کے حکم کی حکمت پر جاری ہے
اندر نظرش بلند یا پست   چوں دانۂ خردل است بر دست
اس کی نظر میں بلندی یا پستی   ہاتھ پر رائی کے دانے کی طرح ہے
روشن نکنم دِگر نشانش   گویم سخنی ز تابعانش
اس کا دوسرا پتہ میں نہ ظاہر کروں گا   اس کے ماننے والوں سے ایک بات کہتا ہوں

آوازۂ نامِ نیکمرداں

نیک مردوں کے نام کی شہرت

آں قطبِ وجود و غوثِ ارشاد   دارد دو امام و چار اوتاد
وہ ہستی کے قطب اور ہدایت کے غوث   دو امام اور چار اوتاد رکھتے ہیں
او شاہ زمان و ایں دو دستور   زاں چار چہار رکن معمور
وہ شاہ زماں ہیں اور یہ دو وزیر   ان چاروں سے چار رکن آباد ہیں
شش تن ز نجیب آں شرفدار   بر شش جہتِ جہاں طرفدار
چھ تن، اس کی شرافت سے مشرف ہیں   جو دنیا کی چھ سمتوں پر حاکم ہیں

……… مثلِ اختر[1] گشتند امیر ہفت کشور
پھر ہفت نجیب تارے کی طرح، ہفت کشور کے سردار ہیں

افراد بسیزدہ رسیدہ — زاں سہ صد و شصت برگزیدہ
افراد تیرہ ۱۳ تک پہنچ گئے — ان سے تین سو ساٹھ ۳۶۰ بزرگ ہیں

آبدال چہل شدہ است معلوم — پس چار ہزار گشت مکتوم
چالیس ابدال معلوم ہوئے ہیں — پھر چار ہزار پوشیدہ ہیں

مجمل شدہ است جمع ایشاں — تفصیل گر کنم مثنوی ن پریشاں (ن شود)
ان کا مجموعہ مجمل بیان ہوا ہے — مفصل بیان کردوں تو پریشان ہوگا

فیضِ مرداں ہفت اقلیم

تمام دنیا کے بزرگوں کا فیض

مارا بوجود شاں قوام[2] است — فیض ہمہ در جہاں مُدام است
ان کی ہستی سے ہمارا قوام ہے — ان سب کا فیض دنیا میں ہمیشہ ہے

نومید مشو ز دیدن شاں — ہستند چو آشکار، و پنہاں
ان کی ملاقات (دید) سے ناامید نہ ہو — وہ ظاہر اور پوشیدہ ہیں

ہر روز بمردماں نشینند — ایں بے بصراں درونہ بینند
روزانہ لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں — یہ بے بصر (اندھے) انھیں نہیں دیکھ

در خواب و خورند مثل ایشاں — گہ یار شوند و گاہ خویشاں
سونے اور کھانے پینے میں انھیں کی طرح ہیں — کبھی دوست ہو جاتے ہیں اور کبھی اپنے

گہ سخرہ کنند و گاہ خندند — گہ دیدہ ز دیدنش بہ بندند
کبھی مسخرہ پن کرتے ہیں اور کبھی ہنستے ہیں — کبھی آنکھ اس کو دیکھنے سے بند کر لیتے ہیں

بر صورتِ خود قیاس گیرند — ہم خانہ و ہم لباس گیرند
اپنی صورت پر اندازہ کرتے ہیں — گھر بھی اور لباس بھی اختیار کرتے ہیں

از بسکہ رحیم و بُرد بار اند — زحمت ببرند و رحمت آرند
بہت ہی رحیم اور متحمل مزاج ہیں — زحمت اٹھاتے ہیں اور رحمت لاتے ہیں

ایں قومِ خدا شناس حق جوے — با خار دیناں و بر گل روئے
یہ خدا شناس اور حق جو قوم — زمانے کے تنوں اور کانٹوں میں پھول ہیں

---

[1] یہ حصہ پھٹا ہوا ہے قیاس ہوتا ہے کہ "پس ہفت نجیب" ہوگا (ناسخ)
[2] قوام = وہ شئے جس پر کسی چیز کا قیام ہو۔

کشتی شکن و درست کار اند　چوں خضر تمام ہوش دارند
کشتی توڑنے والے اور کاموں کو درست کرنیوالے ہیں　حضرت خضر علیہ السلام کی طرح ہوشمند ہیں

در ہر چہ صلاح کار بینندؔ　در کردنش اختیار دارند　ؔ دانند
جس چیز میں کام کی درستی (صلاح) دیکھتے ہیں　اس کے کرنے میں خود مختار ہیں

فرمان ملوک ملک تسلیم

ملک تسلیم کے بادشاہوں کا حکم

باشند دریں گروہ دیگر　فرمان قضا نہادہ بر سر
اس گروہ میں دوسرے بھی رہتے ہیں　جو خدا کا حکم اپنے سر پر رکھے ہوئے ہیں

در کار خدا ز خلق رستہ　دل را بمراد دوست بستہ
جو کار خدا میں مخلوق سے علیحدہ رہ کر　دوست کے مقصد میں دل لگائے ہوئے ہیں

چشم و لب و دل بہم نہادہ　از دست عنان خویش دادہ
آنکھ اور ہونٹ اور دل اکٹھا رکھے ہوئے اور　ہاتھ سے اپنی لگام دیئے ہوئے ہیں

ہشیاری و الہائے شیدا

عاشق شیفتہ کی ہشیاری

ہستند گروہے از مجانین　بیروں ز رسوم واز قوانین
مجنونوں کا ایک گروہ ہے　جو رسوم و قوانین (پابندیوں) سے باہر ہے

مجنون منشان عاقل آموز　عارف صفتان عافیت سوز
مجنون طبیعت والے عقلمند کو سکھانے والے　عارف جیسی صفات والے آرام و عافیت کو جلانیوالے

گہ روے برہنہ گاہ رخ پوش　افگندہ ردائے ہستی از دوش
کبھی ننگے منہ کبھی منہ چھپائے　کاندھے سے ہستی کی چادر پھینکے ہوئے

دیوانہ و ہشیار باشند　بیکار نما بکار باشند
دیوانہ اور ہوشیار ہوتے ہیں　بیکار معلوم ہوتے ہیں، کام میں لگے رہتے ہیں

شیدائے محو ذات والا

ذات والا کا فریفتہ اور شیدا

جمع کہ شیفتہ ذات اند　بیروں ز حساب کائنات اند
جو جماعت، ذات خدا کی شیفتہ ہے　وہ کائنات کے حساب سے باہر ہیں

پس کردہ صفات و پیش دیدہ　در حیرت ذات آرمیدہ
بعد میں صفات بیان کئے ہوئے ہوتے ہیں　تحیر ذات باری تعالیٰ میں آرام کئے ہوئے بھی
اور پہلے سے دیکھے ہوئے ہیں　- وہ لیے ہوئے ہیں

وصف کرم و کرامت قطب

کرم کی تعریف اور قطب کی کرامت

آں قطب کریم با کرامت — و آں نکتۂ خطِ استقامت
وہ قطب کریم اپنی کرامت کے ساتھ — اور وہ خط استقامت کا نکتہ ہے

بستہ کمر و درون کشادہ — سر در قدمِ نبی نہادہ
کمر بستہ اور دل کشادہ — نبی کے پیروں پر سر رکھے ہوئے

چوں لعبتِ پردۂ خیالی — پرگشتہ دریں جہانِ خالی
جیسے پردہ خیالی کا کھلونا (دکھایا) — اس جہاں خالی میں پھرا ہوا

بر دائرہ وجود گرداں — در صورتِ جسم پیکرِ جاں
دائرہ وجود پر گھومنے والا — جسم کی صورت میں، روح کی شکل

زو آب رسد بگلشنِ دہر — اینہا ہمہ جدول اند و او بحر
اسی سے دنیا کے باغ کی آبیاری ہوتی ہے — یہ سب چھوٹی نہریں ہیں اور وہ سمندر ہے

ہر رود کشیدہا در خورِ خویش — آبے کہ درو صفا کم و بیش
ہر نہر اپنے مناسب کھدی ہوئی ہے — جو پانی اس میں ہے اس میں کم و بیش صفائی ہے

لب تر نکند بہ بحر ماند — تا آب بہ تشنگاں رساند
اپنا لب تر نہیں کرتا ہے سمندر کے مشابہ ہے — تاکہ پیاسوں کو پانی سینچتا ہے

ہر خار و گلے کہ در عیان است — زاں آب بروے او نشان است
ہر کانٹا اور پھول جو سامنے ہے — اس پانی کا اس کے چہرے پر نشان ہے

شرح برکات و صحبتِ قطب

اے خار زباں بگل مکن تیز — آب رخ خود بخاک آمیز
اے خار، گل پر زباں تیز نہ کر — اپنے چہرے کی رونق کو خاک میں ملا دے

رخسارۂ خود بگل میالاے — ز اندازۂ خود برون منہ پاے
اپنا رخسارہ مٹی میں نہ لتھیڑ — اپنے اندازے سے قدم باہر نہ رکھ

در سایۂ او نشیں کہ نور است — از روئے تو راہِ آب دور است
اس کے سایہ میں بیٹھ جو نور ہے — تیرے چہرے سے پانی کا راستہ دور ہے

گل چہرۂ آتشیں فروزد — در آتش غیرتت بسوزد
پھول، گلنار چہرے کو روشن کرتا ہے — غیرت کی آگ میں تجھے جلا دیتا ہے

در چہرۂ خود چو گل نمائی — در دیدۂ بلبلاں بیائی
اگر تو اپنا چہرہ پھول کی طرح دکھلائے — تو چاہیئے کہ بلبلوں کی نظر میں آئے

اے نورِ دو دیدہ تیز بیں شو بگذر ز گمان و در یقیں شو
اے دونوں آنکھوں کے نور تیز بیں ہوجا گمان سے درگذر اور یقین میں ہوجا

چوں نورِ دلت پدید آید بر رخسارۂ خارِ گل نماید
جب تیرے دل کا نور ظاہر ہوجائے گا تو رخسارۂ خار گل معلوم ہوگا

در صحبت او نشین و برخیز وز دیدۂ خویشتن بپرہیز
اس کی صحبت میں بیٹھ اور اٹھ اور خویشتن بینی سے پرہیز کر

تا پرتو او بدل در آید در دیدہ چو مردمک نماید
تاکہ اس کا پرتو دل میں داخل ہوجائے آنکھ میں پتلی کی طرح معلوم ہو

چوں رفت غبارِ چشمت از پیش خورشید شوی بدیدۂ خویش
جب تیری آنکھ کا غبار (میل) سامنے سے چلا گیا تو اپنی نظر میں تو سورج ہوجائیگا

ترسم غلطے دگر در آید از چشم تو روشنی رُباید
مجھے ڈر ہے کہ دوسری غلطی نہ ہوجائے جو تیری آنکھ سے روشنی لے جائے

خورشید حضور قطب عالم

قطب عالم کی حضور یابی کا سورج

در غیبت اگر حضور یابی سر تا قدمت بنور تابی
غیبت (خلوت) میں اگر تجھے حضور حاصل ہوجائے سر سے پاؤں تک تو نور سے چمکنے لگے

ایں نور تو نیست پرتو اوست بکشائے نظر ز مغز تا پوست
یہ تیرا نور نہیں ہے اس کا پرتو ہے تو نظر کھول (غور کر) مغز سے پوست تک

روشن نظرے کہ ہیچ بیند در صحبت راستاں نشیند
روشن نظر جو کچھ دیکھتا ہو سچوں کی صحبت میں بیٹھے

در سایۂ شاں چو خاک باشی خورشید شوی بنور پاشی
ان کے سایہ میں تو خاک کی طرح ہوجائیگا تو نور پاشی میں خورشید ہوجائیگا

آئینۂ صدق... آدم

جز راستی و درست کاری یارت نبود براہ باری
سوائے سچائی اور درست کاری کے کوئی تیرا یار نہ ہوگا خدا کے راستہ میں

گر چشم تو راستی نماید از عقدۂ دل گرہ کشاید
اگر تیری آنکھ راستی دکھلائے تو دل کی گتھی سے گرہ کھل جائے

چوں کارِ دلت درست گردد ہر سختیٔ کار سست گردد
جب تیرے دل کا کام درست ہوجائیگا تو ہر کام کی سختی سست (آسان) ہوجائیگی

پیوستہ راست و درست باش چوں تیر بی شست و کماں شوی نشانگیر
یعنی سیدھا اور ٹھیک، تیر کی طرح رہ کہ تو تیر و کماں سے نشانہ لگانے والا ہو جائے

با ایں دو چو رو چو فرق بر سر بے ایں دو مرو چو حلقہ بر در
ان دونوں کے ساتھ چل جیسے مانگ سر پر ہے ان دو کے بغیر نہ چل جیسے زنجیر دروازے پر

ظلمت گاہ برون پرستاں

ظاہر پرستوں کی تاریکی

اے کردہ لباس فقر در بر درویش نما و نفس پرور
اے شخص جو کہ فقر کا لباس پہنے ہوئے ہے تو درویش نما اور نفس پرور ہے

سرگشتہ چو رند لا ابالی پر کردہ شکم چو دیگ خالی
رند لا ابالی کی طرح سرگشتہ ہے پیٹ کو بھرے ہوئے جو دیگ خالی کی طرح ہے

گہ باغ نشیں و گہ ببازار گہ بر لب جوئے و گہ بخمار
کبھی تو باغ نشیں ہے اور کبھی بازار میں کبھی دریا کے کنارے اور کبھی شراب بیچنے والے کے پاس

سجادۂ تو بساط شطرنج ذکرت دو چہار پاشش و پنج
تیرا سجادہ، شطرنج کی بساط ہے تیرا ورد وظیفہ دو، چار، پانچ، چھ ہے

فکرت ہمہ شب کہ زر ربائی وردت ہمہ روز ژاژ خائی
رات بھر تجھے دولت حاصل کرنے کی فکر ہے دن بھر تیرا وظیفہ بیہودہ گوئی ہے

بنگی زنی و قمار بازی گردن کشی و سر فرازی
بھنگ پینے والا اور جواری ہے تو تو سرکش ہے اور مغرور ہے

چوں مست شوی دراز خوابی تا سختی معدہ نرم یابی
جب تو مست ہو جاتا ہے تو دیر تک سوتا ہے تا کہ معدہ کی سختی کو نرم کر لے

صد بار اگر خوری پیاپے ظاہر نکنی کہ چند و تا کے
پے در پے اگر سو مرتبہ تو کھاتا ہے تو یہ ظاہر نہیں کرتا کہ کتنی مرتبہ اور کب تک

انصاف بدہ کہ صفوت اینست یا راہ سلوک مرد دین است
انصاف کر تصوف (صفوت: صوفی ہونا، پاکیزگی) ایسا ہے یا دیندار کی راہ سلوک یہی ہے

بر روزہ و بر نماز خندی در ہزل و دروغ لب نہ بندی
روزہ اور نماز پر ہنستا ہے تو اور بیہودہ گوئی اور جھوٹ سے پرہیز نہیں کرتا ہے تو

با عالم و زاہد و خدا دوست ہمرہ نشوی کہ دشمنت اوست
عالم زاہد اور خدا دوست کے تو ہمراہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ تیرا دشمن ہے

وز صحبت مفسداں نخیزی   بے قید بصلح کل گریزی
مفسدوں کی صحبت سے تو نہیں اٹھتا ہے   بے قید رہ کر "صلح کل" کی طرف بھاگتا ہے
جنگ تو بدین حق پرستاں   صلحت بہ شراب خوار و مستان
تیری لڑائی حق پرستوں کے دین سے ہے   تیری صلح شرابیوں اور مستوں سے ہے
آہنگ کنی براہ و بے راہ   بے خویش شوی بنالہ و آہ
راہ بے راہ تو قصد کرتا ہے   تو نالہ و آہ میں مدہوش ہو جاتا ہے
از خندہ بگریہا در آئی   تا ذوقِ سماع خود نمائی
ہنستے ہنستے تو رونے لگتا ہے   تاکہ تو اپنا ذوقِ سماع دکھلائے
گہ آہ کناں برآوری دست   بیہوش شوی چو صوفیِ مست
کبھی آہ کرتے ہوئے تو دعا کرتا ہے   مست صوفی کی طرح بیہوش ہو جاتا ہے
بے قید نباشی اے ہوائی   کز بند دروں بروں نیائی
تو آزاد نہیں ہے اے خواہش کے بندے   کیونکہ دل کی قید سے تو باہر نہیں آتا ہے (آزاد)
دیدی کہ تمام حالت اینست   ناقص نظرا کمالت اینست
تو نے دیکھ لیا، تیرا پورا پورا مکمل حال یہ ہے   اے ناقص نظر تیرا کمال یہ ہے

صفوت کدۂ درونِ مستاں

مستوں کے دل کا صفوت کدہ

آں را کہ ملامتیہ گویند   آں یک جہتانِ سرخ روئید
جن کو ملامتیہ کہتے ہیں   وہ یک جہت اور کامیاب ہیں
در آئینہ بیں بچشم صورت   زیں روے صفا وزاں کدورت
آئینہ میں چشم صورت سے دیکھ   اس صاف چہرے اور اس کدورت کو
روشن رویش بچشم مردم   در گردشِ دیدہ راہ شاں گم   روشن
لوگوں کی نظروں میں وہ روشن چہرہ ہیں   آنکھ کی گردش میں ان کا راستہ گم ہے
در پردہ خیالہا نمایند   از صورتِ خود بروں نیایند
در پردہ خیالات ظاہر کرتے ہیں   اپنی صورت سے باہر نہیں آتے
در بازیِ دیدہ بے نظیر اند   از حقۂ چرخ مُہرہ گیرند
دیدہ بازی میں بے نظیر ہیں   آسمان سے تریاق حاصل کرتے ہیں، (تارے توڑ لاتے ہیں)
نیکو نظران بد نما کار   در دیدۂ عارفاں سزاوار
نیک نظر اور بد نما کار ہیں   عارفوں کی نظر میں لائق ہیں
در باطنِ کارِ شاں عزیمت   بر ظاہر شاں مباح نیت
باطن میں ان کے کام، خدا کے لئے ہیں   ظاہر میں ان کی نیت مباح ہے

تا چشم بروے خلق دارند　　در دیدہ ہمہ ملامت آرند

مخلوق سے امید اس لئے رکھتے ہیں　　تاکہ سب کی نظروں میں ملامت حاصل کریں

گر دیدۂ مرداں نہ بینند　　در حلقۂ صوفیاں نشینند

اگر لوگوں سے امید نہ رکھیں (کی نظر میں نہ دیکھیں)　　تو صوفیوں کے حلقہ میں بیٹھیں (شمار ہوں)

بیت اللہ مجمع کرامات

ایں قوم بپائے وقت قائم　　نندشتہ دمے ز لوم لائم

یہ قوم وقت کے قیام (ہمیشہ) سے قائم ہے　　ملامت کرنیوالے کی ملامت سے ایک دم بھی خالی نہیں

در خلوت و انجمن بیک حال　　از دیدۂ خلق فارغ البال

خلوت اور جلوت میں ایک حالت میں ہے　　مخلوق کی نظر سے فارغ البال (پوشیدہ) ہے

گہ بر رُخ کائنات بینند　　در آئینۂ صفات بینند

کبھی انھیں مخلوقات میں دیکھتے ہیں　　صفات کے آئینہ میں دیکھتے ہیں

خورشید و شعاع و ذرّہ ہر سہ　　یک چیز بود بدیدہ در سہ

سورج، شعاع اور ذرہ یہ تینوں　　دیدہ ور کی نظر میں تینوں ایک ہیں

ہر مرتبہ را نگاہ دارند　　یک تا بہزار می شمارند

ہر مرتبے (درجہ) پہ نگاہ رکھتے ہیں　　ایک سے ہزار تک گنتے ہیں

ہر ذرہ نمود روئے خورشید　　خورشید بذرّہ ہست جاوید

ہر ذرہ نے خورشید کا چہرہ دکھایا　　خورشید، ذرہ ہی سے زندہ جاوید ہے

آں نور قدیم لایزال است　　از خلق نہ نقص و نہ کمال است

وہ قدیم نور لایزال ہے　　مخلوق سے نہ اسے نقصان ہے اور نہ کمال

شد ہستیٔ ما بہ او نمودہ　　او ہست چنانکہ ہست و بودہ

ہماری ہستی، اسی سے ظاہر ہوئی　　وہ ہے جیسا کہ ہے اور تھا اور رہے گا

بسم اللہ نامۂ مناجات

نامۂ مناجات کی ابتدا

اے ذات تو بے جہات پیدا　　بر نور تو کائنات شیدا

اے خدا تیری ذات بے جہات ہے　　تیرے نور پر کائنات (مخلوق) شیفتہ ہے

خود را بزبان ما ستودی　　مارا بشناس رہ نمودی

ہماری زبان سے اپنی تعریف منوائی تو نے　　ہمیں عقل (شناس) سے تو نے راستہ دکھایا

نے روئے ستائش تو داریم　　از تست ہر آنچہ بر تو آریم

تیری تعریف کرنے کا منہ ہم نہیں رکھتے　　تجھی سے ہے جو کچھ تیری تعریف میں کہتے ہیں

از قوتؔ نست طاعت ما — سرمایۂ تو بضاعت ما
تیری ہی قوت سے ہماری اطاعت و عبادت ہے — تیری ہی یاد بھی ہمارا سرمایہ ہے

چشم و سرو روے از تو داریم — زاں روے بسجدہ می گذاریم
آنکھ اور سر اور چہرہ (صورت) تجھی ہی نے ہمیں دیا ہے — اسی چہرے سے ہم تیرا سجدہ کرتے ہیں

مارا تو بہ لطف برگزیدی — از بہر عبادت آفریدی
ہمیں اپنی مہربانی سے برگزیدہ کیا تو نے — عبادت کے لئے تو نے پیدا کیا

چوں قوتؔ و فعل از تو یابیم — از کار تو سر چگونہ تابیم
جب قوت و فعل تجھی سے پاتے ہیں ہم — تو ہم تیرے کام سے کس طرح سرتابی کریں گے

حضرات کعبہ سلامت

نعمت بدل شکستہ کن جائے — بر بند زبان و دیدہ بکشائے
اے نعمت، دل شکستہ سے جگہ (پیدا) کر — زبان بند کر اور آنکھ کھول

چوں نافع و ضار در جہاں اوست — چشم تو بمرداں نہ نیکوست
جب فائدہ اور نقصان پہنچانے والا دنیا میں وہی ہے — تو لوگوں سے تیری امید اچھی نہیں ہے

ہر سود و زیاں کہ پیشت آید — منسوب بہ دیگراں نشاید
ہر نفع و نقصان جو تجھے پیش آئے — دوسروں کی طرف نسبت کرنا نہیں چاہیے

چوں نیست کسے دگر میانہ — او باشد و اینہمہ بہانہ
جب کوئی دوسرا درمیان میں نہیں ہے — تو وہی ہے اور یہ سب بہانہ ہے

لا نافعؔ خواندۂ و لا ضار — خود را بکن و مکن میازار
"لا نافع" اور "لا ضار" تو نے پڑھا ہے — اپنے کو بس و پیش (کن و مکن) سے مت آزار دے

کارے کہ کنی برائے او کن — خوشنودیٔ خود رضائے او کن
جو کام تو کرے اس کے لئے کر — اس کی رضا اپنی خوشنودی سمجھ

بیروں نہ نہی بدانش و رائے — از دائرۂ حقیقتش پائے
عقل و سمجھ سے — اس کے دائرۂ حقیقت سے باہر پاؤں نہ رکھ

ظاہر نکنی اگر توانی — اسرار حقیقتش تو دانی
اگر تجھ سے ہو سکے تو ظاہر کرے — اس کے اسرار حقیقت تو جانتا ہے

محراب دعائے استقامت

آں را کہ بہ رہ روی مقیم است — ایں راہ صراط مستقیم است
جو کہ رہ روی (راستہ چلنے) میں قائم (پختہ) ہے — یہ راستہ صراط مستقیم ہے

لہ قوۃ - کسی کام کے کرنے کی قوت اور فعل - عمل

خطے است براستی کشیدہ — از خاک بآسماں رسیدہ
ایک خط سیدھا کھینچا ہوا ہے — زمین سے آسمان تک پہنچا ہوا ہے
روشن بصرے رود رسن تاز — تیرہ نظرے شود سر انداز
روشن بصر، رسی پھینکتا ہوا چلا جاتا ہے — تاریک نظر سر کے بل گر پڑتا ہے
زیں راست کسے کہ کج نہد پائے — در منزل ملحداں کند جائے
جو شخص اس ٹھیک راستہ سے اپنا پیر ٹیڑھا رکھے — ملحدوں کی منزل میں اس کی جگہ ہے
در پائے نہ دیدہ سر بر آورد — ترسم کہ سرش بدار خارد
اور جو بغیر پاؤں دیکھے سر اٹھائے — مجھے ڈر ہے کہ اس کا سر سولی سے زخمی ہو گا
ہر جا کہ نظر نہی قدم شو — گاہے ز وجود در عدم شو
جس جگہ تو نظر ڈالے اگر جا — کبھی وجود سے عدم میں ہو جا
طے کردہ رہ گذشت خود را — سرکن رہ بازگشت خود را
اپنی رہ گذشت طے کر کے — اپنی راہ بازگشت کو بیان کر، مکمل کر
تا باز خرامشے نمائی — از اول رہ بآخر آئی
تاکہ پھر تو خوش رفتاری دکھلائے — اول راستہ سے آخر میں آئے
شد اول و آخر تو یکساں — در صورت جسم و معنئ جاں
تیرا اول اور آخر، ظاہری جسم اور حقیقی جاں (روح) میں یکساں ہو گیا
اے ظاہر و باطن تو یکرنگ — در طاقت صلح و قوۃ جنگ
اے کہ تیرا ظاہر و باطن صلح کی طاقت اور جنگ کی قوت میں ایک طرح کا ہے
فارغ ز غبار خویش بینی — در منزل خویشتن نشینی
اور اے فراغت حاصل کرنے والے خویشتن نشینی کی منزل میں خوش بینی کے غبار سے
دیدی کہ چہ گنجہا کشادم — بروے چہ طلسمہا نہادم
تو نے دیکھ لیا، کیسے گنج (خزانے) میں نے کھولے اور اس پر کیسے طلسم رکھے میں نے
زیں گنج طلسم اگر کشائی — از عہدۂ فقر خود برائی
اگر تو اس گنج طلسم کو کھول لے — تو اپنی فقیری کے عہدہ سے باہر ہو جائے

بے غم ہمہ عمر شاد گردی
بے غم تمام عمر خوش رہے
درویش غنی نہاد گردی
غنی طبیعت درویش ہو جائے

تمام شد بعون اللہ تعالےٰ

گنج طلسم از خط میر زبیر خاں بن شریف خاں بن تیر انداز خاں قلعہ دار قلعہ اتور

پلیگ

انسان۔ کرتار سنگھ دُگل

تب میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے اپنا گاؤں بڑا لگتا تھا۔ اتنا بڑا جیسے ایک دنیا ہو۔

مجھے گاؤں کی ہلکی ہلکی دھوپ اچھی لگتی تھی۔ اودا اودا آسمان اچھا لگتا تھا۔ میری ماں کے بنائے البوں کی بو اچھی لگتی تھی۔ بھینس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے باہر لے جانا اچھا لگتا تھا۔ تالاب میں بھینس کو نہلانا اچھا لگتا تھا۔ گھاس پر لیٹے لیٹے میں کتنی کتنی دیر دور کسی کو "ماہیے" کے بول گاتے ہوئے سنتا رہتا تھا۔ سنتے سنتے سو جاتا تھا۔ گاؤں کے گردوارے میں بیٹھا ہوا میں سوچا کرتا تھا کہ اس سے بڑا مکان دنیا میں کوئی ہوگا۔ اپنا گاؤں اس کے آگے ایک اور گاؤں اس کے آگے ایک اور گاؤں۔ اس کے آگے میں سوچتا جنگل جنگل ہوگا' اندھیرا اندھیرا ہوگا' دنیا ختم ہو جاتی ہوگی۔

تب میں بہت چھوٹا تھا۔ باسی روٹی پر مکھن رکھ کر کھانا۔ لسی والے ساگ کے کٹورے بھر بھر سڑپ دینا۔ جتنی لسی کھٹی ہو اتنا ہی اسے خوشی کے ساتھ پینا۔ سویرے سویرے بیریوں کے بیر چننے کے لئے نکل جانا۔ ساون کی بہار میں تازہ نیرو کی تلاش میں کہیں کا کہیں ہو آنا۔

اپنے گاؤں میں مجھے خوب گہما گہمی لگتی تھی۔ بچے بہت زور سے ہنستے تھے۔ مسجد کا ملا بہت زور سے اذان دیتا تھا۔ بازار میں لوگ بہت زور زور سے بولتے تھے۔ لڑنے والے زور سے لڑتے تھے۔ رونے والے زور سے روتے تھے۔ کھیلنے کے وقت کھیل کھیل کر لوگ نہ تھکتے تھے نہ ہارتے تھے۔

اس طرح خوشی خوشی دن گزر رہے تھے کہ ایک دن سننے میں آیا کہ ہمارے گاؤں میں پلیگ پھیل رہی ہے۔ گلی میں ایک مرا چوہا لوگوں نے دیکھا تھا۔ پھر کسی کے گھر میں ایک چوہا گرا۔ پھر کئی گھروں میں چوہے گرنے لگے۔ پھر ایک نوجوان کی کمر پر گلٹی نکل آئی۔ پہلے دن گلٹی نکلی اور اگلے روز وہ ختم ہو گیا۔ اس مردے کو جلا کر ابھی لوگ لوٹے تھے کہ دو اور نوجوانوں کو گلٹیاں نکل آئیں۔ سارے کے سارے گاؤں کا خون جیسے کھینچ لیا گیا ہو۔ ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر دیکھتے دیکھتے گاؤں خالی ہو گیا۔

ہم بھی اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر چلے گئے۔ میں' میرے بہن بھائی' میری ماں اور میرے والد۔ پر میرے دادی دا گھر چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

شہر جہاں جا کر ہم رہے ہمارے گاؤں سے تین میل دور تھا۔ ہر روز سویرے میرے بڑے لالہ جی (دا ہمیں دودھ پہنچانے آتے۔ مکھن دے جاتے۔ گاؤں کے کوئیں سے سبزی لے آتے۔ کتنی کتنی دیر بچوں کے ساتھ باتیں کر اور یوں مل ملا کر پھر گاؤں لوٹ جاتے۔

میرے ماں باپ بڑے لالہ جی سے گاؤں کی خیر خیریت پوچھتے۔ ہر روز جو خبر وہ دیتے وہ اچھی نہ ہوتی۔ ابھی گر رہے تھے۔ ابھی گلٹیاں نکل رہی تھیں۔ ابھی لوگ ایک ایک دن' دو دو دن بیمار رہ رہ کر مر رہے تھے۔

لاکھ میرے ماتا پتا خفا ہوتے پر میرے بڑے لالہ جی اپنا گاؤں چھوڑنے کے لئے راضی نہ ہوئے۔ اگر کوئی صاف ستھرا رہے۔ صاف ستھرا کھائے پیئے' میرے بڑے لالہ جی کہتے تو کوئی بیماری نزدیک نہیں لگتی۔

مجھے شہر کا گھر ذرا اچھا نہ لگا۔ پھر روز جب بڑے لالہ جی گاؤں لوٹتے تو میں ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا۔ یہ بھی کوئی گھر ہوا۔ میں بار بار اپنے سے کہتا — ایک کمرہ' ایک اور کمرہ اور بس۔ باہر کا آنگن وسیع اور کرایہ داروں کا سانجھا تھا۔ آنگن میں لگے ہوئے نل پر دن بھر عورتیں نہاتی رہتیں' کپڑے دھوتی رہتیں' نیم برہنہ! مجھے بڑی شرم آتی۔

جس احاطے میں ہمارا گھر تھا اس کے باہر میونسپل کمیٹی کی چنگی تھی۔ چنگی کے آگے سڑک تھی اور سڑک کے پار چھاونی کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ راولپنڈی کی چھاونی میں نے سنا تھا بڑی مشہور چھاونی تھی۔

میرے نزدیک چھاونی کی بس تین نشانیاں تھیں۔ سڑک کے پار ایک پانی کی ٹینکی تھی جہاں صبح شام فوجی گھوڑے پانی پلانے کے لئے لائے جاتے۔ سامنے سڑک پر درختوں کے نیچے کبھی کسی شام کو انگریز بچے ہوائی بندوقیں لئے پرندوں کا شکار کرنے آتے یا سڑک کے اس پار کوئی آیا فرنگی کے کسی دودھ جیسے گورے چٹے بچے کو گاڑی میں ڈالے ٹہلا رہی ہوتی۔

اور میں سڑک کے پار چھاونی کی ان نئی نئی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا۔

خاص طور پر پانی کی ٹنکی مجھے ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہتی۔ نہ جانے اس لئے کہ اب مجھ سے میرا تالاب چھن گیا تھا جہاں صبح شام میں نہاتا رہتا تھا یا پھر اس لئے کہ اس میں گھوڑے آکر پانی پیتے تھے اور گھوڑوں کو دیکھ کر مجھے اپنی بھینس یاد آجاتی تھی۔ ایک دن ڈرتا ڈرتا میں سڑک کے پار اس ٹنکی کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا ٹنکی میں موتیوں جیسا صاف پانی ہے۔ ایک طرف نل میں سے پانی آرہا تھا دوسری طرف نالی سے پانی بہہ رہا تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے اس پانی کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں کپڑے اتار کر اس میں کود پڑوں پر آگے پیچھے کئی فوجی آجا رہے تھے۔ میری ہمت نہ پڑی۔ اسی روز شام کو گھر آکر میں نے ماں کو اپنی یہ خواہش بتائی۔ میری ماں نے مجھے ایک دم ڈرا دیا۔ اگر تجھے سڑک کے پار گھومتے ہوئے کسی گورے نے دیکھ لیا تو پکڑ کر حوالات میں بند کر دے گا۔ اور جب کوئی گورا کسی کو پکڑے تو اس سے پوچھ گچھ بھی نہیں کی جا سکتی۔

"میں تب جاؤں گا جب کوئی فوجی سامنے نہ ہوگا۔"

"نہ بیٹا" میری ماں نے مجھے اور ڈراتے ہوئے کہا "یہ فوجی کئی بار چھپے کپڑے پہن کر بھی گھومتے رہتے ہیں۔ تو اپنے نل پر ہی نہایا کر۔"

پر نل کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی خالی نہیں ہوتا تھا۔ احاطہ کی عورتیں جو صبح کپڑے دھونے بیٹھتیں کہ شام ہو جاتی۔ میں اکثر اپنے صحن کے باہر بیٹھا ٹنکی کو دیکھتا رہتا تھا۔ ٹنکی جس میں میں نے خود دیکھا تھا موتیوں سا صاف پانی بہتا رہتا تھا۔

سویرے شام' سویرے شام میں ٹنکی کی طرف دیکھتا رہتا اور اس طرح دیکھ دیکھ کر آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک دن دوپہر میں بہت گرمی تھی۔ ٹنکی کے آگے پیچھے کوئی شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے چپکے سے اپنے کپڑے اتار کر اپنی دہلیز پر رکھ دئے اور دوڑتا ہوا سڑک پار کر کے ٹنکی میں جا کودا۔ پہلی ڈبکی لگا کر جب میں نے سر باہر نکالا تو میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ ٹنکی کے کنارے کھڑا ایک گورا مجھے کان پکڑ کر باہر نکال رہا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں سے آ ٹپکا تھا۔ میں بیل سے ٹوٹی تتلی کی طرح اس کے بازوں میں ادھ مرا جا پڑا۔ پھر مجھے پتہ نہیں کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا۔ پھر مجھے پتہ نہیں کہ اس نے کس سے کیا کہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں چارپائی پر بیمار پڑا تھا۔ اس دن سے انگریز کے لئے میرے دل میں سخت نفرت بھر گئی۔ ایک عجب قسم کا ڈر سا بس گیا۔ جہاں کہیں میں گورے کو دیکھ لیتا میرا منہ غصہ کے مارے لال ہو جاتا۔ میری آنکھیں ڈر کے مارے جھک جاتیں۔ میں تھر تھر کانپنے لگتا۔

اگر میں ڈرتا نہیں تھا تو فرنگی کے ان بچوں سے ہوائی بندوقیں لئے کئی بار شام کو سڑک کے پار پیڑوں کے نیچے شکار کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ ان پر تو اکثر مجھے غصہ آجاتا تھا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک اکیلا انگریز بچہ بندوق لئے سامنے سڑک پر گھوم رہا ہے۔ میں دوڑ کر اندر سے اپنی غلیل اٹھا لایا اور سڑک کے پار جاکر پیڑوں پر اندھا دھند پتھر پھینکنے لگا۔ انگریز بچے نے جھوٹ موٹ بندوق میری طرف کر کے مجھے ڈرایا۔ میں نے سچ مچ ایک کنکر اس کی چھاتی پر دے مارا اور گھبرا کر وہ وہاں سے بھاگ گیا۔

اس دن میں رات کو بہت خوش خوش تھا۔ ہنس ہنس کر ہنستا کھیلتا کھیل کر کھیلتا۔

اگلے دن شام کو میں احاطہ کی باہر کی دہلیز پر بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ تین چار انگریز بچے میری طرف آرہے تھے ہر ایک کے ہاتھ میں غلیل تھی۔ لمبے لمبے، پیچے پیچے ربڑ، لوہے کے ہتھے۔ گول پتھر وہ میری طرف پھینک رہے تھے میں دیکھا تو گھبرا گیا۔ کتنی دیر وہ بچے ہمارے احاطے کے باہر منڈلاتے رہے۔

اس کے بعد جب کبھی وہ بچے مجھے دیکھتے میں گھبرایا ہوا بھاگ کر اپنے احاطہ میں چھپ جاتا۔

مجھے شہر کی یہ زندگی زہر لگتی تھی۔ یہ ہمارے گاؤں میں پلنگ زوروں پر تھی اور مجھے کوئی اس طرف منہ تک نہ کرنے دیتا تھا۔

ایک دن میں شام کو اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا سامنے احاطہ میں نل کے گرد کپڑے دھو رہی عورتوں کو دیکھ رہا تھا کہ باہر سے بڑھی نے آکر انہیں کوئی بات بتائی اور ایک دم انھوں نے کپڑے دھونا بند کر دیئے۔ سب عورتیں تھوڑی پر انگلیاں رکھے کتنی دیر تک سر جوڑ کر کھسر پھسر کرتی رہیں۔ پھر دیسی دیسی کپڑے سنبھال ہاتھ ملتی ہوئیں وہ اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ میری ماں جب گھر آئی تو میں نے اس سے کوئی بات پوچھی۔

"بیٹا بڑا ظلم ہوا ہے۔" میری ماں نے مجھے بتلایا۔ "سامنے سڑک پر ایک آیا گورے کے ایک بچے کو گاڑی میں ٹہلا رہی تھی کہ ادھر سے ایک ٹرک آیا اور بچہ گاڑی سمیت اس کے نیچے دب گیا۔ آیا تو بچ گئی پر بچہ پتہ نہیں کیسے ٹرک کے نیچے آ گیا۔ ہائے بیٹا بڑا ظلم ہوا ہے۔ بیچاری آیا ......"

"کیوں آیا کو اب کیا ہو گا؟"

"ہائے بیٹا آیا بیچاری کی مٹی پلید ہو گئی۔"

"کیوں آیا کو سزا ملے گی؟"

"سزا ہی سزا۔ ان فرنگیوں سے بھگوان بچائے۔"

"آیا کو کیا کریں گے ماں؟"

"کیا کریں گے؟ آدھا دھڑ اس کا زمین میں دبا کر باقی آدھا دھڑ شکاری کتوں سے نچوائیں گے۔"

اور میری ماں نہ جانے کتنی دیر تک بولتی رہی۔ مجھے اس کے بعد کچھ سنائی نہ دیا۔ گم سم جہاں بیٹھا تھا وہیں جم گیا۔

اس رات میں کھانا نہیں کھا سکا۔ سونے کے وقت مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کافی رات گئے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنی چارپائی پر آکر لیٹی۔ اپنی ماں سے میں نے پھر پوچھا "ماں اس آیا کو کیسے نچوائیں گے یہ گورے؟"

"بیٹا پہلے ایک گڑھا کھودیں گے۔ اس میں آیا کو کھڑا کریں گے۔ پھر آگے پیچھے مٹی ڈال کر اس کی کمر تک بھرد پھر بھوکے شکاری کتوں کو چھوڑ دیں گے جو اس بے بس عورت کی بوٹی بوٹی کر دیں گے۔ یہ فرنگی بڑے ظالم ہیں۔"

میں چپ چاپ اپنے پلنگ پر آ پڑا۔ ساری رات میں نہ سو سکا۔ مڑ مڑ کر میری آنکھوں کے سامنے ایک ہند

ورت کی شکل آتی جیسے انگریز کے کتے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ بار بار اپنی آنکھوں کے آگے میں انگلیاں رکھ لیتا میں سوچتا رہا سوچتا رہا اور سویرا ہو گیا۔

اگلی صبح جب میرے بڑے لالہ جی گاؤں سے آئے تو میں ان کے ساتھ تیار ہو گیا۔ مجھے لاکھ سمجھایا گیا کہ گاؤں میں پلیگ اپنے پورے زوروں پر ہے۔ میری ماں مجھ پر خفا بھی ہوئی۔ میرے والد نے مجھے ڈانٹا بھی پر میں نے کسی کی ایک نہ سنی مجھے یوں لگتا کہ اگر میں ایک دن اور گوروں کے اس پڑوس میں رہ گیا تو مجھے گلٹی نکل آئے گی۔ روتا دھوتا منتیں کرتا جب میرے بڑے لالہ جی لوٹنے لگے میں ان کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دور جا کر انھوں نے جب مجھے یوں ضد کرتے دیکھا تو اٹھا کر گھوڑی پر بٹھا لیا اور ہم تیز تیز واپس اپنے گاؤں چلے گئے جہاں ایلوں کی بو مجھے اچھی لگتی تھی۔ بھینس کے ساتھ تالاب میں نہانا مجھے اچھا لگتا تھا۔ گھاس پر لیٹے لیٹے دور بہت دور "ماہیے" کے بول سننا اچھا لگتا تھا اور اس طرح سنتے سنتے اکثر میں سو جایا کرتا تھا۔ اپنے گاؤں کی ہلکی ہلکی دھوپ میں۔

ماہر القادری کے سفرِ حجاز کے تاثرات

کاروانِ حجاز

کتاب پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ جیسے آپ خود بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اور روضۂ رسول پر حاضر ہیں ـــــ شعر و ادب، جوشِ بیان اور قوتِ مشاہدہ کا خوشگوار امتزاج۔ خدا و رسول کی محبت ہر سطر میں جھلکتی ہوئی ـــــ کتاب ناول سے زیادہ دلچسپ اور لالہ و گل سے زیادہ رنگین و پاکیزہ ـــــ

سفرنامہ نہیں، دین و دانش کا منشور

دینی ولولوں کو پیام بیداری

"کاروانِ حجاز" اور ماہر القادری جیسے ادیب و شاعر کی حدی خوانی آپ کے دل کی دھڑکنیں گنگنائیں گی اور آپ کی آنکھوں سے خدا اور رسول کی محبت کے آنسو رواں ہوں گے۔

خوبصورت سرورق ـــــ دیدہ زیب کتابت و طباعت

قیمت مجلد چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

مکتبہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ (کراچی ۱) (بھارت میں) مکتبہ تجلی، دیوبند (یو-پی)

اپنے ... اپنے

از:- گجندر سنگھ

کبھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے یا کھانا کھاتے وقت یا شام کو لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے گھر لوٹتے وقت یا سیر کے موقع پر یا کسی بات کو غور سے سنتے ہوئے بات کرتے ہوئے، تبادلہ خیال کرتے ہوئے، طیش میں آکر یا غمگین ہو کر یا مسکراتے مسکراتے ..... غرض ہر وقت اس کے دماغ میں وہی مکالمہ بسا ہوا تھا۔

"دل تو چاہتا ہے کہ ــــ لیکن اب میں تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا ــــ" یہ اس کے اپنے الفاظ تھے

"لیکن میں نے خوب سوچ سمجھ لیا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تمہیں اس بات کا خیال پہلے نہ آیا جب تمہاری تعلیم کی خاطر میں سردیوں، گرمیوں کی تکلیفوں اور بیماری کے باوجود ہر ممکن طرح فیسیں اور ردی جمع کرتا رہا۔ اگر اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں تمہیں اتنی تعلیم دیتا ہی نہیں ــــ اس وقت تمہارا گذارہ ہم میں ہو جاتا تھا نا۔ اس وقت کیوں نہیں کہا تھا؟"

"ان دنوں کہہ دیتا تو کہاں جاتا؟"

پھر وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنے کام میں رک جاتا۔ وہ انتہائی کرب کا اندازہ کرنا چاہتا۔ وہ غم یا طیش یا رنج کو اپنے ہر مسام میں داخل ہوتا دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ رک جاتا۔ وہ اندازہ کرتا لیکن دل کی کپکپی کی ذرا سی تیزی کے علاوہ وہ اور کچھ نہ پا سکتا۔ نہ جانے اس کے اندر یہ سکون کیوں کر تھا؟ اسے تو تشنج چاہئیے تھا۔ انتشار کی ضرورت تھی۔

پھر وہ زبردستی خفا بن کر بڑبڑاتا۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ کسی کو اتنی تعلیم نہ دوں گا تاکہ وہ اس طرح سلوک کرنے کے قابل ہی نہ ہو سکیں اور وہ سچا تھا۔ اس کے چہرے کی خشک جلد پر جھریاں، اس کے کھچڑی بال، اس کی زرد رنگت اور پھیکی آنکھیں، سوکھا جسم۔ محض زندگی کی لگیا بسٹ کو قائم رکھنے میں اور اپنے بال بچوں کی خدمت کی وجہ سے ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی لمبی عمر میں، اپنی زندگی میں، اتنی مشقت اور سخت محنت سے کیا پایا تھا۔ اسے کیا نصیب ہوا تھا۔ وہ محض اپنی بیوی اور اولاد کو پالتے پوستے بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کا دائرہ ختم ہوا چاہتا تھا لیکن وہ ابھی تک اسی عزم سے اسی قرار اور حوصلے سے اپنے فرائض نبھاتا آ رہا تھا۔ پھر اس کے سب سے بڑے بیٹے کی اس بے مروتی اور بدسلوکی نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ جو سہارا، جو مددگار وہ اتنے عرصے سے تیار کر رہا تھا وہ پھسل گیا ــ اور پھر گفتگو کا آخری حصہ ــــ

"لیکن جو کچھ بھی ہو، تمہارا فرض بھی تو کچھ چیز ہے۔ یہ بھی تمہارے بھائی بہن ہیں۔ اگر میں ساری عمر تمہیں پالتا پوستا رہا ہوں تو تمہارا فرض بھی یہ ہے کہ ان کی خاطر......"

"اتنے بہن بھائیوں کو پالتے پوستے تو میں خود بوڑھا ہو جاؤں گا اور یہ اپنے پاؤں پر سب کے سب کھڑے ہو سکیں گے۔ تمام عمر یہی کام کرتے مر جاؤں تو ابھی خودکشی بہتر نہیں ہو گی؟ ایک دو ہوں تو بھی بات ہے!"

پھر مکالمہ ختم ہو گیا۔ لیکن یہ الفاظ وہ برداشت نہ کر سکا۔ اب شاید بار بار ذہن میں دہراتے دہراتے ان فقر

ادہ آتش وہ بے عزتی محسوس نہ ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ برداشت نہ کر سکا تھا۔ گو اس وقت بھی اس نے کچھ نہ کیا ا، کچھ نہ کہا تھا اور معاملہ ختم ہو گیا تھا لیکن وہ الفاظ اسے برداشت نہ ہوئے تھے۔ ایک بار اس نے ان سب کو قتل کر دینے رادہ کیا۔ ایک بار اسے اس بارے میں گمان ہو گیا کہ اس نے ساری عمر کس کی خاطر گنوا ڈالی تھی وہ اب ان باقی بچوں خاطر کام کرنے، انھیں پڑھانے، کھانا مہیا کرنے اور تمام ضروریات کے واسطے مشکل کام کرنے کے لئے قطعی تیار نہ ا۔ گویا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ سب بڑے ہو کر یہی الفاظ دہرائیں گے۔ نہ جانے وہ کیا کرتا لیکن اسے اپنی بیوی سے ت تھی۔ اپنے بیٹے کے یہ الفاظ سن کر وہ قریب بے ہوش ہو گیا تھا کیونکہ وہ کبھی اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ اس عورت —— ـ اور نیک خاتون کی اولاد کے لئے کوئی ان الفاظ کا استعمال کر سکتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کی محبت کی توہین خود ں کا بڑا لڑکا کر رہا تھا۔ وہ لڑکا اپنے باپ کو اپنی ماں کو الزام دے رہا تھا۔ بے عزتی کر رہا تھا!!!

اب وہ چلا گیا تو اسے بہت تکلیف نہ ہوئی۔ وہ اسے اپنے نزدیک پاکر شاید کوئی گناہ کر ہی دیتا۔ چند روز وہ ت پریشان رہا۔ ایک بار وہ اپنی بیوی کے سامنے رو بھی دیا۔ وہ اس کے سامنے کبھی نہ روتی تھی۔ وہ اس کے کردار سے .قف تھی۔ وہ اسے باحوصلہ بنانے کے لئے خود ہوش قائم رکھتی اور وہ اپنے کو واقعی کمزور سمجھنے لگتا۔ اس کی بیوی کی گود ں ایک برس کی لڑکی تھی۔ اس کی ٹانگوں سے ایک لڑکا لپٹا ہوا تھا جو مشکل سے اڑھائی برس کا تھا۔ اس سے بڑا لڑکا ایدپانچ برس کا تھا جو ابھی اسکول نہیں جاتا تھا کیونکہ ابھی بڑے بچوں کی پڑھائی کے لئے ہی آمدنی نہ تھی۔ وہ سارا دن یلتا رہتا تھا۔ وہ گلیوں میں گھومتا تھا۔ گندی عادتوں کو بڑی خوشی اور احتیاط سے سیکھ رہا تھا۔ گالیاں اسے بے شمار ی تھیں اور صفائی یا نفاست سے اسے چڑ تھی۔ وہ اس وقت ماں کے نزدیک زمین پر بیٹھا ناخن چبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کی ایک لڑکی چھ سال کی تھی جو گھر میں ہی پڑھتی تھی۔ بڑے بہن بھائی ترس کھا کر اسے پڑھا دیتے تھے کیونکہ اسے شوق تھا اور وہ ان کی ہر طرح منتیں کیا کرتی تھی۔ ایک نو برس کی لڑکی گھر کا کام کاج بھی کرتی تھی، پڑھتی بھی تھی اور چھوٹے بھائیوں کو سنبھالتی بھی تھی۔ وہ باورچی خانے میں تھی۔ اس سے بڑے تین لڑکے تھے جو سب اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ ان سب کا بڑا بھائی تعلیم پاکر کنارہ کشی اختیار کر چکا تھا۔ کیونکہ اتنے لوگوں کا پالنا اسے ہواس باختہ کئے دیتا تھا۔ اس کے اپنے پلان تھے۔ اپنی زندگی تھی۔ اس کی اپنی امنگیں تھیں۔ جو تصورات اس نے باندھے تھے جن تخیلات کے سہارے وہ جیتا تھا، وہ بہت مضبوط تھے اور وہ اس کشش کو ختم نہ کر سکا۔ وہ گھبرا گیا۔ اپنے والدین کو چھوڑ کر اس نے اپنی ئی راہ قائم کر لی۔ وہ اس دردناک حقیقت پر رویا کرتی تھی۔ اسے شاید یہ امید تھی کہ وہ لڑکا اس طرح ان کے ساتھ سلوک کرے گا۔ چنانچہ ان بچوں میں گھری وہ بیٹھی اوپر آسمان کی طرف دیکھا کرتی تھی اور پیپل کے درخت کی لمبی اخیں اور جوڑے جھکتے پتے ہوا میں جھومتے ہوئے آسمان اور اس کے درمیان آ جاتے اور وہ ان سبز ٹہنیوں کے جھرمٹ میں سے آسمان کی نیلی رنگت کو دیکھنے کی کوشش کرتی کیونکہ وہ بھی آزادی پانا چاہتی تھی اور گھریلو تکالیف سے چھٹکارا پانے کا اسے یہ طریقہ اچھا لگتا تھا کہ آسمان کی پر خلا خاموشی کو جھانکتی رہے۔ پھر اس نے آنسوؤں کی جھلمل میں پیپل کی ایک ٹہنی پر بیٹھے چڑیوں کے ایک جوڑے کو دیکھا جنھوں نے یہ تکلیف سہہ کر اپنے بچوں کو پالا تھا۔ کتنی کتنی دور سے انھیں کھانا لاکر کھلاتے تھے۔ انھیں اڑنے کی مشق کرواتے تھے۔ انھیں پیار کرتے تھے پھر بچے اڑنا سیکھ گئے، کھانا بھی سیکھ گئے اور بولنے میں بھی مشاق ہو گئے۔ ان کے پر لمبے ہو گئے اور مکمل پرندے بن گئے —— وہ اپنے بچوں کو پیار کرتی۔ روتے روتے انھیں دیکھتی رہتی۔ چھوٹی بچی کو گود میں لئے، چھوٹے بالا اپنی ٹانگوں میں لپٹائے وہ بیٹھی رہتی —— چڑیوں نے اپنے بچوں کو چونچیں مار مار کر نکال دیا۔ انھیں

ذہانت ڈپٹ کر دور کر دیا۔ ماں باپ کے فرائض مکمل ہو گئے تھے اور انھیں اب بچوں کی دیکھ بھال کی ضرورت نہ تھی۔ یہ اسے ایک عجیب احساس ہوا۔ انھیں بچوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ اس کے دل میں تسلی اور... پیدا ہو گیا۔ اسے اپنے گود میں جھنجھی بچی سے الفت بڑھ گئی۔ وہ اسے بار بار چومنے لگی۔ اس نے پھر جب بیٹیں کو دیکھ تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ سب اٹھ کر چلے گئے تھے۔ اسے انسان کے خیالات اور رسوم میں بڑی غلطیاں محسوس ہوئیں، اور وہ اسی لئے خاموش تھی۔ حقیقت پر راضی ہو گئی تھی لیکن اس کا خاوند اب بیٹھے بیٹھے چونک پڑتا تھا۔ وہ مکالمہ اس کے کانوں میں گونجنے لگتا تھا۔ پھر وہ اپنی بیوی کی گود میں اور اس کے ارد گرد ان بچوں کو دیکھ کر غضب ناک ہو جاتا۔ اسے بڑے لڑکے کے سلوک پر طیش آ جاتا۔ وہ ان سب سے بدلہ لینے پر تل جاتا۔ دراصل اس نے بیٹیں کے درختوں میں سے آسمان کو جھانکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ دراصل اسے ان معلومات کا گمان نہ تھا جو اس کی بیوی پا چکی تھی۔ چنانچہ وہ اس کے سامنے رو پڑا۔ وہ برداشت نہ کر سکا۔ قدرتی طور پر اس کے آنسو بہ نکلے۔

پہلے وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ سوئی سوئی آواز میں کہا۔ "ہم اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔"

"میرا کوئی فرض نہیں ہے۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "میں کسی کے لئے اپنی زندگی برباد کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ مجھے کیا ملا ہے۔"

اسے بڑی حیرت ہوئی۔ "فرض"۔ اس نے یہ لفظ نگل کر، چبا کر ہر طرح کہا۔ "فرض ہمارا فرض"۔ پھر اسے یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی اسے سمجھنے کے قابل نہ تھی۔ وہ اکیلا ہی بڑبڑایا کرتا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے وہ لائق نہ تھا۔ وہ اس دہشت انگیز، خوفناک منظر کا خیال کرتا جب اس کے بڑے لڑکے نے صاف صاف اس کے منہ پر کہہ دیا تھا بچوں کو پالتے پالتے میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ لیکن ہوں تو بات بھی ہے۔ اس نے اپنے بہن بھائیوں اپنے فرائض کی توہین کی تھی۔ چنانچہ وہ اکیلا بیٹھے بیٹھے سوچنے لگتا۔ اس کے بڑے لڑکے نے اپنے مقصد کو پانے کے بعد اسے چھوڑ کیوں نہ دیا۔ دوسرے بچوں کے حالات ایسے بنائے کہ کسی کو دوبارہ ویسا سلوک کرنے کی جرات نہ ہو سکے۔ کیوں نکما دنیا کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ اس کے بڑھاپے میں اس قابل ہی نہ ہوں کہ اس کے احکام کے خلاف کچھ کر سکیں۔ کیوں نہ وہ ساری عمر ان حسین تصورات سے محروم رہیں۔ ان جذبات سے بیگانہ ہو کر محض اپنے ماں اور باپ اور گھر میں ان کی زندگیاں بسر ہو جائیں۔

وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی ابھری نسوں کو دیکھتا۔ اپنے کانپتے جسم کو دیکھتا جس کی کمزوری روز بروز بڑھ رہی جس میں ہمت اب اتنی نہ رہی تھی کیونکہ جس سہارے پر، جس امید کی بناء پر وہ چلتا آیا تھا۔ جن آرزوؤں پر اس اپنے خاندان کو پالنے پوسنے کی ضرورت سمجھی تھی وہ مقصد اب ناکارہ ہو چکا تھا۔ اس کے چھ لڑکے تھے۔ لڑکیوں کے بارے میں تو وہ جانتا تھا، شروع سے ان کی پرورش ایک بوجھ سمجھ کر ہو رہی تھی۔ لیکن لڑکوں کے بارے میں اس کے خیالات یہ تھے کہ چھ لڑکے لیے شمار سرمایہ ہوتے ہیں۔ چھ لڑکے جب اچھے عہدوں پر ہوں گے تو اس کا خاندان پھر وہ ایک باعزت انسان بن کر دنیا میں حصہ لے گا۔ پھر اس کی تمام خواہشیں بر آئیں گی۔ یہی اس کی زندگی بھر کی پونجی تھی جسے وہ ہر ممکن طرح سنبھال رہا تھا۔ لوگ مختلف ذرائع سے اچھی پوزیشن حاصل کرتے تھے اور شہرت پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ چھ لڑکے اور ان کی اچھی تعلیم و تربیت بہترین طریقہ ہے۔

چنانچہ جھکی کمر کے باوجود تسلی اور اطمینان سے زندگی کے وہ لمحات گزرتے گئے۔ لیکن وہ ایک بات بھی

وہ اب اعتراف کر رہا تھا کہ وہ بھول گیا تھا کہ ان آسائشوں کو پا کر کٹھن فرائض کا سامنا کرنا ایک ناممکن کی سی بات تھی۔ اس کے بڑے لڑکے نے یہ محسوس کر لیا اور جلد از جلد وہ گھبرا کر چلا گیا اور اس نے کہا "میں بوڑھا ہو جاؤں گا لیکن یہ سب کے سب اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ اب اسے زندگی کی رنگینیوں کا احساس ہوا۔ پھر کیوں نہ اپنی زندگی کے پلان کو پانے کے لئے وہ از سر نو کوشش کرے جو تمام خامیوں اور نقائص سے پاک ہو۔

چنانچہ ایک لقمہ منہ میں کھلا اس نے چبایا۔ پانی کے کئی گھونٹ انڈیلے۔ اپنی بیوی کو مخاطب کر کے اس نے کہا "ابھی تو میری نادر منجد حالت میں ہے۔ ابھی تو میرا کچھ بھی نہیں بنا"۔ اس کا بیٹا جواب گھر میں سب سے بڑا تھا۔ منہ بسور کر تھالی کو دیکھتا رہا۔ وہ نہ ماں کا جواب دیتا اور نہ ہی باپ کی باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرتا۔ اس کی ماں کئی بار اسے کھانے کے لئے کہہ چکی تھی۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔

"یہ چاہتا کیا ہے" وہ جھنجھلانے لگا۔ "اگر تیرا خیال ہے کہ اس طرح میں ڈر جاؤں گا تو بے شک نہ کھا"۔

اور وہ واقعی اٹھ کر طیش میں بھرا باہر چلا گیا۔ اس نے دروازہ بڑے زور سے دے مارا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس تیز دھماکے سے ڈر جائیں گے۔

"توبہ ہے" اس نے بیوی کو دیکھا۔ "اسے شرم آنی چاہیئے"۔

"اب میں کیا کروں"۔ اس نے دو روٹیاں اس کی تھالی میں رکھ دیں۔

"مطلب یہ ہے کہ میں سارے خرچ بند کر کے اسے ضرور پڑھاؤں۔ کتنے خود غرض لوگ ہیں" "یہ اولاد"۔ اس نے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اولاد ہے۔ جی جو تو اچھا ہے اب میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں ہر ایک کو تعلیم دے سکوں اور یہ چاہتے ہیں کہ باقی سب کو قتل کر کے انہیں ہی پالا جائے۔ یہ میری عزت کا خیال نہیں کرتے۔ یہ میری آمدنی کا لحاظ نہیں رکھتے۔ یہ میری مشکلات کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ یہ میرے دکھ درد میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔ یہ میرے ساتھ ہمدردی نہیں کرتے۔ یہ مجھے جانور سمجھتے ہیں کہ میں ان کی ضرورتوں کو پورا کئے جاؤں اور یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر مجھے دھکے دیتے جائیں۔ میں کسی کو زیادہ نہیں پڑھاؤں گا۔ ساری عمر اس طرح میں تباہ کر دوں گا۔ چاہے ناراض ہی کیوں رہا کریں۔ یہ اولاد ..... لعنت ہے"۔

"یہ اچھی بات نہیں"۔ اب اس کی بیوی نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ کہا "یوں خفا نہیں ہونا چاہیئے۔ جب دو کو تعلیم دی ہے تو اس کا دل بھی پڑھنے کو چاہتا ہے۔ اسے بھی علم کا شوق ہے۔ آپ کی آمدنی تو ... نہیں کرتا"۔

"بات یہ ہے"۔ اس نے کہا۔ "ان کا فرض؟ یہ پڑھ لکھ کر میری امداد کیوں نہ کریں۔ اب پوچھو کیوں؟ کیا نے ... وہ میٹرک پاس ہے اسے چاہیئے کہ کوئی ہنر سیکھ لے۔ کالجوں میں سال برباد کر کے کیا نوکروں کمائے گا"۔

"آپ صحیح کہتے ہیں۔ ان کا بھی فرض ہے۔ کیوں نہیں"۔ اس نے صلح کن لہجے میں کہنا چاہا۔

"میں صحیح کہتا ہوں"۔ اس نے کہا۔ "میں صحیح کہتا ہوں۔ میں تجربہ کار آدمی ہوں۔ میں صحیح کہتا ہوں"۔

اور جب ایک بار اس نے پختگی سے ایک فیصلہ کر لیا تو وہ اس پر ضرور قائم رہتا۔ وہ سب روئے، چیخے، ... انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ کوسنے دیتے رہے پھر ان کی جدوجہد بے فائدہ ہوئی۔

تین بڑے لڑکوں نے وہاں سے بھاگ نکلنے کا ایک پلان بنایا۔ ماں کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے حالات پر ... نہ وہ اپنی قسمت کو کوستے۔ والدین کی بدسلوکیوں کا جائزہ لیتے اور وہ خاموش بیٹھی سنتی رہتی۔ پھر ان کے دکھ درد کی شدت بڑھ جاتی۔ ان کے جابر قائم شدہ اصولوں اور پابندیوں اور حدود کو توڑ ڈالنے، چوری چوری گھر چھوڑ دینے ...

کے لئے تشنیع میں جکڑے جاتے اور ان کی گفتگو میں روانی آجاتی۔ ایک تسلسل ہو جاتا۔ ایک دردانگیز کیفیت پیدا ہو جاتی۔ کیونکہ ان کے دلوں کو بیحد چوٹ لگی تھی۔ ان کے حسین پلان بن رہے تھے۔ ان کے اپنے مستقبل سے وابستہ خیالات، امیدیں، تمنائیں تھیں جو اب برباد ہو گئی تھیں۔ کیونکہ ان کا باپ کمائی کو تعلیم پر خرچ کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کی امداد کے بغیر وہ بے بس تھے۔ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ تعلیم نہ پا سکتے تھے۔ اس کی امداد کے بغیر بھوک تک نہ مٹا سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مکان سے بھاگ جانے کی ایک اسکیم تیار کی۔ انھوں نے سوچا کہ وہ تینوں مل کر کوئی نہ کوئی ایسا ذریعہ پیدا کریں گے کہ تعلیم جاری رکھ سکیں۔ کمترین قسم کا کام بھی کریں گے اور اپنی کمائی سے تعلیم پائیں گے۔ پھر ان کے وہ تمام خیالات وہ ساری خواہشیں پوری ہوں گی۔ ان کے رتبے بلند و بالا ہوں گے — وہ اپنے والدین سے دور، اپنے آئندہ لمحوں کو بہتر بنا سکیں گے۔

لیکن وہ لڑکے تھے۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی حد وہ بھی اتنی ہی تھیں۔ ایسے ہی جوش میں ایک بار انھوں نے اپنی ماں کے سامنے بھی کہہ دیا۔ انھوں نے اپنے پلان وغیرہ بتائے کہ وہ کس کس قسم کے کام کریں اور اتنی رقم بنا سکیں گے کہ تعلیم اور رہائش کا خرچ بآسانی ادا کر سکیں گے۔ بیچاری ماں کی آنکھوں میں آنسو بھیگ گئے۔ وہ سسکیاں بھرتی رہی۔ وہ ان تینوں کو روتے دیکھتی رہی۔ وہ ان کی باتوں میں ان کے نازک اور معصوم خیالات کو پڑھتی رہی۔ لیکن وہ کیا کرتی؟ اس نے ایک دم فیصلہ کیا کہ وہ ان کی خاطر گڑگڑا کر خاوند کو منائے گی اور اس نے سب کچھ اسے بتا دیا۔ شام کے وقت وہ ابھی دفتر سے لوٹ بوٹ اتار رہا تھا۔ وہ بولا نہیں۔ وہ سب کچھ سنتا رہا۔ اس نے کسی طرح بھی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ بولتی رہی اور وہ خاموش بوٹ اتارتا رہا۔ پھر اپنے کپڑے تبدیل کئے۔ اس کی آنکھوں میں محض ایک حسرت اور یاس کی تھکاوٹ تھی۔ عمر بھر کی محنت اور مشقت کی کمزوری تھی۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا۔

"وہ تینوں کہاں ہیں؟"

وہ تینوں دروازے کے پاس کھڑے سب کچھ سن رہے تھے۔ وہ ماں کی بے بسی اور دکھ تکلیف کو دیکھ کر رو رہے تھے۔ اس نے ان تینوں کو بلایا۔ اس نے بڑی نرمی سے انھیں چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ایک عزم، ایک مقصد کی روشنی اس کے چہرے پر دمکنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس نے انھیں بغور دیکھا۔ "تم میرے خلاف اپنی ماں کے پاس بیٹھے دکھ درد بیان کرتے ہو — میں واقعی بدنصیب ہوں کیونکہ میں ایک معمولی کلرک ہوں اور تمہیں پڑھا نہیں سکتا۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "کافی عرصے سے ہمارے یہاں بے چینی اور پریشانی نے ہمیں سب کو بہت تکلیف دی ہے۔ مجھے تمہاری مجبوریوں کا اچھی طرح علم ہے۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔ خود کماؤ اور پڑھو۔ تم جب چاہو جا سکتے ہو۔ بھاگنے کی ضرورت نہیں میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ تم بے شک چلے جاؤ۔" وہ یہی دہراتا رہا "تم بے شک چلے جاؤ۔"

جیسا ہمیشہ ہوتا ہے انھوں نے اس بارے میں اچھی طرح سوچا۔ انھوں نے اب ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ عزم، ارادے، جوش و خروش اور تصورات سب گم ہو چکے تھے۔ انھیں ایسا لگا گویا ان کی تعلیم کا دین ختم ہو جانا سب سے اچھی بات تھی۔ جیسے وہ تجربہ کار ہو کر اپنے لئے خود آمدنی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جیسے یہی درست تھا کہ وہ بھی کام کر کے باپ اور ماں کی تکلیفوں کو دور کر دیں۔ اب وہ خاموش تھے۔ وہ مطمئن تھے۔

بھاگ جانے یا جدا ہونے کے منصوبے ختم ہو گئے۔ انھوں نے یکایک محسوس کیا کہ وہ کہیں بھی جانے کے قابل نہ تھے۔ خود آزادانہ طور پر بھی رہنے کے لائق بھی نہ تھے۔ اس غریب کی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ سب علیحدگی کی کوشش نہ کر سکیں لیکن ان کے خیالات کچلے نہ جا سکے۔ وہ تینوں بیٹھتے تو ایک دوسرے کو تسلی دینے کے انداز میں کہتے "کوئی بات ن

ہم بھی ایک نہ ایک روز باعزت اور بلند مرتبہ ضرور بن جائیں گے۔ ہمیں بھی باحیثیت مانا جائے گا۔ پھر وہ خاموش ہو کر سوچنے لگتے تو کوئی ذریعہ محسوس نہ ہوتا۔ بھلا تعلیم کے بغیر وہ اچھے بلند رتبے کیونکر پا لیتے؟

اب اس نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس نے ایک دم دیکھ بھال کر ان کے لئے مختلف کاروبار پیش کئے۔ اس نے ان میں سب سے بڑے لڑکے کے لئے ایک کارخانے میں جگہ ڈھونڈھ دی۔ وہاں اسے خاص کل پرزوں کی سمجھ بوجھ اور کاروباری طریقے سمجھنے کے بعد آہستہ آہستہ ترقی کی امیدیں تھیں۔ وہاں جب وہ بوڑھا ہوگا تو شاید ایک انجینئر بن سکے گا۔ وہ سب کارخانوں میں ترقی اور بلند رتبہ پلک جھپکتے میں ملتا سوچتے تھے۔ جب کسی کام کا کرنا ضروری ہو جائے تو اس میں دلچسپی پیدا کرنا معمولی بات ہو جاتی ہے، بڑبڑاتے، کڑھتے اور پریشان ہوتے ہوئے بھی اسے ماننا پڑا۔

جس روز وہ کارخانے میں داخل ہوا اسے ایسا لگا گویا ایک زلزلہ آیا تھا۔ پریوں کے شہر کا ہر محل چونے گارے کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا، کھنڈر بھی نہ بچے تھے۔ وہ مرمریں اینٹیں بھی آتشی لاوے نے جھلس کر سیاہ چٹانیں بنا دی تھیں۔ مکمل تباہی ہو چکی تھی ـــ وہ رونا چاہتا تھا۔ پھر ان سے کئی نامور لوگوں کے آغاز زندگی کے واقعات دلیل میں اپنے ذہن کے لئے پیش کئے۔ پھر وہ لاچار اسی کام میں مشغول ہو گیا۔ اسے ماحول سے نفرت ہو گئی، گھربار دوستوں، عزیزوں بلکہ اپنی زندگی سے ہی نفرت ہو گئی لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔

پھر چھوٹے لڑکے کی طرف مخاطب ہوا۔ اس نے اسی سال میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ کافی سوچ فکر کے بعد اس نے تجویز کیا کہ اسے بجلی کا کام سکھایا جائے۔ چنانچہ وہ کچھ سننے سمجھنے سے پہلے ہی انتظام کر چکا تھا۔ اس نے فوراً اسے بجلی کا کام سیکھنے کے لئے ایک کمپنی میں بھیج دیا۔ وہ لڑکا قدرتی طور پر خاموش مزاج تھا۔ اس نے زیادہ مخالفت نہیں کی۔ وہ محض اپنے کمرے میں جا کر خوب رویا تھا۔ اس نے اپنے دل کی بھڑاس خوب نکالی تھی۔ اس نے ایک کاپی کے کئی صفحے پھاڑ ڈالے تھے۔ جہاں اس کے مستقبل سے وابستہ پلان درج تھے۔ وہ گھر کی مجبوریوں سے واقف تھا لیکن وہ ایک اچھی صاف ستھری مہذب زندگی کی آرزوئیں لئے ہوا تھا۔ وہ ایک شفاف مقام پر خاموش رہنا چاہتا تھا جہاں اس کے متعدد بھائیوں بہنوں کا غل غپاڑہ، ہنگامہ، شور سنائی نہ دے سکے۔

تیسرا لڑکا اسی سال امتحان کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے پیشے میں اسے بھرتی کروائیگا۔

وہ دونوں اپنی آمدنیاں باپ کے ہاتھوں میں تھما دیتے اور خود خاموشی سے ٹکٹکی باندھے کسی نقطے پر یونہی گھورتے رہتے۔ ان کے پاس خرچ کے لئے زیادہ سرمایہ تھا۔ ان سب کی ضروریات بھی بڑھ گئی تھیں۔ چھوٹے بچے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اخراجات میں بھی اضافہ کر رہے تھے۔ انھیں اسکولوں میں جانا تھا۔ انھیں بھوک زیادہ لگتی تھی۔ ان کے کپڑوں پر خرچ زیادہ ہوتا تھا۔

اس نے سوچا وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ اپنے بڑھاپے کی مشکلات کو سر کر لینے میں وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ کم از کم ان تمام بچوں کی پرورش کی ہر ذمہ داری اس پر اتنی بے رحمی سے عائد نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ان بیٹوں سے محبت کرنے لگا۔ ان کا احترام کرنے لگا۔ خود بہ خود اس کے دل میں ان کی خاطر عزت کرنے کے خیالات ابھر آئے۔ یا وہ واقعی بے رحم تھا۔ کیا وہ نہ چاہتا تھا کہ سب جتنا چاہیں تعلیم حاصل کر لیں۔ غریب والدین سے جو اثاثہ، جائداد ورثے میں ملتی ہے وہ تعلیم ہوتی ہے اور کم از کم اپنے جسم میں روح کو قائم رکھنے کے قابل وہ بچے ہو جاتے ہیں۔ کم از کم انھیں گلہ نہیں رہتا کہ وہ ناقابل ناکارہ رہے۔ لیکن وہ کیا کرتا۔ وہ اپنے حالات میں کس طرح بھی وہ کچھ امداد بخش دیتا۔

اور وہ بھی آہستہ آہستہ اس معمول سے مانوس ہوگئے۔ انھیں اپنے اپنے کاروبار سے کچھ ایسی نفرت نہ رہی۔ ان کا چین امن پھر لوٹ آیا۔ وہ سب خوش تھے۔

اس نے سوچا اس طرح وہ سارا بوجھ اتر جائے گا اور وہ لڑکیوں اور لڑکوں کے مطالبات سے جلد چھٹکارا پائے گا۔ ان کے گھر میں نئی فضا بنیادیں قائم کرگئی۔ وہ نظام مزدوری کا قدرتی اور دلچسپ ہوگیا۔

ایک شام وہ سب اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہوکر واپس لوٹے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا، ان کا سب سے بڑا بھائی صحن میں ایک چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کی نیند بڑی گہری تھی۔ وہ چپکے اندر کمرے میں چلے گئے۔ اس کی بیوی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً رو رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں بتایا "وہ واپس آگیا ہے۔"

وہ حیرت زدہ وہیں کے وہیں جم کر رہ گئے۔ انھوں نے باہر صحن میں چرائی نظروں سے اسے دیکھا۔ اتنا بیٹے وہ اس روتی عورت کو دیکھ کر سب رونے لگے۔

پھر اسے خیال ہوا کہ وہ اس بدلے نظام میں، اس نئی فضا میں، اس کم درجہ ماحول میں کیونکر جیئے گا۔

وہ دونوں بھائی اسے پاکر اپنے چین اور امن کو لٹتا محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے سوچا وہ اپنے پیشے چھوڑ کر اب پڑھنے لگ جائیں؟ وہ اسی ماحول کو اچھا سمجھنے لگے تھے۔ اس میں شانتی ملتی تھی۔ پھر انھوں نے اپنے گندے کپڑوں اور سیاہ ہاتھوں کو دیکھا۔ باہر وہ اب انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ وہ بار بار صابن سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ لباس تبدیل کر رہے تھے

وہ سب اس کے سامنے جاتے جھجکے۔ وہ باپ سے بغلگیر ہوکر رو رہا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑے اپنے اپنے کنبے پہ زدوں، مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور سنسنی کو کانوں کے پردوں میں سن رہے تھے۔

کھانا بڑی دیر سے تیار تھا۔ کسی کو بھوک نہ تھی۔

اگر ادب میں گروہ بندیوں کی سطح سے بلند ہوکر دیکھا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح اور صاف نظر آتی ہے کہ جگن ناتھ آزاد اردو کے نئے دور کا ایک منفرد اور عظیم شاعر ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں اس کے کلام کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ جوش، جگر اور فراق کے شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔

جگن ناتھ آزاد

کی مقبول، و مشہور تصانیف

بیکراں ________ ستاروں سے ذرّوں تک

(دوسرا ایڈیشن) ۴/۸/- (دوسرا ایڈیشن) ۲/۱۲/-

اردو ________ جنوبی ہند میں دو ہفتے

(دوسرا ایڈیشن) -/۸/- (ایک طویل سفرنامہ) ۱/۰/۰

گوشۂ ادب۔ چوک انارکلی۔ لاہور ________ دہلی کتاب گھر نیا محلہ پل بنگش۔ دہلی

شاعر ابلیس کی بارگاہ میں

از:- صفدر علی مرزا۔ لکچرار ادبیات، ورنگل کالج

(اس نظم میں زندگی کے بعض تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور چند تلخ حقیقتیں جو نظم ہوئی ہیں برائے شاعری نہیں ہیں۔

ہاں مبارک ہو تجھے اے فاتحِ کون و مکاں
محوِ حیرت تیرے افسوں پر خدائے دو جہاں
سانس لی ہے کہ خدا سے تو نے آخر انتقام
تجھ کو آدم سے بھی لینا تھا ازل کا انتقام
نکتۂ پوشیدہ جنت سے نکلوانے میں تھا
سینۂ سوزاں میں تیرے رقص کرتے تھے شرر
رنگ آخر تیری دیرینہ عداوت لائی ہے
جانتا تھا تو کہ آدم فتنۂ محشر خیز ہے
سعیِ پیہم نے کیا انساں کو آخر زیرِ دام
قصرِ یزداں دفعتہً لرزا لرز کر گر گیا
یک بیک بنیادِ ایوانِ حکومت ہل گئی
درہم و برہم یکایک نظمِ قدرت ہو گیا
اب ہیں ہنگامے ترے صحرا بہ صحرا کو بہ کو
پے بہ پے محفل میں تیرے جام اب چلنے لگے
تیری ہر اک تال پر اب رقص فرمانے لگے
گیسوئے پیچ و خم کے تیرے شیدائی ہوئے
گیسوئے یزداں کے پیچ و خم سے گھبرانے لگے
تیرا جادو چل گیا انساں پہ پھر ایک بار
تیرے ہر اک حکم اور قانون پہ سر دھننے لگے

فتح کر ڈالا تیری تدبیر نے سارا جہاں
مٹ گیا تیرے فسوں سے جس کا اب نام و نشاں
ہو گئیں روزِ ازل سے تھیں تری نیندیں حرام
کر دیا تھا جس نے برہم زندگانی کا نظام
رازِ ناکامیٔ آدم دام میں آنے میں تھا
آدمِ خاکی کھٹکتا دل میں تھا شام و سحر
مدتوں کے بعد حسرت اب تری بر آئی ہے
"اک ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے"
طالبِ سجدہ وہ آدم ہو گیا تیرا غلام
دیکھتے ہی دیکھتے آدم خدا سے پھر گیا
اور الوہیت کی زنجیرِ طلائی گل گئی
ایڑھ کر جیسے کفن تا حشر خالق سو گیا
"تیرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو"
تیرے ہی سانچوں میں انسانوں کے دل ڈھلنے لگے
تیرا جام آتشیں پی پی کے لہرانے لگے
تیری چشمِ مست و سحر آگیں کے سودائی ہوئے
بزم سے اس کی سب اک اک کر کے اٹھ جانے لگے
ہو گیا تیرا شکار اب آدمِ یزداں شکار
تیری ہر اک بات کو اب دل سے دھننے لگے

پڑ گیا جب ابنِ آدم پر ترا دامِ فریب
ہو گئے سرشار جب پی کر ترا جامِ فریب

نذر ان کو تو نے کی اپنی شریعت کی کتاب
اپنے مکتب میں پڑھایا پھر انھیں اپنا نصاب

اور کیا تو نے بصد اخلاص یہ ان سے خطاب
ساتھیو! تعلیم کا میری سنو لبِّ لباب

اب نکل جائے سروں سے دین کا سودائے خام
تف ہے اب تک تم رہے اوہامِ باطل کے غلام

دل سے فرسودہ عقائد کو مٹانا چاہیے
اس میں رہ رہ کر امنگیں گدگدانا چاہیے

خیر کی لعنت سے یکسر پاک ہے میرا نظام
سن لو ہے انسانیت میری شریعت میں حرام

رحم، انصاف اور ہمدردی حماقت کے ہیں نام
میرا آدم ہو نہیں سکتا اخوت کا غلام

میری نظروں میں شرافت اور محبت ہے حرام
آبرو اک مرضِ مہلک اور عزت اک جذام

دوستو! اب عقل کی جانب اٹھائے ہو قدم
اب حیاتِ نو یہ تو پاتے رہو گے دم بہ دم

لو تمھیں میری غلامی کا ہے یہ انعام لو
میری دنیا کی عنانِ حکمرانی تھام لو

یاد رکھنا کام لینا حیلہ و تدبیر سے
حکم چلتا ہے یہاں پر زورِ شمشیر کے

مکر و فن، چالیں، سیاست حکمرانی کے ہیں ڈھنگ
دیکھنا آئے نہ استبداد سے کچھ تم کو ننگ

سلطنت کے میری تم اے "افسرانِ باوقار"
جاؤ! تم کو دے دیا میں نے مکمل اقتدار

لو مسلسل زیر دستوں سے رگڑ کر کام لو
زر جو پیہم لو تو کر دہاں تم مگر آرام لو

آئیں جب اہلِ غرض ہو جاؤ تم شیریں زباں
قطع کر دینا جڑیں پر یہ رہے رازِ نہاں

جو نہیں آتا تمھارے آستاں پر صبح و شام
بہر پابوسی، خوشامد، چاپلوسی اور سلام

جو نہیں کہتا کہ تو داتا ہے تو پروردگار
تو فلاطوں، تو ارسطو، تو سکندر، شہریار

اس کی گردن مار دو غدار ہے کافر ہے وہ
سلطنت کو اس سے خطرہ اک چھپا خنجر ہے وہ

راجدھانی کے مری اے رستم و اسفندیار
اے "جوانانِ" سعادت مند، دانا، ہوشیار

تم ہو میری قوتِ بازو، مرے دل کے قرار
اے جواں مردو تمھیں سے میرے گلشن کی بہار

تم قدم رکھنا نہ بزمِ علم و حکمت میں کبھی
پھنس کے رہ جانا نہ تم دامِ سیاست میں کبھی

جلوہ گر ہوتا پری رویوں کی بزمِ ناز میں
محو ہو جانا ادا و غمزہ و انداز میں

مہ وشِ بدمست ارے مالِ غنیمت ہے یہی
ایسے موقعوں پر شرافت! عینِ ذلت ہے یہی

دخترِ آدم ہے دھن اپنا پرایا کیا سوال
[1] کیا برادر کیا پسر کیا دوست دھن سب کا حلال

میکدے کے اے مرے جام و سبو، رنگیں شراب
"دخترانِ آدم و حوّا" میرے چنگ و رباب

اے گلستانوں کی میرے قمریانِ خوش خرام
مرد کے انھوں نے رکھا تم کو اب تک زیرِ دام

مذہب اور اخلاق اور روزِ جزا، دوزخ ارم
پھر خود غرضی تراشے، مدتوں کیا کیا صنم

بڑھ کے زنجیرِ کہن، طوقِ غلامی توڑ دو
آگیا اب دورِ آزادی کا زنداں چھوڑ دو

---

[1] ایسے واقعات میرے مشاہدے میں ہیں۔

لے لو ضحاکوں سے فرعونوں سے خونی انتقام
اب گرا دو قصر و ایواں اب جلا دو سقف و بام

اب پیو شام و سحر جی بھر کے آزادی کے جام
لو مری دنیا میں ہے تم پر ہر اک قانون حرام

ازدواج و زوجیت اک دام ہے ناپاک دام
پہلے دنیا سے مٹا دو ان کے اب مکروہ نام

پرورش، اولاد، شوہر تا کجا یہ لغویات
منتظر ہے آج جلووں کی تمہارے کائنات

آؤ اب اسٹیج پر آ جاؤ با صد آب و تاب
اس طرح لہراؤ اب کھانے لگے دل پیچ و تاب

پردۂ سیمیں ہے اک فردوس حوریں اس کی تم
رقص و موسیقی کی لہروں میں بس اب ہو جاؤ گم

اس طرح آؤ سنور کر دل لبھانے کے لئے
قلب ہو بے چین ہر اک تم کو پانے کے لئے

یہ نہیں ممکن تو کیا غم فکر کی کیا بات ہے
زندگی اپنی ہے، دن اپنا ہے، اپنی رات ہے

بڑھ رہے ہیں کتنے آدم ہاتھ پھیلائے ہوئے
زلف مشکیں، عارض رنگیں پہ للچائے ہوئے

جاؤ اور بن جاؤ اب تم ان کی روحوں کا سکوں
ان پہ چل جائیگا متوالی جوانی کا فسوں

سہو یزداں سے جو بار آئے تمہارے نخل کو
آئے یزداں خود اٹھالے رہگذر پر ڈال دو

آفریں! ابلیس تجھ پر آفریں! صد آفریں!
گر گئی جو کٹ پہ آخر تیرے، انساں کی جبیں

اب ذرا سی دیر ہے ارماں بر آنے میں ترے
"جوہری بم" بن رہے ہیں کارخانے میں تیرے

ابن آدم صفحۂ ہستی سے جب مٹ جائے گا
تیرے اے ابلیس! ہونٹوں پر تبسم آئے گا

میر تقی میر

اُردو کا عظیم شاعر ــــ نئی تنقید کی روشنی میں اگر آپ ــ میر کے سوانح، ان کی غزلیں اور دوسری اصناف سخن نئی تنقید کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں ــ اگر آپ ــ پاکستان و بھارت کے مشہور ممتاز نقادوں کا نقطۂ نظر میر کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہیں ــ اگر آپ ــ میر کے نشتروں کے علاوہ بھی کچھ اور پڑھنا چاہتے ہیں ــــ تو

ماہنامہ نورنگ کا میر تقی میر نمبر

ضرور ملاحظہ فرمائیے، جو اگست ۱۹۵۵ء تک یہ ضخیم نمبر آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا ــــ

قیمت دو روپے آٹھ آنہ

اپنے قریبی ایجنٹ سے ربط قائم کیجئے یا براہ راست ــ منیجر

ماہنامہ نورنگ ــ صدر ــ کراچی

نغمۂ اردو

(بیادگار سلور جوبلی ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن)

از:۔ قاضی محمد تاج الدین تاجؔ اورنگ آبادی

نہالِ گلشنِ فکر و گماں ہے دیکھئے اردو
چراغِ محفلِ علم و بیاں ہے دیکھئے اردو
ترانے نوجوانانِ وطن کی ہیں زبانوں پر
نشانِ منزلِ آزادگاں ہے دیکھئے اردو
ہر اک زندہ زباں کی خاصیت ہو دل لبھا لینا
محبت آشنا طرزِ بیاں ہے دیکھئے اردو
ادیبوں شاعروں کے مدعا کا نقش رنگیں ہے
عوامی حوصلوں کی ترجماں ہے دیکھئے اردو
ہزاروں قافلے گاتے رہے اردو کے نغموں کو
دلوں پر اب تو سب کے حکمراں ہے دیکھئے اردو
مزاجِ مشرق و مغرب کو سمجھو غور سے دیکھو
شعورِ فطرتِ مشرق عیاں ہے دیکھئے اردو
یقیناً ایشیا کو متحد ہی کر کے دم لیں گی
عزائم کی ہمارے ترجماں ہے دیکھئے اردو
مبارک اے وطن والو کہ اظہارِ تمنا کو
بڑی آسان اور دلکش زباں ہے دیکھئے اردو
غرض ہندو نہ مسلم صرف انسانوں کی باتیں ہیں
نمایاں خاصِ الفت کا نشاں ہے دیکھئے اردو

تفاوت رنگ و بو کا قدرتاً اے تاجؔ ہوتا ہے
حقیقت میں یہی حسنِ بیاں ہے دیکھئے اردو

تبصرے

تاریخ ادب

بنگال میں اردو | از وفا راشدی۔ مکتبہ اشاعت اردو۔ حیدرآباد (پاکستان) قیمت پانچ روپیہ۔

وفا راشدی بنگال کے جواں فکر و جواں سال شاعر اور ادیب ہیں اور تصنیف و تالیف کے خاص سلیقے سے بہرہ ور ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے مشرقی و مغربی بنگال میں اردو زبان و ادب کی ابتدا سے ۱۹۵۷ء تک کی مکمل تاریخ قلمبند کی ہے۔ کتاب باتصویر ہے۔ اس کا پیش لفظ ماہر القادری صاحب ایڈیٹر فاران نے قلمبند کیا ہے۔ اور تعارف اقبال احمد صاحب دیوبندی ایڈیٹر آفتاب روزنامہ حیدرآباد (پاکستان) نے لکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان تحریروں کی اس مفید کتاب کے لئے ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ جس محنت اور سلیقے سے یہ مرتب کی گئی ہے۔ اور جو معلومات اس میں درج ہیں وہ کسی سفارش اور تعارف کے بغیر ہی اتنی اہم ہیں کہ اردو ادب کا کوئی مورخ ان سے استفادہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وفا صاحب نے نصیر الدین ہاشمی صاحب کی دکن میں اردو کے ڈھنگ پر بنگال سے متعلق جملہ معلومات ضمناً اردو صحافت، ادبی انجمنیں، درج کر دی ہیں اور آخر میں بنگال کی اردو مطبوعات اور تصنیفات کی فہرست بھی درج کر دی ہے۔ اس طرح یہ کتاب بنگال کے اردو ادب کے ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کیلئے وفا راشدی صاحب اردو دنیا کی طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سفرنامہ

ساحل اور سمندر | از سید احتشام حسین (لکھنؤ یونیورسٹی)
مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے

احتشام حسین اردو کے ایک اعلیٰ پایہ نقاد اور عالم ہیں۔ ان کی کئی تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہندوستانی لسانیات کا خاکہ بھی ان کی ایک مفید کاوش ہے۔

زیر نظر کتاب ان کے سفر امریکہ کا سفرنامہ ہے جو بطور ڈائری مرتب کیا گیا ہے اور اس کو پیش کرتے ہوئے مصنف کا یہ خوش ہونا بجا ہے کہ اس کا تعلق ادب کی اس صنف سے ہے جس کی اردو زبان میں کمی ہے۔ اس کا مطلب نہیں کہ اس کی اشاعت سے وہ کمی پوری ہو جائے گی بلکہ خیال ہے کہ شاید اسے دیکھ کر دوسرے ادیب اس مفید اور دلچسپ صنف ادب کی جانب متوجہ ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ سفرنامہ اس قابل ہے کہ ہر تعلیم یافتہ اس کا مطالعہ کرے۔ اس کی وجہ سے سفرنامہ لکھنے کا ایک نیا راستہ دکھائی دے گا اور واقعی اردو ادب کی یہ کمی دور ہو سکے گی اگر ایسے ہی چند اور سفرنامے اس زبان میں شائع ہو جائیں۔

احتشام حسین کا نقطۂ نظر اور اسلوبِ بیان دونوں اردو کے جدید ترین رجحانات سے ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ ان کی صورت گری کرنے کا باعث ہیں۔

ناول اور افسانے

جب انسان جاگا از جی۔ایس۔عالم۔ قادری بک ڈپو۔ بمبئی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

جی۔ایس۔عالم کے کوئی ناول (مثلاً محبت اور شکن) اور افسانوں کے مجموعے (بربطِ محبت جاگتی ہے، ایک شعلہ ایک وجود) اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ان کے (۱۲) افسانوں کا مجموعہ ہے جو مجلد ہے اور دیدہ زیب۔ سرورق اور گرد پوش کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

عالم صاحب کے افسانے اپنے اندر ایک خاص دلکشی اور مقصد رکھتے ہیں۔ وہ تخیل پر زور نہیں دیتے مشاہدہ پر نظر رکھتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر افسانہ سبق آموز اور عبرت خیز ہو۔ جو لوگ اس قسم کے افسانے پسند کرتے ہوں وہ ان کو پڑھ کر ضرور خوش ہوں گے۔

آشا دیپ بجھے نا از ست پرکاش سنگر۔ مکتبہ کردار۔ بھوپال۔ قیمت ڈھائی روپے۔

سنگر صاحب حمیدیہ کالج بھوپال میں پروفیسر ہیں اور اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ یہ ان کے (۱۲) افسانوں کا مجموعہ ہے اور اس کا تعارف پروفیسر کنھیا لال کپور نے لکھا ہے۔ سنگر صاحب بھی عالم صاحب کی طرح ترقی پسند نہیں ہیں لیکن ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی، ترقی پسندی کے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ وہ بقول پروفیسر کنھیا لال کپور "ابھی نو عمر اور مشق کے لحاظ سے نوگرفتار ہیں" لیکن ان کے ان افسانوں کے اسلوب اور تکنیک سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو کے ایک مقبول افسانہ نگار ثابت ہوں گے۔ چھوٹے چھوٹے مگر معنی خیز فقروں سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں۔ انسانی فطرت کا اچھا مطالعہ کرتے ہیں اور طنز و مزاح کے ذریعہ اپنے اندازِ بیان میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔

چند تصویرِ بتاں از رام اورنگ آبادی۔ مکتبہ افکار کراچی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اس ناول میں ہندستان کی مشہور فلم ایکٹرس نرگس کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے خاندان کے افراد اور اس کے ماحول اور اس کی موجودہ زندگی کے حالات ناول کے پیرایہ میں دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔

آنچلوں کے سائے از سردار الہام بی۔اے۔ قادری بک ڈپو بمبئی۔ قیمت ڈھائی روپے

یہ بھی ایک ناول ہے جس میں متوسط طبقے کی زندگی پیش کی گئی ہے جس میں بقول مصنف غیرت کا احساس تو ہے لیکن بغاوت کا جذبہ شدید نہیں۔ اس کے سب کردار فرضی ہیں اور حالات و واقعات خیالی۔ سردار الہام ایک کامیاب ناول نگار ہیں۔ انھوں نے کرداروں کے بارے میں خود کچھ کہنے کے بجائے کرداروں اور واقعات کو اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ ان کے مکالموں اور حرکات و سکنات کی مدد سے پڑھنے والے کا ذہن ان کو متعین و مشخص کر سکتا ہے۔

شاعری

صبحِ زنداں از حسین شہیر۔ پردین بک ڈپو الہ آباد۔ قیمت تین روپے۔

حسین شہیر ایک نوجوان شاعر ہیں اور ترقی پسند۔ ان کے اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی ہیں لیکن ان سب کا موضوع زیادہ تر سیاست ہے وہ رمز و ایما کے پیرائے میں سرخ انقلاب کی نوید سناتے ہیں۔ آزاد نظمیں بہت کامیاب لکھی ہیں اور غزلوں میں بھی زندگی اور شگفتگی ہے۔ اس مجموعہ کا تعارف پروفیسر آل احمد سرور (مسلم یونیورسٹی) نے لکھا ہے اور بہت ہی عمدہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اردو شاعری کے پس منظر اور فن کی تبدیلی سے متعلق نہایت ماہرانہ انداز میں بحث کی ہے اور یہ تعارف بجائے خود اردو شعر و سخن پر ایک جدید نقطۂ نظر سے تنقیدی مضمون ہے۔

شہیر کی شاعری میں زندگی کی بڑی قوت ہے۔ غزل میں بھی وہ اپنے خیالات اور مسلک کی اس خوبی سے نمایندگی کرتے ہیں کہ غزل کے مزاج پر بار نہیں ہونے پاتے۔ توقع ہے کہ وہ اردو کے شعرائے مستقبل کی صف اول میں نمایاں مقام حاصل کر سکیں گے۔

انیسیات | از آنیسہ ہارون شروانیہ۔ اردو محل حیدرآباد دکن۔ قیمت دو روپے چار آنے۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی کی بیگم صاحبہ کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ انیسہ صاحبہ ایک خوش ذوق خاتون ہیں اور انھوں نے ان پاکیزہ نظموں اور غزلوں میں اخلاق اور مذہب پرستی کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے۔ ان کے کلام میں بے ساختگی اور ذہانت کے جوہر نمایاں ہیں۔ بعض غزلیں نعتیہ بھی ہیں اور بعض میں سفر حج اور مدینہ منورہ کے تاثرات سوز و گداز کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں۔

"ادارہ"

سرسری ہم جہان سے گزرے

ڈاکٹر زور | مولفہ محمد بن عمر ایم اے لکچرار جامعہ عثمانیہ۔ قیمت دو روپے۔

قابل مولف کی ان تھک کوششوں کا ایک گراں قدر کارنامہ ہے۔ یہ (۲۰۰) صفحات کی دلچسپ کتاب، حسین گردوپیش کا نقاب ڈالے ہوئے، اپنے اندر کافی کشش اور جاذبیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر زور ہر پہلو سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر عکس بے نقاب ہو جاتا ہے —— بعض مضامین بہت اچھے ہیں۔ بعض کافی دلچسپ —— ایک دو تحقیقاتی مقالہ نما —— ویسے تو "مقدمہ" ہی میں ہمیں زور اپنی قوت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

مشاہیر اردو نے اپنے انمول بیانات بھیج کر دریا کو کوزے میں بند کیا ہے کہ

ع پہچان یہ ہے ناز تو پہچان جائیے

بشیر کی نثر میں بھی شاعری کے انداز ہیں۔

قتیل نے ایک لاڈلے گستاخ بیٹے کی طرح اپنے تاثرات کے اظہار میں بڑی بے تکلفی برتی ہے۔ اس مضمون کا اپنا پن اور بے ساختگی مجھے پسند آئی۔

مورخ دکن ہاشمی صاحب نے سیرت کا خاکہ پیش کرنے میں کافی محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے

میکش مرحوم کا مضمون بڑا جاندار ہے۔

سرور کی صاحب —— تو پہلی نظر میں دل دے بیٹھے جس کا نتیجہ "سرزوری" ہے۔

شاہد کا مضمون دلچسپی اور روانی میں اپنی نظیر آپ ہے۔

محمود حسین صاحب کی عقیدتمندانہ پیش کش سادگی و پرکاری کی غماز ہے۔

رفیعہ سلطانہ کا مقالہ۔ ایک سیر حاصل تحقیق اور کافی گہرا مطالعہ ہے۔ ان کے مضمون میں لیلیٰ کی انگلیاں بجائے مجنوں کی پسلیاں بن گئی ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۲)

وزیر حسن دہلوی کی مقالہ تمامہیں "معقولہ نما" عقیدت مندی اپنی نوعیت کی ایک چیز ہی نہیں بلکہ خاصہ کی چیز نظموں میں علی منظور کی نظم مجھے پسند آئی۔

بہرکیف اتنے سارے تحقیقاتی، جامع اور ٹھوس ادبی مقالوں کے درمیان اپنا مضمون دیکھ کر شرمندگی سی ہوتی ہے۔ میرے اپنے الفاظ میں بھی ایک غلطی ہے۔ بجائے اصغر گونڈوی کے میں نے "ظ۔ انصاری" لکھ دیا ہے۔ قارئین سے اپنی اپنی کتاب میں اس کی تصحیح کر لینے کی استدعا کی جاتی ہے۔ فقط

جہاں بانو

بنگال میں اردو

وفا راشدی

بنگال کے نامور ادیب اور مصنف وفا راشدی کی تصنیف ہے جس میں مشرقی و مغربی بنگال میں اردو زبان وادب کی مکمل تاریخ پیش کی گئی ہے۔ بنگال میں اردو کی ابتدا سے آج تک کے بتدریج ارتقاء و ترقی کا سیاسی، علمی و ادبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ دونوں بنگال کے بے شمار قدیم و جدید اہل علم و فضل اور ارباب شعر وادب کے تذکرے مع نمونۂ کلام نظم و نثر شامل ہے۔ شروع سے آج تک کی اردو تصانیف و مطبوعات کا حال بھی درج ہے۔

مشہور ارباب قلم مثلاً رضا علی وحشت، آرزو لکھنوی، عندلیب شادانی وغیرہ کی تصاویر بھی زیر کتاب ہیں۔

"بنگال میں اردو" وفا راشدی کی بارہ سال کی مسلسل محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے بنگال میں اردو کی اہمیت و قابلیت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ گردپوش رنگین و جاذب نظر — قیمت مجلد (پانچ روپے)

ملنے کے پتے:۔

ہر شہر اور ریلوے اسٹیشن کے بک ایجنٹوں کے علاوہ

پاکستان میں:۔ مکتبۂ اشاعت اردو ۲۴۴ جیل روڈ۔ ہیرآباد۔ حیدرآباد (سندھ)

ہندوستان میں:۔ کلکتہ سنٹرل پریس ۱۰ چاندنی چوک۔ اسٹریٹ کلکتہ

ادارہ کی جدید مطبوعات معاصرین کی نظر میں

ترجمانِ زندگی

جناب مولوی سید علی منظور صاحب حیدر آبادی کے کلام کا تیسرا مجموعہ "ترجمانِ زندگی" ...!! خوف تردید اور بعین الیقین
ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہر مصرع، ہر شعر، ہر نظم پختہ گوئی کی بہترین مثال ہے۔ نہایت استادانہ کلام ہے۔ میں تو شاعر کے
[کم]ال کا گرویدہ ہو گیا۔ یہ اعتراف کمال کر کے فخر محسوس کرتا ہوں۔ ایسا برجستہ، چستہ کلام ابھی دیکھا ہے میں نے سرسری نہیں
[دیکھ]ی۔ یہ مجموعہ مہینوں تک میرے سرہانے رہے گا اور اسے بار بار پڑھوں گا۔ کاش دورِ حاضر کے نوجوان شعرا کے یہاں ہیں
[فصاح]ت بیان کی ایسی مثالیں ملتیں۔ ایک بار پھر جی کھول کر اس نادر مجموعے کی تعریف کرتا ہوں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۵۲ء — فراقؔ گورکھپوری

حضرت مولانا سید علی منظور صاحب دارالسرور حیدر آباد کے ایک کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اس نام
[سے] ان کے کلام کا یہ تیسرا مجموعہ بسلسلہ مطبوعات ادارہ ادبیات اردو شمارہ (۱۸۴) شائع ہوا۔
سید علی منظور اپنے مخصوص رنگ کی وجہ سے ایک شانِ انفرادیت کے مالک ہیں۔ جس عنوان پر طبع آزمائی کرتے
[ہیں] اس کے ہر پہلو کو اپنے الفاظ کے جادو سے اجاگر کر دیتے ہیں۔ کلام میں ذرا سا سقم نہیں۔ سلاست و روانی کے بادشاہ ہیں۔
[اس] مجموعہ میں ان کی سب سے پہلے نظم کا عنوان ہے۔ "رکن برادری" عنوان سے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر شاعر نے اس میں لکھا
[کی]ا ہوگا۔ لیکن جب پڑھا تو پڑھتے رہنے ہی کو جی چاہا۔ ہر مصرع شگفتہ اور ہر شعر ایک حقیقت کا حامل ہے۔ لیجئے آپ بھی پڑھئے۔
منظور صاحب کی تمام نظمیں اسی طرز کی ہیں اور ایک سے ایک بہتر صفحات (۱۸۴) سے (۲۰۳) غزلوں کیلئے مخصوص
[ہیں]۔ ماشاء اللہ خوب رنگ تغزل ہے۔ "پیچھے جا رہے ہیں ہم۔ سنے جا رہے ہیں ہم" کی پامال زمین میں خوب بجتے ہوئے
[شعر] نکالے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو نے یہ مفید اور قیمتی مجموعہ شائع کر کے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء — "الفاروق"

رُباعیاتِ الہام

مصنفہ ڈاکٹر رگھونندن راج صاحب سکسینہ الہامؔ۔
زیر نظر کتاب حیدر آباد کے ایک ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ الہامؔ کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اصناف شاعری میں رباعی
ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ شاعر بڑے بڑے مطالب کو رباعی کے چار مصرعوں میں سمو دیتا ہے۔ رباعی کی خصوصیت

یہ ہوتی ہے کہ اس کا وزن بہت ہی سہل ہوتا ہے اور بڑی آسانی سے زبان زد ہو جاتی ہے۔

حیدرآباد کے بیشتر شعراء نے شاعری کی اس صنف میں اپنے کمالات دکھائے ہیں۔ فی زمانہ جناب امجد حیدرآبادی کی اس باب میں بڑی شہرت ہے۔ ڈاکٹر الہام کی ان رباعیوں کو جناب امجد نے شروع سے آخر تک دیکھا اور ضروری اصلاحیں دے کر انھیں موزوں کیا ہے جو رباعیات الہام کے دلچسپ اور پرلطف ہونے کی ضمانت ہے۔ زبان ان کی بہت صاف اور شستہ ہے اور اکثر رباعیوں کا مضمون صوفیانہ اور بلند پایہ مطالب کا حامل ہے۔ کہیں کہیں ایسے الفاظ ضرور آ گئے ہیں جو پاکیزہ اور اعلیٰ مطالب کی نسبت سے مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ بہرحال کتاب بحیثیت مجموعی قابل قدر ہے اور خصوصی اس دور میں جبکہ اردو کو کچلا اور مٹایا جا رہا ہے ایک ہندو اہل قلم کی رباعیوں کا یہ مجموعہ اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اردو کی مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔

۵ راکتوبر ۱۹۵۵ء "ماہنامۂ دکن"

راہ رو اور کارواں

ادارۂ ادبیات اردو کی سلور جوبلی کے موقع پر جو کتابیں تازہ شائع ہوئیں ان میں سے یہ بھی ایک ہے۔ اس میں ان مصنفین کا تذکرہ ہے جن کی تصانیف ادارۂ مذکور سے اس پچیس سال کے عرصہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تذکرے بہت مختصر ہیں اور ان سے مصنفین کی سوانح حیات اور کارناموں کا ایک سرسری جائزہ مستنبط ہوتا ہے۔ سیرت اور مزاج پر کم روشنی ڈالی جا سکی ہے کیونکہ یہ کتاب عجلت میں تیار کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ ایک مفید تذکرہ ہے جس کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی جائیگی۔

اپریل ۱۹۵۵ء "فروغ اردو"

راہ رو اور کارواں ان ادیبوں اور شاعروں کے مختصر حالات زندگی کا مجموعہ ہے جن کے رشحات قلم اور نتائج فکر گزشتہ (۲۵) سال کی مدت میں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع کئے جاتے رہے ہیں اور اس مجموعہ کو نظام کالج کے استاد اردو جناب عبدالحفیظ قتیل ایم۔اے۔پی ایچ ڈی نے مرتب کیا ہے۔

اردو زبان میں شعراء متقدمین کے متعدد تذکرے تو موجود ہیں اور آج سے کم و بیش تیس سال قبل مولوی محمد یحییٰ تنہا نے سیر المصنفین کے نام سے چند اردو نثر نگاروں کے حالات بھی شائع کئے تھے لیکن آج کے عوامی دور میں اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں کے حالات کی تدوین اور ترتیب کی ضرورت ہے۔ ان کے حالات زندگی کی ترتیب اور اشاعت پر بہت کم توجہ مبذول کی گئی ہے اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ جناب حفیظ قتیل صاحب نے کم از کم ادارۂ ادبیات اردو کے ساتھ وابستہ ادیبوں اور شاعروں کے مختصر حالات قلمبند اور شائع کر کے نہ صرف عوام سے ان حضرات کا تعارف کرایا ہے بلکہ اردو ادب کی ایک کمی کو پورا کرنے کی جانب ایک مستحسن قدم بھی اٹھایا ہے۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ اس کے مطالعہ سے نہایت آسانی کے ساتھ اس بات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ اردو کتنی ثروت مند زبان ہے اور اسے ثروت مند بنانے کے لئے طبقہ کے ہندو اور مسلمان کس طرح مل جل کر کوشش کرتے رہے ہیں۔ کتاب کی کتابت اور طباعت صاف اور روشن ہے اور اسے اچھے کاغذ پر طبع کیا گیا ہے۔

اپریل ۱۹۵۵ء جلوۂ جلد (ہفتہ وار)

حیدرآباد کا ادارۂ ادبیات اردو جس کے بانی اور روح رواں ڈاکٹر زور ہیں ہندوستان کے ان چند اہم اداروں میں سے ہے جو سالہا سال سے اردو زبان کی خدمت میں مصروف ہیں اور بڑا قیمتی ادبی سرمایہ فراہم کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں جناب حفیظ قتیل صاحب نے ادارۂ ادبیات کے ایک خاص پہلو کو لے کر یہ بتایا ہے کہ اس ادارے نے جو حیدرآباد کے نوجوانوں میں خدمت علم و ادب کا جذبہ کس حد تک پیدا کیا اور انھوں نے کیا کیا خدمات انجام دیں۔

اس حصہ میں حفیظ قتیل صاحب نے حیدرآباد کے ۵۴ ادیبوں کا ذکر کیا ہے جن میں آٹھ خواتین بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ربع صدی میں کیسی کیسی مفید کتابیں حیدرآباد میں شائع ہوئیں اور ان کی اشاعت میں ادارۂ ادبیات اردو نے کتنی مدد کی۔

اپریل ۱۹۵۵ء "نگار" لکھنؤ

حیات بخشی بیگم

از نصیر الدین صاحب ہاشمی

ملکہ حیات بخشی بیگم جو دکن کے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بیوی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی والدہ تھیں تاریخ دکن کی ان چند نامور شہزادیوں اور شاہی بیگمات میں سے ہیں جو اپنے اخلاق و عادات، فہم و تدبر اور سیاسی دانشمندی کے لئے مشہور ہیں۔ موصوفہ نے ایک نازک موقع پر بڑی جراءت و ہمت سے کام لیا اور قطب شاہی سلطنت کو شاہجہاں کے عہد میں مغلیہ سلطنت کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچالیا۔ اس کے علاوہ ملکہ بڑی فیاض، رحم دل اور سخی تھیں۔ حیدرآباد میں بہت سے رفاہ عام کے کام انھوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ اس کتاب میں موصوفہ ہی کے حالات و سوانح مستند تاریخی حوالوں کی روشنی میں لکھے گئے ہیں جس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہوگا اور سبق آموز بھی۔

بابتہ ۱۹۵۴ء "برہان"

داستان ادب حیدرآباد

علامہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانی ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن انقلاب حیدرآباد سے بہت پہلے سے جو خدمت اردو زبان کی کر رہے تھے اب انقلاب کے بعد ان کے اس کام میں اور زیادہ زور پیدا ہو گیا ہے۔ چند مہینوں کے اندر ابھی حال میں کئی کتابیں ان کی شائع ہوئی ہیں۔ مگر ۱۲ راگست کو جو کتاب آئی ہے اس کا نام داستان ادب ہے۔ دو سو بائیس (۲۲۲) صفحات کی مجلد کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی بہت نفیس ہے۔

(۸ ستمبر ۱۹۵۱ء) "منادی"

یہ کتاب سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو کا شمارہ (۱۴۳) ہے۔ ان اوراق میں پروفیسر زور نے حیدرآباد دکن میں اردو فارسی اور عربی ادب اور شاعری کا جائزہ لیا ہے اور ارباب کمال کے مختصر حالات اور ان کے ادب کے نمونے پیش کئے ہیں۔ اس طرح ایک مختصر تاریخ مرتب کرنے کی کوشش بلاشبہ بہت مستحسن ہے۔ حیدرآباد کی

صدیوں سے علوم و فنون کا مرکز رہا ہے اور اس لئے وہاں کی تہذیب نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا جس میں ہر قوم اور ملت کے لوگ ہمیشہ شریک رہے۔ حیدرآباد کی یہ عظیم الشان خصوصیت آج تک باقی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب اس کو برباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہوگئی تو حقیقت یہ ہے ہندوستان میں مشترکہ تہذیب و تمدن کا یہ ایک آخری نشان بھی مٹ جائے گا۔

پروفیسر زور نے اس کتاب میں نہ صرف تاریخ ادبیات حیدرآباد بلکہ حیدرآبادی تہذیب کی تاریخ کا بہت قیمتی مواد جمع کر دیا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب حیدرآباد کے مورخ کے لئے چراغ راہ ثابت ہو۔ محمد قلی قطب شاہ اور عہد آصف جاہی سے جامعہ عثمانیہ کی تاسیس تک یہ ایک طویل داستان ہے جس کے معنی خیز اشارے ہیں جو ان اوراق میں جمع کر دیئے ہیں۔ ہم پروفیسر زور کی اس کوشش کو قابل مبارکباد سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ تحقیقات کو جاری رکھیں گے اور اس کے نتائج پیش کرتے رہیں گے۔

بحیثیت مجموعی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زیر نظر کتاب قابل قدر ہے اور ڈاکٹر زور کی محنت اور جستجو یقیناً قابل داد ہے جو لوگ تاریخ ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں یا کوئی تحقیقاتی کام کر رہے ہوں ان کے لئے یہ کتاب ایک اچھا رہنما ثابت ہوگی

"ہماری زبان" (یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء)

اس کتاب کے مصنف حیدرآباد کے نامور محقق ادیب علامہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پی ایچ ڈی ہیں جنھوں نے حیدرآباد کے تین علمی دوروں کی یہ ادبی تاریخ دستاویز مرتب کر کے خدمت اردو کے خدمت گذاروں کو یکجا کر دیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے حیدرآباد ابتدا سے لے کر موجودہ انقلاب تک تفصیل سے سامنے آجاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے ہندو مسلمانوں نے اردو کو نہ غیر ملکی زبان سمجھا اور اس کی ترقی میں ہمہ تن مصروف رہ کر اس کو ایک ترقی یافتہ علمی زبان بنانے میں کیا کردار ادا کیا۔ حیدرآباد میں انقلاب سے پہلے ہندو مسلمانوں کی قابل فخر یکجہتی اور اشتراک عمل کو اس انقلاب سے کیا نقصان پہنچا۔

داستان ادب لکھ کر ڈاکٹر زور نے حیدرآباد ہی پر احسان نہیں کیا ہے بلکہ دنیائے ادب پر احسان کیا تاکہ مستقبل کے مورخ دیکھ سکیں کے اردو کو کس طرح سے مٹا کر ایک جناتی زبان حکومت کی طاقت سے جبراً منہ پکڑا ٹھونسنے کے لئے کیا کیا قدم اٹھائے گئے اور پھر سیکولر ہندوستان کے نعرے ہیں۔

کتاب علمی حلقوں میں اور خلوص سے کام کرنے والوں میں بڑی پسند کی جائے گی۔ اگر تمام صوبے اسی طرح کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

"پیشوا" دہلی (محرم الحرام ۱۳۷۱ھ)

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماهنامہ

سب رس
حیدرآباد دکن

جلد (۱۸) نومبر و ڈسمبر ۱۹۵۵ء شمارہ ۱۱/۱۲

نگراں:-
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت:-
رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
جانکی پرشاد

سالانہ چندہ:-
چھ روپے سکۂ ہند

قیمت:-
ایک روپیہ سکۂ ہند

ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ...

اعلان جنوری ۱۹۵۶ء میں "سب رس" کا خاص باتصویر شمارہ شائع ہوگا جو خریداروں کو معمولی سالانہ چندہ میں دیا جائے گا۔ ورنہ اس کی قیمت تین روپے علاوہ محصول ڈاک ہوگی

مہتمم سب رس

فہرست



سنگ بنیاد رکھنے سے قبل حضرت امجد دعا فرما رہے ہیں — ان کی داہنی طرف نواب لطافت جنگ بہادر، ڈاکٹر بی۔ رام کرشنا راؤ، خواجہ حمید الدین شاہد، ڈاکٹر مسعود، رمی راج الدین رس اور دائیں طرف ڈاکٹر زور، فاروق علی صوفی، حامد علی قادری، فخر الدین ارتکنت، مراد علی طالع، نبی الدین قادری، مرزا ساجد علی خاں صاحبان ایستادہ ہیں۔ پیچھے کی صف میں حمید صدیقی، مرزا سرفراز علی، اکبر الدین صدیقی، ڈاکٹر رضی الدین کمال، میر مظہر حسین صاحبان ہیں۔

عمارت ادارہ ادبیات اردو

ادارہ ادبیات اردو کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب اتوار ۶ نومبر ۱۹۵۵ء کو شام کے ساڑھے چار بجے ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ چیف منسٹر حکومت حیدرآباد نے انجام دی۔ اس موقع پر ایک شایان شان عصرانے سے بھی حاضرین کی ضیافت کی گئی۔ مولوی فیاض الدین صاحب نظامی چیف ٹاؤن پلانر حکومت حیدرآباد نے جو رنگین نقشہ عمارت کا تیار کر کے ایک نمایاں مقام پر آویزاں کیا تھا اس کو تمام مہمان گروہ در گروہ دیکھ کر مسرور ہوتے گئے اور فیاض الدین صاحب کے کمال کی داد دیتے رہے۔ چیف منسٹر نے بھی اس کو بہت پسند فرمایا۔ وہ ٹھیک ساڑھے چار بجے تشریف لائے اور آتے ہی گشت کر کے جملہ حاضرین سے مصافحہ کیا۔ پھر مولوی فیاض الدین صاحب سے نقشہ کی تفصیلات دریافت کر کے اپنی نشست پر تشریف لائے۔

سب سے پہلے نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ نے ایک تقریر کی جس میں ادارے کی عمارت کے لئے اب تک جو جد و جہد کی گئی تھی اس کی تاریخ اجمال کے ساتھ بیان کی اور آخر میں ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ صاحب سے سنگ بنیاد رکھنے کی استدعا کی گئی۔ (یہ تقریر اس کے بعد درج ہے)۔

چیف منسٹر صاحب نے اس کے جواب میں نہایت فصیح و بلیغ اردو میں فی البدیہہ تقریر فرمائی جو آگے درج ہے۔

جب سنگ بنیاد رکھا جانے لگا تو حیدرآباد کے مشہور صاحب عرفاں شاعر حضرت امجد سے استدعا کی گئی کہ پہلے وہ دعا فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے دعا پڑھی۔ اس اثنا میں حیدرآباد کے مشہور فوٹو گرافر راجہ دین دیال نے کئی تصویریں لیں اور جب چیف منسٹر صاحب نے اپنے ہاتھ میں تھاپی لے کر سمنٹ پھیلائی تو مرزا ضامن علی صاحب خازن اور دوسرے اصحاب نے پتھر آگے بڑھایا اور ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ صاحب نے اس کو اپنے ہاتھ سے رکھا۔ اس پتھر میں حسب ذیل کتبہ سنگ مرمر کی تختی پر کندہ ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت کا یہ سنگ بنیاد

بتاریخ ۶ نومبر ۱۹۵۵ء

ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ

چیف منسٹر حیدرآباد نے رکھا

آرکیٹکٹ ۔ مولوی فیاض الدین صاحب نظامی

اس تقریب کے بعد تمام حاضرین کی چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی۔ چائے سے فارغ ہو کر چیف منسٹر صاحب بھی حاضرین خاص کر نواب لیاقت جنگ بہادر۔ لچھمی نارائن صاحب گپتا۔ مخدوم محی الدین صاحب۔ اختر صاحب۔ پروفیسر عالم خوندمیری۔ نصیر الدین صاحب ہاشمی وغیرہ سے گفتگو کی اور ساڑھے پانچ برخاست فرمایا اور موٹر میں سوار ہوتے ہوئے ڈاکٹر زور صاحب کو فرمایا کہ بیگم صاحب تک ان کا پہنچا دیں اور زمین عطا کرنے پر ان کی طرف سے بھی شکریہ ادا کریں۔

اس موقع پر ادارے کی مختلف مجلسوں کے ارکان اور مہمان جمع تھے ان میں حسب ذیل قابل

ارکان پارلیمنٹ :۔ سید احمد محی الدین صاحب۔ میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر۔ راج بہادر گوڑ

ارکان حیدرآباد اسمبلی :۔ مخدوم محی الدین صاحب معتمد عوامی محاذ اور اختر حسن صاحب۔

علمی و ادبی خدمت گار :۔ حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔ جانکی پرشاد صاحب۔ سلیمان اریب صاحب اڈیٹر صبا۔ مولوی عارف الله صاحب۔ محترمہ بشیر النسا بیگم صاحبہ بشیر۔ ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ الہام۔ رمن راج سکسینہ صاحب ا[illegible] سید مراد علی صاحب طالع۔ جناب کلیم اللہ صاحب۔

یونیورسٹی کے اساتذہ اور ماہرین :۔ ڈاکٹر قاری قطب الدین صاحب۔ مولوی سید علی اکبر صاحب انوار العلوم کالج۔ پرنسپل محمد علی خاں صاحب۔ پروفیسر عالم خوندمیری صاحب۔ مولوی سید محمد صاحب۔ مو[illegible] محمد بن عمر صاحب۔ مولوی محمود حسین صاحب۔ مولوی حمید الدین صاحب شاہد۔ مولوی سراج الدین احمد مولوی مظہر حسین صاحب۔ مولوی سید معین الدین قادری صاحب۔ مولوی سید عبد المنان صاحب۔ مولوی اک[illegible] صدیقی صاحب۔ منیزہ بانو کاؤس جی صاحبہ۔ زینت ساجدہ صاحبہ۔ سلطانہ بیگم صاحبہ شرف الدین۔ مولوی مح[illegible] صاحب۔ مرزا سرفراز علی صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج۔ مولوی رشید الحسن صاحب۔

عہدہ داران حکومت :۔ لچھمی نارائن صاحب گپتا معتمد تعلیمات۔ محمد فیاض الدین صاحب نظامی [illegible] نادان یار۔ مولوی شرف الدین صاحب ناظم عدالت۔ ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ناظم کتب خانہ [illegible] ڈاکٹر رحیم الدین صاحب کمال۔ قاضی عبد الرشید صاحب نائب ناظم سیل ٹیکس۔

ملک کے دیگر مشاہیر اور علم دوست حضرات :۔ حضرت مولانا سید شاہ سعد الدین صاحب [illegible] تنگ جوش۔ مولوی کرم اللہ خاں صاحب سابق نائب معتمد امور عامہ۔ مولوی میر احمد علی خاں صاحب سابق صو[illegible] مولوی عبد الحمید خاں صاحب سابق صدر المہام عدالت۔ خان بہادر عبد السلام سعید صاحب۔ مولوی [illegible] نواب سابق صدر ناظم محاسبات۔ راجہ کرن پرشاد بہادر۔ نواب میر باسط علی خاں صاحب سابق جج ہائیکو[illegible] میر [illegible] علی خاں صاحب سابق ناظم تعمیرات۔ مولوی مرزا فاروق علی صاحب معتمد ایڈوکیٹ۔ مرزا حامد[illegible] مرزا [illegible] علی صاحب خاندا۔ جناب حیدر صدیقی صاحب۔ عارف علی خاں صاحب۔ عطا اللہ صاحب [illegible] نواب غازی الدین احمد صاحب۔ میر مظفر علی خاں صاحب وغیرہ

تقریر

از:۔ نواب لیاقت جنگ بہادر (صدر ادارہ)

عالی جناب فضیلت مآب ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ صاحب چیف منسٹر حکومت حیدرآباد۔

اسی سال ۲۷ جنوری کو ادارہ ادبیات اردو کی سلور جوبلی کی تقریبات کا افتتاح فرماتے ہوئے جناب نے ارشاد فرمایا تھا کہ ــــ

"اچھے کام کرنے والے اداروں کو ہر مقام پر گھر مل جاتا ہے۔ ہر مقام پر نہیں بلکہ ہر انسان کے دل میں ان کا گھر ہوتا ہے۔ مادی گھر اور در تو بہت آسانی سے مل سکتا ہے۔ ابھی سکریٹری صاحب نے بتایا کہ اس کے کچھ مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔ میں کہوں گا کہ انشاء اللہ اس میں ان کو کامیابی ہو گی۔ میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔"

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جناب کی یہ دعا قبول ہوئی اور یہ ادارہ آخرکار اس قابل ہوا کہ سلور جوبلی کے چند ماہ بعد آج اپنی ایک ذاتی عمارت کا سنگ بنیاد ملک کے ایک ایسے قابل احترام فرد کے ہاتھوں سے رکھا جا رہا ہے جو علوم مشرقیہ کا دلدادہ ہونے کے علاوہ حکومت کا چیف منسٹر اور اردو اور اہل اردو کا ہمدرد بھی ہے۔

اس ادارے کے لئے ایک ذاتی عمارت کی فراہمی کا خیال آج سے پندرہ سال قبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ مرحوم صدر اعظم وقت کے معائنۂ ادارہ کے بعد ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوا۔ چنانچہ [illegible] کتب خانہ کی اہمیت اور بڑھتے ہوئے کاموں کی افادیت کے پیش نظر وعدہ فرمایا [illegible] فرمادیں گے۔ نواب مہدی یار جنگ مرحوم۔ نواب زین یار جنگ بہادر۔ پروفیسر [illegible] کی ایک سب کمیٹی بنائی گئی تاکہ مقام یا عمارت کا انتخاب کرے۔ چنانچہ اس کمیٹی نے [illegible] کیا اور حکومت کے آگے اپنی تجویزیں پیش کیں۔ لیکن ابھی کارروائی جاری ہی تھی [illegible] سبکدوش ہو کر دلی تشریف لے گئے۔

نواب صاحب چھتاری کے دور صدارت عظمیٰ میں بھی یہ کام [illegible]

[illegible] میں ادارہ [illegible] عمارت کا ایک نقشہ تیار کر کے اس کی [illegible]

[illegible]

کے دور میں یہ تحریک تکمیل کی صورت اختیار کر گئی۔ انھوں نے باغ عام کے روبرو مقام کا انتخاب کر کے مولوی فیاض الدین صاحب سے نقشے بھی تیار کرا لئے تھے اور ۱۲؍ اپریل ۱۹۴۷ء کو عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے والے تھے یکایک صدارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے۔ بعد کی حکومت کے نائب صدر نشین ڈیکنٹ راما ریڈی صاحب نے اپنی ایک یادداشت کے ذریعہ سے میر لائق علی صاحب کو اس جانب توجہ دلائی تھی اور یہ مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ پولیس ایکشن ہو گیا اور ملٹری گورنر کی حکومت قائم ہو گئی۔

اس بدلے ہوئے دور میں بھی ادارے نے اپنی جد و جہد جاری رکھی اور ایک تفصیلی درخواست ۱۹؍ مارچ ۱۹۴۹ء کو ملٹری گورنر کی خدمت میں پیش کی لیکن موافق مرام نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار جب جناب کی صدارت میں عوامی قومی حکومت برسر کار آئی تو ادارے کے کاموں میں نیا جوش اور سرگرمی پیدا ہو گئی اور اس کے کتب خانے کے نوادر قلمی اور مطبوعہ کتب میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ مجلس انتظامی نے محترمہ شاہجہاں بیگم صاحبہ ایم۔ اے کو مجلس عمارت کا معتمد بنا کر یہ کام ان کے سپرد کیا۔ انھوں نے بڑی مستعدی کے ساتھ دوڑ دھوپ اور تلاش شروع کی اور جناب والا کو اور وزیر تعمیرات کو اس کی طرف توجہ دلاتی رہیں۔ اس اثنا میں جب کسٹوڈین کی طرف سے مکانات اور زمینیں ہراج لگیں تو ان کے معائنے اور ہراجوں میں شرکت اور خریدی کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ آخر کار ادارے کی سلور جو کے سلسلہ میں محترمہ شاہجہاں بیگم صاحبہ اور ادارے کے ایک رکن انتظامی اور قدیم ہمدرد لچھمی نارائن صاحب گپتا نے توجہ دلائی کہ سرکار سے زمین یا مکان ملنے کا انتظار کرنا مزید تعویق کا باعث ہے۔ اور ادارے نے سالہا سال سے اپنی دوسری ضرورتوں کو روک کر سرکار میں جو رقم عمارت کے لئے محفوظ رکھی ہے اس کے حصول میں آئندہ دشوار پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ادارے کے موسسین میں سے کسی کو چاہئے کہ کوئی زمین بطور عطیہ دیں اور اس پر تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے۔ میں نے بھی اسی شکل کو مناسب سمجھا اور ادارے کی مجلس انتظامی نے اپنے اجلاسوں میں اس پر کافی غور کیا اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کی خواہش پر محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ جو ادارے کے معتمد صاحب اعزاز کی بیگم ہیں اپنے بنگلہ کے سامنے سڑک کی جانب زمین کا یہ قطعہ اس شرط پر عطا کرنے رضامند ہو گئیں کہ اس پر جو عمارت تعمیر ہو وہ ہمیشہ اردو کی ترقی اور استحکام کے لئے وقف رہے اور سالتی ضرورتوں کے لئے استعمال میں نہ لائی جائے۔ چنانچہ اس کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کر کے رجسٹری کرائی گئی اور مولوی فیاض الدین صاحب کو نقشہ کی تیاری اور تعمیر کا سپرد کر دیا گیا۔

میں ادارے کی جانب سے محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور مولوی فیاض الدین صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بہت جلد ایک عمدہ نقشہ تیار کر دیا اور تعمیر کو تکمیل تک پہنچانے کا بھی ذمہ۔

ہم سب کو یقین ہے کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد ڈاکٹر بی رام کشن راؤ صاحب رکھیں گے اور جس کی تعمیر مولوی فیاض الدین صاحب کی نگرانی میں ہو گی وہ جلد اور عمدہ تیار ہو گی اور اس ملک میں اردو کی ترقی، استحکام اور تقویت کا باعث ثابت ہو گی۔

ان چند الفاظ کے بعد میں جناب سے استدعا کرتا ہوں کہ اس کا سنگ بنیاد اپنے دست مبارک سے رکھیں۔

تقریر

از۔ ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ (چیف منسٹر حیدرآباد)

میں ادارۂ ادبیات اردو کے کاموں سے ذاتی طور پر دیرینہ واقفیت رکھتا ہوں۔ یہ ادارہ مشکلات کے باوجود اردو کی بہت اچھی خدمت انجام دے رہا ہے اور اس کے روح رواں ڈاکٹر زور صاحب شروع سے اس کے لئے ایثار کرتے چلے آرہے ہیں اور اردو کے لئے حیدرآباد میں مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ ان کے ساتھیوں میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی میرے پرانے دوست ہیں اور یہ دونوں اصحاب بھی ادارے کے قیام سے اب تک برابر اس کی ترقی اور اردو کی بہبودی کے لئے کام کر رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ دوسروں سے زیادہ یہی اصحاب ڈاکٹر زور صاحب کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

واقعی میں نے ادارۂ ادبیات اردو کی سلور جوبلی کی صدارت اور تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے دل سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس مفید اور مشہور ادارے کیلئے عمارت مل جائے تو اچھا ہے اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ میری یہ خواہش آج پوری ہو رہی ہے۔ اس کے لئے ڈاکٹر زور صاحب کی بیگم صاحبہ نے ایک عمدہ مقام پر جو زمین عطا کی ہے اس کے لئے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں تحریک کروں گا کہ حکومت حیدرآباد کی جانب سے بھی اس کی تعمیر کے لئے رقمی امداد ملے اور یقین ہے کہ ملے گی۔

حیدرآباد شروع ہی سے اردو کا مرکز رہا ہے۔ اور قطب شاہی دور میں یہاں اردو کی بڑی عمدہ اور اعلیٰ کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے بعد اگرچہ کہ کچھ عرصہ تک اردو کا مرکز دہلی اور لکھنؤ میں منتقل ہوگیا لیکن گزشتہ چند قرنوں سے پھر حیدرآباد اردو کا مرکز بن گیا اور جامعہ عثمانیہ نے تو اس زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ سر اکبر حیدری مرحوم نے اس میں جو تجربہ کیا وہ اردو کی ترقی کے لئے بڑا زینہ تھا۔

حیدرآباد میں اس زبان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب اور خدمت گزار موجود ہیں۔ ان باتوں کو کوئی فراموش نہیں کر سکتا اور ہر سمجھدار آدمی [illegible] اردو کی خدمات کی قدر کرے گا اور [illegible]

کرنے والوں سے ہمدردی ہے اور ہونی چاہیئے۔ اس سرزمین میں رہنے والے ہر شخص کو اردو کی ترقی میں سرگرم حصہ لینا چاہیئے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے گذشتہ سال ایک بڑے اچھے کام کا آغاز کیا ہے۔ اس نے قطب شاہی زمانے کی اردو کتابوں کو ہندی پرچار سبھا کے ساتھ مل کر ناگری اور اردو دونوں خطوں میں چھاپنے کا تہیہ کیا۔ جب یہ اسکیم میرے سامنے آئی تو میں نے اس کی تائید کی اور حکومت ہند میں بھی تحریک کی کہ اس کے لئے رقم فراہم کی جائے۔ خود حکومت حیدرآباد سے بھی ساڑھے سات ہزار روپیے اس کام کے لئے دیئے گئے تھے۔ چنانچہ چند ایسی کتابیں چھپ بھی گئی ہیں۔

میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ یہ عمارت مسٹر فیاض الدین کی نگرانی میں بہت جلد تیار ہو جائے اور ادارے میں جو قیمتی اور نادر قلمی کتابیں کثیر تعداد میں جمع کی گئی ہیں وہ اس میں منتقل ہو کر محفوظ رہیں۔ اور یہ عمارت ریسرچ کرنے والوں کے لئے ایک مرکز کا کام دے۔ اور اردو کی خدمت میں اپنی شان کے مطابق حصہ ادا کرے۔

مولوی فیاض الدین صاحب نے حیدرآباد میں کئی عمدہ عمدہ عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ جب یہ عمارت بن جائے گی تو اور ایک خوبصورت اور عمدہ عمارت کا اضافہ ہوگا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ سب سے زیادہ خوبصورت عمارت ہوگی۔ میرے ہاتھ تو مبارک نہیں ہیں لیکن میں کہوں گا کہ اس کا سنگ بنیاد رکھنا میرے لئے مبارک اور مسعود ہے۔

پیامات

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب (جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ)

"یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ اب ادارہ کی عمارت جلد تیار ہو جائے گی۔ اللہ تعالی آپ کی مدد کرے۔ آپ نے ہمیشہ بڑی ہمت سے کام کیا ہے۔"

پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی۔ ایم۔ اے۔ بی اے ایس (صدر انجمن اسلام ریسرچ انسٹیٹوٹ بمبئی)

"یاد فرمائی کے لئے میرا دلی شکریہ اور ادارے کے مستقبل کی وسعت و عظمت کے لئے میری دعائیں اگرچہ دیر سے پیش کی جارہی ہیں لیکن دل سے پیش کی جارہی ہیں۔ اللہ پاک آپ کو حیات خضری عطا فرمائے اور جسمانی اولاد کی ترقی درجات کے ساتھ ساتھ آپ اپنی ذہنی و روحانی اولاد کو بھی ہمیشہ ہمیشہ پھلتا پھولتا دیکھتے رہیں۔"

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ حیا (معتمد انجمن خواتین حیدرآباد)

"میں ڈاکٹر زور صاحب کو اور ان کے ساتھ کام کرنے والوں اور نواب لیاقت جنگ بہادر کو مبارکباد دیتی ہوں کہ عمارت ادارۂ ادبیات اردو کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ عمارت تیار ہو جائے۔ میں آج کے جلسے میں شریک نہیں ہوسکی کہ میرے یہاں خود انجمن خواتین حیدرآباد کا جلسہ ہے۔"

حضرت مولانا سید محمد بادشاہ حسینی صاحب قادری (معتمد مجلس علمائے دکن، حیدرآباد)

"ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت کے سنگ بنیاد کی مبارک تقریب میں ضرور شریک ہوتا لیکن کل اسی وقت میرے یہاں مجلس ماہانہ ہوا کرتی ہے اس لئے معذرت خواہ ہوں اللہ تعالی آپ کی مساعی جمیلہ میں برکت عطا فرمائے۔"

غزل

تلخی سے عبارت ہے احساس کا افسانہ
یا تلخیٔ دوراں ہے یا تلخیٔ پیمانہ

آنکھیں تری شیدائی، دل ہے ترا دیوانہ
روپوش کہاں ہے تو اے جلوۂ جانانہ

یہ رات کی تنہائی، ظلمات کی گہرائی
اس وقت دلِ شاعر اک نالۂ مستانہ

آنکھیں ہوں اگر بینا، ہر ذرّہ حقیقت ہے
اے بےخبرو ورنہ دنیا ہے اک افسانہ

اب محفلِ جاناں سے کیا لوٹ کے جائیں گے
یہ کہہ کے سرِ محفل رخصت ہوا پروانہ

کیا کہیے ان آنکھوں کی آزاد وہ آنکھیں ہیں
پیمانہ بہ پیمانہ میخانہ بہ میخانہ

جگن ناتھ آزاد

دیارِ حسن

ادھر ہیں عشوہ فروشانِ عارض و گیسو
ادھر وہ ہیں جو نگارِ صبا خرید چکے

ضیائے عارض و رنگِ قبا خرید چکے
دیارِ حسن بہ نامِ خدا خرید چکے

تبسم لبِ لعلیں نگار ان کا ہے
جمالِ زہد شکن برملا خرید چکے

نہ صرف جنبشِ ابرو و تابشِ گیسو
بدن بدن سے یہ ظالم ادا خرید چکے

نہ صرف نغمۂ رنگیں نہ صرف سازِ ادا
گلوئے لعل و نشاطِ نوا خرید چکے

خلوصِ عشق نہیں ان کے دسترس میں تو کیا
کرشمۂ نگہِ سرمہ سا خرید چکے

چھلکتی آنکھوں کی سرمستیوں کا ذکر نہیں
کفِ جمیل سے تابِ حنا خرید چکے

وہ اک ادا جسے عالم میں انتخاب کہیں
یہ اس کا حسنِ نظر آزما خرید چکے

وہ عشوہ گر جسے درسِ وفا بھی مل نہ سکا
یہ اس کی لغزشِ پائے وفا خرید چکے

بزعمِ سیم و جواہر بہ زورِ حیلۂ و فن
غرورِ عشوۂ و بندِ قبا خرید چکے

کہاں ہیں کشتیٔ آدم کے ناخدا دیکھیں
کہ تاجرانِ زر و سیم کیا خرید چکے

نامی انصاری

غزل

تارِ امید کہ دل تا بہ نظر ٹوٹ گئے
دل یہ کہتا تھا نہ ٹوٹیں گے مگر ٹوٹ گئے

رات ہم نے انھیں ٹھوکر سے سجا رکھا تھا
کچھ ستارے جو ابھی وقتِ سحر ٹوٹ گئے

ہائے تقدیر کہ ہے گوشِ صدف بے بہرہ
رشتۂ موج میں کتنے ہی گہر ٹوٹ گئے

کون جانے وہ ہیں کس رنگ میں اے خاکِ عدم
بارشِ سنگ سے جو کاسۂ سر ٹوٹ گئے

جلوہ مضراب تھا اور دل میں تھا سازِ الفت
وقتِ نظارہ مگر تارِ نظر ٹوٹ گئے

اے جلال آج سرِ دام تھے ارماں بے بس
ہم نے پرواز کی ٹھانی تھی کہ پر ٹوٹ گئے

مرزا جلال الدین احمد جلال

توہینِ زیست

اسیرِ ذوقِ عبادت ہے عقل سے محرو
نگاہِ علم و خرد اشک ریز اور مغمو
وقارِ زیست کی توہین ہو رہی ہے ا
خود اپنے ہاتھ سے انساں ہے آج تک مظلو

تصویر مری

ہوتی رہی تخریب میں تعمیر مر
آگے رہی تقدیر سے تدبیر مر
اس خالقِ ادراک و تعقّل کی قسم
شرمندۂ معنیٰ نہیں تصویر مر

ابو سعد سعید

غزل

ہنسے تارے تو یادِ رفتگاں تک بات جا پہنچی
گزرتی راہ سے سنگِ نشاں تک بات جا پہنچی

خزاں سے جب بہارِ گل چکاں تک بات جا پہنچی
ارادے جاگ اٹھے نظمِ جہاں تک بات جا پہنچی

خمارِ انتہا حیاتِ رائیگاں تک بات جا پہنچی
سرور و کیف سے سوزِ نہاں تک بات جا پہنچی

نگاہیں یوں اٹھیں اور آشیاں تک بات جا پہنچی
مسرت کی مآلِ جانستاں تک بات جا پہنچی

تری یاد آئی اور بجھنے لگیں تاروں کی قندیلیں
زمیں سے اڑتے اڑتے آسماں تک بات جا پہنچی

چمن والو تخیل کی اڑانیں تا بہ کے آخر
گلوں کے ذکر سے چل کر خزاں تک بات جا پہنچی

غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ، غمِ دوراں، غمِ فردا
نگاہوں سے شروع ہو کر کہاں تک بات جا پہنچی

ترا ملنا حقیقت تھا، حقیقت رہ بھی سکتا تھا
کرو دنیا کو کیا وہم و گماں تک بات جا پہنچی

جنوں تو تھا شراب و رقص و نغمہ کا تو اے احقرؔ
غمِ پنہاں سے آگہیِ جہاں تک بات جا پہنچی

احقر کاشی پوری

غزل

حسن والے دیکھتے ہی رہ گئے
عشق والے ہر مصیبت سہہ گئے

اشک آنکھوں میں تڑپتے رہ گئے
کچھ نہ کہہ کر بھی تو سب کچھ کہہ گئے

وہ اُدھر طوفان و کشتی کا وصال
اور اِدھر ساحل تڑپتے رہ گئے

رک گئے تو چلتے دریا تھم گئے
بہہ گئے تو چاندنی میں بہہ گئے

ہائے اس بے غیرتی کے دور میں
آج تک ہم کیسے زندہ رہ گئے

اس قدر دشواریوں کے باوجود
عشق کے جذبے سلامت رہ گئے

ان جیالے حوصلوں کا کیا جواب
جو شبِ فرقت کے صدمے سہہ گئے

افسر آذری

رباعیات

دروازۂ دل کی کھول دینا زنجیر
آتا ہے محبت کی قلمرو کا سفیر
اصنام کے سینوں میں ہے دھڑکن پیدا
کیوپڈ کی کماں سے چھوٹنے کو ہے تیر

جادہ کا پتہ ملا نہ منزل کا پتہ
کشتی کا پتہ ملا نہ ساحل کا پتہ
اپنا کے تجھے ملا یہی اے غم دوست
اپنا ہی پتہ ملا نہ ہی دل کا پتہ

پیمانہ بڑھا کے ہاتھ کیوں روک لیا
خیام کی سوگند یہ کیا تو نے کیا
حدت سے بہت پلا! پلا دے
رگ رگ میں غم عشق کا جلتا

وہ پہلی نظر وہ بانکپن وہ نکھار
چمکا افقِ دل پہ محبت کا شرار
آنے لگیں ہوش کو جنوں کی نیندیں
اب عقل و خرد کی کون سنتا ہے پکار

فخرالدین ا

عشق منزل نہیں ہے رستہ ہے

یہ تصور میں کون بستا ہے
دیکھئے جس کو دل ترستا ہے

راہ میں ان کی جان کا سودا
کوئی مہنگا نہیں ہے سستا ہے

حسن کا ذکر اور ان کا خیال
گویا تیر از کماں بجستہ ہے

نظر ان کی پڑی نہیں شاید
شوق ابھی تک یہ پائے بستہ ہے

امتحانِ وفا نہیں آساں
اک کسوٹی پہ کوئی کستا ہے

یہ خلاصہ ہے قصۂ غم کا
دل محزوں خراب و خستہ ہے

ق کو پاتے ہیں شوق احمد میں
عشق منزل نہیں ہے رستہ ہے

تہنیت کاش پھر وہیں پہنچیں
جی حرم کے لئے ترستا ہے

تہنیت

پنڈت کیفی

استاذ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اردو کے ان خدمت گزاروں اور محسنوں میں سے تھے جو اپنی ہمہ جہتی خوبیوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے اس زبان کی تاریخ میں زندۂ جاوید سمجھے جائیں گے جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ ہی اب بدل گیا۔ ان کے وفات سے اردو دنیا ایک ایسے محسن سے محروم ہوگئی ہے جس کا بدل ملنا ممکن نہیں ہے۔ وہ نمونہ تھے اس تہذیب اور شائستگی کا جو اردو پیدا کرسکتی تھی۔ اردو کی ہمہ گیری، لوچ، شگفتگی، رعنائی، رواداری اور حفظِ مراتب کے وہ ایک سچے نمائندہ تھے اور اردو کا ایک ایسا پختہ ذوق ان کی ذات میں رچا اور بسا ہوا تھا کہ زمانہ کے انقلاب اور سیاست کی کروٹیں اس پر اثر انداز نہ ہوسکتی تھیں۔

وہ اس زبان کے رموز و عوامض سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس کی ساخت اور فطرت کو سمجھنے اور سمجھانے میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی مضامین قلمبند کئے اور وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے اور آخرکار "کیفیہ" کے نام سے یہ مضامین کتابی صورت میں بھی چھپ گئے۔ "کیفیہ" اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے پہلا باب "اردو زبان کا تاریخی مطالعہ" لسانیاتی کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے حروف تہجی، لفظ، اسم، تذکیر و تانیث، حرف، مصدر، فعل، روزمرہ، محاورہ، کلام، اسلوب، عروض، خطابیات، خط و کتابت اور املا جیسے متفرق موضوعوں سے بحث کرتے ہیں۔

کیفی کا اسلوب لسانیاتی سے زیادہ انشاپردازانہ تھا اور انشاپردازی پر ان کی شان نمایاں تھا۔ وہ بیک وقت نحوی اور عروضی بھی تھے اور ادیب و شاعر بھی۔ ان میں سے ہر ایک برابر کی اہمیت اور شہرت حاصل تھی۔ اردو میں شاعر، ادیب، ماہرین لسانیات اور عروض کے جدا جدا ماہر پیدا ہوتے رہیں گے لیکن شاید ہی کوئی ایسا پیدا ہو جو ان سب میں

حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہیؒ

از:۔ مولوی شیخ فرید صاحب (برہانپوری) ایم اے

نام و نسب حضرت شیخ برہان محمد نام۔ لقب "راز الٰہی" اور عرف "برہان الدین اولیا" ہے۔ ان کے والد بزرگوار شیخ کبیر محمد بن علی الصدیقی گجراتی شطاری اور والدہ معظمہ سیدہ فاطمہ حسینی تھیں۔ لہٰذا حسباً و نسباً وہ صدیقی الحسینی تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کا وطن گجرات تھا۔ ان کے والد شیخ محمد کبیر نے اپنے وطن مالوف سے ہجرت کر کے صوبۂ خاندیس میں سکونت اختیار کی۔ صوبہ خاندیس کے پرگنہ "بودود"[1] کے ایک موضع راجھنی میں ۹۹۸ھ میں وہ پیدا ہوئے۔ برہانپور میں نشو و نما پائی۔

"حضرت شیخ برہان الدین بن کبیر محمد بن علی الصدیقی الگجراتی الشطاری الملقب براز الٰہی۔۔

قد اجتبیت من الکون نور لقابہ — و سالت عن الکون و فور لقایہ

بہ حسب و نسب والد بزرگوار صدیقی اند۔ والدہ معظمہ مکرمہ حضرت سیدہ بودہ و فاطمہ نام داشتہ۔۔۔

مولود شریف حضرت ایشان موضعے از مواضع خاندیس است و نشو و نما در شہر برہانپور یافتہ اند"[2]

"فیض حق" سے سال ولادت برآمد ہوتا ہے۔ لب الدقائق اور مناقب راز الٰہیؒ کے مصنف محمد یوسف بن محمد طاہر نے لکھا ہے کہ خاندیس میں نشو و نما پائی۔۔۔

گشت از و خاندیش جلوہ فزا — یافت در خاندیش نشو و نما ع

تعلیم و تربیت انھوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے عم بزرگوار سے حاصل کی۔ شیخ علم اللہ کمالؒ سے حدیث، فقہ اور سلوک کی تعلیم حاصل کی۔ علوم ظاہری کی تحصیل کے ساتھ ساتھ طلب حق کا جذبہ بھی ان میں موجزن تھا۔ لہٰذا جب علوم ظاہرہ کی تکمیل کے بعد داعیہ حق غالب آیا تو مرشد کامل کی تلاش میں حضرت [illegible] کی خدمت میں پہنچے [illegible] ان سے بیعت کی اور ذکر نفی و اثبات کی تلقین کی اور اس سے فوائد پائے۔

---

[1] بودود۔ برہانپور کے قریب ایک مشہور پرگنہ ہے۔ راجھنی [illegible]

ثمرات الحیات (ملفوظات حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی) — مرتبہ [illegible]

لب الدقائق (ملفوظات حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی) — مرتبہ محمد [illegible]

مناقب راز الٰہی (منظوم سوانح حضرت راز الٰہی) — از محمد یوسف

مناقب راز الٰہی (قلمی) —

[2] علم اللہ کمال — اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ حدیث اور فقہ میں [illegible]

[illegible] حضرت [illegible] کے ملفوظات [illegible] ملفوظات علم اللہ [illegible]

[illegible] حسین خیابانی — [illegible] مشہور۔ ان کے [illegible]

[illegible] باطنی سے مستفیض [illegible]

تلقین کے بعد حضرت ملک حسین نبہانی کے مدرسہ میں دن رات ذکر و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ اس شغل میں ان کو ایک گونہ حاصل ہوتی رہی[1] کچھ عرصہ کے بعد حضرت حسین نبہانی سیر و سیاحت کے لئے باہر چلے گئے۔ رشد و ہدایت کے لئے جب مرشد کی شدید ضرورت ہوئی تو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی[2] کی وساطت سے حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے۔ پہلے عبدالقدوس نے پانچوں نہ کی خلافت عطا کی اور حضرت شاہ مسیح الاولیا[3] کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے اور تقریباً پند ان کی خدمت میں رہے۔

ابتدا تحصیل علوم ظاہری اشتغال فرمودند۔ چوں داعیہ طلب حق غالب آمد۔ بخدمت قدوۃ المحققین شیخ عیسیٰ ...... قدس اللہ سرہ الاعلیٰ رجوع نمودند و ارادت درست کردند و سہ ست
پانزدہ سال در ملازمت حضرت شیخ بودند۔[4]

ایک روز حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ نے اپنے تمام مریدوں کی موجودگی میں خرقۂ خلافت عطا کیا۔ اپنے مرشد کے حکم سے و کی رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے۔ ریاضات و مجاہدات شاقہ کی شدید مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اعلیٰ روحانی مراتب طے مختصر عرصے میں ان کی رشد و ہدایت، کشف و کرامت، زہد و تقویٰ، رضا و تسلیم اور توکل و قناعت کا دور دور تک شہرہ پھیل گیا۔ ان عقیدتمندوں میں عوام کے علاوہ خواص جن میں امراء، سلاطین اور شہزادگان بھی شامل تھے۔ اکثر لوگ ملاقات کا شرف اور سعادت کرنے کے منتظر رہتے تھے اور انھیں موقع نصیب نہ ہوتا تھا۔ صوبہ برہانپور کے حاکم ـــ امیر بیگ ـــ دکن کے عامل ـــ عاقل رازی ـــ اور شہزادہ اورنگ زیب ان کے خاص معتقدین میں سے تھے۔ توکل و استغنا کا یہ عالم تھا کہ لوگ نذر نذرانے اور وہ ان کو قبول نہ کرتے تھے۔ امیر بیگ نے خانقاہ کی تعمیر کے لئے التماس کیا مگر حضرت موصوف نے انکار کر دیا۔[5]

اورنگ زیب حضرت شاہ راز الٰہی کے حضور میں

حضرت شاہ راز الٰہی صاحبان جاہ و حشم اور اہالیان ۔ ۔ ملاقات کرنا آئین درویشی کے خلاف سمجھتے تھے۔ شہزادہ ا۔ کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔ پوشیدہ طور پر وہ رات کو ان کی مجالس وعظ میں شریک ہوتا تھا۔ اور تبرک حاصل کر کے خوش اور ذیل کا شعر پڑھتا تھا ؎

اگر تو در برانی بہ عتاب و سربلندی   ز در دگر در آیم بہ ہزار دردمندی

دارا شکوہ کے مقابلے کے لئے برہان پور سے روانہ ہوتے وقت اورنگ زیب ایک دن بھیس بدل کر حضرت،

---

[1] ملفوظات علم اللہ کمال (قلمی۔ کتب خانہ درگاہ راز الٰہی)

[2] حضرت شیخ عبدالقدوس ـــ حضرت مسیح الاولیا کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حضرت راز الٰہی سے ان کو بہت محبت تھی۔ سندھ میں قرار ہے۔

[3] حضرت مسیح الاولیا ـــ شیخ محمد قاسم کے صاحبزادے تھے۔ علم و فضل میں مشہور۔ ظاہری علوم سے متصف ہونے کے علاوہ مراتب بھی حاصل کر لئے تھے۔ حافظ، قاری، شاعر، مجید عالم اور صوفی تھے۔ کئی تصانیف کے مالک ہیں [illegible] میں وصال ہوا

[4] قرۃ الحیات قلمی (ورق ۲ الف)

[5] ملفوظات محمد یوسف (قلمی)

مجلس میں شریک ہوا۔ حضرت نے نووارد کو دیکھ کر نام دریافت کیا۔ اور یہ معلوم کرکے کہ شہزادہ شریک مجلس ہے خاموش ہو گئے لیکن تبرک نہیں دیا۔ اورنگ زیب دوسرے دن پھر خانقاہ میں پہنچا۔ حضرت نے آزردہ ہو کر کہا کہ "اگر یہ مکان تم کو پسند ہے تو لے لو ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔" شہزادہ خاموش واپس لوٹ گیا۔

اس کے بعد حضرت شیخ نظام (مرتب فتاویٰ عالمگیری) کی وساطت سے صبح کی نماز کے وقت حضرت کی خدمت میں پہنچا۔ اور مودبانہ عرض کی کہ "دارا نے شریعت اسلامی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مجھ کو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکامات کے ساتھ رعیت پروری بھی کروں گا۔"[۱]

حضرت شیخ برہان نے کہا۔ "ہم فقیروں کی دعاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ تم بادشاہ ہو۔ نیکی، عدل اور رعایا پروری کی نیت کے ساتھ دعا کرو۔ ہم بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں:"

"از فاتحہ فقیراں چہ حاصل! شما بادشاہ اید۔ باید فاتحہ بقصدِ عدالت و رعیت پروری بخوانید۔
ماہم بہ رفاقتِ شما دست بہ دعا و فاتحہ بر می داریم۔"[۲]

رشد و ہدایت

کمالِ زہد و تقویٰ اور روحانی عظمت کا یہ عالم تھا کہ ایک دنیا ملاقات کی منتظر رہتی تھی۔ عوام کے علاوہ امراء اور سلاطین بھی ان کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔

حضرت راز الٰہی ہمیشہ ذکر و عبادت، رشد و ہدایت اور درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ اکثر رات میں مریدوں کو رشد و ہدایت کیا کرتے تھے۔ اس "حلقہ درس" میں عوام کے علاوہ خواص اور صاحبانِ منصب و جاہ بھی شریک ہو جاتے تھے۔ اکثر طالبات ایسے "فیوضاتِ حقائق ترجمان" کو مرتب کرتے جاتے تھے۔ روائح الانفاس، ملفوظ عالی (مرتبہ علم اللہ کمالی) لب اللہ قادر (مرتبہ محمد یوسف) مرآت الحیات (مرتبہ عاقل خان رازی) چند اہم ملفوظات ہیں۔ ملفوظ عالی کا ایک نسخہ ۱۰۸۶ھ میں تحریر ہے کہ کتب خانہ راز الٰہی (برہان پور) میں محفوظ ہے۔

عاقل خان رازی نے لکھا ہے کہ:-

"چون بعضے اوقات ایں کمترین بہ مضمون ہدایت مشحون آیۂ کریمہ فسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون متمسک شدہ بجناب ارشاد مآب آں حقائق پناہ دقائق آگاہ جراءت بر عرض سوال می نمود و آنحضرت ادائے حضرت البیان بحکم آنکہ و للارض من کاس الکرام نصیب کہ مشتمل بر ترتیب طلاب و تحمل بر تقویت اصحاب صادقی فرمودند۔ بنا بریں آں جواب با صواب و کلمات فائق البرکات را برائے انتفاع ارباب قبول سوائے انتفاع الطالب و فضول مجموعہ تالیف داد و مرآت الحیات نام نہاد۔"[۳]

ملفوظات علم اللہ کمالی میں ایک جگہ ہے کہ ایک مرتبہ شہزادہ اعظم مجلس میں شریک ہوا اور مجلس ختم ہونے کے بعد پانی دم فرمانے کی التجا کی۔ کسی مرید نے اسی ظروف سے پانی لانا چاہا جو فقیروں کے لئے تھا۔ حضرت نے منع کر دیا۔ جو پانی شہزادہ اپنا لایا اس پر آپ نے دم کر دیا۔

---

[۱] منتخب اللباب ص ۵۵۵ (خافی خاں)

[۲] مجموعہ ص ۲۲

[۳] مرآت الحیات [illegible]

تعمیر مسجد و خانقاہ اپنے پیر و مرشد حضرت مسیح الاولیاء کے اتباع میں ایک مسجد بغیر صحن کے بنائی۔ ایک عرصہ تک وہ خود امامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد میں شیخ عبدالرحیم خوش نویس امام مقرر ہوئے۔ ان کے بعد میران سید عبداللطیف، حافظ احمد، شیخ محمد اور حافظ محمد یوسف کشمیری اور حضرت شہاب الدین ابن حضرت شیخ محمد محدث یکے بعد دیگرے امامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

گوشہ نشینی۔ علالت اور وفات آخر عمر میں جب ان کے قویٰ بالکل کمزور اور مضمحل ہو گئے تو انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مگر رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر ایام میں وہ بیمار ہو گئے۔ بیماری کی شدت بڑھتی گئی اور خدام پورے انہماک سے تیمارداری میں مصروف رہے مگر حضرت فرماتے رہے کہ "رحمت اللہ کافی ست۔"

آخر کار چارہ سازوں کی تمام تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں اور وقت موعود آپہنچا۔ پچاسی سال کی عمر میں ۱۵ ر شعبان ۱۰۸۳ھ کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔ خافی خاں نے منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ جنازہ کے ساتھ لوگوں کا بڑا اژدحام تھا۔

مزار ان کا مزار سندھی پورہ میں ہے۔ پہلے مزار پر ایک معمولی عمارت تھی۔ موجودہ سجادہ نشین حضرت سید حبیب الدین صاحب کے بزرگ سید ریاض الدین صاحب نے اپنی جیب خاص سے کافی رقم صرف کر کے ۱۹۲۲ء میں ایک مضبوط اور شاندار گنبد تعمیر کروایا ہے۔ ہر سال عرس ہوتا ہے۔ مسجد مقبرہ کے سامنے مغربی رخ پر ہے۔ مسجد اور مزار کے درمیانی میدان کے مقابل جنوبی رخ پر خانقاہ ہے۔ اس کے ایک حصہ میں کتب خانہ ہے۔ جس میں قلمی نوادرات محفوظ ہیں۔

خلفاء اور اولاد حضرت راز الٰہی کے کئی خلیفہ تھے۔ ان میں حضرت شاہ نور اللہ شکر گوٹھی۔ حضرات سید احمد شطاری گجراتی خدا نما۔ سید محمد شطاری۔ محمد یوسف۔ علم اللہ کمال۔ شاہ نور رمز الٰہی مشہور ہیں۔

شیخ عبدالعزیز (متوفی ۱۱۱۱ھ) حضرت کے خلف الصدق صاحب فضل و کمال تھے۔ ان کے دو فرزند کریم اللہ رازی اور بابا رحمت اللہ تھے۔

حضرت راز الٰہی کے ایک صاحبزادے حضرت دیوان صاحب کا انتقال ۱۲۲۴ھ میں ہوا۔ کتب خانہ درگاہ میں محفوظ ایک بیاض میں حضرت دیوان صاحب کی تاریخ وفات کے دو قطعات درج ہیں۔

سال تاریخ وفات حضرت دیوان صاحب فرزند حضرت برہان مرحوم قدس اللہ سرہٗ

قطعہ نمبر ۱

ختم اولاد شاہ راز الٰہ | بود دیوان صاحب تنہا
کرد رحلت ازیں جہاں تاریخ | بست و سوم شوال و یوم ثلثا
سال ہجری دراں زماں بود | الف و چہل و چہار وہ و دو بابا

۱۲۴۴ھ

قطعہ نمبر ۲

خلف شاہ برہان راز الٰہ | بود دیوان صاحب از اولاد
سال تاریخ آں فرشتہ منش | کردہ حاذق بہ عمر ایں ایجاد
یک ہزار و دو صد چہل و چہار | روز سہ شنبہ رفت آں ...... ملا
ماہ شوال بست و سوم بود | کرد رحلت بہ کو بہشت فریاد

علامہ شبلی کے غیر مطبوعہ مکاتیب

بنام مولانا مفتی شیر علی صاحب کوچہ میر معانی حیدر آباد دکن

جناب من — استفتاء نامہ سامی پہنچا۔ میرے نزدیک آپ کا جواب قرین صحت ہے مگر چونکہ میں نے افتا کا کام مدت سے چھوڑ دیا ہے اور اب اپنے تئیں اس منصب بزرگ کے قابل نہیں سمجھتا اس لئے دستخط کرنے کی جراءت نہیں ہوتی۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے اور بزرگان دین کے ہوتے میری کیا حاجت ہے۔ والسلام

یکم نومبر ۱۸۹۶ء

شبلی (علیگڈھ)

مولانا

تسلیم — آپ کی تکلیف فرمائی کا بدل مشکور ہوں۔ آپ نے جو شکایت کی ہے یہ تو میرے ہی دل کا زخم ہے لیکن کیا کروں۔ وسو طرح مدرسوں کو ابھارا خود جاکر درس میں بیٹھا۔ پڑھا کر بتایا۔ اعتراضات کئے جواب مانگے لیکن وہ جگہ سے نہیں ہلتے۔ سخت کوفت ہوتی ہے لیکن کیا کیا جائے آشنائے فن تمام ملک میں ناپید ہیں اور ذوق علمی کا پتہ نہیں۔ مجبوراً میں نے ادب کو مطمح نظر بنایا ہے۔ جدید مدرسین میں ایک عرب ادیب مقرر کیا ہے۔

مجھ کو فرصت ہوتی تو خود کچھ کرتا لیکن یک سر وہزار سودا موجودہ تصنیف جب تک ختم نہ ہولے کوئی کام نہیں چھیڑ سکتا۔ یورپ ... عمر خیام کا جبر و مقابلہ چھاپا ہے اس نے بہت مسائل قدما پر اضافہ کئے تھے۔ فرنچ زبان میں ترجمہ اور ریویو بھی کیا ہے۔ والسلام

نو ۔ ۲۳ جولائی ۱۹۰۹ء

شبلی

مکرمی

السلام علیکم — کیا آپ دار العلوم ندوہ کی پرنسپلی بہ مشاہرہ (۱۰۰) بہ شرط ترقی قبول فرما سکتے ہیں۔ مشاہرہ تو ابھی کم ہے لیکن وسیع کام ہے اور ہر طرح کی اصلاح کا موقع ہے۔ مشاہرہ بھی ضرور بڑھے گا آمدنی کے ساتھ۔

۱۳ اگست ۱۹۰۹ء

شبلی (ندوہ)

یہ فقط رسیدی خط ہے۔ جواب ایک ہفتہ میں عرض کروں گا۔

۱۹۰۹ء

شبلی (...)

کرمی ـــــ میں حیدرآباد آرہا تھا اور آپ کو وہیں سے لکھنؤ روانہ کرتا لیکن انقلاب حال نے روک دیا۔ ۱۰ر شوال سے مدرسہ کھل جائے گا۔ آپ اس وقت ضرور بالضرور لکھنؤ پہنچ جائیں۔ میں وہاں ہوں یا نہوں۔ ہاں ایک بات محض بہ غرض احتیاط لکھ دینا ضروری ہے وہ یہ کہ مولوی حفیظ اللہ صاحب اگرچہ مستقل نوکر ہو کر ڈھاکہ گئے ہیں لیکن انگریزی میں قاعدہ ہے کہ برائے نام پہلے تقرر میں ایک عارضی مدت رکھی جاتی ہے اس بنا پر مولوی حفیظ اللہ چار مہینے کے لئے گئے ہیں لیکن آپ کی تقرری قطعی ہے آپ ہرگز پس و پیش نہ کیجئے گا۔ فوراً تشریف لائیے گا یعنی ۱۰ر شوال تک۔ جواب لکھنا ہو تو پالن جی موتی بھائی کھڈ بمبئی کے پتے سے لکھئے گا۔

شبلی

۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۹ء

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ۱۰ر شوال تک آپ لکھنؤ تشریف لائیں۔ دفتر ندوہ میں تار دیدیجئے گا۔ اسٹیشن پر کوئی جاکر آپ کو لائے گا۔ آپ کے قیام کے لئے مکان وغیرہ کا بندوبست کردیا جائے گا۔

شبلی نعمانی

۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۹ء

مولانا

رمضان میں مدرسہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص وجہ تھی یعنی ارکان ندوہ نے ایک اور صاحب کا نام پیش [illegible] اور مجھ کو ان پر اتمام حجت کرنا تھا۔ میں انشاء اللہ دو ہفتہ میں قطعی خط لکھونگا۔

شبلی

۴ر نومبر ۱۹۰۹ء

جناب مولانا مہتمم صاحب زید مجدکم

ان دو بچوں کو دارالعلوم میں پڑھانا مقصود ہے۔ امتحان لے کر تعین کر دیا جائے کہ کس کلاس کے قابل ہیں۔ چونکہ بور[illegible] جگہ نہیں اس لئے دونوں باہر رہیں گے۔

شبلی

یکم دسمبر ۱۹۰۹ء

جناب من

عبدالرحمن رنگونی سے دریافت فرمائیے کہ وہ ۱۰ بجے آغا خاں صاحب کے پاس گئے تھے یا نہیں اور کیا جواب ملا۔ آغا [illegible] کے ہاں سے شاید کوئی جواب آیا ہو دریافت فرما کر لکھئے۔

شبلی

یکم فروری ۱۹۱۰ء

مطبع مجتبائی، دہلی

مولانا

اور بسر کر سکتے۔

افسوس ہے کہ بر آورد بن کر نہیں آئی۔ مارچ کا مہینہ گزر گیا تو سرکاری رقم متعلق مولوی طیب صاحب نہ مل سکے گی۔

۱۸؍ مارچ ۱۹۱۰ء

شبلی

مولانا

گورنمنٹ اب اپنی رقم پر متوجہ ہوئی ہے اور کلاسوں اور سبقوں کی جانچ پڑتال کرے گی۔ مولوی شیخ محمد صاحب کے گھنٹے اس قدر کم ہیں کہ ان کی تنخواہ دینے میں گورنمنٹ کو تامل ہوگا۔ اس لئے متنبی، مقامات حریری وغیرہ کے سبق ان سے متعلق کرنے چاہئیں۔ اس کے علاوہ ان کے دو گھنٹے مدرسہ میں اس کام کے لئے رکھئے کہ کتب درجۂ تکمیل مثلاً دواوین غیر درسی کا فرہنگ لغات بنائیں اور حل الابیات لکھیں۔ ان تحریروں کو انگریزی طریقۂ درس میں لیکچرز کہہ سکتے ہیں۔ مذہبی پابندی کے انتظام میں کوئی ترقی محسوس ہوئی ہے یا نہیں۔

الہ آباد۔ بچم کی گئی۔ ۴؍ اپریل ۱۹۱۰ء

شبلی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰؍ صفر ۱۳۲۸ھ

بخدمت جناب مولوی **شیر علی صاحب**

جناب مولوی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ امسال کتب ذیل کا امتحان آپ لیجئے اور پرچے تیار کر کے یکم اپریل تک براہ مہربانی میرے پاس بھیج دیجئے یہ ہے اس تکلیف کو درگزر فرمائیے۔

شرح حکمۃ الاشراق
از مکو منہ فی شرح جمع اتباع
الشافعین تا شش اقامہ فرضیہ

شرح حکمۃ العین نظم العلوم
مقالہ اول کامل

ہدایہ جلد رابع
تصحیح کتاب الکراہیۃ باب خطر
اباحۃ کتاب ابو حنیفہ

۱۔ فی کتاب (۸) سوال سے کم اور (۱۰) سوال سے زائد نہ ہوں۔
۲۔ وقت امتحان کی تعیین کر دی جائے۔
۳۔ نمبر مفروضہ (۱۰۰) رکھے جائیں۔
۴۔ ہر سوال کے محاذی اس کے نمبر لکھ دیئے جائیں۔

شبلی

جناب مولانا

درخواست رخصت کی۔ منظور ہو کر درج رجسٹر کی گئی لیکن اب فرزند تشریف لے آئے ہوں تو اطلاع دیجئے۔ ورنہ ...

ماہ ۱۹۱۰ء

شبلی

جناب من

بذریعہ تار کے مطلع فرمایئے کہ آپ واپس آئیں گے یا نہیں۔

یکم مارچ ۱۹۱۱ء لکھنؤ

شبلی

جناب من

آپ کو شاید میرا خط نہیں ملا۔ آپ کے جانے کا سخت افسوس ہے۔ کوئی بھی نعم البدل نہیں مل سکتا۔ ۱۶/اپریل کو یہاں جو انتظامیہ ہے۔ اس میں یہ فیصلہ ہوگا مخالفین تو مولوی حفیظ اللہ کو بلانا چاہتے ہیں۔

آپ سر دست درخواست رخصت بیماری مع سرٹیفکٹ بھی بھیج دیجئے۔

۳/اپریل ۱۹۱۱ء

شبلی

جناب مولانا

عجب اتفاق ہے جب آپ کی درخواست رخصت بیماری آئی میں سخت علیل اور صاحب فراش تھا۔ اسی گڑبڑ میں وہ درخ[illegible] کھو گئی۔ براہ عنایت اس کی نقل دوبارہ بھجوا دیجئے یا جدید درخواست۔ مولوی عبد اللہ ٹونکی کچھ جواب نہیں دیتے۔

لکھنؤ۔ ۲۰/اپریل ۱۹۱۱ء

شبلی

جناب مولانا شیر علی صاحب دام مجدکم

کوچۂ میر معانی۔ حیدر آباد دکن۔

مولانا

دار العلوم کی حالت نہایت قابل رحم ہے۔ ٹونکی وغیرہ کوئی نہیں آتے۔ آپ ہی رحم فرمایئے۔ مشاہرہ میں ۲۵ کا اضافہ اور سبق آپ اپنی مرضی کے مطابق جس قدر آپ پڑھا سکیں بورڈنگ وغیرہ کے اہتمام سے سبکدوشی۔ عہدہ وہی پرنسپلی۔ اس[illegible] تو درخواست منظور فرمایئے۔ جو رائے ہو فوراً بلکہ بذریعہ تار کے مطلع فرمایئے۔ عنقریب مجلس منعقد ہوگی اور کوئی انتظام قطعی ہوگا۔

جولائی ۱۹۱۱ء

جناب مولانا

تسلیم — یاد آوری اور مبارکباد کا شکریہ۔ افسوس یہ ہے کہ سیرت نبوی کا کام [illegible] کیا کہ آ[illegible] اتر آیا یعنی آنکھ بالکل بیکار ہے۔ گو ابھی قدح کے قابل نہیں۔ دہنی پر بھی زور پڑتا ہے۔ تاہم قصد ہے [illegible] ہو سکے کا[illegible] افسوس ہے مجھ کو املا کی عادت نہیں۔ ورنہ لکھوانا آسانی سے ممکن تھا۔ ندوہ کی عمارت نہایت عمدہ [illegible] ہو چکے۔ ۲۵ ہزار کی اور ضرورت ہے۔ اب کے گیارہ ہزار کا چندہ بھی ہوا۔ ایک رئیس نے (۵۰) ماہوار بھی مقرر کئے۔ ندوہ زیادہ کامیاب ہوتا لیکن دوستوں کی عنایت بحال خود باقی ہے۔ مولانا اور شاہ صاحب کسی کام کو چلنے [illegible]

خیر خدا سب کا مالک ہے۔ آپ کی یاد مدرسہ کی در و دیوار تک کو نہیں بھولی۔

ع عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

۲؍اپریل ۱۹۱۳ء

شبلی

مولانا

سلام مسنون۔ — کتاب پہنچی لیکن یہ تو ادب کی کتاب ہے۔ آپ نے جس کتاب کا ذکر فرمایا تھا یعنی ترار: پردہ تو یہ نہیں ہے۔ کیا یہ کتاب غلطی سے آ گئی ہے۔

بمبئی۔ ۵؍جولائی ۱۹۱۳ء

شبلی

مولانا

آپ کے تشریف لے جانے پر کئی دن سناٹا رہا۔ کتاب مذکور قدیم تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس کے مضامین اسی قسم کے ہیں جیسے کہ میزان الحکمۃ کے۔ سب لوگ سلام نیاز عرض کرتے ہیں۔

شبلی

بمبئی۔ ۱۶؍جولائی ۱۹۱۳ء

جناب مولانا شیر علی صاحب دام مجدکم

تحیۃ و سلام — ان چند مظلوموں کی عرضی اس خط میں ملفوف ہے۔ آپ اگر جناب مولوی انوار اللہ خاں صاحب سے یا جس مناسب صورت سے ممکن ہو مولوی صاحب موصوف کو دیں کہ اعلیٰ حضرت تک پہنچا کر داد رسی کرادیں تو داخل حسنات اور شکر گزاری ہوگا۔

واقعی یہ مظلومین موجب رحم اور اعانت ہیں۔

۱۹۱۳ء

شبلی نعمانی

تسلیم — وہ کام ہوگیا اب تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔

۔۔ اگست ۱۹۱۳ء

شبلی

مولانا — میرا ان معاملات میں ہاتھ نہیں ہے۔

۔۔ ۱۹۱۳ء

شبلی

ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر حیدرآباد

کرمی

تسلیم — مشکور یاد آوری ہوں لیکن علیل ہوں۔ اس وقت صرف ذیل کی سطریں حاضر کرسکتا ہوں۔

مشیر نسواں

یہ کتاب ایسی حالت میں مجھ کو ملی کہ پیہم تین راتوں سے نیند نہیں آئی ہے اور دماغ بالکل بیکار ہو رہا ہے۔ تاہم کتاب کو جا بجا سے دیکھا۔ مجھ کو ہرگز توقع نہ تھی کہ ہمارے زمانے کی مخدرات ایسی قابلانہ مفید، دلچسپ اور وسیع کتابیں تصنیف کر سکتی ہیں۔ یہ کتاب محاسن سے مملو اور معائب سے بالکل پاک ہے۔

۷ر مارچ ۱۹۱۳ء

شبلی

ہم لوگ نیلام میں جا رہے ہیں اگر آپ کے سونے یا کسی اور کام کا وقت نہ ہو تو چلئے۔

۱۶ر اکتوبر ۱۸۹۸ء

شبلی

ماہنامہ

فاران

کا

معرکتہ آرا سیرت نمبر جنوری ۱۹۵۶ء میں آرہا ہے

ایک ایک مقالہ نظر افروز۔ ایک ایک نظم دلنواز۔ ایک ایک سطر حبِّ رسول کی خوشبو میں بسی ہوئی دین و دانش اور ادب و اخلاق کا گرانقدر مرقع عربی فارسی اور اردو شعراء قدیم و جدید کے نعتیہ کلام کا بے مثال انتخاب ماہر القادری مدیر "فاران" کے برسہا برس کے سوچے ہوئے پروگرام کا نقش جمیل

<u>لکھنے والے</u>:— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا منظور نعمانی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا عبدالقدوس ہاشمی، نعیم صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی (پیرس)، ڈاکٹر فخرالدین (انڈونیشا)، م برام، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر خلیل احمد نظامی۔ پروفیسر عبدالحمید، ڈاکٹر حامد بلگرامی۔ محمد عاصم وغیرہ۔

(دو رنگ کے جدید ترین حسین و جمیل سرورق کے ساتھ)

ضخامت ڈھائی سو صفحات سے زیادہ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

فاران کا سالانہ چندہ چھ روپے، مستقل خریدار صاحبان سے سیرت نمبر کی قیمت نہیں لی جائے گی۔

ماہنامہ فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱ (پاکستان)

ہندوستان میں۔ دفتر "الحسنات" رامپور (یوپی)

نئی پنجابی شاعری

از: جناب کرتار سنگھ صاحب دگل

ہندوستان کی نئی زبانوں میں پنجابی زبان اپنی شاعری کی وراثت پر فخر کر سکتی ہے۔ پنجابی شاعری شیخ فرید شکر گنج، گرونانک، شاہ حسین، بلھے شاہ جیسے خدا رسیدہ فقیروں، سنتوں اور صوفیوں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ گرونانک کی شاعری میں ہر اعتبار سے بہترین شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ ہیئت اور تکنیک کے لحاظ سے ہم نے جتنے بھی شکل اور نئے تجربے کئے ہیں ان کے بہترین نمونے پہلے سے ہی گرونانک کی شاعری میں موجود ہیں۔ جذبات کے اظہار کے مطابق نظم کی سطروں کا پھیلنا، سکڑنا، بول چال کے ڈھنگ کے وزن۔ ایک موضوع سے دوسرے موضوع تک پڑھنے والے کو تیار کئے بغیر ہی چلے جانا، یہ سب خصوصیات گرونانک کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک مدت سے پنجابی ادیب یہ بات تسلیم کرتے آئے ہیں کہ فقیروں، سنتوں، صوفیوں اور عاشقوں کے آپ ہمارے بول [illegible] رکھے ہیں چاہے [illegible] روایتی شاعری کا شوقی نظر آئے [illegible] چاہے وہ شاعر [illegible] کے وزن میں [illegible] گئے ہیں۔

پنجاب کی سرزمین ہمیشہ سے سنتوں، صوفیوں اور فقیروں کو جنم دیتی آئی ہے۔ پنجاب کے [illegible]

کرتا ہے۔ آخر چناب کے کنارے ہی ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحبان کے پریم ناٹک کھیلے گئے۔ وارث شاہ نے بھی اسی دریا کے کنارے ہیر اور رانجھا کے پیار کو اپنی شاعری میں زندہ جاوید کر دکھایا۔

ویسے جسے ہم نئی پنجابی شاعری کہتے ہیں اس کا سب سے پہلا شاعر بھائی ویر سنگھ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ پنجابی زبان کو ایک مدت کے بعد ایک ایسا شاعر نصیب ہوا جسے اپنی روایتوں کی سمجھ سے زیادہ پہچان تھی اور جسے وقت کے تقاضے کا بھی اتنا علم تھا کہ جہاں اس نے روایتی رنگ کی شاعری کے نمونے پیش کئے، وہاں کئی بے خوف اور نئے تجربے بھی کئے۔ بھائی ویر سنگھ میں جہاں [illegible] صوفیانہ انداز ملتا ہے [illegible] رباعی اور [illegible] بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا گیا ہے [illegible] انگریزی شاعری سے [illegible] استعمال بھی [illegible] بھائی ویر سنگھ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی [illegible] شاعر کا [illegible] جس موضوع کا [illegible] کو تجربہ نہیں ہے [illegible] اگرچہ بھائی ویر سنگھ [illegible]

ہر ایک اہل دل کو متاثر کیا تھا۔ لیکن اس شاعر کی آدھی درجن سے زیادہ نظموں کے مجموعوں میں کہیں بھی ان تحریکوں کا ذکر نہیں ملتا۔ کہیں بھی یہ شاعر اپنی نظموں میں اس قسم کی آواز بلند نہیں کرتا۔ "اے فرنگی! اب ہم تمہارے غلام نہیں رہیں گے"۔ ویر سنگھ بار بار اپنے باغیچے کے باغبان کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اسے بھول کر بھی اپنے وطن کے کسان کی یاد نہیں آتی۔ ویر سنگھ گل داؤدی کی تعریف کرتا ہے۔ کشمیر کے چناروں سے بچھڑتے ہوئے اسے رنج ہوتا ہے۔ لیکن گیہوں کی نئی بالیاں کہیں بھی اسے سرشار نہیں کرتیں۔ پکے ہوئے گیہوں کا کندن جیسا رنگ کہیں بھی اس کی نگاہ کو خیرہ نہیں کرتا۔

ویر سنگھ اپنی شاعری کے اعتبار سے ایک سکھ شاعر ہے۔ اپنی شاعری میں وہ جو کچھ بھی کہتا ہے سکھ دھرم کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر کہتا ہے اور یہ بات اس نے کئی جگہ تسلیم کی ہے کہ ان کے نزدیک شاعری سکھ فلسفے کو سمجھانے، اس کی خوبیوں کو واضح کرنے اور سکھ جذبات کے اظہار تک ہی اہمیت رکھتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ نئے نقادوں کی نظر میں ویر سنگھ کی شاعری کی اہمیت موضوع سے کہیں زیادہ ہئیت کے پیش نظر ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بھائی ویر سنگھ نے آج سے (۲۵) برس پہلے اس پائے کا کلام پیش کیا تھا۔

سپنے میں تم ہم سے ملے
ہم نے جھٹ تمہیں گلے لگایا
تم ٹھہرے نرے نور۔ تم ہمارے ہاتھ نہ آئے
ہماری کلائی کانپتی رہ گئی۔

پروفیسر پورن سنگھ کو پنجابی شاعروں کی صف میں لانے کا شرف بھی بھائی ویر سنگھ کو ہے۔ پورن سنگھ ایک سکھ سائنسداں تھے جو اعلیٰ تعلیم کے لئے جاپان گئے۔ اور وہاں ویدانتی ہو گئے۔ جب وہ پنجاب میں لوٹے بھائی ویر سنگھ کی صحبت میں پھر سے سکھ بن گئے اور انھوں نے خود کو پنجابی زبان اور ادب کی خدمت میں لگا دیا۔ پورن سنگھ ایک جذباتی شاعر تھا۔ اس کی تخلیقات میں پنجابی شاعری نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ پہلی بار اس نے پنجابی زبان کو آزاد نظم سے روشناس کرایا۔ "کھلے گھونگھٹ" اور "کھلے میدان" یہ ہیں پورن سنگھ کی آزاد نظموں کے دو مجموعے آج تک ان نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ وزن قافیے اور ردیف کے محتاج ہیں۔ ایک شدید بہاؤ ہے جس کے ساتھ پورن سنگھ کی شاعری پڑھنے والے کو اپنے ہمراہ لے چلتی ہے۔ پورن سنگھ کے کلام سے جیسے دھرتی کی سگندھ آتی ہے۔ وہ کیکر کے پھولوں کا ذکر کرتا ہے۔ کھیتوں میں چرتے ہوئے مویشیوں کا ذکر کرتا ہے۔ بے پردہ انسانوں کا ذکر کرتا ہے۔ یوں اس شاعر نے پنجابی شاعری کو جنتا کی زندگی کے قریب لاکر کھڑا کر دیا۔ وہ ایک مفکر بھی ہے۔ "کھلے گھونگھٹ" میں اس کی شاعری کا تیور کہیں کہیں بہت سنجیدہ ہے لیکن اس کا انداز بیان اتنا موثر ہے کہ کہیں اس کی چال ڈگمگاتی نہیں۔ اس نے پورن بھگت کے قصے کو آزاد نظم میں پیش کیا۔ میرے خیال میں پورن سنگھ ابھی تک نئے پنجابی شاعروں میں پیش پیش ہے۔ اگر وہ اتنی کم عمر میں نہ چل بستا تو اس سے پنجابی شاعری کی بہت سی امیدیں وابستہ ہو سکتی تھیں۔

جذبے کی شدت، خیال کی سنجیدگی اور روحانیت سے لگاؤ رکھنے کی وجہ سے پریتم سنگھ سفیر سب سے زیادہ پروفیسر پورن سنگھ کے نزدیک ہے۔ سفیر کو اپنے کلام میں پورن سنگھ سے زیادہ ہئیت اور تکنیک کا دھیان رہتا ہے۔ لیکن جہاں خیال گہرا ہونے لگتا ہے وہاں پورن سنگھ کی طرح سفیر کی چال مستی دھیمی ہی نہیں پڑ جاتی بلکہ شدتِ فکر کے باعث یہ شاعر دبا دبا سا نظر آنے لگتا ہے۔ اور پھر وہ جیسے بھاگ نکلتا ہے اور جیسے کہ زبان اس کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک۔ ایک گہرائی سے دوسری گہرائی تک وہ اڑتا جاتا ہے۔ پھسلتا جاتا۔ سفیر جیسے اپنے موضوع کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہے جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اسے کہہ بھی رہا ہوتا ہے اور وہ موضوع اس کی پکڑ سے کچھ باہر بھی نظر آتا ہے۔ مغرب کے شاعروں کی سی زندگی پر بے اعتباری، قدرت کے انصاف میں شبہ، حسن میں گناہ کا احساس، حق کی اس دنیا میں بے کار تلاش ـــــ اس طرح کی آوازیں یا

سیفر کی کویتا میں سنائی دیتی ہیں ۔

کسی کنواری کے کاجل سے رنگے ہوئے نین
پریت کی جھانکیاں جن میں لٹک رہی ہیں
جو سات آٹھ بار چناب کو پار کر چکی ہے
فاختہ کی طرح اپنا مکھڑا بنا کر
وہ ایک دوپٹے کا آنچل تھام لیتی ہے

جہاں دیر سنگھ نے آجکل پنجابی میں اپنا کلام کہنا بند کر رکھا ہے وہیں رام چاترک اور گیانی گورمکھ سنگھ مسافر دو ایسے پرانے استاد ہیں جو ابھی تک باقاعدہ لکھ رہے ہیں اور جہاں تک بن پڑتا ہے وہ نئی شاعری کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں جہاں چاترک پرانے موضوعات کو نئے انداز میں پیش کرتا ہے وہاں مسافر نئے موضوعات کو بھی اپناتا ہے۔ چاترک کی شاعری میں زبان کی چاشنی، محاورے کی سادگی، بیان کی صاف گوئی، ہیئت کی ہمواری ــــ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو ابھی تک اس کی شاعری کو نئے شاعروں کے کلام کے پیش نظر الگ نوعیت عطا کرتی ہیں۔ مسافر کی شاعری میں ایک دبی دبی سی، دھیمی دھیمی سی چوٹ، ظلم اور انیائے پر ایک بے لوث سی حیرت، دنیا کی مکاری اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف ایک سنجیدہ سا اشارہ ۔ یہ کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن پر کوئی بھی نیا شاعر فخر کر سکتا ہے۔ چاترک سماجی برائیوں کا پردہ فاش کرتا ہے تو مسافر سیاسی فتنہ پردازیوں کا ذکر کرتا ہے۔ چاترک کسان کے کھیتوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بیلوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی سادہ خوش حال زندگی کا ذکر کرتا ہے۔ مسافر اپنے کلام میں کسان کے ساتھ ہو رہی لوٹ کھسوٹ کا، مزدور کے ساتھ ہو رہی ناانصافی کا، درمیانہ طبقے کے لوگوں کے گھٹیا پن در زات کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ مسافر اپنی ایک نظم میں " نئے اُبھرتے " کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

ایک الگ
ایک مالکن
[illegible]

نئی کار کے گدّے پر
بیٹھا اپنا منہ گھسا رہا ہے۔
کبھی مالک کے منہ کے ساتھ
کبھی مالکن کی ٹھوڑی کو
چاٹتا ہے چومتا ہے
خوش ہوتا ہے
اٹھکھیلیاں کرتا ہے
جسم کو جھٹکتا ہے
دم ہلاتا ہے
کھڑکی سے باہر جھانک کر
جیٹھ کی دھوپ میں
سڑک پر پیدل
چلتے جا رہے
چہروں کو دیکھ کر
ان کے دلوں کو پڑھ رہا ہے۔

حال کی نئی پنجابی شاعری میں پروفیسر موہن سنگھ اور امرتا پریتم دو مشہور نام ہیں۔ ان کی شاعری پر مغرب کی چھاپ ہے۔ کسی حد تک بدیسی شاعری کے نئے رجحانات نے انھیں اکسایا اور کسی حد تک اس شاعر اور شاعرہ نے ایک دوسرے کو ابھارا۔ موہن سنگھ کی عظمت اس بات میں ہے کہ مغرب کی بہترین روایتوں میں پرورش پانے کے باوجود وہ اپنی یگانگت اور اپنے طیعز اد انداز کلام کو قائم رکھ چکا ہے اور امرتا پریتم کی سمجھ بوجھ اس بات میں ہے کہ وہ موہن سنگھ سے ایک اشارہ لیتی ہے لیکن زبان اس کی اپنی ہے۔ اس کا انداز بیان اس کا اپنا ہے۔ اس کے تخیل سے بننے والی تصویریں اس کی اپنی ہیں۔ اس کی شاعری ایک عورت کی شاعری ہے۔ اس کے موضوعات ایک عورت کے موضوعات ہیں۔ اس کا نظریہ ایک عورت کا نظریہ ہے۔ موہن سنگھ کسان کی [illegible] امرتا پریتم [illegible] کا ذکر
[illegible]

آواز بلند کرتا ہے۔ امرتا مزدور لوگوں کے گیت رچتی ہے۔ ان کے ساتھ مزدور مَردوں کی طرف سے ہونے والی ناانصافی کا کھوج ڈھونڈتی ہے۔ نئی پنجابی شاعری میں موہن سنگھ اور امرتا پریتم نے سب سے زیادہ گیت لکھے ہیں۔ ان کے لکھے گیت جو گائے جا سکتے ہیں۔ جو گلی گلی لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ موہن سنگھ کی آجکل کی شاعری میں سیاسی عنصر حاوی ہوتا ہے۔ کئی بار وہ سیاسی قدروں کا ذکر اپنی محبوبہ کے پیار کے پردے میں کرتا نظر آتا ہے۔

تمہارے سینے کے نازک گھونسلے میں
اب میرا دم گھٹتا جا رہا ہے
جن راستوں کو بچھوؤں نے ڈس لیا
ان راستوں پر اب میں اپنے پر جھٹکنا چاہتا ہوں!

موہن سنگھ اور امرتا پریتم کے بعد اوتار سنگھ آزاد، سوریندر سنگھ نرولا اور دیویندر ستیارتھی کچھ ایسے نام ہیں جن کی شاعری میں عظیم شاعری بننے کے سارے وصف موجود ہیں۔ نئی پنجابی شاعری کی اس پود میں دیویندر ستیارتھی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ "دھرتی کی آوازیں"۔ "پسینہ اور گیہوں"۔ "بوڑھی نہیں دھرتی" نظموں کے یہ تین مجموعے ستیارتھی جی نے پنجابی زبان میں پیش کئے ہیں۔ انھوں نے پنجابی زبان کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع کر دکھایا ہے۔ پہلی بار پنجابی شاعری میں پنجاب سے باہر دیس کے دور دور کے خطوں کی زندگی کو نقش کیا گیا ہے۔ آسام، بنگال، تامل ناڈ وغیرہ کی لوک کتھاؤں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ گونڈوں، کشمیریوں اور پہاڑیوں کے گیتوں کے دھنوں کو پھر سے زندہ کیا گیا ہے۔ دیویندر ستیارتھی نے بہت سے اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ نئی زندگی کے عام ہر روز نظر آنے والے پہلوؤں پر جنھیں کبھی شاعری کے بے مطلب موضوع سمجھا جاتا تھا۔ بول چال کے انداز کی بدولت ستیارتھی جو کئی بار کئی دقیق مسئلے ایک عجیب سادگی سے سمجھاتے ہیں۔

بوڑھی نہیں ہے دھرتی
کوئی بڑھیا کی بھی ترنجن کی
نیا چرخہ اپنے سامنے رکھ کر
کات رہی ہے سوت
کات رہی ہے نیا مستقبل
آج کی پونیوں سے
ماضی بہت پرانا نہیں ہے۔
ابھی کل کی بات ہے
جب کپاس اگی تھی
پہلی بار کھیتوں میں
سوچ کر بنایا تھا
کسی کاریگر نے
گاؤں میں چرخہ
لڑکی ہے ترنجن کی
بوڑھی نہیں ہے دھرتی!!

نئی پنجابی شاعری آج بڑے سیانے اور ہونہار ہاتھوں میں ہے۔ جن راستوں پہ آج کا پنجابی شاعر چل رہا ہے صحیح ہیں اور اس بات کی امانت دار ہیں کہ اس شاعری کو ایسا نہ ہوگا جس پر کبھی شرمندہ ہونا پڑے۔

لے ترنجن = چرخہ کاتنے والیوں کی مجلس۔

اعلان

جنوری ۱۹۵۶ء میں "سب رس" کا خاص باتصویر نمبر شائع ہوگا جو خریداروں کو معمولی سالانہ چندہ میں دیا جا[ئے گا] ورنہ اس کی قیمت تین روپے علاوہ محصول ڈاک ہ[وگی]

[illegible]

تبصرے

نکہت و نور سلام سندیلوی صاحب کے کلام کا دوسرا مجموعہ جو ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ مجلد۔ صفحات ۱۱۲۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سلام سندیلوی کے کلام کا پہلا مجموعہ "ساغر و مینا" چند سال قبل شائع ہو کر داد قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جس کا تعارف پروفیسر آل احمد سرور نے قلمبند کیا ہے۔ اس مجموعے میں نظموں کے ساتھ غزلیں بھی شریک ہیں اور نظمیں اشتراکی، رومانی اور تاریخی ہر قسم کی شامل ہیں۔

"نکہت و نور" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سلام میں شاعری کا فطری ذوق ودیعت ہے اور شاعر کے لئے جس تڑپ اور لگن کی ضرورت ہے وہ بھی ان کے دل میں موجود ہے۔ قدرت کی طرف سے ان کی زندگی میں ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں جن کے سبب ان کے کلام میں سوز و گداز پیدا ہو چکا ہے۔ ایسا سوز و گداز جو اردو کے بہت سے شاعر فرضی اور رسمی طور پر اپنے کلام میں پیدا کرتے ہیں۔

ان حادثات اور جاں گسل صدمات سے سلام صاحب فائدہ اٹھانا چاہئے تاکہ ان کے کلام کی مقبولیت اور اثر میں اضافہ ہو اور اردو کے ایک بڑے اور کامیاب شاعر ثابت ہوں۔

سلام کے کلام کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان کو زبان پر قابو حاصل ہے اور ان کی نظموں کے بہت سے بند جوش کے کلام سے میل کھاتے ہیں اور [illegible] کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ [illegible] [illegible] قابل تعریف [illegible]

اور بیان میں جوش پیدا ہوتا ہے جو سلام کے دوسرے ہمعصروں میں کم نظر سے گذرتا ہے۔

آسٹریلیا کی جھلک سفر بڑے ذائقہ کی چیز ہے۔ اس مشاہدہ کو بڑی تقویت ہوتی ہے۔ حدیث بھی تو ہے — "سفر وسیلۂ ظفر"

جو سفر نہیں کرتا وہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نے صرف کتاب کی جلد دیکھ لی اور خوش ہو گیا۔ اس کو اس کتاب کے متن اور مواد پر عبور نہ ہو۔ دنیا کی ہر چیز غور کرنے اور دیکھنے کے لائق ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ جنھیں سفر کے مواقع نصیب ہوں — ادب ایک لامحدود وسعت کا حامل ہے۔ مختلف خانوں میں بٹا ہوا اور ویسے بھی مجھے کہانیوں اور افسانوں سے زیادہ روزنامچے، خطوط اور سفرنامے پسند ہیں۔

جب ماہنامہ "شہاب" میں لکھنے کے لئے اچھے اچھے حفادری قدآور ادیبوں سے گڑگڑا کر کہا کہ کچھ تو لکھو شہاب کے لئے یہ پرچہ بھی اپنے دکن سے نکلتا ہے۔ اس میں لکھنا تمہارا اخلاقی فرض ہے جبکہ شہاب نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ اب جو کڑی دھوپ لگے تو اسی کو بھول گئے" — لیکن کسی پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اچھے اچھے مضامین چھپنے کی تمنا ہی رہی ایک عرصہ بعد ایک سفرنامہ قسم کی چیز دیکھی — "آسٹریلیا کی جھلک" — از مسز لیس [illegible] خاں۔ سوچنے لگی یہ کون ہوں گی۔ جانے کہاں کی ہیں۔ حید [illegible] کا تو شہاب کی حد تک خون سفید ہو گیا ہے۔ [illegible]

ایک جھلک بھی تو دیکھی ان کی [illegible] — [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] [illegible]

[illegible]

تھیں۔ قلم میں کتنی طاقت ہے۔ گویا ایک کہنہ مشق ادیب ہو جس کو زبان اور بیان پر پوری پوری قدرت ہو۔ بہر کیف بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے دکن دیس میں بھی ایسے ایسے قلم کے دھنی ہیں جو عرصہ تک نقاب پوش رہتے ہیں لیکن جب نقاب اٹھ جاتا ہے تو ان کے جادو نگار قلم کی دھوم مچ جاتی ہے۔

اب تو یہ حالت تھی شہاب کے کسی شمارے میں اگر "آسٹریلیا کی جھلک" نہ ہوتی تو شہاب بھی پھیکا پھیکا لگتا اور میں نے لبنیٰ صاحبہ سے کہدیا کہ آپ ان سے ہر شمارے میں اپنی قسط دینے کے لئے تقاضہ فرمائیے۔ چلئے۔ کچھ مہینوں تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر بند ہوگیا۔ بڑی بےچینی رہی۔ اور شہاب نے بھی شہاب ثاقب بن کر اسم بامسمیٰ کی بات رکھ لی۔ آج ان بکھرے موتیوں کو مرصع حیثیت سے نمایاں دیکھ کر دل واقعی بےحد خوش ہوا۔ لیکن کتاب ختم کرنے کے بعد بھی جی نہیں بھرا اور طبیعت یہ چاہتی ہے کہ کہے۔ جلا دے لیکن وہ کہے جائیں کہاں اور —!! اس کے ابتدائی حصے سے تو بہت آگے ہی لطف اٹھا چکی تھی۔ اب تو پورا آسٹریلیا سامنے ہے۔ مصنف کے اسلوب کی دلکشی سارے سفرنامے پر محیط ہے۔ شکر ہے کہ ایک خاصہ کی چیز کتابی شکل میں شائع ہوکر ادب نواز حلقہ میں مقبول ہو چکی ہے — اس سفرنامے کے پڑھنے والے سو فیصد سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ یہی "عیش میں یاد خدا نہ رہی" لیکن مصنف نے ظفر کے اس نظریہ کو جھٹلا دیا اور انہیں یاد خدا [illegible] بار بار آئی۔ جہاں کی رنگین صبح و شام میں بھی ذکر پر تنہا [illegible] انہوں نے خدائے قدوس کی عظمت کو محسوس کیا اور جانے [illegible] جہاں وہ [illegible] آئے خیالات کا [illegible]

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

اور شاید اسی لئے وہ کہاوت ہے نا "نیک نیت منزل آساں"۔ ان پر صادق آئی۔ اور وہ خوشی خوشی سفر سے واپس آکر اپنے بچھڑوں سے ملیں جن کی یاد سارے سفر میں ان کے لئے خدا کی یاد کا ایک ذریعہ بنی رہی۔

"خانصاحب" تو کم و بیش اس سفرنامے کے ہر صفحہ پر جلوہ گر ہیں — کبھی برج کھیلتے ہوئے۔ کبھی آئینہ دیکھتے ہوئے۔ کبھی کسی خاص قسم کی مسز خاتون کو بلا وجہ بھی اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے۔ وہ ایک مقولہ ہے نا عربی کا "محبت بار بار ذکر کرواتی ہے"۔ ایک مشرقی عورت خواہ دنیا کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک ہی کیوں نہ چلی جائے وہ اپنے شریک حیات کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ قطب نما کا رخ قطب ہی کی طرف ہوگا۔ کہیں خانصاحب کے فن کی خوبیوں کا ذکر ہے۔ کہیں ان کی مذہبی پابندیوں کا تذکرہ — انداز بیان نہایت سلیس، رواں اور دلکش —

کہیں کہیں املا اور انشاء کی غلطیاں ہیں مثلاً شکم پُر صحیح لفظ ہے۔ شکم پور — غلط۔ صفحہ ۲۰۵ - ۲۰۶ بہت دلچسپ ہیں۔ صفحہ ۲۰۵ پر سالن "بھتے" کی طرح صحیح ہے "بیہتے"۔ [illegible] دھرتی ماتا" صحیح لفظ ہے۔ "دہرتی" غلط۔ خیر تو اس [illegible] معمولی غلطیوں سے اس کتاب کی دلکشی متاثر نہیں ہو [illegible]

اس کتاب پر کچھ لکھنے کے لئے دل [illegible] بڑی گڑبڑ کر رہے تھے — وہ ناک میں دم [illegible] تا — لیس مزہ آگیا — لیکن دماغ حاضر نہ تھا۔ [illegible] سمجھوتہ کرلیا ہے اور دونوں حاضر ہیں — تو [illegible] [illegible] نکلنے کے برابر ہے۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ؍)

ملنے کا پتہ:۔ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو [illegible]
عابد روڈ۔ حیدرآباد

[illegible]

حیدرآباد میں کل ہند کانگریس کی جدوجہد

از:۔ مولوی حافظ محمد مظہر صاحب

اسی دس سال کے دوران میں حکومت آصفیہ نے بلا مطالبہ رعایا مجلس وضع قوانین بھی قائم بھی کر دی۔ اگرچہ اس کا اقتدار صرف قانون سازی کی حد تک تھا۔ اس میں دو اراکین کو منتخب کرنے کا وکلاء کو حق دیا گیا تھا اور دو اراکین جاگیردار حلقے سے منتخب ہوا کرتے تھے۔ اس کی بدولت قانون سازی سے دلچسپی ملک میں پیدا ہو گئی۔ وکلاء کے انتخاب میں یہ التزام باہمی سمجھوتے سے کر لیا گیا کہ ایک رکن ہندو اور ایک رکن مسلمان کو منتخب کیا جائے۔ بہترین وکلا اس طرح مجلس وضع قوانین میں منتخب ہو کر آتے تھے۔ بہرطور اس دس سال کے عرصے میں حیدرآباد میں بڑی حد تک علمی، ادبی، قومی اور سیاسی مسائل سے دلچسپی زیادہ ہوتی چلی گئی۔ نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں اہل الرائے افراد اپنی رائے اپنے حلقہ اثر میں ظاہر کیا کرتے تھے۔ اضلاع و تعلقات میں مجالس لوکل فنڈ اور بلدہ میں مجلس صفائی یا بلدیہ موجود تھی مگر چونکہ انتخاب اراکین نہ ہوتا تھا، اراکین حکومت کی منظوری سے نامزد ہوتے تھے۔ اس لئے جو دلچسپی اس وقت ہندوستان میں ان مجالس میں لی جاتی تھی وہ یہاں نہ تھی۔ مگر اکثر سرکاری و غیر سرکاری اراکین اپنے فرائض کو دلچسپی اور آزادی رائے کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے۔ بہرطور انیسویں صدی کے اختتام کے زمانے میں حیدرآباد میں قومی اور ملکی معاملات سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ ہندوستان کی طرح یہاں سیاسی حقوق طلبی کی جدوجہد نہ تھی۔ مگر چونکہ حکومت خود اہل ملک کے ہاتھ میں تھی اور ملک کا روپیہ ہندوستان کی برطانیہ کو ہوم چارجز (Home Charges) کے طور پر نہ جاتا تھا اور اہل ملک ہی کو اور خصوصاً قدیم باشندوں کو حکومت میں اپنے ملک و حقوق کے تحفظ اور نظم و نسق کو اعلیٰ معیار پر رکھنے کا جذبہ تھا اور کاروبار حکومت بمقابل انگریزی حکومت کے ملک کی اہم زبان اردو میں انجام پاتا تھا اس لئے وہ ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ممالک محروسہ کے باشندے عملاً اپنے ملک کے نظم و نسق کو اس سے بہتر برطانوی ہند سے زیادہ واقف تھے۔

بہرطور انیسویں صدی کا اختتام جمہوری آزادی و ترقی کا جذبہ ملک میں پھیلنے کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں ہر دس سال زیادہ ترقی ہائی۔ ہم جہتی طور پر [illegible] کانگریس کے ساتھ ربط اور اس کی تائید کا جذبہ پیدا ہو گیا جس کی تفصیل اب آئے گی۔ بیسویں صدی بیسوی کے آغاز [illegible] ملک کی عمرانی صلاح [illegible] اپنی جدوجہد کو تیز تر کر دیا۔ تعلیم کچھ نہ کچھ پھیلی تھی مگر مدارس دینیہ کا [illegible] مطابق حال نہ تھا۔ چونکہ لڑکے بیرسٹر اور ڈاکٹر کی ڈگری سے طرزِ معاشرت متاثر ہو گئی اس لئے کسی [illegible] محدود ہو گئی تھی۔ اسی وقت کے محدود فنانس کی کمی کا [illegible] کا ذکر تھا [illegible] بجائے [illegible] برائے حکومت کی متاثرہ آمدنی کا ازالہ کرتے ہوئے [illegible]

معین المہام فینانس نے حیدر آباد کے مالیہ کو درست بنانے، اس کے سکے کو مستحکم کرنے، اس کے چلن کو زیادہ کرنے اور مشکلات کو حل کرنے میں جو سکہ کے متعلق حائل تھے اپنی پوری توجہ منعطف کر دی۔ حیدر آباد کے مالیہ کو درخشاں بنایا اور نتیجے یہ کہ حکومت کے موازنہ میں توازن پیدا ہو گیا، صلاح و فلاح عامہ کے لئے رقموں کو منظور کرنے میں پیش رفت کی۔ مگر تعلیمات کی اصلاح میں انگریز ناظم تعلیمات نہ ہونے کی بناء پر انھوں نے اپنے دور معین المہامی میں تنگ نظری سے کام لیا۔ اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ حیدر آباد کی تعلیمی صلاح و فلاح چند سال تک رکی رہی۔

مالیہ سے قطع نظر، حیدر آباد کے روشن ضمیر فرزندان وطن نے اس کی طرف جد و جہد آغاز کر دی کہ ایک طرف حیدر آباد کی تعلیمی اور ہمہ جہتی ترقی ہونی چاہیے اور حیدر آباد میں جو شاندار قومی اتحاد ہے اس سے کام لیتے ہوئے برطانوی ہند کی طرح حیدر آباد میں بھی ہمہ جہتی قومی ترقی کے ذرائع مہیا کئے جائیں۔

حیدر آباد کے نامور محبان وطن میں ڈاکٹر اگھور ناتھ صاحب اپنی ملازمت کی وجہ سے زیادہ عملی حصہ پبلک رہنمائی میں نہ لے سکتے تھے مگر ملا عبدالقیوم صاحب جو ملازمت سے وظیفہ یاب ہو چکے تھے۔ ایک طرف اتحاد اسلامی، حجاز ریلوے، دوسری طرف کانگریس کے کام سے حیدر آباد کو روشناس کرنے میں آگے بڑھنے تیار ہو گئے۔ ملا عبدالقیوم صاحب مرحوم کے دو فرزند مولوی عبدالمنیم صاحب بی اے اور ملا عبدالباسط صاحب نے اپنے والد ماجد کے فیض تعلیم و تربیت سے ان کی ہی رہبری میں آگے بڑھنے کا سامان پیدا کیا۔

مولوی اکبر علی صاحب بھی جنھوں نے احاطۂ ملا صاحب میں سکونت اختیار کر لی تھی، ملا صاحب کے قومی و ملکی امور میں رہنمائی کی وجہ سے عملی کام کے لئے تیار ہو گئے اور ایک ادارہ "انجمن معارف" کے نام سے قائم ہو گیا کہ حیدر آباد کے تعلیمی اور ہمہ جہتی صلاح و فلاح میں کچھ کام کیا جائے۔ یہ تجویز ہو گئی تھی کہ ایک ماہانہ رسالہ "صحیفہ" کے نام سے اجرا ہو اور اس کی ادارت مولوی اکبر علی صاحب کے ذمہ رہے۔ صحیفہ کے پہلے شمارے کی اشاعت کے وقت ہی ملا عبدالقیوم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اکبر علی صاحب اور ملا عبدالباسط صاحب نے بڑی ہمت کرتے ہوئے رسالہ کو معدوم ہونے سے بچا لیا۔ صحیفہ ماہانہ چند [illegible] جاری رہا اور اس کے بعد روزنامہ کی صورت میں آ گیا۔ اس نے حیدر آباد کے سیاسی، تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور [illegible] کے متعلق جو خدمات دوسروں کے اشتراک عمل سے انجام دی ہیں وہ حیدر آباد کی عموماً ہمہ جہتی اور خاص کر سیاسی جدو جہد [illegible] نمایاں رہے گا۔ احاطۂ ملا صاحب میں "انجمن معارف" اور صحیفہ ماہانہ روزنامہ کی خدمت ادا کرنے محبان ملک کی [illegible] کھڑی ہو گئی، مگر ان کا کام بلند و بالا رہا ہے۔

مولوی محمد مرتضیٰ صاحب نے صحیفہ اور انجمن معارف میں عظیم ترین کام کیا ہے اور نہ صرف [illegible] دونوں امور کی [illegible] صلاح و فلاح اور [illegible] وارثت سے جو رہتے ہیں ان کا کام نمایاں ہے۔ [illegible]

[illegible] مولوی عبدالسلام صاحب [illegible]

[illegible] ملا عبدالقیوم صاحب کے [illegible]

[illegible] امتحانات میں [illegible]

[illegible] ان کے مضامین حیدر آباد کے [illegible]

میں [illegible] مولوی عبدالحلیم صاحب [illegible] مولوی مرتضیٰ صاحب

کے مطالعے سے مضامین لکھنے کے لئے ہمت افزائی کی۔ پندرہ سال کے بعد سے وہ عربی اخباروں کا ترجمہ جریدۂ روزگار مدراس کے لئے کیا کرتے تھے اور جہاں شمالی ہندمیں "وکیل" امرتسر اور "پیسہ" ہمدرد" "وطن" نے مولوی غلام محمد صاحب مولوی انشاء اللہ خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی وجہ سے معاملات اسلامی میں مسلمانوں کی دلچسپی کا عظیم تر کام کیا۔ اس طرح جنوب میں مولوی مرتضیٰ صاحب نے عظیم جریدہ روزگار کے ذریعہ ملک کے لئے عظیم تر کام کیا۔

مولوی محمد مرتضیٰ صاحب نے تاریخ و ادب عربی و فارسی کے ساتھ حیدرآباد کے نظم ونسق اور سرکاری کاغذات اور رپورٹوں وغیرہ کا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا تھا۔ عربی اخبارات کے اردو ترجمے اور تاریخی مضامین کے تحریر کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے علمی کام کو پھیلانا شروع کیا۔ کتب خانہ آصفیہ میں روزانہ وہ جاتے اور اپنی دلچسپی کی کتابوں کا عربی و فارسی میں مطالعہ کرتے خصوصیت سے ان کا مطالعہ تاریخ پر زیادہ تھا۔ مسلم رہنمائے مولوی وحیدالدین صاحب سلیم نواب حاجی اسماعیل خاں صاحب کے سرپرست اور اعانت سے انیسویں صدی کے اختتام پر علیگڈھ سے معارف کا رسالہ شائع ہونے لگا تھا۔ اس میں حالات سسلی کے نام سے ایک سلسلہ تاریخ انھوں نے شروع کیا کیونکہ سسلی (موقوعہ یورپ) میں مسلمانوں کی حکومت پہلی صدی ہجری میں قائم ہوئی تھی اور اس نے یورپ میں تمدن وتہذیب اور اسلامیت کو پھیلانے میں عظیم تر حصہ لیا ہے۔ ان کا سلسلۂ مضمون دلچسپی سے پڑھا جانے لگا تھا اور ہندوستان میں ان کے نام اور کام کی واقفیت اہل علم کے حلقوں میں شروع ہو گئی تھی۔ مولانا شبلی اور مولوی وحیدالدین سلیم وغیرہ اس کو پسندیدگی سے دیکھ رہے تھے

مولوی مرتضیٰ صاحب نے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کے اور حیدرآباد کے مسائل حاضرہ کا بھی مطالعہ کیا اور ہندوستان کے قومی اداروں اور ان کے کام اور ملک کی ضرورتوں پر بھی ان کی نظر وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ بیس سال کی عمر میں انھوں نے حیدرآباد کے اخباروں میں اس کے متعلق مضامین لکھنا شروع کئے کہ حیدرآباد کی تعلیمی حالت غور اور توجہ کے قابل ہو گئی اس کی اصلاح ضروری ہے ان کے مضامین کی بدولت ملک کی توجہ مسائل تعلیم پر مرکوز ہو گئی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی مدارالمہامی کے بعد انھوں نے حیدرآباد کے نظم ونسق، سیاسی امور وغیرہ پر مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ اس کا اثر ہر حال یہ ہوا کہ دوسرے افراد و نوجوان بھی اس پر غور کرنے لگے مدراس کے اخبارات میں جو حیدرآباد سے متعلق تھے نیز یہاں کی حیدرآبادی صحافت میں بھی [illegible] کام کرنے لگے۔ ۱۹۰۶ء میں انجمن [illegible] ترقی کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا کہ حیدرآباد کی تعلیمی حالت غور و توجہ کی محتاج ہے۔ اپنے مضامین میں ہندوستان کے علمی اداروں کو بھی حیدرآباد کی تعلیم پر توجہ کرنے پر متوجہ کیا۔

اسی زمانے میں طلباء وغیرہ کی ادبی انجمنیں قائم ہونے لگی تھیں اور مدرسہ دارالعلوم میں بھی "انجمن [illegible]" قائم ہو گئی تھی۔ [illegible] صاحب اور ملا عبدالباسط صاحب وغیرہ اس میں زندگی پیدا کر رہے تھے۔ انھوں نے مرحوم [illegible] صاحب کو بھی مدرسہ یا انجمن کی طرف متوجہ کیا۔ ماہنامہ [illegible] جاری ہو گیا کہ ملک کی ترقی کے لئے اور خاص کر تعلیمی ترقی کے لئے [illegible] کام کرنے [illegible]

اسی زمانے میں بعض ملک [illegible] راقم اس پر توجہ دلانے لگا کہ حیدرآباد کی تعلیمی اصلاح [illegible] [illegible] راقم کو یہ یاد ہے [illegible] کی تعلیمی اصلاح پر اپنی صدا [illegible] سے بلند کرتا تھا زیادہ تر برادر مرحوم مولوی مرتضیٰ صاحب [illegible] کے مطالعہ اور مدرسہ اور مدرسہ سے باہر [illegible] بنا۔

بہر حال [illegible] ملک کی [illegible]

اس وقت تک حیدرآباد کی صلاح و فلاح کے لئے کوئی مستقل تحریک موجود نہ تھی۔ جو کچھ تھا وہ ادبی انجمنوں اور اخبارات تک محدود تھا۔ ملک کے سربرآوردہ افراد ہندوستان کی سیاسی اور تعلیمی کانفرنسوں اور کانگریسوں میں شرکت کو ہی بڑا کام تصور کرتے تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس مدراس، بمبئی وغیرہ میں ہوتے۔ اس میں مسلمانوں، اہل علم اور قومی درد رکھنے والے افراد شریک ہوتے۔ پنڈت کیشو راؤ صاحب، وامن نائک صاحب وغیرہ نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ دونوں افراد پونہ، بمبئی وغیرہ کی تعلیمی تحریکوں سے دلچسپی لیتے۔ اس کے مقابل مسلمان علیگڈھ کالج وغیرہ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ بہرطور اس کی ضرورت تھی کہ حیدرآباد کی ہمہ جہتی ترقی اور پبلک کاموں کی بنیاد وسعت سے ڈالی جائے۔ اگرچہ حیدرآباد کی مجلس وضع قوانین بلا مطالبۂ رعایا خود سرکار نے قائم کر دی تھی مگر اس میں پیش روی کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

(۴۸) برس کا عرصہ گذر چکا ہے اس وقت خود برطانوی ہند میں منٹو اور مارلے ریفارم اسکیم (Minto and Morley Reform Scheme) زیر غور تھی۔ مگر حیدرآباد کے متعلق ابھی کسی کی توجہ نہ تھی کہ یہاں بھی اس کا مطالبہ پبلک کی جانب سے کیا جائے۔ راقم کو اس کی اولیت ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ اخبار "جریدۂ روزگار" مدراس میں ایک تفصیلی ادارتی مضمون کا سلسلہ شروع کیا جو چند ہفتوں تک ہفتہ وار شائع ہو رہا تھا اور راقم نے تفصیل سے مجلس وضع قوانین، مجالس بلدیہ، لوکل فنڈ اور دیگر اسی قسم کے پبلک سرکاری مجلسوں اور کمیٹیوں کی اصلاح کی جانب حکومت اور ملک دونوں کو توجہ دلائی کہ حیدرآباد میں جو قومی اتحاد ہے اور جس طرح رعایا اور حکومت کے مقاصد میں کوئی مغائرت نہیں ہے اس کی بناء پر کم از کم برطانوی ہند کے اصول پر کام کرنے کا وقت آ چکا ہے۔ یہ سلسلہ دلچسپی سے پڑھا گیا تھا مگر اس وقت کے انگریز حکام فینانس، مالگزاری نے بھی اس کو مناسب نہ سمجھا تھا کہ حیدرآباد کی سلف گورنمنٹ میں کچھ پیش روی کی جائے۔ جب حکومت کو اس کا خیال نہ ہو تو پھر رعایا بھی خاموش ہی تھی۔ اس زمانے میں پنڈت کیشو راؤ صاحب نے مجلس وضع قوانین وغیرہ میں اپنا انتخاب بحیثیت رکن طبقۂ وکلاء کرایا تھا اور ان کو اب حیدرآباد میں نیشنل کانگریس اور قومی تحریک حیدرآباد میں چلانے میں سرگرمی حاصل ہو گئی تھی۔ کسی مطالبہ کو جو پبلک کی جانب سے ہو سکے، کہ نا پسند نہ کرتے تھے کہ سلف گورنمنٹ کو حیدرآباد میں ترقی دینا چاہیئے اور حیدرآباد میں نیشنل کانگریس کے نمونے پر کوئی ادارہ متحدہ قومیت کی بنیادوں پر قائم کرنا چاہیئے

بہرطور (۴۸) سال قبل تک اگرچہ حیدرآباد میں مجلس وضع قوانین اور مجالس بلدیہ و لوکل فنڈ برطانوی ہند کے نمونے پر موجود تھے مگر اس میں نمائندگی رعایا کا اصل اصول موجود نہ تھا اور نہ اختیارات ہی کافی تھے۔ اسی کے لئے مطالبہ کے مضامین کا سلسلہ اخبارات میں اپنے نام سے نہیں بلکہ خود اخباری ادارت کی جانب سے لکھنے کا سلسلہ راقم نے شروع کیا اور خاص حلقوں میں اس پر دلچسپی بھی لی جانے لگی

مارلے منٹو ریفارم (Reform) کے بعد حیدرآباد کے محکمۂ وضع قوانین نے جن کی ذمہ داری اس زمانے میں را[illegible] کرشنا چاری مشیر قانونی سے وابستہ تھی۔ اس پر غور کرنا شروع کیا کہ مجلس وضع قوانین کی کچھ توسیع ہونی چاہیئے۔ مگر محکمۂ فینانس [illegible] انگریز ذمہ دار امور نظم و نسق اور خاص کر سالانہ موازنۂ جمع و خرچ کو مجلس وضع قوانین کے حلقہ میں لانے کو پسند نہ فرماتے [illegible] صرف یہ مناسب سمجھا گیا کہ ارکان مجلس وضع قوانین کی تعداد زیادہ کر دی جائے اور بلدہ کی طرح اضلاع کے [illegible] قائم ہوں۔ یہ اصول حضرت غفران مکان کے زمانے میں منظور کر لیا گیا تھا مگر اس کا اعلان اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع کے جلوس [illegible] وضع قوانین کے ایک عمارت کے افتتاح کے ضمن میں کیا گیا۔ وضع قوانین کو چھوڑ کر مجالس بلدیہ و لوکل فنڈ [illegible]
[illegible]

[illegible] سلطان عبد الحمید خان کو (Young Turkish Party) یا انجمن اتحاد و ترقی نے بعض یورپین ممالک کی خاموش
رہنمائی [illegible] کی وجہ سے معزول کر دیا اور ترکی میں ۱۹۰۵ء میں دستوری حکومت سلطان محمد خامس کے تحت شروع ہوئی ۔
شوکت پاشا، انور پاشا، مصطفیٰ کمال وغیرہ سب اسی انقلاب ترکی کے بعد میدان سیاست میں نمودار ہوئے۔ ترک اپنی دستوری
حکومت و اصلاحات میں متوجہ ہوئے تو یورپین ڈپلومیسی نے بلقانی حکومتوں کو اپنی سرپرستی میں ابھار کر وہ مقدونیہ کے حلقہ سے
ترکی حکومت کو ختم کر دیں اور پہلی مرتبہ جو مخالف حکومت عثمانیہ جد و جہد کامیابی سے ختم ہوئی تو پھر اب مزید سیاسی چالیں آغاز ہوئیں
کہ ترکوں کو جہاں تک ہو سکے ختم کرنا مناسب ہے۔ جو توازن قوت یورپ کی سلطنتوں کا تھا، اس کی بناء پر ایک حالت سکون
قائم تھی۔ یورپین ڈپلومیسی نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک طرف اٹلی کو جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد سے برگشتہ کیا جائے اور دوسری طرف انگلستان
کی خارجہ حکمت عملی تھی کہ روس کو بھی برطانیہ کے ساتھ تعاون پر آمادہ کیا جائے۔ لبرل وزارت نے روس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس
میں روس کو ایران، ترکی، افغانستان کے علاقہ میں اپنی مداخلت کو بڑھانے اور اس کے معاوضہ میں انگریزوں کے ساتھ رہنے یا
کم سے کم کوئی یورپین جنگ کی صورت میں ناطرفداری پر راغب کیا جا سکے۔ یہ تفصیلات اسلامی دنیا اور ایشیائی تاریخ آئندہ ادبی
کا اہم ذکر ہو سکتے ہیں۔

یہ سب جد و جہد اس بناء پر انگریزوں نے آغاز کی تھی کہ جرمن اپنے شہنشاہ ولیم کی رہنمائی میں ترکی سلطنت کو اپنے ساتھ
متحد کرتے ہوئے ایک عظیم انقلاب یورپ میں کرنے آمادہ تھے۔ حجاز ریلوے دمشق سے مدینہ تک مکمل ہو چکی تھی اور دوسری طرف
بصرہ سے قسطنطنیہ تک ریلوے سلسلہ کو ترکی عملداری کے اندر قائم کرنے کی تجویز ہو چکی تھی اور بغداد ریلوے کا حصہ قسطنطنیہ سے
بصرہ تک وسعت پا رہا تھا۔ اس کے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے جو برطانیہ بلکہ سارے یورپ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، انگریزوں
نے سلطان عبد الحمید خان کو حکومت سے ہٹانے میں ترکوں کی خاموش مدد کی۔ مگر اس کے بعد بھی ترکوں کا تعاون جرمنوں سے وابستہ رہا تھا۔
اسی ضمن میں یہ ظاہر کرنا بے محل نہیں ہے کہ غالباً ۱۹۰۹ء میں حجاز ریلوے کا جب افتتاح دمشق سے مدینہ طیبہ تک ہو گیا تو افتتاح
تو تقریب ہندوستان کے اکثر مقامات پر ہوئی اور حیدرآباد میں اس کے افتتاح کی خوشی کی تقریب بڑی دلچسپی کے ساتھ منائی گئی تھی۔ مولوی
ظفر علی خان صاحب نے اس کے متعلق اولاً اشارہ کیا تھا۔ پھر مولوی مرتضیٰ صاحب، اکبر علی صاحب، ملا عبد الباسط صاحب وغیرہ
نے اس میں عملی حصہ لیا اور بیت خانہ مولوی خیر المبین صاحب مرحوم میں افتتاح حجاز ریلوے کا جلسہ بڑے اہتمام و جوش سے ہوا تھا اور
مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی اس میں جمع ہوئے تھے۔ کیفی صاحب اور مولوی ظفر علی صاحب نے اس میں پر جوش نظمیں پڑھی تھیں اور جلسہ کے
خیال رہا تھا کہ حجاز ریلوے کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے جو انجمن حیدرآباد میں قائم ہے اس کو پھر احیا کر لیا جائے اور بندرگاہ
[illegible] سے مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ سے دمشق تک اس کو وسعت دینے میں مسلمانان اس میں ہاتھ بٹائیں۔
مولوی حاجی عبد الرحیم صاحب [illegible] حیدرآباد میں اپنے تجارتی کاروبار وغیرہ سے شہرت رکھتے تھے اور جو بانوچہ کے
سامنے لکڑی کاٹنے کا کارخانہ [illegible] چلانے پر کیا کرتے تھے، اور مدرسہ نظامیہ حیدرآباد وغیرہ اسلامی تحریکات
کی امداد کرتے تھے وہ بھی [illegible] اسی قسم کی عملی جد و جہد اور رجحانات حجاز ریلوے و بغداد ریلوے کے
اثرات انگریزوں کو [illegible] آمادہ کرنے کا باعث ہو گئے۔
انگریزوں کی ڈپلومیسی [illegible] کو اٹلی کو خاموشی سے اجازت دے دی جائے کہ وہ ترکی عملداری
طرابلس کو اپنے حلقہ [illegible]

وہ تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہ گیا ہے۔ انگریزوں نے اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ تصفیہ کر دیا کہ مصر سے ترکوں کو طرابلس تک فوجی کارروائیوں کی اجازت نہ دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کے لئے صرف بحری راستہ باقی رہ گیا تھا اور اس میں اپنی بحری قوت کمزور رہنے سے بے بس تھے۔ تاہم خود طرابلس کے نہتے عربوں نے جس طرح اپنی آزادی کی حفاظت میں جدوجہد کی اور سواحل سے آگے بڑھنے میں اٹلی کے جس طرح مزاحم رہے وہ بھی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ انور پاشا بھی خاموشی سے اٹلی کی ہر قسم کی ناکہ بندی کر دینے کے باوجود طرابلس میں پہنچ گئے تھے۔ طرابلس کے عربوں اور مرحوم شیخ سنوسی کو جو طرابلس کے عربوں کی رہنمائی کر رہے تھے اپنی بھی کامیاب جدوجہد کا بھی یقین دلایا۔ تقریباً ایک سال تک اس کی جدوجہد جاری رہی تھی اور ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کے اس طریقہ پر نہایت ناگواری و ناپسندیدگی کا علانیہ اظہار کیا۔ مولانا شبلی اور اقبال کی پرجوش نظمیں بھی اس موقع پر کہی گئی ہیں۔ انگریزوں نے ترکی کو بے بس کرنے کے لئے جو کام شروع کیا تھا اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور مسلم لیگ کو زیادہ سے زیادہ سرگرمی لینے میں آمادہ کر دیا۔ اس کے ساتھ کانگریس کے پلیٹ فارم پر بھی مسلمانوں کا زیادہ اجتماع شروع ہو گیا اور یہ کوشش ہو رہی تھی کہ مسلمان اور ہندو سیاسی امور میں متحد ہو جائیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ اقتدار حکومت حاصل کرنے میں جدوجہد قومی کر دی جائے اور یہ سمجھا گیا تھا کہ ہندوستان میں قومی اتحاد مسلمان اور ہندو میں ہو سکتا ہے اور دونوں کے مفاد یکساں ہیں۔

انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت کو منتشر کرنے میں پوری جدوجہد کی۔ یورپ کی جنگ عظیم کے امکانات کو وہ قریب تصور کرنے لگے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اسلامی دنیا کے ترکی، ایران، افغانستان، مراکش کی حکومتیں اور خلیج فارس کی چھوٹی مسلم حکومتیں یورپ کے لئے بڑا خطرہ ہیں۔ اسی کو محسوس کرتے ہوئے ایک طرف یمن میں، دوسری طرف مصر میں، تیسری طرف خلیج فارس کی مسلم شیوخ حکومتوں میں برطانوی حکمت عملی پوری قوت کے ساتھ کام کرنے لگی کہ ترکوں کا مصر سے خلیج فارس تک کا جو مسلم علاقہ ہے وہاں ترک طاقت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی اپنی محدود قومیت مثلاً عراقی قومیت، عربی قومیت وغیرہ کے تخیل میں ابھار دیا جائے۔ وقتاً فوقتاً انگریزوں نے ان علاقوں میں جو کام کیا ہے اور جس کا کامیاب اختتام کرنل لارنس کے سیاسی چالوں پر ہوا۔ اس نے ترکی خلافت اسلامیہ کے اثر کو بالکل کم سے کم کر دیا جائے۔

بات میں بات پیدا ہوئی اس لئے اس کا ذکر کر دینا پڑا۔ اس کی سرگزشت علیحدہ لکھی جاتی ہے کہ خلافت اسلامی کے سلطان عبدالحمید خاں کے تخیل کو کمزور اور ناکام بنا دینے میں انگریزوں نے کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔ اب پھر سلسلۂ بیان کو شروع کیا جاتا ہے۔

طرابلس میں اٹلی کی کارروائیاں اور اس کے مقابل خود طرابلس کے عربوں کی بہادرانہ مدافعت اٹلی کے لئے سخت ہو چکی تھی اور اب یورپ کی حکمت عملی اس کی طرف متوجہ ہو گئی کہ ترکوں کو اور زیادہ کمزور کیا جائے۔ اس وقت کی بلقانی عیسائی ریاستیں بلگیریا، آسٹریا، رومانیہ، مانٹے نگرو یہ سب مل کر یورپ کی سرپرستی اور اشاروں سے متحد ہو کے ترکی علاقے کو ختم کرنے کے لئے ۱۹۱۲ء میں میدان عمل میں آگئیں۔ ترکی سلطنت سلطان محمد خامس کے دور میں جس طرح بے بسی کے ساتھ اس حالت سے دوچار ہو ۱۹۰۹ء سے خلافت عثمانیہ کا انتہائی حزنیہ ہے۔ کامل پاشا صدر اعظم، ناظم پاشا وزیر جنگ نے اس کی تیاری کا بہانہ کی تھی کہ دشمن کا مقابلہ ترکوں کی بہادری سے کیا جائے۔ بلقانی جنگ کا ناگوار اثر ہندوستانی مسلمانوں میں [illegible] ہر جگہ ہلال احمر کے نام سے ترکی مجروحین کی امداد کے لئے چندہ جمع ہونے کا اہتمام ہوا۔ [illegible] قائم ہوئی اور [illegible] اس کے متعلق [illegible] جس طرح غریب مسلمان ترکوں کی امداد کے لئے [illegible] ہندوستان [illegible] پیدا ہو گئے تھے۔ مولانا محمد علی شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس کے [illegible] الہلال اور کامریڈ

ی اخبارات اور حیدرآباد میں رہنمائے دکن، صحیفہ اور ہندوستان کے خبروں میں اردو روزناموں کی جدید اشاعت سے ہندوستان میں ایک
تلاطم برپا تھا۔ انگریز مصلحتاً ہندوستان کے مسلمانوں کے ہیجان میں مزاحم نہ ہونا چاہتے تھے۔ ترکی بہت جلد بے دست و پا ہو گیا
سالونیکا یانوپل نے بلقانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور بلقانی بڑھتے ہوئے میدان چتلجا تک آگئے۔ بالآخر چتلجا کے سامنے ترکوں
نے اپنی ہار مان لی اور دبی ہوئی صلح پر آمادہ ہو گئے۔ جس طرح کامل پاشا کو وزارت سے استعفا دینا پڑا، شوکت پاشا صدر اعظم ترکی
ہو گئے اور ناظم پاشا محکمہ باب عالی کے سامنے مارا گیا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مصطفیٰ کمال کا ہاتھ تھا اور ترکوں میں حرکت
کے نئے جد و جہد پیدا ہوئی مگر ناظم پاشا اور کامل پاشا نے جو غفلت یا غداری، جو بھی کہا جائے کی تھی اس کا انجام ترکوں کو برداشت
کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قدرت الٰہی نمودار ہوئی جب بلقانی ریاستیں اپنے حاصل کردہ ملک کی تقسیم کے لئے گفت و
شنید کرنے لگیں۔ خود ان میں جنگ و جدل برپا ہو گئی اور رومانیہ اور بلگیریا نے بلقان کو پھر جنگ و جدل کا میدان بنا دیا اور انور پاشا
اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے بہادر ترکوں کی فوج کو لئے ہوئے ایڈریانوپل تک پہنچ گئے اور وہاں استحکام سے اپنا قبضہ جما لیا۔ ابھی
ترکی کی غیر متوقع شکست اور بلقانی ملک کی تقسیم کا مسئلہ حل نہ ہوا تھا کہ خود عظیم الشان جنگ یورپ ۱۹۱۴ء میں پہلی مرتبہ آغاز ہو گئی۔

ترکی اور یورپ کے میدان سیاست اور میدان جنگ سے قطع نظر، ہندوستان میں جنگ بلقان کا اثر یہ پیدا ہوا کہ مسلمان
بڑی قوت کے ساتھ ترکوں کی تائید کی وجہ سے ایسے متحد نظر آرہے تھے کہ اس کے پہلے نہ نظر آئے تھے۔ اب نئے سیاسی اور قومی رہنما
مسلمانوں میں پیدا ہو چکے تھے۔ محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد، مختار احمد انصاری کا دور دورہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں لیے
دئے مسلمان ترکی کے حالات کو بدل نہ سکتے تھے مگر ان کے اتحاد عمل کا محور ترکوں سے ہٹتے ہوئے خود انگریزوں کی حکومت کی طرف
توجہ ہو گیا اور خلافت کانفرنس، مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی کے لئے نیشنل کانگریس سے بڑھ کر انگریزوں سے مقابلے کے لئے
آمادہ ہو گئے۔ اس حالت کو سمجھتے ہوئے گاندھی جی نے جو ہندوستان کے حقیقی قومی رہنما گنگادھر راؤ تلک کے انتقال کی وجہ ہو چکے
فائدہ اٹھانا چاہا۔ کانگریس اور لیگ کا سیاسی اتحاد بھی پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ (۲۷) سال کے بعد یہ ہوا کہ ۱۵/۱۶ اگست ۱۹۴۷ء
ہندوستان پاکستان دونوں کی علحدہ تقسیم کے ساتھ انگریزی تسلط کے ساتھ آزاد ہو گئے اور برا عظم ہندوستان کی نئی تاریخ آغاز ہوئی۔

حیدرآباد بھی اس جنگ آزادی اور جد و جہد میں ہندوستان سے پیچھے نہ رہا ہے۔ جنگ بلقان میں ترکوں کی امداد اور پھر
بلقان میں حیدرآباد نے اپنے شایان شان کام کیا ہے۔ پہلے تو جنگ بلقان کے وقت ہی جو عام جلسے حیدرآباد اور اضلاع
منعقد ہوتے تھے اس میں جو جوش چندہ دینے میں ہوتا تھا اور جس طرح حاضرین پر رقت اور تاثر طاری ہوتے تھے۔ وہ نہ پھر
نہ پہلے کبھی بعد نظر آسکے تھے۔ اس نے مسلم اور ہندو اتحاد کو بھی تقویت دی۔ احاطہ عبدالقیوم صاحب نے انجمن ہلال احمر میں عظیم ترین
کئے ہیں۔ ملا عبدالباسط صاحب، مولوی اکبر علی صاحب، مولوی مرتضیٰ صاحب وغیرہ کے علاوہ مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم
ٹاکی اپنے وعظ سے جلسہ عام میں بڑا جوش و خروش پیدا کر دیتے تھے۔ انجمن ہلال احمر نے مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری
حیدرآباد میں طلب کیا [illegible] عام و خاص جلسوں میں رہے حالانکہ چند سال قبل جلسہ میلاد شریف میں شاہ سلیمان
صاحب مرحوم کی طلبی کو حکومت [illegible] اعدادان کو جو یہاں آچکے تھے اس وقت کے حکومت کے احکام سے بلاد غط
ہی جانا پڑا۔ پانچ سال [illegible] حیدرآباد میں آنا تبدیلی حالات اور عام خیالات میں تیز ہو جانے کا نتیجہ تھا۔
ہلال احمر کے جلسے [illegible] اور روز بروز ترکوں کے پیچھے ہٹنے کے واقعات [illegible]
کا اثر پیدا ہوتا تھا۔ [illegible] عبدالقیوم صاحب میں شہدائے بلقان کی غائبانہ نماز جنازہ [illegible]

سے ایک مسلم جلسہ عام طلب کیا گیا تھا۔ ایک دن پہلے بلکہ اسی جمعہ کی صبح کو زیادہ وسیع وہ خبریں آ گئی تھیں [illegible] اب با دلِ ناخواستہ صلح کرنے پر مجبور ہو گئی ہے اور بلقانی ریاستیں فاتحانہ تصفیہ کرنے والی ہیں۔ عصر کے بعد جلسہ [illegible] ہی تھا مگر نہایت ہی رقت و تاثر کے ساتھ جلسہ ختم ہوا۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد چند ارکان انتظامی بشمول مولوی اکبر علی صاحب، مولوی مرتضیٰ صاحب و راقم وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے اور وہاں کچھ سوچ رہے تھے کہ نماز مغرب کے بعد روزنامہ "بلٹن" آیا اور راقم نے ہی اس کے اوراق کھولے۔ دیکھا کہ سرخیوں پر نظر پڑی۔ اس میں درج تھا کہ شوکت پاشا صدر اعظم ہو گئے۔ ناظم پاشا مارا گیا اور کامل پاشا صدر اعظم مستعفی ہو گیا اور ترک جد و جہد کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں۔ راقم نے حاضر الوقت افراد کو یہ سرخیاں سنائیں اور کچھ عجیب تاثرات پیدا ہو گئے۔ دلوں میں شکر الٰہی کے جذبات پیدا ہوئے اور پھر عرصہ تک تفصیلی خبریں پڑھی گئیں اور اس کے متعلق گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ طے پایا کہ جس قدر بھی ہلال احمر کی رقم حیدر آباد میں ہے وہ فوراً بنک کے ذریعہ شوکت پاشا وزیر اعظم کو روانہ کر دینا چاہئے اور جو تار کا پیغام جائے گا اس میں یہ پیام بھی دیا جائے کہ مجاہدانہ جنگ جاری رکھی جائے۔ دوسرے ہی روز یہ رقم روانہ ہو گئی۔

راقم جو اس زمانے میں صحیفہ کے لئے خبروں کا ترجمہ کرتا تھا اور اداریے بھی لکھتا تھا اپنے کام کو شروع کر گیا۔

بہر حال یہ خبریں بڑی ہمت افزا تھیں مگر حالات کو سابق وزارت ناظم پاشا کامل پاشا اتنی [illegible] بگاڑ چکے تھے کہ بالآخر ترکوں کو اپنی ہار ماننی پڑی۔ مقدونیہ کا صوبہ جو ترکوں کے پاس تھا بلقانی ریاستوں کے حوالے کرنا پڑا۔ جس طرح مزاجی اثرات کسی ملکی و قومی حادثہ پر قوم و ملک پر طاری ہو جاتے ہیں مسلمانوں میں پیدا ہو گئے۔

اگرچہ ترکوں کی حالت تو بگڑ چکی تھی مگر سارے ہندوستان کی طرح ہمارے ملک میں بھی بیداری کی لہریں پیدا ہو گئیں۔ پھر پہلی جنگ یورپ کے بعد متذکرہ بالا تحریکِ خلافت اور اس کے ضمن میں کانگریس کی اور خاص کر گاندھی جی کی تائید بالآخر ہندوستان کو آزاد کر کے رہی۔ یہ اجمال تھا اور اس کی اجمالی کی تفصیل اور خاص کر جہاں تک حیدر آباد سے متعلق ہے، علیحدہ علیحدہ رکھتے ہوئے پھر ۱۹۲۰ء کے بعد کی تفصیل قلمبند کر دی جائے گی تاکہ ہمارے ملک دکن کی تاریخ آزادی محفوظ ہو جا سکے۔

(باقی آئندہ)

اردو کا ایک نیا رسالہ بہت جلد آپ کی خدمت میں پیش ہوگا۔

ماہنامہ تجلی

معیاری مضامین، عمدہ افسانے، دلکش نظمیں۔ دل پذیر غزلیں اور دیدہ زیب سر ورق

سالانہ قیمت چھ روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

منیجر ماہنامہ تجلی۔ گلزار بلڈنگ۔ پریڈی اسٹریٹ۔ صدر۔ کراچی ۳